READING SECTION
Online Library For Pakistan
WWW.PAKSOCIETY.COM

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

جون 2017

نگران اعلیٰ
معراج رسول

READING SECTION
Online Library For Pakistan
WWW.PAKSOCIETY.COM
READING SECTION
Online Library For Pakistan
WWW.PAKSOCIETY.COM
www.paksociety.com
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

www.paksociety.com

سسپنس ڈائجسٹ

مدیرہ اعلیٰ: عذرا رسول

انشائیہ — 07 — جون ایلیا

معانی شناسی اور سچ کی تلاش میں ایک مسافر کا فلسفہ

آپ کے خط — 08 — مدیر اعلیٰ

سسپنس کی مجلس مشاورت قارئین کی تلخ و شیریں باتیں گلے شکوے اور پرخلوص مشورے

شکن در شکن — 16 — ڈاکٹر ساجد امجد

ماضی کا آئینہ، بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات

رقم کی واپسی — 55 — تنویر ریاض

تاریک ذہنوں میں امید کی کرن جگاتی ایک دلچسپ تحریر

ایک لمحہ — 65 — منظر امام

محبتوں اور اپنائیت کا ادھار واپس کرنے والے ایک خوش قسمت انسان کا ماجرا

شیش محل — 68 — اسماء قادری

اسرار و تحیر کے پردوں میں ملفوف سطر سطر رنگ بدلتی واردات قلبی کی عکاس دلچسپ داستان

دوراہا — 101 — وسیلہ خاتون

جرائم کی دنیا میں دیانت داری کی تلوار پر کھڑے پولیس آفیسر کی جرأت مندی

نفس کا قیدی — 112 — ملک صفدر حیات

ایک ماں جائے کی سنگدلی اور خود غرضی کا دلخراش واقعہ

دہرا انتقام — 147 — محمد یاسر اعوان

خون کی ہولی کھیلنے والی ایک دوشیزہ کے ضمیر کی بے چینی کا احوال

جلد 47 • شمارہ 06 جون 2017 • زرِ سالانہ 800 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •

خط کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 • فون: 35895313(021) فیکس 35802551(021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

CPNE MEMBER APNS

نفسیاتی مریض 155
کبیر عباسی
دوسروں کو سمجھنے کا دعویٰ کرنے
والوں کا خود سے بے خبری کا انداز

محفل شعروسخن 162
قارئین
آپ کے ہاتھوں سجی ایک انجمن رنگ رنگ
آپ کی پسند آپ کے ذوق سے ہم آہنگ

نامراد 165
سلیم انور
چوٹ کھا کر دوستی کی قدر کرنے
والے دو بے وقوفوں کا انداز نظر

وقت 168
حسام بٹ
ایک پرعزم بازی گر کی بازی گری...... سنسنی
خیز واقعات پر مشتمل ایک طویل داستان

قضا 205
نعمان اسحاق
بھولی بسری یادوں کو حال سے
ملاتی ایک چونکاتی کہانی

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی 209
ضیا تسنیم بلگرامی
دنیاداری کو ٹھکرانے والے اور آزمائشوں میں
خوش رہنے والے ایک ولی کا قصہ

مقصد حیات 223
ایم اے راحت
اپنی تحریروں میں ہمیشہ زندہ
رہنے والے مصنف کی یادگار تحریر

غرق محبت 248
طاہر جاوید مغل
روح کا روح سے میل تال اور محبتوں کے بے
مثال اور لازوال جذبوں کی سحرانگیز داستان

کترنیں **
ادارہ
دنیا بھر سے ادھر ادھر سے لطیفے چٹکلے اقتباسات
مسکراہٹیں اور قہقہے سب کچھ آپ کے لیے

پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول • مقام اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

انشائیہ

جون ایلیا

پہچان

میں نے دنیا کی ایک اعلیٰ حکمت سے خبر، خیال، خوش اندیشی، خیر طلبی اور خجستہ کاری کے رموز و اسرار اور راستی کے نہاں اور آشکار کا کچھ توشہ حاصل کیا ہے تاکہ تمہاری شنوائیوں اور بینائیوں کے درمیان برابر برابر بانٹ دوں۔ میں نے اس حکمت سے معنی اور بیان کی وہ دولت پائی ہے جو زمن کے دن اور رات کی بدحالی میں تمہارے کام آئے گی۔

اس توشے سے روح اور دماغ کی سب سے زیادہ فائدہ پہنچانے والی غذا کے حق دار قرار پاؤ اور اس دولت سے شعور اور شائستگی کی سب سے زیادہ بیش قیمت متاع کو اپنا حق ٹھہراؤ۔

میں نے اس نادر حکمت سے تمہارے وجود کے باطن اور ظاہر کے لیے جو کچھ کسب کیا ہے، وہ یہ ہے کہ صبح اور شام کی جس گام زنی میں راہ سے بے راہ ہو جانے کا ڈر ہو اس کے حق میں اپنے گھٹنوں کو شل جانو۔

دلدل کی طرف بڑھنے سے زندگی بھر ایک پتھر کی طرح بے جنبش رہنا کہیں بہتر ہے۔ اس بات کو مت جھٹلاؤ کہ تم اب تک، اس آن تک ایک نگل جانے والی دلدل کی طرف بڑی تڑنگ کے ساتھ بڑھتے رہے ہو۔ کیا ایسا نہیں ہے؟ بڑے دکھ کی بات ہے اور اسے بڑے دکھ کے ساتھ کہنا اور سننا چاہیے کہ ایسا ہی تو ہے۔ تم جھوٹ کی اس دلدل کی طرف کب تک بڑھتے رہو گے، آخر کب تک؟

جھوٹ پر لعنت بھیجو اور سچ جہاں بھی ہو اس تک پہنچنے کے لیے دل اور جاں سے گزر جاؤ۔ سچ کے سفر کا آغاز بڑا ہی جان لیوا ہوتا ہے۔ اس میں مغز، اذیت ناک سوزش سے دہکنے لگتا ہے۔ تلوے آبلے اگلنے لگتے ہیں اور سستانے کی ایک گھڑی بھی نصیب نہیں ہوتی۔

اگر مسافر نے اس دہکتی اور تپتی ہوئی اذیت کو سہار لیا تو جانو کہ وہ اسی لمحے انجام تک پہنچ گیا۔ ایک ایسے فرخندہ اور فیروز مندانہ انجام تک جسے دیکھنے والے اور اس کے بارے میں سننے والے وہ لوگ بھی جن کی زندگی پر ہمیشہ رشک کیا جاتا رہا ہو، اپنی ساری زندگی اس انجام پر رشک کرتے ہوئے گزار دیں۔

تم میں سے بہت سے لوگ شاید یہ جاننا چاہیں گے کہ سچ آخر ہے کیا؟ سچی بات یہ ہے کہ میں یہ بتانے سے یکسر قاصر اور عاجز ہوں کہ سچ کیا ہے؟ اس لیے کہ سچ کو شاید جانا نہیں جا سکتا پر ایک عجیب بات ہے کہ اسے ہر آن اور ہر ساعت پہچانا جا سکتا ہے اور پہچانا گیا ہے، پہچانا جاتا ہے۔

کیا یہاں میں ایک بات کہوں؟ کہو کہ ہاں..... وہ بات یہ ہے کہ جاننے میں اتنی بھلائی نہیں جتنی بھلائی پہچاننے میں ہے۔ پھر یہ کہ جاننے کی بہت سی شرطیں ہیں، بہت سی رسمی شرطیں۔ اس کے لیے دنیا کے بہت سے ہنر سیکھنا پڑتے ہیں اور بہت وقت لگانا پڑتا ہے جو ضائع بھی جا سکتا ہے۔ جاننا ایک پیشہ ہے اور پیشہ تو پیشہ ہی ہوتا ہے۔ وہ بیٹھے بیٹھے تو نہیں آ جاتا۔

اب رہا پہچاننا تو وہ کوئی ''پیشہ'' نہیں ہے۔ وہ تو وجود کی معنی شناسی کا معاملہ ہے۔ سو میں تم سے جو بات کہنا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ اپنے اندر انسانوں اور ''شیطانوں'' کی پہچان پیدا کرو کہ پہچان ہی دل اور دانائی کی جان ہے اور وہ انسانوں کے کچھ خاص گروہوں کی میراث نہیں ہے۔

تم ان زبردست لوگوں کو آخر کیوں نہیں پہچانتے جو تمہیں بڑی بے رحمی کے ساتھ اپنا زیر دست بنائے ہوئے ہیں بلکہ انہوں نے تو تمہیں جوتوں کی طرح پہن رکھا ہے۔ کیا یہ بات سچ نہیں ہے؟ اگر یہ سچ ہے اور تم اس سچ کو پہچانتے ہو تو پھر کس وجہ سے ان کے جھوٹ اور جھانسوں کو رعایت پر رعایت دیتے چلے آ رہے ہو۔ آخر تم نے ان سے کیا پایا ہے؟ تم نے تو ان کی خاطر سب کچھ کھویا ہے، ڈبویا ہے۔

پہچان سے کام لو اور چوروں کو کوتوال سمجھنا چھوڑ دو۔ تم ان کے لگاتار جھوٹ اور جھانسوں کے مارے ہوئے ہو۔ اپنے آپ کو بری طرح مارے ہوئے ہو۔ قزاقوں کو طعنے کے طور پر بھی سالار کارواں نہ کہو۔ یہ لوگ بھونکنے والے کتے اور پھاڑ کھا جانے والے درندے ہیں جو آپس میں ایک دوسرے پر غراتے ہیں۔ تو نا، تا تواں کو نگل رہا ہے اور بڑا چھوٹے کو (اپنے) پیروں تلے کچل رہا ہے۔ ان میں کچھ چوپائے بندھے ہوئے ہیں اور کچھ چھٹے ہوئے ہیں۔

دوسروں کے غلام بن کے نہ رہو جبکہ خدا نے تمہیں آزاد بنایا ہے۔ اس بھلائی میں کوئی بھلائی نہیں جو برائی کے وسیلے سے حاصل کی جائے اور اس آسودہ حالی میں کوئی بہتری نہیں جس کی خاطر حقتیاں جھیلنا پڑیں۔ سب سے برا کھاتا وہ ہے جو حرام ہو اور سب سے بڑا ظلم وہ ہے جو کسی ناتواں پر کیا جائے۔

ظالم چاہے اقتدار کی مسندوں پر بیٹھے ہوں یا ان پر بیٹھنے کی ہوس میں ہوں، وہ ہیں بہر حال ظالم ہی۔ ان سے کہو ''تم نے لوگوں کے ایک بڑے گروہ کو تباہ کر دیا ہے۔ اپنی گم راہی سے انہیں دھوکا دیا ہے اور انہیں اپنے سمندر کی موجوں میں ڈال دیا ہے۔ ان پر اندھیرے چھائے ہوئے ہیں۔''

سو باتوں کی ایک بات یہ ہے کہ پہچان سے کام لو اور صیادوں کو باغ باں نہ سمجھو۔ یہ تمہاری آزادی کے بیری ہیں۔ یہ لوگ اپنے سوا سب کو دل گیر اور اسیر دیکھنا چاہتے ہیں کہ اسی میں ان کا عیش اور ان کی آسائش ہے۔ سو پہچان سے کام لو اور ان میں سے کسی کے بھی دھوکے میں نہ آؤ۔

☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

آپ کا خط

عزیزانِ من!
السلام علیکم!

جون 2017ء کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں آپ کے شوق کی تسکین کے لیے حاضر ہے۔ یہ ایسے وقت حاضر کیا جا رہا ہے جب الیکشن کا دھمال ڈالے تمام سیاسی جماعتیں عوام کے مسائل حل کرنے کے لیے خود کو پیش کر رہی ہیں۔ الیکشن کے دھمال کا یہی تو کمال ہے کہ ان دنوں ہر ایک قائد کی زبان پر قومی مسائل کی نہ صرف تکرار ہوتی ہے بلکہ دلوں میں عوام کا دکھ بھی جاگ اٹھتا ہے۔ اگرچہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ الیکشن ہونے کے بعد کسی کو پروا تک نہیں رہتی کہ عوام پر ان کا کیا اثر پڑتا ہے اور ان کے وہ غم دور ہوئے بھی یا نہیں جو الیکشن ہونے سے پہلے ان کے دلوں میں ایک سوز پیدا کیے ہوئے تھے مگر الیکشن کے ہونے تک تو مسائل کے حل کے حوالے سے کسی نہ کسی حد تک عوام کے حق میں بہتری کی صورت نکل ہی آتی ہے۔ جیسے کہ آج اس وقت وطنِ عزیز لوڈشیڈنگ، اوور بلنگ، پانی کی کمی، بلدیاتی اداروں کی ناقص کارکردگی اور اس کی درستگی، کمر توڑ مہنگائی، سڑکوں کی مرمت اور شاید کسی حد تک بے روزگاری کے آسیب میں گھرا ہوا ہے۔ حالانکہ یہ مسائل اتنے ہی پرانے ہیں جتنے ہمارے سیاستدان ......لیکن اس وقت تو ایسا لگ رہا ہے جیسے ان قائدین کے ہاتھوں میں کوئی جادوئی چراغ ہے اور بس ان کے اشارہ کرتے ہی گویا عوام کے تمام دکھ درد دور ہو جائیں گے مگر یہ اتنا آسان بھی نہیں ہے......ابھی تو مسائل میں گھری قوم کے لیے آنے والے دنوں میں بجٹ بھی بجلی گرانے کے لیے تیار ہے۔ دیکھیے بجٹ دھماکا بے چارے عوام پر مزید کتنا بوجھ ڈالتا ہے۔ انہی دنوں رمضان المبارک تمام مسلمانوں کے لیے رحمتوں کی سوغات لیے ساتھ ساتھ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی فضیلتوں سے استفادہ حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائے (آمین) انہی دعاؤں کے سائے تلے اب ہم چلتے ہیں اپنی محفل کی جانب۔

☒ دوست محمد چارسدہ روڈ پشاور سے تبصرہ کر رہے ہیں۔ ’’20 تاریخ کو جانِ محبوب پرچہ ملا۔ اہرام مصر جیسی پراسراریت اور جھیل سیف الملوک جیسی خوبصورتی لیے پرچے کا دیدار ہوا۔ ہاکر حیران کہ بھائی اتنی بے قراری کیوں۔ میں نے کہا بھائی انتظار اس چیز کا کیا جاتا ہے جو سب سے زیادہ محبوب ہو۔ خودغرضی اور بے حسی کے اس دور میں سسپنس ایسا پیارا دوست نہیں ملے گا۔ انکل، سسپنس اور جاسوسی جیسے پرچے کہیں نہیں ملیں گے۔ تقریباً 23 سال پہلے جب میں نے پہلی مرتبہ سسپنس اور جاسوسی کا مطالعہ شروع کیا تو میرا بڑا بھائی جو نہ جانے کب سے یہ پرچہ پڑھتا تھا، الماری میں رکھ کے جب باہر جاتا تو میں چپکے سے نکالتا کہ بھائی یہ کیا چیز ہے۔ جب میں نے شروع کیا تو اس کے سحر میں ایسا گرفتار ہوا کہ دوسری کتابوں کے ہوتے ہوئے میرا دل اسی پرچے میں لگ گیا۔ بھئی یہ سچی گل ہے اس وقت سے لے کر اب تک میرے ہاتھوں میں سیکڑوں کتابیں آئیں لیکن آپ کے ادارے کے پرچوں کا مقابلہ کرنا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ ہمارے گھر میں سسپنس اور جاسوسی کا موجود رہنا لازم و ملزوم ہے کیونکہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے اور یقین کریں جب تک یہ میرے ہاتھوں میں نہ آئے، اس وقت تک دل بے چین رہتا ہے۔ تکلیف اور بیماری کے باوجود میرا سسپنس اور جاسوسی سے جنون اور محبت ہے کہ مجھے خط لکھنے سے نہ روک سکی۔ اب تو خط نہ لکھنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے مجھے پاکستانی کرکٹ ٹیم سے نکال دیا گیا ہو۔ اب آتے ہیں ٹائٹل کی طرف۔ میرا خیال تھا کہ اس دفعہ ڈاکرانکل بہار کے موسم پر رنگ بکھیریں گے لیکن چلو جی آپ کی مرضی، ہم ٹانگ کیوں اڑائیں۔ ٹائٹل گرل جامنی سوٹ، زرد دوپٹے اور چہرے پر بالوں کی لٹ لیے خوشگوار موڈ میں ہے اور پیچھے ایک آدمی کتاب کی ورق گردانی کرتا ہوا بالکل بے خبر ہے۔ ویلڈن ڈاکرانکل۔ ایسے شاہکار آپ کے علاوہ کوئی نہیں بنا سکتا۔ انشائیہ میں جون ایلیا صاحب اعتماد کی بات کر رہے تھے۔ جون ایلیا صاحب اس زمانے میں اعتماد کس پر کریں؟ جب بھائی سے اعتماد اٹھ جائے تو اور لوگوں کی باتیں تو چھوڑیں۔ آج کل اعتماد والے لوگ ہزار میں ایک بھی نہیں ملے گا۔ اداریے میں انکل نے مزدوروں اور تعلیمی معیار کی باتیں کیں۔ میری دعا ہے کہ مزدوروں کی حالت سنور جائے اور اس حقیقت سے باہر آ جائیں کہ ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات...... تعلیمی معیار کے لیے تو بس دعا ہی کی جا سکتی ہے۔ اب آتے ہیں دنیا کی سب سے خوبصورت محفل کی طرف جہاں پر بہت سے کھٹے میٹھے، پیارے پیارے بھائیوں اور بہنوں جیسے دوست موجود ہیں۔ لاہور سے ہمارے نئے بھائی عامر خان آفریدی کرسی صدارت پر براجمان تھے۔ مبارک ہو جی۔ بھئی اتنی سستی اچھی نہیں، اپنے کام خود ہی کر لیا کریں۔ دوسرے نمبر پر عبدالجبار رومی انصاری صاحب کا تبصرہ بھی بہت خوب تھا۔ ناہید یوسف، اشفاق شاہین، زرین آفریدی، بینش صدیقی، محمد صفدر معاویہ، ادریس احمد خان، احسان سحر اور مہتاب احمد کے تبصرے بھی محفل کی جان تھے۔ صفدر معاویہ صاحب گھومتے بہت ہیں اور ہمارے شہر میں بھی آئے تھے، ویلکم جناب۔ بابر عباس صاحب آپ بھی اپنی پسند کا اظہار کریں لیکن کسی کو بوڑھا اور کسی کو بچہ کہنا اچھا نہیں لگتا۔ فتح مکرر ڈاکٹر ساجد امجد صاحب کی اسلام کے دو عظیم سپوتوں کی کہانی۔ سبکتگین کا غلام سے بادشاہ بننا اور پھر اس کے بیٹے محمود غزنوی کے کارنامے کسی سے پوشیدہ نہیں۔ تنویر ریاض کی تماشا پڑھی۔ یقین کریں تنویر ریاض صاحب کی کسی بھی کہانی کی مجھے اب تک سمجھ نہیں آئی۔ ان سے درخواست ہے کہ ذرا آسان اور سمجھ میں آنے والی کہانی بیان کریں۔ ظفر اقبال ظفر کی ناسور پڑھی۔ آہ، دل پر ایک پتھر سا لگا۔ کیسی بے حسی ہے ہمارے معاشرے کی کہ کسی انسان کو انسان نہیں سمجھتے۔ ہر انسان کی قدر کرنی چاہیے۔ شیش محل بھی اچھی جا رہی ہے۔ خدا اسما قادری کے قلم کو اور بھی طاقت دے۔ منظر امام صاحب کی کھٹے انگور پڑھی۔ بے اختیار لوٹ پوٹ ہو گئے۔ کیا خوبصورت تصویر کشی کی منظر صاحب نے ملاوٹ کے بارے میں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

وسلم کا ارشاد ہے کہ جس نے ملاوٹ کی وہ ہم میں سے نہیں۔ لیکن پتا نہیں آج کل بازاروں میں کیا کیا ہوتا ہے۔ خدا ہمارے حال پر رحم کرے۔ ٹیڑھی کھیر سلیم انور کی مختصر لیکن اچھی اسٹوری تھی۔ مرزا امجد بیگ کی عزت دار ایک بہت زبردست، جاندار اور شاندار کہانی۔ شگفتہ جیسی عورتیں کبھی خوش نہیں ہوتیں۔ اپنے مجازی خدا کے لیے گڑھا کھودا تھا لیکن خود اس میں گر گئی۔ انوکھی قربت ڈاکٹر شیر شاہ سید کی دل گرفتہ کہانی۔ جس میں ایک شوہر نے اپنی بیوی سے وفاداری کی ایک شاندار روایت قائم کی ہے۔ ایسی مثالیں کم کم ملتی ہیں۔ دھکا ثمر عباس صاحب کی اچھی اسٹوری تھی۔ دھیان علی اختر کی بس ایویں سی تھی۔ کھوٹا سکہ فوزیہ طیبہ کی کیا شاندار کہانی، کہانی کے آخر تک سسپنس اور تھرل قائم رہا۔ حیران ہوا کہ مغربی معاشرے میں بھی ایسی اولاد ہوتی ہے جو اپنے باپ کے لیے ایسی قربانی دے سکے۔ ویلڈن فوزیہ صاحبہ۔ حسام بٹ کی وقت پڑھی۔ کہانی دھیرے دھیرے آگے جا رہی ہے۔ امید ہے کہ یہ سلسلہ بہت کامیاب ہوگا۔ تعزیت، محمد الیاس، گاؤں کی سادہ اسٹوری۔ یہ محبت بھی کیا چیز ہے جس کے لیے انسان کیا کیا نہیں کرتا۔ مجموعی طور پر ایک بگڑی ہوئی اولاد کا انجام یہی ہوتا ہے۔ کوزہ گر درویش ضیا تسلیم بلگرامی کی ایک اور کاوش۔ واقعی اولیاء کرام کی زندگی کے حالات پڑھ کے انسان اچھے برے کی تمیز سیکھ جاتا ہے۔ شاکر لطیف کی عورت کا انتقام خاص متاثر نہ کر سکی۔ سلیم فاروقی کی بھنور پڑھی۔ دل نے بے اختیار کہا کہ کاش سلیم صاحب آپ زندہ ہوتے۔ عمران جیسے صحافی نے اپنی زندگی داؤ پر لگا دی لیکن اپنے فرائضِ منصبی سے سبکدوش نہیں ہوا اور اس کو اس کا انعام مل گیا۔ طاہر جاوید مغل صاحب سے درخواست ہے کہ وہ سسپنس میں قسط وار کہانی شروع کریں۔ محفل شعر و سخن میں محمد رشید سیال، ناہید یوسف، سید ظفر عباس زیدی اور شاہد علی کے اشعار اچھے تھے۔ کترنیں بھی بہترین تھیں۔ خاص کر راحیلہ شفیق ویلڈن۔ مجموعی طور پر مئی کا شمارہ بہت بہترین تھا۔'' (رسالے کی پسندیدگی کا بے حد شکریہ!)

✠ محمد صفدر معاویہ ضلع خانیوال سے لکھ رہے ہیں۔ ''سرورق کو نہایت محنت اور عرق ریزی کے ساتھ بنایا گیا۔ خوبصورت دوشیزہ اور ساتھ ایک مرد ہے، جیسے آج کل جٹ گندم کاٹ کر تھکا ہوتا ہے ویسے یہ بھی لگتا ہے طویل مسافت کے بعد تھک کر بیٹھ گیا ہے۔ بہر حال بہت اچھا سرورق تھا۔ لو جی پاناما کا فیصلہ بھی آ گیا اور پھر قوم کو انتظار کی سولی پر لٹکا دیا گیا۔ جو سات ماہ میں تحقیقات مکمل نہ کر سکے، وہ دو ماہ میں کون سا تیر مار لیں گے۔ عوام کو بے وقوف بنا رہے ہیں سب۔ ایلیا جی کے پاس آئے تو ان کی گفتگو کا لب لباب یہ تھا کہ ہمیں خودی سے باہر نکلنا ہوگا۔ ایک ہونا ہی ہمارے لیے اور ملک کے لیے فائدہ مند ہے۔ آپ کے اداریے پر آئے تو آپ کافی دکھی لگے کہ ملک میں کوئی چیز بھی تو ٹھیک نہیں ہے۔ آپ کا ان باتوں کا رونا رونا بالکل جائز ہے۔ آپ اپنے فورم سے یہ آواز ملک کے مفاد میں اٹھاتے رہیں گے اور ہمیں ان شاء اللہ اپنے ساتھ پائیں گے۔ اپنے الفاظ کے حق میں بھی تو شنوائی ہوگی۔ بس اللہ پاک آپ کا یہ ملکی و عوامی جذبہ سلامت رکھے اور خوشیاں آپ کے آنگن میں کھلتی رہیں۔ محفل میں آئے تو لاہور سے عامر خان آفریدی اپنی پہلی ہی کوشش میں کرسیٔ صدارت کے مستحق قرار پائے۔ آپ کی بات ہمیں ہضم ہوگئی کیونکہ میں نے خود دیکھا ہے کہ کچھ لوگ لکھنے سے بھاگتے ہیں۔ آپ کو مبارک ہو۔ آپ نے بہت خوبصورت تبصرہ لکھا۔ آگے روحی بھائی کو بہت ہی پیارے انداز میں تبصرہ کرتے پایا۔ ناہید یوسف صاحبہ بھی اپنے بہترین انداز میں موجود اپنے مجازی خدا کو بھوکا مارنے کے چکر میں تھیں۔ یہ بھی سچ ہے سسپنس پڑھتے ہوئے کسی اور کام کا دل نہیں کرتا پر باقی کام کرنے تو ہیں، مجبوری ہے۔ پہلے چار میں سے تین تبصروں پر لاہوری براجمان ہیں۔ اشفاق شاہین بھی عمدہ انداز میں محفل کی رونق بنے۔ سید عالم شاہ پہلے پاکستان میں واپسی مبارک اور پھر آپ کا مختصر تبصرہ بھی اچھی تجویز کے ساتھ تھا۔ زرین آفریدی، بینش صدیقی بھی محفل کی رونق اپنے طنز و مزاح کے ساتھ بڑھاتے ہوئے۔ بہترین تبصرہ نگاری، پتا نہیں میری ماں مسز صدیقی کدھر غائب ہوگئی ہیں۔ اللہ ان کو اپنی امان میں رکھے، آمین۔ حاضری لگوائیں ماں جی مجھے آپ کا انتظار ہے۔ اسرار ساقی بھائی آپ بھی محفل میں نہیں آ رہے، خیریت تو ہے نا۔ بابر عباس، ماہین بابر، فضل عباس کا منفرد انداز بہت پسند آتا ہے۔ بہت ہی پیارے اور طنز و مزاح سے بھرپور تبصرے لکھتے ہیں، ویلڈن۔ رمضان پاشا جی خوش نظر آ رہے ہیں، اللہ آپ کو سدا خوش رکھے۔ بہترین تبصرہ لکھا آپ نے۔ محمد شہباز ناز خود کو بوڑھا کہنے پر ناراض نظر آئے بابر عباس پر ہوسکتا ہے بھئی انہوں نے لمبی عمر کی دعا دی ہو۔ مہتاب احمد بھی اپنے تبصرے سے محفل کی رونق بنے نظر آئے۔ کہانیوں میں حاضری دی تو شیش محل پر پہنچے جو اپنے پورے جوبن پر ہے۔ جولیٹ اور اسد اللہ ایک بار پھر مل گئے تو وہیں چاند بانو اور عارف سے بھی ملاقات ہوگئی۔ اگلی قسطوں میں چاند بانو لازمی طور پر جولیٹ کے سامنے اپنے محبوب کا نام لے گی تو اس پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹیں گے۔ ادھر فاروق بھائی اپنے آخری دشمن راٹھور تک پہنچ گیا لیکن آخر میں سسپنس پھیلا کر قسط کو ختم کر دیا۔ ادھر سے راٹھور کو مدد بھی پہنچنے والی ہے ادھر فاروق باقاعدہ اسے لڑنے کا موقع دے رہا ہے۔ ابتدائی صفحات پر ڈاکٹر ساجد امجد کی فتح مکرر پڑھی۔ پہلی دفعہ تاریخ میں یہ تحریر پڑھی جس میں بغیر خون خرابے کے حکومت محمود تک جا پہنچی۔ سبکتگین کو جہاں اچھے سوداگر نے خریدا، وہیں وہ اچھے بادشاہ الپتگین کے پاس پہنچا۔ اس نے بہترین طریقے سے حکومت کی اور راجا کو شکست دی اور پھر مسلمانوں کے لیے ایک ہیرا مطلب کہ اپنے بیٹے محمود غزنوی کی صورت چھوڑ گیا۔ تنویر ریاض کی تماشا میں جیس جو کہ ایک ایجنٹ تھی اور جیف کو پکڑنا اس کا مشن تھا، پر وہ مکمل طور پر کامیاب نہ ہوسکی۔ اب خود اسے مقدمے کا سامنا تھا اور وہ برائن کو چاہنے لگی تھی پر افسوس۔ ظفر اقبال ظفر کی ناسور پڑھی۔ ہاں یہ سچ ہے کہ ہم لوگ بغیر کسی ثبوت کے کسی کو کچھ بھی ثابت کر سکتے ہیں جہاں پر کوئی قانون نظر نہیں آتا۔ بیگار کیمپ یا بھٹے وہاں پر اور ایسی کئی جگہ پر جبری کام لیا جاتا ہے۔ اس مسافر سے ہمدردی کے بجائے اسے کیسے کیسے القاب سے نوازا ڈالا اور پھر سب سے بڑا ظلم مجاوروں نے کیا۔ اس کو مزار سے اٹھا کر باہر پھینک دیا۔ یہ تحریر ہمارے معاشرے کے منہ پر کھلا تھپڑ ہے۔ منظر امام کے قلم سے کھٹے انگور صحیح کہا کہ یہاں پر ہر چیز دو نمبر حتیٰ کہ حسن بھی۔ یہاں ایک ٹافی سے لے کر انسان کے کفن تک ہر چیز دو نمبر ہے تو وہاں پر خدا کی رحمتیں تو نہیں اتریں گی۔ سلیم انور کی ٹیڑھی کھیر مختصر پر بہترین تحریر تھی۔ لی وہ دوسری عورت تھی جس نے میرینا کا گھر اجاڑ دیا۔ مرزا امجد بیگ اس بار عزت دار لے کر آئے۔ اپنی طرف سے تو

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

شگفتہ عبدالغفار اور خالد مقبول نے کوئی کسر نہ چھوڑی، وحید خان کو پھنسانے میں پر کئی ایسی فاش غلطیاں کیں جو کہ بیگ صاحب نے عدالت میں ثابت کر کے اپنے موکل کو نہ صرف بری کرا یا بلکہ سعدیہ کے اصل قاتلوں کو بھی انجام تک پہنچایا۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید اس مرتبہ انوکھی قربت لے کر آئے جس میں عمر کی محبت بھی لازوال تھی کہ اس نے حلیمہ کا ساتھ چھوڑنے کے بجائے زندگی کا ساتھ ہی چھوڑ دیا اور محبت کو امر کر دیا پر حلیمہ کو انتظار کی سولی پر لٹکا دیا۔ ثمر عباس کی دھکا اچھی تحریر تھی۔ ساندرہ نے جس وجہ سے پروفیسر کا قتل کیا، اس کو مقصد حاصل نہ ہو سکا، الٹا قاتل بن بیٹھی اور اپنی کے مزے ہو گئے۔ محفل شعروسخن محمد رشید سیال سکھر سے لے کر حنظلہ شاہد سکھر تک بہترین اشعار سے مزین رہی۔ ویری نائس۔ علی اختر دھیان لے کر آئے۔ پہلے اپنا ملک چھوڑ کر پردیس جانا اور پھر بچوں پر پابندی لگانا جہاں پر یہ ممکن نہیں، پرشا نے اچھا فیصلہ لیا کہ میں اپنے ملک پاکستان جاؤں گی۔ اس کے بغیر نامکمل ہوں۔ فوزیہ طیبہ کی کھوٹا سکہ پڑھی۔ مارٹن کریگ نے سمجھا کہ باپ نے قتل کیا اور اس کا الزام اپنے سر لے لیا۔ باپ سے محبت کا اچھا انداز تھا پر قاتل کوئی اور نکلا۔ اینڈ کوئی خاص مزے کا نہیں تھا۔ وقت کی دوسری قسط پڑھی جہاں شارو اغوا ہو گئی تو وہیں انکل سلطان کے گھر چوری اور پھر اسد علی کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ قسط اچھی رہی۔ آخر میں ایلم اسٹریٹ کے نام پر چونکنا یقیناً کسی پرانے واقعے کا یاد آنا ہوگا۔ محمد الیاس تعزیت لے کر آئے۔ یقیناً برائی کرنے والا آخر کار ذلیل ہی ہوتا ہے۔ نواز نے تو پھر پٹھان اور افتخار کے علاوہ کئی کو موت کے منہ میں پہنچا دیا تھا، اس کا یہی انجام ہونا تھا۔ کوزہ گر درویش ضیا تسنیم بلگرامی ایک ولی کامل کا ماجرا لے کر آئے۔ بابا خواجہ نے نوجوان شمس الدین کی دنیا بدل کر رکھ دی اور پھر اس سے دنیا روشن ہوئی۔ شاکر لطیف عورت کا انتقام لے کر آئے۔ افشاں سلطان احمد نے اپنے شوہر سلطان احمد سے بدلہ لیا۔ اپنے بیٹے کے ذریعے اس کو مروایا اور اپنا انتقام پورا کر لیا۔ آخری صفحات پر سلیم فاروقی صاحب کی تحریر بھنور آئی۔ اللہ سلیم فاروقی کے درجات بلند فرمائے (آمین) نوجوان عمران نے بڑی بہادری کے ساتھ ویڈیو بنانے کے بعد اس کی حفاظت کے لیے جان کی بازی تک لگا دی۔ شہلا نے بھی پسِ پردہ اس کی بڑی مدد کی کہ ویڈیو اٹھا کر آئی جی تک پہنچائی اور گولی بھی کھائی' عمدہ تحریر تھی۔"

⌘ طاہرہ گلزار کی پشاور سے آمد۔ "آج یعنی 19 اپریل کو ایک بار پھر ڈیوٹی کے بعد جا کر اپنا محبوب سسپنس لے لیا۔ واقعی گرمی کے اس موسم میں سسپنس ٹھنڈی پھوار بن جاتا ہے۔ اس بار میرا خط جلدی پہنچ گیا ہوگا۔ اب تمام دوستوں کے خطوط سے معلوم ہو جائے گا کہ کون کتنا خوش تھا اور کس کو دکھ ہوا، میرے نمبرون آنے پر۔ ہاں ایک بات تمام دوستوں کے ساتھ شیئر کر رہی ہوں کہ جب یہ خط شائع ہوگا بھی تو اس وقت ہمارا ہردلعزیز تبصرہ نگار رضوان سلطان تنولی 23 اپریل کو مجھ سے ملنے پشاور آئے گا۔ انشائیہ میں جون ایلیا اس بار اعتماد کی باتیں کرتے نظر آئے۔ اعتماد کے لفظ سے تو اب مجھے بھی نفرت ہو گئی ہے۔ اس لفظ نے مجھے بہت دکھ دیے۔ اللہ اس ملک اور اس کے لوگوں پر رحم کرے آمین..... معراج انکل آپ کے ایک ایک لفظ تیر کی طرح دل و دماغ میں گھس گئے لیکن ہم کمزور عوام بھی کیا کریں۔ عامر خان آفریدی کی پہلی انٹری اور وہ بھی پہلے نمبر پر، واہ کتنے خوش قسمت ہو۔ ویلکم اینڈ مبارکاں۔ بہت زبردست تبصرہ لکھا ہے۔ واقعی یہ جواب ضرور دینا کہ آپ کے لیے کرائے امتحان میں کون جاتا تھا۔ سچ بتانا جھوٹ نہیں۔ ہاں میرے سویٹ دوست عبدالجبار رومی میں بہت خوش ہوں۔ اللہ آپ کو بھی خوش رکھے، آمین۔ ہمیشہ کی طرح بہت جامع، نفیس اور دلچسپ تبصرہ رہا...... ناہید یوسف بہت دلچسپ انداز لے کر حاضر تھیں۔ ناہید جی دوستوں کے ساتھ اچھی بنائے رکھو۔ زرین جی میں نے کوئی منت نہیں مانی تھی۔ یہ میرے نصیب میں لکھا تھا اس لیے میں نمبرون آئی بھی۔ آپ اتنی نروس کیوں ہیں۔ میں تو ہر وقت خوش رہتی ہوں۔ اب آپ بھی خوش ہو، آخر میں ادارے نے مکھن لگا ہی دیا۔ آخر میں بابر عباس سے گلہ۔ بھائی تو آپ اپنی عمر بھی بتا دیتے کیوں لڑکیوں کی طرح عمر چھپاتے ہو۔ کہانیوں میں پہلے شیش محل۔ اس بار تو اسما قادری باجی بہت رلا دیا۔ پاکستان کے اس وقت کے حالات کی ایسی منظر کشی کی جیسے اس وقت ہم بھی وہیں تھے۔ جولیٹ اسداللہ کو ملی، بہت اچھا ہوا۔ جولیٹ بہت ہمدرد اور محبت کرنے والی شخصیت ہے۔ چاند بانو بھی پاکستان پہنچی اور اب جولی اس کو گھر لے کر جائے گی۔ ہاں عارف کو اس حالت میں دیکھ کر دکھ ہوا لیکن ایسے کمزور، سطحی اور بزدل انسان کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ فاروق نے کیتھرائن کو پاکستان بھیج دیا اور اب راٹھور سے جنگ جاری ہے۔ پلیز فاروق کو جلد پاکستان پہنچا دیں لیکن پہلے وہ راٹھور کو ٹھکانے لگا دے۔ فاروق کو صرف جولیٹ ملنا چاہیے۔ حسام بٹ صاحب کی تحریر وقت دوسری قسط بھی کافی ایکشن والی رہی، شارو اغوا ہو گئی۔ دو بندے انکل سلطان کو تقریباً پانچ ہزار ڈالرز کا چونا لگا گئے۔ علی اور اسمارٹ بننے کے چکر میں پہلے پیلو کو مار چکا اور اب لگتا ہے کہ وہ ڈیلفینا جیسی بلا کے جنگل میں پھنسنے جا رہا ہے۔ آہستہ آہستہ یہ تحریر ابھر کے آئے گی۔ ویلڈن حسام بٹ صاحب...... محمد الیاس کی مختصر تحریر تعزیت اچھی کہانی رہی اولاد کی اور خاص کر بیٹے کی صحیح تربیت نہ کرنے کا یہی انجام ہوتا ہے...... شاکر لطیف کی مختصر تحریر عورت کا انتقام اچھی تحریر تھی۔ سلطان احمد جیسے شوہر اور باپ کے نام پر داغ ہوتے ہیں، اچھا دی اینڈ تھا۔ سلیم انور کی مختصر تحریر ٹیڑھی کھیر واقعی مرد کے ساتھ ساتھ دوسری عورت بھی عورت ہی کی دشمن ہے...... اپنے منظر امام انکل اس بار پھر چالاکی دکھا کر ہمیں لومڑی کی کہانی سنا کر جان بچا گئے۔ پلیز آپ کوئی لمبی کہانی کیوں نہیں لکھتے۔ ہمیں انتظار رہے گا۔ ظفر اقبال ظفر کی تحریر ناسور نے تو روح تک کو زخمی کر دیا۔ معلوم نہیں خود کو مسلمان کہنے والے اس معاشرے کے بے حس اور خودغرض لوگ...... ایک مظلوم لڑکے کو اتنی اذیتیں دے دے کر مار دیا۔ ناسور وہ لڑکا نہیں یہ بے حس معاشرہ ناسور ہے۔ مرزا امجد بیگ صاحب اس بار کا کیس کافی شاندار اور جاسوسی سے بھرپور کیس تھا۔ آخر بیگ صاحب نے وحید خان کو باعزت رہائی دلا ہی دی...... سلیم فاروقی صاحب کی یہ آخری تحریر بھنور ہمیشہ یاد رہنے والی تحریر۔ واقعی ہمارے ملک کو شہلا، نوشین اور عمران جیسے کرداروں کی سخت ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ سلیم فاروقی صاحب کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے آمین...... ہمیشہ کی طرح اس بار بھی ضیا تسنیم بلگرامی دل و دماغ اور روح کو تسکین دینے میں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

کامیاب۔ اللہ ان کو اس کا اجر دے۔ امید کرتی ہوں کہ جون کے سسپنس میں ہمیں ایک بار پھر پیغمبروں کا سلسلہ پڑھنے کو ملے گا تو روزوں کا مزہ بھی دوبالا ہو جائے گا۔ باقی سسپنس بھی لاجواب ہے، کترنیں بھی اس بار بہت زبردست تھیں۔"

✠ ادریس احمد خان، ناظم آباد، کراچی سے شاملِ محفل ہیں۔ "سسپنس کا حصول بروقت ہوا۔ سرورق بھی خوش رنگ تھا اور زبانِ حال سے آپ اپنی ستائش کر رہا تھا۔ انشائیے سے بھی آگاہی کے در کھلے۔ اداریہ بھی حسبِ حال تھا۔ سرِفہرست عامر خان آفریدی تھے، مبارکباد۔ زرین آفریدی، محمد صفدر معاویہ کا شکریہ کہ تبصرہ پسند کیا۔ باقی دوست بھی شاداں و فرحاں دکھائی دے رہے تھے۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی "فتح مکرر" نے تاریخ کے چہرے سے پردہ اٹھایا۔ تنویر ریاض کی تماشا نے محظوظ کیا۔ ناسور نے معاشرے کے دوغلے کرداروں کا پردہ چاک کیا۔ اس کے بعد "شیش محل" پڑھی جو بلاشبہ پسندیدگی کی انتہائی بلندیوں پر براجمان ہے۔ کہانی آہستہ آہستہ اپنے انجام تک خوبصورت انداز میں جاری ہے۔ اچھی تحریر کو کسی سند کی ضرورت نہیں ہوتی اور وہ مقبولِ عام بن جاتی ہے۔ "انوکھی قربت" بہترین سبق آموز کہانی تھی۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی تحریر دیر تک دلوں پر نقش رہتی ہے۔ ثمر عباس کی "دھکا" بھی اچھی تحریر ثابت ہوئی۔ خوبصورت اور معیاری اشعار سے مزین محفلِ شعر و سخن نے بھی بہت خوبصورت اشعار سے روشناس کیا۔ "دھیان" ثنا نے بہت اچھا فیصلہ کیا۔ چاہے کتنی ہی رنگین و سنہری دنیا میں پہنچ جائیں مگر اپنی اقدار و معاشرے کو نظرانداز نہیں کر سکتے کہ اپنے اقدار سے ہی جڑے رہنے میں بھلائی ہے۔ کھوٹا سکہ بھی بہتر تھی۔ حسام بٹ کی "وقت" جاری ہے۔ امید ہے یہ تحریر بھی سارے قارئین کی توجہ مبذول کر لے گی۔ "تعزیت" نے بھی متاثر کیا۔ "کوزہ گر درویش" نے بھی دل کو ایمان کی روشنی سے منور کیا۔ دنیا میں راہ سے بھٹکے ہوئے لوگوں کے لیے ولی اور راہبر آتے رہے اور آتے رہیں گے۔ "عورت کا انتقام" بھی اثرانگیز تھی۔ آخری صفحات کی کہانی بھی بہترین کہانی تھی۔ سنہری باتوں سے متاثر کرنے والی کترنوں نے بھی کافی لطف اندوز کیا۔"

✠ محمد شہباز ناز کا گجر کالونی شاہ پور صدر، ضلع سرگودھا سے تبصرہ۔ "بڑی بے چینی کے ساتھ وقت گزرا۔ اتنی تیز دھوپ میں تین چار بار 15 کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے سسپنس لینے کے لیے جاتا اور جواب ملتا کہ اب تک مارکیٹ میں نہیں آیا۔ 24 اپریل کو اللہ اللہ کر کے بڑی مشکل سے ملا۔ سسپنس ملتے ہی سارے شکوے دور ہو گئے۔ (مگر پرچہ تو بروقت مارکیٹ میں آچکا تھا۔ پھر آپ کو دیر سے کیسے ملا؟) ٹائٹل گرل پر جیسے ہی نظر پڑی تو یہی محسوس ہوا کہ وہ اپنے محبوب کو ایسی ترچھی نظروں سے دیکھ رہی ہے جیسے پچھتا رہی ہو کہ میں نے بے وفائی کیوں کی اور دوسری طرف اس کا محبوب بھی اس سے منہ پھیرے یہی سوچ رہا تھا کہ کاش! یہ میری زندگی میں نہ آتی۔ اب چلتے ہیں محفل کی طرف۔ جون ایلیا کا انشائیہ پڑھا۔ سچ اور اعتماد کے بارے میں بہت ہی اہم باتیں لکھیں۔ سب سے پہلے ظفر اقبال کی کہانی ناسور پڑھی۔ شروع سے آخر تک ایک ہی انسان کا کردار تھا۔ اس کے بعد مرزا امجد بیگ کی کہانی عزت دار پڑھی۔ بیگ صاحب نے اس بار بھی بڑی مہارت سے وحید خان کو بچایا۔ مہر النسا اور اس کی بیٹی شگفتہ کی پوری کوشش تھی کہ وحید خان سعدیہ کا قاتل قرار ٹھہرے۔ جبکہ اس کوشش میں AG اور وحید خان کا منیجر خالد مقبول بھی تھا۔ سچ چھپانے سے نہیں چھپتا۔ سامنے آکر ہی رہتا ہے۔ دلچسپ کہانی تھی۔ ثمر عباس صاحب کی کہانی دھکا پڑھی اور پڑھ کر دل کو دھکا لگا۔ اچھی کہانی تھی۔ منظر امام صاحب کی کہانی کھٹے انگور پڑھی۔ منظر امام صاحب اس بار ایک انوکھی کہانی لے کر آئے لیکن جب بھی آتے ہیں چھا جاتے ہیں۔ ہمارے لیے اس میں اور بھی پیغامات ہوتے ہیں اگر کوئی سمجھے تو۔ اپنی پسندیدہ کہانی شیش محل پڑھی۔ سر جی یقین کریں بالکل بورنگ محسوس نہیں ہوئی۔ فاروق اب ایکشن میں آگیا ہے۔ ایسا لگا بعد میں انڈین فلم دیکھ رہا ہوں۔ چاند بانو نے گناہوں کی زندگی ترک کر کے نیک زندگی اختیار کی اور دوسری طرف ماجدہ شریف ہونے کے باوجود غربت کی وجہ سے اپنے بھائی کا علاج کروانے کی خاطر گناہوں کی دلدل میں پھنس گئی۔ اسما قادری صاحبہ! کہانی بہت اچھی جا رہی ہے، بیسٹ کہانی ہے۔ محمد الیاس کی تعزیت اور ڈاکٹر شیر شاہ سید کی کہانی انوکھی قربت پڑھی، بہترین کہانیاں تھیں۔ سلیم فاروقی کی کہانی بھنور پڑھی۔ ایک چونکا دینے والی کہانی تھی۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی کہانی فتح مکرر پڑھی۔ اسلامی تحریر کے حوالے سے ایک سبق آمیز کہانی تھی۔ بابر عباس صاحب کا بہت بہت شکریہ کہ انہوں نے مجھے بھیا کہا اور میرے بارے میں اتنے اچھے الفاظ بولے۔ خدا ان کو توفیق دے۔ تمام دوستوں کے تبصرے بہت اچھے لگے۔ دعا گو ہوں کہ اللہ پاک اس محفل کو آباد و شاد رکھے اور اس ادارے کو مزید ترقی نصیب فرمائے۔ آمین۔"

✠ عبدالجبار رومی انصاری، چوہنگ سٹی لاہور سے محفل کی زینت بن رہے ہیں۔ "چھوٹی چھوٹی آنکھیں، جب ترچھی ہو جاتی ہیں دل میں بے چینی اور انداز بدلنے لگتا ہے۔ نہ پوچھو کیا گزرتی ہے جب پیار سے پیار بچھڑنے لگتا ہے۔ شاید ایسا ہی کچھ احوال سرورق کی دوشیزہ کی ترچھی نظر بیان کر رہی ہے۔ تم کون ہو؟ اور ہم کون ہیں؟ بحث ہونی چاہیے، شکوے شکایات بھی ہوا کرتے ہیں۔ اصل بات ہے "اعتماد" کی کہ ہم کسی پر کس قدر اعتماد کر سکتے ہیں اور جون ایلیا بھی ایک اعتماد ہیں کہ ہم ان کی سچی باتوں پر کس قدر اعتماد کے ساتھ عمل کرتے ہیں۔ عامر خان آفریدی کی پہلی شرکت مبارکباد کی مستحق ہے اور ساتھ میں رومی کی حوصلہ افزائی بھی عمدہ رہی۔ ناہید یوسف کو بھی ٹائم ملا تو بھرپور تبصرہ اپنی جگہ بنا گیا اور اشفاق شاہین کی بے چینی ختم ہوئی تو دوستوں سے ملاقات بھی ہو گئی۔ شارجہ پلٹ سید شاہ عالم زمرد کی حاضری اچھی لگی۔ زرین آفریدی اور بینش صدیقی بھی طاہرہ کو ہنساتی ہوئی اچھی لگیں لیکن طاہرہ گلزار شاید ابھی مان نہیں رہیں تبھی تو سسپنس میں نظر نہیں آ رہیں۔ محفل میں چار چاند لگاتے محمد صفدر معاویہ کی انٹری بھی ہر بار کی طرح عمدہ رہی۔ احسان سحر کی خوشگوار سوچیں اچھی لگیں اور آخر میں مہتاب احمد بھی ردی کی ٹوکری سے بچتے بچتے اپنی جگہ بنا گئے۔ زبردست۔ باطل کے خلاف جہاد اور اپنی رعایا کی بہتر خبرگیری ہی بادشاہوں کو نیک نام اور کامیاب بناتی ہے۔ رحم دل بادشاہ ناصر الدین سبکتگین کی جنگی حوالوں سے حکمتِ عملی تو عمدہ تھی ہی، اس کے بیٹے محمود غزنوی ان سے بھی بڑھ کر تھے۔ خوبصورت تاریخی کہانی پڑھ کر بہت

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

اچھا لگا۔ ''فتح مکرز'' ایسی ہی ہوتی ہے۔ عورت کے انتقام نے بابو کو جنم دے کر اپنے انتقام کی راہ ہموار کی اور سلطان احمد شناسائی کہانی پڑھتے پڑھتے اپنے انجام کو پہنچ گئے۔ یوں عورت کا انتقام بھی پورا ہوا۔ حالات کی ستم ظریفی نے شیش محل کی دو شہزادیوں کو ملا دیا لیکن دونوں ہی ایک دوسرے سے انجان مگر محبت سے گندھی ہوئی۔ جولیٹ اور چاند بانو۔ جولیٹ ایک بار پھر اپنے پاپا سے آملی اور دوسری طرف فاروق نے پیاری سی کیتھی کو بھی پولیس سے آزاد کروا کے پاکستان بھیج دیا۔ امید ہے فاروق بھی جلد اپنا حساب بے باق کر کے پاکستان آجائے گا اور پھر نئے شیش محل کی بنیاد کھڑی ہوگی۔ انگور تو واقعی بہت کھٹے ہیں اور ہر کسی کو اس کا ادراک بھی ہے لیکن کیا کیا جائے کوئی بھی ایسے حالات میں کچھ کرنے کو تیار نہیں۔ بس مجبور و بے کس ہو کر حالات سے سمجھوتا کیے ہوئے ہیں پھر انگور تو کھٹے ہی ہوں گے نا۔ گڈ مارننگ ''وقت'' میں ڈیلفینا کی دبنگ انٹری علی کو کہیں سے کہیں پہنچا دے گی اور وہ ایک نئی دنیا میں داخل ہوگا۔ باقی علی نے لیونارڈو کے ساتھی کی درگت بنا کے اسے اگلے جہان میں پہنچا دیا اور شارو پھر بھی ابھی نہیں ملی۔ ''وقت'' کی بساط ہے بس ''وقت'' کو پڑھو ''وقت'' کو جاننے کے لیے۔ واقعات و شواہد چیخ چیخ کر اعلان کر رہے تھے کہ وحید خان بے گناہ ہے۔ استغاثہ کے گواہ بھی شروع ہی سے دروغ گوئی سے کام لے رہے تھے پھر بھی کیس کو اتنا لمبا کر دیا۔ عدالتی کارروائیاں بھی مہینوں چلتی رہتی ہیں۔ خیر ''عزت دار'' رہا ہوا اور بیگ صاحب کے وکالتی داؤ پیچ بھی دلچسپی کے ساتھ زبردست رہے۔ جرنلسٹ عمران تو اپنی حماقتوں پر غصہ ہی کرتا رہا اور انسپکٹر شہلا اس سے دو ہاتھ آگے نکلی۔ آخر پولیس والی جو ٹھہری۔ باقی عمران نے جو ویڈیو بنا کے مصیبتیں جھیلیں اور کوما میں جانے کی اداکاری اور ساتھ میں شہلا کا کردار بھی دلچسپ اور قابلِ ستائش رہا اور پولیس مین حسن جاوید، شاکر اور عبدالوحید اپنے انجام کو پہنچے۔ دوستو! خدا کی راہ اس وقت تک نہیں کھلتی، جب تک کوئی انسان تقویٰ کو اپنا شعار نہ بنالے۔ کوزہ گر درویش، حضرت امیر کلالؒ کے حالاتِ زندگی مشعلِ راہ تھے اور آپ کی پُراثر نصیحتیں بھی دلوں میں گھر کرنے والی کہ ہر ایک کے لیے بے مثال۔ بہت عمدہ تحریر تھی۔ محفل شعروسخن سے محمد رشید سیال، صبا سحر اور نعیم احمد کے اشعار بہت پیارے لگے۔''

✠ تحریم شاہ، لاہور کینٹ سے خط لکھ رہی ہیں۔ ''ٹائٹل گرل تو تیار کھڑی کہیں جانے کی تیاری میں لگتی ہے۔ شاید اپنے محبوب سے ملنے کے لیے جو پیچھے کھڑا انہی کا انتظار کر رہا ہے۔ اس لیے انہیں ایک دوسرے کے ساتھ مصروف چھوڑ کر آگے بڑھی تو جون ایلیا سے ٹکرا گئی۔ وہ ہمیشہ کی طرح دانش مندی کا خزانہ لیے کھڑے تھے اور ہم نے ان سے تھوڑا سا چن لیا۔ آج کل جو لوگ جمہوریت کے علم بردار بنے پھرتے ہیں انہیں تو شاید اس کی الف، ب بھی نہیں معلوم کہ جمہوریت حقیقت میں اعتبار کرنے کا اور ہر ایک کی برابری کا نام ہے لیکن وہ لوگ صرف اپنے آپ کو سب سے اعلیٰ اور سچا سمجھتے ہیں۔ بیشک ہم میں سے کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ ہم نے کبھی جھوٹ بولا ہی نہیں۔ جمہوریت یہی ہے کہ ہمیں ایک دوسرے پر اعتبار کر کے اطمینان سے ایک دوسرے کی بات سننی اور کہنی چاہیے نہ کہ الزام تراشی کرنی چاہیے۔ خیر سیاست کو چھوڑ کر اپنی محفل کی طرف آتے ہیں۔ میں مصروفیت کی وجہ سے پچھلے کئی ماہ محفل میں شرکت نہ کر سکی لیکن افسوس تو یہ ہے کہ کسی نے مجھے یاد ہی نہیں کیا۔ لیکن خوشی یہ ہے کہ ہم نہ سہی تو کیا ہوا، اس ماہ لاہور سے ہمارے بھائی، عامر خان آفریدی نے لاہوریوں کا نام بلند کر دیا۔ صدارت پر قبضہ جما کر ''لالہ'' آفریدی کی طرح پہلی ہی بال پر چھکا مار دیا۔ بہت مبارک ہو۔ ارے یہ کیا، واہ بھئی واہ آج تو وزارت پر بھی لاہوری ہی چھائے ہوئے ہیں۔ باقی سب کے تبصرے بھی اچھے رہے۔ اب آتے ہیں کہانیوں پر۔ شیش محل کافی تیز رفتاری سے چل رہی ہے۔ بس جلدی سے فاروق بھی کراچی پہنچ جائے۔ باقی سارے کردار تو وہاں اکٹھے ہو ہی گئے ہیں۔ ماروی ختم ہوگئی اور نئی قسط وار کہانی ''وقت'' ابھی شاید آہستہ آہستہ سسپنس اور ایکشن پکڑے گی کیونکہ فی الحال کوئی بڑا واقعہ نہیں ہوا۔ کھٹے انگور تو زبردست رہی۔ واقعی آج کل ہر چیز بناوٹی ہوگئی ہے لیکن بیچاری لومڑی پر بڑا ترس آیا۔ آخر میں انوکھی قربت درد بھری لاجواب کہانی۔ دھکا بس ایسی ہی عام سی تھی۔ کوئی خاص بات نہیں تھی سوائے اس کے جو برا کرتا ہے اسے برا انجام ہی ملتا ہے۔ دھیان واقعی والدین کے لیے سبق آموز کہانی کہ جیسا انہوں نے کیا ان کی اولاد بھی ویسا ہی سیکھتی ہے اور وہی کرتی ہے اس لیے جو ہم نہیں چاہتے کہ ہماری اولاد کرے، وہ ہمیں بھی نہیں کرنا چاہیے۔ کھوٹا سکہ بھی کبھی کبھار کام آجاتا ہے۔ وہ اور بات ہے کہ اس کے پاس عقل نہ ہو۔ جیسے کہ مارٹن کریگ۔ عورت کا انتقام بھی سسپنس بھری دلچسپ کہانی تھی۔''

✠ پائندہ خان سلیمان خیل، فیروز وٹواں ضلع شیخوپورہ سے شاملِ محفل ہیں'' اللہ تعالیٰ آپ کے ادارے کو دن دوگنی رات چوگنی ترقی عطا کرے۔ اس ماہ سسپنس دو دن کی تاخیر سے ملا۔ سسپنس کا انتظار میں بڑی شدت سے کرتا ہوں اور یہ انتظار مجھے انتہائی کوفت میں مبتلا کرتا ہے لیکن جب بھی سسپنس ملتا ہے تو طبیعت ایک دم تروتازہ ہوجاتی ہے۔ ماہِ مئی کا سسپنس ملا تو سب سے پہلے جون ایلیا صاحب کا انشائیہ ''اعتماد'' پڑھا۔ یقیناً اگر ہم دوسروں کے الفاظ میں سچائی تلاش کریں اور صرف اپنی ذات کو ہی سچائی کا منبع ثابت کرنے پر نہ تلیں تو اعتماد کی فضا پختہ بنیادوں پر قائم ہوتی ہے۔ جون صاحب کی بات جب بھی پڑھتا ہوں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاید کسی گاؤں کی چوپال میں حقہ پیتے ہوئے کسی سیانے بابے کی باتیں سن رہا ہوں۔ بڑوں سے سنا ہے کہ پرانے وقتوں میں بابے بڑی پُرحکمت دانشمندانہ باتیں کرتے تھے جن میں سے اکثر ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گئی ہیں۔ خیر اس کے بعد خطوط کی محفل میں پہنچے تو عامر خان آفریدی کو پہلی انٹری کے ساتھ کرسیِ صدارت پر براجمان پایا۔ خوش آمدید عامر صاحب۔ گزشتہ ماہ کرسیِ صدارت کا اعزاز پانے والی طاہرہ گلزار اس مرتبہ محفل سے غائب ہیں۔ فضا شاہ ماڈل ٹاؤن لاہور بھی محفل میں غیر حاضر ہیں۔ کرسیِ وزارت پر عبدالجبار

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

رومی صاحب فائز ہیں۔ رومی صاحب کا تبصرہ بڑا عمدہ ہے۔ ناہید یوسف کا طویل تبصرہ بھی کافی جاندار ہے۔ اشفاق شاہین، بابر عباس اور زرین آفریدی کے تبصرے بھی عمدہ اور جاندار تھے۔ اس کے بعد ''فتح مکرر'' میں ڈاکٹر ساجد امجد صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ساجد امجد صاحب کی تحریر ہمیشہ دلچسپ اور جاندار ہوتی ہے۔ اس مرتبہ انہوں نے سبکتگین کے بارے میں لکھ کر ہماری معلومات میں اضافہ کیا۔ ایک ہرنی کی دعا نے سبکتگین کو غلامی سے تختِ شاہی تک پہنچا دیا۔ سلطان سبکتگین صحیح معنوں میں مردِ مجاہد اور کامل مسلمان تھا۔ اس کے بیٹے سلطان محمود کی زندگی بھی ہمیشہ جہاد کے لیے وقف رہی۔ آپ سے گزارش ہے کہ اگلی مرتبہ سیتاپوری صاحب کی تحریر شامل کی جائے کیونکہ سسپنس کے ابتدائی صفحات میں ان کی تحریر چار چاند لگا دیتی ہے۔ منظر امام صاحب کی تحریر ''کھٹے انگور'' انتہائی دلچسپ تحریر تھی۔ بے چاری لومڑی انگور حاصل کر کے بھی خالی ہاتھ رہی۔ جس طرح لڑکی کے بال مصنوعی تھے اور انگور پلاسٹک کے تھے، اسی طرح اب تو ہر چیز مصنوعی اور ملاوٹ بھری ہوگئی ہے۔ دفتروں، گھروں اور عمارتوں میں مصنوعی پودے جن پر مصنوعی پھل لگے ہوتے ہیں اور پلاسٹک کے پھول ہوتے ہیں۔ ہماری زندگی تصنع اور بناوٹ سے بھری ہوئی ہے۔ میرے پاس پرانے سسپنس اور سرگزشت کافی تعداد میں ہیں کیونکہ میں کافی سالوں سے سسپنس پڑھ رہا ہوں اور ہر ماہ کا ڈائجسٹ محفوظ کرتا ہوں۔ دوست احباب مذاق کرتے ہیں اور کہتے ہیں یار خان، کیسے خبطی انسان ہو، یہ کتابیں اور پرانے سسپنس اور سرگزشت کا ڈھیر تم نے لگا رکھا ہے، ان کے علاوہ بھی تفریحِ طبع اور فارغ وقت گزارنے کے اسباب ہیں۔ انٹرنیٹ ہے، فیس بک ہے اور بھی جدید ذرائع ہیں۔ تو میں ان سے کہتا ہوں کہ میں تصنع اور بناوٹ سے بھرپور چیزوں سے بیزار ہوں۔ یہ کتابیں، سسپنس اور سرگزشت کا ڈھیر ہی میرا قیمتی اثاثہ ہے۔ (بہت خوب...... آپ نے درست کہا۔ کتابیں اثاثے سے کم نہیں ہوتیں)۔ خیر بات کہاں چلی گئی۔ ''عزت دار'' میں جس طرح بیگ صاحب نے خالد مقبول، اے جی اور شگفتہ کے جرم کو عیاں کیا، وہ قابلِ تحسین ہے۔ بیگ صاحب نے بے شمار گناہوں کو پھانسی کے پھندے سے بچایا۔ یقیناً یہ بڑا نیکی کا کام ہے۔ اللہ انہیں جزائے خیر دے۔ بیگ صاحب کی جگہ کوئی اور وکیل ہوتا تو وحید خان کو بھی ناحق سزا ہو جاتی اور بے چاری سعدیہ کے قاتل بھی گرفت میں نہ آتے۔ ''کوزہ گر درویش'' میں ضیا تسنیم بلگرامی نے ہمارے ایمان کو جلا بخشی۔ امیر کلال کے حالاتِ زندگی پڑھ کر ایمان تازہ ہوگیا۔ امیر کلال پر تیمور کے رعب کا کوئی اثر نہ ہوا۔ شیر جیسے درندے نے بھی آپ کا احترام کیا۔ اولیاء کی کرامات تو بہت ساری ہیں جو کہ تحریروں کے ذریعے ہم تک پہنچتی ہیں۔ ضیا تسنیم بلگرامی کا شکریہ کہ ہمیں اولیاء کرام کے ایمان افروز واقعات پڑھنے کو ملتے ہیں۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی تحریر ''انوکھی قربت'' بھی ایک لازوال تحریر ہے۔ اس میں ہمیں ایک طرف تو ڈاکٹر ہیملن اور ڈاکٹر کیتھرین جیسے کرداروں کا پتا چلتا ہے جن کی انسانیت سے بے لوث اور بے پناہ محبت اور جذبہ خدمت انسانیت کے اعلیٰ سے اعلیٰ اخلاق و ایثار کا نمونہ بلکہ اس سے بھی زیادہ ہے کیونکہ اس کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔ حلیمہ کی بیماری کے باوجود عمر نے اس سے محبت و وفا قائم رکھی بلکہ جان دے کر ہمیشہ کے لیے زندہ ہوگیا۔ یہ بھی محبت کی ایک اعلیٰ مثال ہے۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی ایسی تحریریں دکھی انسانیت کی خدمت کا سبق دیتی ہیں جو کہ یہ خود خدمت کا ایک اعلیٰ درجہ ہے۔ ''دھکا'' ثمر عباس کی بہترین تحریر ہے۔ ساندرہ اگر منفی رویے کے بجائے اگر مثبت سوچ رکھتی تو کامیاب ہو جاتی۔ پروفیسر کی جگہ ایملی کا تقرر ہوگیا۔ ساندرہ پروفیسر کی موت کی ذمے دار ہو کر بھی گوہرِ مقصود حاصل نہ کر سکی۔ ''تعزیت'' میں بھی نواز اگر مثبت رویہ اختیار کرتا تو اسے مولوی صاحب کی بیٹی زینب بھی مل جاتی اور نہ تو وہ اصل گل اور نائی کے بیٹے کا قاتل بنتا نہ زینب جان سے جاتی اور نہ خود ہجوم کے ہاتھوں پٹتا۔ ''دھکا'' اور ''تعزیت'' کا حاصلِ سبق تقریباً ایک جیسا ہے۔ یعنی منفی اقدام سے حاصل کچھ نہیں ہوتا بلکہ معاشرے میں مزید خرابیوں اور نقصان کا باعث بنتے ہیں۔ علی اختر کی ''دھیان'' اچھی تحریر ہے۔ ہمارے معاشرے میں المیہ یہی ہے کہ ہم جو کچھ کریں اس پر تو کوئی ندامت نہیں لیکن جب اولاد جوان ہو جائے تو ان سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ جو کچھ غلط ہم سے سرزد ہو چکا ہے، وہ ہماری اولاد اختیار نہ کرے۔ حالانکہ اگر مغرب میں بھی ہم اگر بے راہ روی کے بجائے اپنے کردار کو بے داغ رکھیں تو اپنی اولاد کو بھی نصیحت کرنے کا جواز ہوتا ہے اور اس کا یقیناً اثر بھی ہوتا ہے۔ ثنا نے آخر میں ملک جانے کی بات کر کے اپنے باپ کو دورنگی اور منافقت کے نقصانات کا آئینہ دکھا دیا اور اپنی مثبت سوچ اور کھرے پن کا ثبوت دیا۔ ''عورت کا انتقام'' شاکر لطیف کی دلچسپ، سسپنس سے بھرپور اور سبق آموز تحریر ہے۔ آخر میں پتا چلتا ہے کہ سلطان احمد مدیرِ اعلیٰ ہے اور اس عورت کا خاوند ہوتا ہے۔ اپنے ماضی کی غلطی کے باعث سلطان احمد اپنے بیٹے بابو کی گولی کا نشانہ بنتا ہے۔ یہ بات باعثِ عبرت ہے۔ آغاز تجسس سے بھرپور ہے اور آخر میں سبق بھی موجود ہے، یہ تحریر یقیناً دلچسپ ہے۔ کترنیں بھی

سانحہ ارتحال

ڈائجسٹ پڑھنے والوں کے ہردلعزیز قلم کار اور اردو ادب کو سیکڑوں شہرۂ آفاق ناول دینے والے معروف مصنف ایم اے راحت 24-04-2017 کی دوپہر برین ٹیومر کے عارضے میں مبتلا ہو کر اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے (انا للہ وانا الیہ راجعون)۔ مرحوم جاسوسی تحریروں میں ابنِ صفی اور تاریخی ادب میں جناب نسیم حجازی سے متاثر تھے۔ آپ نے تقریباً ڈیڑھ ہزار کہانیاں تخلیق کیں جن میں دیومالائی تخلیقات اور بچوں کے لیے بھی بے شمار کہانیاں شامل ہیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے ناول اور ان کے کرداروں کی قسمت لکھنا ایم اے راحت کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ ہر کردار کو جزئیات کے ساتھ لکھنا آپ کا کمال تھا۔ دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور سوگواران کو صبرِ جمیل عطا کرے۔ ادارہ اس غم میں برابر کا شریک ہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

کافی دلچسپ تھیں۔ شیش محل، وقت اور آخری صفحات کی تحریر کو میں آخری دنوں کے لیے بچا کر رکھتا ہوں۔ جب سسپنس لیٹ ہوجاتا ہے تو ان کو پڑھ کر اپنے انتظار کی کوفت ختم کرتا ہوں۔ سسپنس کے تمام اسٹاف اور لکھنے والوں اور قارئین جو کہ ایک فیملی کے مانند ہیں، سب مبارکباد کے مستحق ہیں۔ جو کہ اس دور میں جبکہ ہر جگہ الیکٹرانک میڈیا، سوشل میڈیا، انٹرنیٹ اور دیگر خرافات کا دور دورہ ہے ایسے وقت میں سسپنس اور سرگزشت جیسے پرچوں سے وابستہ ہونا مثبت سوچ ہونے کی عکاسی کرتا ہے۔ (رسالے کی پسندیدگی کا بے حد شکریہ)۔''

✠ ناہید یوسف اسلام آباد سے محفل میں شامل ہو رہی ہیں۔ ''اف...... یہ گھر کی صفائی ستھرائی بھی اک کارِ محال ہے۔ آج ہم نے سوچا کہ جلدی جلدی سارا کام نمٹا کر سسپنس کا دیدار کریں گے لیکن اف...... بس ایک چیز کو چھیڑنے کی دیر تھی کہ پورا گھر الٹ پلٹ کے رکھ دیا۔ خیر اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ شوہر صاحب وقت سے پہلے ہی گھر پہنچ گئے اور پھر ہم دونوں نے مل کے جلدی جلدی سب چیزیں سمیٹیں، تھک ہار کے تھوڑی دیر آرام کیا پھر اس کے بعد چائے سے خود کو تر و تازہ کرنے کی کوشش کی اور اس میں کافی حد تک کامیابی بھی ہوئی۔ پھر سوچا کہ تسلسل نہ ٹوٹے اس لیے لگے ہاتھوں رات کا کھانا بھی تیار کر ڈالا۔ اب کہیں جا کر ہم نے سسپنس تھاما۔ واہ بھئی...... اس دفعہ فہرست دیکھ کر خوشی سے نہال ہو گئے کیونکہ ہمارے فیورٹ رائٹر سلیم فاروقی مرحوم کی کہانی جو لگی ہوئی تھی۔ اللہ تعالیٰ فاروقی صاحب کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین۔ سلیم فاروقی کی بھنور واقعی اسمِ بامسمّیٰ تھی۔ کہانی نے مختلف مواقع پر ہمارے دل کی دھڑکنیں زیر و زبر کیں تاہم اینڈ میں جیت سچائی کی ہوئی...... ویلڈن۔ آپ سے گزارش ہے کہ ہمارے ایک اور فیورٹ رائٹر طاہر جاوید مغل کی کوئی طویل کہانی لگائیں اور پھر ان کا کوئی سلسلہ شروع کریں کیونکہ طاہر صاحب کے قلم کا جادو سر چڑھ کے بولتا ہے اور ایک خلقت (قارئین) ان کے قلم سے نکلے الفاظ کے سحر میں کھو جاتے ہیں۔ خیر، امید کرتے ہیں ہماری درخواست پر غور کیا جائے گا۔ انشائیہ میں جون ایلیا اعتماد کے بارے میں گفتگو کرتے نظر آئے اور انہوں نے ایک دوسرے پر اعتماد کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ پھر پہنچے ڈاکٹر ساجد امجد صاحب کی تاریخی کہانی فتح مکرر پر...... اوہ! پھر تھوڑی دیر کا وقفہ لینا پڑ گیا یہاں کیونکہ شوہر صاحب کو بھوک نے ستانا شروع کر دیا تھا۔ خیر کھانے سے فراغت کے بعد بے خوف و خطر اور کسی در اندازی کے واہمے کے بغیر سسپنس کو دوبارہ تھام لیا۔ کہانی میں بہت سے نشیب و فراز تھے۔ غلام مندی سے اپنا سفر شروع کرنے والا غلام...... بادشاہ کے تخت پر براجمان ہوا۔ سبکتگین نے عدل و انصاف کی ترویج میں بڑا حصہ لیا اور ظلم کی بیخ کنی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ کافی معلوماتی تحریر تھی۔ مزہ آ گیا۔ پھر شیش محل کی طرف دوڑ پڑے۔ واہ جی اسماجی! کہانی کو کافی تیز ترین کر دیا ہے۔ جولیٹ اسد اللہ سے جا ملی، بہت خوشی ہوئی اور چاند بانو کو بھی اپنے ساتھ گھر میں لے آئی۔ زبردست۔ ادھر فاروق ربن کے قاتلوں سے نبرد آزما ہے۔ آخری قاتل کے خاتمے کے لیے جان کی بازی لگائی ہوئی ہے۔ کہانی نے ہمیں پلکیں جھپکنے نہیں دیں۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار رہے گا۔ شیر شاہ سید صاحب کی تحاریر مختصر مگر جامع اور پُراثر ہوتی ہیں۔ انوکھی قربت پڑھ کر محبت کی گہرائی اور سچائی کا اندازہ ہوا۔ عمر نے محبت کی اعلیٰ مثال قائم کی۔ سلیم انور، منظر امام، محمد الیاس کی کہانیاں بھی بہتر رہیں۔ ثمر عباس کی دھکا بہت شاندار کہانی تھی۔ مرزا امجد بیگ عزت دار کے ساتھ حاضر ہوئے۔ تاہم کہانی نے کوئی خاص تاثر قائم نہ کیا۔ وہی عدالتی جھمیلے۔ ہم تو بور ہو گئے۔ خیر حسام بٹ کی وقت نے بوریت میں کمی کی۔ منظر امام، تنویر ریاض، فوزیہ طیبہ، علی اختر کی کہانیاں بہترین رہیں۔ مجموعی طور پر سسپنس نے پورے ماہ کی تھکن اتار دی۔ بہت اچھا رہا۔ شاکر لطیف کی کہانی رہ گئی پڑھنے سے۔ ٹائم نہیں ہے ورنہ اس پر بھی تبصرہ کرتے۔ اللہ پاک ادارہ جاسوسی کو مزید ترقی عطا فرمائے۔ آمین۔''

✠ مہتاب احمد، حیدرآباد سے خط لکھ رہے ہیں۔ ''اس دفعہ تو گرمی نے دماغ پلپلا کر ڈالا ہے۔ کچھ سمجھ ہی نہیں آ رہا کہ کیا کریں، کیا نہ کریں۔ حواس باختہ سے ہوئے کام پر جاتے ہیں اور نڈھال ہو کر گھر لوٹتے ہیں۔ لیکن اس حالت میں بھی سسپنس کا خیال ایک لمحے کے لیے دل و دماغ سے محو نہ ہوا۔ بس تھوڑا مصروفیت نے قدم جکڑے رکھے لیکن ہم نے بھی ہمت نہ ہاری اور تپتی دھوپ میں سسپنس لینے کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ مصروفیت کو بھی خاطر میں نہ لائے اور سسپنس تھامے کشاں کشاں گھر کی طرف چل پڑے۔ راستے ہی میں فہرست پر نگاہ دوڑانی شروع کر دی۔ اس چکر میں ایک دو جگہ ٹھوکر کھا کر گرنے سے بھی بچے۔ خیر، گھر پہنچ کے بیگم صاحبہ کو چائے بنانے کا کہا اور خود فریش ہو کر کرسی پر بیٹھ گئے۔ سسپنس کی فہرست کئی ناموں سے بھری پڑی تھی۔ اپنے پسندیدہ رائٹرز کے نام دیکھے تو دل میں لڈو پھوٹنے لگے۔ اسی دوران میں چائے آ گئی تو مزہ دوبالا ہو گیا۔ بس پھر کیا تھا، چائے کے ساتھ ساتھ سب سے پہلے اپنے من پسند رائٹر کی کہانی ڈھونڈی۔ ویسے تو ہمیں تمام رائٹرز ہی اچھے لگتے ہیں اور ایمانداری کی بات یہ ہے کہ ہر رائٹر ہی بہت محنت سے ایک تحریر لکھتا ہے۔ جس کے لیے الفاظ کا چناؤ، کہانی، کردار غرضیکہ تمام چیزوں کا خیال رکھ کر قاری کی دلچسپی کا سامان مہیا کرتا ہے۔ سب سے پہلے اپنے موسٹ فیورٹ لکھاری ڈاکٹر ساجد امجد کی فتح مکرر سے آغاز کیا۔ ساجد صاحب تاریخی موضوع کو اتنے اچھے پیرائے میں بیان کرتے ہیں کہ پڑھ کے کہیں بھی بیزاری کا احساس نہیں ہوتا اور تاریخ سے بھی آگاہی ہوتی ہے۔ اس دفعہ سبکتگین کے بارے میں لکھا۔ اس کی دانش مندی اور بہادری کی بدولت اسے مسندِ حکومت عطا ہوئی۔ حالانکہ وہ ایک غلام تھا۔ بہت ہی زبردست تحریر تھی۔ یقین جانیے ہم بہت محظوظ ہوئے۔ اس کے بعد حسام بٹ صاحب کی وقت کو ''وقت'' دیا۔ یہ ہمارا ذاتی خیال ہے کہ فی الحال ابھی کہانی میں ایسی کوئی خاص بات نظر نہیں آ رہی۔ مطلب یہ کہ کہانی اپنی جانب توجہ مبذول کرانے سے قاصر ہے۔ ہو سکتا ہے آگے چل کر کہانی میں دلچسپی پیدا ہو۔ اس کے بعد دوسرا سلسلہ شیش محل پڑھا۔ واقعی اسما قادری نے جس طرح آغاز کیا تھا، یعنی کہانی بہت سست رفتاری سے چل رہی تھی مگر اب کہانی کی رفتار اتنی ہی تیز ہے۔ کہانی میں ایکشن بھی بھرپور ہو گیا ہے۔ ابھی کہانی مزید دلچسپی کی طرف بڑھ رہی ہے۔ ویلڈن اسماجی۔ سلیم فاروقی مرحوم کی کہانی

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

بھنور بس ٹھیک لگی۔ چھوٹی کہانیوں میں ہمیں علی اختر کی دھیان اور ڈاکٹر شیر شاہ سید کی انوکھی قربت نے کافی متاثر کیا۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید واقعات میں حقیقت کا رنگ بھر دیتے ہیں۔ بہرحال کہانی پڑھ کر آنکھیں نم ہوگئیں۔ واقعی اس دنیا میں محبت کرنے والے باقی ہیں اور انہی کے دم سے دنیا میں اچھائی کا وجود ہے۔ شاکر لطیف کی عورت کا انتقام بھی بہت زبردست لگی ہمیں۔ عورت کمزور سہی لیکن جب تہیہ کرلے تو بڑے سے بڑا کام سرانجام دے لیتی ہے۔ ضیا تسنیم بلگرامی کی کوزہ گر درویش میں اولیاء اللہ کے ایمان افروز واقعات سے مستفید ہوئے۔ فوزیہ طیبہ کی کھوٹا سکہ بھی اپنا رنگ جمانے میں کامیاب ہوئی۔ واقعی سچ ہے کہ بعض دفعہ کھوٹا سکہ بھی کام آجاتا ہے۔ باقی رسالہ زیرِ مطالعہ ہے مگر ہم بغیر دیکھے، بغیر پڑھے کہہ سکتے ہیں کہ دیگر چیزیں بھی معیاری ہوں گی کیونکہ ادارہ جاسوسی نام ہے معیار کا......!‘‘

✠ مہیش کمار کا سبی، بلوچستان سے پچھلے شمارے پر تبصرہ۔ ’’محفلِ یاراں میں اپنا تبصرہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی اور اس سے زیادہ خوشی اس وقت ہوئی جب اپنا نام اپنے بلوچستان کے ساتھ دیکھا (شکریہ) تاریخ کے حوالے سے ایک بار پھر آپ کا شکر گزار ہوں میری ایک فرمائش ہے کہ دنیا کی تمام قومیں اپنی اپنی تاریخ رکھتی ہیں، ان پر بھی تھوڑی نظر رکھیں اور ہمارے علم میں بھی اضافہ فرمائیں۔ معما کے لیے معما پرفیکٹ عنوان تھا۔ کرشمہ کی کاریگری بہت دیکھی۔ چارلی اور بین دونوں اپنے اپنے کام میں ماہر لگے لیکن عقل بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ مہتاب خان کی کاوش بہت بہترین لگی اور انہوں نے مجھے ایک گانا بھی یاد دلا دیا (امیروں کی شام غریبوں کے نام) ملک صفدر حیات نے مجھے کہانی کے آخر تک اپنے سحر میں جکڑے رکھا اور دو بے گناہوں کی قیمتی جانوں کا افسوس بھی ہوا۔ رچرڈ کا بدلہ نہ لینا ہی بہترین انتقام تھا، کیونکہ اعتماد کا ختم ہونا ہی انسان کی حقیقی موت ہے۔ منظر امام صاحب بہ ظاہر تو تھوڑے سے الفاظ کی تبدیلی سے بہترین بنا سکتے تھے کہ شوہر نہیں بلکہ بیوی دھکا دے کر شوہر کو کشتی میں سوار کرا دیتی، بہرحال فنٹاسٹک۔ عروۃ الوثقیٰ منفرد اور خوبصورت نام تھا لیکن اس کے اوپر ایک شیطان کا قبضہ تھا۔ ایڈووکیٹ...... نے اس کو اپنی صحیح جگہ پہنچا دیا۔ باعث زحمت ایک عقل مندانہ اور دلچسپ کہانی تھی۔ وقت کے لیے وقت نہ مل سکا۔ نہیں تو تبصرہ لکھنے کا وقت نکل جاتا۔ ارسل اور بخت کی دوستی بے مثال رہی لیکن بخت جذبات میں بہہ بلکہ ڈوب گیا اور ارسل کو ایک خطرناک بیماری میں مبتلا کر دیا لیکن ارسل نے دوستی کا حق پورا پورا ادا کیا۔‘‘

✠ رانا حبیب الرحمٰن کی ٹوبہ ٹیک سنگھ سے پچھلے شمارے پر خیال آرائی۔ ’’اپریل 2017ء کا سسپنس ڈائجسٹ 22 تاریخ کو سزائے موت کے سیل کے باہر والے لان میں دو لڑکوں کے درمیان اخبارِ جہاں کے ساتھ پڑا ہوا نظر آ گیا۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ تقریباً دونوں ہی ان پڑھ تھے۔ اخبارِ جہاں پر صنفِ نازک جو صرف دیکھنے میں لگتی ہیں، ہوتی نہیں، کو دیکھنے میں مصروف تھے۔ چپکے سے قریب جا کر سسپنس اٹھایا اور اپنے سیل کے اندر غائب ہوگئے۔ ادارے سے ناراضگی تو پہلے سے یوں کی توں ہے اور دوستوں سے بھی لیکن ان دونوں سے محبت میں کمی ابھی تک نہیں آئی۔ اسی چیز کو مدِنظر رکھتے ہوئے حنا عروج مرحومہ کی ہمشیرہ اور سسپنس کی ایڈیٹر یمنیٰ احمد کے ہاتھوں میں سے ہوتے ہوئے اپنے پیارے سے دوستوں کی محفل میں آن وارد ہوئے۔ یوں تو ہم خود پرانے ہی ہیں مگر ہمارا آنا صرف مہمانوں کی طرح ہی ہوتا ہے اس لیے پرانے دوست جانتے ہیں کہ نئے شامل ہونے والے اور والیوں کے لیے ہم بالکل نئے ہیں۔ ادارے کے لوگ اور تمام قارئین یا لکھاری ایمانداری سے بتائیں کہ چاروں ڈائجسٹوں کے سرورق نہایت ہی بے جان نہیں ہوتے۔ اگر ان میں جان یعنی زندگی کی کچھ رمق موجود کر دی جائے تو کیا قیامت وقت سے پہلے ہی آ جائے گی۔ خدا کا خوف کر کے سرورق کی تصویروں میں زندگی نظر آئے۔ وقت سلسلہ وار کہانی کی پہلی قسط بہترین تھی۔ شروعات میں ہی بہت سی معلومات سے بھرپور قسط تھی۔ میرے خیال میں تو ایسی ہی کہانیوں میں رنگینی، سنگینی، معلومات وغیرہ سب چیزیں ہونی چاہئیں مگر اب تو ٹی وی ڈرامے، فلمیں اور کہانیاں صرف اور صرف گھریلو مسئلوں کو ہی اجاگر کرتی نظر آتی ہیں۔ شیش محل کی قسط بھی بہترین تھی۔ گولو کا کردار ختم کر دیا گیا بلکہ اب تو آہستہ آہستہ کئی کرداروں کو ختم کر کے اسٹوری کو سمیٹا جا رہا ہے۔ فنکار کہانی میں یہ سبق موجود تھا کہ اٹھ باندھ کمر کیا ڈرتا ہے پھر دیکھ خدا کیا کرتا ہے۔ کافرِ نعمت میں قارئین کے لیے سبق آموز اور عبرت آموز تاریخی واقعات تھے۔ کرشمہ، شاہکار اور ٹوٹے ہوئے لوگ بھی اچھی کہانیاں تھیں۔ مراسلوں میں وزیر محمد خان، سمیرا سعید، ریاض بٹ اور رضوان تنولی کے مراسلے بھی بہترین تھے۔ شعر و سخن میں جاوید اختر رانا، ناہید یوسف، گلناز رئیس، قدرت اللہ نیازی، فضا شاہ لاہوری، حنظلہ شاہد کے انتخاب اچھے تھے۔ محفل میں ہماری بہت پیاری اور دلی دوست طاہرہ گلزار کا تبصرہ پہلے نمبر پر مبارکاں ہو۔ اللہ آپ کو سدا ہنستی مسکراتی چہچہاتی رکھے، آمین۔ محمد خواجہ کورنگی شہباز ناز بھی حاضر تھے۔ زبیر ساگر بھئی کسی سے کیوں گلہ کروں۔ آپ سے تو بہت زیادہ گلہ ہے۔ آپ تو میرے شہر گوجرہ کے رہنے والے ہیں پھر...... انکل بابر عباس دونوں اولادوں کی مبارک۔ مہیش کمار جی آیاں نوں کہندے آں۔ فضا شاہ بھی بہت خوش نظر آئیں۔ ابرار احمد ساقی بہت دیر بعد۔ انعم کمال بلیک لسٹ میں، اف گھبرانا نہیں۔ مرحا گل اور رعنا گل بھی غائب تھیں۔ حالانکہ پتا ہے ہمارا دل اداس ہوتا ہے۔ آخر میں قارئین سے ایک سوال...... سب پر جواب دینا لازم ہے کہ شادی محبت کی کامیاب ہے یا ارینج میرج؟ اور وٹہ سٹہ کی شادی کامیاب ہوتی ہے یا کہ دوسری؟ سوال کا جواب سب ضرور دیں۔‘‘ (بھائی اس کسوٹی کی ضرورت کیونکر پیش آ گئی؟ خیریت تو ہے نا؟)

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔

سید جاوید، گلشن اقبال کراچی۔ عنبرین لاشاری، لندن۔ پلوشہ خان، مانسہرہ۔ صبا سحر، کراچی۔ نادیہ اسلم، نواب شاہ۔ فرحان شیخ، ملتان۔ عاصم خان، کراچی۔ انعم کمال، حیدرآباد۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

شکن در شکن

ڈاکٹر ساجد امجد

طبقہ کوئی بھی ہو... حق وراثت تمام طبقات میں یکساں اصولوں پر رائج ہے... خواہ بادشاہ ہو یا ادنیٰ غلام... "تلوار خط سے زیادہ سچی اور مضبوط ہوتی ہے..." حلق تلفی کے تناظر میں مسعود کا اپنے باپ محمود غزنوی کو یہ کھرا جواب تاریخ میں اپنا ایک مقام بنا گیا۔ اگرچہ محمود غزنوی کو بخوبی اندازہ تھا کہ نظام حکومت چھوٹے بیٹے کے بس کا روگ نہیں، اس کے باوجود اس نے ایک غلط فیصلے کو ہوا دی جس کے نتیجے میں اسی طرح بغاوت کو ابھرنا اور تباہی پھیلانا تھی۔ جس طرح محمود غزنوی کے سترہ حملے مملکت میں اضافے کا سبب بنے اسی طرح مسعود کا ایک باغیانہ حملہ بکھری ہوئی مملکت کو منظم کرنے کی وجہ بن گیا۔ کوئی چھوٹا سا گھر ہو یا ایک وسیع مملکت... نظام تو ایک ہی طرح سے چلتا ہے یہ اور بات منصف اور منتظم کتنی اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ورنہ تاریخ نے ثابت کر دیا ہے کہ شکن در شکن کا سلسلہ یونہی دراز ہوتا رہا ہے۔ ماضی کے گمشدہ کردار آج بھی اپنے حالات و واقعات سے آنے والی نسلوں کو عبرت کا سامان مہیا کیے ہوئے ہیں۔

ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

خلیفہ بغداد کا قاصد ابھی ابھی خط لے کر پہنچا تھا۔ محمود اس وقت اپنی بارگاہ میں بیٹھا ہوا تھا۔ غلام ہاتھ باندھے سامنے کھڑے تھے اور دربار کے سامنے کوہ پیکر ہاتھیوں کی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ قاصد نے باریابی کی اجازت ملنے کے بعد نشست سنبھالی تھی کہ حاجب نے شہزادہ مسعود کے حاضر ہونے کی اطلاع دی۔

''ان سے کہنا، اس وقت باریابی کا محل نہیں۔ پھر کسی وقت حاضر ہوں۔''

حاجب نے یہ جواب سن کر دروازے سے باہر قدم نکالا ہی تھا کہ معاملاتِ خارجہ کے وزیر ابونصر روزنی اندر داخل ہوئے۔ تسلیمات بجالانے کے بعد ایک نظر قاصد پر ڈالی اور اس وقت تک نہیں بیٹھے جب تک محمود کی چشمِ التفات نے انہیں سہارا نہیں دے دیا۔

''خلیفہ بغداد کی جانب سے آنے والے قاصد نے مجھے مجبور کیا کہ میں آپ کو حاضری کی زحمت دوں۔''

''غلام حاضر ہے۔''

''ذرا اس خط کو کھول کر پڑھیے اور جو مناسب جواب ہو، وہ تحریر کیجیے۔''

''بے شک سلطان معظم۔'' ابونصر روزنی نے خط قاصد کے ہاتھ سے لے لیا۔ ابھی وہ خط کی مہر کھول ہی رہا تھا کہ حاجب پھر اندر آیا۔ اس کی اس ناوقت حاضری پر محمود کے ماتھے پر شکنیں ابھر آئیں۔

''جلدی کہو کیا کہنا ہے؟''

''شہزادہ امیر محمد آپ سے ملنے کے متمنی ہیں۔ میں نے بہت عذر پیش کیا لیکن.....''

''عذر پیش کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ ہماری طرف سے باریابی کی اجازت ہے۔''

حاجب الٹے قدموں لوٹ گیا۔

شہزادہ امیر محمد نے اندر آ کر ایک مرتبہ پھر اجازت طلب کی۔ آگے بڑھ کر باپ کے ہاتھ کو بوسہ دیا اور خاموشی سے ایک طرف بیٹھ گیا۔

''آپ کیوں رک گئے۔ خط پڑھیے ہم ہمہ تن گوش ہیں۔''

''حضور! میں حیران ہوں کہ کیا پڑھوں اور کیا مطلب اخذ کروں۔''

''ایسی کیا عبارت مرقوم ہے جس کا مطلب کشید کرنے میں آپ کو تامل ہے؟''

''حضور! بسم اللہ کے بعد چند سطور حروف مقطعات الم۔ الم میں لکھی ہوئی ہیں اور ان سطور میں لکھا ہے، الحمدللہ

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

Downloaded From Paksociety.com

رب العالمین والصلوۃ علیہ رسولہ وآلہ اجمعین۔''

اس عجیب وغریب خط کو پڑھ کر اور سن کر محمود کو حیرانی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا۔ قرآن مجید کی وہ تمام آیات جن کا ان مقطعات سے کچھ بھی تعلق تھا، وہ سب پڑھی گئیں اور ان کے مفاہیم ومطالب پر غور کیا گیا لیکن کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ اس وقت وہاں خواجہ ابوبکر قستانی بھی موجود تھے۔ انہیں ابھی محمود کی بارگاہ میں زیادہ رسوخ حاصل نہیں ہوا تھا اس لیے وہ خاموش بیٹھے تھے۔ جب کچھ دیر گزر گئی تو خواجہ ابوبکر نے کچھ بولنے کی ہمت کی۔

''جان کی امان پاؤں تو میں کچھ عرض کروں؟''

''اجازت ہے۔''

''کچھ عرصہ پہلے آپ نے خلیفہ بغداد سے گزارش کی تھی کہ ایک فرمان کے ذریعے سمرقند آپ کے حوالے کردیا جائے۔''

''ہاں۔''

''اس کے جواب میں خلیفہ نے نہایت سخت الفاظ میں آپ کو پیغام بھجوایا تھا۔''

''مجھے وہ بھی یاد ہے۔''

''تو پھر یہ بھی یاد ہوگا کہ آپ نے دارالخلافت کو ہزار ہا کوہ پیکر ہاتھیوں سے روندڈالنے کی دھمکی دی تھی۔''

''دی تو تھی۔''

''اس لیے ممکن ہے خلیفہ نے اس کے جواب میں سورۃ فیل کی طرف اشارہ کیا ہو۔''

سلطان محمود نے جب یہ بات سنی تو اس کا ہوش جاتا رہا۔ جب ہوش آیا تو بہت رویا اور خلیفہ بغداد کے قاصد سے معافی مانگی۔ اسے بیش قیمت تحائف دے کر بغداد روانہ کیا اور ابوبکر قستانی کو قیمتی خلعت دے کر اپنے امیروں کے گروہ میں شامل کرلیا۔

محمود نے بدمزہ ہوکر محفل برخاست کردی اور آرام کرنے چلا گیا۔ اس کا بیٹا محمد شاید کوئی بات کرنے آیا تھا لیکن محفل کا رنگ دیکھ کر چپکا بیٹھا رہا۔ محفل برخاست ہوئی تو خود بھی اٹھ کر چلا گیا۔

محمود پر اس خط کا ایسا اثر ہوا تھا کہ وہ دن بھر خواب گاہ سے باہر نہ نکلا۔ شام ہوئی تو خدام اور کنیزوں کے ہمراہ خانہ باغ کی سیر کو نکلا۔ یہ اتفاق تھا یا مسعود کی بے چینی اسے تلاش کرتی پھر رہی تھی کہ وہ بھی اسی باغ کی طرف نکل آیا۔ محمود اس وقت فارغ تھا اور تفریح کی غرض سے نکلا تھا لہٰذا مسعود کی آمد نے اس کی طبیعت پر خوشگوار اثر ڈالا۔ اس نے بیٹے کو خوش آمدید کہا اور چہل قدمی میں اسے بھی اپنے ساتھ شریک کرلیا۔ اب مسعود کو اپنے دل کا حال سنانے کا موقع مل گیا۔

''ابا جان، مجھے آپ سے ایک شکایت ہے۔''

''تمہیں شکایت کب نہیں ہوتی؟''

''آپ شکایت کا موقع دیتے ہیں تو شکایت ہوتی ہے۔''

''مسعود! بہادر ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ آدمی بدتمیز بھی ہو۔''

''اگر آپ سچائی کو بدتمیزی کہتے ہیں تو میں کیا کرسکتا ہوں۔''

''کون سی سچی بات ہے جو آپ کہنا چاہتے ہیں؟''

''جب میں نے آپ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہا تو آپ نے پیغام بھجوادیا کہ یہ ملاقات کا محل نہیں لیکن کچھ ہی دیر بعد امیر محمد آیا تو آپ نے طلب فرمالیا۔''

''بس یہی فرق ہے تم میں اور امیر محمد میں۔ اگر میں نے تمہیں بلالیا ہوتا اور امیر محمد کو منع کردیتا تو وہ ہرگز مجھ سے اس لہجے میں بات نہ کرتا۔ باپ کی مجبوری کو سمجھتا۔''

''میں وہ مجبوری ہی تو پوچھنا چاہتا ہوں۔''

''ضروری نہیں کہ میں اپنی مجبوری بھی بتاؤں۔''

مسعود کے چلے جانے کے بعد بہت دیر تک وہ امیر محمد اور مسعود کے درمیان موازنہ کرتا رہا۔ امیر محمد کتنا سعادت مند ہے۔ میں جو کچھ کہتا ہوں اس سے کبھی اختلاف نہیں کرتا۔ اس کے برخلاف مسعود کا حال یہ ہے کہ سچ کا سہارا لے کر گستاخی کی حدوں کو چھونے لگتا ہے۔ اس کی بہادری کو دیکھتے ہوئے میری نظروں میں تو اس کی عزت ہوسکتی ہے، دل میں نہیں۔

کسی ایک واقعے پر منحصر نہیں۔ مسعود بات بے بات محمود سے درشت کلامی کر بیٹھتا تھا۔ سلطان اسے سخت ناپسند کرنے لگا۔ اس ناپسندیدگی نے اس قدر طول کھینچا کہ وہ ہر طرح سے مسعود کی حق تلفی کرنے لگا۔ امیر محمد کو ہر طرح سے اہمیت دینے لگا۔ مسعود نے وجہ جاننے کی کوشش نہیں کی، وہ تو بس اس نتیجے پر پہنچا کہ باپ اس کے بھائی امیر محمد کو زیادہ چاہتا ہے۔ وہ یہ بھی سوچنے لگا تھا کہ باپ کی یہ چاہت تخت و تاج کی وراثت کے وقت بھی بڑا جھگڑا کھڑا کرے گی۔ وہ اپنی اہمیت جتانے کے لیے مزید درشت اور تلخ ہوگیا۔

امیر محمد اور مسعود دونوں بھائی ایک ہی دن پیدا ہوئے تھے۔ مسعود اپنے بھائی سے چند لمحے پیشتر اس دنیا میں آیا تھا اس لیے وہ خود کو بڑا بھائی تصور کرتا تھا جبکہ امیر محمد کو بڑے

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

چھوٹے کا کوئی خیال نہیں تھا۔شاید باپ کی بے پناہ توجہ کی وجہ سے چکا بنا ہوا تھا۔باپ کے سامنے سراپا نیاز بنا رہتا تھا لیکن مسعود کی قطعی عزت نہیں کرتا تھا۔مسعود اس کا قصوروار باپ کو سمجھتا تھا کہ دونوں مل کر اس کی حق تلفی کر رہے ہیں۔

یہ کشیدگی اس وقت انتہا کو پہنچ گئی جب محمود نے خلیفہ بغداد کے نام خط لکھوایا جس میں یہ سفارش کی گئی تھی کہ فرامین اور خطبات میں امیر محمد کا نام مسعود کے نام سے پہلے لکھا جائے۔

دربارِ محمودی آراستہ تھا۔تمام امراء و وزراء تشریف لا چکے تھے۔امیر محمد اور مسعود بھی موجود تھے۔ان سب کی موجودگی میں اس خط کو پڑھا گیا۔

اس خط کا مضمون سن کر تمام درباریوں کو سخت افسوس ہوا۔تمام درباریوں میں تھوڑی دیر کے لیے بے چینی پھیل گئی۔سلطان محمود کے سامنے کسی کو احتجاج کی جرأت نہیں تھی لیکن سرگوشیوں میں اسے حق تلفی اور ناموزوں خیال کیا جا رہا تھا۔

مسعود زیادہ دیر اپنی بے عزتی برداشت نہ کر سکا اور دربار سے اٹھ گیا۔ایک امیر ابونصر نے اسے اٹھتے ہوئے دیکھا تو وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے آگئے اور اس سے اظہارِ افسوس کیا۔

''تمہاری حق تلفی پر مجھے اور تمام اہلِ دربار کو بہت افسوس ہوا ہے۔''

مسعود نے اظہارِ افسوس کرنے پر ان کا شکریہ ادا کیا اور نہایت دوراندیش جواب دیا۔

''تلوار.....خط سے زیادہ سچی اور مضبوط ہوتی ہے۔''

ابونصر کو یہ جواب سن کر یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ آئندہ کیا ہونے والا ہے۔مسعود سے یہ گفتگو کر کے جب ابونصر دربار میں واپس آیا تو محمود نے اسے اپنے پاس بلالیا۔

''تم مسعود کے ساتھ دربار سے باہر کیوں گئے اور تمہاری اس سے کیا بات چیت ہوئی؟''

''اس نے نہایت عالمانہ جواب دیا کہ تلوار، خط سے زیادہ سچی اور مضبوط ہوتی ہے۔''

''اس نے غلط نہیں کہا۔'' سلطان نے جواب دیا۔

''مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ مسعود ہر لحاظ سے امیر محمد سے بہتر ہے اور مجھے اس کا یقین ہے کہ میرے بعد سلطنت.... مسعود ہی کے قبضے میں آئے گی لیکن میں جو کچھ کر رہا ہوں، اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ امیر محمد نے ہمیشہ میری عزت کی ہے اور ہر طرح سے میرا خیال رکھا ہے۔''

''سلطانِ عالی وقار! سلطنتوں کا انتظام تو بہادر

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

دہکتے جون کی گرم ہوائیں
جانفزا جاسوسی کی ٹھنڈی فضائیں

نیلا دائرہ ● ریزہ ریزہ وجود کے ساتھ سچ اور جھوٹ کی تلاش میں لہولہو ہوجانے والوں کی سنسنی خیز داستان امجد رئیس کی زبردست قلم نگاری

انگارے ● شریف آدمی کو بدمعاش بننے پر مجبور کر دینے والے قانون شکن عناصر کی یکجائی سے جنم لینے والا ہولناک سلسلہ طاہر جاوید مغل کے قلم سے

آوارہ گرد ● چلچلاتی دھوپ میں بے آسرا تنہا مسافر کی آبلہ پائی... عبدالرب بھٹی کی طبع آزمائی

سرورق کی کہانیاں

آپ کے تبصرے...
مشورے محبتیں... شکایتیں...
اور نئی نئی دلچسپ باتیں... کہانیاں

پہلا رنگ ● رگ و پے میں ہلچل مچا دینے والے شگفتہ کرداروں کی حیلہ سازیاں

دوسرا رنگ ● کاروباری اور دنیاوی معاملات میں کامیابی کا زینہ عبور کرنے والوں کی فتنہ انگیزیاں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

حکمرانوں کے مرہونِ منت ہوتا ہے۔ مسعود کی بہادری میں کوئی کلام نہیں۔ لوگ اسے ''رستمِ ثانی'' کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔''

محمود نے اس کے جواب میں خاموشی اختیار کی۔ ابو نصر نے بھی سمجھ لیا کہ اب وہ اس موضوع پر کلام کرنا نہیں چاہتا۔ اس نے اجازت لی اور سامنے سے ہٹ گیا۔

حق تلفیوں کے اس بازار میں مسعود نے کسی بغاوت سے تو گریز کیا لیکن باپ کی طرف سے منہ پھیر کر کھڑا ہو گیا۔ فاصلے بڑھتے گئے۔ سلطان نے اس کی آنکھوں کی تپش سے بچنے کے لیے اسے اصفہان بھیج دیا۔

مسعود فرامین اور خطبوں میں امیر محمد کا نام اپنے نام سے پہلے دیکھتا رہا اور کڑھتا رہا۔

''تلوار..... خط سے زیادہ سچی اور مضبوط ہوتی ہے۔''

☆☆☆

سلطان محمود غزنوی کا انتقال ہوا تو امیر محمد گورگان میں تھا اور مسعود اصفہان میں۔ دونوں بیٹوں میں سے کوئی بھی اس کے قریب نہیں تھا۔ دونوں کو ایک ساتھ بلانے میں خون ریزی کا خطرہ تھا۔ محمود زیرِ زمین تھا اور تخت خالی پڑا تھا۔ درباریوں میں تخت نشینی کے مسئلے پر اختلافات بڑھتے جا رہے تھے۔ معرکہ آرائیوں کے اس دور میں مسعود سے بہتر سلطان کا جانشین اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا لیکن سلطان کی وصیت امیر محمد کے حق میں تھی۔

سلطان کے داماد امیر علی بن ارسلان نے خسر کا انتقال ہوتے ہی قاصدوں کو گورگان کی طرف دوڑا دیا تھا۔ امیر محمد جونہی غزنی پہنچا، اسے تخت پر بٹھا دیا گیا۔

مسعود نے جب باپ کے انتقال اور بھائی کے تخت نشیں ہونے کی خبر سنی تو عراق و عجم میں اپنے قابل اور تجربہ کار نائب اور عامل مقرر کر دیے اور خود خراسان پہنچ گیا۔ یہاں پہنچ کر وہ سوچتا رہا کہ غزنی پر لشکر کشی کر دے یا یہیں بیٹھ کر حالات کا مشاہدہ کرتا رہے۔ اس نے بہت کچھ سوچنے کے بعد امیر محمد کے نام خط لکھا۔

''تمہیں مجھ سے خائف ہونے کی ضرورت نہیں۔ والدِ گرامی نے جو ملک تمہیں عطا کیے ہیں، میں ان کو اپنے قبضے میں لانا نہیں چاہتا۔ میرے لیے خود اپنے مفتوحہ ممالک یعنی جبال، طبرستان اور عراق کافی ہیں۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم اپنے ممالک میں بھی یہ ہدایت کر دو کہ خطبے میں میرا نام تمہارے نام سے پہلے پڑھا جائے۔''

امیر محمد کو اس کا جواب دانش مندی سے دینا چاہیے تھا لیکن وہ اقتدار کے نشے میں چُور تھا۔ اس نے نہایت سخت جواب اسے لکھ بھیجا۔

''اس امید میں مت رہنا کہ میں ایسا کوئی حکم جاری کروں گا۔ تمہارا نام میرے نام کے بعد لکھا جاتا ہے، اسی طرح لکھا جاتا رہے گا کہ تم اسی لائق ہو۔ تمہیں اگر اپنی بہادری پر ناز ہے تو مجھے اپنی ہر دل عزیزی پر۔ میری رعایا مجھ سے محبت کرتی ہے، میرے لیے یہی بہت ہے۔ میں اپنے والد کی وصیت پر عمل کر رہا ہوں۔ تم اس میں دخل مت دو۔ جو تمہارے ممالک تمہارے پاس ہیں، وہ بھی اب شاید تمہارے پاس نہ رہیں۔''

اور بہت سی ایسی سخت باتیں لکھ دیں کہ مسعود ہوشیار ہو گیا۔

امیر محمد نے اپنی رعایا کو اپنا فرمانبردار بنانے کے لیے خزانے کے منہ کھول دیے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں ہر شخص خوش حالی کی زندگی بسر کرنے لگا اور بظاہر فوج سمیت ہر طبقہ مطمئن نظر آنے لگا لیکن لوگ دل سے اس کے ساتھ نہیں تھے۔ وہ اب بھی مسعود کو پسند کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ کسی طرح حکومت مسعود کو مل جائے۔

محمود کا پسندیدہ غلام ایاز اس صورتِ حال سے سخت نالاں تھا۔ اسے اپنے مرحوم آقا کا یہ قول اچھی طرح یاد تھا کہ مسعود ہر لحاظ سے امیر محمد سے بہتر ہے۔ اسے اپنے آقا کا یہ کہنا بھی یاد تھا کہ میرے بعد سلطنت مسعود ہی کے قبضے میں آئے گی۔ وہ دن رات اس فکر میں لگا ہوا تھا کہ کسی طرح سلطنت مسعود کو مل جائے۔ اس نے ایک امیر ابو علی دایہ سے ملاقات کی اور اس سے مدد کا وعدہ لیا۔

''جلدی میں امیر محمد کو سلطان کی جگہ بٹھا تو دیا گیا ہے لیکن وہ کسی اعتبار سے بھی موزوں نہیں۔ سلطان بھی امیر مسعود ہی کو ترجیح دیتے تھے۔''

''تمہارا کہنا ٹھیک ہے۔'' ابو علی دایہ نے کہا۔ ''لیکن سوال یہ ہے کہ امیر محمد بھی تخت کا وارث ہے۔''

''جب دوسرا وارث بھی موجود ہے تو ہم بہتر کا انتخاب کیوں نہ کریں۔''

''تمہارے خیال میں اب بہتر کے انتخاب کا وقت گزر نہیں گیا؟''

''آپ دیکھ رہے ہیں اپنی نااہلی چھپانے کے لیے امیر محمد کس بے دردی سے خزانہ لٹا رہا ہے۔ میرے آقا نے جان جوکھوں میں ڈال کر جو خزانہ جمع کیا تھا، وہ یوں ضائع جا رہا ہے۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

''ہم اسے روک بھی تو نہیں سکتے۔''

''ہم اسے روک نہیں سکتے، اسے ہٹا تو سکتے ہیں۔''

''آہستہ بولیے۔ کسی نے سن لیا تو غضب ہو جائے گا۔''

''اگر کچھ لوگ ساتھ دیں تو میں نے کچھ سوچ لیا ہے۔''

''آپ نے کیا سوچا ہے۔ اگر قابلِ عمل ہوا تو میں ضرور ساتھ دوں گا۔''

ایاز نے ابوعلی دایہ کو اپنے منصوبے سے آگاہ کیا لیکن اتنی خاموشی اور احتیاط سے کہ کسی کو کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ دونوں کے درمیان کیا طے ہوا۔

ایاز نے ابوعلی دایہ کے علاوہ چند بہادر غلاموں کو اپنے ساتھ ملایا اور دن دہاڑے شاہی اصطبل میں داخل ہو کر خاصے کے گھوڑوں کو قبضے میں کر لیا اور تمام لوگ ان گھوڑوں پر سوار ہو کر ''بست'' کی طرف روانہ ہو گئے۔

داروغۂ اصطبل نے اس واقعے کی اطلاع فوراً امیر محمد تک پہنچائی۔ امیر محمد نے ایک چھوٹا لشکر ایاز کو گرفتار کرنے کے لیے روانہ کر دیا۔

ایاز اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہوا پہ سوار بھاگا چلا جا رہا تھا کہ اپنے پیچھے گرد و غبار اٹھتا ہوا دیکھ کر چونک گیا۔

''ساتھیو! امیر کو خبر ہو گئی ہے۔ اس نے ہماری گرفتاری کے لیے آدمی دوڑائے ہیں۔''

''کیا خبر لشکر کتنا بڑا ہے۔'' ایک غلام نے کہا۔

''اب مقابلہ کیے بغیر چارہ نہیں ہوگا۔'' ایاز نے کہا۔

ابوعلی دایہ ماہر جنگجو تھا۔ اس نے گھوڑا پھیرا اور غبار کے چھٹنے کا انتظار کرنے لگا۔ ہوا نے اپنی قینچی سے غبار قطع کیا تو پچیس سے تیس آدمیوں کا گروہ سامنے تھا۔

''ساتھیو! دشمن کی تعداد زیادہ نہیں۔ امیر نے ہماری طاقت کا غلط اندازہ لگایا ہے۔ آگے بڑھو اور انہیں تلواروں پر رکھ لو۔''

طرفین میں زبردست لڑائی چھڑ گئی۔ دونوں طرف کے بہت سے لوگ اس معرکے میں کام آ گئے۔ دشمن کے لشکر میں جو لوگ بچ گئے تھے، ایاز نے انہیں غیر مسلح کر کے غزنی واپس بھیج دیا تاکہ وہ اپنے ساتھیوں کی بربادی کی داستان سنا سکیں۔ مقتولوں کے سر کاٹ کر ان کے حوالے کر دیے۔

''یہ سر اپنے امیر کے حوالے کر دینا۔ کہیں وہ تمہیں جھوٹا نہ سمجھ لے اور یہ بھی کہہ دینا کہ ایاز اپنے آقا امیر مسعود کے پاس پہنچ گیا ہے۔''

یہ سپاہی جب اپنے ساتھیوں کے کٹے ہوئے سر لے کر امیر محمد کے پاس پہنچے تو اس نے سمجھ لیا کہ اب امیر مسعود سے جنگ کیے بغیر چارہ نہیں۔ اس نے ایک زبردست فوج تیار کی اور غزنی سے روانہ ہوا۔ وہ ابھی ''نکیا باد'' نامی مقام پر پہنچا تھا کہ رمضان کے چاند نے جھلک دکھائی۔ رمضان کے احترام میں وہ اسی مقام پر خیمہ زن ہو گیا۔

امیر ایاز اور ابوعلی دایہ اپنے چند ساتھیوں کی قربانی دینے کے بعد نیشاپور پہنچا اور مسعود سے ملاقات کی۔ مسعود ان دونوں کو دیکھ کر حیران ہوا تھا لیکن وضاحت ہونے پر مطمئن بھی ہو گیا۔

''غزنی میں بہت بے چینی پھیلی ہوئی ہے۔ تمام لوگ آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔''

''میں نہیں چاہتا کہ ہم دونوں بھائیوں میں خون ریزی ہو لیکن محمد ہے کہ لڑنے مرنے پر تلا ہوا ہے۔''

''ہم نے اس کی حکومت سے بغاوت کر دی ہے، اب اسے تکمیل تک آپ پہنچائیں گے۔''

''میں پھر یہی کہوں گا کہ ہم دونوں کے درمیان جنگ نہ ہو۔ تمام معاملات پُرامن فضا میں طے پا جائیں۔''

''آپ کچھ بھی سوچیں لیکن امیر محمد لڑائی کا ارادہ کر چکا ہے۔''

''باقی امراء کیا کہتے ہیں؟''

''وہ از خود کوئی قدم نہیں اٹھا سکتے۔ آپ نے اگر پہل کی تو وہ ضرور آپ کا ساتھ دیں گے۔''

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ کسی نے اطلاع دی کہ امیر محمد ایک زبردست لشکر کے ساتھ ''نکیا باد'' میں خیمہ زن ہو گیا ہے۔

ایاز کو حیرت ہو رہی تھی کہ اسے نیشاپور آئے ہوئے صرف چار دن ہوئے ہیں اور امیر محمد نکیا باد پہنچ گیا۔ اس سے بھی زیادہ حیرت کی بات یہ تھی کہ مسعود کو یہ اطلاع دن کے دن مل گئی۔

''مالک! یہ کیا ماجرا ہے۔ ادھر امیر محمد نکیا باد میں خیمہ زن ہوا، ادھر آپ کو اطلاع مل گئی۔ ایسا انتظام تو جنگ کے دنوں میں بھی نہیں ہوتا۔''

''میں نے یہ ہنر اپنے اور تمہارے آقا سلطان محمود غزنوی سے سیکھا ہے۔ ایسے آدمی مقرر کر رکھے ہیں جو دن بھر ارد گرد کے علاقوں میں گھومتے ہیں اور خبریں جمع کر کے مجھ تک پہنچاتے ہیں۔ یہی قاعدہ ابا جان کا بھی تھا۔ ممکن ہی نہیں تھا کہ کسی علاقے میں آندھی آئے اور انہیں خبر نہ ہو۔ مجھے تو یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ ''بست'' سے کچھ پہلے امیر محمد کے آدمیوں سے تمہاری جھڑپ ہوئی ہے۔ اب یہ بھی معلوم

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

ہوگیا کہ مجھ پر حملہ آور ہونے کے لیے نکلا ہے اور ''نکیا باد'' کے مقام پر آ کر رک گیا ہے۔''

''امیر معظم! میں اور میرے آدمی آپ پر جان نچھاور کرنے کے لیے بے چین ہیں آپ تیاری فرمائیں۔''

''میں اب بھی یہ چاہوں گا کہ ہمارے درمیان جنگ نہ ہو۔''

''اگر اس کا لشکر حملہ آور ہوگیا؟''

''تو ہم مقابلہ کریں گے۔ ویسے میرا یہ خیال ہے کہ وہ رمضان کے احترام میں جنگ سے گریز کرے گا۔ ابھی پورا مہینا پڑا ہے تیاری ہم بھی کرلیں گے۔ اس دوران میں یہ بھی کوشش کرتا رہوں گا کہ اسے راہِ راست پر لے آؤں۔''

مسعود دل سے یہ چاہتا تھا کہ بھائی سے جنگ نہ ہو اور تمام معاملات بات چیت سے طے ہوجائیں۔ وہ صرف یہ چاہتا تھا کہ فرامین و خطبات میں اس کا نام امیر محمد سے پہلے لکھا جائے۔ یہ کوئی ایسا بڑا مطالبہ نہیں تھا لیکن امیر محمد نے اسے اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا تھا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر امیر محمد کی خدمت میں ایک خط روانہ کیا۔ اس خط کا بھی وہی حشر ہوا جو پہلے خط کا ہو چکا تھا۔ اس نے صاف لکھ دیا۔

''خاطر جمع رکھو۔ میں نے رمضان کے احترام میں پاؤں روک لیے ہیں۔ عید کا جشن یہیں مناؤں گا۔ اس کے بعد تم سے ملاقات ہوگی اور جشنِ فتح مناؤں گا۔ اپنے لشکر کو تیار رکھو۔ جلد ملاقات ہوگی۔''

اس خط کے بعد صلح کی امید ہی نہیں رہی تھی۔ اس نے بھی جنگ کی تیاری شروع کردی لیکن دل میں تہیہ کرلیا کہ وہ خود حملہ نہیں کرے گا۔ اگر امیر محمد نے حملہ کیا تو وہ اپنا دفاع ضرور کرے گا۔

امیر محمد جنگ کا اعلان کر کے جو ''نکیا باد'' میں پڑا رہا، یہ اس کے لیے نقصان کا باعث بنا۔ اس کے امیروں اور وزیروں کو سوچنے کا موقع مل گیا۔ وہ غزنی سے یہاں تک دیکھتے آئے تھے کہ خلقِ خدا کے دل مسعود کے ساتھ ہیں۔ پھر وہ کیوں اپنی جانوں کو خطرے میں ڈالیں۔ اس کے علاوہ ان پر مسعود کی بہادری کا رعب بھی تھا۔ جیسے جیسے دن گزرتے جارہے تھے، وہ سوچنے لگے تھے کہ یا تو یہ جنگ ٹل جائے یا وہ مسعود سے جا کر مل جائیں۔ امیر محمد کے نامور امراء امیر علی خویشاوند، امیر یوسف، میر حسین وغیرہ اس کے سخت خلاف ہوگئے۔

رمضان کا مہینا اسی کش مکش میں گزر گیا۔ عید کے روز نماز ادا کرنے کے بعد امیر محمد نے دربار منعقد کیا۔ سر پر تاج رکھ کر وہ جڑاؤ کرسی پر بیٹھا ہی تھا کہ اس کے سر سے تاج گر گیا۔ لوگوں نے اسے فالِ بد سمجھا اور اس سے علیٰحدہ ہونے کا پکا ارادہ کرلیا۔

امراء نے آپس میں مشاورت کی اور عید کے تیسرے دن امیر مسعود کی حمایت کے نعرے لگاتے ہوئے امیر محمد کے خیمے کے گرد جمع ہوگئے۔ امیر محمد کے لشکرِ خاص کے کچھ لوگوں نے جو خیمے کی حفاظت کے لیے متعین تھے مزاحمت کا ارادہ کیا لیکن ابو علی خویشاوند اور امیر یوسف سبکتگین نے آگے بڑھ کر انہیں سمجھایا۔

''ہم کسی غلط ارادے سے نہیں آئے ہیں۔ ہمیں امیر سے ملاقات کرنے دو۔ اگر وہ ہماری بات مان لیتے ہیں تو ٹھیک ورنہ ہم واپس چلے جائیں گے۔''

''آپ لوگ ابھی امیر مسعود کی حمایت کے نعرے لگا رہے تھے۔ اسے ہم کیا سمجھیں؟''

''یہی بات تو ہم کرنے جارہے ہیں۔ امیر مسعود سے جنگ کرنا حماقت ہے۔ ہماری جانوں کا مفت میں نقصان ہوگا۔ اس میں تمہارا بھی فائدہ ہے بلکہ زیادہ فائدہ ہے کیونکہ تم لوگ امیر کے خاص لشکری ہو مگر جنگ ہوئی تو سب سے پہلے تم پر مصیبت ٹوٹے گی۔''

''آپ لوگ امیر سے کیا بات کرنا چاہتے ہیں؟''

''یہی کہ مسعود سے صلح کرلی جائے۔''

''آپ لوگ تو مسلح ہو کر، اپنے لشکر کے ساتھ آئے ہیں۔ یہ صلح کا کون سا پیغام ہے؟''

''کچھ اور نہیں بس ہم امیر کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ لشکر بھی اس جنگ کے خلاف ہے۔ اگر ہمارے حکم پر وہ جنگ کا ایندھن بنا بھی تو بے دلی سے لڑے گا۔''

''اس کے باوجود ہمیں امیر سے پوچھنا پڑے گا۔''

''ظاہر ہے۔ اجازت کے بغیر ہم امیر کی خدمت میں کیسے حاضر ہوسکتے ہیں۔''

امیر محمد کو اپنے امراء سے ملنے میں کیا تکلف ہوسکتا تھا البتہ امیر مسعود کی حمایت میں لگنے والے نعروں سے اسے تشویش ضرور تھی۔ پہرے داروں نے اسے یہ کہہ کر مطمئن کردیا کہ امرائے کبار اسی سلسلے میں آپ سے ملاقات کے متمنی ہیں۔ امیر نے اجازت دے دی۔

امرائے عظام اسی عاجزی اور انکسار سے پیش ہوئے جو ان کا دستورِ قدیمی تھا۔

''غالباً آپ لوگ اسی مشورے کے لیے حاضر ہوئے

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

ہیں کہ عید بھی گزر گئی، اب لشکر کو کب روانہ کیا جائے۔''

''ہمیں مشورہ تو یہی کرنا چاہیے تھا لیکن اب حالات بدل گئے ہیں۔''

''حالات بدل گئے ہیں یا آپ لوگ؟'' امیر محمد نے کڑک کر پوچھا۔

''امیر معظم! ہماری وفاداری پر شک نہ فرمائیں۔ ہم نے آپ کا نمک کھایا ہے۔ ہم تو وہ بات کریں گے جس سے آپ کا اقبال مزید بلند ہو۔''

''کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟''

ابوعلی خویشاوند سامنے آیا اور کہنا شروع کیا۔

''گستاخی معاف، بات سخت ہے لیکن کہے بغیر چارہ نہیں۔ ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ تمام مخلوق امیر مسعود کی مطیع ہو چکی ہے۔ اس لیے یہ یقین ہے کہ آپ اس کے مقابلے کی تاب نہ لا سکیں گے۔''

''یہ تم نے سوچ بھی کیسے لیا۔ کیا ہم اتنے بزدل ہو گئے ہیں..... کیا تم اتنے کمزور ہو گئے ہو؟''

''امیر معظم! ہماری اپنی کوئی طاقت نہیں۔ ہم نہیں ہمارا لشکر لڑتا ہے۔ بے دلی ان پر بھی طاری ہے۔''

''کیا آپ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ میں مسعود کے سامنے جا کر گڑگڑاؤں یا بے عزتی سے غزنی چھوڑ کر بھاگ جاؤں۔''

''ہم آپ کے وقار پر آنچ نہیں آنے دیں گے۔''

''میں لڑنے سے پہلے اپنی شکست مان لوں اور تم کہتے ہو میرے وقار پر آنچ نہیں آئے گی۔''

''یہ سب آپ نہیں ہم کریں گے۔ آپ اپنی جگہ بیٹھے رہیں، ہم اس کے پاس جائیں اور آپ کی طرف سے معذرت چاہیں۔ پھر وہ آپ کو اپنے پاس بلائے۔ اس طرح ہماری اور آپ کی جانیں محفوظ رہیں۔''

اب امیر محمد کے پاس ان کی بات ماننے کے سوا چارہ نہیں تھا۔ جب ہاتھ میں تلوار ہی نہ ہو تو لڑا کیا جائے۔

''لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں۔'' اس نے دونوں ہاتھوں سے ہتھیار رکھ دیے۔

یہ سفارت کامیاب ہوئی تو لشکر کے دوسرے سردار بھی آ گئے اور امیر محمد کو ''قلعہ دج'' میں لے جا کر بٹھا دیا۔

امیر محمد یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ گرفتار ہو چکا ہے۔

سردارانِ لشکر امیر مسعود کے استقبال کے لیے روانہ ہوئے۔ وہ نیشاپور سے ہرات آیا ہوا تھا کہ یہ لوگ اس کے پاس پہنچے۔

تمام لشکر اور خزانہ امیر مسعود کے پاس پہنچ گیا۔ اس کی یہ آرزو پوری ہوئی کہ دونوں بھائیوں میں جنگ نہ ہو۔ معاملات بات چیت سے طے ہو جائیں۔

اس نے امیر محمد کے لشکر اور اس کے سرداروں کو ساتھ لیا اور ہرات سے بلخ آ گیا۔ یہاں پہنچ کر اس نے چند انتظامی معاملات درست کیے اور بلخ سے غزنی کی راہ لی۔

غزنی کو دلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔ دریچوں میں غزنی کی عورتیں پھولوں کی طرح سجی ہوئی تھیں۔ سڑکوں پر دو رویہ قطاروں میں مرد شہری اپنے بادشاہ کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے کھڑے تھے۔ جنگی باجوں پر وطن کی محبت کے نغمے گائے جا رہے تھے۔ جونہی اعلان ہوا کہ سلطان مسعود کی سواری باد بہاری دروازۂ شہر میں داخل ہوئی ہے تو نفیروں اور نغموں کی گونج میں اضافہ ہو گیا۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ بادشاہ کی طرف سے درہم و دینار نچھاور کیے جا رہے تھے۔

''تلوار خط سے زیادہ سچی اور مضبوط ہوتی ہے۔''

اس کا کہا ہوا یہ مقولہ آج سچا ثابت ہو رہا تھا۔ اس کے باپ نے خلیفہ بغداد سے سفارش کی تھی کہ فرامین وخطبات میں اس کا نام امیر محمد کے نام کے بعد لکھا جائے لیکن آج اس نے اپنی تلوار سے اس سفارش کو چاک کر دیا تھا۔ اس کے باپ کی وصیت کے مطابق امیر محمد کو تخت سونپا گیا تھا لیکن مسعود کی تلوار نے فیصلہ کر دیا کہ تخت پر بیٹھنا کسے زیب دیتا ہے۔ امیر محمد ایک سال بھی حکومت نہ کر سکا اور اب تختِ غزنی اس کے قدموں تلے تھا۔ اس کے باپ کا کہنا بھی صحیح ثابت ہو رہا تھا۔ محمود نے کہا تھا، مجھے اس کا یقین ہے کہ میرے بعد سلطنت مسعود ہی کے قبضے میں آئے گی۔

وہی بارگاہ تھی جہاں کبھی محمود بیٹھا کرتا تھا۔ وہی امراء تھے، وہی غلام۔ اس نے پہلا دربار منعقد کیا تھا۔ وہ اس بیش قیمت تخت پر بیٹھا تھا جس پر ملکوں ملکوں سے لائے ہوئے زمرد جڑے ہوئے تھے۔

''احمد حسین میمندی کو پیش کیا جائے۔''

جس شخصیت کو طلب کیا جا رہا تھا اسے گرفتار پہلے ہی کیا جا چکا تھا۔ اب تو صرف اہلِ دربار کے سامنے پیش کرنا تھا۔

مسعود کی زبان سے الفاظ ادا ہوئے اور ایک پاکیزہ صورت شخصیت حبشی غلاموں کے حصار میں زنجیروں میں جکڑ اور بار میں پیش کر دیا گیا۔ یہ شخص کوئی خطرناک مجرم نہیں تھا جو اس طرح پیش کیا جا رہا تھا۔ گویا اس کی تذلیل مقصود تھی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

مسعود ہی کے حکم پر ابوعلی خویشاوند کو دربار میں لایا گیا۔

''آپ امیر محمد کے ملازم تھے۔ آپ نے اس سے بے وفائی کی اور اسے دھوکے سے قید کر دیا۔''

''میں نے تو آپ کے حق میں آواز بلند کی تھی۔''

''کل کسی اور کے حق میں آواز بلند کرو گے۔''

مسعود نے اسے بھی قتل کی سزا سنا دی۔ امیر یوسف کو قید کی سزا دی۔

مسعود نے چند دنوں کے اندر اندر ان تمام لوگوں کو نیست و نابود کر دیا جنہوں نے امیر محمد کی حمایت میں آواز بلند کی تھی۔ اس کے بعد وہ قلعہ دج میں امیر محمد سے ملنے گیا۔

''کیا میں نے تمہیں پیش کش نہیں کی تھی کہ اقتدار اور حکومت اپنے پاس رکھو، میرے ساتھ صرف اتنا حسن سلوک کرو کہ خطبات میں میرا نام اپنے نام سے پہلے لکھنے کی اجازت دے دو۔''

''اس کے بعد تم یہ دعویٰ کرتے کہ اقتدار میں بھی اولیت کا شرف تمہیں حاصل ہے۔''

''اب کیا کہتے ہو۔ تم تو اقتدار بچانے نکلے تھے۔''

''مجھے شکست نہیں ہوئی ہے۔ میرے ساتھ بے وفائی ہوئی ہے۔ اگر میں جنگ کرتا تو میں نہیں تم یہاں ہوتے۔''

''اگر میں یہاں ہوتا تو تم میرے ساتھ کیا سلوک کرتے؟''

''وہ آنکھیں ہی نکلوا دیتا جن میں ہمیشہ میرے لیے نفرت رہی ہے۔''

''نفرت تو تمہاری آنکھوں میں بہت ہے۔'' مسعود نے کہا اور اس کے پاس سے اٹھ کر آ گیا۔ کچھ دیر بعد اس کمرے کا تالا کھلنے کی آواز آئی جس میں اسے قید رکھا گیا تھا۔ اس نے آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ کوئی ملازم ہوگا جو صفائی ستھرائی کے لیے آ گیا ہوگا۔

اس نے نیم وا آنکھوں سے پلٹ کر دیکھا۔ یہ وہ نہیں تھے جو صفائی کی غرض سے روز آیا کرتے تھے۔ ملازموں کو بدلتے کیا دیر لگتی ہے، یہاں تو بادشاہ بدل جاتے ہیں۔

''کون ہو تم لوگ..... یہاں کیا لینے آئے ہو؟''

''ہم آپ کو لینے آئے ہیں۔''

''کیوں؟''

''قلعے کے باہر تازہ ہوا میں..... جہاں آپ کو سب کچھ نظر آنے لگے گا۔''

''کیا میری رہائی کا پروانہ آ گیا؟''

''جی ہاں۔''

''آخر بھائی کو بھائی کا خیال آ ہی گیا۔'' اس نے اپنے آپ سے کہا۔ ''رہائی کے پروانے میں اور کیا لکھا ہے؟ مجھے کہاں لے جایا جائے گا؟''

''یہ تو ہمیں نہیں معلوم۔''

''ہماری زنجیریں کھولی جائیں۔''

ان لوگوں نے آگے بڑھ کر اس کے پیروں میں پڑی بھاری زنجیریں کھول دیں۔ زنجیریں کھول دی گئی تھیں لیکن دو آدمی اسے اِدھر اُدھر سے پکڑے ہوئے چل رہے تھے۔ کمرے سے نکلتے ہی اسے نیچے اترنے والی سیڑھیوں کی طرف لے جایا گیا۔

''یہ راستہ تو غالباً تہ خانے کی طرف جاتا ہوگا۔ تم تو کہہ رہے تھے مجھے قلعے سے باہر لے جایا جائے گا؟''

''آپ اس قلعے سے واقف نہیں ہیں۔ سیڑھیاں اتر کر ایک سرنگ ہے جو سیدھی محل کی طرف جاتی ہے۔ آپ کو اسی سرنگ کے ذریعے محل میں پہنچا دیا جائے گا۔ یہ خفیہ راستہ اس لیے اختیار کیا جا رہا ہے تاکہ آپ کو دشمنوں سے محفوظ رکھا جا سکے۔''

سیڑھیاں ختم ہوئیں تو اس نے خود کو ایک گول کمرے میں پایا جہاں کوئی فرنیچر نہیں تھا، بس ایک پتھر کی میز پڑی تھی۔

وہ شاہی خاندان کا فرد تھا۔ بادشاہ رہ چکا تھا۔ ایسے کئی قلعوں اور ان کی بناوٹ سے واقف تھا۔ یہاں کے ماحول کو دیکھ کر اس کا ماتھا ٹھنکا۔ اس نے مزاحمت کی کوشش

مرنے سے پہلے

ڈاکٹر مذہبی خیالات رکھتا تھا۔ جس مریض کو دوا دیتا اسے کوئی روحانی ہدایت بھی کر دیتا۔ ایک نوجوان کے لیے نسخہ لکھنے کے بعد اس نے کہا۔ ''نوجوان! مجھے بتاؤ کسی کو جنت میں جانے کے لیے کیا کرنا چاہیے؟''

''مرجانا چاہیے۔'' نوجوان نے جواب دیا۔

ڈاکٹر کچھ پریشان ہوا اور پھر بولا۔

''لیکن مرنے سے پہلے کیا کرنا چاہیے؟''

''آپ کو بلا لینا چاہیے۔'' نوجوان نے جواب دیا۔

مرسلہ: وزیر محمد خان، عظل ہزارہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

بھی کی لیکن کارندوں نے اسے بری طرح دبوچ لیا اور زبردستی پتھر کی میز پر لٹا دیا۔

وہ آنکھیں نکل گئیں جس میں مسعود کے لیے نفرت تھی۔

اپنے راستے کے تمام کانٹے ہٹانے کے بعد وہ ملکی انتظام کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کی بہادری کی دھاک ایسی بیٹھی ہوئی تھی کہ اردگرد کے علاقوں کے حکمران اور سردار ان بھی فوجی امداد کے لیے اس کے پاس آنے لگے۔ یہ امداد بھی توسیع سلطنت کا اچھا بہانہ بن گئی۔ اس وقت کے دستور کے مطابق جو ملک کسی کی مدد کرتا تھا وہاں اپنے نام کا سکہ جاری کرتا تھا اس کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا تھا اور وہ ملک ہمیشہ کے لیے اس کا اطاعت گزار ہو جاتا تھا۔

☆☆☆

کچ اور مکران کے حاکم نے جب وفات پائی تو اس کے دو بیٹوں میں اقتدار کے حصول کی جنگ شروع ہوگئی۔ ایک بھائی عیسیٰ سلطنت پر قابض ہوگیا۔ دوسرا بھائی ابوالعساکر اسے اپنا حق سمجھتا تھا لیکن اس کے پاس اتنا لشکر نہیں تھا کہ عیسیٰ کا مقابلہ کرتا اور زبردستی اسے تخت سے اتار دیتا۔ اس نے بھائی سے ملاقات کی اور ایک مناسب تجویز سامنے رکھی۔

''دیکھ بھائی! ہم ایک ہی باپ کے دو بیٹے ہیں۔ جتنا تمہارا حق ہے اتنا میرا بھی حق ہے۔ کیوں نہ ہم ایسا کریں کہ سلطنت دو حصوں میں بانٹ لیں۔ نصف تم رکھ لو، نصف میرے پاس رہے اور ہم ہنسی خوشی رہیں۔ اگر کوئی حملہ آور ہوتا ہے تو ہم مل کر اس کا مقابلہ کریں۔''

عیسیٰ اپنی طاقت کے گھمنڈ میں اس کی اس تجویز پر زور سے ہنسا۔

''کیا تم نے یہ نہیں سنا کہ دو فقیر ایک کمبل میں گزارہ کر سکتے ہیں لیکن دو بادشاہ ایک سلطنت میں نہیں رہ سکتے؟''

''سنا تو میں نے بھی ہے لیکن کیا ہم اس مثال کو غلط ثابت نہیں کر سکتے؟''

''تمہاری اس بات پر میں ہنسنے کے سوا کیا کر سکتا ہوں۔ اقتدار تلوار کی نوک سے حاصل کیا جاتا ہے، باتیں بنانے سے نہیں۔ اگر تم میں طاقت ہے تو بہ زورِ شمشیر مجھ سے یہ سلطنت چھین لو۔''

''اگر جنگ ہوئی تو ہم میں سے ایک ضرور ضائع ہو جائے گا۔ کیا تمہیں یہ اچھا لگے گا؟''

''مجھے تمہاری یہ دھمکی اچھی لگی۔ میں خود مرنے یا تمہیں مارنے کو تیار ہوں۔ اگر ہمت ہے تو اپنے لشکر کو میرے لشکر کے مقابل لے آؤ۔''

ابوالعساکر نے سمجھ لیا کہ اب بھائی کو سمجھانا بے کار ہے۔ وہ بظاہر خاموش ہو کر بیٹھ گیا لیکن سوچتا ضرور رہا کہ اب اسے کیا کرنا ہے۔

ایک روز عیسیٰ شکار کے لیے نکلا تو اُسے موقع مل گیا۔ اُس نے چند با اعتماد ساتھیوں کو ہمراہ لیا اور خفیہ راستہ اختیار کرتے ہوئے محل سے باہر آ گیا۔ باہر نکلتے ہی سپاہیوں کے ایک گروہ نے اس کا راستہ روک لیا۔

''امیر عیسیٰ کی ہدایت کے مطابق آپ محل سے باہر نہیں جا سکتے۔''

''میں قیدی نہیں شہزادہ ہوں۔''

''ہمیں اس سے انکار نہیں لیکن ہمیں یہی حکم ملا ہے۔''

''کس نے دیا ہے تمہیں یہ حکم؟''

''اس سلطنت کے حاکم امیر عیسیٰ نے جس کے ہم ملازم ہیں۔''

''اگر میں پھر بھی جانا چاہوں؟''

''ہم آپ کو جبراً روکنے پر مجبور ہوں گے۔''

''تمہاری یہ مجال۔'' ابوالعساکر نے کہا اور تلوار بے نیام کر لی۔ اسے دیکھ کر اس کے ساتھیوں نے بھی تلواریں بلند کیں اور سپاہیوں پر ٹوٹ پڑے۔ یہ لوگ ماہر شمشیر زن اور بلا کے بہادر تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے سپاہیوں میں سے کچھ تو لاشوں میں تبدیل ہو گئے، کچھ بھاگ کھڑے ہوئے۔

''گھوڑوں کو جتنی تیز دوڑا سکتے ہو دوڑاؤ۔ ممکن ہے ہمارا تعاقب کیا جائے۔'' ابوالعساکر نے کہا۔

یہ حکم سنتے ہی سب کے گھوڑے ہوا سے باتیں کرنے لگے۔ صحرا، پہاڑ، میدان، تنگ گھاٹیاں عبور کرتا ہوا یہ قافلہ غزنی پہنچ گیا۔ غزنی پہنچتے ہی ابوالعساکر نے مسعود کے وزیر احمد بن حسین میمندی سے رابطہ کیا اور اس کے توسط سے سلطان مسعود کی خدمت میں پہنچ گیا اور تمام ماجرا کہہ سنایا۔

''اے امیروں کے امیر! اگر آپ اپنے لشکر کی مدد سے میری مدد فرمائیں اور میرا آبائی ملک مجھے واپس دلا دیں تو ہمیشہ حکومتِ غزنی کی اطاعت کا دم بھرتا رہوں گا اور اپنے علاقے میں آپ کے نام کا خطبہ اور سکہ جاری کروں گا۔''

''تمہاری بپتا سن کر مجھے سخت افسوس ہوا لیکن تمہاری مدد کرنے سے قبل میں ضروری سمجھوں گا کہ اپنے درباریوں کو اعتماد میں لوں۔''

مسعود نے اسی روز امراء اور سالاروں کا اجلاس

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

طلب کیا اور ان کے سامنے مکران کی صورتِ حال رکھی۔ ایک طویل بحث کے بعد بالآخر یہ طے ہوا کہ سائل کی درخواست قبول کرلی جائے۔ اس کا فائدہ ہمیں یہ ہوگا کہ کچ اور مکران کی طرف سے ہمیں ہر خطرے سے نجات مل جائے گی۔ دوسرے لفظوں میں ہماری سلطنت مکران تک وسیع ہوجائے گی۔

سلطان مسعود نے ان مشوروں کی روشنی میں امیر التونتاش کی سربراہی میں ایک لشکر ابو العسا کر کے ساتھ روانہ کردیا۔ لشکر کی روانگی کے وقت اس نے التونتاش کو ہدایت کی کہ اگر عیسیٰ صلح پر آمادہ ہو اور سلطنت میں سے نصف علاقہ ابو العسا کر کو دینے کو تیار ہو تو اس سے جنگ نہ کی جائے لیکن اگر وہ جنگ پر آمادہ ہو تو اس سے جنگ کی جائے اور ملک اس کے قبضے سے نکال کر ابو العسا کر کے حوالے کردیا جائے۔

یہ لشکر جب مکران کی حدود میں پہنچا تو سلطان کی ہدایت کے مطابق التونتاش نے امیر عیسیٰ سے..... بات چیت کے لیے ملاقات کی۔ امیر عیسیٰ نے استقبال تو شاندار کیا لیکن جب یہ سوال آیا کہ ابو العسا کر سے صلح کرلی جائے اور اس کے نتیجے میں سلطنت کا نصف علاقہ اسے دے دیا جائے تو اس نے پوری بات ہی سننے سے انکار کردیا۔ اسے اپنی طاقت پر اتنا گھمنڈ تھا کہ اس نے صلح پر جنگ کو ترجیح دی۔ نہایت بے ہودگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے التونتاش کی موجودگی میں اپنی فوج کے افسرِ اعلیٰ کو طلب کیا اور اسے لشکر کو تیار رکھنے کی ہدایت کی۔

التونتاش مایوس ہوکر اٹھ آیا۔ اس نے لشکر میں آتے ہی اپنی فوج کو صف آرا ہونے کا حکم دے دیا۔ امیر عیسیٰ بھی اپنا لشکر لے کر نکلا۔ لڑائی کی ابتدا ہی میں یہ ظاہر ہونے لگا تھا کہ مسعود کا لشکر بھاری پڑنے لگا ہے۔ عیسیٰ کو اب بھی عقل آجانی چاہیے تھی لیکن اس نے خود کو بھی جنگ کی آگ میں جھونک دیا۔ وہ گھوڑے سے کود گیا اور صفوں کے درمیان گھس گیا۔ اس کی بہادری دیکھ کر مسعودی لشکر حیران تھا۔ ایک بجلی تھی جو چاروں طرف کوند رہی تھی۔ اس کی تلوار کے سامنے جو آیا مارا گیا لیکن اس کی بہادری بھی کسی کام نہ آئی۔ اس کا لشکر پیٹھ دکھا گیا۔ وہ کسی صورت میدان چھوڑنے کو تیار نہیں تھا..... بالآخر مارا گیا۔ اس کے مرتے ہی اس کے رہے سہے سپاہی بھی بھاگ کھڑے ہوئے۔

ابو العسا کر نے مسعودی امداد کے بل بوتے پر ملک پر قبضہ کرلیا اور حسبِ وعدہ اپنے ملک میں امیر مسعود کے نام کا خطبہ اور سکہ جاری کردیا۔

مسعود اس فتح کی خبر سن کر بہت خوش ہوا۔ اب اس کے نام کا خطبہ غزنی سے بلوچستان کی سرزمین تک پڑھا جارہا تھا۔

سلطان بننے کے بعد یہ اس کی پہلی فتح تھی۔ اس کا شکر ادا کرنے کے لیے وہ ''عروس فلک مسجد'' گیا تاکہ شکرانے کے نوافل ادا کرسکے۔ یہ مسجد سلطان محمود نے تعمیر کرائی تھی۔ وہ جب ہندوستان کے کئی راجاؤں کو شکست دے کر، مالِ غنیمت بٹور کر غزنی واپس آیا تھا تو نعمتِ خداوندی کے شکریہ کے طور پر یہ جامع مسجد تعمیر کرائی تھی اور اب اس کا بیٹا نفل شکرانہ ادا کرنے آیا تھا اور مسجد کے دروازے پر کھڑا اس بڑے پتھر کو دیکھ رہا تھا جو اس کے باپ کے حکم سے یہاں ڈالا گیا تھا۔ یہ کوئی معمولی پتھر نہیں تھا۔ جب سلطان محمود نے سومنات کا مشہور مندر فتح کیا تھا اور بت خانے میں اس کی نظر سومنات کے بت پر پڑی تھی تو اس کی غیرتِ اسلامی نے جوش مارا تھا۔ اس نے گرز سے جو اس کے ہاتھ میں تھا، ایک کاری ضرب لگائی اور اس بت کا منہ توڑ دیا اور پھر حکم دیا کہ اس بت میں سے پتھر کے دو ٹکڑے کیے جائیں اور غزنی بھیج دیے جائیں۔ اس کے حکم کی تعمیل کی گئی۔ یہ دو پتھر غزنی بھیجے گئے۔ انہی میں سے یہ ایک پتھر تھا جو جامع مسجد کے دروازے پر پڑا تھا۔ مسعود اس سے پہلے بھی اس پتھر کو دیکھ چکا تھا لیکن اس وقت اس کی کیفیت ہی دوسری تھی۔ ان راجاؤں کا خیال آرہا تھا جنہیں اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ یہ پتھر اس کے لیے نشانِ عبرت تھا۔ اس نے دل میں تہیہ کیا کہ وہ ہندوستان کو فتح کرنے کے لیے ایک دن ضرور روانہ ہوگا، اس کا باپ غزنی واپس آگیا تھا لیکن وہ وہاں اپنی حکومت قائم کرے گا۔ اس نے حقارت سے اس پتھر پر پاؤں رکھا اور مسجد میں داخل ہوگیا۔

بادشاہ کی آمد کی خبر سن کر پورا شہر امڈ آیا تھا۔ اسے سخت حفاظتی پہرے میں اگلی صف تک پہنچایا گیا۔ اس کے دائیں بائیں اس کے دونوں وزیر کھڑے تھے۔ اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی تو اپنے وزیر کے برابر ایک کمبل پوش کو کھڑا دیکھا۔ گرمیوں کے دن تھے لیکن وہ شخص سر سے پاؤں تک ایک موٹا کمبل اوڑھے ہوئے تھا۔ اس کے منہ کا کچھ حصہ بھی اس کمبل میں چھپا ہوا تھا۔ مسعود نے اس کی طرف دیکھا اور چاہتا تھا کہ اسے وہاں سے ہٹا دے۔ نہ جانے کیوں وہ اسے مشکوک سا لگا تھا۔ اسی وقت امام نے نیت

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

باندھی۔ مسعود کو بھی نیت باندھنی پڑ گئی۔ جب امام نے سلام پھیرا تو مسعود کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ شخص صف میں موجود نہیں تھا۔ اس کی جگہ کسی اور شخص نے لے لی تھی۔ مسعود کو ایک اور دھچکا لگا۔ وہ کمبل پوش نیت باندھنے تک موجود تھا پھر نماز کے دوران کہاں غائب ہوگیا؟

امام صاحب نماز کے بعد مسعود کے پاس آ کر بیٹھ گئے۔ مسعود بھی شکرانے کے نفل ادا کر چکا تھا۔ اب مسجد خالی ہونے کا انتظار تھا تاکہ مسعود بہ آسانی باہر نکل سکے۔ مسعود کی نظر پھر اس کمبل پوش پر پڑی۔ وہ ابھی تک مسجد میں موجود تھا۔ مسعود نے امام کی توجہ اس طرف دلائی۔ ''اس شخص کو یہاں بلایئے۔'' امام نے اس طرف دیکھا جس طرف مسعود نے اشارہ کیا تھا اور اشارے سے اس شخص کو بلایا۔ وہ شخص مسعود کے قریب آیا تو کوئی اور تھا۔ اس کے بدن پر کمبل نہیں تھا۔ مسعود نے پھر اس طرف دیکھا۔ کمبل پوش اپنی جگہ موجود نہیں تھا۔

''تم ابھی کمبل اوڑھے بیٹھے تھے۔ وہ کمبل کہاں چھپا دیا؟''

''سلطانِ محترم! گرمیوں کے دن ہیں، میں کمبل کیوں اوڑھوں گا؟ آپ نے کسی اور کو دیکھا ہوگا۔''

''تم کیا کام کرتے ہو؟''

''میں تاجر ہوں مگر بہت معمولی۔ میری تجارت میں مسلسل گھاٹا ہو رہا ہے۔ اب تو نوبت فاقوں تک آ گئی ہے۔''

اس شخص نے بادشاہ کو سامنے دیکھ کر اپنی حالت بیان کی تاکہ بادشاہ اسے انعام سے نوازے۔

مسعود محتاجوں اور غریبوں کا بہت خیال رکھتا تھا اور ہمیشہ انہیں صدقہ اور خیرات دیا کرتا تھا..... ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ رمضان کے مہینے میں اس نے صرف ایک دن میں ایک لاکھ سے زیادہ درہم خیرات کیے۔

اس شخص کا حال سن کر مسعود نے اشارہ کیا اور اس کے آدمی نے اشرفیوں کی ایک تھیلی اس شخص کے حوالے کردی۔ وہ دعائیں دیتا ہوا اس کے پاس سے اٹھ گیا۔

مسعود ایک مرتبہ پھر حیرانی کے سمندر میں غوطے کھانے لگا تھا کہ اس کمبل پوش کا کیا ماجرا ہے لیکن اس نے اس حیرانی کا کسی سے ذکر نہیں کیا۔ کچھ دیر بعد وہ مسجد سے باہر آیا۔ باہر ایک ہجوم اسے دیکھنے کے لیے جمع تھا۔ اس نے ایک نظر ہجوم پر ڈالی، وہی کمبل پوش اسے پھر نظر آیا لیکن جیسے ہی اس کی نظر اس کمبل پوش پر پڑی، وہ پراسرار شخص ہجوم میں کہیں غائب ہوگیا۔ مسعود کو پھر تعجب ہوا لیکن اس مرتبہ اسے یقین ہوگیا کہ اس آنکھ مچولی میں کوئی راز ضرور پوشیدہ ہے۔

اس کے آدمیوں نے راستہ بنایا اور وہ سوار ہوگیا۔ اسے محل کی طرف جانا تھا لیکن کوئی بات ایسی دل میں آئی کہ اس نے ارادہ بدل دیا۔ اب وہ اس باغ کی طرف رواں دواں تھا جو سلطان محمود نے اپنے باپ سبکتگین کے لیے آراستہ کیا تھا اور اس باغ میں ایک شاندار عمارت تعمیر کرائی تھی۔ اس کا ارادہ تبدیل ہوتے ہی اطلاع کردی گئی۔ فوجی دستے نے اس باغ کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ کنیزیں اور غلام پہنچ گئے۔ ضیافت کے اہتمام ہونے لگے۔

مسعود کی سواری پہنچتے ہی سپاہیوں کی بھاگ دوڑ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ ایک ایک درخت کی تلاشی لی جارہی تھی۔ مسعود اس عمارت کے اس کمرے میں پہنچا جو اس کے لیے مخصوص تھا۔ غلام ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ کنیزیں حکم کی منتظر تھیں کہ باہر شور کی آواز سنائی دی۔ پھر ایک فوجی بارگاہ میں حاضر ہوا۔

''سلطانِ ذی جاہ! سخت پہرے کے باوجود ایک شخص اندر گھس آیا ہے اور ضد کر رہا ہے کہ اپنے بادشاہ سے ملواؤ۔''

''اسے آنے دو۔ ہم خود اس سے پوچھیں گے کہ اس نے اندر آنے کی جرأت کیسے کی۔''

جب سپاہی اسے لے کر مسعود کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور مسعود کی نظر اس پر پڑی تو وہ گھبرا کر اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔ اب حیران ہونے کی باری غلاموں کی تھی۔ بادشاہ اور اس معمولی آدمی کے استقبال کے لیے کھڑا ہوجائے۔ انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کا کھڑا ہونا استقبال نہیں بلکہ سخت گھبراہٹ میں وہ یہ حرکت کر بیٹھا ہے۔ اس کے سامنے وہی کمبل پوش کھڑا تھا جو اسے مسجد میں نظر آیا تھا۔

''تم یہاں کیسے آئے اور کیا کہنا چاہتے ہو؟'' مسعود نے دوبارہ اپنی جگہ بیٹھتے ہوئے کہا۔

''پہلے ان نامحرموں کو اپنے پاس سے ہٹاؤ۔'' اس شخص نے کنیزوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ مسعود کا وزیر بھی وہیں تشریف فرما تھا۔ اس نے اس شخص کو ڈانٹا۔

''بادشاہوں سے کلام کرتے ہوئے پاسِ ادب شرط ہے۔''

''میں بادشاہ سے نہیں، اپنے داماد سے مخاطب ہوں جسے برات لے کر ہندوستان پہنچا تھا اور یہ ابھی تک یہیں ہے۔''

یہ عجیب و غریب جواب سن کر مسعود کو یقین ہوگیا کہ یہ شخص یا تو پاگل ہے یا مجذوب ہے جو استعاروں کی زبان

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

میں بات کررہا ہے یا پھر بہروپیا ہے۔ اس نے کنیزوں کو باہر جانے کا حکم دے دیا۔

''میں نے نامحرموں کو ہٹا دیا۔ اب کہو کیا کہنا ہے؟''

''ہمدان کے راستے میں کانٹے بچھے ہوئے ہیں۔ تم اپنے براتی بھیجو تاکہ وہ کانٹے ہٹا کر پھول بچھا ئیں۔''

''اے شخص! تو یا تو خود پاگل ہے یا مجھے پاگل بنانے کی کوشش کررہا ہے۔ سچ سچ بتا تو ہے کون؟''

''مخلوقِ خدا مشکل میں ہے اور تو کہہ رہا ہے میں کون ہوں۔''

''مخلوق کو میری ذات سے کیا تکلیف ہے؟''

''ہمدان میں ایک شخص علاؤ الدولہ ہے جس نے تجھ سے زیادہ لشکر جمع کرلیا ہے۔ ادھر سے ادھر لوٹ مار کرتا پھرتا ہے۔ خلقِ خدا اس سے سخت تنگ ہے۔ تجھے وہاں ہونا چاہیے تھا اور تو یہاں عیش وعشرت میں مشغول ہے۔''

''میں پھر بھی یہ پوچھوں گا کہ آپ ہیں کون؟'' مسعود غالباً خوف زدہ ہوگیا تھا کہ ''تو'' سے ''آپ'' پر آگیا تھا۔

''ابھی تھوڑی دیر میں بادل چھا جائیں گے، بجلی چمکے گی، بارش ہوگی پھر تو خود سمجھ جائے گا کہ میں کون ہوں۔''

اس نے کہا اور آنکھیں بند کرکے بیٹھ گیا۔ مسعود کو سخت الجھن ہورہی تھی لیکن وہ اتنا خوف زدہ ہوگیا تھا کہ اسے دھتکارتے ہوئے ڈر رہا تھا۔ اچانک بادلوں کی گرج سنائی دی۔ بادل اتنے گہرے تھے کہ دن میں رات نظر آنے لگی اور پھر ایسی طوفانی بارش ہوئی کہ ہر طرف جل تھل ہوگیا۔ یہ بارش کا موسم نہیں تھا۔

''حضرت! میں آپ سے گستاخی پر معذرت خواہ ہوں۔ میں اب سمجھ گیا آپ صاحب کرامت بزرگ ہیں۔''

''اب میرے نہیں، تیرے کرامت دکھانے کے دن ہیں۔ تیری یہاں نہیں، ہمدان میں ضرورت ہے۔ علاؤ الدولہ کی موت تیرے ہاتھوں لکھی ہے۔ اس کی تقدیر کا فیصلہ جلد کر اور مخلوقِ خدا کو نجات دلا۔''

''حضرت! میں ضرور آپ کی نصیحت پر عمل کروں گا لیکن میں پھر بھی آپ کے بارے میں جاننا چاہوں گا۔ میں نے آپ کو آج سے پہلے غزنی میں نہیں دیکھا۔''

''میں خرقان سے چل کر یہاں تک پہنچا ہوں۔ تیرے والد سلطان محمود نے شیخ ابوالحسن خرقانی سے ملاقات کی تھی۔ انہی کے عطا کردہ خرقے کی بدولت اس نے سومنات کا مندر فتح کیا تھا۔ میں اسی سورج کا معمولی سا ذرّہ ہوں۔ شیخ ابوالحسن، سلطان محمود سے بہت خوش تھے۔ اس خوشی کا کچھ حصہ میری بدولت تجھ تک پہنچا ہے۔ تجھے چاہیے کہ تُو چار چیزوں کو اختیار کرے۔ اول پرہیزگاری، دوم نماز، سوم سخاوت، چہارم شفقت۔''

''اگر آپ سے ملاقات چاہوں؟''

''ملاقات تو ہم نہیں چاہیں گے۔ جب ہمیں تیری ضرورت ہوگی، تجھے دیکھنے چلے آئیں گے۔''

مسعود نے نہایت احترام سے انہیں رخصت کیا اور انہیں چھوڑنے باغ کے دروازے تک آیا۔

''میں نے یہ تو آپ سے پوچھا ہی نہیں کہ آپ کہاں تشریف لے جائیں گے اور سواری کا انتظام کیا ہے۔''

''ہماری فکر چھوڑ و اور ہمدان کی فکر کرو۔ ہمدان ہمیں بہت عزیز ہے۔''

بزرگ نے کہا اور ایک طرف کو چل دیے۔ مسعود انہیں جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

کیا وہ خرقان سے پیدل آئے تھے اور خرقان تک پیدل ہی جائیں گے؟

سلطان نے انہیں اپنی دانست میں رخصت کردیا۔ اس کے کانوں میں اس فقیر کے کہے ہوئے الفاظ گونج رہے تھے۔ ہمدان کے راستے میں کانٹے بچھے ہوئے ہیں۔ تم اپنے براتی بھیجو تاکہ وہ کانٹے ہٹا کر پھول بچھا ئیں۔ وہ محل میں آیا تو بھی یہ الفاظ اس کے ساتھ ساتھ محل میں آئے تھے۔

اس نے اسی وقت تمام اہم لوگوں کا اجلاس طلب کیا اور صورتِ حال پر مشورہ کیا کہ چند لوگوں کو ہمدان کی طرف بھیجا جائے جو یہ دیکھ کر آئیں کہ خلقِ خدا کی تباہی کس حد تک پہنچ گئی ہے۔ اس نے چند فوجیوں کو عام شہری بنا کر ہمدان کی طرف بھیج دیا۔ یہ لوگ چند ہی روز میں معلومات حاصل کرکے واپس آگئے۔ انہوں نے بیان کیا۔

''ایک شخص علاؤ الدولہ نے ایک بہت بڑا لشکر جمع کرلیا ہے۔ اس لشکر کے ساتھ اس نے چاروں طرف تباہی اور بربادی کا کھیل کھیلنا شروع کردیا ہے اور ان علاقوں میں جو ہمارے عامل ہیں ان پر حملہ آور ہوکر کسی کو قتل کررہا ہے اور بہت سوں کو علاقے سے نکلنے پر مجبور کررہا ہے۔ اس طرح وہ اپنے لیے علیحدہ سلطنت قائم کرنے کے درپے ہے۔ لوگ اس کی لوٹ مار سے بہت تنگ ہیں اور آپ کے نام کی دہائی دے رہے ہیں۔''

مسعود کے لیے بس اتنی معلومات کافی تھیں۔ اب اس فقیر کے الفاظ کا مطلب اچھی طرح اس کی سمجھ میں آگیا تھا۔ براتی بھیجنے کا مطلب لشکر بھیجنا تھا۔

اس نے اپنے سپہ سالار التونتاش کو حکم دیا کہ ایک لشکر

WWW.PAKSOCIETY.COM

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف

ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ

کتاب کی مُختلف سائزوں میں اپلوڈنگ

ایڈ فری لنکس

ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر

ناولز اور عمران سیریز کی مُکمل رینج

Click on http://paksociety.com to Visit Us

پاک سوسائٹی کو فیس بُک پر جوائن کریں http://fb.com/paksociety

پاک سوسائٹی کو ٹوئٹر پر جوائن کریں http://twitter.com/paksociety1

پاک سوسائٹی کو گُوگل پلس پر جوائن کریں https://plus.google.com/112999726194960503629

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بُک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بُک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

http://paksociety.com

Downloaded From Paksociety.com

لے کر فوراً ہمدان پہنچے اور تمام کانٹے ہٹا کر پھول بچھادے۔ اسے اس لشکر کو بھیجتے ہوئے نہایت خوشی ہو رہی تھی۔ وہ ایک مجذوب کی خواہش کی تکمیل کر رہا تھا۔

یہ لشکر ابھی ہمدان کے نواح میں پہنچا تھا کہ اسے معلوم ہوگیا کہ یہاں حکمرانی کس کی ہے۔ علاؤ الدولہ ایک بہت بڑے لشکر کے ساتھ راہ روکے کھڑا تھا۔ التونتاش کو بھی اس کے لشکر سے کچھ فاصلے پر رکنا پڑا۔ طلایہ گردوں نے آگے بڑھ کر جائزہ لیا۔ لوٹے تو یہ خبر لائے کہ علاؤ الدولہ ذرا بھی خائف نہیں۔ یہ موقع بھی دینا نہیں چاہتا کہ مسعودی لشکر تھکن اتار لے۔ وہ اپنی فوجوں کو تربیت دے رہا ہے اور کسی بھی وقت حملہ آور ہوسکتا ہے۔

التونتاش نے سرداروں کو مخاطب کیا۔

''ہمیں جنگ کے آغاز ہی سے یہ عزم کرنا ہے کہ آج کا یہ معرکہ ہمیں ہر صورت جیتنا ہے اور علاؤ الدولہ کو شکست دے کر یہاں سے بھگانا ہے۔ اس کا جو لشکر ہے، وہ سامنے آکر لڑنے کا عادی نہیں۔ وہ ہمارا مقابلہ زیادہ دیر نہیں کرسکے گا۔ وہ بھاگ کر اِدھر اُدھر روپوش ہوجائے گا اور وقفے وقفے سے تنگ کرتا رہے گا۔ اس لیے ہمیں ایسی حکمتِ عملی تیار کرنی ہے کہ علاؤ الدولہ کو بھاگنے کا موقع نہ مل سکے۔ میرے آدمی وہ مقامات دیکھ کر آئے ہیں جہاں سے وہ فرار ہوسکتا ہے لہٰذا اپنے لشکروں کو چند حصوں میں تقسیم کرلو۔ ایک حصہ جنگ کرے اور باقی حصے ان مقامات میں چھپے رہیں۔ اگر علاؤ الدولہ کا لشکر بھاگ کر اس طرف کا رخ کرتا ہے تو وہ اس کا مقابلہ کریں۔ اس کے ساتھ ہی جنگ پر بھی نظر رکھیں۔ اگر ہمیں شکست ہو رہی ہے تو تازہ کمک کے طور پر ہماری مدد کو پہنچیں۔ یاد رکھو، ہمارا سامنا بہادر دشمن سے نہیں چالاک دشمن سے ہے۔ یہاں لڑائی کے روایتی اصولوں پر چلنا نہیں ہوگا، اپنے اصول وضع کرنے ہوں گے۔''

ابھی وہ یہ تقریر کر ہی رہا تھا کہ علاؤ الدولہ کے لشکر میں طبلِ جنگ زور زور سے بجائے جانے لگے۔

''علاؤ الدولہ لڑائی میں پہل کرنا چاہتا ہے، لہٰذا ہمیں آگے بڑھنا چاہیے۔''

التونتاش نے اپنے لشکر کو آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ باقی سرداروں کے لشکر دائرے کی شکل میں ادھر ادھر پھیل گئے تاکہ علاؤ الدولہ کے فرار کے راستے مسدود ہوجائیں۔

التونتاش آندھی طوفان کی طرح روانہ ہوا اور علاؤ الدولہ کے لشکر سے ٹکرا گیا۔ علاؤ الدولہ کا لشکر اب بھی پامردی سے مقابلہ کر رہا تھا لیکن کچھ ہی دیر میں اس کی ضد نے اس کا انجام اسے دکھا دیا۔ اس کا لشکر پیچھے ہٹنے لگا۔ اس کے جوش دلانے پر بھی لڑنے کو تیار نہیں تھا۔ اس نے گردن گھما کر دور تک پھیلے ہوئے کوہستانی سلسلے کی طرف دیکھا اور اپنے لشکر کو پیچھے چھوڑ کر اپنا گھوڑا پہاڑوں کی طرف دوڑا دیا۔ لشکر پہلے ہی پسپا ہوگیا تھا۔ اس نے بھی بھاگنے ہی میں عافیت جانی۔

اتنے لشکری جنگ میں نہیں مارے گئے جتنے تعاقب کے دوران قتل ہوگئے۔ تقریباً ایک فرسنگ کے فاصلے پر علاؤ الدولہ کو ایک درّہ نظر آیا جس میں داخل ہوکر وہ پہاڑوں میں غائب ہوسکتا تھا لیکن اس کی بدقسمتی کہ وہاں التونتاش نے ایک چھوٹا سا دستہ پہلے ہی ٹھہرا دیا تھا۔ علاؤ الدولہ نے چاہا کہ ہتھیار پھینک دے۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو اس کا شکست خوردہ لشکر بھاگا چلا آرہا تھا۔ اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کے لشکر کا تعاقب کیا جارہا ہے۔ اپنے لشکر پر نظر پڑتے ہی اس کی ڈھارس بندھ گئی۔ اس نے ایک مرتبہ پھر جنگ کا ارادہ کرلیا۔ اس درّے میں جو لشکر چھپا ہوا تھا اس کی تعداد بہت کم تھی۔ علاؤ الدولہ کو یقین تھا کہ وہ انہیں بھگا دے گا اور پھر جس طرف چاہے گا نکل جائے گا۔ اپنے لشکر کے پہنچتے ہی اس نے ہلا بول دیا۔ دونوں طرف سے تلواریں چلنے لگیں۔ علاؤ الدولہ پھر بھاری پڑنے لگا۔ اتنی دیر میں شاہی لشکر پہنچ گیا۔ اب علاؤ الدولہ اور اس کا لشکر دونوں طرف سے گھر چکا تھا۔ اب فرار کا کوئی موقع نہیں تھا۔ اس نے یہی بہتر جانا کہ لڑتے لڑتے جان دے دی جائے۔ ایسا ہی ہوا۔ کئی تلواریں ایک ساتھ اٹھیں۔ اپنی پیاس بجھا کر واپس آئیں تو اس کا سر اس کے تن سے جدا ہوچکا تھا۔ اس کے بچے کھچے لشکر کا بھی یہی حال ہوا۔ جنہیں موقع ملا، وہ فرار ہوگئے۔ شام ہونے کو تھی اور پہاڑ کے دامن میں لاشیں بکھری پڑی تھیں۔

التونتاش نے علاؤ الدولہ کا سر مسعود کے پاس غزنی بھیج دیا۔ اس کے بعد اس نے حکم دیا کہ کوئی نرم جگہ دیکھ کر گڑھا کھودا جائے اور اسے ان لاشوں سے پاٹ دیا جائے۔ اس نے ان لاشوں کی اجتماعی نمازِ جنازہ کا بھی حکم دیا۔

''مرنے والے تمام لوگ چونکہ مسلمان تھے اس لیے ہم ان کی بے حرمتی گوارا نہیں کرسکتے۔ ان کی نمازِ جنازہ بھی ادا کی جائے اور انہیں دفن بھی کیا جائے۔''

شاید کسی جنگ میں یہ اہتمام کسی نے نہ کیا ہو۔

التونتاش نے کچھ عرصے کے اندر اندر اس ملک کو علاؤ الدولہ کے عاملوں کے قبضے سے نکال لیا۔ محمود کے خراسانی

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

امیروں کی جاگیریں ضبط کرلیں اور ان علاقوں کو اپنی سلطنت میں شامل کرلیا۔

ہمدان میں ابھی جنگ جاری تھی کہ سلطان مسعود غزنوی صفاہان اور ''رے'' کی طرف روانہ ہوا۔ وہ ہرات میں تھا، مسلمانوں کا نجات دہندہ سمجھ کر ''سرخس'' اور باد آورد کے باشندے اس کے پاس آئے اور ترکمان سلجوقیوں کے ظلم وستم کی شکایت پیش کی۔ مسعود یہ شکایتیں اس وقت سے سن رہا تھا جب وہ تخت پر بھی نہیں بیٹھا تھا۔ اس وقت وہ مجبور تھا لیکن اب بااختیار تھا لہٰذا اس کا ضمیر ملامت کررہا تھا کہ وہ اس فتنے کو کیوں نہ جڑ سے اکھاڑ پھینکے۔

ترکمان دراصل وسط ایشیا میں رہنے والے ترک تھے۔ رفتہ رفتہ ترک اور ترکمان دو مختلف گروہوں کے لیے استعمال ہونے لگے۔ ترکمان کبھی بھی اپنی علیحدہ حکومت قائم نہ رکھ سکے۔ مختلف حکومتوں مثلاً ایران، خوارزم، بخارا، افغانستان کے علاقوں میں سکونت اختیار کرلی لیکن جہاں بھی رہے، اپنی آزادی کو برقرار رکھا۔ دوسرے علاقوں میں لوٹ مار ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ بے حد بہادر تھے۔ بسا اوقات ان کے خلاف عسکری مہمیں روانہ کی گئیں جنہیں ترکمانیوں نے شکست دی۔

ترکمانیوں کی بڑھتی ہوئی فتنہ انگیزیوں کو دیکھ کر مسعود نے اپنے ایک سالار عبدالرئیس بن عبدالعزیز کو ایک زبردست لشکر کے ساتھ ترکمانیوں کی سرزنش کے لیے روانہ کیا اور خود غزنی چلا آیا۔

عبدالرئیس نے بارہا ترکمانیوں کے ساتھ جنگیں کیں لیکن ان کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ بس اتنا ہوا کہ عبدالرئیس انہیں پیچھے دھکیلتا رہا اور سلطان کے علاقوں میں داخل نہ ہونے دیا۔

غزنی آنے کے بعد وہ ایک روز محل کی چھت پر بیٹھا تھا۔ کچھ ملول بھی تھا کیونکہ اس کا سالار عبدالرئیس، ترکمانیوں کے مقابلے میں کوئی خاص کامیابی حاصل نہیں کرسکا تھا۔ ہمدان میں جو کامیابی اسے حاصل ہوئی تھی، اس کا خیال آرہا تھا۔ یہ خیال آتے ہی اسے وہ کمبل پوش بھی یاد آیا جس کے کہنے پر وہ ہمدان کی طرف گیا تھا۔ کاش! وہ فقیر پھر مل جائے۔ شاید اس کی دعا سے کوئی کام بن جائے۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ آسمان پر گہرے بادل چھا گئے اور بوندا باندی شروع ہوگئی مگر یہ بوندا باندی ایسی نہیں تھی جو اسے پریشان کرتی۔ وہ اس ہلکی پھوار سے لطف اندوز ہوتا رہا۔

شیکسپیئر کے اقوال

1۔ محبت ایسی شیرینی ہے جس کو چکھ لینے کے بعد دیر تک اس کا ذائقہ برقرار رہتا ہے۔

2۔ شخصیت کی ایک جھلک آواز میں بھی ہوتی ہے۔

3۔ جب تک قدم اٹھتا رہے گا، فاصلے طے ہوتے رہیں گے۔

4۔ مرد محبت میں موسم بہار کی طرح ہوتا ہے اور شادی کے بعد موسم سرما کی طرح ہوتا ہے۔

5۔ لاشعوری خوف شعوری خوف سے زیادہ بے چینی رکھتا ہے۔

6۔ ہر وعدہ ایک فرض ہے اور عزت ایک چیلنج۔

7۔ لہجے کا اثر آواز سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔

8۔ اپنی محبت اپنے بچوں کو دو، جتنی دے سکو مگر اپنا تخیل نہیں۔ ہر بچہ اپنا تخیل اپنے ساتھ لاتا ہے۔

9۔ دل اداس ہو تو گونجتی شہنائیاں بھی انسان کو متوجہ نہیں کرسکتیں۔

(انتخاب: ریاض بٹ، حسن ابدال)

وقت

وقت کی پابندی میں کامیابی کا راز پنہاں ہے کیونکہ وقت کبھی نہیں رکتا، نہ ہی لوٹ کر آتا ہے لہٰذا وقت کا صحیح استعمال ہی عقلمندانہ فیصلہ ہے۔ اگر ہم غور کریں تو معلوم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی ہر چیز اپنا کام مقررہ وقت پر انجام دے رہی ہے۔ مثلاً سورج، چاند، ستارے، پھول، پودے اور پرندے وغیرہ جبکہ انسان اپنی زندگی میں تبدیلی لے آیا ہے۔ رات کو دیر تک جاگنا اور دن کو دیر تک سونا یا بے وقت کھانا اب ہمارا معمول بن گیا ہے تو ہمیں بوڑھے تو کجا بچوں اور جوانوں کو لاحق ہونے والی بیماریوں یا معاشرے میں صبر وتحمل کی کمی پر حیران نہیں ہونا چاہیے۔ کوشش کیجیے کہ وقت کو تھام کر چلیں اور زندگی کے ہر قدم پر اپنے اور دوسروں کے وقت کی قدر کریں۔

مرسلہ: گل ناز رئیس، گلستانِ جوہر، کراچی

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

پھر اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ لاشعوری طور پر اس کی نظر باہر سڑک کی طرف اٹھ گئی۔ اس نے دیکھا، وہی کمبل پوش اس کے محل کے نیچے ٹہل رہا ہے۔ اس کا جی چاہا کہ چیخ چیخ کر اسے محل میں آنے کو کہے لیکن یہ دیوانگی ہوتی۔ ایک غلام پاس کھڑا تھا۔ اسے دوڑایا کہ نیچے کمبل اوڑھے ایک آدمی ٹہل رہا ہے اسے نہایت احترام کے ساتھ محل میں لے کر آئے۔ غلام نیچے چلا گیا۔ مسعود اب بھی اس کمبل پوش پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ اس نے دیکھا کہ غلام نیچے گیا اور اس کمبل پوش سے کچھ بات کرنے لگا۔ اس شخص نے کمبل کے اندر ہاتھ ڈالا اور ایک کاغذ نکال کے اس کے ہاتھوں میں دے دیا، غلام محل کی چھت پر آیا۔

''میں نے تم سے کہا تھا کہ اس شخص کو لے کر اندر آؤ۔'' مسعود نے برہمی سے کہا۔

''سلطانِ محترم! میں نے آپ کا پیغام اس کے گوش گزار کر دیا تھا۔ اپنی طرف سے بھی بہت ضد کی تھی لیکن اس نے یہ کاغذ مجھے دے دیا اور خود ایک طرف کو چل دیا۔''

مسعود نے وہ کاغذ کھول کر پڑھا۔ اس پر لکھا تھا۔

''علی تگین + سمرقند''

یہ دونوں نام اس کے لیے اجنبی نہیں تھے لیکن اس مبہم تحریر کا مطلب واضح نہیں تھا۔ اس کے دربار میں عالموں اور دانش وروں کی کمی نہیں تھی۔ اس نے یہ عبارت (اگر اسے عبارت کہا جائے) سب کو دکھائی لیکن کوئی بھی اس معمے کو حل نہ کر سکا۔

مسعود اس امید پر خاموش ہو گیا کہ شاید وہ فقیر پھر آئے اور اس سے میں اس عبارت کا مفہوم سمجھ لوں۔

دن پر دن گزرتے گئے۔ ہمدان میں امن قائم ہو چکا تھا۔ جو لشکر ہمدان کی طرف گیا تھا، سپہ سالار التونتاش کی سربراہی میں گیا تھا اور اسی کی سربراہی میں واپس ہو چکا تھا۔ اس وقت وہ مسعود کے پاس بیٹھا تھا۔ چند اور سالار بھی تھے۔ امیر مسعود کے دو بیٹے مودود اور مجدود بھی موجود تھے التونتاش ہمدان کے واقعات و انتظامات سے آگاہ کر رہا تھا کہ ہفتوں پہلے بھیجے ہوئے طلایہ گرد اور مخبر مسعود کی اجازت سے دربار میں داخل ہوئے۔

''التونتاش! ہم نے انہیں علاقے کی صورتِ حال جاننے کے لیے روانہ کیا تھا۔ اچھا ہوا کہ یہ لوگ اس وقت واپس آئے ہیں جب تم بھی موجود ہو۔'' مسعود نے کہا اور پھر ان لوگوں کی طرف متوجہ ہوا۔ ''اگر کوئی خاص خبر لائے ہو تو ہمارے حضور پیش کرو۔''

''سلطانِ معظم! سمرقند کا حاکم علی تگین اپنی عسکری طاقت میں اضافے کے بعد تکبر اور گھمنڈ میں مبتلا ہو گیا ہے۔ اس نے ہمارے علاقوں کی طرف کبھی ہوس کی نگاہ سے نہیں دیکھا تھا لیکن اب سمرقند اور بخارا کو مٹھی میں بند کرنے کے بعد ہنگامہ آرائی پر اتر آیا ہے۔ اگر اس کی روک تھام نہ کی گئی تو ہمارے سرحدی علاقے اس کی دستبرد سے محفوظ نہیں رہ سکیں گے۔''

مخبر خبریں دے رہے تھے اور اس کا ذہن ''کمبل پوش'' کے دیے ہوئے کاغذ میں الجھا ہوا تھا۔ سمرقند اور علی تگین کا نام آتے ہی عبارت کا مفہوم اس کی سمجھ میں آ گیا۔ عبارت میں کہا جا رہا تھا کہ سمرقند کے حاکم علی تگین کی چیرہ دستیوں کی روک تھام کے لیے کمر کس لو۔ اس فقیر کے اس طرف توجہ دلانے کا مطلب یہ تھا کہ کامیابی اسی کی ہوگی۔ وہ اپنے خیالوں سے اس وقت چونکا جب التونتاش کی آواز اس کے کانوں میں آئی۔

''سلطانِ معظم! ان حالات میں ہمارے لیے کیا حکم ہے؟''

''اگر علی تگین یہ خیال کرتا ہے کہ اس نے اپنی طاقت اور قوت میں بہت زیادہ اضافہ کر لیا ہے اور کوئی اس کی راہ نہیں روک سکتا تو ہم اس کے وہم کو حماقت میں تبدیل کر کے رکھ دیں گے۔ علی تگین کی سرکوبی کے لیے بہت بڑا لشکر یہاں سے جائے گا۔ اس لشکر کے کماندار تم (التونتاش) ہو گے..... تو پھر تیاری کرو۔ جتنی جلدی ممکن ہو علی تگین سے ٹکرانے کے لیے روانہ ہو جاؤ۔''

تمام سالاروں نے اتفاق کیا۔ سلطان مسعود اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ دربار برخاست ہو گیا۔

لشکر میں خبر پہنچا دی گئی تھی۔ زور و شور سے تیاریاں جاری تھیں۔ تمام بھاری سامان اور سامانِ رسد لشکر کی روانگی سے قبل ہی روانہ کر دیا گیا۔

التونتاش نے دریائے اسویہ کو عبور کر کے پہلے تو بخارا پر حملہ کر کے اسے فتح کیا اور پھر سمرقند کی طرف روانہ ہوا۔

علی تگین کو جب غزنوی لشکر کے آنے کی خبر ملی تو وہ بھی حرکت میں آیا اور سمرقند سے نکل کر کھلے میدان میں آ گیا۔ اس کے طلایہ گردوں نے اسے پہلے ہی اطلاع دے دی تھی کہ غزنوی فوج کب تک یہاں پہنچ جائے گی اور ان کی تعداد کتنی ہے۔ جس میدان میں اس نے پڑاؤ کیا تھا، اس میدان کے ایک طرف تو ایک بہت بڑی نہر بہہ رہی تھی اور دوسری طرف ایک بہت بڑا پہاڑ تھا۔ علی تگین نے بڑی

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

چالاکی سے اپنی فوج کا ایک دستہ اس پہاڑ کے پیچھے چھپا دیا اور خود مقابلے کے لیے تیاری کرنے لگا۔

مسعود کی فوج نے بھی اسی میدان میں آ کر پڑاؤ کیا۔ دیکھا تو علی تگین صفیں باندھے تیار کھڑا تھا۔ التونتاش نے بھی اپنے سرداروں کو حکم دے دیا کہ وہ میمنہ اور میسرہ کو ترتیب دے کر تیار رہیں۔ وہ خود اپنے خاص لشکر کو لے کر ''قلب'' میں آ گیا۔

دونوں فوجیں قدم قدم کر کے آگے بڑھنے لگیں اور پھر سامنے آتے ہی تلواریں چنگاریاں اگلنے لگیں۔ کبھی ایک طرف کی صفیں بے ترتیب ہو جاتیں، کبھی دوسری جانب کی یہ کش مکش گھنٹوں جاری رہی اور طے شدہ منصوبے کے تحت کمین گاہ میں بیٹھے ہوئے علی تگین کے دستے نے مسعودی لشکر کی پشت سے حملہ کر دیا۔ اس اچانک افتاد نے مسعودی لشکر کو بوکھلا کر رکھ دیا۔ انہوں نے پلٹ کر اس حملے کو روکنے کی کوشش کی تو سامنے سے دباؤ بڑھنے لگا۔ اب نہ فرار کا راستہ تھا نہ مقابلے کی سکت۔

اس اچانک حملے میں غزنوی فوج کے بے شمار سپاہی مارے گئے۔ التونتاش بھی زخمی ہوا۔ اتفاق سے یہ زخم جسم کے ایک ایسے حصے پر لگا جہاں پہلے بھی زخم لگا تھا۔ یہ زخم اس وقت آیا تھا جب التونتاش سلطان محمود غزنوی کے ساتھ ہندوستان میں معرکہ آرائی کر رہا تھا۔ وہاں ایک پتھر اس کے سر پر آ لگا تھا۔ اب یہ دوسرا زخم بھی اسی جگہ لگا تھا۔

وہ زخم کھاتے ہی کچھ دیر کے لیے لڑکھڑایا اور پھر ایک کپڑا لے کر زخم پر اچھی طرح باندھ لیا۔ کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیا کہ وہ زخمی ہوا ہے۔ اگر یہ خبر پھیل جاتی تو لشکر میں بددلی پھیل جاتی۔ وہ اسی زخمی حالت میں میدان میں ڈٹا رہا بلکہ اب اور جانفشانی سے لڑ رہا تھا۔ وہ اس جنگ کو جلد سے جلد انجام تک پہنچانا چاہتا تھا۔ اس کے لشکریوں میں بھی اس کی بہادری کو دیکھ کر نیا جوش اور ولولہ پھیل گیا۔ غزنوی لشکر نے بے شمار افراد کو تہ تیغ کیا۔ باقی لوگوں کو میدانِ جنگ سے بھگا دیا۔

التونتاش نے اسی زخمی حالت میں دن کی روشنی گزار دی تھی۔ میدان میں اندھیرے نے قدم رکھا تو علی تگین نے اپنا لشکر واپس بلا لیا۔ غزنوی لشکر بھی اپنے خیموں میں واپس آ گیا۔

اپنے خیمے میں پہنچتے ہی التونتاش نے فوجی سرداروں کو طلب کیا۔ بک تغدی، حسین میکال، تونک بن حسین اور دوسرے سردار اس کے خیمے میں پہنچ گئے۔ وہ یہی سمجھ رہے تھے کہ التونتاش نے انہیں کل کے مقابلے کے لیے مشورہ کرنے کو بلایا ہے لیکن خیمے میں پہنچے تو معاملہ ہی دوسرا تھا۔ وہ زخمی حالت میں زمین پر پڑا ہوا تھا۔ اس نے سر پر بندھا ہوا کپڑا ہٹا دیا تھا۔ زخم کا منہ کھلا ہوا تھا جس پر خون جم گیا تھا۔

''سردار! یہ کیا ہوا..... کیا خیمے میں کوئی شخص چھپا ہوا تھا جس نے آپ کا یہ حال کیا؟ میدانِ جنگ میں تو آپ ٹھیک ٹھاک تھے۔''

''یہ زخم مجھے میدانِ جنگ ہی میں لگا تھا لیکن میں نے کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیا تھا کہ کہیں لشکر میں پریشانی نہ پھیل جائے۔''

''آفرین ہے آپ کی دلاوری اور وفاداری پر۔ آپ نے ابھی تک جراح کو کیوں نہیں بلایا؟ ٹھہریے ہم بلاتے ہیں۔'' تونک بن حسین یہ کہتے ہوئے خیمے سے باہر نکل گیا۔

''اب کسی طبیب یا جراح کو بلانے کی ضرورت نہیں رہی۔ یہ زخم بہت کاری ہے۔ اب میں بچنے والا نہیں۔ چند سانسیں میرے قبضے میں ہیں، سوچتا ہوں تم لوگوں سے کچھ باتیں کر لوں۔ ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ اب مجھ پر بھروسا نہ کرنا۔ میں کسی بھی وقت تم لوگوں سے بچھڑ سکتا ہوں۔ اب تم لوگ آزاد ہو۔ اپنے حالات دیکھ کر اس لڑائی کے بارے میں جو چاہو کرو۔''

اتنی دیر میں طبیب اور جراح خیمے میں داخل ہوئے۔ انہوں نے زخم کا اچھی طرح سے معائنہ کیا۔ اس وقت تک التونتاش پر بے ہوشی طاری ہو چکی تھی۔

''زخم کی حالت بہت خراب ہے۔'' طبیب نے آگاہ کیا۔ ''یہ ہوش میں رہتے تو اچھا تھا لیکن بے ہوش ہو گئے ہیں۔ اگر یہ چوبیس گھنٹے میں ہوش میں آ گئے تو ٹھیک ہے ورنہ اسی بے ہوشی کی حالت میں ان کا انتقال ہو سکتا ہے۔ کاش! یہ زخمی ہوتے ہی میدان سے نکل آتے۔ اس وقت ان کا علاج ہو سکتا تھا۔ سر کی چوٹ تھی، خون بہنا چاہیے تھا۔ انہوں نے زخم چھپانے کے لیے خون کو روک دیا جو زہر بن گیا۔ بہرحال، اللہ بڑا کارساز ہے۔''

طبیبوں نے جمع خاطر کے لیے مرہم پٹی کر دی لیکن جاتے جاتے بھی مایوسی کا اظہار کر دیا۔

''التونتاش کی حالت نازک ہے اور صبح پھر دشمن سے مقابلہ کرنا ہے لہٰذا ہم ابھی طے کر لیں کہ کیا کرنا ہے۔'' حسین میکال نے سوال اٹھایا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

''کیا ہم بزدلوں کی طرح لڑائی کی طرف سے منہ موڑ کر کھڑے ہو جائیں؟'' بک تغدی نے کڑک کر کہا۔

''صلح کرنا مصلحت ہے، بزدلی نہیں۔''

''تو آپ چاہتے ہیں کہ اس موقع پر صلح کر لی جائے؟''

''اس کے سوا چارہ نہیں ہے۔ اگر التونتاش لڑائی میں شریک نہ ہوئے تو لشکر اس دل جمعی سے نہیں لڑ سکے گا لہٰذا ہارنے سے بہتر ہے صلح کر لی جائے۔''

''کیا علی تگین صلح کے لیے تیار ہو جائے گا؟''

''یہ کہنا قبل از وقت ہے۔ اگر وہ نہ مانا تو مجبوری ہوگی، آر یا پار۔''

''کیا اس صلح کی اجازت سلطان سے لینا ضروری نہیں؟''

''شاید نہیں یا شاید سلطان بھی یہ فیصلہ ہم پر چھوڑ دے۔ اسی لیے التونتاش نے بھی کہا تھا کہ اب تم لوگ اپنے حالات کو دیکھتے ہوئے لڑائی کے بارے میں جو چاہو کرو۔''

''اگر دوسرے لوگ بھی اس صلح کے لیے تیار ہیں تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔'' بک تغدی نے کہا۔ دوسرے سرداروں نے بھی حسین میکال کی اس تجویز سے اتفاق کیا کہ اس وقت صلح کر لینا ہی مناسب ہوگا۔ جب اس تجویز پر سب کا اتفاق ہو گیا تو ان فوجی سرداروں نے علی تگین کے پاس ایک قاصد روانہ کیا اور اس سے صلح کی درخواست کی۔

صلح کے لیے یہ شرط رکھی گئی تھی کہ بخارا کو غزنوی سلطنت میں شامل کیا جائے اور سمرقند اور اس کے آس پاس کا علاقہ علی تگین کے قبضے میں رہے۔

علی تگین کو اس شرط میں معقولیت نظر آئی۔ اس نے سوچا بخارا کو غزنوی لشکر نے زور بازو سے حاصل کیا ہے لہٰذا وہ اس کے پاس رہنا ہی چاہیے لیکن اگر سمرقند بھی ان کے پاس چلا گیا تو اس کے پاس کیا رہ جائے گا۔ اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ التونتاش زخمی ہو چکا ہے ورنہ شاید وہ اس صلح پر آمادہ نہ ہوتا۔ التونتاش کی ہیبت نے اسے صلح پر مجبور کر دیا البتہ وہ یہ سوچ ضرور رہا تھا کہ آخر ایسی کیا مجبوری ہے کہ التونتاش کی طرف سے صلح کا پیغام بھیجا گیا ہے۔

علی تگین صلح کر کے سمرقند کی طرف روانہ ہو گیا۔ غزنوی لشکر بھی واپس روانہ ہوا۔ التونتاش اسی زخمی حالت میں سرداروں کے حصار میں تھا۔ اس کی حالت مسلسل تشویشناک تھی۔ سفر کے دوران ہی التونتاش نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ اس کی موت کی خبر کو راستے میں لشکریوں سے چھپائے رکھا۔

خوارزم پہنچ کر التونتاش کی موت کا اعلان کر دیا گیا۔ سلطان مسعود خراسان میں تھا کہ اسے التونتاش کے مرنے کی اطلاع ملی۔ اس نے التونتاش کی خدمات کے صلے میں اس کے بیٹے ہارون کو خوارزم کا حاکم مقرر کر دیا۔

اس کے باپ سلطان محمود نے ہندوستان پر سترہ حملے کیے تھے۔ کوئی راجا ایسا نہیں تھا جو اس کا زخم خوردہ نہ ہو لیکن محمود کی وفات کے بعد تین چار سال کا وقفہ درمیان میں آ گیا تھا۔ مسعود اندرونی شورشوں کو نمٹانے میں مشغول رہا۔ ہندوستانی راجاؤں نے یہ سمجھ لیا کہ اب غزنی سے کوئی یہاں آنے والا نہیں۔ انہوں نے طرح طرح سے مسلمانوں کو ستانا شروع کر دیا تھا۔ ان ہی میں قلعہ سرستی کا راجا تھا۔ یہ قلعہ ''درہ کشمیر'' میں واقع تھا۔ اس راجا نے مسلمانوں کا جینا حرام کر دیا تھا۔ قلعہ سرستی کے اردگرد خاصا بڑا علاقہ اس کے زیر سرپرستی تھا۔ ان علاقوں میں مسلمان بھی خاصی تعداد میں آباد تھے لیکن راجا کے مظالم نے انہیں گھر بار چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔ آنے جانے والے تجارتی قافلے بھی اس کی چھین جھپٹ سے محفوظ نہیں تھے۔ وہ نہ صرف ان کا مال و متاع لوٹ لیتا تھا بلکہ انہیں قید کر کے محض تعصب کی بنا پر ان کو ذلیل کرتا تھا۔ چھوڑتا بھی تھا تو اس وقت جب وہ کوڑی کوڑی کے محتاج ہو چکے ہوتے تھے۔ جیبوں سے پیسے اور جسموں سے جان نکل چکی ہوتی تھی۔

ہندوستان کی طرف سے آنے والے مخبروں کی زبانی اس تک یہ خبریں پہنچتی رہتی تھیں، بالآخر اس کے غزنوی خون نے جوش مارا اور اس نے لشکر کشی کا پختہ ارادہ کر لیا۔

وہ ہر معاملے میں اپنے وزیر احمد بن حسین میمندی سے مشورہ کرتا تھا۔ اس نے جب ہندوستان پر لشکر کشی کا ارادہ کیا تو وہ اس وقت خراسان میں تھا۔ احمد حسین میمندی سے مشورے کے لیے ضروری تھا کہ وہ اسے یہاں بلائے یا خود غزنی پہنچے۔ اس نے یہی بہتر سمجھا کہ خود غزنی چلا جائے اور وہیں سے تیاری کر کے ہندوستان روانہ ہو جائے۔

وہ ابھی واپسی کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اس کے آدمیوں نے مجذوب کمبل پوش کی موجودگی کا سراغ لیا۔ مسعود جہاں بھی جاتا تھا اپنے آدمیوں کو حکم دیتا تھا کہ وہ اس مجذوب کا ٹھکانا تلاش کریں۔ خراسان میں بھی اس کے آدمی کسی ایسے شخص کو تلاش کرتے پھر رہے تھے جو سر سے پاؤں تک کمبل میں لپٹا ہوا اور اب وہ یہ خبر لے آئے تھے کہ خراسان سے باہر جو ندی بہہ رہی ہے، اس کے کنارے ایک جھونپڑی ہے۔ انہوں نے اس شخص کو اس جھونپڑی میں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

دیکھا ہے اور ان کے بقول اس سے باتیں بھی کر کے آئے ہیں۔ بادشاہ فوراً سوار ہوا اور ان کے ساتھ وہاں پہنچ گیا۔ دور دور تک کسی جھونپڑی کا نشان تک نہیں تھا۔ ندی کے کنارے ایک تابوت رکھا تھا۔ مسعود نے اپنے ساتھ آئے ہوئے آدمیوں سے تابوت کھولنے کے لیے کہا۔ تابوت کھولا گیا تو وہ خالی تھا۔ یہ تابوت یہاں کیوں رکھا گیا ہے؟ جھونپڑی کہاں گئی؟ مجذوب کدھر چلا گیا؟ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ اس نے اپنے آدمیوں سے کہا کہ تابوت اپنے ساتھ لے چلیں۔

وہ یہ تابوت لے کر اپنی قیام گاہ پر آ گیا۔ جب وہ غزنی روانہ ہوا تو یہ تابوت اس کے ساتھ تھا۔ وہ ابھی چند منزلیں ہی گیا ہوگا کہ مخالف سمت سے ایک سوار آتا نظر آیا۔ یہ سوار غزنی سے آیا تھا۔ یقیناً کوئی خاص خبر تھی۔

''وزیر سلطنت خواجہ احمد بن حسین میمندی نے قضائے الٰہی سے وفات پائی۔''

یہ خبر سنتے ہی مسعود کو ندی کنارے رکھے تابوت کا خیال آیا جو اب اس کے ساتھ تھا۔ معاملہ ہو گیا۔ مجذوب نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ کسی اہم شخصیت کا انتقال ہوا ہے۔ یہ تابوت اپنے ساتھ لیتے جاؤ۔

احمد بن حسین میمندی کی وفات کی خبر سنتے ہی مسعود کو اس کی پریشانی کے دن یاد آ گئے۔ سلطان محمود غزنوی نے اسے اپنا وزیر مقرر کیا تھا۔ اس عہدے پر وہ اٹھارہ سال تک کام کرتا رہا لیکن اس کی دیانت داری کی بدولت اس کی کشتی بھنور میں آ گئی۔ بڑے بڑے امیر اس کے خلاف ہو گئے اور اس کے خلاف محمود کے کان بھرنے شروع کر دیے۔ ان درباریوں کی باتوں نے محمود کے دل پر اثر کیا اور اس نے احمد بن حسین کو وزارت سے علیحدہ کر دیا اور اسے قید کرا دیا۔ وہ تیرہ سال تک ''کالنجر'' کے قلعے میں اسیری کی زندگی گزارتا رہا۔ یہاں تک کہ مسعود تخت نشین ہوا اور اس نے اس غریب کو رہائی دلا کر اپنا وزیر سلطنت مقرر کیا۔

مصیبت کے دن گزرے ہی تھے کہ وہ ہر قید سے آزاد ہو گیا۔

وہ غزنی پہنچا تو لوگوں کو تعجب کے سوا کیا ہو سکتا تھا کہ وہ احمد بن حسین میمندی کی تدفین کے لیے تابوت بھی ساتھ لایا ہے۔

احمد بن حسین کی تدفین کے بعد نئے وزیر کی تقرری کا مسئلہ درپیش تھا۔ اسے جلد سے جلد حل کرنا اس لیے بھی ضروری تھا کہ اسے ہندوستان کی مہم پر روانہ ہونا تھا۔ اس کی غیر موجودگی میں انتظام سلطنت سنبھالنے کے لیے ایک لائق آدمی کی ضرورت تھی۔ بالآخر ابونصر احمد پر نظر گئی لہٰذا اسے خوارزم سے بلا کر اس عہدے پر متمکن کر دیا گیا۔

ان معاملات سے نمٹنے کے بعد سلطان مسعود غزنوی ہندوستان پر لشکر کشی کے لیے دھوم دھام سے روانہ ہوا اور ''دتہ کشمیر'' میں ''سرستی'' کے قلعے پر پہنچ کر اس کا محاصرہ کر لیا۔

شہر کے اندر جو قلعہ بنایا گیا تھا اس پر اگر ''ناقابل تسخیر'' لکھ دیا جاتا تو بے جا نہ ہوتا۔ قلعہ نہایت مستحکم تھا۔ اس کی اونچی فصیلیں بے جوڑ پتھروں سے تعمیر کی گئی تھیں۔ ان فصیلوں کے گرد گہری خندق تھی جو چاروں طرف سے قلعے کو اپنے حصار میں لیے ہوئے تھی۔ راجا نے اس خندق کو عبور کرنے کے لیے ایک جگہ متحرک پل بنایا تھا۔ جسے بوقتِ ضرورت خندق کے ایک حصے پر دیوار کی طرح بچھا دیا جاتا تھا اور جب ضرورت نہ رہتی، قلعے کے اندر کھینچ لیا جاتا۔ اس پل کے بغیر خندق عبور کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

مسعود غزنوی نے مجبوراً اس خندق سے کچھ فاصلے پر خیمے لگانے کا حکم دے دیا۔ یہ جگہ قلعے سے کم از کم اتنی دور ضرور تھی کہ فصیل سے چلنے والے تیر یہاں تک نہ پہنچ سکیں اور پہنچیں بھی تو موثر نہ ہوں۔ ایک لحاظ سے یہ جگہ نہایت محفوظ تھی۔ قلعے میں محصور راجا کے لیے مشکل یہ تھی کہ اس کا رابطہ باہر کی دنیا سے منقطع ہو چکا تھا۔ اس کے پاس تازہ رسد نہیں پہنچ سکتی تھی۔ وہ صرف اتنے دن محصور رہ سکتا تھا جتنے دن کا غذائی سامان اس کے پاس موجود تھا۔ مسعود کو بھی کوئی جلدی نہیں تھی۔ اس کے لشکر کو تھکن اتارنے کا موقع مل رہا تھا۔

غزنوی لشکر محاصرہ کیے پڑا تھا۔ دونوں طرف سے چھیڑ چھاڑ ہوتی رہتی تھی۔ کبھی فصیل سے تیر برسائے جاتے تھے، کبھی لشکر کی طرف سے فصیل کو نشانہ بنایا جاتا تھا لیکن دونوں کی کوششیں بے کار جا رہی تھیں۔ اس تیر اندازی کا بس اتنا فائدہ ہو رہا تھا کہ دونوں لشکر اپنی موجودگی کا احساس دلا رہے تھے۔

ایک ہفتہ گزر گیا تھا، نہ راجا کو قلعے سے باہر آنے کی ہمت ہو رہی تھی نہ غزنوی لشکر کو خندق عبور کرنے کی کوئی صورت نظر آ رہی تھی۔ خندق عبور بھی کر لی جاتی تو دیو پیکر فصیل سامنے تھی۔

قلعے کے اندر بھی پریشانی ہی پریشانی تھی۔ اس وقت بھی راجا فصیل کے ایک برج سے غزنوی لشکر کا جائزہ لے کر آیا تھا اور پہلے سے زیادہ پریشان نظر آ رہا تھا۔ اس کی

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

فوج کا سینا پتی بھی اس کے ساتھ تھا۔

''ٹوڈرمل! تم نے پڑاؤ کی حالت دیکھی؟''

''دیکھی مہاراج۔''

''کیا کہتے ہو ان مسلمانوں کے بارے میں؟''

''کہنا کیا ہے مہاراج! کب تک پڑے رہیں گے۔ اٹھ کر خود ہی چلے جائیں گے۔''

''یہ تم نے کیسے کہہ دیا؟''

''مہاراج! خندق پار کرنا ان کے بس کی بات نہیں۔ اگر خندق پار کر بھی لی تو فصیل کی دیوار توڑنا ان کے لیے ناممکن ہوگا۔ خندق پار کی تو ہمارے تیر انداز انہیں چھلنی کر کے رکھ دیں گے۔''

''مجھے معلوم ہے کہ یہ سب تم مجھے خوش کرنے کے لیے کہہ رہے ہو۔ حقیقت کچھ اور ہے جو تم بھی جانتے ہو۔''

''جو اندازہ میرا تھا، وہ میں نے مہاراج کو بتا دیا۔''

''تم یہ بات اچھی طرح جانتے ہو کہ قلعے میں موجود خوراک کے ذخیرے میں کمی آتی جا رہی ہے۔''

''جی مہاراج۔''

''ہمیں بروقت معلوم نہ ہو سکا تھا کہ مسعود غزنوی یہاں پہنچنے والا ہے ورنہ ہم قلعے میں زیادہ خوراک جمع کر لیتے۔''

''جی مہاراج۔''

''کیا جی مہاراج کی رٹ لگائی ہوئی ہے۔ بولتے کیوں نہیں کہ اب کیا کیا جائے؟ گنے کی فصل پک چکی ہے۔ ان مسلمانوں کے پاس اگر خوراک ختم بھی ہوگئی تو گنے کی فصل کاٹ کر مہینوں زندہ رہ سکتے ہیں۔''

''مہاراج! مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ قلعے میں خوراک کا ذخیرہ ختم ہونے کو ہے۔ اب تو ہمیں باہر نکل کر لڑنا ہی پڑے گا۔''

''کیا تم محمود غزنوی کو بھول گئے ہو؟ وہ جب آتا تھا اپنے ساتھ موت کا عذاب لے کر آتا تھا۔ مسعود غزنوی اس کا بیٹا ہے۔ یہ لشکر وہی خونخوار لشکر ہے۔ اگر یہ ہم پر غالب آ گیا تو ہم میں سے کسی کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔''

''پھر تو ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے۔ ہم مسعود غزنوی سے صلح کر لیں۔''

''کن شرائط پر؟''

''صلح ہم کر رہے ہیں اس لیے شرائط ایسی ہوں جو مسعود کے لیے پرکشش ہوں۔''

''بس اب تم جاؤ۔ میں سوچتا ہوں کہ شرائط کیا ہوں۔''

یہاں سے اٹھ کر وہ اپنی رانی کے پاس گیا۔ رانی بھی اس محاصرے سے پریشان تھی۔ راجا کی کمزوری اس پر ظاہر ہو چکی تھی۔ وہ خود یہ سوچ رہی تھی کہ راجا سے بات کرے گی۔ راجا نے خود یہ موقع دے دیا اور ٹوڈرمل سے ہونے والی تمام گفتگو اسے بتا دی اور خود اس سے بھی مشورہ مانگا۔

''میں تو خود آپ سے بات کرنے والی تھی۔ ہماری سات بیٹیاں ہیں اور ساتوں جوان ہیں۔ میں نے سنا ہے مسلمان بڑے عیاش ہوتے ہیں۔ جنگ میں جو لڑکیاں ان کے ہاتھ آتی ہیں انہیں داسیاں بنا کر رکھتے ہیں۔ آپ اس مصیبت کو جلد سے جلد یہاں سے ہٹائیں ورنہ میں خود ان کے پاس پہنچ جاؤں گی۔ ان سے کہوں گی کہ مجھے اور میری بیٹیوں کو راستہ دے دو پھر تم جانو اور راجا جانے۔''

''تم کیسی بیوی ہو کہ اس مشکل گھڑی میں میرا ساتھ نہیں دے رہی ہو۔''

''میں آپ سے پہلے ہی کہتی تھی کہ مسلمان رعایا کو زیادہ تنگ مت کرو۔ انہی میں سے کسی نے شکایت کی ہوگی جو یہ مسلمان بادشاہ ہم پر چڑھائی کرنے آ گیا۔ اسے دفع کرو ورنہ میں اپنی جان دے دوں گی۔''

''ٹوڈرمل کہتا ہے صلح کر لوں۔''

''خود سوچو، جب لڑنے والا خود صلح کا کہہ رہا ہے تو تم کیا اکیلے لڑو گے؟''

''ٹھیک ہے بھاگوان! جب تیری بھی یہی رائے ہے تو مجھے کیا۔''

راجا کا دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن مرتا کیا نہ کرتا۔ حالات ایسے ہو گئے کہ اسے صلح پر تیار ہونا پڑا۔ اس نے ٹوڈرمل اور دوسرے سالاروں سے مشورے کے بعد صلح نامے کی عبارت تیار کر لی۔

''ہم اس شرط پر صلح کرنے کے لیے تیار ہیں کہ بادشاہ ہمیں قتل نہ کرے۔ اس کے صلے میں ہم اسی وقت ایک بہت بڑی رقم بطور نذرانہ پیش کریں گے اور آئندہ بھی اسی طرح ہر سال ایک معقول رقم خراج کے طور پر ادا کرتے رہیں گے۔''

راجا نے یہ درخواست ایک قاصد کے حوالے کی کہ وہ اسے سلطان مسعود تک پہنچا دے اور اس کا جواب لے کر فوراً قلعے میں آ جائے۔

راجا کے حکم سے متحرک پل نے اپنا کام شروع کر دیا۔ قلعے کا دروازہ کھلا۔ متحرک پل نے جنبش کی اور خندق کا ایک بڑا حصہ خندق کی چھت بن گیا۔ قاصد کے گھوڑے نے اس

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

چھت پر قدم رکھ دیا۔ اس کے پیچھے ایک اور سوار آیا۔ دروازے پر کھڑے پہرے داروں نے یہی سوچا ہوگا کہ راجا نے ایک نہیں، دو قاصد روانہ کیے ہیں۔ جب گھوڑے خندق کی دوسری طرف چلے گئے تو اس نے پل ہٹالیا۔

قاصد کو احساس ہوا کہ اس کے پیچھے ایک سوار اور آرہا ہے تو اس نے پلٹ کر دیکھا لیکن جتنی دیر میں وہ رک کر اس کا انتظار کرتا، پیچھے آنے والا سوار ایک طرف مڑا اور گنے کے کھیتوں کی طرف چلا گیا۔ وہ گھوڑے سمیت ان کھیتوں میں داخل نہیں ہوسکتا تھا۔ اس نے گھوڑا وہیں چھوڑا اور پیدل چلتا ہوا گنے کے کھیت میں داخل ہوگیا۔

قاصد کچھ دیر اس عجیب وغریب آدمی کو دیکھتا رہا پھر آگے بڑھ گیا کہ ہوگا کوئی..... مجھے کیا۔

جب وہ قاصد لشکر کے بالکل قریب پہنچ گیا تو اس نے سفید جھنڈا بلند کرلیا تاکہ لشکر سے اس کی جانب کوئی تیر نہ چلایا جائے۔ لشکر میں پہنچتے ہی اس نے زور سے آواز دی۔

''مجھے تمہارے بادشاہ سے ملنا ہے۔''

چند سپاہی آگے بڑھے اور اسے اپنے گھیرے میں لے لیا۔

''تم کون ہو اور بادشاہ سے کیوں ملنا ہے؟''

''ہم راجا کی جانب سے صلح کا پیغام لے کر آئے ہیں۔''

سپاہیوں نے اسے سلطان مسعود کی خدمت میں پہنچادیا۔ اس وقت اس کے دو سردار بک تغدی اور حسین میکال بھی بیٹھے تھے۔ باتیں یہی ہو رہی تھیں کہ محاصرہ اٹھا کر غزنی چلا جائے یا قلعے کی تسخیر کی کوئی ترکیب نکالی جائے۔ سلطان مسعود نے یہی مناسب سمجھا کہ ان لوگوں کی موجودگی ہی میں قاصد کا پیغام پڑھا جائے۔

جب قاصد پیغام پڑھ کر سنا چکا اور جواب کا طالب ہوا تو مسعود نے سالاروں کی طرف دیکھا۔

''اس سے کہیے جواب کے لیے کل پھر حاضر ہو۔''

قاصد کے چلے جانے کے بعد حسین میکال سلطان مسعود سے مخاطب ہوا۔

''سلطان! یہ تو بہت اچھا ہوا کہ صلح کے لیے ہمیں ہاتھ نہیں بڑھانا پڑا۔ شرائط بھی نہایت معقول ہیں اگر ہم قلعہ فتح بھی کرلیتے تو بھی مفتوح راجا کے سامنے یہی شرائط رکھتے۔''

''جب آپ اتنے ہی مطمئن تھے تو مثبت جواب اسی وقت کیوں نہیں دے دیا؟''

''ہم اپنی کمزوری ظاہر نہیں ہونے دینا چاہتے تھے۔ ہم کیوں ظاہر کرتے کہ ہمیں جلدی ہے۔''

سلطان مسعود ارادہ کرچکا تھا کہ ان معقول شرائط پر وہ صلح کرلے گا اور غزنی واپس چلا جائے گا۔ اگر اس نے قلعہ فتح بھی کرلیا تو بھی وہ انہی شرائط پر غزنی واپس جائے گا تو کیوں نہ ابھی چلا جائے۔ ابھی یہ مجلس برخاست نہیں ہوئی تھی کہ چند سپاہی ایک شخص کو پکڑ کر اس کے حضور لائے۔ اس کے کپڑے دھول اور مٹی میں اٹے ہوئے تھے۔ کئی جگہ سے پھٹ بھی گئے تھے۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔

''کون ہے یہ؟'' سلطان مسعود نے پوچھا۔

''سلطان! یہ کہتا ہے مسلمان ہے اور آپ سے کچھ بات کرنا چاہتا ہے۔''

''اس کے لباس سے تو یہی ظاہر ہو رہا ہے کہ یہ مسلمان ہے۔ بہرحال تم لوگ جاؤ۔ اسے یہیں چھوڑ دو، ہم خود اس سے بات کرتے ہیں۔''

وہ شخص اتنا تھکا ہوا تھا کہ اجازت لیے بغیر ہی زمین پر بیٹھ گیا۔ مسعود نے محسوس ضرور کیا لیکن اس کی حالت دیکھ کر اس سے کوئی باز پرس نہیں کی۔

''اب کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟'' مسعود نے پوچھا۔

''حضور! ہم چند مسلمان تاجر اپنے وطن سے نکلے اور بدقسمتی سے ان کافروں کے ہاتھوں گرفتار ہوگئے ہیں۔ ان ہندوؤں نے ہم پر طرح طرح سے تشدد کیا۔ ہماری تمام دولت چھین لی اور قلعے میں ہم سے غلاموں کی طرح کام لیا جاتا ہے۔ اگر آپ نے صلح کرلی تو آپ کے جانے کے بعد یہ ہندو ہم پر مصیبت ڈھائیں گے اور زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ اگر ہمیں چھوڑ بھی دیا تو کسی اور قافلے کو قیدی بنالیں گے۔ یہ سلسلہ یونہی چلتا رہے گا۔ اگر آپ نے قلعہ فتح کرلیا اور اپنی عمل داری قائم کرلی تو مسلمان محفوظ ہوجائیں گے۔ آپ راجا کو پابند بھی کرسکتے ہیں کہ وہ مسلمانوں پر ظلم نہ ڈھائے۔''

''وہ تو سب ٹھیک ہے لیکن تم قلعے میں تھے تو تمہیں قلعے سے باہر کس نے آنے دیا؟''

''مجھے معلوم ہوا تھا کہ قاصد صلح کا پیغام لے کر باہر جارہا ہے۔ میں نے کچھ اشرفیاں چھپا کر اپنے پاس رکھ لی تھیں۔ وہ اشرفیاں اس وقت کام آگئیں۔ میں نے قلعے کے دروازے پر کھڑے دو پہرے داروں میں وہ اشرفیاں بانٹ دیں۔ انہوں نے ایک گھوڑے کا انتظام کردیا۔ قاصد جونہی باہر نکلا، میں بھی اپنے گھوڑے پر سوار ہوا۔ اس سے پہلے کہ متحرک پل اپنی جگہ واپس آتا، میں بھی خندق پار کرگیا۔ قاصد نے مجھے دیکھ لیا تھا اس لیے میں دوسری طرف مڑ گیا اور گنے کے کھیتوں میں داخل ہوگیا۔ یہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

راستہ اتنا طویل ہوجائے گا، یہ مجھے معلوم نہیں تھا۔ میں بڑی مشکل سے آپ تک پہنچا ہوں۔ ہاں، میں ایک بات اور بتادوں۔ قلعے میں خوراک کا ذخیرہ بہت کم رہ گیا ہے۔ اس لیے راجا صلح پر مجبور ہوا ہے۔ میں پھر یہ کہوں گا کہ اگر آپ نے صلح کرلی تو آپ کے جانے کے بعد راجا ہمارا جینا دوبھر کردے گا۔''

اس تقریر کو سن کر مسعود کے دل میں جذبۂ اسلامی نے جوش مارا اور اس نے صلح کا ارادہ ترک کردیا۔ دوسرے دن جب وہی قاصد صلح کے پیغام کا جواب لینے آیا تو مسعود نے صاف کہہ دیا۔

''ہمیں ان شرائط پر صلح منظور نہیں۔ اپنے راجا سے کہو جنگ کی تیاری کرے۔ یا تو خود باہر نکل آئے یا ہم کسی نہ کسی طرح قلعے میں داخل ہوجائیں گے۔''

مسعود نے شاید پہلے ہی سوچ لیا تھا کہ کیا کرنا ہے۔ اس نے لشکر کو حکم دیا کہ قریب کے کھیتوں سے گنے کاٹ کاٹ کر خندق میں ڈالتے رہیں۔ اس علاقے میں گنا بہ افراط پیدا ہوتا تھا لہٰذا کوئی کمی نہیں ہوئی اور خندق کی سطح اتنی بلند ہوگئی کہ بہ آسانی قلعے تک پہنچا جاسکتا تھا۔ اوپر سے تیر اندازی ہوتی رہی۔ بہت سے مسلمان شہید بھی ہوئے لیکن لشکر فصیل کے نیچے پہنچ گیا۔ قلعے میں موجود راجا کا لشکر اتنا پریشان ہوچکا تھا کہ اس نے خود قلعے کا دروازہ کھول دیا اور لڑے بغیر ہتھیار ڈال دیے۔

مسلمانوں نے ہندوؤں کو قتل کیا۔ ان کے بیوی بچوں کو قید کیا اور ان کا مال و اسباب اپنے قبضے میں کرلیا۔ مسلمان تاجروں کو ان کی دولت واپس کردی اور انہیں رہا کرایا۔

راجا کو گرفتار کر کے سلطان کے سامنے پیش کیا گیا۔

''ہمیں یہ شکایت پہنچی ہے کہ تم مسلمان تاجروں پر مظالم ڈھاتے رہے ہو۔ کیا تم نے اپنی طاقت کا غلط استعمال نہیں کیا؟ کیا تم یہ سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کا کوئی والی وارث نہیں؟ تم نے دیکھ لیا کہ مسلمانوں کی حمایت کرنے والے کیسے طاقتور ہیں۔''

''مجھ سے واقعی پاپ ہوگیا۔ اگر اب مجھے موقع ملا تو میں مسلمانوں کا برابری سے خیال رکھوں گا۔''

''اگر میں صلح کرلیتا تو تم اسے میری کمزوری سمجھتے۔ اب تم نے دیکھ لیا کہ غزنی سے ہندوستان دور نہیں۔ میں کسی بھی وقت تمہاری سرزنش کے لیے آسکتا ہوں۔''

''میں آپ کا اطاعت گزار رہوں گا۔''

''اس کی کیا ضمانت ہے؟''

''آپ مجھ پر بھروسا کریں۔''

''میں نے اپنے ایک آدمی احمد نیالتگین کو ہندوستان کا سپہ سالار بنا کر لاہور بھیجا تھا۔ وہی میرا نمائندہ ہوگا جو تم پر نظر رکھے گا اور تم اس کے سامنے جوابدہ ہوگے۔ پابندی سے خراج ادا کرتے رہو گے۔''

''مجھے منظور ہے۔''

مسعود نے سوچا تھا کہ وہ کچھ دن ہندوستان ہی میں رہے گا۔ اس سلسلے میں احمد نیالتگین سے خط کتابت بھی ہوگئی تھی کہ وہ کچھ دن بعد یہاں سے رخصت ہوگا اور لاہور میں قیام کرے گا لیکن اسے چند خبروں نے غزنی کی طرف لوٹ جانے پر مجبور کردیا۔ یہ خبریں طبرستان کی طرف سے آرہی تھیں جہاں کے حاکم ابا قالنجار نے لوٹ مار کا بازار گرم کردیا تھا۔ سلطان کی مملکت کے ایک علاقے پر بھی قبضہ کرلیا تھا اور دوسرے علاقوں کی طرف للچائی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ مسعود کی مسلسل غیر حاضری نے اسے اور بھی شیر بنا دیا تھا۔ مسعود کے وزیر مملکت نے کئی مرتبہ اس کی طرف لشکر روانہ کیے لیکن ترکمانیوں کی طرح وہ بھی ناقابل تسخیر معلوم ہورہا تھا۔ اب تو یہ ڈر لگنے لگا تھا کہ کہیں وہ غزنی پر ہی دھاوا نہ بول دے۔ ابونصر وزیر مملکت نے اس کی طرف قاصد دوڑائے تو اس نے ''سرخس'' کو خیرباد کہا اور کچھ دن لاہور میں قیام کرتا ہوا غزنی کی طرف روانہ ہوگیا۔ غزنی میں اس کا بے چینی سے انتظار ہورہا تھا۔ اس کے پہنچتے ہی ایک مرتبہ پھر غزنی کے بازاروں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ جنگ کے بادل پھر منڈلانے لگے۔

مسعود کا لشکر ہندوستان کے سفر سے تھکا ہوا لوٹا تھا۔ اس نے لشکر کو آرام کرنے کی غرض سے ایک ہفتے تک غزنی ہی میں روکے رکھا۔ ابونصر نے مشورہ ضرور دیا تھا کہ مسعود غزنی ہی میں رہے اور اس کا کوئی لائق سالار یا فرزندوں میں سے کوئی اس مہم پر روانہ ہو لیکن اس نے خود جانا ضروری سمجھا۔

''یہ مہم اتنی آسان ثابت نہیں ہوگی۔ قدم قدم پر میرے مشوروں کی ضرورت ہوگی۔ اس لیے میرا جانا ضروری ہے۔''

سلطان مسعود جس مہم کو بہت مشکل سمجھ رہا تھا، امیر طبرستان کی بزدلی نے اسے اتنا ہی آسان بنا دیا۔ مسعود کے لشکر نے طبرستان پہنچتے ہی وہاں کے دو شہروں ''آمل'' اور ''ساری'' کو فتح کرنے کا ارادہ کیا۔ ابھی تک طبرستان کی فوج وہاں نہیں پہنچی تھی۔ وہاں کے باشندوں نے متفق ہوکر

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

مسعودی لشکر کا مقابلہ کیا۔ یہ شہر نہایت جنگجو قبائل پر مشتمل تھے۔ مقابلہ بھی خوب کیا لیکن باقاعدہ تربیت یافتہ فوج سے ان کا کیا مقابلہ۔ چند گھنٹے بھی نہیں گزرے تھے کہ دونوں شہر مسعود کی دونوں ہتھیلیوں پر آ گئے۔

یہ دونوں شہر پلک جھپکتے میں مسعود کے قبضے میں چلے گئے تھے۔ مسعود اپنے لشکر کو لے کر ''گورگان'' چلا گیا۔ دراصل وہ اپنے لشکر کو ستانے کا موقع فراہم کرنے کے بعد نئی مہم کی ابتدا کرنا چاہتا تھا۔

امیر طبرستان کو جب ان شہروں کے ہاتھ سے چلے جانے کا علم ہوا تو اسے اپنے مرکزی شہر کی فکر ہوئی۔ نہ جانے کب سلطان متحرک ہو جائے اور یلغار کر دے۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ کتنا ہی بڑا لشکر تیار کر لے، سلطان کا مقابلہ نہیں کر سکتا چنانچہ اس نے اپنے سالاروں سے مشورہ کرنے کے بعد اپنا ایک وفد گورگان بھیجا اور امان طلب کی۔

''سلطان محترم! ہم ابا قا کالنجر کا پیغام لے کر آئے ہیں۔ اس نے یہ پیغام دے کر ہمیں بھیجا ہے کہ آنے والے دور میں وہ آپ کا مطیع اور فرماں بردار بن کر رہے گا۔ اس کے علاقے میں نہ صرف آپ کے نام کا خطبہ پڑھا جائے گا بلکہ آپ کے نام کا سکہ بھی جاری ہوگا۔''

''ہمیں خوشی ہوئی کہ اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ وہ آئندہ سرکشی پر نہیں اترے گا اور ہمارے علاقے کو نقصان نہیں پہنچائے گا؟''

''ہم نے بھی اپنے آقا سے اس موضوع پر بات کی تھی۔ وہ ضمانت کے طور پر اپنے بیٹے اور بھتیجے کو آپ کے پاس بھیجنے کو تیار ہے۔''

''جب وہ اس ضمانت کی تکمیل کر دے گا تو ہم بھی غزنی واپس چلے جائیں گے۔''

ابا قا کالنجر نے اپنے بیٹے بہمن اور اپنے بھتیجے شیرو بہ کو ضمانت کے طور پر سلطان کے پاس گورگان روانہ کر دیا۔ سلطان چند روز قیام کے بعد روانہ ہو گیا۔

وہ نیشاپور میں تھا کہ وہاں کے باشندوں نے اس کے پاس آ کر ترکمان سلجوقی کے مظالم کی شکایت کی۔ وہ اس سے پہلے بھی ترکمانیوں کے خلاف مہم چلا چکا تھا۔ اس کا سالار عبدالرئیس بن عبدالعزیز ترکمانیوں کی بیخ کنی کے لیے کئی لڑائیاں لڑ چکا تھا لیکن اسے کوئی کامیابی نہ مل سکی تھی۔ یہ لوگ آوارہ گرد لڑاکا تھے۔ کچھ دیر مقابلہ کرتے تھے پھر روپوش ہو جاتے تھے۔ پھر کہیں سے برآمد ہو جاتے تھے۔ لوٹ مار کا بازار گرم کرتے تھے۔ پھر روپوش ہو جاتے تھے۔ یہ لوگ چونکہ ایک بڑے علاقے میں پھیلے ہوئے تھے اس لیے ان کا سدباب مشکل ہو رہا تھا۔ اس مرتبہ مسعود نے بک تغدی اور حسین بن علی میکال کو ایک زبردست فوج کے ساتھ ترکمانیوں کی سرزنش کے لیے روانہ کیا۔

ترکمانی چیونٹیوں کی طرح پہاڑوں پر پھیلے ہوئے تھے اور غزنوی فوج کا مشاہدہ کر رہے تھے۔ جب یہ فوج ایک مقام ''شقید القاق'' پر پہنچی تو ان چیونٹیوں نے رینگنا شروع کیا۔ چند لوگ پہاڑ سے نیچے اترے اور سالار بک تغدی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

''ترکمانی یہ درخواست کرتے ہیں کہ ہماری ساری قوم غزنویوں کی تابع اور فرماں بردار ہے۔ ہم اگر لوٹ مار کرتے ہیں تو یہ ہماری معاشی مجبوری ہے لہٰذا اگر امیر مسعود ہماری معاش کے لیے زمین کی حد بندی کر دے تو ہم اقرار کرتے ہیں کہ آئندہ ہم کسی کو نقصان نہیں پہنچائیں گے۔''

بک تغدی دور دراز کا سفر کرتا چلا آ رہا تھا۔ ترکمانیوں کی پچھلی حرکتیں بھی یاد تھیں۔ اس نے نہ صرف یہ کہ ان لوگوں کی بے عزتی کی بلکہ نہایت سخت جواب دے کر انہیں لوٹا دیا۔

''ترکمانیوں سے جا کر کہہ دو کہ اطاعت کا اقرار کریں اور آئندہ کسی بداعمالی کے مرتکب نہ ہوں۔ اپنا ایک قابلِ اعتبار آدمی بھیج کر میرے نام ایک شاہی فرمان منگوائیں تاکہ میں ترکمانیوں سے کسی قسم کا تعرض نہ کروں۔ اگر یہ شرائط منظور نہیں تو ہمارے اور ان کے درمیان تلوار سے صلح ہوگی۔''

ترکمانی ایسی بے عزتی کہاں برداشت کرنے والے تھے۔ سب کے سب پہاڑوں سے اتر آئے۔ غضب کا رن پڑا۔ ان کی سرفروشی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی لیکن غزنوی لشکر ایسی جانبازی سے لڑا کہ ترکمانیوں کے قدم اکھڑنے لگے۔ وہ ایسے مواقع پر فرار کا راستہ اختیار کرتے تھے۔ کچھ دنوں کے لیے روپوش ہو جاتے تھے اور پھر وہی لوٹ مار کا راستہ اختیار کرتے تھے۔ انہیں جب پوری طرح یقین ہو گیا کہ بک تغدی کے سامنے ان کا زور نہیں چل سکے گا تو وہ جنگ سے بھاگ گئے۔

بک تغدی نے دور تک ان کا تعاقب کیا۔ ان کے مال و دولت پر قبضہ کر لیا اور ان کے اہل و عیال کو گرفتار کر لیا۔ غزنوی لشکر بھی لوٹ مار کے لیے ادھر ادھر منتشر ہو گیا۔ غزنوی لشکر یہی سمجھ رہا تھا کہ اب جنگ ختم ہو گئی۔ بہت سوں نے تو اپنے ہتھیار بھی اتار کر رکھ دیے تھے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

ترکمانیوں کو ایک اچھا موقع ہاتھ آ گیا۔ انہوں نے درّۂ کوہ سے نکل کر بک تغدی پر حملہ کر دیا۔ غزنوی لشکر منتشر ہو چکا تھا لیکن اس کے باوجود نہایت بہادری سے لڑا۔ بہت سے آدمی گنوا کر انہوں نے اپنی صفیں بھی درست کر لیں۔ طرفین میں دو دن دور اتوں تک زبردست لڑائی ہوتی رہی۔ غزنوی سپاہیوں کی تعداد کم تھی، اس لیے میدان جنگ سے ان کے قدم اکھڑنے لگے۔ بک تغدی کو مصلحت اسی میں نظر آئی کہ میدانِ جنگ سے فرار ہو جائے۔ اس نے اپنا گھوڑا دوڑایا اور حسین بن علی میکال کے گھوڑے کی قریب پہنچ گیا۔

''میکال! اب لڑنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ لشکر ہمت ہار بیٹھا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ ہم میدانِ جنگ سے بھاگ کر اپنی جانیں بچائیں۔''

''یہ کہاں کی بہادری ہے کہ ہم لشکر کو چھوڑ کر خود بھاگ جائیں۔''

''ترکمانیوں کو لشکر کی نہیں، اس وقت ہماری تلاش ہے۔ لشکر ہمارے دفاع کے لائق نہیں رہا ہے۔ اپنی جان بچاؤ۔''

''اپنی جان بچانے کے لیے میری تلوار بہت ہے۔''

''تم کس کس سے لڑو گے؟ میری بات اب بھی مان لو۔''

''مجھے مرنا منظور ہے لیکن بھاگ نہیں سکتا۔''

''میرے دوست مجھے معاف کر دینا۔ میں یہاں سے نکلتا ہوں۔ زندہ بچ گیا تو امیر مسعود تک ضرور پہنچوں گا۔'' بک تغدی نے کہا اور صفیں چیرتا ہوا نکل بھاگا۔

میکال استقلال سے لڑتا رہا لیکن ترکمانیوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا۔ بک تغدی نیشاپور پہنچ گیا اور امیر مسعود کے قدموں میں تلوار رکھ دی۔

مسعود نے شکست کا حال سنا تو اسے سخت صدمہ ہوا۔ ناکام و نامراد واپس غزنی روانہ ہوا۔

وہ ابھی ترکمانیوں سے دوسرے ٹکراؤ کا منصوبہ بنا ہی رہا تھا کہ لاہور کے ناظم احمد نیالتگین کی بغاوت کی خبریں اس تک پہنچیں۔ اس کی فوج تھکی ہوئی تھی۔ مسعود کا شوقِ دیوانگی اس کے سپاہیوں کو آرام کا موقع ہی نہیں دے رہا تھا۔ لوگ برسوں سے اپنے گھر نہیں گئے تھے۔ روز روز کی محاذ آرائیوں سے تنگ آ چکے تھے۔ اب لاہور کا مرحلہ درپیش ہو گیا تھا لہٰذا لشکر میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ سالار بک تغدی اس صورتِ حال کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے مسعود سے ملاقات کی اور اس کی توجہ اس طرف دلائی۔

''آپ کے حکم سے مفر تو نہیں لیکن سپاہیوں میں بے دلی پھیلی ہوئی ہے۔ اگر ان لوگوں کو زبردستی لے جایا گیا تو ہمیں ایک اور بغاوت کا سامنا ہوگا جو ممکن ہے لاہور میں نہیں، غزنی میں ہو۔''

''کیا میں لشکر والوں کی حق تلفی کرتا ہوں؟ کیا وہ میرے ملازم نہیں؟ کیا انہیں مالِ غنیمت میں حصہ نہیں ملتا؟ پھر وہ انکار کیوں کریں گے؟''

''میں یہ نہیں کہتا کہ انکار کریں گے۔ میں تو صرف اتنا عرض کروں گا کہ نتائج بہتر نہیں آئیں گے اور یہ بھی ممکن ہے کہ انکار کر دیں۔''

''تم کیا کہنا چاہتے ہو..... میں لاہور کی بغاوت کو نظر انداز کر دوں؟ لاہور کو ہاتھ سے جانے دوں؟ احمد کو اس کے حال پر چھوڑ دوں؟ اس کے خلاف کسی مہم کا آغاز نہ کروں؟''

''میرا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا۔ میں تو صرف یہ گزارش لے کر آیا تھا کہ اس مہم پر کسی اور کو بھیجا جا سکتا ہے۔ یہ اتنی بڑی مہم نہیں ہے۔ جس سردار کو حکم دیں گے، وہ اپنا ذاتی لشکر لے جا کر اس بغاوت کو کچل دے گا۔ شاہی لشکر کو کسی بڑے معرکے کے لیے محفوظ رکھیے۔''

سلطان مسعود نے بک تغدی کے مشورے پر عمل کیا اور ناتھ نام کے ایک ہندو سردار کو احمد نیالتگین کی سرکوبی کے لیے لاہور روانہ کر دیا۔

ناتھ نے احمد کی طاقت کا غلط اندازہ لگایا اور ایک معمولی سا لشکر لے کر لاہور کے دروازے پر دستک دے بیٹھا۔

احمد اپنی طاقت میں اتنا اضافہ کر چکا تھا کہ وہ اس معمولی سے لشکر کو خاطر میں نہ لایا۔ پوری طرح تیار ہو کر باہر نکلا اور ناتھ کے مقابل آ گیا۔ دونوں میں زبردست جنگ ہوئی۔ اس جنگ میں ناتھ مارا گیا اور اس کا لشکر بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کی اطلاع مسعود کو پہنچی تو اس نے تلک کو طلب کیا۔ یہ شخص ہندوؤں کا بہت بڑا امیر تھا۔ اس کے پاس بہت بڑا لشکر تھا۔ مسعود نے اسے لاہور کی طرف روانہ کیا۔ تلک نے نیالتگین سے جنگ کر کے اسے شکست دی۔ نیالتگین شکست کھا کر سندھ کی طرف بھاگا۔ تلک برابر اس کے تعاقب میں لگا ہوا تھا۔ نیالتگین بار بار پلٹ کر دیکھتا تھا اور تلک کو موجود پا کر آگے بڑھ جاتا تھا۔ وہ منصورہ گیا، ٹھٹھہ پہنچا۔ وریائے سندھ کے کنارے پہنچ کر سمجھ رہا تھا کہ تلک واپس چلا گیا ہوگا لیکن گھوڑوں کی ٹاپوں نے اسے دہلا دیا۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا کہ وہ دریا پار کر کے دوسری طرف

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

اتر جائے۔ وہ ابھی دریا کے وسط میں پہنچا تھا کہ دفعتاً دریا میں سیلاب آ گیا۔ نیالتگین نے بہت ہاتھ پاؤں مارے لیکن ڈوب گیا۔

تلک اور اس کے ساتھی کنارے پر کھڑے اس کے ڈوبنے کا منظر دیکھ رہے تھے۔ یہ عبرت کا وقت تھا۔ احمد نیالتگین کل تک لاہور کا حکمران بنا ہوا تھا۔ سیاہ سفید کا مالک تھا۔ کفرانِ نعمت نے اس حال کو پہنچایا کہ بھاگتے کو زمین تنگ ہوگئی۔ دریا میں کودا، اس نے بھی آگے بڑھنے نہ دیا۔

عبرت کی یہ زنجیر ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی۔ ایک کڑی باقی تھی۔ تلک یہ منظر دیکھ کر آگے بڑھنے ہی والا تھا کہ دریا کے بہاؤ نے نیالتگین کی لاش کنارے پر پھینک دی۔ تلک کے آدمیوں نے اس کا سر کاٹ کر تلک کے سامنے پیش کر دیا۔ تلک نے وہ سر سلطان مسعود کے پاس غزنی بھیج دیا۔

سلطان مسعود نے غزنی میں ایک نیا محل تعمیر کروایا تھا۔ اس میں ایک بڑا خوبصورت جڑاؤ تخت بچھایا گیا اور اس تخت پر ایک عالی شان تاج سونے کی زنجیر سے باندھ کر لٹکایا گیا۔

مسعود نے اس محل میں پہلا دربار منعقد کیا۔ جڑاؤ تخت پر قدم رنجہ فرمایا اور تاج اپنے سر پر رکھا۔ یہی وقت تھا جب احمد نیالتگین کا ''سر'' غزنی لایا گیا اور ایک طشت میں رکھ کر مسعود کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ تمام درباریوں نے مبارک باد کے نعرے بلند کیے اور اسے نیک شگون سمجھا گیا۔

ابھی یہ خوشی کم نہیں ہوئی تھی کہ انہی قاصدوں نے ایک بری خبر بھی مسعود کے گوش گزار کی۔

''ہانسی کے راجا نے سلطان کی اطاعت سے منہ موڑ لیا ہے اور وہ سرکشی پر آمادہ ہے۔ اس نے مسلمان رعایا پر مظالم کی حد کر دی ہے۔ مسلمانوں کو زبردستی ہندو بنایا جا رہا ہے۔''

یہ اطلاع ایسی نہیں تھی جسے نظر انداز کیا جا سکتا۔ معاملہ صرف ایک شہر کا نہیں تھا۔ اس کی دیکھا دیکھی دوسرے راجاؤں کو بھی بغاوت پر آمادہ ہوتے دیر نہیں لگتی۔ سلطان محمود غزنوی کے حملوں نے جن راجاؤں کے سر جھکا دیے تھے، اب وہ سر اٹھانے لگے تھے۔ ان کی بیخ کنی ضروری تھی ورنہ لاہور ان راجاؤں سے دور نہیں تھا۔ جن علاقوں کے پیچھے سبکتگین اور محمود غزنوی کی محنت تھی، ان پر آنچ آنے کا خطرہ بڑھ گیا تھا۔

مسعود نے عام دربار ملتوی کر دیا اور صرف سالاروں کا اجلاس طلب کیا۔

''ہمیں ایک مرتبہ پھر ہندوستان کی طرف جانا ہوگا۔''

''ترکمانیوں کا خطرہ ابھی ٹلا نہیں ہے۔ آپ کے روانہ ہوتے ہی وہ پھر سر اٹھائیں گے۔''

''اس سیلاب کو روکنے کا حل بھی ہم نے تلاش کر لیا ہے۔ میں لشکر کا ایک حصہ الگ کر کے عبدالرئیس بن عبدالعزیز کی سربراہی میں چھوڑ جاؤں گا جو میرے آنے تک میرے علاقوں تک انہیں روکے رکھے گا۔''

''کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ پہلے ہم ترکمانیوں سے نمٹ لیں جو مسلسل ہمارے لیے عذاب بنے ہوئے ہیں اور اس کے بعد ہندوستان کا رخ کریں؟''

''میرے بھائیو! ترکمانیوں سے جنگ کوئی ایک دو دن کی بات نہیں ہے۔ وہ سامنے آ کر لڑنے کے عادی نہیں ہیں۔ ان کا تعاقب کرتے کرتے ہمارے لشکری اتنا تھک چکے ہوں گے کہ ہندوستان جانے کے لائق نہیں رہیں گے۔ اس کے علاوہ اس وقت میرا ہندوستان جانا اس لیے بھی سود مند ہوگا کہ وہاں کے راجاؤں سے مالِ غنیمت لے کر لوٹوں گا جو ترکمانیوں سے جنگ کرنے میں کام آئے گا اور ہندوستان کے جو علاقے ہمارے باج گزار ہیں، ان پر ہماری دھاک بھی بیٹھے گی۔''

اس کے دلائل میں وزن تھا اور کسی میں اختلاف کی جرأت بھی نہیں تھی لہٰذا تمام سالاروں نے اس سے اتفاق کیا اور اجلاس ختم ہو گیا۔

وہ توہم پرست نہیں تھا لیکن آج بڑی شدت سے اسے وہ مجذوب یاد آ رہا تھا جو کئی مرتبہ اس کی مدد کر چکا تھا۔ اس کے آدمی تلاش کرتے کرتے تھک چکے تھے لیکن وہ کہیں نظر نہیں آیا تھا۔ اسے بہت دن بعد وہ تابوت یاد آیا جو خراسان میں ندی کے کنارے رکھا ہوا ملا تھا۔ اس وقت وہ اسے احمد بن حسین میمندی کی موت کی طرف اشارہ سمجھ رہا تھا لیکن اب وہ سوچ رہا تھا کہ کہیں اس مجذوب نے اس تابوت کے ذریعے اپنی موت کی اطلاع تو نہیں دی تھی کیونکہ اس دن کے بعد سے وہ کسی کو نظر نہیں آیا تھا۔ کہیں اس کا انتقال تو نہیں ہو گیا، اس کی طرف سے ہونے والی بشارتوں کا سلسلہ بھی بند ہو چکا تھا۔ اس نے اس معمے کو خدا پر چھوڑا اور ہندوستان جانے کی تیاری کرنے لگا۔ جب لشکر کی تیاری مکمل ہو گئی تو مسعود اپنے سالاروں کے ساتھ ہندوستان کی طرف کوچ کر گیا۔

ہانسی کے راجا کو جب خبر ملی کہ سلطان مسعود غزنی سے

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

روانہ ہوا ہے تو اسے یہ سوچنے کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ کس کی سرکوبی کے لیے آرہا ہے۔ خود غزنی کے دربار میں ایسے لوگ موجود تھے جو اسے پل پل کی خبریں پہنچا رہے تھے۔ اسے اپنی طاقت پر اتنا گھمنڈ تھا کہ اس نے محصور ہونے کے بجائے کھلے میدان میں جنگ کرنے کو ترجیح دی۔ اس نے شہر سے نکل کر دو میل کے فاصلے پر پڑاؤ کرلیا دوسرے لفظوں میں وہ سلطان مسعود کے استقبال کے لیے تیار کھڑا تھا۔

سلطان مسعود کا لشکر جونہی مناسب فاصلے پر پہنچا، ہانسی کے راجا نے جنگ کے نقارے بجوانے شروع کردیے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ غزنوی لشکر کو آرام کا موقع ملے۔

ابھی غزنوی لشکر نے آرام کے لیے خیمے بھی بلند نہیں کیے تھے کہ جنگ کا آغاز ہوگیا۔ یہ جنگ اتنی ہولناک تھی کہ چند گھنٹوں ہی میں فیصلے کی طرف بڑھتی نظر آنے لگی۔ راجا کی جلد بازی نے اسے شدید نقصان پہنچایا۔ اس نے اپنا آدھا لشکر کٹوا دیا اور پھر اس کے قدم لڑکھڑانے لگے۔ وہ پیچھے ہٹنے پر مجبور ہوگیا لیکن اسے فائدہ یہ تھا کہ پشت پر اس کا شہر تھا۔ وہ اپنے بچے کھچے لشکر کو لے کر شہر میں داخل ہوا اور محصور ہوگیا۔

طبقاتِ ناصری کے مولف کا بیان ہے کہ اس زمانے میں ہانسی سوالک کا دارالسلطنت تھا۔ ہانسی کا قلعہ بہت ہی مضبوط تھا۔ اس کی بابت ہندو عقیدہ رکھتے تھے کہ اسے کبھی کوئی مسلمان فرماں روا تسخیر نہیں کرسکتا۔

سلطان مسعود نے ہندوؤں کے اس عقیدے کو باطل کرنے کے لیے اس قلعے کا محاصرہ کرلیا۔ قلعے کا محاصرہ کیے پانچ روز گزر گئے تھے۔ اتنے مضبوط قلعے کو فتح کرنے کے لیے پانچ روز کچھ بھی نہیں ہوتے بلکہ اس کی مضبوطی کو دیکھ کر لگتا تھا، پچاس روز بھی گزر جائیں تو کم ہیں۔ اس دہشت میں یہ چھٹی رات تھی جب مسعود کو خواب میں وہ مجذوب کمبل پوش نظر آیا۔ مسعود نے دیکھا کہ مجذوب فصیل کے قریب گیا ہے اور کسی سیڑھی کی مدد کے بغیر فصیل پر چڑھ گیا اور اندر اتر کر شہر پناہ کا دروازہ کھول دیا۔ غزنوی لشکر اندر چلا گیا۔ مسعود کی آنکھ کھلی تو وہ پرامید تھا کہ پانچ دن کی مسلسل محنت آج اپنا رنگ دکھائے گی۔ آج شہر ضرور فتح ہوجائے گا۔ اس نے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے لشکر کو چار حصوں میں تقسیم کرکے فصیل کے چاروں طرف پھیلا دیا۔ پہلے ایک حصے نے شہر پر تیر برسائے۔ اندر موجود راجا کے لشکری یہ سوچ کر اس طرف بھاگے ہوں گے کہ حملہ ہوگیا۔ اسی وقت دوسرے حصے نے حملہ کردیا پھر تیسرے حصے نے۔ راجا کے لشکریوں کو مشغول کرنے کے بعد لشکر کے چوتھے حصے نے سیڑھیوں کی مدد سے اوپر چڑھنا شروع کردیا۔ فصیل پر موجود پہرے داروں نے خوف سے بھاگنا شروع کردیا۔ مسعود کے سپاہی دوسری طرف اتر گئے اور دروازہ کھول دیا۔ ایک مرتبہ پھر گھمسان کا رن پڑا۔ راجا کا بچا کھچا لشکر بھی ختم ہوگیا۔ اس آپا دھاپی میں راجا کا کچھ پتا نہ چلا۔ شاید وہ اپنی جان بچا کر بھاگ گیا تھا یا پھر مارا گیا اور لاش نہیں ملی۔

اس جنگ کے دوران مسعود کو معلوم ہوا تھا کہ سون پت کے راجا دیپال ہری اور ایک دوسرے ہمسایہ راجا رام دیو نے اس جنگ میں ہانسی کے راجا کی لشکر اور مال وزر سے مدد کی ہے لہٰذا اب اس نے ان دونوں کو سبق سکھانے کا ارادہ کیا۔ اس نے ہانسی کا قلعہ اور تمام مالِ غنیمت اپنے قابل اعتماد سرداروں کے حوالے کیا اور خود سون پت کا قلعہ فتح کرنے کے لیے آگے بڑھا۔

اس کی دہشت اس کے قدموں سے آگے آگے جارہی تھی۔ راجا دیپال ہری ایسا بدحواس ہوا کہ راج پاٹ چھوڑ کر جنگل کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ غزنوی لشکر نے سون پت پہنچ کر قلعے کو تسخیر کرلیا اور اس کے تمام بتوں کو پاش پاش کرکے تمام مال و دولت پر قبضہ کرلیا۔ جب کسی نے بتایا کہ راجا کو فلاں مندر کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے دیکھا گیا تھا تو لشکر میں سے چند سپاہی اس مندر میں گئے۔ وہاں ننگ دھڑنگ ایک پنڈت بیٹھا ہوا تھا۔ اس سے راجا کے بارے میں پوچھا لیکن وہ کچھ بتانے سے قاصر تھا کیونکہ وہ گونگا تھا۔ کم از کم اشارے سے اس نے یہی بتایا تھا کہ وہ گونگا ہے۔ ایک مسلمان کو شک ہوا اور اس نے تلوار اس کے سر پر لہرائی۔

''ہمارے دھرم میں گونگے کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔ میں ابھی تیری گردن اڑاتا ہوں۔'' موت کے خوف نے گونگے کو زبان دے دی۔

''بھگوان کے لیے مجھ پر دیا (رحم) کرو۔ میں گونگا نہیں ہوں۔''

اسے اس طرح بولتے ہوئے دیکھ کر مسلمان کو ہنسی آگئی۔

''اگر تو گونگا نہیں ہے تو بتا تیرا راجا دیپال کہاں چھپا ہوا ہے؟''

''وہ یہاں آیا ضرور تھا لیکن وہ یہاں ہے نہیں۔''

''تجھے ضرور معلوم ہوگا۔ بتا وہ کہاں ہے؟'' مسلمان نے پھر تلوار کا رخ اس کی طرف کیا۔

''بتاتا ہوں..... بتاتا ہوں۔'' پنڈت نے کہا۔ ''وہ یہاں چھپنے کے لیے آیا تھا لیکن جب اس نے مجھے بتایا کہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

آنے والے مسلمان ہیں تو میں نے اسے یہاں چھپنے سے منع کردیا۔ میں نے اسے بتایا تھا کہ مسلمان، مندروں کے دشمن ہیں۔ وہ شہر میں آئے تو مندر میں ضرور آئیں گے اور تو پکڑا جائے گا۔''

''میں نے تجھ سے یہ پوچھا ہے کہ اس وقت وہ کہاں ہے؟''

''مہاراج! یہ مجھے نہیں معلوم۔ ہاں، اس نے یہ ضرور کہا تھا کہ وہ جنگل کی طرف جارہا ہے۔''

سپاہیوں کو اب اتنی فرصت نہیں تھی کہ اسے قتل کرتے یا اس سے کچھ اور پوچھتے۔ دوڑتے ہوئے مندر کی سیڑھیاں اترے اور سیدھے اس طرف پہنچے جہاں مسعود کے لیے خیمہ لگایا گیا تھا۔

''سلطانِ معظم! ہمیں معلوم ہوا ہے کہ دیپال قریبی جنگل کی طرف چلا گیا ہے۔''

''فوراً جاؤ۔ ایک ایک درخت چھان مارو اور اسے پکڑ کر میرے پاس لاؤ۔''

سپاہیوں کی ایک بڑی تعداد جنگل کی طرف روانہ ہوئی۔ یہ ایسا گھنا جنگل تھا کہ دن میں اندھیرا طاری تھا۔ یہاں کسی کو تلاش کرنا آسان نہیں تھا۔ یہ خطرہ بھی تھا کہ اگر راجا نے یا اس کے آدمیوں نے اندھیرے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے حملہ کردیا تو بہت نقصان ہوسکتا ہے۔ یہ سپاہی پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ ایک جگہ ایک سپاہی کے پاؤں سے کوئی چیز ٹکرائی۔ دیکھا تو ایک بڑا صندوق تھا۔ اس کا مطلب تھا راجا یہیں کہیں ہے۔ یہ صندوق اسی کا ہوسکتا تھا۔ اسے کھولا گیا تو راجا کا خزانہ اس میں بند تھا۔ ہیرے جواہرات کی بڑی مقدار تھی جن سے صندوق بھرا ہوا تھا اور آگے بڑھے تو ایک جوتی ملی جس میں قیمتی موتی جڑے ہوئے تھے۔

''اگر راجا یہاں ہوتا تو دوسری جوتی بھی یہاں ہوتی۔'' ایک سپاہی نے کہا۔

''اسے ہماری آمد کا علم ہوگیا ہوگا۔ وہ گھبراہٹ میں ایسا بھاگا کہ پاؤں کی ایک جوتی بھی یہیں رہ گئی۔ اب وہ یہاں نہیں ہے یا جنگل میں بہت آگے تک نکل گیا ہے۔ اب اسے ڈھونڈنا فضول ہے۔ کیا خبر یہ جنگل کہاں تک جاتا ہے۔ واپسی میں ایسا نہ ہو کہ ہم راستہ ہی بھول جائیں۔''

سپاہیوں نے وہ صندوق کندھوں پر اٹھایا اور جنگل سے باہر نکل آئے۔

مسعود نے بھی دیپال ہری کو اس کے حال پر چھوڑا اور اپنے دوسرے دشمن رام دیو کی طرف بڑھا۔ راجا رام دیو اپنی آنکھوں سے دیپال ہری کا حشر دیکھ چکا تھا۔ اسے جب مسعود کی آمد کی خبر ہوئی تو اس نے دانش مندی سے کام لیا۔ بہت سا مال و دولت مسعود کی خدمت میں روانہ کیا اور یہ درخواست کی۔

''میں بہت ضعیف اور کمزور ہوں لہٰذا مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ بذاتِ خود خدمتِ اقدس میں حاضر ہوسکوں۔ میرے حال پر رحم کیا جائے اور جو کچھ ارسالِ خدمت ہے، اسے قبول کیا جائے اور مجھے اپنے اطاعت گزاروں میں شمار کیا جائے۔''

مسعود نے اس کی یہ درخواست قبول کرلی۔ اس نے رام دیو پر حملہ آور ہونے سے گریز کیا اور واپس سون پت چلا گیا۔

اس نے سون پت کی حفاظت اور انتظام کے لیے ایک معتمد امیر کو وہاں چھوڑا اور خود سون پت کے آس پاس کے علاقوں کی فتح میں مصروف ہوگیا۔

ان علاقوں کو اس نے بہت جلد فتح کرلیا۔ ان پر قبضہ کرنے کے بعد وہ غزنی کی طرف روانہ ہوا۔ لاہور پہنچا تو کچھ دن وہاں قیام کیا۔ اس نے اپنے دوسرے بیٹے ابو المجد ودود کو وہاں کا حاکم بنایا اور اسے طبل و علم عطا کیا اور محمود غزنوی کے مشہور غلام ایاز کو اس کا اتالیق مقرر کرکے غزنی روانہ ہوگیا۔

ابھی وہ غزنی پہنچا بھی نہیں تھا کہ راستے کی دھول اس کے سر کو چھونے لگی۔ اسے ترکمانیوں کی طرف سے بڑھنے والی شورشوں کی خبروں نے چراغ پا کردیا۔ ایک تو ہندوستان کی مہمات کی تھکن، اوپر سے یہ خبریں۔ میری تقدیر مجھے غزنی کیوں نہیں جانے دیتی؟ ایک چکر ہے جو میرے پاؤں سے لپٹا ہوا ہے۔

دراصل جب وہ ہندوستان پر لشکر کشی کے لیے نکلا تھا تو بک تغدی اور حسین میکال کے سپرد ترکمانیوں کی مہم کی تھی جس میں انہیں شکست ہوگئی تھی۔ مسعود ہندوستان چلا گیا تھا۔ اس کی غیر موجودگی میں فتح یاب ترکمانیوں نے وہ طوفان اٹھایا کہ غزنی کا وجود ہی خطرے میں پڑ گیا۔ خبریں ایسی تھیں کہ وہ یہ سوچنے لگا تھا کہ اسے غزنی دیکھنا نصیب بھی ہوگا یا نہیں۔ اس نے غزنی جانے کا ارادہ ترک کردیا۔ اپنے لشکر کے ساتھ بڑی تیزی سے بلخ شہر کا رخ کیا۔

اس کا لشکر اس خوشی میں شاداں چلا جارہا تھا کہ اس کی منزل غزنی ہے۔ اچانک حکم ہوا کہ ترکمانیوں سے نمٹنا ہے، لہٰذا ''بلخ'' چلو۔ لشکر کی خوشی بے دلی میں بدل گئی۔ اس کا

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

لشکر قتل و غارت گری کا کھیل کھیلتے کھیلتے تھک چکا تھا۔

ترکمانیوں کو جب خبر ہوئی کہ سلطان مسعود ان کی سرکوبی پر آمادہ ہے اور اس کا رخ ''بلخ'' کی طرف ہے تو وہ بلخ چھوڑ کر ادھر ادھر کے علاقوں میں منتشر ہو گئے۔

وہ وہاں پہنچا تو ترکمانیوں کی کہانیاں تھیں، وہ خود وہاں موجود نہیں تھے البتہ خبروں کی صورت ایک اور آفت منہ کھولے کھڑی تھی۔

مسعود نے اطمینان کا سانس لیا تھا کہ یہاں آتے ہی اسے ترکمانیوں کا سامنا کرنا نہیں پڑا لیکن یہ اطمینان وقتی ثابت ہوا۔ اس کے پہنچنے کے ایک دن بعد ہی بلخ کے باشندوں کا ایک وفد خدمت میں حاضر ہوا اور اس سے فریاد کی۔

''دریا آمو (ماوراالنہر) کے اس پار کے علاقوں کے حکمران طغرل بیگ نے دریا پار کر کے کئی بار مسلمانوں کے علاقوں میں لوٹ مار کی ہے اور مسلمانوں کا قتلِ عام کیا ہے۔ اب تو یہ حال ہے کہ مسلمان عورتیں بچوں کو سلاتے وقت کہتی ہیں سو جاورنہ طغرل بیگ آجائے گا..... ذرا ہوشیار۔ بچے یہ کہہ کر ماں کو لاجواب کرتے ہیں، آنے دو طغرل بیگ کو میں سلطان مسعود کو بلالوں گا اور عورتیں مایوسی سے کہتی ہیں، سلطان کو ہماری پروا کہاں..... اسے تو ہندوستان سے فرصت نہیں۔''

سلطان مسعود ان کی فریاد سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے ترکمانیوں کے خلاف مہم کو التوا میں ڈالا اور طغرل بیگ سے دو دو ہاتھ کرنے کا تہیہ کرلیا حالانکہ اسے ایک جذباتی فیصلہ ہی کہا جاسکتا تھا کیونکہ یہ سردیوں کا موسم تھا۔ طغرل بیگ کا علاقہ برف کی چادر اوڑھ چکا تھا۔ اس وقت کوئی دیوانہ ہی ان علاقوں میں قدم رکھ سکتا تھا۔ اس کے امراء اور فوجی افسروں وغیرہ کو اس کے ارادے کی خبر ہوئی تو انہوں نے مخالفت کی اور ترکمانیوں سے نمٹنے کی تلقین کی۔

''دو سال سے ترکمانی خراسان میں لوٹ مار مچائے ہوئے ہیں اور اہلِ خراسان ان کی اس روش سے اس حد تک عاجز آچکے ہیں کہ خراسانیوں کا ایک بڑا حصہ ان کی حکومت تسلیم کرنے کے لیے تیار ہو گیا ہے۔ اس وقت یہی مناسب ہے کہ پہلے ترکمانیوں کا قلع قمع کیا جائے اور پھر اس کے بعد کسی اور طرف توجہ کی جائے۔''

مسعود نہ تو موسم کی شدت کا قائل ہو سکا، نہ امراء کے دلائل اس پر اثر انداز ہوئے۔ وہ اپنے ارادے پر قائم رہا۔ اس نے دریائے جیحوں پر پل بندھوایا۔ ایک مرتبہ پھر ارکینِ سلطنت نے اسے روکنے کی کوشش کی۔

''یہ برف باری کا موسم ہے۔ ذرائع آمدورفت محدود ہیں۔ شاہراہوں پر برف ہی برف ہوگی۔ لشکر کی پیش قدمی میں بڑی تکلیفیں اور دقتیں اٹھانا پڑیں گی لہٰذا بہتر یہ ہے کہ سردی کا موسم گزر جانے کے بعد اس مہم کی ابتدا کی جائے۔''

اس پر کسی مشورے کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اس نے پل بنتے ہی لشکر کو ساتھ لیا اور دریا پار کر گیا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ ماوراالنہر میں کوئی اس کے مقابلے کے لیے موجود نہ تھا۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے سردی نے سب کو نگل لیا ہے۔ شدید برف باری اور تیز بارش نے غزنوی لشکر کا برا حال کر دیا۔ سڑکیں برف سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ یہ لوگ برف ہٹاتے راستے بناتے آگے بڑھتے رہے۔

مسعود نے اس صوبے کے بہت سے علاقوں پر کسی روک ٹوک کے بغیر قبضہ کرلیا لیکن بے پناہ تکلیفیں اور مصائب برداشت کرنے کے بعد۔

وہ خوش تھا کہ لڑے بغیر علاقے فتح ہو رہے ہیں لیکن اسی دوران اس کے وزیر خواجہ احمد نے بلخ سے اطلاع دی کہ داؤد سلجوقی ایک زبردست لشکر کے ساتھ بلخ کی طرف بڑھ رہا ہے اور میرے پاس اتنی فوج اور سامانِ جنگ نہیں کہ اس کے مقابلے میں صف آرا ہو سکوں۔

یہ خبر سنتے ہی مسعود بلخ جانے کے لیے روانہ ہو گیا۔ اس کے ہٹتے ہی طغرل بیگ متحرک ہوا۔ پشت کی جانب سے مسعود کے لشکر پر حملہ کر دیا اور بہت سے اونٹ اور گھوڑے لوٹ کر لے گیا۔ اس نے باقاعدہ جنگ تو نہیں کی لیکن کئی آدمیوں کو زخمی کر کے اور لوٹ مار کے بعد کہیں غائب ہو گیا۔ اس وقت اتنی فرصت کسی کو نہیں تھی کہ اس کا تعاقب کیا جاتا۔

داؤد سلجوقی بلخ کے ارادے سے نکلا تھا لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ مسعود تیزی سے پلٹا ہے اور بلخ کے قریب پہنچنے کو ہے تو اس نے حملے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور ''مرو'' کی طرف مڑ گیا اور گورگان کے راستے اپنی پناہ گاہوں کی طرف چلا گیا۔

سلطان مسعود جب بلخ میں داخل ہوا تو اسے معلوم ہوا وہ گورگان کی طرف گیا ہے۔ سلطان مسعود نے اس کے تعاقب میں گورگان کا رخ کیا۔ داؤد سلجوقی گورگان کو چھوتا ہوا اپنی محفوظ پناہ گاہوں کی طرف چلا گیا تھا۔ مسعود کو ناکامی ہوئی۔ وہ اپنے لشکر کے ساتھ گورگان ہی میں ٹھہر گیا۔

وہ خود بھی گورگان میں تھا، اس کا بیٹا ابومودود بھی اس کے ساتھ تھا اور مسعود کا لشکر بھی یہیں اپنی تھکن اتار رہا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

اس سے اچھا موقع اور کیا ہوسکتا تھا۔ شہر کے معزز لوگوں نے ایک وفد تیار کیا اور اس سے ملاقات کے لیے پہنچ گئے۔

مسعود جس شہر میں ہوتا تھا، وہاں کے لوگوں سے ملنے میں اسے عار نہیں ہوتی تھی۔ لوگ اجازت لے کر حاضر ہوتے تھے اور مسائل سے آگاہ کرتے تھے۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا، میرے اصل مخبر تو کسی شہر کے باشندے ہیں۔ مخبر جو باتیں کسی مصلحت کے تحت چھپا لیتے ہیں یہ ظاہر کردیتے ہیں۔

مسعود نے اس وفد کا نہایت خوش دلی سے استقبال کیا۔

''عزیز دوستو! تمہارے سامنے غزنی کا سلطان نہیں مسلمانوں کا ہمدرد بیٹھا ہے۔ جو کہنا چاہتے ہو کسی خطر کے بغیر کہو۔ اگر تمہیں ہم سے بھی کوئی شکایت ہے تو ہم سننے کو تیار ہیں۔''

''سلطانِ معظم! ہمیں آپ سے تو کوئی شکایت نہیں البتہ آپ کی بے خبری سے شکایت ہے۔''

''بات تو ایک ہی ہوئی، بہر حال پھر بھی کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟ وہ کون سی خبر ہے جس کی ہمیں خبر نہیں؟''

''حضور! اس علاقے میں علی تقندری نام کا ایک ڈاکو ہے جس نے تہلکہ مچا رکھا ہے۔ بستیوں کی بستیاں اجاڑ دیتا ہے۔ عورتیں اٹھا کر لے جاتا ہے جنہیں لونڈی بنا کر بیچ دیتا ہے۔ مال و اسباب کسی کے پاس نہیں رہنے دیتا۔''

''تم میں سے کسی کو اس کے ٹھکانے کا علم ہے؟''

مسعود کے اس سوال پر ایک شخص اپنی جگہ سے کھڑا ہوا۔ یہ وہ شخص تھا جسے علی تقندری کے آدمی اغوا کر کے لے گئے تھے اور وہ کسی نہ کسی طرح وہاں سے بھاگ نکلا تھا۔

''میں اس قلعے سے واقف ہوں جسے وہ اپنی پناہ گاہ کے طور پر استعمال کرتا ہے۔''

سلطان مسعود نے وفد کو رخصت کردیا اور اس شخص کو روک لیا جو علی تقندری کے ٹھکانے سے واقف تھا۔ وفد کے چلے جانے کے بعد سلطان نے علی تقندری کے پاس بھیجنے کے لیے چار رکنی وفد تشکیل دیا۔ اس وفد میں وہ شخص بھی تھا جو اس کے ٹھکانے سے واقف تھا۔

یہ وفد اس قلعے میں پہنچا اور علی تقندری سے ملا۔

''سلطان مسعود تک تمہاری شکایتیں پہنچی ہیں۔ سلطان نے تمہیں گورگان طلب کیا ہے تاکہ تم سے اطاعت اور فرماں برداری کا عہد لے۔''

''میں سلطان کا غلام نہیں ہوں کہ اس کی ایک آواز پر گورگان پہنچ جاؤں۔''

''غلام نہیں، اس کی رعایا تو ہو۔''

''میں اپنی دنیا کا خود غلام ہوں، کسی کی رعایا نہیں۔''

''تم اس کی رعایا نہیں لیکن اس کی رعایا کے لیے اذیت کا باعث بنے ہوئے ہو۔ وہ اپنی رعایا کی حفاظت چاہتا ہے۔''

''تو کرلے حفاظت۔ اسے کس نے روکا ہے۔ میری روزی پر کیوں لات مارنا چاہتا ہے۔''

''دیکھو، تم گورگان چلے جاؤ تو فائدے میں رہو گے۔ ممکن ہے بادشاہ تمہیں معاف کردے ورنہ.....''

''ورنہ کیا؟''

''وہ تمہاری سرکوبی کے لیے لشکر بھیجے گا۔''

''شوق سے بھیجے۔ میرا لشکر اس کا مقابلہ کرے گا۔ اپنے بادشاہ سے کہو علی تقندری جنگ کے لیے تیار ہے۔''

اس نے نہایت بدتمیزی کا مظاہرہ کرتے ہوئے شاہی وفد کو قلعے سے باہر نکال دیا اور خود قلعہ بند ہو کر بیٹھ گیا۔

شاہی وفد نامراد لوٹا اور وہاں ہونے والی گفتگو سے مسعود کو آگاہ کیا تو اس کے غصے کی انتہا نہ رہی۔ اس نے ایک چھوٹا لشکر اس کی سرکوبی کے لیے روانہ کردیا۔

''اگر ایک معمولی ڈاکو کا مقابلہ کرنا میری توہین نہ ہوتی تو میں خود لشکر کے ساتھ جاتا لیکن مجھے یقین ہے کہ میری غیر موجودگی کے باوجود تم اسے زنجیروں میں جکڑ کر میرے سامنے لاؤ گے۔''

لشکر روانہ ہوا۔ علی تقندری کو اپنے جنگجوؤں پر بڑا ناز تھا۔ اس نے قلعے کی فصیل سے شاہی لشکر کو دیکھا تو اور بھی نازاں ہوا۔ ''سلطان نے میری طاقت کا غلط اندازہ لگایا۔ معمولی سا لشکر بھیج کر سمجھتا ہے کہ وہ مجھے شکست دے دے گا۔ یہ لشکر تو میرے ایک نوالے کا بھی نہیں۔ میں اگر اسے کھلے میدان میں شکست دوں گا تو اس کی شاہی دھری رہ جائے گی۔ اس کے غرور نے اسے باہر نکلنے پر مجبور کردیا۔ اس کا لشکر بادشاہی لشکر سے دوگنا تھا۔ مسعود نے واقعی غلط اندازہ لگایا تھا لیکن اب کیا ہوسکتا تھا۔ علی تقندری نے آتے ہی ہلا بول دیا۔ شاہی لشکر نے بھی بھرپور جواب دیا۔ جلد ہی اندازہ ہوگیا کہ علی تقندری کا لشکر تعداد میں زیادہ ہیں زیادہ ضرور ہے لیکن اسے جنگوں کا تجربہ نہیں۔ نئے لوگوں سے لڑنا اور بات ہے اور تجربہ کار فوج سے لڑنا دوسری بات ہے۔ اس کے لشکری کٹ کٹ کر گرنے لگے۔ جب اس نے دیکھا کہ اس کے سپاہی آدھے بھی نہیں رہ گئے تو وہ قلعے کی طرف بھاگا۔ چاہتا تھا کہ قلعے میں داخل ہو کر دروازے بند کرلے لیکن اسے دیکھ کر اس کے سپاہی بھی دروازے کی طرف بھاگے۔ دروازہ بند کرنے میں اتنی دیر لگ گئی کہ غزنوی لشکر

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

لڑتا بھڑتا قلعے میں داخل ہوگیا اور ڈاکو کو گرفتار کرلیا گیا۔ اس کے بچے کھچے ساتھی بھی گرفتار کرلیے گئے۔ اس کی نشاندہی پر لوگوں کا لوٹا ہوا مال بھی قلعے کی کوٹھریوں سے نکل آیا۔ کچھ مغوی عورتیں اور مرد بھی بازیاب کرالیے گئے۔

سلطان مسعود کا لشکر ان سب کو لے کر گورگان کے نواح میں پہنچا جہاں سلطان مسعود ان کا انتظار کررہا تھا۔ اس نے اپنے سالار کو مبارک باد دی کہ وہ علی تقندری کو زندہ گرفتار کرکے لے آیا تھا اور پھر علی تقندری سے مخاطب ہوا۔

''تجھ ایسے بدبخت سے میرا ہم کلام ہونا میری توہین ہے لیکن میں تیرا انجام تجھے یاد دلانے کے لیے تجھ سے مخاطب ہوں۔ تیری کم سے کم سزا یہ ہے کہ تیری گردن اڑادی جائے۔''

''اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ میرے ساتھیوں میں سے بہت سے ابھی زندہ ہیں جو تجھ سے بدلہ لیں گے۔ تجھ سے بدلہ نہ لے سکے تو تیری رعایا کا جینا حرام کردیں گے۔''

''تو کتنا بدبخت ہے کہ مرتے وقت بھی تجھ پر توبہ کا دروازہ بند ہے۔''

جب علی تقندری کو یقین ہوگیا کہ سلطان اسے سزا دیے بغیر نہیں مانے گا تو معافی تلافی پر اتر آیا۔

''اگر اس مرتبہ مجھے معاف کردیا جائے تو میں آئندہ کے لیے برے کاموں سے توبہ کرلوں گا۔''

''توبہ کا وقت گزر گیا۔ میرے بلانے پر اگر تو گورگان آجاتا اور میری اطاعت کا دم بھرتا تو میں تجھے معاف کرسکتا تھا لیکن تو نے وہ وقت نکال دیا۔ اب اگر توبہ کررہا ہے تو یہ تیری چالاکی ہے۔''

سلطان نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا۔ وہ اسے گھسیٹتے ہوئے ایک طرف لے گئے اور اس کی گردن اڑادی۔ خلقِ خدا نے اطمینان کا سانس لیا۔

اب مسعود کو غزنی کا رخ کرنا تھا لیکن اسی دوران یہ خبریں گشت کرنے لگیں کہ ادھر ادھر بکھرے ہوئے ترکمانی شہر ''مرو'' میں جمع ہورہے ہیں۔ سلطان مسعود کو اپنا عہد یاد آیا۔ وہ ترکمانیوں کے خلاف مہم پر جانا چاہتا تھا لیکن طغرل بیگ کا تقاضہ سامنے آگیا تھا اور اس نے ترکمانیوں کے خلاف مہم ترک کردی تھی۔ اب جو اس نے ترکمانیوں کے جمع ہونے کی خبریں سنیں تو وہ شہر مرو کی طرف روانہ ہوا۔

ترکمانیوں نے جب سنا کہ سلطان مسعود ''مرو'' کی طرف کوچ کررہا ہے تو وہ گھبرا گئے۔ انہوں نے ایک قاصد مسعود کی طرف روانہ کیا اور کہلا بھیجا۔

''ہماری قوم پوری طرح بادشاہ کی اطاعت گزار اور فرماں بردار ہے۔ ہم نے اب تک جو بدعنوانیاں کی ہیں، وہ صرف اس لیے کہ ہمارا کوئی ذریعۂ معاش نہیں۔ اگر بادشاہ ہماری معاش کے لیے مدد فرمائے اور اتنی جاگیر وقف کردے کہ ہمارے جانوروں اور اہل وعیال کی کفالت ہوسکے تو آئندہ کے لیے ایسی حرکتوں سے توبہ کریں گے۔''

مسعود نے ان کی اس درخواست کو قبول کیا اور ان کے سردار ''پیغو'' کے پاس اپنا ایک قاصد بھیجا تاکہ وہ اپنے وعدے کی ضمانت دے اور نیک چلنی کا یقین دلائے۔

سردار پیغو نے اس قاصد کے ذریعے سلطان مسعود کو یقین دلایا کہ وہ اپنی قوم کو راہِ راست پر رکھے گا اور ہمیشہ سلطان کا وفادار رہے گا۔ اس کے علاقوں کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھے گا اور اس سے ٹکرانے سے ہمیشہ گریز کرے گا۔

سلطان اس جواب سے بہت خوش ہوا۔ وہ خود اس آوارہ گرد جنگجو قوم سے ٹکرانے کے حق میں نہیں تھا۔ وہ تو ہمیشہ سے یہ چاہتا رہا تھا کہ اس کے علاقوں میں امن رہے تاکہ وہ ہندوستان کے راجاؤں سے آسان جنگیں لڑتا رہے۔ معمولی سی جاگیر دے کر امن خریدنا اسے برا نہیں لگا۔

اب اسے ''مرو'' جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے اپنا رخ ہرات کی طرف موڑ دیا۔

''مرو'' سے ہرات جاتے ہوئے مسعود ابھی راستے ہی میں تھا کہ ترکمانیوں کا ایک لشکر اچانک کوہستانی سلسلے سے نمودار ہوا اور سلطان مسعود غزنوی کے لشکر کے پچھلے حصے پر حملہ آور ہوا۔ چند سپاہیوں کو قتل کیا اور خوراک سے لدے ہوئے بار برداری کے جانور اپنے ہمراہ لے گئے۔ کوہستانی سلسلہ انہیں چھپانے کے لیے دور تک پھیلا ہوا تھا۔

سلطان مسعود کو معلوم ہوا تو ترکمانیوں کی اس حرکت پر سخت غضب ناک ہوا۔ اس نے لشکر وہیں روک دیا اور لشکر کا ایک دستہ ان کے پیچھے روانہ کیا۔ تھوڑی دور جا کر اس لشکر نے ترکمانیوں کو جالیا۔ ترکمانی بھی مسلح تھے۔ دونوں لشکروں میں شدید ٹکراؤ ہوا۔ ترکمانیوں نے بہت چاہا کہ وہ شاہی لشکر پر غالب آجائیں لیکن ان کی ایک نہ چلی، بہادر تھے اس لیے بھاگنے پر مرنے کو ترجیح دی۔ کچھ قتل ہوئے، باقی گرفتار کرلیے گئے۔ لاشوں اور قیدیوں کو مسعود کے سامنے پیش کردیا گیا۔ اس نے ان مردہ اور زندہ ترکمانیوں کو گدھوں پر سوار کرکے ان کے سردار ''پیغو'' کے پاس بھجوایا اور کہلا بھیجا۔ ''یہ دیکھو اور آئندہ کے لیے ہوشیار ہوجاؤ۔ جو کوئی وعدہ خلافی کرتا ہے اور اپنے عہد کو توڑتا ہے اس کا یہی حال

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

ہوتا ہے۔''

یہ گرفتار ہونے والے ترکمانی جب پیغو کے پاس پہنچے تو اس نے سلطان کو پیغام بھجوایا۔ ''میں خود بھی ان لوگوں سے بے زار تھا اور میں خود ان کو سزا دینا چاہتا تھا جو انہیں خود بخود مل گئی۔''

پیغو نے اس واقعے سے اپنی لاعلمی ظاہر کی اور معذرت کی۔

مسعود اب مطمئن تھا۔ وہ ہرات سے نیشاپور آیا اور وہاں سے طوس کی طرف روانہ ہوا۔ طوس کے قرب و جوار میں بھی ترکمانیوں کے ایک چھوٹے سے لشکر نے سلطان سے چھیڑ چھاڑ کی۔ سلطان نے ان کی اکثریت کو موت کے گھاٹ اتارا اور طوس شہر میں داخل ہوگیا۔ یہاں آ کر اسے معلوم ہوا کہ بادآورد کے باشندوں نے قلعہ ترکمانیوں کے حوالے کر دیا ہے۔ اس نے طوس کے قلعے کو فتح کر کے اہالیانِ قلعہ کو قتل کیا اور پھر نیشاپور کی طرف واپس ہوا۔

☆☆☆

سلطان مسعود اب طغرل بیگ اور ترکمانیوں کے درمیان گھرا ہوا تھا۔ کبھی طغرل بیگ اس کے مقابلے پر آتا کچھ دیر لڑتا اور بھاگ جاتا، کبھی ترکمانی اس کے ساتھ ساتھ چلتے، موقع دیکھ کر حملہ آور ہوتے اور لوٹ مار کر کے پہاڑوں میں گم ہوجاتے۔ اسے عیار دشمنوں سے واسطہ پڑا تھا اور وہ حتی الامکان ان سے نمٹ رہا تھا۔ سلطان کا لشکر اس آنکھ مچولی سے تھک چکا تھا۔ بڑے بڑے سردار اس سے نالاں ہونے لگے تھے کہ وہ انہیں آرام کا موقع ہی نہیں دیتا۔ انہیں مسلسل جنگوں میں مصروف رکھے ہوئے ہے۔ مسعود کو ان عناصر کے تیور دیکھنے چاہیے تھے لیکن وہ اس بدلتی ہوئی صورتِ حال کو خاطر میں نہیں لا رہا تھا۔

ترکمانی اسے کہیں چین سے نہیں بیٹھنے دے رہے تھے۔ مسعود نے بھی انہیں ناکوں چنے چبوا دیے تھے۔ وہ ہر جگہ ان کا پیچھا کرتا پھر رہا تھا۔ تنگ آ کر ترکمانیوں نے امن معاہدوں کو طاق میں رکھا اور آپس میں اتفاق کر لیا۔

''ٹکڑیوں میں بٹ کر مسعود کے خلاف کارروائیاں کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ ہمیں چاہیے کہ ہم سب مل کر چاروں طرف سے اسے گھیر لیں اور اس کا خاتمہ کر دیں۔''

اس منصوبے پر عمل کرنے کا انہیں بہت جلد موقع مل گیا۔ سلطان مسعود ایک مہم کے لیے ''سرخس'' گیا ہوا تھا۔ جب وہ ''سرخس'' سے نکل کر کھلے میدان میں آیا تو ترکمانیوں نے جمع ہو کر چاروں طرف سے اسے گھیر لیا۔

مسعود نے بھی فوج کو مرتب کیا اور فریقین کے درمیان جنگ شروع ہوگئی۔

مسعود کے بہت سے سردار جو اس سے تنگ آ چکے تھے، کچھ دیر تو لڑے اور پھر دشمن سے مل گئے۔ اس نمک حرامی پر مسعود کے غصے کا ٹھکانا نہیں رہا تھا۔ اس نے ان غداروں کی پروا نہیں کی اور خود میدان میں اتر آیا لیکن برے دن اس کا پیچھا کر رہے تھے۔ ترکمانیوں کو بھاری پڑتے ہوئے دیکھ کر اس کے لشکر کا وافر حصہ اپنے سرداروں سمیت میدانِ جنگ سے فرار ہوگیا۔ اب وہ چیدہ چیدہ سالاروں اور بہت تھوڑے لشکر کے ساتھ تنہا رہ گیا۔ جب اس نے دیکھا کہ بہت کم لوگ اس کے ساتھ رہ گئے ہیں تو ان چند ساتھیوں کے ساتھ دشمن کی صفوں کو چیرتا ہوا میدان سے بھاگ نکلا۔ دشمن نے اسے بھاگتے ہوئے دیکھا لیکن کسی کو یہ جرأت نہ ہوئی کہ کوئی اس کا تعاقب کرتا۔ اسے یہ شک ضرور تھا کہ دشمن اس کا تعاقب کرے گا اس لیے برق رفتاری سے دوڑ رہا تھا۔ اسی طرح دوڑتے دوڑتے وہ ''مرو'' پہنچا۔ اس کے مفرور لشکر کا کچھ حصہ اس سے پہلے ہی وہاں پہنچ چکا تھا۔ مسعود کے وہاں پہنچتے ہی یہ لشکر اور چند مفرور سردار اس سے آملے۔

اب مایوس اور دل شکستہ مسعود غزنوی اپنی ہزیمت کسی میت کی طرح اپنے کاندھے پر اٹھائے غزنی کی طرف رواں دواں تھا۔ مفرور سردار اور لشکر بھی اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ راستے بھر اس نے ان سے کوئی بات نہیں کی لیکن غزنی پہنچتے ہی اس نے انہیں ان کی غداری کی سزا دی۔ پہلے انہیں گرفتار کیا گیا پھر ذلیل و رسوا کیا اور آخر کار ہندوستان بھجوا کر وہاں کے مختلف قلعوں میں قید کروا دیا۔ ان قیدیوں میں اس کے مشہورِ زمانہ سالار بک تغدی اور حاجب شیبانی بھی تھے۔

ان قیدیوں میں سے اکثر نے قید کی حالت میں وفات پائی۔

اس شکست اور ساتھیوں کی غداری نے سلطان کو پژمردہ کر دیا۔ اس کے پاس معمولی سا لشکر رہ گیا تھا۔ اس کے قدیمی اور عزیز ترین سالار ہندوستان کے قلعوں میں قید تھے۔ اس نے اہم ترین معرکوں میں کامیابی حاصل کی تھی اور اپنی دھاک بٹھائی تھی۔ اس ایک شکست نے ان سب پر پانی پھیر دیا تھا۔ اب وہ دربار بھی کم منعقد کر رہا تھا۔ ایک قسم کی گوشہ نشینی کی زندگی گزار رہا تھا۔ اس کے ہمدرد ساتھی اس کی طرف سے سخت فکرمند تھے.... بالآخر

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

اس نے اس تنہائی سے تنگ آ کر خود کو علمی مصروفیات میں منہمک کرلیا۔ وہ ابتدا ہی سے ذی علم اور علم پرور تھا معرکہ آرائیوں نے اسے اس طرف سے غافل کردیا تھا ورنہ اس کی تربیت کسی طالب علم کی طرح کی گئی تھی۔ خوش بیان ادیب، عربی زبان کا ماہر اور علوم نقلیہ کا دلدادہ تھا۔ علم ہیئت کا شائق اور سائنسی علوم۔ دانش وروں، شاعروں اور ادیبوں کو انعامات سے نوازا کرتا تھا۔

سلطان مسعود چونکہ عالموں کا قدردان تھا اس لیے وہ بیرونی کی بھی قدر کرتا تھا۔ بیرونی بھی اس کا دل سے مداح تھا۔ سلطان مسعود بیرونی کے ساتھ اکثر سائنسی اور علمی موضوعات پر تبادلہ خیال کیا کرتا تھا، ایک دفعہ اس نے بیرونی سے دریافت کیا کہ رات اور دن کیوں گھٹتے بڑھتے ہیں۔ کبھی رات لمبی ہوتی ہے اور کبھی دن لمبا ہوجاتا ہے۔ سورج قطبین پر غروب کیوں نہیں ہوتا؟ اس بارے میں وہ مشاہدے کے ذریعے واضح دلائل مانگتا تھا۔ بیرونی نے سلطان کے لیے آسان زبان میں کتاب اللیل والنہار لکھی۔ چونکہ سلطان عربی زبان میں مہارت رکھتا تھا اس لیے یہ کتاب پڑھ کر بہت خوش ہوا۔

سلطان مسعود چونکہ علم ہیئت اور حقائق علمیہ میں شغف رکھتا تھا لہٰذا اس بات کے پیش نظر بیرونی نے علم ہیئت اور نجوم پر ایک نہایت عمدہ کتاب لکھی جس کا طرز بیان بہت سادہ اور آسان تھا۔ اس نے منجموں کے مسائل پر بہت کم بحث کی، سائنسی اصطلاحات بھی بہت کم استعمال کیں۔ تمام مسائل کو اس طریق سے بیان کیا کہ جو بھی اس فن سے معمولی شغف رکھتا ہو، وہ اس کے مفہوم کو سمجھ سکتا تھا۔ اس نے علم ہیئت کے وہ مسائل جن تک مسلمان رسائی حاصل کرسکتے تھے، تمام کے تمام بیان کردیے۔ بیرونی نے اس معرکۃ الآرا کتاب کا نام سلطان مسعود کے نام پر ''قانونِ مسعودی'' رکھا۔ جب کتاب سلطان کو پیش کی گئی تو اس کا دل باغ باغ ہوگیا۔ اس نے بیرونی کو خلعت سے نوازا اور چاندی کے سکوں سے لدا ہاتھی بیرونی کو انعام کے طور پر پیش کیا۔

سلطان مسعود ہی کے حکم سے بیرونی نے ایک اور کتاب بھی تحریر کی جس میں موضوع سے مناسبت رکھنے والی قرآن حکیم کی آیات جگہ جگہ دلیل کے طور پر پیش کیں۔ علم نجوم پر یہ کتاب اتنے اعلیٰ پائے کی تھی کہ سلطان نے بے حد پسند کی اور انعام واکرام سے نوازا۔

ایک البیرونی پر ہی منحصر نہیں، اس زمانے کے مشہور عالم قاضی ابومحمد نے اپنی عظیم الشان کتاب جو فقہ حنفی سے متعلق ہے، سلطان مسعود ہی کے نام معنون کی تھی اس کا نام ''کتاب مسعودی'' رکھا تھا۔

علمی مشاغل میں مصروف رہنے کے باوجود اس کے دل پر شکست کا داغ ایسا لگا تھا کہ مندمل ہونے کا نام نہیں لیتا تھا۔ جب فرصت ملتی تھی، ترکمانیوں کو کچلنے کی ترکیبیں سوچتا رہتا تھا۔ ایک ترکیب یہ سمجھ میں آئی کہ وہ بجائے غزنی کے لاہور کو اپنا دارالسلطنت بنائے۔ اپنا تمام مال ومتاع لاہور لے جائے اور اس دولت سے ایک نیا لشکر ترتیب دے۔ اپنے لشکر میں نئے لشکریوں کو داخل کرکے اپنی قوت میں اضافہ کرے پھر ترکمانیوں اور سلجوقیوں کو ان کی بداعمالیوں کی سزا دے۔

روانگی سے قبل چند انتظامی معاملات درست کرنا ضروری تھے۔ اس نے اپنے بیٹے مودود کو بلخ کا امیر مقرر کیا اور خواجہ محمد بن عبدالصمد وزیر کو اس کے ہمراہ کرکے چار ہزار سپاہیوں کے لشکر کے ساتھ اسے بلخ روانہ کیا۔ اس کا دوسرا بیٹا ابوالمجدود لاہور سے آیا ہوا تھا۔ اسے دو ہزار سپاہیوں کے ساتھ ملتان روانہ کیا تاکہ وہاں کے انتظام کو بہتر بنائے اور ابتری وانتشار پیدا نہ ہونے دے۔ تیسرے بیٹے کو کوہ پایہ غزنی کی طرف روانہ کیا تاکہ وہاں کے سرکش افغانوں کو قابو میں رکھا جائے اور اس طرح غزنی سلطنت کی سرحدیں انتشار سے محفوظ ہوگئیں۔

غزنی کو چھوڑنا آسان نہیں تھا لیکن ترکمانیوں سے شکست کے بعد وہ ہمت ہار بیٹھا تھا۔ یہاں کے لوگوں سے اسے امید نہیں رہی تھی۔ اسے مجبوراً ہندوستان جانا پڑ رہا تھا۔

اس نے اپنے باپ محمود غزنوی کی جمع کی ہوئی تمام دولت جو مختلف قلعوں میں رکھی ہوئی تھی، غزنی منگوائی۔ اس کام میں بھی کئی مہینے صرف ہوگئے۔

اس نے اپنے ارادے کو صیغۂ راز میں رکھا تھا لیکن کسی نہ کسی طرح بات باہر نکل ہی گئی۔ لشکر میں بے چینی پھیل گئی۔ ہزاروں سپاہی اپنے سرداروں کو بتائے بغیر لشکر چھوڑ کر چلے گئے۔ وہ اس تکلیف دہ سفر پر جانے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھے۔ کئی سرداروں نے بھی اس کی مخالفت کی لیکن وہ اپنے ارادے پر ڈٹا رہا۔

وہ اپنے بچے کھچے لشکر کے ساتھ لاہور کی طرف کوچ کرگیا۔ اونٹوں پر لدا ہوا شاہی خزانہ قابلِ اعتبار غلاموں کے حصار میں لشکر کے ساتھ چل رہا تھا۔

وہ راستے ہی میں تھا کہ بھائی کی محبت نے جوش مارا۔ اپنے کیے پر ندامت ہوئی۔ اپنے بھائی امیر محمد کو اندھا

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

کرا کے ایک قلعے میں قید رکھا ہوا تھا۔ برسوں سے اس کا خیال تک نہیں آیا تھا لیکن اس وقت وہ اسے بے تحاشا یاد آرہا تھا۔ اس نے لشکر کو پڑاؤ کرنے کا حکم دیا۔ جتنے سالار تھے، سب حیران تھے کہ اتنی جلدی کون سی تھکن غالب آگئی کہ بادشاہ پڑاؤ کررہا ہے۔

خزانے سے لدے ہوئے اونٹ وفادار غلاموں کے پہرے میں لشکر سے الگ کھڑے تھے۔

پڑاؤ کرتے ہی مسعود اپنے خیمے میں بند ہوگیا۔ کسی کو اندر آنے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ سوچ رہا تھا، امیر محمد کے بارے میں کیا ہونا چاہیے۔ وہ نابینا ہوچکا ہے۔ اب اس کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں۔ اگر اسے اپنے پاس بلالوں اور لاہور پہنچ کر اسے اپنے ساتھ رکھوں تو کیا حرج ہے۔ اسے تمام پچھلی باتیں یاد آرہی تھیں۔ اس وقت وہ اقتدار پر قابض ہوگیا تھا۔ اسے سزا دینی ضروری تھی لیکن اب سلطنت میرے پاس ہے۔ لشکر میرا ہے، طاقت میری ہے۔ وہ میرے لیے خطرہ نہیں بن سکتا۔ اگر میں نے اسے رہائی دلادی تو وہ عمر بھر میرا احسان مند رہے گا۔

وہ گھنٹوں اپنے آپ سے جنگ کرتا رہا۔ کبھی ایک رائے قائم کرلیتا، کبھی دوسری رائے اختیار کرلیتا..... بالآخر اپنے ایک آدمی کو اس کام کے لیے بھیجا کہ وہ اس کے بھائی امیر محمد کو قلعے سے نکال کر اس کے سامنے لائے۔

اسے اسی مقام پر رات بسر کرنی تھی اور صبح ہوتے ہی روانہ ہونا تھا۔ وہ سونے کے لیے لیٹا تو نیند کہیں دور جا کر کھڑی ہوگئی تھی۔ وہ کروٹیں بدلتا رہا اور سوچتا رہا۔ رات کے کسی پہر میں اسے نیند آگئی۔ اس نے ایک بھیانک خواب دیکھا۔ اس نے دیکھا کہ ایک بہت بڑا میدان ہے جہاں لاکھوں آدمیوں کی بھیڑ ہے۔ اتنے لوگ جمع ہیں کہ راستہ بنا کر نکلنا محال ہے۔ اچانک وہ بھیڑ چھٹ گئی۔ گزرنے کے لیے راستہ بن گیا۔ پھر ایک شخص دور سے آتا دکھائی دیا۔ قریب آیا تو مسعود کو پہچاننے میں دقت نہیں ہوئی۔ سرخ کمبل میں لپٹا ہوا یہ وہی مجذوب فقیر تھا لیکن اس حالت میں کہ اس کی گردن پر سر نہیں تھا۔ اس نے اپنا کٹا ہوا سر اپنی ہتھیلی پر رکھا ہوا تھا اور وہ چل رہا تھا۔ جب وہ اس بھیڑ میں راستہ بناتا ہوا آگے بڑھا تو لوگوں نے گریہ وزاری شروع کردی۔

مسعود کی آنکھ کھلی تو اس کے رخسار بھی آنسوؤں سے تر تھے۔ وہ ایک مرتبہ پھر اس خواب کو دہرانے لگا۔ وہ مجذوب خود قتل ہوگیا ہے یا کسی ممکنہ قتل کی طرف اشارہ کررہا ہے؟

وہ اس خواب کے مختلف پہلو سوچتا رہا لیکن کوئی واضح تعبیر سمجھ میں نہ آئی۔ اگر کوئی بات سمجھ میں آئی تو یہ کہ شاید کوئی بڑی افتاد پیش آنے والی ہے۔ مجھے اب باقی سفر بڑی احتیاط سے طے کرنا ہے۔

صبح ہوئی اور یہ قافلہ ایک مرتبہ پھر روانہ ہوا۔

جب مسعود رباط مارکلہ (صحیح لفظ ''مارگلہ'' ہے۔ یہ مقام راولپنڈی اور اٹک کے درمیان واقع ہے) یا دریائے جہلم کے قریب پہنچا تو ان غلاموں نے جو خزانے کی حفاظت پر مامور تھے، اس خزانے کا کچھ حصہ لوٹ کر اپنے خیموں میں چھپا دیا۔

انہوں نے یہ فعلِ بد انجام تو دے لیا لیکن یہ سوچ کر ان پر لرزہ طاری ہوگیا کہ اگر خزانے کے لوٹے جانے کی خبر سلطان مسعود کو ہوگئی تو ہم میں سے کوئی زندہ نہیں بچے گا۔ کسی کا سر اس کی گردن پر نہیں رہے گا۔

سلطان نے پڑاؤ کرلیا تھا۔ خزانے کے پہرے دار تبدیل ہوگئے تھے۔ جن لوگوں نے خزانے پر ہاتھ صاف کیا تھا وہ سب ایک خیمے میں جمع ہوگئے تھے اور اپنے بچاؤ کی ترکیبیں سوچ رہے تھے۔

''اب پہرے دار تبدیل ہوگئے ہیں۔ چوری کا الزام ان پر آئے گا۔'' ایک نے کہا۔

''کیسی نادانی کی باتیں کرتے ہو۔ دولت ہمارے خیموں سے برآمد ہوگی۔''

''یہ راز کبھی کھلنے والا نہیں۔''

''یہ راز جب بھی کھلے گا، سلطان ہمیں چھوڑے گا نہیں۔''

''ہم یہ دولت لے کر کہیں فرار ہوجائیں۔''

''اس طرح ہم اپنے پاؤں پر کلہاڑی خود ماریں گے۔ ہم پاتال میں بھی چھپ گئے تو سلطان ہمیں ڈھونڈ لے گا۔''

''پھر کیا ہوسکتا ہے۔ جلدی سوچو رات گزرنے والی ہے۔''

ان کا ایک ساتھی جو بڑی دیر سے خاموش بیٹھا تھا، کچھ سوچ کر بولا۔

''اس کا ایک ہی حل ہے اور وہ یہ کہ سلطان کو گرفتار کر کے معزول کردیا جائے۔ اس کا بھائی امیر محمد یہاں پہنچ چکا ہے، اس کی بادشاہت کا اعلان کردیا جائے۔''

''سلطان کا لشکر ایسا ہونے دے گا؟''

''بالکل ہونے دے گا۔ سلطان کی آئے دن کی مہموں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

اور غزنی شہر سے دور رہنے کے بعد بہت سے لشکری اس سے نالاں ہیں۔ وہ تو الٹا خوش ہوں گے کہ سلطان مسعود سے جان چھوٹی۔ انہیں اپنے گھروں کو جانے کا موقع ملا۔ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ سلطان کے زیادہ تر لشکری اس کا ساتھ چھوڑ کر جا چکے ہیں۔ جو ہیں وہ بھی بس زبردستی اس کے ساتھ ہیں۔''

''اس کے باوجود ہم یہ کام اکیلے نہیں کر سکتے جب تک کچھ بڑے سالار ہمارے ساتھ شامل نہ ہو جائیں۔''

رات نے ایک قدم اور بڑھا دیا تھا۔ اس سوال کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا کہ کسے اپنے ساتھ ملایا جائے۔ آخر وہی شخص پھر بولا جس نے یہ تجویز دی تھی۔

''میری نظر میں دو آدمی ہیں جو بہ آسانی سلطان کے خلاف ہو سکتے ہیں۔''

''وہ کون.....؟'' کئی آوازیں ایک ساتھ ابھریں۔

''سلیمان بن یوسف اور علی خویشاوند کا بیٹا۔''

''تم نے یہ کیسے جان لیا کہ یہ دونوں ہمارا ساتھ دیں گے؟''

''کیا تمہیں یاد نہیں کہ علی خویشاوند کو سلطان نے قتل کرا دیا تھا اور یوسف کو قید میں ڈال دیا تھا اور وہ اسی عالم اسیری میں چل بسا تھا۔ ان دونوں کو یہ واقعات یاد ہوں گے۔ اپنے باپ کے قاتل کے خلاف وہ ضرور اٹھ کھڑے ہوں گے۔ ہم انہیں بدلہ لینے کا آسان موقع فراہم کر رہے ہوں گے۔''

بات سب کی سمجھ میں آ گئی۔ اب وقت ضائع کرنے کا موقع نہیں تھا۔ ان میں سے چند لوگ اٹھے اور علی خویشاوند کے خیمے میں پہنچ گئے۔ وہیں سلیمان بن یوسف کو بھی بلوا لیا گیا۔

یہ پہلے ہی طے کر لیا گیا تھا کہ انہیں خزانے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا جائے گا ورنہ ان کا حصہ بھی انہیں دینا پڑے گا۔

جب سلیمان بن یوسف بھی آ گیا تو سرگوشیوں نے دکان سجالی۔ ان دونوں کو یاد دلایا گیا کہ سلطان ان کے باپ کا قاتل ہے۔

''یہ ہمیں بھی معلوم ہے۔ بدلے کی آگ ہمارے دل میں بھی جل رہی ہے، لیکن ہم سلطان سے ٹکرانے کی ہمت نہیں رکھتے۔ اب تم لوگ یہ بتاؤ کہ تم کس مقصد کے لیے آئے ہو؟'' سلیمان بن یوسف نے کہا۔

''آپ کو معلوم ہے سلطان مسعود کا بھائی امیر محمد یہاں پہنچ چکا ہے۔''

''ہمیں یہ بھی معلوم ہے۔''

''تو پھر ہمارا منصوبہ یہ ہے کہ سلطان مسعود کو گرفتار کر کے امیر محمد کی بادشاہت کا اعلان کر دیا جائے۔ امیر محمد ہندوستان جانے کے بجائے غزنی واپس جانا پسند کرے گا اور ہم ہندوستان جانے سے بچ جائیں گے اور مسعود کی سخت گیری سے بھی نجات مل جائے گی۔ امیر محمد کی حکومت کا پہلا دور ہم دیکھ چکے ہیں۔ وہ ایک آرام طلب اور فیاض آدمی ہے۔ اس کے دورِ حکومت میں ہماری عمر میدانوں میں نہیں محلوں میں گزرے گی۔''

سلیمان بن یوسف اور خویشاوند کے بیٹے نے آنکھوں آنکھوں میں کچھ طے کیا اور اپنی حمایت کا عندیہ دے دیا۔

''تم لوگوں کا جو مقصد ہے، وہ تم جانو۔ ہمیں سلطان سے بدلہ لینے کا موقع مل رہا ہے اس لیے ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ ہم اپنے اپنے لشکروں کو کارروائی کے لیے تیار رکھیں گے۔ تم اپنے لشکر تک یہ باتیں پہنچا دو۔ ایسا نہ ہو کہ آپس میں ٹکراؤ ہو جائے۔ بادشاہ نے اپنا خزانہ رباط کے علاقے میں پہنچا دیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ یہاں زیادہ دن قیام کرنا چاہتا ہے۔ کل کا دن ہم اپنے ساتھیوں کو آگاہ کر کے تیار رہنے کا مشورہ دیں گے اور کل رات اس منصوبے پر عمل کریں گے۔''

یہ غلام جس اندھیرے میں گئے تھے، اسی اندھیرے میں واپس آ گئے۔ دولت کی تقسیم سے بھی بچ گئے اور کام بھی پورا ہو گیا۔

دوسرے دن لشکر گاہ میں عجیب پراسرار سا ماحول

مرنے سے پہلے

ڈاکٹر مذہبی خیالات رکھتا تھا۔ جس مریض کو دوا دیتا اسے کوئی روحانی ہدایت بھی کر دیتا۔ ایک نوجوان کے لیے نسخہ لکھنے کے بعد اس نے کہا۔

نوجوان! مجھے بتاؤ کسی کو جنت میں جانے کے لیے کیا کرنا چاہیے؟''

''مرجانا چاہیے۔'' نوجوان نے جواب دیا۔

ڈاکٹر کچھ پریشان ہوا اور پھر بولا۔

''لیکن مرنے سے پہلے کیا کرنا چاہیے؟''

''آپ کو بلا لینا چاہیے۔'' نوجوان نے جواب دیا۔

مرسلہ: وزیر محمد خان، بٹل ہزارہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

دیکھا گیا۔ کچھ لوگ تھے جو ایک جگہ سے دوسری جگہ جا رہے تھے۔ کئی سالار بھی آپس میں ملے۔

شام ہوتے ہوتے کچھ دستے غزنی اور بلخ کی طرف جانے والی شاہراہوں پر متعین ہو گئے۔ احتیاط کے طور پر لاہور جانے والی سڑک کو بھی بند کر دیا گیا۔

لشکر میں عام طور پر سلطان مسعود کی طرف سے شکایت پائی جاتی تھی۔ سلیمان بن یوسف اور علی خویشاوند کے بیٹے کے طرفدار بڑی تعداد میں موجود تھے۔ ترکمانیوں سے شکست کھانے کے بعد جن سالاروں مثلاً بک تغدی وغیرہ کو اس نے ہندوستان کے قلعوں میں قید کرا دیا تھا، ان کے حامی بڑی تعداد میں موجود تھے۔ بعض وہ تھے جنہیں برسوں ہو گئے تھے اور گھر جانا نصیب نہیں ہوا تھا۔ ان وجوہات کی بنا پر تقریباً سارا لشکر مسعود کا مخالف ہو گیا۔ مسعود مجبوراً مارگلہ میں قلعہ بند ہو گیا۔ اس کے سوا وہ کچھ اور کر بھی نہیں سکتا تھا۔ بھاگنے کی تینوں شاہراہیں بند ہو گئی تھیں۔ لشکر خلاف تھا۔ امراء نے آنکھیں پھیر لی تھیں۔ ابھی دوپہر تک یہ حال تھا کہ دوستوں نے اسے گھیرا ہوا تھا۔ ایک شاعر اسی دن لاہور سے یہاں پہنچا تھا اور اس کی شان میں قصیدہ پیش کر کے انعام وصول کر کے رخصت ہوا تھا۔ کسی کو گمان بھی نہیں تھا کہ ابھی چند گھنٹوں کی مہلت میں کیا ہو جائے گا۔

جب لشکر نے حملہ کیا تو وہی امراء دشمن کی صفوں میں کھڑے نظر آئے بلکہ ایک صاحب کی مہربانی سے لشکر کو رباط میں داخل ہونے کا موقع ملا۔ سلیمان بن یوسف، علی خویشاوند کا بیٹا اور بک تغدی کا ایک عزیز جو مسعود کے درباریوں میں شامل تھا، لشکریوں کی ایک بڑی تعداد کے ساتھ مسعود کے پاس گئے اور اس کے پیروں میں بیڑیاں ڈلوا دیں۔

''سلطان معظم یہ نہیں پوچھیں گے کہ لاہور اب کتنی منزل دور رہ گیا ہے؟'' اس کے باغی امراء نے طنزاً اس سے پوچھا۔

''میں اندھوں سے راستہ نہیں پوچھا کرتا۔''

''ہم اندھے ہیں مگر ہم نے آپ کو تو خوب پہچانا۔''

''پہچان لیتے تو اس ذلت کا کام نہ کرتے جو اب کر رہے ہو۔''

''ہم نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔ ہم نے تو وہی کیا جو اس سے پہلے آپ کرتے رہے ہیں۔ آپ نے اپنے بھائی امیر محمد سے اس کی بینائی چھین لی تھی۔ اب ہم حضور کو انہی کے پاس لیے چلتے ہیں۔ دیکھیے وہ آپ کے بارے میں کیا فیصلہ صادر کرتے ہیں۔''

''وہ ہمارا قیدی فیصلہ صادر کرنے والا کون ہوتا ہے۔''

''وہ آپ کا قیدی نہیں، غزنی کا حکمران ہے۔ اس نے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا ہے۔''

سلطان مسعود کے لیے یہ اطلاع بالکل نئی تھی۔ اب اس کی سمجھ میں آیا کہ امیر محمد اب تک اس سے ملاقات کے لیے کیوں نہیں آیا تھا۔ اسے یہ بھی تعجب ہو رہا تھا کہ امیر محمد اب تک لشکر گاہ کے اس خیمے میں رہ رہا تھا۔

سلطان مسعود کو امیر محمد کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ اس کے پیروں میں بیڑیاں اب بھی پڑی ہوئی تھیں۔ امیر محمد تو دیکھ نہیں سکتا تھا لیکن سلطان مسعود دیکھنے کی طاقت رکھنے کے باوجود اسے نہیں دیکھ رہا تھا۔ یہ اس کی نفرت تھی جو اسے امیر محمد کی طرف دیکھنے نہیں دے رہی تھی۔

''یہ تو میں نہیں دیکھ سکتا کہ تمہاری آنکھوں میں میرے لیے کتنی نفرت ہے لیکن سوچ سکتا ہوں کہ میں بااختیار ہوں۔ میں تمہیں قتل تو نہیں کراؤں گا البتہ نظر بند ضرور کروں گا۔ تم جو جگہ اپنے اور اپنے بال بچوں کے لیے منتخب کرو وہیں تمہیں قید کروں گا تاکہ تم اپنی زندگی کے باقی دن اطمینان سے بسر کر سکو اور اپنی آنکھوں سے میرا دور حکومت دیکھو۔''

مسعود نے قلعہ گیری (یہ قلعہ دریائے سندھ کے قریب واقع تھا) میں رہنا پسند کیا اور روانگی کی تیاری کرنے لگا۔

جب مسعود روانگی کی تیاری کرنے لگا تو اس کے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی لہٰذا اس نے امیر محمد کے پاس ایک آدمی بھیجا تاکہ وہ اخراجات کے لیے رقم لائے۔ امیر محمد نے پانچ سو درہم بھجوائے۔ جب یہ رقم اس کے سامنے آئی تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''سبحان اللہ! کل اسی وقت میرے قبضے میں زر و جواہر سے لدے ہوئے تین ہزار اونٹ تھے اور آج یہ عالم ہے کہ میرا بھائی مجھے پانچ سو درہم بھجوا رہا ہے۔ میرا ایک اونٹ ہی مجھے واپس کر دیتا۔''

مسعود نے اسی وقت اپنے چند ساتھیوں سے ایک ہزار دینار بطور قرض لیے اور وہ پانچ سو درہم جو امیر محمد نے بھجوائے تھے، اسی شخص کو بطور انعام دیے جو لے کر آیا تھا۔

سلطان مسعود کے قلعہ گیری روانہ ہونے کے بعد امیر محمد رباط مارگلہ میں داخل ہو گیا۔ سلطان مسعود کا خزانہ اور لشکر سب کچھ اس کے ہاتھ آ گیا۔

امیر محمد چونکہ اندھا تھا اس لیے اس نے سلطنت کا تمام کاروبار اپنے مخبوط الحواس بیٹے احمد کے سپرد کر دیا۔ احمد کا دماغی توازن کچھ درست نہیں تھا۔ اسے پاگل نہیں کہا جا

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

سکتا تھا لیکن مخبوط الحواس ضرور تھا۔ بعض اوقات ایسے کام کر جاتا تھا کہ بعد میں خود پچھتاتا تھا۔

جب سلطان مسعود قلعہ گیری میں منتقل ہو گیا تو ایک روز امیر محمد کے دو چھوٹے بیٹے عبدالرحمٰن اور عبدالرحیم اپنے چچا یعنی مسعود سے ملنے قلعہ گیری گئے۔

عبدالرحمٰن نے مسعود کو دیکھتے ہی بڑی بدتمیزی سے کہا۔ ''اب یہ سر تاج شاہی کے قابل نہیں رہا'' اور پھر اس کے سر سے ٹوپی اتار کر زمین پر پھینک دی۔ یہ ایسی بدتمیزی تھی جسے عبدالرحیم برداشت نہ کر سکا۔ اس نے اس ناشائستہ حرکت پر عبدالرحمٰن کو ڈانٹا اور ٹوپی اٹھا کر مسعود کے سر پر رکھ دی۔

''عبدالرحمٰن!'' عبدالرحیم نے اپنے بھائی سے کہا۔ ''بادشاہوں کے دن بدلتے رہتے ہیں۔ کل تک ہمارا باپ قید میں تھا آج تخت پر ہے۔ اگر کل چچا جان کے دن پھرے تو انہیں تمہاری یہ حرکت یاد رہے گی۔''

''اب ان کے دن پھرنے والے نہیں۔'' عبدالرحمٰن نے ایک مرتبہ پھر نہایت بدتمیزی سے کہا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

☆☆☆

سلطان مسعود کے سابق سالار اور اس تمام فساد کے بانی توشگین بلخی، سلیمان بن یوسف اور خویشاوند کا بیٹا ایک ہی خیمے میں جمع تھے اور آئندہ کا لائحہ عمل طے کر رہے تھے۔

''مجھے ابھی ابھی یہ خبر ملی ہے کہ امیر محمد کا بیٹا عبدالرحیم مسعود کے ساتھ نہایت عزت سے پیش آیا ہے جبکہ عبدالرحمٰن نے اس کی بے عزتی کی۔'' توشگین نے کہا۔

''اس واقعے میں کون سی نئی یا انوکھی بات ہے؟'' سلیمان بن یوسف نے کہا۔

''نئی بات یہ ہے کہ دونوں کے رویے سامنے آ گئے۔ اگر کسی وقت حالات بدلتے ہیں تو عبدالرحیم، مسعود کا ساتھ دے گا۔''

''یہ تو تم نے بہت دور کی سوچی۔'' توشگین نے اس کا مضحکہ اڑایا۔

''آپ اسے مذاق نہ سمجھیں۔ میں سنجیدہ ہوں۔ نئے سلطان احمد سے لوگ خوش نہیں ہیں۔ اسے نیم پاگل قرار دیتے ہیں۔ اگر اسے کسی وقت معزول کر کے امیر محمد نے اپنے ان دو بیٹوں یعنی عبدالرحمٰن اور عبدالرحیم کے ہاتھوں میں انتظام دے دیا تو یہ سوچو یہ کش مکش کیا رنگ دکھا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی سوچو کہ مسعود کے بیٹے ابھی زندہ ہیں۔ اگر وہ ''مارگلہ'' کی طرف بڑھے اور امیر احمد کو شکست دے کر سلطنت پر قابض ہو گئے اور مسعود کو رہا کرا لیا تو سوچو ہمارا حشر کیا ہوگا۔ ذرا سوچو، امیر محمد کو قید کر کے اندھا کر دیا گیا تھا۔ کوئی کہہ سکتا تھا کہ سلطنت ایک مرتبہ پھر اس کے ہاتھوں میں آئے گی۔ دیکھو آ گئی۔''

''اس طویل تقریر کا مقصد تو یہ ہوا کہ مسعود کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔'' توشگین نے کہا۔

''بالکل..... میرا مقصد یہی ہے۔ جب مسعود نہیں رہے گا تو پھر ہمیں اپنے انجام کی فکر نہیں ہوگی۔ یوں سمجھو کہ ہم مسعود کو قتل کر کے ایک اہم گواہ کو راستے سے ہٹائیں گے۔''

''تجویز اچھی ہے لیکن یہ کام سلطان محمد کے بیٹے احمد کی رضامندی کے بغیر نہیں ہو سکتا کیونکہ سلطنت کے تمام انتظامات تو اسی کے ہاتھ میں ہیں۔''

''یہ تمام خدشات جو تم نے پیش کیے، احمد کے سامنے رکھتے ہیں بلکہ اس سے تو یہ کہتے ہیں کہ جب تک مسعود زندہ ہے تمہارے باپ کی حکومت اور تمہاری جان کو خطرہ ہے لہٰذا اسے قتل کرا دو۔''

یہ بات خبط الحواس احمد کی سمجھ میں آ گئی۔ اس نے سلطان محمد کی جانب سے ایک فرمان لکھا جس میں کہا گیا تھا۔ ''مسعود کو قتل کر کے اس کا سر کاٹ کر میرے پاس بھیج دو۔''

یہ فرمان قلعہ گیری کے کوتوال کے پاس بھجوا دیا گیا۔ اسی رات مسعود کو قتل کر دیا گیا اور اس کا سر اس کی لاش کے ساتھ رکھ کر احمد کی خدمت میں پہنچا دیا گیا۔ احمد نے سر دیکھا، لاش دیکھی اور مطمئن ہونے کے بعد اسے دوبارہ قلعہ گیری بھیج دیا کہ اسے قلعے کے اندر ہی دفن کر دیا جائے۔

سلطان محمد تک یہ خبر پہنچی تو آنسو بہانے کے سوا اس کے پاس کچھ نہیں بچا تھا۔ وہ بہت دیر تک بھائی کو یاد کر کے روتا رہا۔

جب ہوش آیا تو اسے یاد آیا کہ جب کوئی مرجاتا ہے تو اس کے اعزہ سے تعزیت بھی کی جاتی ہے۔ اس نے کاتب کو بلوایا اور مسعود کے لڑکے مودود کے نام اس مضمون کا خط بھیجا کہ فلاں فلاں افراد نے اپنے باپ کے قصاص کے لیے تمہارے باپ کو قتل کر دیا۔ ان کے علاوہ کوئی اور اس اقدام میں شریک نہیں ہے۔

سلطان مسعود قتل ہو گیا تھا۔ اس کا کٹا ہوا سر اس کی لاش کے ساتھ چل کر آیا تھا۔ سلطان اپنے خواب کی تعبیر دیکھنے کے لیے اب اس دنیا میں نہیں رہا تھا۔ وہ جب ہندوستان جانے کے لیے لشکر کے ساتھ نکلا تھا اور ایک جگہ قیام کیا تھا تو خواب میں اس نے دیکھا تھا کہ کمبل پوش

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

مجذوب اپنا کٹا ہوا سر اپنے ہاتھ میں لے کر چل رہا ہے۔ یہ خواب اشارہ تھا کسی ناگہانی آفت کا۔ سلطان نے سوچا بھی تھا کہ وہ احتیاط کرے گا لیکن احتیاط نہ کر سکا۔ اپنے بھائی امیر محمد کو اپنے پاس بلا لیا اور اس کے بیٹے کے ہاتھوں سر کٹوا بیٹھا۔

امیر مودود کو جب سلطان محمد کا خط ملا تو اس نے جواب میں لکھا۔

''خدا آپ کی عمر دراز کرے اور آپ کے لڑکے احمد مخبوط الحواس کو اتنی عقل دے کہ وہ دنیا کے نشیب و فراز کو سمجھ سکے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ آپ کے دیوانے بیٹے نے ایک بہت بڑا جرم کیا ہے اور ایسے بادشاہ کو قتل کیا ہے جسے امیر المومنین نے ''سید الملوک والسلاطین'' کا لقب دیا تھا۔ میں آپ پر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ایک نہ ایک دن یہ خون رنگ لائے گا اور آپ کے بیٹے کو اس کے اعمال کی سزا ضرور ملے گی۔''

اس خط کا جواب لکھنے کے بعد وہ چاہتا تھا کہ مارگلہ پہنچے اور اپنے باپ کے خون کا بدلہ لے لیکن وزیر ابو نصر نے اسے اس ارادے سے باز رکھا اور اسے سمجھا بجھا کر اپنے ساتھ غزنی لے گیا۔

مودود کے آنے کی خبر سن کر غزنی کے تمام بڑے بڑے سردار اور امراء اس کے استقبال کے لیے شہر سے باہر آئے۔ اس کا بھائی ایزد یار بھی اس کے حق میں دستبردار ہو گیا اور مودود کو نیا سلطان تسلیم کر کے اس کے سر پر تاجِ شاہی رکھ دیا۔

مودود نے تخت پر قدم رکھتے ہی باپ کے قتل کا بدلہ لینے کا عندیہ دیا۔ ایزد یار کا لشکر بھی اس کے ساتھ ہو گیا۔ دونوں قوتوں نے مل کر ایک عظیم الشان لشکر تیار کیا اور غزنی سے کوچ کر گیا۔

اس کے کوچ کی خبریں جب مارگلہ پہنچیں تو امیر محمد بھی مارگلہ سے نکلا۔

امیر مودود اپنے چچا سے انتقام لینے کے لیے جب ایک مقام ''دتور'' یا ''دینور'' تک پہنچا تو امیر محمد کی فوج سامنے آ گئی۔

فوجیں آراستہ ہوئیں اور جنگ شروع ہو گئی۔ امیر محمد کا بیٹا اور مسعود کا قاتل اس لشکر کی سربراہی کر رہا تھا۔ تمام دن جنگ ہوتی رہی۔ جب رات ہو گئی تو دونوں فوجیں اپنے اپنے ٹھکانوں پر واپس آ گئیں۔

دوسرے دن پھر جنگ شروع ہوئی۔ امیر محمد کا ایک سالار سید منصور جو میر اجل کہلاتا تھا، امیر مسعود کے حق میں دستبردار ہو گیا۔ اس نے ایک آدمی کے ذریعے مودود کی خدمت میں کہلا بھیجا کہ وہ اس جنگ میں حصہ نہیں لے رہا ہے لہٰذا اسے جان کی امان دی جائے۔

سید منصور جنگ کے وقت کھڑا تماشا دیکھتا رہا اور اس نے کسی جانب سے کوئی کوشش نہیں کی۔ میدانِ کارزار گرم ہوتا رہا۔ لاشیں گرتی رہیں اور ... بالآخر امیر مودود کو فتح حاصل ہوئی۔ امیر محمد اپنے لڑکے احمد اور بڑے بڑے سرداروں کے ہمراہ گرفتار ہو گیا۔

ان اسیروں کو امیر مودود کے سامنے پیش کیا گیا، ان میں وہ بھی تھے جنہوں نے مسعود کے قتل کی سازش تیار کی تھی اور احمد کو قتل پر اکسایا تھا۔

امیر مودود نے جواب سلطان مودود بن چکا تھا ان اسیروں کے قتل کے احکام صادر کر دیے۔ صرف امیر محمد کے بیٹے عبدالرحیم کو زندہ رہنے دیا کیونکہ اسے بتا دیا گیا تھا کہ قلعہ گیری میں ملاقات کے وقت عبدالرحیم سلطان مسعود سے عزت کے ساتھ پیش آیا تھا اور اس کی ٹوپی زمین سے اٹھا کر اس کے سر پر رکھی تھی۔

جب مودود اپنے باپ کے قاتلوں کو موت کے گھاٹ اتار چکا تو اس مقام پر جہاں یہ جنگ ہوئی تھی، ایک شہر آباد کرنے کا حکم دیا اور اس شہر کا نام ''فتح آباد'' رکھا۔ باپ کی لاش کی بابت حکم دیا کہ گیری سے غزنی لائی جائے اور خود بھی غزنی پہنچ گیا۔

وہ دن غزنی میں ماتم کا دن تھا جب سلطان مسعود کی لاش قلعہ گیری سے غزنی لائی گئی۔ غزنی کے ہر شہری نے سیاہ لباس پہنا ہوا تھا۔ ہر آنکھ اشکبار تھی۔

سلطان کی میت ایک بڑے میدان میں پہنچا دی گئی جہاں اس کی نمازِ جنازہ ادا ہونی تھی۔ جب صفیں بندھ گئیں تو اس گرمی کے موسم میں بہت سے لوگوں نے اگلی صف میں کھڑے اس عجیب شخص کو دیکھا جو ایک بھاری کمبل میں لپٹا ہوا تھا۔ اس وقت بھی کسی کو معلوم نہ ہو سکا کہ یہ کون تھا اور نماز کے بعد کدھر چلا گیا۔

ماخذات

تاریخ فرشتہ، محمد قاسم، طبقات اکبری، خواجہ نظام الدین، طبقات ناصری، ترجمہ احمد علی شوق، ابو ریحان البیرونی، محمد زکریا ورک

WWW.PAKSOCIETY.COM

http://paksociety.com

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

www.paksociety.com

"لگتا ہے کہ میری ماں پاگل ہوگئی ہے۔" یہ کہتے ہوئے جارج نے کرسی میں بیٹھے ہوئے بے چینی سے پہلو بدلا۔ اس وقت وہ میرے لیونگ روم میں بیٹھا ہوا تھا۔ میں چائنا ٹاؤن کے اس اپارٹمنٹ میں گزشتہ تیس سال سے رہائش پذیر تھی جب اپنے شوہر کے ہمراہ نیویارک سٹی آئی لیکن وہ پندرہ برس قبل داغ مفارقت دے گیا اور میں اس کے بغیر زندگی گزارنے پر مجبور ہوگئی۔ میں اس کے لیے تیار نہیں تھی لیکن حالات نے مجھے بہت کچھ سکھا دیا۔ اس کے بغیر بھی میں نے پانچ بچوں کی پرورش کی اور ان کی زندگی سنوارنے پر بھرپور توجہ دی۔ یہاں تک کہ ان کے اخراجات پورے کرنے کے لیے ایک فیکٹری میں سلائی کا کام بھی کیا۔

میں صرف اپنے بچوں کے لیے ہی پریشان نہیں تھی بلکہ شوہر کے کزنز کے بچوں پر نگاہ رکھنے کے لیے بھی وقت نکال لیتی تھی اور ضرورت پڑنے پر انہیں مشورہ بھی دیتی تھی۔ اس لیے جب جارج میرے دروازے پر آیا تو مجھے بہت خوشی ہوئی کیونکہ میں اپنے شوہر کے دور کے رشتے دار کے بیٹے کے لیے بھی فکرمند تھی اور جو اپنے آپ کو ہیمر کہلوانا

تاریک ذہنوں میں امید کی کرن جگاتی ایک دلچسپ تحریر

بہت اچھا لگتا ہے جب کوئی مجرمانہ ذہن راست گوئی کی جانب متوجہ ہوجائے مگر... ایسا فلموں میں ہوتا ہے یا فرضی کہانیوں میں۔ حقیقی طور پر اگر نادانستگی میں ایسا واقعہ رونما ہو بھی جائے تو دنیا دانتوں تلے انگلی داب لیتی ہے۔ یہاں بھی کچھ ایسا ہی ہوا کہ ایک مہربان کی کاوشوں سے نہ صرف غلط فہمی دور ہوئی بلکہ وہ غلط فہم بھی درست فہم کی جانب چل پڑا۔

رقم کی واپسی

تنویر ریاض

WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

Downloaded From Paksociety.com

پسند کرتا تھا۔ وہ بہت ذہین اور باصلاحیت تھا لیکن بدقسمتی سے غلط راستے پر پڑ گیا تھا اور صرف اپنے والدین ہی کی نہیں بلکہ میری نصیحتوں کو بھی نظر انداز کر دیا کرتا تھا۔

بہر حال اپنے بچوں کی طرف سے مجھے ایسی کوئی پریشانی نہیں تھی۔ وہ سب اچھی جگہوں پر کام کر رہے تھے گو کہ میرے چار بیٹے دوسرے قصبوں میں چلے گئے تھے لیکن انہیں اپنی ذمے داریوں کا احساس تھا۔ وہ اہم مواقع پر مجھ سے ملنے ضرور آتے، چاہے وہ کوئی سالگرہ ہو، ماؤں کا دن یا یوم آزادی..... البتہ چھوٹی بیٹی جولیا میرے ساتھ ہی رہا کرتی تھی۔ جارج اسکول میں میرے دوسرے بیٹے کا ہم جماعت تھا اور وہ بھی دوسرے قصبے میں چلا گیا تھا۔ میری بیٹی کا دعویٰ تھا کہ وہ صرف اس لیے میرے ساتھ رہ رہی ہے کہ مجھے روزمرہ زندگی میں اس کی مدد کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ میں نے کبھی اس کی بات کی تردید نہیں کی لیکن سچ تو یہ ہے کہ تیس سال سے اس اپارٹمنٹ کی سیڑھیاں چڑھ رہی ہوں، مجھے پہلے دن کی طرح اب بھی انہیں چڑھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔ جب مکان کی مالکہ اولڈی نے یہ اپارٹمنٹ دکھایا تھا تو اس نے جو کرایہ بتایا، وہ مجھے بہت زیادہ لگا.... بہر حال تھوڑی سی بحث کے بعد ہم ایک قابل قبول معاہدے پر پہنچ گئے۔

مجھے خوشی ہے کہ بیٹی میرے ساتھ رہتی ہے کیونکہ اسے اب بھی میری توجہ کی ضرورت ہے۔ بعض اوقات دیر تک کام کرنے کی وجہ سے وہ کھانا نہیں کھاتی یا بیزا وغیرہ سے گزارہ کر لیتی ہے جو میری نظر میں کھانا نہ کھانے کے برابر ہے۔ میں اس کے لیے قوت بخش سوپ بناتی ہوں جس سے اس کی توانائی بحال رہ سکے۔ اس کا کام کافی تھکا دینے والا ہے۔ وہ پرائیویٹ سراغ رساں ہے جس کا سارا وقت حقائق معلوم کرنے کے لیے لوگوں کا پیچھا کرنے میں گزر جاتا ہے۔ پہلے میں بھی یہی سمجھی کہ جارج اس سے ملنے آیا ہے لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ میرا خیال غلط تھا۔

''تم میرے باپ کو تو جانتی ہی ہو۔'' جارج نے کہا۔ اس کا اصل نام یونگ لوتاؤ تھا لیکن وہ اپنے آپ کو جارج کہلوانا پسند کرتا تھا۔ وہ اپنی گفتگو کو پُراثر بنانے کے لیے چینی زبان استعمال کر رہا تھا لیکن اسے اس پر عبور حاصل نہیں تھا جبکہ میرے بچے بہت اچھی زبان بولتے تھے۔ انہوں نے زمانہ طالب علمی میں ہر ہفتے چینی زبان کی کلاس میں شرکت کی تھی۔ اسی طرح ان کے کزن ہیمر نے بھی چینی زبان پر عبور حاصل کیا تھا۔

جارج نے چائے کی پیالی ہونٹوں سے لگائی، گو کہ میں جانتی تھی کہ اسے میری چائے کی کوئی پروا نہیں ہے لیکن وہ صرف مجھے خوش کرنے کے لیے پی رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے میرے لیے تائی، تائی کے الفاظ بھی استعمال کیے۔ اس رویّے کے پیش نظر میں نے بھی ماں کے بارے میں استعمال کیے جانے والے الفاظ کو نظر انداز کرنے کا فیصلہ کیا جو اس نے ابتدائی کلمات میں ادا کیے تھے۔

''تمہارے باپ کے بارے میں صرف اتنا ہی جانتی ہوں کہ اس نے اپنی مرضی سے زندگی ختم کرنے کے لیے وقت کا انتخاب کیا۔'' میں نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

''لیکن تائی، تائی! اس نے رقم نہیں چرائی تھی۔''

میں نے سر ہلا دیا لیکن زبان سے کچھ نہیں کہا۔ میں نے یوں ظاہر کیا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی اور نہ ہی میں نے وہ افواہیں سن رکھی ہیں جو چائنا ٹاؤن میں گردش کرتی رہی تھیں۔ ان افواہوں کے مطابق جارج کے باپ لو چان نے لکی مارننگ جیولرز کے سیف میں سے بھاری مقدار میں امریکی کرنسی چرائی تھی جہاں وہ ملازمت کیا کرتا تھا۔ اس رقم کی مالیت تقریباً ایک لاکھ ڈالرز تھی۔ لو چان سے بھی پوچھ گچھ کی گئی لیکن افواہوں کے علاوہ کوئی ثبوت نہیں ملا۔ اس کے گھر کی بھی تلاشی لی گئی لیکن کچھ برآمد نہ ہوا۔ چونکہ اس کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت نہیں تھا اس لیے پولیس نے اسے گرفتار نہیں کیا لیکن اس واردات کے چند دنوں بعد ہی اس نے خودکشی کر لی۔ افواہ سازوں کا کہنا تھا کہ اس نے ضمیر کی ملامت سے تنگ آ کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا۔

میں نے منافقت سے کام لینا ضروری نہ سمجھا کیونکہ جارج نے جو موضوع چھیڑا تھا، اس پر مزید گفتگو کرنا یا کوئی وضاحت طلب کرنا میرے نزدیک وقت کا زیاں تھا کیونکہ میں اس بارے میں سب کچھ جانتی تھی اور میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو وقت ضائع کرنا پسند کرتے ہیں۔

''میرا باپ بیمار تھا۔'' جارج نے کہا۔ ''وہ زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ جس تکلیف میں مبتلا تھا، اس کے بارے میں ڈاکٹروں کی رائے تھی کہ وہ بڑھتی چلی جائے گی۔ میرا خیال ہے کہ یہ بھی ایک وجہ تھی۔ پھر اس پر چوری کا الزام بھی لگ گیا۔ وہ یہ سب برداشت نہ کر سکا اور اس نے اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا۔''

میں نے ایک بار پھر سر ہلا دیا حالانکہ میں اس کے

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

باپ کی بیماری کی سنجیدہ نوعیت کے بارے میں بھی جانتی تھی۔ میں نے جارج سے پوچھا۔ ''کیا تم جانتے ہو کہ وہ رقم کس نے چرائی تھی؟''

''یہ میں کیسے جان سکتا ہوں اور میں یہاں اس رقم کی بات کرنے نہیں آیا۔ میں پورے احترام کے ساتھ یہ کہوں گا کہ اس رقم کو تلاش کرنا تمہارے بس سے باہر ہے اور نہ ہی میں تم سے یہ کہہ رہا ہوں کہ اس رقم کا پتا لگاؤ یا میرے باپ کی ساکھ کو بچاؤ۔ اب بہت دیر ہو چکی ہے۔ میں تو تمہارے پاس اپنی ماں کے سلسلے میں آیا ہوں۔''

''اچھا، اب میں سمجھی۔'' میں نے طنزاً کہا۔ اس کی باتوں سے میں نے یہی اندازہ لگایا کہ وہ میرے بارے میں بہت کم جانتا ہے۔ اس لیے میں نے فوری ردعمل ظاہر کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ بعض اوقات سراغ رسانی میں عقل مندی کا تقاضا یہی ہے کہ دوسرے لوگ آپ کے بارے میں غلط اندازہ لگائیں۔

''تمہاری ماں نے ایسا کیا کر دیا جس سے تمہیں پریشانی ہو رہی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

وہ مجھ پر نگاہیں جماتے ہوئے بولا۔ ''اس کا سوٹ کیس۔''

میں نے ایک بار پھر سر ہلا دیا۔ اس کی ماں کا اصل نام تو ''لوفے وا'' تھا لیکن وہ اپنے آپ کو گلوریا کہلوانا پسند کرتی تھی۔ وہ ایسٹ براڈوے میں رہتی تھی جو میرے گھر سے زیادہ دور نہیں تھا۔ میں نے آخری بار اسے اس وقت دیکھا تھا جب اس کے شوہر کی آخری رسومات میں شرکت کے لیے گئی تھی۔ اس کے اگلے روز سے ہی گلوریا کو چائنا ٹاؤن کی سڑکوں پر ایک سوٹ کیس گھسیٹتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔

''میں نے بھی جب پہلی بار اسے سوٹ کیس کے ساتھ دیکھا تو پوچھ بیٹھی کہ کیا وہ کسی سفر پر جا رہی ہے؟'' میں نے جارج کو بتایا۔ ''یا وہ کچھ وقت کے لیے تمہارے یا تمہاری بہن کے پاس رہنا چاہ رہی تھی لیکن اس نے میری بات کی تردید کر دی۔''

اس نے خاصی بدتمیزی کا ثبوت دیا تھا لیکن میں نے یہ بات جارج کو نہیں بتائی۔ کہیں وہ اپنی ماں کا دفاع نہ کرنے لگے۔ اس طرح مزید وقت ضائع ہوتا۔

''اس کا کہنا ہے کہ اس سوٹ کیس میں اس کی تمام قیمتی اشیا ہیں۔ اب میرا باپ اس دنیا میں نہیں رہا اس لیے وہ ڈرتی ہے کہ کہیں کوئی اس کے اپارٹمنٹ میں نقب لگا کر وہ ساری اشیا چوری نہ کر لے اس لیے وہ انہیں اپنے ساتھ لیے پھرتی ہے۔''

''وہ قیمتی چیزیں کیا ہیں؟''

''کچھ نہیں۔ اس کے پاس کوئی قیمتی چیز نہیں ہے۔'' وہ ہاتھ نچاتے ہوئے بولا۔ ''اپارٹمنٹ کا کرایہ نامہ، اس کے کچھ نسخے، ہمارے پیدائش کے سرٹیفکیٹ اور ایک بریسلیٹ..... یہ سب چیزیں ایک پرس میں بھی آ سکتی ہیں۔''

''پھر اس سوٹ کیس میں کیا ہے؟''

وہ ناک سکیڑتے ہوئے بولا۔ ''پرانے اخبارات، میلے کپڑے..... اس کے علاوہ مجھے معلوم نہیں۔ میں تمہیں بتا چکا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ وہ پاگل ہو چکی ہے۔'' وہ آگے کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔ ''میں نے کوشش کی کہ وہ ہمارے ساتھ کوئنز میں رہے۔ یہ میں اس وقت سے کہہ رہا ہوں جب میرا باپ پہلی بار بیمار ہوا تھا۔ میں ان دونوں کی دیکھ بھال کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور اب مجھے اس کی فکر ہے۔ وہ اس طرح اکیلی نہیں رہ سکتی لیکن وہ میری بات ماننے کے لیے تیار نہیں۔''

''میرے بچے بھی یہی چاہتے ہیں کہ میں اپنے بیٹے کے گھر چلی جاؤں جو کہ کوئنز میں رہتا ہے۔'' میں نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ''میں بھی وہاں نہیں جانا چاہتی۔ چائنا ٹاؤن میرا گھر ہے۔ شاید تمہاری ماں بھی ایسا ہی محسوس کرتی ہو۔ مجھے اس میں پاگل پن کی کوئی بات نظر نہیں آتی۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن تم اپنے شوہر کے مرنے کے فوراً بعد نام نہاد قیمتی چیزوں سے بھرا ہوا سوٹ کیس لے کر سڑکوں پر نہیں پھرتیں جبکہ مرنے والے پر ایک بڑی رقم چرانے کا الزام بھی ہو۔''

میں نے ایک بار پھر سر ہلا دیا کیونکہ اس نے ایک اچھا نکتہ اٹھایا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

''تم میرے پاس کیوں آئے ہو جارج؟''

اس نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا..... ''بالآخر اسے ہمارے پاس رہنے کے لیے آنا ہی ہوگا کیونکہ اب ڈیڈی اس دنیا میں نہیں رہے جو اپارٹمنٹ کا کرایہ دے سکیں۔ اس حقیقت کا ادراک ہونے میں اسے کچھ وقت لگے گا۔ تب تک اسے سوٹ کیس سمیت سڑکوں پر پھرنے سے احتراز کرنا چاہیے۔ یہ خطرناک ہے۔ وہ دراصل کوشش کر رہی ہے کہ کوئی اس پر حملہ کرے۔ ہر کوئی سمجھتا ہے کہ اس سوٹ کیس میں رقم ہے۔''

''وہ ایسا کیوں سمجھیں گے؟'' میں حیران ہوتے ہوئے بولی۔ ''اگر گلوریا کے پاس چرائی ہوئی رقم ہے تو کون

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

سوچے گا کہ وہ اسے سوٹ کیس میں لیے پھر رہی ہے؟''

''وہ لڑکے جو گینگ کے لیے کام کرتے ہیں۔ میں نے ونگ جی لی کو اس کی بلڈنگ کے آس پاس چکر لگاتے دیکھا ہے۔''

''ونگ جی لی اس گروہ سے الگ ہو چکا ہے اور جیل سے آنے کے بعد وہ بالکل بدل گیا ہے۔ اس کی ماں نے مجھے بتایا ہے کہ وہ اپنی سابقہ حرکتوں سے تائب ہو چکا ہے اور اچھی زندگی گزارنے کا خواہش مند ہے۔''

''تم نے اس کی ماں کی بات پر یقین کرلیا..... وہ کیسے یہ کہہ سکتی ہے؟''

''ایک ماں اپنے بیٹے کو اچھی طرح جانتی ہے۔''

جارج نے ایک بار پھر ناک سکیڑی۔ یہ کوئی پُرکشش انداز نہیں تھا۔ ''کاش میری ماں بھی یہ سمجھ سکے کہ میں یہ کہنے میں کتنا سنجیدہ ہوں۔ اسے ہمارے ساتھ رہنے کی ضرورت ہے۔ تب تک اسے اس سوٹ کیس سے چھٹکارا حاصل کرنا ہوگا جو بدمعاشوں کے لیے ایک مقناطیس ہے۔''

''میں سمجھ گئی۔'' میں نے کہا۔ ''تم چاہتے ہو کہ تمہاری ماں کو اس سوٹ کیس سے الگ کردوں۔''

''یہ پہلا کام ہوگا۔ دوسرا کام اسے ہمارے ساتھ کوئنز میں رہنے پر آمادہ کرنا ہے۔''

''میں ایک وقت میں ایک ہی کام کرسکتی ہوں۔''

اس کے جانے کے بعد میں نے سوچنے میں کچھ وقت گزارا۔ گو کہ میری بیٹی سراغ رساں ہے لیکن یہ میرا پہلا کیس نہیں تھا۔ ماضی میں بھی چند مواقع ایسے آئے جب میں نے اس بات کو ترجیح دی کہ میری بیٹی کو ان کیسز میں مددگار نہیں ہونا چاہیے۔ اس طرح میں خود ہی ان کا حل نکالنے میں کامیاب ہوگئی۔ بہرحال یہ پہلا کیس تھا جو کوئی مکمل براہِ راست لے کر میرے پاس آیا تھا۔

میں نے چائے ختم کی کیونکہ صورتِ حال کا بغور جائزہ لینے کے لیے اس کی ضرورت ہوتی ہے اور کچن کی دیوار پر لگے ہوئے ٹیلی فون کی طرف بڑھی۔ گو کہ میری بیٹی نے مجھے موبائل فون بھی دے رکھا ہے لیکن اسے میں ضرورت کے وقت ہی استعمال کرتی ہوں۔ میں نے فون کرکے گلوریا کو اپنے یہاں چائے پر مدعو کیا۔

اپنے مہمان کا انتظار کرنے کے دوران میں نے اپنے شوہر کے کزن کے بیٹے یونگ ہیمر کے بارے میں دوبارہ سوچنا شروع کردیا۔ مجھ میں اتنی اہلیت ہے کہ بیک وقت دو مسائل کے بارے میں سوچ سکوں۔ اس سوچ بچار کے دوران میں نے کچن میں رکھے ہوئے برتن بھی دھو ڈالے پھر میں نے کچھ مزید فون کالز کیں پھر اسٹول پر چڑھ کر بادام سے بنے ہوئے بسکٹوں کا ڈبا اتارا۔ اس کے بعد میں نے چائے کے لیے پانی رکھ دیا۔

گلوریا نے دروازے کی گھنٹی بجائی اور میں نے مطلوبہ بٹن دبا کر دروازہ کھول دیا۔ میں نے سیڑھیوں پر اس کے بھاری قدموں کی آواز سنی اور جان گئی کہ وہ سوٹ کیس گھسیٹ رہی ہے۔ اگر وہ اسے گھر چھوڑ آتی تو میرا کام یہیں ختم ہوجاتا اور میں اسے چائے پلا کر رخصت کردیتی مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ وہ سوٹ کیس اپنے ساتھ لے کر آئی تھی۔

ڈیوڑھی میں داخل ہوکر اس نے اپنی گیلی برساتی اتاری اور مجھے وہ چھوٹا سا تحفہ دیا جو میرے لیے خرید کر لائی تھی۔ وہ مٹھائی کا ڈبا تھا جسے میں نے کھول کر پلیٹ میں سجا دیا، جب وہ اپنے جوتے اتار رہی تھی۔ وہ کبھی میری قریبی دوست نہیں رہی لیکن اس سے اکثر ملاقات ہوتی تھی جب ہمارے بچے ایک ہی اسکول میں پڑھا کرتے تھے۔ ہمارے تعلقات ہمیشہ خوشگوار رہے۔ شاید اس نے میری دعوت کا اچھا اثر لیا ہو۔ اپنے شوہر کی خودکشی کے بعد وہ تنہا ہوگئی تھی کیونکہ سب لوگ میری طرح نہیں سوچتے پھر سوٹ کیس کا بھی معاملہ تھا۔ اگر اس کے بیٹے کی رائے کو نظرانداز کردیا جائے تب بھی سوٹ کیس کو ساتھ لیے پھرنا ایک عجیب سی بات نظر آتی ہے، خاص طور پر ایسی صورت میں جب آپ کہیں نہ جارہے ہوں۔

''تمہارے بیٹے کا خیال ہے کہ تم اپنے حواس کھو بیٹھی ہو۔'' میں نے پیالی میں چائے ڈالتے ہوئے کہا۔

اس نے نتھنے سکیڑے اور بولی۔ ''وہ چاہتا ہے کہ میں کوئنز چلی جاؤں اور اس کی فیملی کے ساتھ رہوں۔ میں نے انکار کردیا۔ اس لیے وہ مجھے پاگل سمجھتا ہے۔''

''تم یہ سوٹ کیس اپنے ساتھ سڑکوں پر لیے پھرتی ہو۔ ممکن ہے کہ وہ اس وجہ سے بھی تمہیں پاگل کہتا ہو۔''

اس نے ایک بسکٹ نکالتے ہوئے کہا۔ ''اس سوٹ کیس میں میری تمام قیمتی اشیا ہیں اس لیے اسے ساتھ رکھنا ضروری ہے۔ اب میرا شوہر اس دنیا میں نہیں رہا۔ کوئی بھی شخص میرے اپارٹمنٹ میں داخل ہوکر یہ چیزیں چوری کرسکتا ہے۔''

''تمہارا شوہر کام کیا کرتا تھا۔ اس نے گھر پر رہ کر تمہاری قیمتی اشیا کی حفاظت نہیں کی لیکن اس کی زندگی میں تو تم بھی یہ چیزیں اپنے ساتھ لے کر نہیں پھرتی تھیں۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

''ہاں۔ میں خوش قسمت تھی کہ اتنے برسوں میں یہ چیزیں چوری نہیں ہوئیں لیکن اپنے شوہر کی موت کے بعد میں زیادہ خطرہ محسوس کرنے لگی ہوں۔''

''گلوریا۔'' میں نے سختی سے کہا۔ ''کیا اس سوٹ کیس میں وہ ایک لاکھ ڈالرز بھی ہیں جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ تمہارے شوہر نے کمپنی کے سیف سے چوری کیے تھے؟''

''بالکل نہیں۔'' وہ اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ ''تمہیں میرے شوہر کے بارے میں اس جھوٹ پر یقین نہیں کرنا چاہیے۔''

''ٹھیک ہے۔ میں یقین نہیں کرتی لیکن تمہیں یہ بات سمجھنی چاہیے کہ اگر میں یہ سوال کرسکتی ہوں تو دوسرے لوگوں کے ذہن میں بھی یہ بات ہوگی۔ تمہارا بیٹا بھی اسی لیے پریشان ہے کہ تم اپارٹمنٹ میں تنہا رہتی ہو اور اس سے زیادہ خطرناک بات یہ ہے کہ تم یہ سوٹ کیس اپنے ساتھ لیے پھرتی ہو۔''

اس نے جلدی جلدی چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ''مجھے اس کی پریشانی سے کوئی سروکار نہیں۔ میں جانتی ہوں کہ کیا کر رہی ہوں۔''

''مجھے بتایا گیا ہے کہ ونگ جی لی تمہاری نگرانی کر رہا ہے۔''

''یہ بات تمہیں کس نے بتائی..... میرے بے وقوف بیٹے نے؟ میں ونگ جی لی سے بالکل بھی خوفزدہ نہیں ہوں۔''

''ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو جیسا کہ مجھے بتایا گیا ہے کہ وہ سدھر گیا ہے لیکن اس کے علاوہ اور بھی نوجوان لڑکے ہیں۔'' میں نے ہیمر کے بارے میں سوچتے ہوئے کہا۔ ''جو تمہارے لیے خطرناک ہوسکتے ہیں۔''

میری اس بات کا گلوریا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے چائے کے کچھ اور گھونٹ لیے، میرے بچوں کے بارے میں پوچھا۔ میں ناراض ہونے والوں میں سے نہیں ہوں چنانچہ میں نے اسے مختصراً ان کی مصروفیات کے بارے میں بتادیا۔ اس نے چائے پی اور میرے بہت سارے بسکٹوں پر ہاتھ صاف کیا اور جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے میرا شکریہ ادا کیا لیکن مجھے اس کے الفاظ میں گرم جوشی محسوس نہیں ہوئی۔ وہ اپنا سوٹ کیس گھسیٹتی ہوئی میرے گھر سے چلی گئی۔

اس کے جانے کے بیس منٹ بعد میرا دوسرا مہمان بھی آ گیا۔ اب ونگ جی لی میری ڈیوڑھی میں اپنے گیلے جوتے اتار رہا تھا۔ جب میں نے آخری بار اسے دیکھا تھا، اس کے مقابلے میں وہ بہت مختلف دکھائی دے رہا تھا۔ یہ اس کے جیل جانے سے پہلے کی بات ہے۔ وہ رکرز آئی لینڈ میں آٹھ مہینے کی سزا بھگت کر آیا تھا۔ اس کی ماں دعویٰ کرتی تھی کہ اب وہ سدھر گیا ہے۔ دیکھنے میں بھی وہ ایسا ہی لگ رہا تھا۔ اس نے بالوں میں سلیقے سے کنگھی کی ہوئی تھی۔ کپڑے استری شدہ تھے۔ یہاں تک کہ جوتے بھی خوب چمک رہے تھے۔

میں نے اورنج کا پیالہ اس کی کرسی کے برابر والی میز پر رکھا اور بولی۔ ''ونگ جی لی! تم بہت اچھے لگ رہے ہو۔ کیا تم اب بھی لوگوں کو لوٹتے ہو؟''

وہ بسکٹ منہ میں رکھنے والا تھا کہ اس کا ہاتھ درمیان میں ہی رک گیا۔ ''نہیں۔ یہ کہنا بے کار ہے کہ میں نے کبھی ایسا نہیں کیا۔''

''میں سمجھتی ہوں۔'' میں نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ ''تاہم تمہاری ماں کا کہنا ہے کہ تم سدھر چکے ہو۔ اس نے مجھے بتایا کہ تمہیں جیل میں وقت گزارنا بہت تکلیف دہ محسوس ہوا لہٰذا تم نے فیصلہ کیا کہ اپنی طرف سے پوری کوشش کرو کہ دوبارہ وہاں جانے کا امکان باقی نہ رہے۔ اس کا کہنا ہے کہ تم اپنی اصلاح کی کوشش کر رہے ہو۔ کیا یہ سچ ہے؟''

اس نے مجھ سے آنکھیں..... ملائے بغیر کہا۔ ''میں نے جیل میں رہ کر یہی سیکھا ہے کہ اصلاح کر کے ہی میں اپنے اعمال بہتر بنا سکتا ہوں۔''

''اپنی اصلاح کرنا بہت اچھی بات ہے۔ یہ زندگی گزارنے کے لیے بھی اچھا ہے۔ کیا تمہارے پاس اس کا کوئی راستہ ہے؟''

وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''کوئی بھی مجھے ملازمت نہیں دے گا۔'' اس نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن میں زیادہ دیر فارغ نہیں رہوں گا۔ مجھے امید ہے''..... اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں نے تمہیں اس لیے بلایا ہے تاکہ خود دیکھ سکوں کہ تم واقعی بدل گئے ہو جیسا کہ تمہاری ماں کہتی ہے۔ اب مجھے اس کی بات پر یقین آ گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہم بھروسا کرسکتے ہیں۔ امید ہے کہ مستقبل میں تمہارا ہر عمل ایک ایمان دار اور کارآمد زندگی کے مقصد میں معاون ثابت ہوگا..... اور بسکٹ لو۔''

اس نے بسکٹ نہیں لیا تو میں نے ایک بار پھر چائے بنائی تاکہ ہماری گفتگو جاری رہے۔

میرا تیسرا مہمان ونگ جی لی کے جانے کے آدھ گھنٹا

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

بعد آیا۔ یہ میرے شوہر کے کزن کا بیٹا ہیمر چن تھا۔ وہ میرے لیے کوئی تحفہ لے کر نہیں آیا اور نہ ہی اس نے اپنے نئے قیمتی جوتے اتارے جب تک کہ میں نے اسے ایسا کرنے کے لیے نہیں کہا۔ کرسی پر بیٹھتے ہی اس نے دو بسکٹ ایک ساتھ اٹھائے لیکن چائے کو ہاتھ نہیں لگایا۔

''ہیمر .....!'' میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے وہ راستہ پسند نہیں جس پر تم آگے بڑھ رہے ہو۔''

اس نے بسکٹ کا ٹکڑا منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے یاد نہیں کہ میں نے تم سے اس بارے میں پوچھا ہو۔''

''مجھ سے بدتمیزی سے بات مت کرو۔'' میں نے غصے سے کہا۔ ''اگر میرا شوہر زندہ ہوتا تو وہی اس خاندان کا بڑا کہلاتا۔ اس کی بیوی ہونے کی حیثیت سے مجھے یہ حق حاصل ہے کہ اپنی خواہشات کا اظہار کرسکوں۔''

''کہتی رہو۔'' ہیمر بولا۔ ''تمہیں کوئی نہیں روک رہا۔''

اس نے ایک اور اورنج اٹھایا جو ونگ جی لی نے کرایا تھا۔

''شاید نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''لیکن کسی نہ کسی کو تو تمہیں روکنا چاہیے۔ تم نے ایک غلط راستے کا انتخاب کیا ہے جو تمہیں ایک بری زندگی کی طرف لے جائے گا۔''

''اس فکرمندی کے لیے تمہارا شکریہ۔ کیا تم نے مجھے اسی لیے بلایا تھا کہ میری بری زندگی کے بارے میں خبردار کرسکو۔ کیا اب میں جاسکتا ہوں؟''

''لگتا ہے کہ تم میری تنبیہہ کو سنجیدگی سے نہیں لے رہے۔ میں دیکھ رہی ہوں کہ تم اب بھی کسی قابلِ نفرت کارروائی کے بارے میں سوچ رہے ہو۔''

''میری بات کا غلط مطلب مت سمجھو آنٹی لیکن تمہیں کوئی اندازہ نہیں کہ میں کیا سوچ رہا ہوں۔''

''میں کچھ چیزیں دیکھ سکتی ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''میں نے کچھ باتیں سنی بھی ہیں جو نیک شگون نہیں ہے۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ تم اس بدقسمت بیوہ گلوریا کا پیچھا کررہے ہو اور تمہاری نظریں اس کے سوٹ کیس پر ہیں۔''

''میں نہیں جانتا کہ کس نے تمہیں یہ بات بتائی لیکن یہ بالکل غلط ہے۔ میں نے بھی اس پاگل بڑھیا پر توجہ نہیں دی۔''

''اگر تم اس غریب عورت پر حملہ کرکے اس کا سوٹ کیس چھیننے کے بارے میں سوچ رہے ہو جس کے بارے میں تمہیں یقین ہے کہ اس میں وہ ایک لاکھ ڈالرز موجود ہیں جن کی چوری کا الزام اس کے شوہر پر لگایا گیا تھا تو میں تمہیں ایسا نہ کرنے کا مشورہ دوں گی۔''

''اوہ میرے خدا! کیا تم واقعی ایسا کروگی؟'' اس نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔ ''مگر کیوں؟''

''پہلی بات یہ کہ تم اچھی طرح جانتے ہو یہ غلط ہے۔ دوسرے یہ کہ تم جیل چلے جاؤ گے۔ میری ابھی ونگ جی لی سے بات ہوئی ہے جو حال ہی میں جیل سے رہا ہوا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ جیل کوئی اچھی جگہ نہیں ہے۔ وہ اپنی اصلاح کی کوشش کررہا ہے تاکہ اسے دوبارہ جیل جانا نہ پڑے۔''

''تم اس کی باتوں میں آگئیں۔ مجھے حیرت ہے آنٹی۔ میں تو تمہیں ایک ہوشیار خاتون سمجھتا تھا۔ وہ لڑکا اب بھی پہلے جیسا ہی ہے۔''

''میں تمہاری رائے سے اتفاق نہیں کرتی۔ ہم دونوں میں جو بھی درست ہے، اس کے باوجود جیل کے بارے میں حقائق تبدیل نہیں ہوسکتے۔ وہ بہت ہی بری جگہ ہے۔ اس کے علاوہ بھی گلوریا کا سوٹ کیس چرانا ایک غلطی ہوگی کیونکہ رقم اس میں نہیں ہے۔''

''یہ تم کیسے جانتی ہو؟''

''اس نے مجھے یہی بتایا ہے۔''

وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ ''آنٹی! تمہاری ساری باتیں غلط ہیں۔''

''گلوریا نے مجھے بتایا ہے کہ وہ رقم اس کے سوٹ کیس اور نہ ہی اس کے گھر میں ہے۔ اس طرح یہ معاملہ تو ختم ہوگیا۔ تاہم یہ جاننا بہت مشکل ہے کہ تمہیں سیدھے راستے پر کس طرح لایا جائے۔ میں نے اپنا فرض سمجھ کر یہ کوشش کی تھی کیونکہ تم سارے بسکٹ کھا چکے ہو اس لیے تمہیں چلے جانا چاہیے۔''

''اچھا خیال ہے۔'' وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

میں نے اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے کہا۔ ''اپنے والدین کو میرا اسلام کہنا۔''

''بالکل ..... وہ جوتے پہنتے ہوئے بولا۔ ''بسکٹوں کے لیے شکریہ۔ خدا حافظ آنٹی۔''

اس کے جانے کے بعد میں ایک بار پھر ٹیلی فون کی طرف بڑھی۔ اس بار میں نے لکی مارننگ جیولرز کا نمبر ملایا۔ ان کی دکان چند بلاک کے فاصلے پر سینٹرل اسٹریٹ پر واقع تھی۔ صبح کے وقت سڑکوں پر بہت رش ہوتا ہے اور باہر کا موسم بھی ٹھیک نہیں تھا اور میرا وہاں جانا ضروری نہیں تھا اس لیے میں نے فون پر ہی بات کرنا مناسب سمجھا۔

''ولیم کوستا۔'' میں نے دکان کے مالک سے رابطہ ہونے پر کہا۔ ''میں چن یونگ ین بول رہی ہوں۔ یہ بتاؤ کہ اگر کوئی شخص کسی دوسرے کے لیے کوئی بڑا کام کرے تو

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

وصول کنندہ کو جواب میں اس کے ساتھ ایک چھوٹی سی مہربانی کرنے میں خوشی محسوس ہوگی۔ کیا میں ٹھیک کہہ رہی ہوں؟''

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ''کیا میں تمہیں جانتا ہوں؟''

''نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''براہِ مہربانی میرے سوال کا جواب دو۔''

''میں سمجھتا ہوں کہ ایسا ہونا چاہیے۔ معاملہ کیا ہے؟''

''اگر تمہیں چوری شدہ رقم واپس مل جائے تو یہ ایک بڑا کام ہوگا۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟''

وہ حیران ہوتے ہوئے بولا۔ ''تم اس رقم کے بارے میں کیا جانتی ہو؟''

''میں کچھ نہیں جانتی۔ صرف تم سے ایک سوال پوچھ رہی ہوں۔ اس کا جواب دو۔''

''ہاں اگر کوئی شخص یہ رقم واپس کرتا ہے تو میں اس کا احسان مند ہوں گا بشرطیکہ وہ کوئی چور نہ ہو۔''

''ٹھیک ہے، شکریہ۔'' یہ کہہ کر میں نے فون رکھ دیا۔

اس کے بعد ٹیلی فون کافی دیر خاموش رہا۔ مجھے جس کال کا انتظار تھا، وہ شام ڈھلے موصول ہوئی۔ اس سے پہلے صرف میرے سب سے بڑے بیٹے کا فون آیا تھا۔ اپنے بچوں کا فون سن کر مجھے یک گونہ خوشی ہوئی تھی جبکہ وہ ٹیلی فون استعمال کرنے کے بارے میں زیادہ مستعد نہیں تھے۔

میری بیٹی اسی وقت گھر آئی تھی جب وہ متوقع کال آئی۔ اس نے اپنے بیڈ روم سے ہی پوچھا کہ کیا میں فون پر بات کرنا پسند کروں گی۔ شاید وہ سمجھ رہی تھی کہ میں سوگئی ہوں لیکن میں جاگ رہی تھی۔ میری توقع کے مطابق فون کرنے والا ونگ جی لی تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ سب لوگ خیریت سے تو ہیں۔

''ہاں۔'' اس نے کہا۔ ''میرا مطلب ہے کہ سوائے.....''

''میں اس وقت کوئی طویل کہانی سننے کی ضرورت محسوس نہیں کرتی۔'' میں نے اسے بتایا۔ ''کافی دیر ہوچکی ہے۔ اگر سب لوگ خیریت سے ہیں اور پریشانی کی کوئی بات نہیں تو تم صبح مجھ سے ملنے آسکتے ہو۔''

اس نے میری بات سے اتفاق کیا۔ میرا دن بھی کافی مصروف... گزرا تھا لہٰذا میں بھی بستر پر دراز ہوگئی۔

اگلے روز صبح سویرے میری بیٹی کام پر چلی گئی اور میں ونگ جی لی کی آمد کا انتظار کرنے لگی لیکن اس کے آنے سے پہلے ہی جارج کا فون آ گیا۔

''گزشتہ رات میری ماں پر حملہ ہوگیا۔''

''مجھے امید ہے کہ وہ زخمی نہیں ہوئی ہوگی۔''

''نہیں۔ انہوں نے صرف سوٹ کیس چھین لیا جس کے بارے میں، میں اسے پہلے ہی خبردار کر چکا تھا۔''

یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے رکا پھر بولا۔ ''تمہیں حیرانی نہیں ہوئی۔ چائنا ٹاؤن میں سب کو معلوم ہو چکا ہے۔''

''میں پہلے ہی اس بارے میں سن چکی ہوں۔'' میں نے اس کی بات تسلیم کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا اسے اپنی اشیا مل گئیں؟''

''ہاں۔ میرا خیال درست نکلا۔ انہیں وہ سوٹ کیس کولمبس پارک میں پڑا ہوا ملا۔ وہاں اخبارات، ڈیڈی کی پرانی قمیصیں اور ردی کاغذ بکھرے ہوئے تھے۔ یہ تھیں اس کی قیمتی اشیا۔''

''جارج.....'' میں نے کہا۔ ''مجھے خوشی ہے کہ تمہاری ماں کو کوئی نقصان نہیں پہنچا اور تمہیں بھی اس پر خوش ہونا چاہیے۔ اس کا یہ طرزِ عمل انوکھا ضرور ہے کہ وہ فضول چیزوں سے بھرا ہوا سوٹ کیس لیے پھر رہی ہے۔ یہ صدمے کا اثر بھی ہوسکتا ہے۔ میں تو یہی کہوں گی کہ جب تک وہ یہ حماقت کر رہی ہے، تم اسے برداشت کرتے رہو، گو کہ مجھے یقین نہیں کہ یہ زیادہ عرصہ چلے۔''

''یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟''

''معاف کرنا جارج..... مجھے آج بہت سے کام کرنا ہیں۔'' میں نے دروازے پر گھنٹی کی آواز سن کر کہا۔ ''میں تم سے بعد میں بات کروں گی۔''

میں نے اس کی برساتی لے کر باتھ روم میں لٹکائی اور ونگ جی لی کو لیونگ روم میں بٹھا دیا۔ اس مرتبہ وہ میرے لیے چھوٹے سنگتروں کا تھیلا لے کر آیا تھا۔ میں نے وہ چھوٹی میز پر رکھا اور اس کے لیے چائے نکالتے ہوئے بولی۔ ''مجھے صبح جارج نے فون کر کے بتا دیا ہے۔''

''ہاں۔ میں شرطیہ کہہ سکتا ہوں کہ اس کی ماں کو بہت صدمہ ہوا ہوگا۔ حالانکہ.....''

میں نے کچھ انتظار کرنے کے بعد کہا۔ ''براہِ کرم اپنا جملہ مکمل کرو۔''

''معافی چاہتا ہوں۔ بات صرف اتنی ہے کہ میں نے تمہارے کہنے کے مطابق ہیمر کا تعاقب کیا۔ اس نے گلوریا کے قریب جانے کے لیے اندھیرا ہونے کا انتظار کیا۔ اس نے سوٹ کیس چھینا اور اس کوشش میں گرتے گرتے بچا کیونکہ گلوریا نے کوئی مزاحمت نہیں کی بلکہ وہ مسکرا رہی تھی۔ مجھے یہ بہت عجیب لگا۔ وہ اس سے لڑنے کے بجائے وہاں سے چلی گئی۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''تم نے کیا کیا؟''

''صرف وہی جو تم نے کہا تھا۔''

''لیکن تم نے اسے زخمی نہیں کیا؟''

ونگ جی لی کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ''میں نے بالکل وہی کیا جو تم نے کہا تھا۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''میں نے اسے ضرب ضرور لگائی لیکن زخمی نہیں کیا۔ یہ چوٹ ایسی نہیں کہ ٹھیک نہ ہو سکے لیکن اس دوران وہ کافی تکلیف میں رہے گا۔ میں نے اس کا وہ حال کیا ہے کہ کافی عرصہ وہ سیدھا ہو کر نہیں چل سکے گا اور اس کی چال میں لنگڑاہٹ رہے گی۔''

''تم نے اس سے کیا کہا؟''

''میں نے اسے بتا دیا کہ وہ ایک کمزور سا لڑکا ہے جو اپنے آپ کو مضبوط ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اگر میں نے اسے آئندہ اس علاقے میں گڑبڑ کرتے دیکھا تو اسے جان سے مار دوں گا۔ بہرحال اب وہ گرفتار ہو چکا ہے اور اسے اسی حالت میں ایک رات جیل میں گزارنا ہوگی۔ بس میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ جو کچھ میں نے اس کے ساتھ کیا، وہ اسے خوفزدہ کرنے کے لیے کافی ہے۔''

''بہت عمدہ..... اور بسکٹ لو۔ وہ تم ہی تھے جس نے سوٹ کیس کا سامان باہر نکالا؟''

''ہاں۔ میں نے سوچا کہ اس مار پیٹ کے بعد یہ اور بھی برا ہوگا کہ کوئی اور رقم لے کر بھاگ جائے۔''

''لیکن رقم اس میں نہیں تھی۔''

''نہیں۔'' ونگ جی لی نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ''جیسا کہ تم نے کہا تھا چن تائی تائی۔ واقعی اس میں کچھ نہیں تھا۔''

''تم مجھے آنٹی کہہ سکتے ہو۔'' میں نے کہا۔ ''کیا تم نے یہ خبر چائنا ٹاؤن میں پھیلا دی ہے..... اس سوٹ کیس میں رکھی چیزوں کے بارے میں؟''

اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ہر کوئی جان گیا ہے۔ میں نے ایسی اداکاری کی جیسے واقعی پاگل ہو گیا ہوں۔''

''تم نے بہت اچھے طریقے سے اپنا کام کیا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اور چائے پیو گے؟''

ونگ جی لی کے جانے کے بعد میں نے مزید کچھ ٹیلی فون کالز کیں۔ ان میں سے ایک جارج اور دوسری اس کی ماں گلوریا کے لیے تھی۔ میں نے رات والے واقعے پر ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے اسے ایک بار پھر چائے پر مدعو کیا۔

ایک بار پھر وہ سوٹ کیس سمیت میرے گھر کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ جب وہ دروازے پر پہنچی تو میں نے اس کی چھتری لے کر باتھ روم میں رکھ دی۔ وہ میرے لیے سیاہ پھلیوں والے بن لے کر آئی تھی جو میں نے چائے دان کے ساتھ ایک پلیٹ میں رکھ دیے۔

''تم بالکل ٹھیک لگ رہی ہو۔'' میں نے کہا۔ ''کوئی چوٹ تو نہیں آئی؟''

''نہیں۔ میں بھاگ گئی تھی۔ انہیں صرف میرا سوٹ کیس چاہیے تھا۔ میں نے پہلے ہی پولیس کو اس لڑکے کے بارے میں بتا دیا ہے جو اپنے آپ کو ہیمر کہتا ہے۔ وہ اسے تلاش کر لیں گے۔''

''اس طرح انہیں یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ تمہاری قیمتی اشیا اس کے پاس نہیں ہیں۔''

''نہیں۔ خوش قسمتی سے وہ انہیں تلاش نہیں کر سکا۔'' وہ آگے کی طرف جھکی اور اپنی آواز نیچی کرتے ہوئے بولی۔ ''میں نے انہیں ایک دوسرے سوٹ کیس میں منتقل کر دیا تھا۔'' اس نے ایک نئے سوٹ کیس کی طرف دیکھتے ہوئے سر ہلایا جس نے میرے گھر کا داخلی دروازہ روک رکھا تھا۔

''گلوریا۔'' میں نے چائے کی پیالی میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''جس سوٹ کیس کو تم ساتھ لیے ہوئے پھر رہی تھیں، اس میں تمہاری کوئی قیمتی چیز نہیں تھی۔ تم چاہتی تھیں کہ کوئی یہ سوچ کر حملہ کرے کہ اس سوٹ کیس میں وہ رقم ہے جس کی چوری کا الزام تمہارے شوہر پر لگا تھا لیکن جب گروہ کے لڑکوں نے سوٹ کیس کھولا تو اس میں صرف پرانے کپڑے اور ردی کا غذ تھے۔ فوراً ہی یہ خبر پورے چائنا ٹاؤن میں پھیل گئی۔ اب لوگ یہی سمجھیں گے کہ شوہر کی موت کے صدمے سے تمہارا ذہنی توازن خراب ہو گیا ہے۔ آئندہ کوئی تم پر حملہ نہیں کرے گا اور نہ ہی کوئی اس رقم کی تلاش میں تمہارے اپارٹمنٹ کا رخ کرے گا جس کی چوری کا الزام تمہارے شوہر پر لگایا گیا تھا۔ یہ تھا تمہارا منصوبہ۔ اب تم اطمینان سے وہ ایک لاکھ ڈالرز خرچ کر سکو گی۔''

گلوریا کا منہ کھلا رہ گیا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''میں نہیں جانتی۔'' میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''جب پولیس نے تمہارے اپارٹمنٹ کی تلاشی لی تو وہ رقم کہاں چھپائی گئی تھی۔ اگر تمہارے شوہر نے کوئی سیفٹی ڈپازٹ باکس کرائے پر لیا ہوتا تو پولیس اس کا بھی پتا لگا لیتی لیکن اگر کسی نے پہلے سے تیاری کر رکھی ہو تو اتنی بڑی رقم کو چھپانے کے لیے اور بھی کئی جگہیں ہیں۔ ابھی میں نے کہا کہ یہ تمہارا منصوبہ تھا لیکن اصل اسکیم تمہارے شوہر نے

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

بنائی تھی۔ تم دونوں کو ڈر تھا کہ اس کی موت کے بعد تمہارا بیٹا مکان کا کرایہ دینے سے انکار کردے گا اور تمہیں اپنے ساتھ رہنے پر مجبور کرے گا۔ اس لیے اس محتاجی سے بچنے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا گیا۔''

اب بھی گلوریا خاموش رہی۔

''میرے اپنے بچے بھی ایسی ہی خواہشات کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''کہ مجھے اپنے بڑے بیٹے کے پاس کونز چلے جانا چاہیے۔ میں ایسا نہیں چاہتی گو کہ ان کے ساتھ اچھا وقت گزارتی ہوں۔ یہ بہت اہم ہے کہ بچے اپنی دادی کے بارے میں جانیں۔ اسی طرح میں انہیں دادا کے بارے میں بھی یاد دلاتی رہتی ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ تم بھی ایسا ہی کروگی گو کہ اس کا سہرا تمہارے شوہر کو جاتا ہے کہ اس نے مرنے سے پہلے تمہاری خوشی کا انتظام کردیا۔ ویسے بھی یہ بہت شاطرانہ اسکیم تھی لیکن تم اپنے پوتے پوتیوں کو کیا بتاؤ گی کہ ان کا دادا ایک چور تھا۔''

اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتی، دروازے کی گھنٹی بجی اور دوسرے ہی لمحے جارج داخلی دروازے میں کھڑا جوتے اتار رہا تھا۔ میں نے اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بولی۔ ''اپنی ماں سے سخت رویہ اختیار نہ کرنا۔ یہ ناخلفی ہوگی۔ تمہارے لیے بہتر ہوگا کہ اس بات پر توجہ دو کہ وہ اپنے گھر میں رہنے کے لیے کتنی سنجیدہ ہے۔ وہ کب تک یہاں رہ سکتی ہے اور تمہارا باپ بھی چاہتا ہوگا کہ اس کی خواہش کا احترام کیا جائے۔ تم نے گزشتہ روز کہا تھا کہ کاش تمہاری ماں سمجھ سکے کہ تم اسے اپنے ساتھ رکھنے میں کتنے سنجیدہ ہو۔ میرا خیال ہے کہ اب وہ یہ بات سمجھ جائے گی۔ تمہیں وہ رقم مل گئی؟''

جارج نے اپنی ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں اپارٹمنٹ سے ہی آرہا ہوں۔ وہ رقم الماری کے نچلے خانے کی تہ میں چھپائی گئی تھی۔ اب مجھے یقین آ گیا کہ ڈیڈی نے ہی وہ رقم چرائی تھی۔''

گلوریا کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ ماں اور بیٹا ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگے۔

میں نے جلدی سے کہا۔ ''اب میں بتاتی ہوں کہ یہ مسئلہ کیسے حل ہوگا۔ اس کمرے سے باہر کسی شخص کو بھی اس بارے میں علم نہیں ہونا چاہیے۔ میں گمنام بن کر رقم کی واپسی کا بندوبست کروں گی۔ جارج! تم اپنی ماں کے اپارٹمنٹ کا کرایہ دیتے رہوگے جب تک وہ چائنا ٹاؤن میں رہنا چاہے اور گلوریا تم پاگلوں کی طرح سوٹ کیس لے کر پھرنا چھوڑ دوگی۔ اس کے علاوہ تمہیں پولیس کو یہ بھی بتانا ہوگا کہ تم سے حملہ آور کو پہچاننے میں غلطی ہوئی۔ ہیمر ایک رات جیل میں گزار چکا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔''

وہ دونوں میری بات سمجھ گئے اور انہوں نے میری اسکیم سے اتفاق کیا۔ جب وہ جانے لگے تو میں نے جارج کو یاد دلایا کہ میں نے اس کے لیے جو سراغ رسانی کی ہے، اس کا بل بھیج رہی ہوں۔

ان کے جانے کے بعد میں نے لکی مارننگ جیولرز کو فون کیا۔ ''چن یونگ ین بول رہی ہوں۔'' میں نے مالک سے اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ ''میں نے ابھی ابھی افواہ سنی ہے کہ تمہاری رقم واپس مل جائے گی۔''

''کیا؟'' وہ چونکتے ہوئے بولا۔ ''تم نے کس سے سنا؟ وہ رقم کہاں ہے؟''

''تم یہ سوال نہ کرو تو بہتر ہے کہ یہ رقم کہاں تھی۔ سارا مسئلہ ایک غلط فہمی کی وجہ سے ہوا جو دور ہوگئی ہے۔ البتہ مجھے تم سے ایک بات اور کہنی ہے۔''

''وہ کیا؟''

''گزشتہ گفتگو کے دوران میں نے تم سے ایک چھوٹی سی مہربانی کی بات کی تھی۔ اگر تم وہ کردو تو سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا۔''

''کیا یہ کوئی جبر ہے؟''

''نہیں سفارش.....'' میں نے کہا۔

''میرے جاننے والوں میں ایک نوجوان شخص کو ملازمت کی ضرورت ہے، گو کہ اس کا ماضی داغ دار ہے لیکن وہ دل کا بہت اچھا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ تمہارے لیے کارآمد ثابت ہوگا۔''

اس مہم کو سرانجام دینے کے لیے مجھے چار مختلف کوریئر کمپنیوں کی خدمات حاصل کرنا پڑیں تاکہ رقم کی منتقلی کا عمل مکمل طور پر خفیہ رہے۔ پہلی کمپنی نے گلوریا کے فلیٹ سے مال اٹھایا۔ اس طرح دوسری، تیسری اور پھر چوتھی کمپنی کے ذریعے آخری ڈیلیوری ہوئی۔ اس سارے عمل کے دوران میں بری طرح تھک گئی لیکن یہ اطمینان ضرور تھا کہ میں نے چرائی ہوئی رقم اس کے مالکوں تک واپس پہنچادی تھی بلکہ اس کے عوض ایک بھٹکے ہوئے مایوس نوجوان کو بھی سیدھے راستے پر لگادیا۔ اب مجھے ہیمر کے لیے بھی ایسا ہی بندوبست کرنا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

میری اسسٹنٹ میری میز کے پاس آ کر کھڑی ہوئی۔ اس وقت اس کی مداخلت مجھے کھل گئی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ”کیا بات ہے۔ تم جانتی ہو کہ میں سیمینار کے لیے نوٹس بنا رہا ہوں۔ ایک گھنٹے کے بعد مجھے اپنا لیکچر ڈیلیور کرنا ہے۔“

”سوری سر!“ وہ بوکھلا گئی تھی۔ ”لیکن آپ سے ایک درخواست ہے۔ پلیز اسے ایک نظر دیکھ لیں۔“

”کون ہے وہ؟“

”ایک اکیلی عورت۔ میرے پڑوس میں رہتی ہے۔ بوڑھی ہو چکی ہے۔ اس کا کوئی بھی پُرسانِ حال نہیں ہے۔ اس کے شوہر کا انتقال ہو چکا ہے اور کوئی اولاد بھی نہیں ہے۔“

ایک لمحہ

منظر امام

یہ حقیقت ہے کہ بس کوئی ایک لمحہ ہی ہوتا ہے جب زندگی بن بھی جاتی ہے اور بکھر بھی جاتی ہے... اور اگر کسی دوسرے کے اختیار میں یہ بنانے اور بکھیرنے کا عمل آجائے تو یہ اس کا ظرف کہ وہ کیا فیصلہ کرتا ہے... وہ بھی بس اسی ایک لمحے کا قیدی تھا جس میں اس کی قسمت کا فیصلہ کسی انتہائی کمزور انسان کے ہاتھ میں تھا اور اس نے اس کا حق ادا کر دیا مگر... ایک روز اسے اس حق کا قرض بھی ادا کرنا تھا۔

محبتوں اور اپنایت کا ادھار واپس کرنے والے ایک خوش قسمت انسان کا ماجرا

WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

Downloaded From Paksociety.com

''کیا مصیبت ہے؟'' میں جھلا گیا تھا۔ ''میں تم سے اس کی لائف ہسٹری نہیں معلوم کر رہا۔ کیا پرابلم ہے اس کے ساتھ؟''

شہلا نے اپنے ہاتھ میں تھامی ہوئی رپورٹ میری طرف بڑھا دی۔ رپورٹ دیکھ کر میں اور بھی جھلا گیا۔ ''شہلا کیا ہوا ہے تمہیں۔ یہ کیس میرا نہیں ہے۔ اس کی Knee cap اپنی جگہ سے کھسک گئی ہے۔ یہ سرجری کا کیس ہے۔ وہ بھی ہڈیوں کے سرجن کا۔''

''میں جانتی ہوں سر۔'' شہلا روہانسی... ہوگئی تھی۔ ''لیکن ایک نظر اس بے چاری کو دیکھ تو لیں۔''

''میں اسے کمرے میں نہیں بلاؤں گا۔'' میں نے کہا۔ ''کہاں بیٹھی ہے وہ؟''

شہلا خاموش ہوگئی تھی۔ اس نے فوراً میری ٹیبل کے پاس والا شیشہ ایک طرف کر دیا۔ اس شیشے سے وہ روم نظر آجاتا تھا جہاں مریض بیٹھا کرتے تھے۔ میں نے یہ خاص انتظام اسی لیے کیا تھا کہ جن مریضوں کو دیکھنا ہوا نہیں اسی طرح دیکھ کر بلا لیا کرتا تھا۔

''وہ دیکھیں سر۔ وہ سفید ساڑی میں۔'' شہلا نے اشارہ کیا۔

میں نے اس بوڑھی کمزور عورت کو دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ نہ جانے یادوں کی کتنی کھڑکیاں ایک ساتھ کھل گئی تھیں۔ وہ کمزور اور بوڑھی ہوگئی تھیں لیکن ان کے نقوش وہی تھے۔ وہی مہربان نقوش۔ پیار کرنے والے۔ خیال رکھنے والے۔

میں چند لمحوں تک اس کی طرف دیکھتا رہا پھر میں نے شہلا کی طرف دیکھا۔ جس کی امید بھری نگاہیں میری جانب لگی ہوئی تھیں۔ ''جاؤ، اسے بلا لو۔''

شہلا جلدی سے باہر چلی گئی۔ جیسے اسے یہ خدشہ ہو کہ میں کہیں اپنا ارادہ نہ بدل دوں لیکن اسے کیا معلوم کہ اب تو میرے سارے ارادے اس بوڑھی عورت کے قدموں میں ڈھیر ہو چکے تھے۔ میں اس کو دیکھ کر اپنے اس زمانے میں چلا گیا تھا جب میں اسکول میں پڑھا کرتا تھا اور تعلیم میرے لیے وبالِ جان بنی ہوئی تھی۔ میری سمجھ میں کئی سبجیکٹ نہیں آتے تھے۔ مجھے اپنے ابو کا خیال رہتا تھا۔ وہ بے چارے میری تعلیم کی وجہ سے کتنے پریشان رہتے تھے۔ دن بھر مزدوری کرتے اور شام کے وقت میری پڑھائی کا پوچھا کرتے۔ جبکہ ان کو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ الجبرا کس کو کہتے ہیں اور جیومیٹری کیا چیز ہوتی ہے۔ میں ان کو اپنی کاپیاں دکھایا کرتا اور وہ انہی کو دیکھ کر خوش ہو جاتے۔

دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ شہلا اس عورت کو لے آئی تھی۔ اس غریب سے چلا بھی نہیں جا رہا تھا۔ شہلا نے اسے سامنے والی کرسی پر بٹھا دیا۔

وہ مجھے دیکھ کر مسکرا دی۔ وہی مسکراہٹ۔ وہ نہیں بدلی تھی۔ اس مسکراہٹ میں وہی تازگی تھی، وہی پیار تھا۔ اپنائیت تھی جو پہلے کبھی ہوا کرتی تھی۔

''بیٹا، میری رپورٹ تو دیکھ لی نا؟'' اس عورت نے مجھے مخاطب کیا۔

''ہاں اماں دیکھ لی ہیں لیکن.....'' میں کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

''کیا ہوا بیٹا؟ بتاؤ.....''

''اماں! آپ کا یہ کیس عام دواؤں کا نہیں ہے۔ گھٹنے کی سرجری ہوگی۔ آپ کو ڈاکٹر احتشام کے ہاسپٹل جانا ہوگا۔ وہاں اسی کا علاج ہوتا ہے۔''

''جانتی ہوں بیٹا۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''میرے ایک جاننے والے وہاں بھی لے گئے تھے لیکن سرجری کے اخراجات میں برداشت کرنے کے قابل نہیں ہوں۔ مجھے تو بس کوئی پین کلر دے دو تاکہ وقتی طور پر اس درد سے نجات مل جائے۔''

''لیکن آپ کو تو سرجری کرانی ہی ہوگی۔'' میں نے کہا۔ ''پین کلر سے کام نہیں چلے گا۔''

''سرجری کہاں سے کرواؤں۔ میرے پاس تو پیسے ہی نہیں ہیں۔''

بہت پہلے، بہت پہلے بالکل یہی بات میں نے اپنی ٹیچر سے کہی تھی۔ ''مس میں نئی کتابیں کہاں سے لاؤں اور ٹیوشن کہاں سے لوں۔ میرے ابو کے پاس تو پیسے ہی نہیں ہیں۔''

''کوئی بات نہیں۔'' ٹیچر نے میرے گال پر تھپکی دی۔ ''اگر پیسے نہیں ہیں تو کیا ہوا۔ میں دوں گی پیسے۔ تم ایسا کرو، شام کے وقت میرے گھر آجایا کرو۔ میں تمہاری کتابیں بھی لے لوں گی۔''

ٹیچر کا گھر میرے محلے کے قریب ہی تھا۔ میں نے ایک بار ان کا گھر دیکھا تھا۔ ان کے والدین بھی ان کے ساتھ ہی تھے۔ میرے لیے یہ بہت خوشی کی بات تھی کہ ٹیچر مجھ پر مہربان ہو کر مجھے خود ہی پڑھائیں گی۔

میں نے گھر جا کر جب ابو کو بتایا تو وہ بھی خوش ہو گئے تھے۔ ''بیٹا! ایک کام کرو۔ تم مجھے اپنی ٹیچر کے پاس لے چلو۔ میں ان کا شکریہ ادا کروں گا۔''

پہلے دن ابو میرے ساتھ گئے تھے۔ وہ اپنے ساتھ مٹھائی کا ایک ڈبا بھی لے گئے تھے۔ ٹیچر نے ان سے کہا۔ ''ارے آپ نے اس کی زحمت کیوں کی۔ کیا ضرورت تھی؟''

''ہم غریب لوگ ہیں ٹیچر!'' ابو نے کہا تھا۔ ''آپ میرے

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

بیٹے کے لیے بہت کچھ کررہی ہیں۔ میں اور کیا کرسکتا ہوں؟''

''کچھ دنوں کی بات ہے۔'' ٹیچر مسکرادیں۔ ''پھر آپ لوگ غریب نہیں رہیں گے۔ کیونکہ مجھے اندازہ ہوگیا ہے کہ آپ کا یہ بیٹا ایک بڑا آدمی بننے والا ہے۔''

ان کی حوصلہ افزائی ہی تھی۔ جس نے مجھے شہر کا ایک مشہور اور بڑا ڈاکٹر بنادیا تھا اور میں نے ان کی دعا سے اور ان کے صدقے عزت، دولت اور شہرت کمائی اور اس وقت وہی میرے سامنے بیٹھی کہہ رہی تھیں کہ ان کے پاس اپنے آپریشن کے پیسے بھی نہیں ہیں۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ میں نے اپنا چہرہ دوسری طرف کرلیا۔

''بیٹا۔'' ٹیچر کی آواز آئی۔ ''تم مجھے کوئی پین کلر ہی دے دو تو بہتر ہوگا۔''

''دیکھیں میری بات سمجھنے کی کوشش کریں۔'' میں نے کہا۔ ''پین کلر سے کچھ نہیں ہوگا اور جہاں تک اخراجات کا تعلق ہے تو آپ اس کی پروا نہ کریں۔ میرے پاس ایک این جی او ہے۔ وہ آپ کے سارے اخراجات برداشت کرے گی۔ آپ کو کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔''

''یہی تو میں نہیں چاہتی۔'' اس نے کہا۔

''وہ کیوں؟''

''اس لیے کہ میں یہ اچھی طرح جانتی ہوں کہ وہ این جی او کون سی ہوگی۔ میرے سارے اخراجات تم برداشت کروگے۔'' انہوں نے کہا۔ ''لیکن میری نیچر یہ رہی ہے کہ میں نے کبھی کسی سے کچھ نہیں مانگا۔ کسی سے کچھ نہیں لیا۔ یہ بات تم بھی جانتے ہو۔''

''میں؟''

''ہاں بیٹا۔ میں نے پہچان لیا ہے تم کو۔'' ٹیچر نے کہا۔ ''تم ذیشان ہو نا۔ پہلے صرف ذیشان ہوا کرتے تھے۔ اب ماشاء اللہ ڈاکٹر ذیشان ہوگئے ہو۔ شہر کے سب سے بڑے ڈاکٹر۔ میں نے کہا تھا نا کہ تم بہت بڑے آدمی بننے والے ہو۔ خدا نے میری بات رکھ لی۔ میں نے اس کمرے میں آتے ہی تم کو پہچان لیا تھا بیٹا۔''

میں اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے قدموں میں جا کر بیٹھ گیا۔ میں رو رہا تھا۔ وہ بھی رو رہی تھیں۔

انہوں نے اپنا کانپتا ہوا ہاتھ میرے سر پر رکھ دیا۔ ''جب آپ مجھے بیٹا سمجھتی ہیں اور شروع ہی سے سمجھتی آئی ہیں تو کیا ایک بیٹے کا اتنا حق نہیں ہے کہ وہ اپنی ماں کی خدمت کرسکے۔ بتائیں؟ آپ ہی نے تو یہ سکھایا تھا کہ کسی حقدار کا حق نہیں مارنا چاہیے۔ اس کو لوٹا دینا چاہیے تو آج جب ایک بیٹا اپنی ماں سے اپنا حق مانگ رہا ہے تو آپ کیوں دیر کررہی ہیں؟''

وہ خاموش رہیں۔ البتہ سسکیاں لے رہی تھیں۔ اسی دوران شہلا بھی کمرے میں داخل ہوگئی۔ وہ یہ سب دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔ وہ پریشان ہوکر جانے لگی تھی۔ میں نے اسے آواز دی ''شہلا!''

''یس سر!'' وہ رک گئی تھی۔

''شہلا فوراً ڈاکٹر احتشام سے اپائنٹمنٹ لے لو۔ میرے حوالے سے۔ ان سے کہنا ڈاکٹر ذیشان کو اپنی ماں کی سرجری کروانی ہے۔ سمجھیں؟''

ایک بار پھر ٹیچر کا ہاتھ میرے سر پر آ گیا۔

میں نہیں جانتا کہ میں نے اپنا حق ادا کیا تھا یا نہیں لیکن اتنا ضرور ہے کہ بہت دنوں کے بعد مجھے ایک عجب سا سکون ملا تھا۔ ایسا سکون جو اس وقت ملا کرتا تھا جب میری ماں زندہ تھی۔

اور میں ایک ڈاکٹر ہونے کے ناتے سب سے یہ کہہ رہا ہوں کہ جب بھی زندگی میں ایسا کوئی موقع آئے تو اسے جھوٹی انا اور شان کے چکر میں برباد نہ کریں۔ فائدہ اٹھالیں۔

معافی

وہ ایک عام سا دن تھا۔ لاہور کی مال روڈ میری گزرگاہ تھی۔ جسے چند لوگوں نے مُردہ درمیان میں رکھ کر روک رکھا تھا اور ڈُہائی دے رہے تھے۔ پتا نہیں یہ معاشرہ کس سمت نکل پڑا ہے؟ ہم زندوں کا احترام تو کب کا کھو چکے، اب مُردوں کا بھی کھونے لگے ہیں۔ مردوں کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کرنا کہاں کا احتجاج ہے؟

مُردے سے معافی کے لیے آگے بڑھا، لیکن اس دن مجھے معلوم ہوا کہ معافی بھی مقدر والوں کو ملتی ہے۔ چار پائی کے قریب ہوا تو..... آواز آئی۔ صاحب! یہ عورت ہے۔ میں نے فوراً پاؤں کے پاس جاتے ہوئے ہاتھ ہٹالیے اور آہستگی سے کہا۔ کیا انسان مرنے کے بعد بھی عورت یا مرد رہتا ہے؟ چارپائی پر ہاتھ رکھ کر معافی مانگی اور کہا۔ درحقیقت..... آپ زندہ ہو..... ہم مرگئے ہیں۔

(صابر چودھری کی کتاب اینا رمل کی ڈائری سے اقتباس)

مرسلہ: جاوید اختر رانا، پاک پتن شریف

WWW.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

شیش محل

قسط نمبر: 22

اسماء قادری

جہاں پر انسان کی بے بسی کی انتہا ہو... وہیں سے ربِّ جلیل کی رحمتوں کی ابتدا ہوتی ہے۔ یہ بات کبھی اس نے بچپن میں سنی تھی مگر حادثات و واقعات اور طبقاتی کشمکش میں گھری مختصر سی فانی زندگی کے پیچ و خم میں الجھ کر اسے کچھ یاد نہ رہا... اسے نہیں معلوم تھا کہ یکسانیت سے بے زار اور تنوع کے متلاشی لوگ معزز اور بلند مقام کے حصول کی خاطر خود کو کتنی پستی میں گرا لیتے ہیں۔ وہ ذہین وفطین نوجوان بھی آنکھوں میں خوش امیدی کے خواب لیے راہ میں پلکیں بچھائے اس کا منتظر رہتا تھا لیکن ناکام آرزوؤں اور ناآسودہ تمناؤں کے انجام نے اس کے مندمل زخموں کو لہولہو کردیا... راکھ میں دبی چنگاری نے اس کے تمام ارادوں کو خاکستر کر ڈالا۔ دل کی بے ترتیب دھڑکنوں کے ساز کے درمیان جو خوش امیدی کبھی اس کی زندگی کا حصہ تھی اب نہ تو وہ خوش دکھائی دیتا تھا اور نہ ہی کسی کی آنکھ میں اس کے لیے کوئی امید باقی تھی۔ جانے یہ زندگی کا کونسا موڑ تھا... وہ تو شیش محل کے ہر منظر میں محبوب کی مسکراتی آنکھوں کے جلتے دیپ میں اپنے عکس کو دیکھنے کا عادی تھا... کھلتے گلابوں اور محبتوں کی برستی پھوار میں خود کو بھیگا محسوس کرتا تھا کہ اچانک اس شیش محل میں ہر جانب لپکتے شعلوں کی جھلک دکھائی دی تو احساس ہوا کہ وہ لوگوں کے ہجوم میں کس قدر تنہا ہے... جسے وہ اپنا ہمسفر اور رفیق سمجھتا رہا اس سے بڑا رقیب کوئی نہ نکلا۔

اسرار و تحیر کے پردوں میں ملفوف سطر سطر رنگ بدلتی واردات قلبی کی عکاس دلچسپ داستان

WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

Downloaded From
paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

Downloaded From Paksociety.com

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

یہ قیامِ پاکستان سے قبل کا زمانہ ہے۔ جولیٹ ایک مقامی عیسائی لڑکی ہے جس کے والدین نے متوسط طبقے سے تعلق رکھنے کے باوجود اسے اعلیٰ تعلیم دلائی ہے اور وہ ایک اخبار کے دفتر میں ملازمت کر رہی ہے۔ اس کا محبوب اور کلاس فیلو عارف بھی اس کا کولیگ ہے۔ مذاہب کے فرق کے باوجود وہ ایک دوسرے سے شادی کے خواہش مند ہیں لیکن عارف پہلے اپنی بہنوں کے فرض سے فارغ ہونا چاہتا ہے۔ زمانہ طالب علمی میں ان کی ایک ساتھی شنا بھی رہی ہے جو عارف کو پسند کرتی ہے لیکن عارف کے جولیٹ کی طرف جھکاؤ اور طبقاتی فرق کی وجہ سے کھل کر اظہار نہیں کرتی اور ایک جاگیردار و سیاست داں ولدار آغا سے شادی کر لیتی ہے۔ ولدار آغا کانگریس سے تعلق رکھتا ہے۔ جولیٹ اپنے اخبار کی طرف سے ولدار آغا کا انٹرویو لینے جاتی ہے۔ ولدار آغا اچھے کردار کا مالک نہیں ہوتا۔ اس کے انٹرویو کے بعد جولیٹ مشکل میں پڑ جاتی ہے۔ آغا کی طرف سے پیغامات اور تحائف کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور ان حربوں میں ناکامی کے بعد بالآخر جولیٹ کو اغوا کر لیا جاتا ہے۔ حالتِ بے ہوشی میں اسے زیادتی کا نشانہ بنانے کے بعد اس بات پر مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ آغا سے نکاح پر راضی ہو جائے۔ جولیٹ کے انکار کو خاطر میں لائے بغیر نکاح کے انتظامات جاری ہوتے ہیں کہ شنا اس کی مدد کے لیے پہنچ جاتی ہے اور اسے فرار کروا دیتی ہے۔ لُٹی پِٹی جولیٹ گھر پہنچتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے لٹنے کی داستان اس سے پہلے گھر پہنچ چکی ہے اور اس کی ماں جوزفین حرکتِ قلب بند ہونے سے مر گئی ہے۔ باپ جوزف بھی بیٹی اور بیوی کے دکھ میں بستر سے لگ جاتا ہے۔ ان مشکل حالات میں جولیٹ عارف سے جذباتی اور اخلاقی سہارے کی خواہش مند ہوتی ہے لیکن عارف ایک روایتی مرد کی طرح داغ دار لڑکی کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ ان حالات میں جولیٹ اپنے مجرم سے انتقام لینے کا فیصلہ کرتی ہے اور اس سلسلے میں محلے کے ایک بدمعاش فاروق کی مدد لینے کا فیصلہ کرتی ہے۔ فاروق ربن دادا کے اڈے سے وابستہ ہے اور جولیٹ کے لیے پسندیدگی کے جذبات رکھتا ہے۔ جولیٹ اس کے جذبات سے واقف ہے لیکن ظاہر ہے ایک غنڈے کی محبت کو قبول نہیں کر سکتی۔ وہ اس کے ایک ساتھی سے ایک مہلک چاقو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ چاقو کی مدد سے وہ ولدار آغا کو قتل کرنے کے لیے ان جلسے جلوس میں پابندی سے شرکت کرتی ہے جن میں آغا کی موجودگی کا امکان پایا جاتا ہے لیکن اسے تمام تر کوشش کے باوجود اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہیں ہو پاتی۔ کشمکش کے اس عرصے میں اس کے باپ جوزف کی حالت مزید خراب ہو جاتی ہے اور مرنے سے قبل وہ جولیٹ کو بتاتا ہے کہ اس کی ماں جوزفین نے اس کے لیے ایک صندوقچی میں کچھ چیزیں رکھ چھوڑی ہیں۔ جولیٹ صندوقچی کھولتی ہے تو اس میں سے ایک ڈائری، ہیرے جڑا ایک لاکٹ اور دھندلائی ہوئی ایک بلیک اینڈ وہائٹ تصویر برآمد ہوتی ہے۔ تصویر جوزفین اور ایک اجنبی مرد کی جوانی کی ہے۔ جوزفین کی ڈائری پڑھنے کے بعد اسے علم ہوتا ہے کہ اس کی ماں ماضی میں ایک نواب خاندان کی گورنس کے طور پر ملازمت کرتی تھی۔ دورانِ ملازمت جوزفین اور نواب زادہ اسد اللہ کو ایک دوسرے سے محبت ہو جاتی ہے۔ ادھر فاروق سر میں چوٹ لگنے کے باعث اسپتال میں ایڈمٹ ہو جاتا ہے۔ وہاں ایک نرس کے ساتھ بدسلوکی کرنے پر فاروق ایک شخص کی مرمت کرتا ہے اور وہیں ان کی ملاقات سیٹھ بھابیہ سے ہو جاتی ہے۔ سیٹھ ربن دادا کی خدمات حاصل کر لیتا ہے۔ ڈاکٹر کے مشورے کے مطابق فاروق کو آب و ہوا کی تبدیلی کے لیے شملہ بھیج دیا جاتا ہے اور وہ وہاں سیٹھ بھابیہ کی رہائش گاہ پر بطور مہمان قیام کرتے ہیں۔ وہیں اس کی ملاقات بھابیہ کی بیٹی بملا سے ہوتی ہے جو بیوہ تھی۔ بملا اور فاروق میں دوستانہ تعلقات قائم ہو جاتے ہیں۔ طوائف زادی چاند بانو فاروق سے محبت کرتی ہے۔ بملا چاند بانو سے رقابت کے جذبات محسوس کرتی ہے۔ بملا ایک غنڈے کے ذریعے چاند بانو کا ایکسیڈنٹ کرا دیتی ہے جس میں زمرد بائی جان سے جاتی ہے۔ ادھر ربن فاروق کا حساب چکتا کرنے کے لیے ولیم کو شدید تشدد کا نشانہ بناتا ہے۔ خفیہ اطلاع پر پولیس ربن کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ فاروق بمبئی لوٹ آتا ہے۔ ربن اور فاروق ولیم والے معاملے کو نمٹانے کے لیے وکیل اشوک بچن کی خدمات لیتے ہیں۔ ادھر جولیٹ اپنی ماں کی ڈائری پڑھ لیتی ہے اور وہ اپنے دل میں انتقام کی آگ لیے خاموشی سے حیدرآباد جانے کے لیے نکل کھڑی ہوتی ہے۔ وہاں پہنچ کر وہ نواب سلیم اللہ کی حویلی میں ملازمت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ فاروق جولیٹ کی غیر موجودگی سے پریشان ہو کر معلومات حاصل کرتا ہے۔ وہ چاند بانو کے ایکسیڈنٹ کی ذمے دار بملا کو سبق سکھانے کا فیصلہ کرتا ہے تاہم اپنی اچھی خصلت کے باعث اسے چھوڑ دیتا ہے۔ فاروق کو کچھ لوگ اغوا کر لیتے ہیں۔ جولیٹ حویلی والوں پر انکشاف کرتی ہے کہ وہ جوزفین اور نواب اسد اللہ کی اولاد ہے۔ اسد اللہ اسے بیٹی قبول کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے۔ فاروق کے اغوا میں بھابیہ سیٹھ کی بیٹی بملا کا ہاتھ ہوتا ہے۔ بملا فاروق کو خود کو اپنانے پر زور دیتی ہے۔ انکار پر اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیتی ہے۔ فاروق پر بملا کو قتل کرنے کا الزام لگ جاتا ہے۔ ربن فاروق کو روپوش کر دیتا ہے۔ وہ فاروق کی خواہش پر انو پم اگروال کی فیملی کے ہمراہ اس کے لندن جانے کے انتظامات کرتا ہے۔ ربن فاروق کو دیکھنے بندرگاہ جاتا ہے۔ واپسی میں ڈی ایس پی اور مجو کے گرگے اسے گھیر کر شدید زخمی کر دیتے ہیں۔ ادھر فاروق کو پتا چلتا ہے کہ آغا لندن میں نہیں بلکہ کراچی میں ہے تو وہ جہاز سے اتر کر ایک ہوٹل میں ٹھہر جاتا ہے۔ وہیں سے وہ کیتھی سے ملنے جاتا ہے جہاں ربن کو بسترِ مرگ پر پڑا دیکھتا ہے۔ ربن دم توڑ دیتا ہے۔ نواب سلیم اللہ کی حویلی پر بلوائی حملہ کر دیتے ہیں جس میں حویلی کے تمام افراد مارے جاتے ہیں۔ صرف اسد اللہ، صفی اللہ اور آپا بیگم بچتے ہیں۔ ادھر جولیٹ پہلے ہی حویلی سے نکل چکی ہوتی ہے۔ جولیٹ جانی کے ساتھ کراچی کے لیے روانہ ہوتی ہے تو ہندو بلوائی ٹرین پر ہلا بول دیتے ہیں۔ جانی بھی اس حملے میں مارا جاتا ہے تاہم جولیٹ اتفاقی طور پر محفوظ رہتی ہے۔ نواب اسد اللہ بھی ہجرت کر کے لاہور آ جاتے ہیں۔ ادھر فاروق ربن کے قاتلوں رمیش، بھابیہ، مجو اور رفیکے کو ٹھکانے لگا دیتا ہے۔ لاہور میں جولیٹ کو ایک مہربان خاتون اپنے زیرِ سایہ رکھتی ہیں۔ وہاں وہ اسد اللہ کو دیکھتی ہے۔ ادھر فاروق جس گھر میں چھپا ہوتا ہے وہاں پولیس دھاوا بول دیتی ہے جس میں گولو اپنی جان سے جاتا ہے۔ اسد اللہ کراچی جانے کے لیے ٹرین میں سوار ہوتے ہیں تو انہیں جولیٹ مل جاتی ہے۔ جولیٹ اسد اللہ کے ساتھ کراچی آ جاتی ہے اور مہاجرین کے کیمپ میں ان کی خدمت میں مصروف ہو جاتی ہے۔ وہیں اسے چاند بانو ملتی ہے، وہ اس پیاری سی لڑکی کو اپنے ساتھ گھر لے آتی ہے۔ وہیں اس کی ملاقات عارف سے بھی ہو جاتی ہے۔ بلوائیوں نے اس کے ہاتھ پیر کاٹ دیے تھے۔ ادھر فاروق راٹھور کا خاتمہ کرنے کے لیے دہلی پہنچ جاتا ہے اور اسے گھیر لیتا ہے۔ تاہم سیٹیوں اور دوڑتے قدموں کی آوازیں سن کر راٹھور کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگتی ہیں۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

جولیٹ سو کر اٹھی تو طبیعت میں عجیب سی کسلمندی اور اداسی محسوس کر رہی تھی۔ رات میں بھی اسے اچھی اور پُرسکون نیند نہیں آسکی تھی۔ بار بار عارف کا معذور و بے چین سراپا ذہن میں آجاتا تھا۔ بے شک وہ مشکل حالات میں سارے قول و قرار بھول کر اسے چھوڑ گیا تھا اور وہ بھی اس کی اس حرکت کے بعد اسے اپنے دل سے بے دخل کر چکی تھی پھر بھی اس کی تکلیف سے ازحد متاثر ہوئی تھی۔ انہوں نے زندگی کے کئی برس ایک ہی تعلیمی ادارے اور پھر دفتر میں ساتھ کام کرتے ہوئے گزارے تھے اور تعلقِ خاص سے ہٹ کر دیرینہ شناسائی کے باعث بھی وہ عارف کے لیے خود کو دکھی محسوس کر رہی تھی، وہ جسمانی ہی نہیں، روحانی اذیت میں بھی مبتلا تھا اور دُہری تکلیف نے اسے بالکل ختم کر دیا تھا۔ کوئی انسان جسے آپ نے زندگی سے بھرپور، صحت مند اور توانا دیکھا ہو، عین عالمِ جوانی میں ایسی ابتر حالت میں نظر آئے تو صدمہ تو محسوس ہوتا ہی ہے۔ چنانچہ جولیٹ بھی صدمے میں مبتلا رہی تھی اور رات بھر سوچتی رہی تھی کہ عارف کے لیے کیا کر سکتی ہے۔

بہت سوچ بچار کے بعد اس نے فیصلہ کیا تھا کہ عارف کا کسی بڑے ڈاکٹر سے چیک اپ کروائے گی اور اس کے لیے مصنوعی ٹانگوں کا انتظام کروادے گی۔ عارف کا ایک ہاتھ سلامت تھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھنے کے لائق ہو جاتا تو اس کے لیے کسی دفتری ملازمت کا انتظام کیا جاسکتا تھا۔ وہ پڑھا لکھا اور قابل شخص تھا۔ اپنی ذہانت اور محنت سے اب بھی روزی کما سکتا تھا۔ اخبار کی ملازمت کا تجربہ اس کے لیے روزگار کا انتظام کرنے میں معاون ثابت ہو سکتا تھا۔ اس نے عارف کی بہن ماجدہ سے بھی ایک بار اور گفتگو کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ ماجدہ کو اس کے بھائی کی صحت اور زندگی کا واسطہ دے کر غلط روش پر چلنے سے روکنے اور کسی حلال ذریعے سے روزی کمانے پر راضی کر سکے۔ اپنے ان فیصلوں کے بعد اس نے خود کو خاصا مطمئن محسوس کیا تھا لیکن پھر بھی جانے کیا بات تھی کہ صبح اٹھی تو خود کو ہمیشہ جیسا تازہ دم محسوس نہیں کر رہی تھی۔ اس نے سوچا کہ شاید رات کو اچھی نیند نہ لینے کے باعث یہ کیفیت ہے چنانچہ خود کو تازہ دم کرنے کے لیے غسل خانے میں گھس گئی۔ خاصا طویل شاور لینے کے بعد وہ تیار ہو کر اپنے کمرے سے باہر نکلی اور باورچی خانے کا رخ کیا۔ اسد اللہ نے ہر کام کے لیے ملازمین کا انتظام کر رکھا تھا جو طے کردہ معمول کے مطابق ہر کام انجام دے ڈالتے تھے۔ باورچی خانے کی ذمے داری بھی ایک تجربہ کار خانساماں کے سپرد تھی اور جولیٹ کو صرف اتنا کرنا ہوتا تھا کہ وہ ایک بار جا کر جائزہ لے لے کہ کہیں کسی شے کی کوئی کمی تو نہیں ہے۔ اس وقت بھی اس نے اسی ارادے سے باورچی خانے میں قدم رکھا تو چاند بانو کو وہاں کھڑا دیکھ کر حیران رہ گئی۔ وہ نماز کے انداز میں سر اور چہرے کے گرد چادر لپیٹے بڑے انہماک سے پتیلی میں سے کچھ نکال کر پیالے میں ڈال رہی تھی۔

''ارے..... تم کیا کر رہی ہو چاند بانو!'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''کچھ خاص نہیں۔ بس دادی جان کے لیے جو کا میٹھا دلیا تیار کیا ہے۔ امید ہے وہ پسند فرمائیں گی۔'' چاند بانو نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اسے جواب دیا۔ جولیٹ نے کل شام اسے کیمپ سے اپنے ساتھ کوٹھی لانے کے بعد گھر کے جملہ افراد سے متعارف کروادیا تھا اور خوش تھی کہ اسے یہاں خوش دلی سے قبول کرلیا گیا ہے۔ چاند بانو کو وہ ملازمہ کی حیثیت سے یہاں نہیں لائی تھی، چنانچہ اس کے لیے ایک بہترین کمرے کا بھی انتظام کر دیا تھا لیکن وہ صبح صبح باورچی خانے میں کھڑی کام کر رہی تھی۔

''ہم نے بی بی کو منع بھی کیا تھا میڈم لیکن یہ نہیں مانا۔ یہ تو صبح ہم سے بھی پہلے کچن میں موجود ہے۔ آج کا ناشتا انہوں نے ہی بنایا ہے۔ ہم نے تو صرف چائے اور ٹوسٹ ہی ریڈی کیا ہے۔'' خانساماں نے اپنی صفائی پیش کرنے والے انداز میں جولیٹ کو بتایا۔

''تم خانساماں سے بھی پہلے کچن میں پہنچی ہوئی ہو۔ صبح کتنے بجے جاگ گئی تھیں؟'' جولیٹ کی حیرت میں اضافہ ہوا۔

''ہم تہجد کے وقت ہی جاگ جاتے ہیں۔ فجر کے بعد دوبارہ سونے کی عادت بھی نہیں ہے اس لیے سوچا کہ فارغ بیٹھے رہنے کے بجائے تھوڑا سا کام ہی کرلیا جائے۔ ہمیں کھانا پکانے کا شوق ہے لیکن بہت زیادہ مشق نہیں ہے اس لیے معلوم نہیں آپ لوگوں کو ہمارا تیار کردہ ناشتا پسند بھی آئے گا یا نہیں۔'' اس نے نہایت سادگی سے جولیٹ کو جواب دیا۔

''اپنا شوق پورا کرنے کے لیے تمہیں کلنگ کی اجازت دے رہی ہوں لیکن تم اسے اپنی ذمے داری نہیں سمجھنا۔ گھر کے ہر کام کے لیے ملازمین موجود ہیں۔ تم اپنی خوشی سے چاہو تو دادی جان کو تھوڑی سی کمپنی دے سکتی ہو کیونکہ تمہیں پتا ہے کہ میں دن بھر گھر میں موجود نہیں ہوتی اور بہت کم وقت ان کے ساتھ گزار پاتی ہوں۔ ان کی دیکھ

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

بھال کے لیے نرس موجود ہے لیکن میرا خیال ہے تمہاری کمپنی سے ان کی صحت پر اچھا اثر پڑے گا۔''

''جی شکریہ۔ ہمیں خود بھی ان کی صحبت میں وقت گزار کر خوشی ہوگی۔ اب اگر آپ اجازت دیں تو ہم دادی جان کے لیے یہ دلیا لے جائیں۔ ٹھنڈا ہو کر لطف نہیں دے گا۔''

''بالکل لے جاؤ پھر ناشتے کی میز پر آ جانا۔ تمہارا بنایا ہوا ناشتا تمہارے بغیر کھانے میں بھلا کیا لطف آئے گا۔'' جولیٹ اس کے انداز پر مسکرا دی اور اسے باہر جانے کا راستہ دیا۔ وہ چلی گئی تو اس کے تیار کردہ ناشتے کا جائزہ لینے لگی۔ پوریاں، آلو چھولوں کی ترکاری، سوجی کا خوش رنگ و خوشبودار حلوا۔ ابلے ہوئے انڈے بالکل تیار ٹرالی میں سجے ہوئے تھے اور اب ملازم مکھن، جیم اور ٹوسٹ جیسے لوازمات ٹرالی میں منتقل کر رہا تھا۔ وہ اس طرف سے مطمئن خود بھی ندرت جہاں کے کمرے میں پہنچ گئی۔ چاند بانو نے ان کے اوپری دھڑ کو تکیوں کا سہارا دے کر قدرے اوپر اٹھا رکھا تھا اور گلے میں نیپکن باندھ کر انہیں چمچے کی مدد سے دلیا کھلا رہی تھی۔ ندرت جہاں کی حالت ایسی بھی کہ وہ معمول کی غذا نہیں لے سکتی تھیں اور انہیں نیم ٹھوس یا مائع غذا ہی دی جاتی تھی۔ وہ غذا بھی وہ بہت کم مقدار میں لیتی تھیں لیکن جولیٹ نے محسوس کیا کہ آج وہ چاند بانو کا تیار کردہ دلیا کافی رغبت سے کھا رہی ہیں۔ انہیں کھلاتے ہوئے چاند بانو ان سے چھوٹی چھوٹی باتیں بھی کرتی جا رہی تھی۔ وہ کسی کی باتوں کا جواب نہیں دیتی تھیں لیکن ان کی آنکھوں کی چمک اور چہرے کے تاثرات سے ظاہر تھا کہ انہیں چاند بانو کا خود سے بات کرنا اچھا لگ رہا ہے۔ جولیٹ کے دیکھتے ہی دیکھتے چاند بانو نے پیالے میں موجود سارا دلیا انہیں کھلا دیا اور پھر بڑی محبت سے ان کا منہ صاف کرنے لگی۔ وہ اپنے کام سے فارغ ہو کر پیچھے ہٹی تو جولیٹ نے آگے بڑھ کر ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر چوما اور شوخ لہجے میں بولی۔

''دیکھیے دادی جان! میں آپ کے لیے کتنی اچھی لڑکی ڈھونڈ کر لائی ہوں۔ یہ تو بالکل بیٹیوں کی طرح آپ کا خیال رکھ رہی ہے اور مجھے لگتا ہے کہ آپ کو اس کے ہاتھ سے بنا دلیا بھی بہت اچھا لگا ہے۔''

''یو آر رائٹ میڈم! رئیلی آج بیگم صاحب نے پہلی بار ٹھیک سے ڈائٹ لیا ہے۔''

نرس نے بھی اس کی تائید کی۔

''اب تو مجھے بھی تمہارے ہاتھ کا ذائقہ چکھنے کی بے چینی ہو رہی ہے چاند بانو! چلو ڈائننگ روم میں چلتے ہیں۔ ویسے بھی ناشتے کا ٹائم ہو گیا ہے، پاپا اور بڑے ابا بھی ناشتے کے لیے آنے والے ہوں گے۔''

''ہم یہیں ناشتا کر لیتے ہیں؟'' چاند بانو نے جھجک کا مظاہرہ کیا۔

''بالکل نہیں۔ تمہارے ہاتھ کا بنایا ہوا ناشتا تمہاری موجودگی میں ہی اصل لطف دے گا۔'' جولیٹ نے اس کے انکار کو قطعی رد کر دیا اور ندرت جہاں سے مخاطب ہو کر بولی۔

''اچھا دادی جان! اب اجازت دیجیے۔ دوبارہ شام میں آپ سے ملاقات ہوگی۔''

ندرت جہاں نے نگاہوں کی زبان سے اسے الوداع کہا۔ یہ حالات کی بہت بڑی تبدیلی تھی کہ وہ جولیٹ جس کی شکل دیکھنا بھی انہیں گوارا نہیں تھا، اب انہیں عزیز ہو گئی تھی لیکن وہ زبان سے اظہار کرنے سے قاصر تھیں۔

ناشتے کی میز پر جولیٹ نے خاص طور پر اسد اللہ اور صفی اللہ کو بتایا کہ آج کا ناشتا چاند بانو نے تیار کیا ہے۔ صفی اللہ نے اختصار سے اور اسد اللہ نے بہت کھل کر چاند بانو کے بنائے ناشتے کی تعریف کی۔ وہ اپنی جگہ بیٹھی جھینپتی رہی۔ خود اس نے بہت کم کھایا۔ ڈھیر ساری تعریفیں کرنے کے باوجود جولیٹ نے خود بھی بہت کم کھایا تھا۔ صبح سے طبیعت پر جو اضمحلال چھایا ہوا تھا، وہ اسے چھپانے کی کوشش تو کر رہی تھی لیکن خود اپنی ذات کو اس کے اثرات سے بچا نہیں پا رہی تھی۔ ناشتے سے فراغت کے بعد اس نے سب کو گڈ بائے کہا اور کیمپ کے لیے روانہ ہو گئی۔ وہاں پہنچتے ہی اس نے سب سے پہلے عارف کے خیمے کا رخ کیا لیکن وہاں جمع ہجوم کو دیکھ کر دور ہی سے ٹھٹک گئی۔ لوگوں کی چہ میگوئیوں کے درمیان کسی عورت کے بلند آواز میں کیے جانے والے بین سب سے نمایاں تھے۔ وہ تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی آگے بڑھی۔ قریب پہنچنے پر اسے ہجوم کے درمیان سینہ کوٹ کوٹ کر روتی ماجدہ دکھائی دی۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ لوگوں کے درمیان سے راستہ بناتی ہوئی ماجدہ تک پہنچی۔ اس کے اردگرد کئی عورتیں موجود تھیں جو اسے سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھیں لیکن وہ پچھاڑیں کھاتی کسی کے قابو میں نہیں آ رہی تھی۔

''کیا ہوا ہے ماجدہ! تم اس طرح کیوں رو رہی ہو؟''

اس نے ماجدہ کا شانہ زور سے ہلاتے ہوئے وحشت زدہ لہجے میں پوچھا۔

''میں لٹ گئی۔ میں برباد ہو گئی۔ میرا کچھ نہیں بچا، مجھے چھوڑ کر چلا گیا میرا بھائی۔ پورا خاندان مر گیا، میں کیوں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

بچ گئی۔ مجھے کیوں چھوڑ دیا تو نے سب کا غم دیکھنے کو۔ موت کے فرشتے کو میری جان لینے کے لیے کیوں نہیں بھیجا تو؟'' وہ اسے جواب دینے سے زیادہ آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا اٹھا کر مالکِ کائنات سے جھگڑ رہی تھی۔

''عارف مرگیا.....'' جولیٹ کے وجود پر کوڑا سا لگا۔

'' کیسے مرگیا وہ؟ کل تو میں اسے بالکل ٹھیک چھوڑ کر گئی تھی۔'' اس نے دوبارہ ماجدہ کو جھنجوڑتے ہوئے اس سے پوچھا۔ عارف کمزور اور معذور ضرور ہوگیا تھا لیکن اس کی حالت اتنی بری بھی نہیں تھی کہ وہ ایک رات میں ہی جان کی بازی ہار جاتا۔ وہ تو اس کے لیے کیا کچھ سوچ کر یہاں آئی تھی اور وہ ہی باقی نہیں رہا تھا۔

'' رات کسی وقت اس نے چوہے مارنے والی دوا کھا کر خودکشی کرلی۔ صبح یہ جنم جلی آئی تو بھائی کی لاش دیکھی.....'' جولیٹ کے سوال کا جواب ماجدہ کے بجائے ایک ادھیڑ عمر عورت نے دیا۔ اس کے انداز میں ماجدہ کے لیے ملامت تھی۔ یقیناً اسے بھی ماجدہ کے کرتوتوں کا علم تھا اور سمجھ رہی تھی کہ عارف کی خودکشی کے پیچھے ماجدہ کی بھٹکی ہوئی روش ہی تھی۔ جولیٹ بھی جانتی تھی کہ ماجدہ کی وجہ سے عارف ذہنی تناؤ اور جذباتی ابتری کا شکار تھا لیکن وہ محسوس کررہی تھی کہ اس انتہائی قدم کے پیچھے خود اس سے ہونے والی ملاقات بھی کارفرما تھی۔ عارف نے اسے اس لیے چھوڑ دیا تھا کہ اس کے حساب سے اب وہ ایک پاک دامن عورت نہیں رہی تھی اور وہ اسے اپنے خاندان کا حصہ نہیں بنا سکتا تھا لیکن قسمت نے اس کے منہ پر، جولیٹ کی مظلومیت پر بے رحمی کا مظاہرہ کرنے کے نتیجے میں اس سے بھی شدید طمانچہ مار دیا تھا۔ اس کی ایک بہن کو بلوائی اٹھا کرلے گئے تھے اور دوسری روپوں کے لیے جسم کا دھندا کرنے لگی تھی۔ وہ جو پہلے ہی اندر سے بری طرح ٹوٹ چکا تھا، جولیٹ کے سامنے ہونے والی شرمندگی کو نہ سہہ سکا اور خود اپنے ہاتھوں سے اپنی جان لے لی لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ اس کے پاس چوہے مار دوا آئی کہاں سے؟ اس نے یہ سوال بلند آواز سے کر بھی ڈالا۔

'' اس نے صفائی والے لڑکے کو پیسے دے کر دوا منگوائی تھی۔ اس نے شکایت کی تھی کہ اس کے خیمے میں بہت چوہے ہورہے ہیں جو کھانے پینے کے سامان میں بھی گھس جاتے ہیں اور وہ اپنی معذوری کی وجہ سے انہیں بھگا نہیں پاتا۔ لڑکے نے دوا لاکر دینے کے بعد عارف کو پیشکش کی تھی کہ وہ خیمے کے مختلف حصوں میں دوا ڈال دیتا ہے لیکن عارف نے اسے منع کردیا اور یہ کہہ کر دوا اپنے پاس رکھ لی کہ ماجدہ خود یہ کام کرلے گی۔'' مردوں میں سے ایک صاحب نے اس کے سوال کا جواب دیا تو وہ خالی نظروں سے سب کو دیکھ کر رہ گئی۔ اصل حقیقت یہ تھی کہ اب عارف اس دنیا میں نہیں رہا تھا اور اس کے جانے کی وجوہات پر بات کرنا ایک فردی سی بات تھی۔

☆☆☆

سیٹیوں اور دوڑتے قدموں کی آوازیں تیزی سے قریب آتی جارہی تھیں۔ راٹھور جس کا چہرہ پہلے ہاتھ پر چاقو سے لگنے والے زخم کی تکلیف اور خوف کے باعث زرد ہورہا تھا، زندگی بچ جانے کی امید ہوتے ہی کھل اٹھا تھا۔

''میری مانو تو تم لوگ ہتھیار ڈال دو ورنہ کچھ ہی لمحوں میں کتے کی موت مارے جاؤ گے۔'' اس نے خود کو گھیر کر کھڑے ستار بھائی کے آدمیوں سے کہا جنہوں نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ وہ حکم کے غلام تھے اور اس وقت ان کی نکیل فاروق کے ہاتھوں میں تھی۔ وہ انہیں جو حکم دیتا، وہ اس پر عمل کرتے۔

''تم لوگ آگے جاکر آنے والوں کو روکنے کی کوشش کرو۔ اس سے حساب کتاب میں خود کروں گا۔'' صورتِ حال سنگین ہونے کے باوجود فاروق کے چہرے سے اطمینان رخصت نہیں ہوا اور اس نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا۔ وہ فوراً ہی حرکت میں آگئے۔

''تم بہت بڑی مسٹیک کررہے ہو۔ تمہارے چند ساتھی پولیس فورس سے مقابلہ نہیں کرسکتے۔ آرمی بھی شہر میں ہی موجود ہے۔ ہنگامہ زیادہ بڑھا تو وہ لوگ بھی پولیس فورس کا ساتھ دینے آجائیں گے۔'' راٹھور نے فاروق پر دباؤ ڈالنے کی کوشش کی لیکن اس نے کوئی اثر نہیں لیا اور مسکراتا ہوا راٹھور کی طرف بڑھا۔ اس کی پیش قدمی پر راٹھور گھبرا گیا۔ اس کا ریوالور اس کے ہاتھ سے نکل چکا تھا اور نہتا ہونے کی وجہ سے وہ فاروق جتنا پُراعتماد نہیں تھا۔ بدحواسی میں اسے کچھ اور سجھائی نہیں دیا تو کہنی کے نیچے ابھی تک گھپے ہوئے فاروق کے چاقو کا دستہ پکڑ کر اسے ہی کھینچ کر باہر نکال لیا۔ اس عمل سے اس کی اذیت میں اضافہ ہوا اور خون نہایت تیزی سے بہنے لگا۔ عام حالات میں یہ ایک نہایت گہرا گھاؤ تھا لیکن جب جان پر بنی ہو تو آدمی اس طرح کی باتوں کو نظر انداز کردیتا ہے۔ راٹھور نے بھی یہی کیا اور ہاتھ میں پکڑا چاقو پوری قوت سے فاروق کو دے مارا۔ راٹھور کی طرف دھیرے دھیرے

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

بڑھتا فاروق اس کی ایک ایک جنبش پر نظر رکھے ہوئے تھا۔

راٹھور نے اس کی طرف چاقو پھینکا تو اس نے نہایت تیزی سے اپنے جسم کو دائیں جانب ہٹاتے ہوئے خود کو نہ صرف اس کے وار سے محفوظ رکھا بلکہ فضا میں ہی چاقو کو اچک لیا۔ چاقو ہاتھ میں آتے ہی اس کے کانوں نے فائرنگ کی کان پھاڑ آوازیں سنیں۔ یقینی طور پر ستار بھائی کے آدمی پولیس فورس کو اس طرف آنے سے روکنے کے لیے برسرِ پیکار ہوگئے تھے۔ وہ کتنی مہلت حاصل کر پاتے، اسے اندازہ نہیں تھا، بس یہ احساس تھا کہ راٹھور کے معاملے کو بہت تیزی سے نمٹانا ہوگا۔ اس نے ہاتھ میں آجانے والے چاقو کو ہوا میں لہرایا اور راٹھور سے بولا۔

''یہ چاقو مجھے ربن دادا نے تحفے میں دیا تھا اور یہ میرا فرمانبردار ہے۔ تم جیسے چڑی مار اس چاقو سے میرا شکار نہیں کرسکتے۔'' ردِعمل میں راٹھور نے عجیب حرکت کی۔ وہ نیچے جھکا اور مٹھی میں مٹی بھر کر فاروق کی طرف اچھال دی اور خود پلٹ کر تیزی سے بھاگنے لگا۔ جس طرف گولیاں برس رہی تھیں، وہ اس کی مخالف سمت میں بھاگ رہا تھا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ بے شک اس طرف اس کے ساتھی اور ہمدرد موجود ہیں لیکن اندھی گولیاں دوست اور دشمن کسی کو نہیں پہچانتی ہیں۔ وہ کسی اندھی گولی کا شکار نہیں بننا چاہتا تھا۔ دوسری طرف فاروق وقتی طور پر راٹھور کی چال سے تھوڑا سا متاثر ہوگیا تھا۔ راٹھور کی پھینکی ہوئی مٹی کے کچھ ذرات اس کی آنکھوں میں چلے گئے تھے جن کی چبھن سے اس کی آنکھوں میں پانی آگیا تھا اور بصارت دھندلا سی گئی تھی۔ اس کے باوجود اس نے ہمت نہیں ہاری اور دوڑتے قدموں کی آواز پر ہی راٹھور کے پیچھے بھاگ کھڑا ہوا۔ بھاگتے ہوئے اس کی آنکھوں سے مسلسل پانی بہہ رہا تھا لیکن اس کا ایک فائدہ یہ ہوا تھا کہ آنکھوں میں جانے والے مٹی کے ذرات بھی اس پانی کے ساتھ بہہ کر نکلتے جارہے تھے اور چبھن کا احساس کم ہوتا جارہا تھا۔ فاروق نے آنکھوں کو ہاتھوں سے مسلنے کی غلطی نہیں کی تھی کیونکہ اسے معلوم تھا کہ ایسا کرنے سے آنکھوں میں موجود ذرات کی رگڑ آنکھوں میں انفیکشن پیدا کرسکتی ہے۔ وہ تکلیف کو نظرانداز کرکے نہایت پھرتی سے راٹھور کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔

راٹھور چاق وچوبند آدمی تھا اور اس وقت تو اس کی جان پر بنی ہوئی تھی، اس لیے وہ بہت تیزی سے بھاگ رہا تھا۔ خود فاروق کے لیے بھی یہ زندگی اور موت کی ہی جنگ تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اگر اس وقت راٹھور اس کے ہاتھوں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہوگیا تو اسے دوسرا موقع ملنا بہت مشکل ہوگا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ خود ہی گرفتار ہوجاتا۔ ستار بھائی کے آدمی بے شک مسلح تھے اور پوری پامردی سے اس کے حکم پر عمل کررہے تھے لیکن اس حقیقت کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا تھا کہ ریاستی طاقت کے آگے چند افراد کا زیادہ دیر ڈٹا رہنا بہت مشکل تھا۔ وہ اپنے مددگاروں کے زیر ہوجانے سے پہلے راٹھور کو اس کے انجام تک پہنچا دیتا، یہی اس کے لیے مناسب تھا۔

اس کا جذبۂ انتقام اسے بہت تیزی سے راٹھور کے پیچھے بھگا کر لے جارہا تھا۔ فاصلہ چند قدم رہ گیا تو اس نے کسی چیتے کی سی پھرتی سے جست لگائی اور راٹھور پر جا پڑا۔ وہ دونوں بھاگتے بھاگتے سڑکوں کو چھوڑ کر گلیوں میں پہنچ گئے تھے جہاں روشنی بہت کم تھی اور وہ بس سایوں کی طرح ہی دکھائی دے رہے تھے۔ یہ سائے ایک دوسرے سے دست وگریباں بری طرح زمین پر لوٹ رہے تھے۔ راٹھور زخمی ہونے کے باوجود بھرپور مزاحمت کررہا تھا۔ انسان زندگی کے لیے ایسا ہی دیوانہ ہوتا ہے۔ وہ بھی دیوانہ وار زندگی کی جنگ لڑرہا تھا۔ دوسری طرف فاروق کے لیے بھی ایک طرح سے یہ زندگی اور موت کا ہی معاملہ تھا۔ ربن کے قتل میں شامل اس اہم کردار کو انجام تک پہنچائے بغیر وہ سکون کی سانس نہیں لے سکتا تھا۔ ربن کے قاتل زندہ رہتے تو خود اس کا جینا دوبھر ہوجاتا۔ اسے یہ بھی اندازہ تھا کہ اگر آج وہ ناکام ہوگیا تو اسے دوبارہ موقع ملنا بہت مشکل ہوگا۔ اپنے اس احساس کے تحت وہ راٹھور کو بری طرح رگید رہا تھا اور موقع ملنے پر اسے ایک آدھ گھونسا بھی جڑ دیتا تھا۔

اس کا چاقو اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا لیکن اس نے ابھی تک راٹھور پر چاقو سے کوئی وار نہیں کیا تھا۔ ربن کی دی اخلاقی تربیت نے ان نازک حالات میں بھی اسے ایسا کرنے سے روک رکھا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ راٹھور اپنے ریوالور سے محروم ہوجانے کے بعد اب بالکل نہتا ہے اور نہتے دشمن پر ہتھیار کا استعمال اس کی تربیت کے برخلاف تھا۔ وہ چاقو والے ہاتھ کو استعمال کیے بغیر بس ایک ہاتھ سے لڑرہا تھا۔ خود راٹھور کا بھی ایک ہاتھ زخمی تھا اور دیکھا جائے تو عملاً وہ دونوں ایک جیسی پوزیشن میں تھے۔ راٹھور عام پولیس والوں کی طرح سست اور ڈھیلا بندہ نہیں تھا۔ وہ پوری قوت سے فاروق کا مقابلہ کررہا تھا اور فاروق کو بھی اس کا کوئی نہ کوئی وار سہنا پڑ رہا تھا پھر بھی بہرحال وہ راٹھور پر

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

بھاری تھا اور کچھ دیر نہیں جاتی تھی کہ اسے مکمل طور پر زیر کرنے والا تھا لیکن اچانک ہی راٹھور نے اپنے سر سے اس کے سر پر ایک طوفانی ٹکر ماری تو وہ ہل کر رہ گیا۔ درد کی ایک ایسی خوفناک لہر اٹھی کہ اسے اپنے حواس گم ہوتے محسوس ہوئے اور آنکھوں کے آگے تارے سے ناچنے لگے۔ اگرچہ وہ ماضی میں سر پر لگنے والی مہلک چوٹ سے ایک طویل علاج کے بعد صحت یاب ہو چکا تھا لیکن ڈاکٹروں نے اسے احتیاط کی تاکید کر رکھی تھی۔ لڑائی میں احتیاط کی گنجائش کہاں ہوتی ہے۔ دشمن کا وار چل گیا اور اس کی حالت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے اس کے ہاتھ سے چاقو بھی چھین لیا۔ چاقو ہاتھ سے نکل جانے کا احساس ہوتے ہی فاروق نے سر کو زور سے جھٹکا دیتے ہوئے آنکھوں کے سامنے ناچتے تاروں سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کی اور غیر ارادی طور پر اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے انداز سے ہی راٹھور پر لات چلا دی۔ یہ کوئی جچا تلا وار نہیں تھا جو دیکھ بھال کر کیا گیا ہو لیکن اس کا نتیجہ حیرت انگیز نکلا۔ راٹھور اس سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا اور اس کی چلائی لات عین اس وقت راٹھور کی کہنی پر لگی تھی جب وہ چاقو تولے اس پر حملہ کرنے ہی والا تھا۔

فاروق کی ٹانگ کی ضرب نے اس کے ہاتھ کو عجیب سے زاویے سے موڑ دیا اور چاقو کا رخ خود اس کی جانب ہو گیا۔ اگلے ہی لمحے اس کے حلق سے ایک بھیانک چیخ نکلی اور وہ نیچے گر کر بری طرح تڑپنے لگا۔ فاروق نے آنکھیں مسلتے ہوئے اس کی طرف دیکھا تو دنگ رہ گیا۔ چاقو اس کے نرخرے میں پیوست ہو گیا تھا اور وہ بے بسی کے عالم میں زمین پر پڑا کسی ذبح کیے جانے والے جانور کی طرح تڑپ رہا تھا۔ راٹھور کے تڑپنے کا منظر دیکھتے ہوئے اس نے دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں بھی سنیں۔ فائرنگ کا سلسلہ کچھ دیر ہوئی موقوف ہو چکا تھا جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا تھا کہ ستار بھائی کے آدمی بھرپور مزاحمت کے بعد زیر ہو گئے ہیں اور اب پولیس فورس علاقے میں پھیل رہی ہے۔ پیچھے مڑنے پر فاروق کو دور جھلملاتی روشنیاں دکھائی دے گئیں۔ اس تاریک گلی میں فی الحال وہ ان روشنیوں کی زد سے محفوظ تھا لیکن اسے اندازہ تھا کچھ اور قریب آنے پر وہ لوگ راٹھور کے بلبلانے کی آوازیں سن کر اس طرف آ جائیں گے۔

اس نے آگے بڑھ کر راٹھور کے سینے پر اپنا دایاں پیر جمایا اور اس کی گردن میں پیوست اپنا چاقو کھینچ لیا۔ چاقو کھینچنے پر راٹھور کی گردن سے خون کا ایک فوارہ سا چھوٹا جس نے فاروق کے چہرے اور لباس کو داغ دار کر دیا لیکن اس نے پروا نہیں کی اور پوری بے رحمی سے اس کا دایاں ہاتھ تھام کر ایک ہی جھٹکے میں اس کی ساری انگلیاں کاٹ ڈالیں۔ یہی وہ ہاتھ تھا جس سے اس نے ربن پر گولی چلائی تھی۔ پامردی سے درجن بھر افراد سے لڑتے ربن کو درحقیقت سینے پر لگنے والی گولی نے ہی زیر کیا تھا۔ وہ پہاڑ سا حوصلہ رکھتا تھا لیکن تھا تو بہرحال گوشت پوست سے بنا انسان جسے سینے میں اترنے والے سیسے نے ڈھا دیا تھا اور آج وہ شخص خاک و خون میں لوٹتا اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے رہا تھا جس نے ربن سے اس کی زندگی چھین کر بہت سوں کو ان کی روح سے محروم کر دیا تھا۔ وہ اپنے چاہنے والوں کے لیے ان کی روح جیسا ہی تو تھا اور اس کے بغیر وہ ایسا ہی محسوس کرتے تھے کہ جیسے بے روح جسم لیے پھرتے ہوں۔

جاں کنی کے عالم میں مبتلا راٹھور کا جسم انگلیاں کاٹے جانے کی اذیت سے بری طرح پھڑکا لیکن فاروق نے اس کے لیے اپنے دل میں کوئی ہمدردی محسوس نہیں کی۔ رحم اور ہمدردی کے جذبات انسانوں اور معصوموں کے لیے ہوتے ہیں، خونی درندوں سے کسی کو ہمدردی نہیں ہوتی۔ راٹھور تنہا ربن کے قتل کا مجرم تو نہیں تھا۔ وہ محافظ کے لباس میں مظلوم مسلمانوں کے مال و متاع اور زندگیاں بھی چھینتا پھر رہا تھا۔ کچھ دیر قبل انہوں نے اسے ایک مسلمان سنار کی دکان کا تالا تڑواتے ہوئے ہی پکڑا تھا۔ وہ جسے حفاظت کرنی چاہیے تھی، خود ہی لٹیرا اور قاتل بنا ہوا تھا تو پھر وہ ایسے ہی انجام کا حق دار تھا۔ فاروق نے اس کی لاش پر حقارت سے تھوکا اور اپنے قدم آگے بڑھا دیے۔ بے شک اس نے ربن کے آخری قاتل کو بھی انجام تک پہنچا کر اپنی زندگی کا سب سے اہم مشن پورا کر لیا تھا لیکن ابھی اسے کچھ اور کام بھی کرنے تھے جن میں سرفہرست جولیٹ کے مجرم کو انجام تک پہنچانے کا کام تھا۔ اسے اس کام کے لیے زندگی سے کچھ اور مہلت درکار تھی اسی لیے وہ قریب آتی آوازوں اور روشنیوں سے بچ کر بھاگتا چلا جا رہا تھا۔ زندگی ایسی ہی شے کا نام ہے جو کسی نہ کسی بہانے انسان کو جینے پر اکساتی رہتی ہے۔ وہ بھی زندگی کی چاہ میں بھاگ رہا تھا۔ اچھی بات یہ تھی کہ رہائشی علاقہ ہونے کے باوجود کوئی بھی گھروں سے باہر نہیں آیا تھا۔ شہر میں کرفیو نافذ تھا اور لوگ خوف زدہ تھے چنانچہ کسی نے بھی اس پرائی آگ میں کودنے کی حماقت نہیں کی تھی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

شیش محل

فاروق اور راٹھور کے درمیان ہونے والی خونی لڑائی نے گلی کے مکینوں کو نیند سے نہ جگایا ہو، ایسا تو ممکن ہی نہیں تھا۔ وہ جاگ گئے ہوں گے لیکن بنا بتیاں روشن کیے بس دروازے اور کھڑکیوں کی درزوں سے جھانکنے پر ہی اکتفا کیا ہوگا۔ تاریکی میں انہوں نے دو سایوں کے علاوہ دیکھا بھی کیا ہوگا لیکن بہرحال اتنی بات تو سمجھ آ گئی ہوگی کہ ایک سایہ دوسرے کو ہلاک کر کے خود موقع واردات سے فرار ہو چکا ہے۔ فرار فاروق کی ضرورت تھی اور وہ ہانپتا ہوا بھاگتا چلا جا رہا تھا۔ یہ بمبئی نہیں تھا جس کی گلیاں اس کے لیے ہر وقت اپنی باہیں کھلی رکھتی تھیں اور جس کے راستے اسے ہاتھ کی لکیروں کی طرح ازبر تھے۔ یہاں وہ خود کو بچانے کی جبلی خواہش کے تحت اندھا دھند بھاگتا چلا جا رہا تھا۔ راٹھور کی ماری ٹکر کی وجہ سے اب بھی اس کے سر میں وقفے وقفے سے پٹاخے سے پھٹ رہے تھے لیکن وہ پھر بھی کسی نہ کسی طرح بھاگتا چلا جا رہا تھا۔ راستوں کا تعین کیے بغیر یوں ہی بے سمت بھاگتے ہوئے آخر کار اس کی ہمت جواب دے گئی اور آخر وہ ایک مکان کی ڈیوڑھی پر سانس لینے کے لیے رکا تو وہیں ڈھے گیا۔ غنودگی میں جاتے ہوئے بھی اسے احساس تھا کہ موت کے ہرکارے اس کے پیچھے ہیں چنانچہ دفاع کی لاشعوری خواہش کے تحت اس نے جیب میں پڑے چاقو کو مضبوطی سے جکڑ لیا۔ راٹھور کی انگلیاں کاٹنے کے بعد اس نے چاقو کو اسی کے لباس سے صاف کر کے دوبارہ جیب میں رکھ لیا تھا اور اب اس کا ہاتھ جیب کے اندر ہی چاقو کو مضبوطی سے تھامے ہوئے تھا اور کان آہٹوں پر لگے ہوئے تھے۔ اس کی تربیت، ہوش میں نہ ہونے کے باوجود اس سے ہوش مندوں جیسی حرکات خود کار طریقے سے کروا رہی تھی۔ آخر کار اس کے حساس کانوں نے اپنے بہت قریب ایک آہٹ سن لی اور فطری طور پر اس نے آہٹ کے ماخذ کی طرف دیکھنا چاہا لیکن اپنی اس خواہش میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ غشی جیسی کیفیت نے اسے اپنی جگہ سے ٹھیک طرح ہلنے بھی نہیں دیا۔ اس وقت اس کے ذہن میں جو واحد خیال آیا، وہ یہ تھا کہ کیا میں اپنے حصے کے کام انجام دیے بغیر ہی اس دنیا سے جانے والا ہوں؟

☆☆☆

عارف کی موت جولیٹ کے لیے کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ ماضی میں اس کا عارف سے بہت قریبی تعلق رہا تھا اور وہ دونوں ایک ساتھ زندگی گزارنے کی منصوبہ بندی کرتے رہے تھے۔ حالات نے عارف کے خیالات میں تبدیلی پیدا کر دی اور وہ اپنی راہ بدل گیا تو جولیٹ نے بھی اسے اپنے دل سے نکال دیا لیکن اب جن حالات میں اس نے اپنی جان دی تھی، ان سے جولیٹ از حد متاثر ہوئی تھی۔ اسے رہ رہ کر عارف کا معذور اور بے بس وجود یاد آتا تھا اور خود بخود ہی آنکھیں بھیگ جاتی تھیں۔ عارف کی آخری رسومات پر آنے والے تمام اخراجات اس نے خود اٹھائے تھے۔ اسد اللہ نے بینک میں اس کے نام سے علیحدہ اکاؤنٹ کھلوا کر اس میں ایک معقول رقم جمع کروا دی تھی اور اسے اختیار دے دیا تھا کہ وہ جس طرح چاہے، اس رقم کو خرچ کرے۔ اس لیے رقم کے معاملے میں اسے کوئی تنگی یا پریشانی نہیں تھی۔ بھائی کی موت کے غم سے نڈھال ماجدہ کے لیے بھی وہ اپنے ذہن میں ایک منصوبہ تشکیل دے رہی تھی تاکہ اس کے معاشی مسائل حل ہو سکیں۔ فی الحال اس نے ماجدہ سے اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کی تھی۔ وہ ماجدہ کو غم سے سنبھلنے کا موقع دینا چاہتی تھی۔ وہ روزانہ کیمپ میں اس سے ملاقات کرتی تھی اور اپنے طور پر اسے تسلی و تشفی دینے کی کوشش کرتی تھی لیکن وہ محسوس کر رہی تھی کہ ماجدہ کی آنکھوں کی ویرانی دن بہ دن بڑھتی جا رہی ہے۔ وہ اس کی باتوں کے جواب میں کچھ بولتی بھی نہیں تھی۔ اس صبح وہ ماجدہ سے ملنے اس کے خیمے میں پہنچی تو دیکھا کہ وہ وہاں موجود نہیں ہے۔ اسے خیال گزرا کہ وہ آس پڑوس کے کسی خیمے میں گئی ہوگی چنانچہ سب سے قریبی خیمے میں مقیم خاندان کی خاتون سے اس کے بارے میں دریافت کیا۔

''وہ یہاں نہیں ہے۔ میں اس ..... کو یہاں قدم رکھنے کی بھی اجازت نہیں دے سکتی۔'' خاتون نے اس کے استفسار کے جواب میں ماجدہ کے لیے ایک موٹی سی گالی کا استعمال کرتے ہوئے کھردرے لہجے میں جواب دیا۔

جولیٹ کو خاتون کا انداز ناگوار گزرا لیکن وہ انہیں ٹوک نہیں سکی۔ اسے اندازہ تھا کہ یہاں سب کو ماجدہ کی روش کا علم ہے اور خاتون نے اسی مناسبت سے اس کے لیے گالی استعمال کی ہے۔ اس خیمے سے ہٹ کر اس نے آس پاس کے مزید تین چار خیموں سے ماجدہ کے بارے میں معلوم کرنے کی کوشش کی لیکن ہر جگہ لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے ماجدہ کے لیے تحقیر آمیز الفاظ استعمال کیے گئے۔ وہ تھک ہار کر دوبارہ ماجدہ والے خیمے میں آ بیٹھی۔ اس خیمے میں ایک چارپائی پر عارف نے اپنی زندگی کی آخری سانسیں لی تھیں۔ چارپائی کے سرہانے رکھی میز پر اب بھی وہ دوائیں موجود تھیں جو عارف کو صحت مند کرنے کے لیے

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

ماجدہ اپنا جسم بیچ کر خریدے لائی تھی۔ وہ ساری دوائیں بے مقصد یہاں پڑی رہ گئی تھیں اور عارف چلا گیا تھا۔ خیمے میں اس کے استعمال کی چیزیں بھی ادھر ادھر رکھی زندگی کی بے ثباتی کا احساس دلا رہی تھیں۔ زندگی کے ان لوازمات کے لیے آدمی کیا کچھ جدوجہد نہیں کرتا اور جب دنیا سے جاتا ہے تو سب کچھ یونہی دھرا رہ جاتا ہے۔ جولیٹ چند منٹ سے زیادہ وہاں نہیں بیٹھ سکی اور گھبرا کر باہر آ گئی۔ باہر آتے ہی اس کی نظر صفائی والے اس لڑکے پر پڑی جس نے عارف کو اس کے کہنے پر چوہے مارنے والا کر دی تھی۔ جولیٹ کو دیکھ کر وہ ذرا سا ٹھٹکا پھر جھجکتا ہوا اس کے قریب آ گیا۔ عارف کی خودکشی پر کیمپ انتظامیہ نے اس بے چارے کو خاصی ڈانٹ پھٹکار کا نشانہ بنایا تھا کہ اس نے وہ مہلک زہر عارف کو کیوں فراہم کیا۔ اس موقع پر جولیٹ نے ہی اس غریب لڑکے کی ڈھال بن کر اسے اس مصیبت سے نجات دلائی تھی۔

''کیسے ہو نظام؟'' وہ قریب آیا تو جولیٹ نے اس کا نام لے کر اس سے دریافت کیا۔

''ٹھیک ہوں میڈم!'' اس نے جواب دے کر خاموشی اختیار کر لی لیکن اس کے انداز سے لگتا تھا کہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے۔ اچانک ہی جولیٹ کو خیال آیا کہ اس سے ماجدہ کے بارے میں پوچھے۔ وہ صبح سویرے سے ہی صفائی کے سلسلے میں... کیمپ میں اِدھر اُدھر گھومتا رہتا تھا اور بہت ممکن تھا کہ اس نے ماجدہ کو کہیں آتا جاتا دیکھا ہو۔

''وہ رات ہی کو یہاں سے چلی گئی تھی۔ میں آپ کو یہی بات بتانا چاہ رہا تھا۔'' اس کے استفسار کے جواب میں نظام نے اسے اطلاع دی۔

''چلی گئی..... لیکن کیسے؟'' جولیٹ کو اس انکشاف پر حیرت ہوئی۔

''اسے قادر شاہ اپنے ساتھ لے گیا۔'' اس نے آواز کو پست کر کے جولیٹ پر ایک اور انکشاف کیا۔

''قادر شاہ.....'' جولیٹ کو ایک اور دھچکا لگا۔ ''کیا وہ زبردستی ماجدہ کو یہاں سے لے کر گیا ہے؟''

''میرے خیال میں نہیں۔'' نظام نے نفی میں سر ہلایا پھر مزید بولا۔ ''وہ اپنی مرضی سے ہی قادر شاہ کے ساتھ گئی ہوگی۔ قادر شاہ اس کا ایجنٹ تھا۔ بھائی کے مرنے کے بعد سے وہ دھندے پر نہیں جا رہی تھی لیکن یہاں بھی بدنیت لوگوں کی کمی نہیں ہے۔ قادر شاہ نے اسے سمجھایا ہوگا کہ مفت کی کھانے والوں سے جان چھڑا کر وہاں چلے جہاں اسے دام مل سکے۔ اس لیے وہ یہاں سے چلی گئی۔''

نظام نے گویا اس پر کئی حقائق آشکار کر دیے۔ اس کے دل کو ایک اور گہرا صدمہ پہنچا۔ پناہ گزینوں کے اس کیمپ میں ایسی لوٹ مار پر اس کا دل بوجھل ہو گیا۔ اس روز وہ زیادہ دیر تک کیمپ میں نہ رک سکی اور گھر واپس آ گئی۔ اس وقت اسد اللہ گھر پر موجود نہیں ہوتے تھے اور صفی اللہ اپنے کمرے تک محدود رہنے کے عادی تھے۔ اس نے یونہی ندرت جہاں کے کمرے میں جھانکا تو اسے وہاں چاند بانو دکھائی دی۔ وہ ندرت جہان کے بستر کے قریب رکھی کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ حسب معمول اس نے نماز کے انداز میں چادر اوڑھ رکھی تھی اور دونوں ہاتھوں میں قرآن اٹھائے اس کی تلاوت میں مصروف تھی۔ اس کی آواز میں بڑی حلاوت اور کشش تھی۔ جولیٹ اس کی آواز کے سحر میں گرفتار کھنچی چلی گئی اور کمرے کے ایک گوشے میں پڑی کرسی پر بیٹھ کر محویت سے چاند بانو کی تلاوت سنتی رہی۔ ندرت جہاں کی خدمت پر مامور عیسائی نرس بھی خاموشی اور دلچسپی سے قرأت سن رہی تھی۔ بستر پر دراز ندرت جہاں کی آنکھیں بند تھیں لیکن بند آنکھوں کے گوشے سے بہتے آنسوؤں کے قطرے گواہی دے رہے تھے کہ وہ بھی قرآن کی آیات کو پوری توجہ سے سن رہی تھیں۔

جولیٹ اسلام کا مطالعہ شروع کر چکی تھی لیکن قرآن کو عربی میں پڑھنے اور سمجھنے سے قاصر تھی۔ ہاں، چاند بانو دوران قرأت بار بار ''فَبِاَیِّ اٰلَاءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ'' کی تکرار اسے اچھی لگ رہی تھی۔ دوسری طرف ندرت جہاں جو اس آیت کا ترجمہ جانتی تھیں، زیادہ بے قرار اور مضطرب تھیں۔ ''پس تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے'' کے الفاظ ذہن میں گونجتے تھے تو اپنے ماضی کے مناظر ایک ایک کر کے آنکھوں کے سامنے چلے آتے تھے۔ پورے غرور اور طنطنے سے زندگی گزارتے ہوئے انہیں کبھی احساس ہی نہیں ہوا تھا کہ جس شان و شوکت پر وہ مغرور اور نازاں ہیں، وہ تو ان کے رب کی نعمتیں ہیں جن پر بندے کو غرور کا حق نہیں بلکہ شکر واجب ہے اور دولت و ثروت کی موجودگی میں انکساری کا اظہار بھی شکر گزاری کی ہی ایک قسم ہے۔ دولت کے بل پر دوسرے انسانوں کو اپنے سے کمتر اور حقیر جاننا اصل میں اللہ کے غضب کو دعوت دینا ہے۔ وہ بھی ساری زندگی نخوت و غرور میں گزار کر اپنے رب کو غضبناک کرنے کے جرم کی مرتکب ہوئی تھیں۔ انہوں نے بھی اپنے رب کی عطا کردہ نعمتوں پر سجدۂ شکر ادا نہیں کیا تھا، الٹا رب کے بندوں کے ساتھ حقارت سے

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

پیش آ کر ان کی تذلیل کرتی رہی تھیں۔ وہ نعمتوں کو جھٹلانے والی تھیں اس لیے اپنے رب کے غضب کا شکار ہوئی تھیں لیکن پھر بھی دیکھا جائے تو ان کا رب اب بھی ان پر مہربان تھا۔ وہ چاہتا تو اس معذوری ولاچاری کے ساتھ انہیں بے سہارا بھی کر دیتا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا تھا۔ ان کے پاس آج بھی بہت سی نعمتیں تھیں۔ خدمت، توجہ، دوا اور علاج سب کچھ میسر تھا اور ایسا بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔ سگی اولاد بستر علالت پر بے بس پڑے ماں باپ سے بیزار آ جاتی ہے لیکن یہاں بھتیجوں نے انہیں کسی طرح کی تنگی اور کمی محسوس نہیں ہونے دی تھی تو یہ بھی اللہ کی ان پر نعمت تھی۔ وہ آنسو بہاتی دل کی گہرائیوں سے اپنے رب سے معافی طلب کرنے کے ساتھ ساتھ ہر ''فبای الاء ربکما تکذبٰن'' کے ساتھ اپنے رب کی نعمتوں کا اعتراف اور شکر کرتی جا رہی تھیں۔

کچھ ایسی ہی حالت چاند بانو کی بھی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اس کا رب اس پر کتنا مہربان ہے۔ وہ جو عزت کی زندگی کی چاہ میں مبتلا ہر آن ڈرتی رہتی تھی کہ ایسی زندگی اسے کیسے اور کہاں نصیب ہوگی، آج ایک محفوظ چھت تلے بیٹھی ہوئی تھی اور اللہ نے ایک غیر لڑکی کے دل میں اس کے لیے اتنی ہمدردی اور محبت پیدا کر دی تھی کہ وہ اسے قادر شاہ جیسے بھیڑیوں کے چنگل میں جانے سے بچا کر اپنے ساتھ یہاں لے آئی تھی۔ اپنے رب کی اس مہربانی پر شکر گزار وہ بھی بے آواز آنسو بہا رہی تھی لیکن ان آنسوؤں نے اس کی قرأت کی روانی پر کوئی اثر نہیں ڈالا تھا۔ وہ بہت واضح اور صاف آواز میں ایک کے بعد ایک آیت پڑھتی جا رہی تھی۔ آخرکار سورۃ ختم ہوگئی اور اس نے قرآن پاک بند کر کے چادر کے پلو سے اپنے آنسو پونچھے پھر وہ ندرت جہاں کی طرف متوجہ ہوئی اور قرآن پاک کو سائڈ ٹیبل پر رکھ کر ٹشو کی مدد سے ان کے آنسوؤں کو صاف کرتے ہوئے ان کے ماتھے پر ایک بوسہ دیا۔ اس کا یہ بوسہ ندرت جہاں پر عجیب طرح اثر انداز ہوا اور وہ بری طرح بلک بلک کر رونے لگیں۔ ان کی یہ کیفیت دیکھ کر چاند بانو گھبرا گئی۔ جولیٹ اور ڈیوٹی نرس بھی فوراً متوجہ ہوئیں۔ نرس پروفیشنل انداز میں ان کا بی پی اور نبض کی رفتار وغیرہ چیک کرنے لگی جبکہ جولیٹ نرم آواز میں انہیں تسلی اور دلاسے دیتی رہی۔

''مم...... ما...... معافی......'' ان کے عرصے سے خاموشی اختیار کیے لبوں نے بڑی مشکل سے جنبش کی اور وہ جولیٹ کی طرف دیکھتے ہوئے صرف ایک لفظ ادا کر سکیں۔

''کسی معافی کی ضرورت نہیں ہے دادی جان! آپ میری بزرگ ہیں اور میں نے ماضی کی ہر بات بھلا کر آپ کی حیثیت تسلیم کر لی ہے۔'' جولیٹ نے ان کے ہاتھوں کو محبت سے تھامتے ہوئے انہیں یقین دلایا اور پھر بڑی دیر تک ان کے بالوں میں انگلیاں پھیرتی ان سے تسلی آمیز گفتگو کرتی رہی۔ اس دوران نرس نے ایک انجیکشن تیار کر کے ان کے بازو میں لگا دیا تھا۔ ان کے ساتھ بلند فشارِ خون کا مسئلہ تھا اور ڈر رہتا تھا کہ کسی بھی قسم کے جذباتی دباؤ کی صورت میں ان کی طبیعت زیادہ بگڑ نہ جائے۔ انہیں اس جذباتی دباؤ سے

قارئین متوجہ ہوں

پرچا نہیں ملتا

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ بک اسٹال کا نام جہاں پرچا دستیاب نہ ہو۔
☆ شہر اور علاقے کا نام۔
☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل نمبر۔

رابطے اور مزید معلومات کے لیے

ثمر عباس 0301-2454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
سسپنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگزشت
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ کراچی

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں
35802552-35386783-35804200
ای میل: jdpgroup@hotmail.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

بچانے کے لیے ہی نرس نے انہیں سکون آور انجکشن لگا دیا تھا۔ دوا کے اثر سے وہ جلد ہی سو گئیں تو جولیٹ نے چاند بانو کو اپنے ساتھ باہر آنے کا اشارہ کرتے ہوئے خود بھی باہر کا رخ کیا چاند بانو کھسیائی ہوئی سی اس کے پیچھے باہر آ گئی۔

''ہم روزانہ ظہر کی نماز کے بعد انہیں قرآن پاک پڑھ کر سناتے ہیں اور ہم نے ہمیشہ محسوس کیا ہے کہ انہیں ہمارا ایسا کرنا اچھا لگتا ہے لیکن آج جانے کیا ہوا کہ وہ اس طرح تڑپ تڑپ کر رونے لگیں۔'' جولیٹ کے کمرے میں پہنچ کر چاند بانو نے اسے صفائی دینے کی کوشش کی۔

''تم دادی جان کو کیا پڑھ کر سنا رہی تھیں چاند بانو؟'' اس کے معذرتی جملوں پر توجہ دیے بغیر جولیٹ نے کھوئے کھوئے سے لہجے میں اس سے پوچھا۔

''ہم سورۃ الرحمٰن کی تلاوت کر رہے تھے۔ اس سورۃ کو قرآن کی زینت کہا جاتا ہے۔ ہمیں اس سورۃ کی قرأت کر کے بہت سکون ملتا ہے اس لیے ہم آج دادی جان کو خاص طور پر یہ سورۃ سنا رہے تھے لیکن انہیں نہ جانے کیا ہوا کہ وہ اس طرح رونے لگیں۔'' چاند بانو اب بھی کنفیوژ سی تھی۔

''وہ جو تم ایک لائن بار بار ریپیٹ کر رہی تھیں، اس کا کیا مطلب تھا؟''

جولیٹ نے اس بار بھی اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے اس سے دریافت کیا۔ ''اس آیت کا ترجمہ ہے، پس تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔''

چاند بانو نے اسے آگاہ کیا۔ زمرد بائی کے کوٹھے پر جہاں لڑکیوں کو گانے بجانے اور رقص کی تعلیم دی جاتی تھی، وہیں قرآن پڑھانے کے لیے بھی ایک مولوی صاحب ملازم تھے۔ عید، شب برات، روزوں اور قربانی کا اہتمام بھی خوب ہوتا تھا اس لیے طوائف زادی ہوتے ہوئے بھی چاند بانو دینی معلومات سے بے بہرہ نہیں تھی۔ عشق نے طبیعت میں سوز پیدا کیا تو خود بخود ہی مذہب کی طرف رجحان بڑھتا چلا گیا اور اپنی پچھلی زندگی سے مکمل تائب ہونے کے بعد تو وہ بالکل ہی دین کی ہو رہی تھی اس لیے معلومات میں بھی خاصا اضافہ ہوا تھا۔

''اللہ پاک نے قرآن کی تلاوت میں بہت سکون رکھا ہے۔ ہم نے بچپن میں ہی کلام پاک پڑھنا سیکھ لیا تھا لیکن باقاعدہ تلاوت کی عادت نہیں تھی، بس رمضان اور شب برات وغیرہ پر ہی گناہ بخشوانے کے لیے اسے کھولنے کا رواج تھا۔ جب ہم کوٹھا چھوڑ رہے تھے تو پتا نہیں کس جذبے کے تحت قرآن پاک کا ایک چھوٹا نسخہ اپنے ساتھ لے لیا تھا۔ ہمیں ایسا لگتا تھا کہ قرآن کا وہ نسخہ ہماری حفاظت کرتا ہے۔ اپنی طبیعت کے اضطراب پر قابو پانے کے لیے ہم نے قرآن پاک کی تلاوت کا سلسلہ شروع کر دیا اور اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے ہمیں اس عمل میں اتنا سکون ملا کہ اب یہ ہمارے معمولات میں شامل ہے۔ مخصوص اوقات کے علاوہ بھی جب ہمیں فرصت میسر ہو یا دل کو بے چین پائیں تو فوراً قرآن پاک کی تلاوت کرنے بیٹھ جاتے ہیں۔ اس سے ہمارے دل کو بہت ڈھارس ملتی ہے۔'' جولیٹ کی کیفیت سے بے خبر چاند بانو جذب کی سی کیفیت میں اسے بتاتی جا رہی تھی۔

''کیا واقعی عبادت کرنے سے انسان کے دل کو سکون مل جاتا ہے؟'' اس کی باتیں سن کر جولیٹ نے بچوں کی سی معصومیت سے پوچھا۔ ایک عرصہ ہو گیا تھا اسے بے سکونی کے عالم میں رہتے ہوئے۔ دلدار آغا نے جو کچھ اس کے ساتھ کیا تھا، اس کے بعد سے اسے کبھی چین نہیں ملا تھا۔ عارف کی بے وفائی، جوزف اور جوزفین کی دائمی جدائی، جوزفین کی ناکام داستانِ محبت اور اس کے علاوہ بھی دکھوں اور امتحانوں کا ایک سلسلہ تھا جو وہ مسلسل اپنی جان پر سہہ رہی تھی۔ عارف کی موت کے حادثے نے زخموں کو نئے سرے سے ادھیڑ ڈالا تھا اور وہ پہلے سے بھی زیادہ خود کو سکون کی متلاشی پا رہی تھی، اس لیے چاند بانو سے یہ سوال کیا تھا۔

''اپنے تجربے کی روشنی میں تو ہم پورے یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ عبادت سے دل کو سکون اور قرار ملتا ہے۔ ہم آپ کو ایک سچ بتائیں۔ ہم جو محبت میں بے طلب ہونے کا دعویٰ کرتے تھے، اتنے بھی بے طلب نہیں تھے۔ کبھی کبھی بہت آزردہ ہو جاتے تھے کہ جونس نس میں بستا ہے، ہم بھی اس کے گھر میں نہیں بس سکتے۔ وہ بھی ہمارے نہیں بن سکتے۔ دنیا میں کہیں ایک لڑکی ہے جو ان کے دل پر قابض ہے اور اس نے ہمارے لیے ان کے دل تک جانے کے سارے راستے بند کر دیے ہیں لیکن جب ہم اپنے خالق سے قریب ہوئے تو اس کیفیت سے بھی باہر نکل آئے۔ اب ہماری محبت پہلے سے کہیں زیادہ شفاف ہے۔ ہم نے اپنی ہر طلب کو بھلا کر اپنے معبود سے صرف ایک طلب رکھی ہوئی ہے کہ وہ انہیں ان کے دل کی خوشی کے ساتھ طویل زندگی عطا فرمائے۔ ہمارا دل تو ان کی خوشی کو محسوس کر کے بھی خوش ہو جائے گا اور یقین جانیے، اپنے

WWW.PAKSOCIETY.COM

http://paksociety.com

پاک سوسائٹی پر مُوجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

Downloaded From Paksociety.com

معبود سے یہ سب مانگ کر ہمارے دل میں اتنا سکون اتر آیا ہے کہ ہمیں پورا یقین ہے کہ ایک نہ ایک دن وہ اپنے دل کی خوشیاں ضرور پالیں گے۔ ہم تو اس اُن دیکھی اور اُن جان لڑکی سے بھی محبت کرنے لگے ہیں جو آج ان کی محبت کو نہیں پہچانتی لیکن آنے والے وقت میں اسے اس محبت کی حقیقت کو تسلیم کرنا پڑے گا۔''

چاند بانو اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے اپنی ہی رو میں بولتی چلی گئی۔ ''تم بہت پیاری بہت اچھی لڑکی ہو چاند بانو! میں تمہاری حوصلہ مندی سے متاثر بھی ہوتی ہوں اور مجھے تمہارے سکون پر رشک بھی آتا ہے۔ تمہیں دیکھ کر میرا دل تمہاری طرح بن جانے کو چاہتا ہے لیکن میں کیسے تمہاری طرح بن سکتی ہوں۔ میں تو بیچ منجدھار میں پھنسی ہوئی ہوں۔ عبادت میں بھی سکون پاؤں تو کیسے کہ ابھی تو یہ بھی طے نہیں کرسکی ہوں کہ مجھے اپنی ماں کے مذہب پر قائم رہنا چاہیے یا اپنے باپ کے دین کو اپنا لینا چاہیے۔'' جولیٹ کے ذہنی تناؤ نے اسے ایک اہم مسئلے کو چاند بانو کے سامنے بیان کرنے پر مجبور کردیا۔

''آپ ماں یا باپ کے دین میں سے کسی کے انتخاب کی کشمکش میں کیوں پڑتی ہیں۔ آپ خود کو اس الجھن سے آزاد کرلیں کہ فلاں دین میری ماں کا تھا اور فلاں پر میرا باپ کاربند ہے۔ آپ اپنے لیے صرف اس دین کا انتخاب کریں جو خود آپ کو اچھا لگے۔ جس میں آپ سچائی اور حق کو پائیں، جو آپ کو فطرت سے قریب محسوس ہو۔'' چاند بانو نے اسے مشورے سے نوازا۔

''تم ٹھیک کہتی ہو۔ مجھے ایسا ہی کرنا ہوگا۔'' جولیٹ کو اس کا مشورہ اچھا لگا پھر اسے بتانے لگی۔ ''پاکستان آنے سے پہلے میں اسلام کا مطالعہ کررہی تھی۔ اسلامی تعلیمات نے مجھے کافی حد تک متاثر بھی کیا لیکن میں کسی واضح فیصلے پر اس لیے نہیں پہنچ سکی کہ میری وجہ سے کہیں مام اور ڈیڈ کی روحوں کو تکلیف نہ پہنچے۔''

''ہم آپ سے ایک بار پھر یہی کہیں گے کہ دین کا انتخاب کرنے کے لیے آپ کو انسانی رشتوں اور محبتوں سے خود کو آزاد رکھنا ہوگا۔ روزِ حشر انسان سے صرف اس کے اپنے اعمال کا حساب لیا جائے گا اور کسی تاویل کو سنے بغیر رب تعالیٰ یہی کہے گا کہ جب میں نے تجھے عقل دی تھی تو پھر تو نے اس سے کام کیوں نہیں لیا۔ آپ تو اچھی خاصی تعلیم یافتہ اور سمجھدار خاتون ہیں۔ آپ کو اپنا ہر فیصلہ عقل کی کسوٹی پر پرکھ کر کرنا چاہیے۔'' چاند بانو اس سے عمر میں چھوٹی تھی لیکن کسی بڑی بہن کی سی محبت سے اسے سمجھا رہی تھی۔ سمجھداری سے ہی کام لیتے ہوئے اس نے اس موضوع کو زیادہ طول نہیں دیا اور بات بدلتے ہوئے پوچھنے لگی۔

''یہ بتائیں کہ ہوا کیا ہے؟ چند دن سے ہم آپ کو بہت مضطرب دیکھ رہے ہیں اور آج تو آپ خلافِ معمول وقت سے بہت پہلے گھر واپس آگئی ہیں۔ کیا کوئی بات ہوئی ہے؟''

''ہاں۔'' جولیٹ نے اعتراف کیا اور پھر اسے عارف کی موت کے سانحے سے آگاہ کرنے کے ساتھ ساتھ خود بخود ہی اپنی ذات پر بیتے ہر سانحے سے آگاہ کرتی چلی گئی۔ اتنے عرصے میں یہ پہلی بار تھا کہ وہ کسی سے اپنا دکھ بانٹ رہی تھی۔ آصف خان نے حویلی میں قیام کے عرصے میں کتنی بار اسے کریدا تھا، اس کے دل کا حال جاننے کی کوشش کی تھی اور یقین دہانی کروائی تھی کہ وہ ہر صورت میں اس کا ساتھ دے گا لیکن پھر بھی وہ اس کے سامنے کچھ عیاں نہیں کرسکی تھی اور اس چھوٹی سی لڑکی کو سب بتا دیا تھا جس سے اس کا کوئی رشتہ نہیں تھا اور وہ خود ایک پناہ گزین کی حیثیت سے اس گھر میں مقیم تھی۔

''آپ پر جو کچھ گزرا، وہ واقعی بہت الم ناک اور قابلِ افسوس ہے لیکن ہم پھر بھی یہ کہیں گے کہ آپ اتنے عظیم نقصانات اٹھانے کے باوجود خود پر اپنے رب کی نعمتوں کو نہیں جھٹلا سکتیں۔ اس رب نے اس وقت جب اپنے تئیں آپ بالکل تنہا رہ گئی تھیں، سگے باپ تک آپ کو رسوائی دی۔ ان کے دل میں آپ کے لیے بے تحاشا محبت ڈالی اور ان ساری مادی نعمتوں سے نوازا جس کے لیے بہت سے لوگ ساری زندگی خواب ہی دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ مادی نعمتوں اور سہولیات کو بھلے ہم دوسرے تیسرے درجے پر رکھیں لیکن ان کی اہمیت سے انکار نہیں کرسکتے۔ معاشی آسودگی انسان کے ذہن کو یکسوئی عطا کرنے اور راہیں

طریقۂ تبلیغ اسلام

حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔

لوگوں کو اسلام کی دعوت الفاظ استعمال کیے بغیر دیا کرو۔

پوچھا گیا کیسے؟

فرمایا۔ اپنے کردار اور اخلاق کے ذریعے۔

مرسلہ: محمد جاوید خان، تحصیل علی پور

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

متعین کرنے میں خاصی مدد دیتی ہے۔ آپ اپنی اور ماجدہ کی مثال کو ہی سامنے رکھیے۔ آپ کو ساری مادی آسائشات مہیا ہیں اس لیے آپ سکونِ دل کے حصول کے لیے آسانی سے خدمتِ خلق کی راہ پر چل پڑی ہیں، دوسری طرف ماجدہ کو اسی ناآسودگی کی وجہ سے پستی کی راہ اختیار کرنی پڑی ہے۔ ہم ماجدہ کو اس کے عمل میں حق بجانب قرار نہیں دے رہے لیکن آپ کو ایک تلخ حقیقت سے آگاہ کررہے ہیں۔ مالی طور پر آسودہ یا پھر گھر کی چار دیواری میں محفوظ رہنے والی عورت کے لیے جو پامالی ساری زندگی کا روگ بن جاتی ہے، اسی پامالی و پستی کو ایک قلاش اور بے آسرا عورت اپنے نصیب کا لکھا سمجھ کر قبول کرلیتی ہے۔ ایسی عورتوں کو دیکھ کر آپ اور ہم جیسے لوگوں کو تو رب کا بے حد شکر گزار ہونا چاہیے کہ اس نے ہمیں ایسی آزمائش میں مبتلا نہیں ہونے دیا اور عزت سے جینے کے مواقع میسر کیے۔'' چاند بانو نے بہت محبت سے جولیٹ کے اشک اپنی چادر سے صاف کیے اور دھیمے لہجے میں اسے سمجھاتی چلی گئی۔

''تمہاری باتیں دل کو اچھی لگتی ہیں چاند بانو! تم دعا کرنا کہ میرا دل بھی تمہاری طرح سکون پالے۔''

''ہم آپ کے کہے بغیر بھی آپ کے لیے بہت دعائیں کرتے ہیں، اب اور بھی زیادہ کریں گے۔'' اس کی درخواست پر چاند بانو نے مسکرا کر جواب دیا۔ اپنے گھر کی چھت تلے پناہ دے کر جولیٹ نے اس پر بہت بڑا احسان کیا تھا اور وہ اس احسان کا بدلہ دعاؤں کی صورت میں ہی دے سکتی تھی۔ سو بہت فراخ دلی سے یہ کام کیا کرتی تھی اور کیا جولیٹ اسد اللہ، اللہ کی اس نعمت کو جھٹلا سکتی تھی کہ اس نے اسے ان لوگوں سے نوازا تھا جو اس کے لیے دعا گو رہتے تھے اور دعاؤں کے حصار میں رہنے والوں سے بڑھ کر بھلا کون خوش نصیب ہوتا ہے۔

☆☆☆

فاروق کی آنکھ کھلی تو وہ ایک چھوٹے لیکن صاف ستھرے کمرے میں موجود تھا۔ کمرے میں ہلکی روشنی والا ایک بلب جل رہا تھا جس نے اردگرد کے مناظر کو واضح کیا ہوا تھا لیکن اس کی روشنی آنکھوں کو چبھتی نہیں تھی۔ کچھ دیر تک وہ یونہی ناسمجھی کے عالم میں اپنی جگہ پڑا اس ماحول اور منظر میں اپنی موجودگی کے بارے میں غور کرتا رہا لیکن پھر سر میں اٹھنے والی درد کی لہر نے اس کی توجہ بانٹ لی۔ چند سیکنڈ میں درد کی وہ لہر گزر گئی تو اسے یاد آیا کہ وہ راٹھور کے اس کے انجام تک پہنچنے کے بعد اپنی جان بچا کر بھاگا تھا تو ایک مکان کی ڈیوڑھی میں گر کر نیم بے ہوش ہوگیا تھا۔ اسے دھندلا دھندلا سا خیال تھا کہ کسی نے اس کے بے جان ہوتے وجود کو ہلایا تھا اور اسے آوازیں دیتے ہوئے اس کے بارے میں جاننے کی کوشش کی تھی لیکن سر میں ہونے والی شدید تکلیف نے اسے کوئی جواب نہیں دینے دیا تھا۔ راٹھور کی ٹکر نے اسے خاصا نقصان پہنچایا تھا پھر اس کے بعد اس کے ساتھ ہونے والی کشمکش اور جان بچانے کے لیے کی جانے والی بھاگ دوڑ نے مزید کام خراب کردیا تھا۔ وہ جو شملہ سے واپس آنے کے بعد سے خود کو بالکل فٹ اور صحت مند تصور کررہا تھا، ایک اور جھٹکے کی زد میں آگیا تھا اور اب جانے کس کے گھر میں آرام دہ بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ اپنے ذہن میں اٹھتے اس سوال کے جواب کے لیے اسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا اور وہ کمرے کا دروازہ کھول کر اندر آنے والے شخص کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔

''ڈاکٹر پرکاش.....''

''اب کیسا فیل کررہے ہو ینگ مین؟'' انہوں نے اس کی حیرت کو نظرانداز کرتے ہوئے نرمی سے پوچھا۔

''میں ٹھیک ہوں لیکن آپ یہاں کیسے؟'' فاروق کی حیرت ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

''میرے پیرنٹس یہاں رہتے ہیں اور میں ان سے ملاقات کے لیے چھٹی پر یہاں آیا ہوا ہوں۔'' انہوں نے اس کی حیرت دور کردی پھر نہایت سنجیدگی سے بولے۔

''باہر پولیس نے سارے علاقے کو گھیرا ہوا ہے۔ وہ اس شخص کو اریسٹ کرنا چاہتے ہیں جس نے ان کے ایک آفیسر کو قتل کرڈالا ہے۔ ان کی طرف سے اناؤنسمنٹ کی گئی ہے کہ جس کسی نے بھی قاتل کو پناہ دے رکھی ہے، وہ اسے خود پولیس کے حوالے کردے ورنہ پولیس خانہ تلاشی لے کر خود اسے بازیاب کروالے گی۔ اس اناؤنسمنٹ کے بعد میرے فادر خوف زدہ ہیں اور چاہتے ہیں کہ تمہیں پولیس کے حوالے کردیا جائے لیکن میں پہلے تم سے ساری بات جاننا چاہتا ہوں۔''

ڈاکٹر پرکاش وہ شخص تھے جنہوں نے اس کے علاج پر خصوصی توجہ دی تھی اور اس علاج کے دوران ربن سے ہونے والی دوستی کو یوں نبھایا تھا کہ ربن کے آخری وقت میں اسے شناخت کرلینے کے باوجود پولیس پر ظاہر نہیں کیا تھا۔ مردہ خانے سے ربن کی لاش نکال کر فاروق کے حوالے کرنے میں بھی کیتھرائن کو ڈاکٹر پرکاش کا تعاون حاصل رہا تھا اور اب بھی وہ اسے فوری طور پر پولیس کے حوالے کرنے

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

کے بجائے اپنے گھر میں پناہ دیے ہوئے تھے۔

وہ ہوش میں آتے ہی یہ بات نوٹ کر چکا تھا کہ اس کا لباس تبدیل کیا جا چکا ہے اور ہاتھ، پیر اور چہرہ بھی صاف ہے۔ اسے یاد تھا کہ راٹھور کی گردن سے پھوٹنے والے خون کے فوارے نے اس کے چہرے اور لباس کو آلودہ کر دیا تھا اور اس کے ہاتھ بھی خون میں رنگے ہوئے تھے۔ وہ اتنی بری حالت میں یہاں پہنچا تھا کہ ڈاکٹر پرکاش کی جگہ کوئی اور ہوتا تو فوراً اسے پولیس کے حوالے کر دیتا۔ انہوں نے ایسا نہیں کیا تھا تو یہ ان کی مہربانی تھی۔

''میں اپنے ساتھ آپ کے سلوک کے لیے آپ کا شکر گزار ہوں ڈاکٹر صاحب اور چاہتا ہوں کہ آپ میری وجہ سے کسی دشواری میں گرفتار نہ ہوں۔ آپ چاہیں تو اپنے والد کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے مجھے پولیس والوں کے حوالے کر سکتے ہیں۔'' اس نے ڈاکٹر پرکاش کو جواب دیا۔

''میں نے تم سے کہا ہے نا کہ میں حقیقت جاننے کے بعد کوئی فیصلہ کروں گا۔ تم میرے ان مریضوں میں سے ہو جن سے میں بے حد قریبی تعلق محسوس کرتا ہوں۔ یہ ٹھیک ہے کہ تمہارے علاج کے لیے مجھے انگریز ڈاکٹر کی مدد لینی پڑی تھی لیکن تمہارے کیس کو میں نے خود بھی پوری توجہ دی تھی اور تم صحت مند ہونے لگے تھے تو مجھے بہت خوشی ہوئی تھی لیکن تم جس حالت میں یہاں پہنچے تھے، اسے دیکھ کر میں شاکڈ رہ گیا تھا۔ کیا تمہیں یاد ہے کہ تمہارے سر میں اتنا شدید درد ہو رہا تھا کہ تم دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بری طرح کراہ رہے تھے؟'' انہوں نے کچھ ناراض سے لہجے میں اس سے دریافت کیا تو وہ جواباً نفی میں سر ہلا کر رہ گیا۔ اسے واقعی یاد نہیں تھا کہ اس کی ایسی کیفیت تھی۔ وہ تو خود کو غنودگی اور غشی کی کیفیت میں محسوس کرتا رہا تھا۔

''تم بہت تکلیف میں تھے فاروق لیکن اچھی بات یہ تھی کہ تم مجھ تک پہنچ گئے اور میں نے تمہارے بدلے ہوئے حلیے کے باوجود تمہیں پہچان کر ممکنہ ٹریٹمنٹ دے دیا..... لیکن میرا خیال ہے کہ تمہیں پراپر چیک اپ اور علاج کی ضرورت ہے۔'' وہ اسے اس کی حالت سے آگاہ کر رہے تھے۔ یہ سن کر فاروق کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ آ گئی اور وہ بولا۔

''یہاں جان بچا کر نکلنے کے امکانات کم ہیں اور آپ پراپر چیک اپ اور علاج کی بات کر رہے ہیں۔''

''تم بتاؤ تو سہی کہ ہوا کیا تھا؟'' ڈاکٹر پرکاش نے ایک بار پھر اس پر زور دیا تو وہ ربن کے قتل میں راٹھور کے کردار سے لے کر اپنی انتقامی کارروائی تک بہت کچھ بتاتا چلا گیا۔ اپنی انتقامی کارروائیوں کے بہت سے قصے اس نے حذف کر دیے تھے لیکن یہ ضرور بتا دیا تھا کہ کیتھرائن کو اس سے ہمدردی کی پاداش میں کن صعوبتوں سے گزرنا پڑا تھا اور وہ اسے حوالات سے فرار کروانے کے جرم کا مرتکب ہونے کے ساتھ ساتھ ملک سے فرار کروانے میں بھی کامیاب ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر پرکاش دخل دیے بغیر سنجیدگی سے اس کی ساری بات سنتے رہے۔ وہ چپ ہوا تو بولے۔

''تم خطروں سے کھیل رہے ہو فاروق! تم جو کچھ کر چکے ہو اس کے بعد سرکار سے تمہارے لیے کسی نرمی کی امید نہیں کی جا سکتی۔ میں پریشان ہوں کہ اتنا سب ہونے کے بعد تم کہاں تک خود کو بچا پاؤ گے۔''

''یہ تو خود مجھے بھی نہیں معلوم۔ میں تو بس یہ جانتا ہوں کہ مجھے جو کچھ کرنا چاہیے تھا، میں نے وہی کیا ہے۔ میں دادا کے قاتلوں کو کسی صورت معاف نہیں کر سکتا تھا۔'' فاروق کے چہرے پر تناؤ سا آ گیا۔

''میں تمہارے ایموشنز کو سمجھ سکتا ہوں۔ ربن دادا واقعی بہت پیارا آدمی تھا۔ اس کی پرسنالٹی نے مجھے بھی بہت انسپائر کیا تھا، تمہیں تو پھر وہ بالکل بیٹوں کی طرح چاہتا تھا۔ تمہارا اس کے وحشیانہ قتل پر اس طرح ری ایکٹ کرنا بنتا تھا، پر اب سوچنا یہ ہے کہ تم یہاں سے بچ کر کیسے نکلو گے؟ پولیس نے خاصے بڑے ایریے کو پوری طرح گھیر رکھا ہے۔'' وہ اس کے لیے پریشان تھے۔

''آپ چاہیں تو خود کو مشکل سے بچانے کے لیے پولیس والوں کو انفارم کر سکتے ہیں۔'' فاروق نے گویا ان کی مشکل آسان کرنے کی کوشش کی۔

''واٹ ربش؟ میں ایسا کیسے کر سکتا ہوں؟ مجھے یہی کرنا ہوتا تو تمہیں گھر کے اندر لا کر تمہاری اتنی دیکھ بھال کیوں کرتا؟'' وہ ناراض ہوئے۔

''آپ اجازت دیں تو میں اپنے طور پر یہاں سے نکلنے کی کوشش کرتا ہوں۔ انہوں نے خانہ تلاشی شروع کر دی اور مجھے آپ کے گھر سے بازیاب کر لیا تو آپ کی نیک نامی پر حرف آئے گا۔'' وہ اپنی وجہ سے انہیں کسی پریشانی میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''نہیں۔ تم ایسا کچھ نہیں کرو گے۔ وہ چپے چپے پر پھیلے ہوئے ہیں اور تمہارا ان کو چل دے کر نکلنا پاسیبل نہیں ہوگا۔ تمہاری کنڈیشن بھی زیادہ اچھی نہیں ہے۔ مجھے لگتا ہے

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

کہ تم عرصے سے اپنی کیئر کیے بغیر خود کو جوکھم میں ڈالے ہوئے ہو اور اسی کی کسر اب نکل رہی ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ تمہارے سر کی تکلیف تمہیں دوبارہ بھی پریشان کر سکتی ہے۔ تم یہاں میری نظروں کے سامنے رہو اور میری تجویز کردہ میڈیسن استعمال کرو، تمہارے لیے یہی ٹھیک ہوگا۔'' انہوں نے سختی سے اس کی دوسری تجویز بھی رد کر دی۔ اسی وقت دروازے پر ہلکی سے دستک ہوئی اور وہ کھل گیا۔ کھلے دروازے سے ایک عمر رسیدہ خاتون ٹرے ہاتھوں میں اٹھائے اندر داخل ہوئیں۔

''ارے ماتاجی! آپ نے کیوں کشٹ کیا...... مجھے بلا لیتیں۔'' ڈاکٹر پرکاش فوراً اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے۔

''کشٹ کیسا بیٹا! اپنے ہاتھ سے کام کرنا اچھا لگتا ہے۔ نوکرانی تو میں نے بس تمہاری ضد پر رکھی ہوئی ہے۔'' ان کے جھریوں بھرے چہرے پر مسکراہٹ اور ممتا کی روشنی تھی۔

''آپ کونسا میری ہر ضد مانتی ہیں۔ کتنی بار آپ سے کہا ہے میرے ساتھ بمبئی چل کر رہیں۔ بچے بھی آپ دونوں کو یاد کرتے رہتے ہیں۔'' ڈاکٹر پرکاش نے انہیں ایک کرسی پر بٹھا دیا تھا اور بہت محبت سے شکوہ کر رہے تھے۔

''تمہیں خبر ہے میرا اس گھر سے ہٹ کر کہیں من نہیں لگتا۔ بچوں کو تم چھٹیوں میں ہم سے ملوانے لے آتا۔ پڑھنے لکھنے والے بچوں کو عام دنوں میں کہاں فرصت ہوتی ہے کہ بوڑھے دادا دادی کے ساتھ سے بتا سکیں، بس آتے جاتے ہیلو ہائے ہی کر پاتے ہیں۔'' انہوں نے پیار سے بیٹے کے شکوے کا جواب دیتے ہوئے حقیقت بیان کی۔ فاروق سرہانے سے ٹیک لگائے بیٹھا دلچسپی سے یہ منظر دیکھتا رہا۔ عرصہ گزر گیا تھا اسے ماں کی چھاؤں سے محروم ہوئے لیکن ماں بھولی نہیں تھی اور وہ یقین سے کہہ سکتا تھا کہ اس کی اور ڈاکٹر پرکاش کی ماں میں کوئی فرق نہیں تھا کہ ماں کا تعلق کسی بھی طبقے، مذہب یا خطے سے ہو...... ماں، ماں ہی ہوتی ہے۔ وہ بھی آنکھوں میں محبت لیے ناشتے کے لوازمات ان دونوں کے سامنے سجاتی رہیں اور کچھ سادگی سے بولیں۔

''لو کھاؤ بیٹا! نوکرانی آج نہیں آسکی تو لمبے سمے کے بعد آج میں نے رسوئی میں پیر رکھا ہے۔ جانے ڈھنگ کا بنا بھی یا نہیں۔''

''بہت مزے کا ہے ماتاجی! میرا انٹرنیشنل کلنگ کا ماہر شیف بھی اتنے مزے کا کچھ نہیں پکا پاتا۔''

ڈاکٹر پرکاش فاروق کو کھانے کا اشارہ کر کے خود شروع ہو چکے تھے اور دل بھر کر تعریفیں بھی کرتے جا رہے تھے۔ ان کی ہر تعریف پر ان کی ماں کا چہرہ مزید روشن ہو جاتا تھا۔ وہ مڈل کلاس گھرانے کی وہی روایتی ماں تھیں جنھوں نے بیٹے کی اچھی تعلیم کے لیے اپنے شوہر کے ساتھ مل کر نہ جانے کتنی قربانیاں دی تھیں۔ بیٹا پڑھ لکھ کر اپنی الگ دنیا بسا چکا تھا اور پیچھے بوڑھے ماں باپ اسی میں خوش تھے کہ ان کا بیٹا ایک اچھی زندگی گزار رہا ہے اور اپنی بے تحاشا مصروفیت میں سے تھوڑا سا وقت نکال کر وقتاً فوقتاً ان سے ملنے آجاتا ہے۔ ڈاکٹر پرکاش کی عمر دیکھتے ہوئے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ ان کے بچے جوانی کی سرحد پر پہنچ چکے ہوں گے اور اسی حساب سے ان کے والدین کی عمریں بھی اچھی خاصی تھیں، یعنی وہ لوگ ایک طویل عرصے سے تنہائی کی زندگی گزار رہے تھے۔ ہو سکتا ہے وہ روایتی ذہن کے لوگ ہی ہوں جنھیں اپنی پرانی جگہ چھوڑنا اچھا نہ لگتا ہو لیکن عموماً ایسے بوڑھے والدین کی ضد اپنا بھرم قائم رکھنے کی ہی ایک کوشش ہوتی ہے۔ کامیاب بچوں کے بوڑھے والدین ان کے شاندار گھروں میں اس توجہ اور اپنایت سے محروم ہوتے ہیں جو ان کے بیٹوں کے گھر میں ان کی حیثیت کو مستحکم بنا سکے اس لیے وہ اپنی انا اور خودداری کو بچا کر بیٹوں کے بڑے گھروں کو چھوڑ کر اپنے چھوٹے اور عام سے گھروں میں رہنا پسند کرتے ہیں اور اتنی بات پر ہی خوش ہو لیتے ہیں کہ بیٹا دور رہ کر بھی ان کے آرام کے لیے متفکر رہتا ہے۔

ڈاکٹر پرکاش نے اپنا ناشتا پھرتی سے ختم کیا اور فاروق کو اچھی طرح کھانے کی ہدایت کر کے کمرے سے باہر نکل گئے۔ فاروق کی طبیعت بوجھل تھی اور کھانے پینے کو دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن وہ ڈاکٹر پرکاش کی ماں کے اصرار پر ان کا دل رکھنے کے لیے کچھ نہ کچھ کھاتا رہا۔ انہوں نے اس سے اس کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا، اس لیے اسے بھی ان کی موجودگی بھاری محسوس نہیں ہوئی۔ کچھ دیر بعد جب وہ ناشتے سے ہاتھ کھینچ چکا تھا، ڈاکٹر پرکاش ایک بزرگ کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئے۔ ڈاکٹر پرکاش سے ان کی حد درجے مشابہت ظاہر کر رہی تھی کہ وہ ان کے والد ہیں۔ فاروق نے انہیں آداب کیا۔ جواب میں انہوں نے بھی جیتے رہو کہا اور اپنی بیوی کی خالی کی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئے۔ وہ برتن وغیرہ سمیٹ کر ناشتے کی ٹرے واپس لے جا رہی تھیں۔

''پرکاش سے تمہارے بارے میں بہت کچھ پتا

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

چلا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ مرنے والا شخص ایس پی راٹھور تھا۔ اس آدمی کے بارے میں بہت کچھ سننے میں آرہا تھا۔ بتانے والے بتاتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کے لیے بالکل قصائی تھا اور دلی میں ہونے والے خون خرابے میں اس کا بڑا ہاتھ تھا۔ نیچرلی مجھ جیسے کسی بھی ہندو کو ہندوستان کی ڈویژن اچھی نہیں لگی۔ کوئی بھی آدمی اپنے گھر کے ٹکڑے ہوتے دیکھ کر خوش نہیں ہوتا لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ ہم مسلمانوں کو مارنا اور لوٹنا شروع کردیں۔ کچھ باتوں میں وہ ٹھیک بھی ہیں۔ ہمارے لیڈرز اگر ان کی شکایت پر کان دھرتے اور انہیں منانے کی کوشش کرتے تو شاید بٹوارے کو روکا جاسکتا تھا پر اب تو جو ہونا تھا ہوگیا اور ہمیں کوئی ادھیکار نہیں ہے کہ مسلمانوں کو ان کے اس فیصلے کی سزا دیں۔ راٹھور اور اس جیسے لوگ جو کچھ کررہے ہیں، وہ بہت غلط ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ایسے لوگ اپنی اصل سے ہی ٹھیک نہیں ہیں۔ تمہارے ساتھ اس نے جو کچھ کیا، اس پر تمہارا ایکشن ٹھیک ہی ہے۔ افسوس کہ راٹھور نے قانون کا رکھوالا ہوتے ہوئے ایک قابل اور ذہین نوجوان کو غلط راہ پر چلنے کے لیے مجبور کردیا۔ پرکاش کی سفارش، تمہاری کیفیت اور راٹھور کے کردار کو دیکھتے ہوئے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں تمہیں اپنے گھر میں پناہ دوں گا۔ میں ہندو بعد میں ہوں اور انسان پہلے..... اس لیے انسانیت کے ناتے ہی تمہارے کام آنا چاہتا ہوں۔'' اپنی گفتگو اور سوچ سے انہوں نے ثابت کردیا کہ ڈاکٹر پرکاش کے عمدہ کردار کے پیچھے ان ہی کی تربیت کارفرما ہے۔ وہ واقعی انسان دوست آدمی تھے۔ فاروق نے اتنے اچھے لوگوں کو اپنی وجہ سے مشکل میں ڈالتے ہوئے خود پر بوجھ محسوس کیا اور بولا۔

''آپ لوگوں کی اس کشادہ دلی پر میں آپ کا شکر گزار ہوں لیکن مجھے لگتا ہے کہ مجھے اپنی وجہ سے آپ لوگوں کو کسی مشکل میں نہیں ڈالنا چاہیے۔ میں یہاں سے چلا جاتا ہوں۔ قسمت نے ساتھ دیا تو پولیس والوں کی نظروں سے بچ کر نکل ہی جاؤں گا۔''

''کہاں نکل جاؤ گے؟ پولیس نے پورے علاقے کو گھیرا ہوا ہے اور گھروں کی تلاش لینے کا کام شروع کرچکی ہے۔ اب تو ہمیں تمہیں یہیں کسی طرح چھپانے کی کوشش کرنی ہے۔'' انہوں نے اس کے خیال کو رد کردیا اور ڈاکٹر پرکاش کی طرف متوجہ ہوکر بولے۔

''تم نے کچھ سوچا پرکاش؟''

''اسی پر سوچ رہا ہوں پتا جی! اپنے گھر میں کوئی تہ خانہ یا دوسری خفیہ جگہ تو ہے نہیں کہ فاروق کو وہاں چھپادیں۔ پولیس والوں کی نظریں ویسے بھی ہر خفیہ جگہ کو ڈھونڈ لیتی ہیں۔ ہاں، ایک ترکیب ہوسکتی ہے اسے چھپانے کی۔ ہم اسے مریض بنالیتے ہیں۔''

''میں کچھ ٹھیک سے سمجھا نہیں بیٹے!''

''آپ بس اتنی بات یاد رکھیں پتا جی کہ اس کا نام جتیندر ہے، ہریانہ سے آیا ہے اور اس کی آنکھوں کا آپریشن ہوا ہے۔ میری یہاں موجودگی کی وجہ سے آپ اسے اسپتال میں اکیلا چھوڑنے کے بجائے گھر لے آئے ہیں تاکہ میں اس کی اچھی دیکھ بھال کرسکوں۔ پولیس والے اگر پوچھیں تو آپ بول دینا کہ اُدھر اس کی ماتا کی طبیعت بھی بہت خراب ہے اس لیے اس کے پتا آپریشن کے فوراً بعد آپ کے بھروسے پر واپس لوٹ گئے تھے۔ بہن بھائی اس کا کوئی ہے نہیں۔'' ڈاکٹر پرکاش جلدی جلدی اپنے والد کو سمجھانے لگے اور وہ اثبات میں سر کو جنبش دیتے اس کی بات کو سمجھ جانے کا تاثر دیتے رہے۔

''میں اپنا کام شروع کرتا ہوں۔ آپ ماتا جی سے کہیں کہ فاروق کے کپڑے اور دوسری چیزیں جلا کر ان کی راکھ بہادیں تاکہ پولیس کو کوئی نشانی نہ مل سکے۔'' ڈاکٹر پرکاش نے اپنے والد کو ہدایات دیں تو فاروق چونک گیا۔ اس کی قمیص کی جیب میں اس کا چاقو موجود تھا اور لباس کے نیچے پہنی صدری میں خاصی رقم بھی تھی۔ یہ دونوں چیزیں اسے دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ ڈاکٹر پرکاش سے سوال کرنا بھی اسے معیوب لگا لیکن انہوں نے خود اس کی کیفیت کو بھانپ لیا اور بتانے لگے۔

''تمہارے پاس موجود رقم میں نے حفاظت سے رکھ دی ہے اور چاقو میرے میڈیکل باکس میں ہے۔ اگر تلاشی ہوئی بھی تو میڈیکل باکس پر کوئی دھیان نہیں دے گا۔ ویسے بھی وہ لوگ اصل میں تمہاری تلاش میں ہوں گے اس لیے دوسری چیزوں کا باریک بینی سے جائزہ لینا مشکل ہے۔''

''جوا کھیل کر دیکھ لیتے ہیں۔ قسمت نے زور مارا تو ایک بار پھر بچ نکلوں گا۔'' فاروق اداس سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا تو بڈھا ڈاکٹر پرکاش نے کوئی بھی جواب دیے بغیر اپنا کام شروع کردیا۔ ان کے والد پہلے ہی باہر نکل چکے تھے۔ ڈاکٹر پرکاش نے اس کی دونوں آنکھوں پر روئی کے گولے کی پتلی سی تہ جما کر اوپر سے پٹی باندھنے کے علاوہ دائیں رخسار پر بھی میڈیکل ٹیپ کی مدد سے پٹی چپکا دی۔ ان اقدامات کی وجہ سے فاروق کے چہرے کا بیشتر حصہ چھپ

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

گیا تھا اور شناخت آسان نہیں تھی۔

''تمہارے جسم پر اور بھی چھوٹی موٹی چوٹیں موجود ہیں۔ اگر کسی کی نظر پڑ جائے تو بہانہ بنایا جاسکتا ہے کہ ہاسپٹل میں کسی ضرورت کے تحت تم نے خود بستر سے اٹھنے کی کوشش کی اور دواؤں کی میز پر گر گئے۔ گرنے سے شیشیاں وغیرہ ٹوٹیں تو ان کے ٹکڑے تمہارے جسم کے مختلف حصوں میں چبھ کر زخم بنا گئے۔'' ڈاکٹر پرکاش ہر طرح کے سوال جواب کے لیے اپنے ساتھ دوسروں کو بھی تیار دیکھنا چاہتے تھے۔

''میں آپ کی ہدایات یاد رکھوں گا۔'' فاروق نے انہیں یقین دہانی کروائی۔

''تمہیں کسی کے سامنے زیادہ بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر پولیس والے یہاں آئے تو میں ان سے کہہ دوں گا کہ تمہیں مسکن دوائیں کھلا کر سلا دیا گیا ہے۔ میری کوشش ہوگی کہ تمام بات چیت میں خود ہی کروں۔ تمہیں، پتا جی اور ماتا بی کو صرف احتیاطاً سب کچھ بتاتا جا رہا ہوں۔''

''جیسا آپ مناسب سمجھیں۔'' فاروق نے اپنی لگامیں مکمل طور پر ان کے ہاتھ میں تھما دی تھیں اور ان کی ہر بات پر صاد کر رہا تھا۔

''آنکھوں پر پٹی بندھے ہونے سے تمہیں الجھن تو ہو رہی ہوگی لیکن جان بچانے کے لیے یہ تھوڑی سی تکلیف سہہ لو۔ میں تھوڑی تھوڑی دیر بعد یہاں کا چکر لگاتا رہوں گا۔ اگر تمہیں کوئی ضرورت پڑے تو تم آواز دے کر بلا سکتے ہو۔ فی الحال میں تمہیں سچ مچ ایک سکون کی دوا کھلا رہا ہوں۔ اسے کھا کر تم آرام سے سو جاؤ۔ اس طرح تمہیں زیادہ الجھن بھی نہیں ہوگی اور تمہارے سر کی تکلیف کو بھی آرام ملے گا۔ ویسے اب تم کیسا فیل کر رہے ہو؟''

''جب جاگا تھا تو سر میں درد کی لہریں محسوس ہو رہی تھیں۔ ناشتے کے بعد کافی بہتر ہوں۔'' فاروق نے جواب دیا تو انہوں نے اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے اسے اپنے ہاتھ سے ایک گولی کھلائی اور آرام کرنے کی ہدایت کرتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے۔ یہ ان کی کھلائی گئی گولی کا اثر تھا یا وہ خود بھی مسلسل بھاگ دوڑ کی وجہ سے بہت تھک چکا تھا کہ تھوڑی ہی دیر میں نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ نیند کا یہ دورانیہ تقریباً ڈھائی تین گھنٹوں پر محیط تھا۔ شاید وہ ابھی کچھ دیر مزید سویا رہتا لیکن غیر معمولی آوازوں نے اسے نیند سے جگا دیا۔ سوتے وقت اس کے ذہن میں تھا کہ پولیس والے خانہ تلاشی کے لیے یہاں آسکتے ہیں اس لیے گہری نیند سے جاگنے کے باوجود بھاری بوٹوں کی دھمک اور مردانہ آوازوں نے اسے فوراً سمجھا دیا کہ پولیس اسے تلاش کرتے ہوئے یہاں پہنچ چکی ہے۔ اسے اپنے اعصاب میں واضح تناؤ محسوس ہوا لیکن کسی نہ کسی طرح خود پر ضبط کیے بستر پر پڑا رہا۔ کچھ لمحوں میں ہی اسے اپنے کمرے کا دروازہ کھولے جانے کی آواز سنائی دی۔ ساتھ ہی ایک مردانہ آواز کانوں میں پڑی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

''میں سر کا اسٹوڈنٹ رہا ہوں اور مجھے ان کی زبان پر بھروسا ہے۔ بس اپنی ڈیوٹی پوری کرنے کے لیے آپ کے گیسٹ پر ایک نظر ڈالنا چاہتا ہوں۔''

''شیور انسپکٹر! ڈیوٹی پوری کرنا بہت اچھی بات ہے، بس آپ کوشش کریں کہ میرا پیشنٹ ڈسٹرب نہ ہو۔ اس کے لیے ریسٹ بہت ضروری ہے۔'' ڈاکٹر پرکاش نے پروفیشنل انداز اختیار کرتے ہوئے اسے جواب دیا۔ فاروق کی آنکھوں پر پٹی تھی اس لیے وہ کچھ دیکھ نہیں سکتا تھا، اتنا اندازہ البتہ ہو گیا کہ کوئی اس کے قریب آ کر کھڑا ہوا ہے۔ اس نے پوری کوشش کی کہ اس کا اعصابی تناؤ اس کے چہرے سے ظاہر نہ ہو اور وہ سکون سے سویا ہوا ہی محسوس ہو۔ حسب توقع انسپکٹر نے ڈاکٹر پرکاش سے اس کے رخسار پر چپکی پٹی کے بارے میں پوچھا اور انہوں نے اسے وہی جواب دیا جو کہ پہلے طے کر چکے تھے۔

''سر ہمیشہ بڑی سوفٹ نیچر رکھتے ہیں۔ اپنے دوست کے بیٹے کے لیے اس عمر میں بھی کشٹ اٹھانا انہی کی ہمت ہے۔'' انسپکٹر شاید اپنا اطمینان کر چکا تھا اور دوستانہ لہجے میں پرکاش کے سامنے تبصرہ کر رہا تھا۔

''پتا جی ہیومینٹی پر بلیو کرنے والے آدمی ہیں۔ انہوں نے مجھے ڈاکٹر بھی اسی لیے بنایا تھا کہ میں انسانوں کی سیوا کروں۔ اپنے اسٹوڈنٹس کو بھی وہ یہی سب سمجھاتے تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد بھی کئی سالوں تک وہ بچوں کو فری ایجوکیشن دیتے رہے ہیں۔ وہ تو پچھلے دو تین سالوں سے ان کی ہمت نہیں رہی ہے تو گھر سے نکلنا چھوڑ دیا ہے لیکن اب بھی کوئی بھولا بھٹکا پڑھانے کی ریکویسٹ لے کر گھر آ جائے تو اسے نہ نہیں کہتے۔'' ڈاکٹر پرکاش اور پولیس انسپکٹر کی گفتگو سے ظاہر ہو رہا تھا کہ انسپکٹر ڈاکٹر پرکاش کے والد کا کوئی پرانا شاگرد نکل آیا ہے، اسی لیے اتنے دوستانہ انداز میں پیش آ رہا ہے۔ باتیں کرتے ہوئے وہ دونوں کمرے سے باہر چلے گئے تو فاروق نے سکون کا سانس لیا اور اپنی جگہ پر لیٹے لیٹے ہی محسوس کرتا رہا کہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

پولیس والے اب اس گھر سے باہر جا رہے ہیں۔ ان کے جانے کے دو چار منٹ بعد ہی ڈاکٹر پرکاش دوبارہ اس کے کمرے میں آ گیا اور آہستہ سے اسے آواز دے کر پوچھا۔

''تم جاگ رہے ہو نا فاروق؟''

''جی ڈاکٹر صاحب۔'' فاروق فوراً اپنی جگہ سے اٹھ بیٹھا اور بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''آپ کی ترکیب کامیاب رہی۔ پولیس والے دھوکا کھا کر واپس چلے گئے۔''

''شاید..... لیکن مجھے لگتا ہے کہ وہ تھوڑا سا کھٹک گئے ہیں۔ اصل میں تھوڑی سی مس ہینڈلنگ ہو گئی۔''

''وہ کیا؟'' فاروق چونکا۔

''تمہارے خون آلود کپڑوں وغیرہ کو جلانے کے بعد ماتا جی راکھ ٹھیک طرح سے بہا نہیں سکیں۔ ایک سپاہی نے باتھ روم میں پڑی راکھ دیکھ لی تھی اور اس کے بارے میں پوچھا بھی تھا۔ میں نے بہانہ بنا دیا کہ ماتا جی نے سفید لٹھے اور نمک سے میری نظر اتارنے کے بعد دونوں چیزیں باتھ روم میں لے جا کر جلا دی تھیں۔ یہ اسی کی راکھ ہے لیکن پتا نہیں پولیس والوں نے مانا بھی یا نہیں۔ انہوں نے مجھ سے ہاسپٹل اور ڈاکٹر کا نام بھی پوچھا تھا کہ تمہارا آپریشن کہاں اور کس نے کیا۔ پتا جی سے بھی پوچھ رہا تھا کہ ان کے دوست ہریانہ میں کس جگہ رہتے ہیں۔'' ڈاکٹر پرکاش تذبذب کا شکار تھے۔ فاروق کو بھی ان کی تشویش میں جان محسوس ہوئی۔

''خیر تم فکر نہ کرو۔ میری یہاں بھی ڈاکٹرز سے اچھی پہچان ہے۔ میں نے اپنے جاننے والے ایک آئی اسپیشلسٹ کا ریفرنس دے دیا ہے۔ اسے فون کر کے سمجھا دوں گا کہ اگر کوئی انکوائری کرے تو اسے کیا جواب دینا ہے۔'' انہوں نے اپنی تشویش سے آگاہ کرنے کے ساتھ ہی اسے تسلی بھی دی۔

''مجھے نہیں لگتا ڈاکٹر صاحب کہ وہ مطمئن ہو گئے ہوں گے۔ پولیس والوں کو ایک بار شک پڑ جائے تو وہ بال کی کھال نکالنے بیٹھ جاتے ہیں۔ ابھی جو آیا تھا، وہ آپ کے پتا کا شاگرد تھا اس لیے ان کے احترام میں خاموشی سے چلا گیا۔ اب دوبارہ اس کی جگہ کوئی دوسرا آئے گا جو کوئی لحاظ نہیں کرے گا۔ مجھے اس سے پہلے ہی یہاں سے نکلنا ہوگا۔'' فاروق بے چین ہو گیا اور آنکھوں پر بندھی پٹی کھولنے کی کوشش کی۔

''جلد بازی سے کام نہ لو۔ اس طرح سوچے سمجھے بنا نکل کر تم آسانی سے ان کے جال میں پھنس جاؤ گے۔ مجھے کوئی اُپائے سوچنے دو۔'' ڈاکٹر پرکاش نے ایک بار پھر اسے کوئی جذباتی قدم اٹھانے سے روکا اور چھوٹے سے کمرے میں ادھر سے ادھر ٹہلنے لگے۔ فاروق کو نہ چاہتے ہوئے بھی ان کی بات ماننا پڑی۔

''ٹھیک ہے۔ ایک اُپائے ہے میرے پاس ہے۔''

دو منٹ کے اندر ہی ڈاکٹر پرکاش نے ٹہلنا بند کر دیا اور اس کی طرف رخ کر کے بولے۔ وہ سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔

''میں ہاسپٹل سے ایمبولینس منگواتا ہوں۔ ایمبولینس کو کوئی نہیں روکے گا۔ بہانہ یہ ہوگا کہ تم اپنی آنکھوں میں تکلیف محسوس کر رہے ہو اس لیے تمہیں چیک اپ کے لیے لے جایا جا رہا ہے۔ یہاں کی طرح ہاسپٹل کے باہر پولیس کا گھیرا نہیں ہوگا اس لیے تم وہاں سے نکلنے کی کوشش کرو گے تو کامیاب ہو جاؤ گے۔'' ان کی تجویز واقعی اچھی تھی۔ فاروق کے چہرے پر بھی رونق دوڑ گئی اور وہ بولا۔

''وہاں سے تو ستار بھائی بھی مجھے نکلوا سکتے ہیں۔ مجھے ان کا ٹیلیفون نمبر یاد ہے۔ آپ ٹیلیفون پر میری ان سے بات کروا دیں۔''

''او کے۔ پہلے میں ایمبولینس کے لیے کال کر کے اپنے دوست کو ساری بات سمجھا دوں پھر تمہاری بات کرواتا ہوں۔'' ڈاکٹر پرکاش کمرے سے باہر نکل گئے۔ نصف گھنٹے کے اندر فاروق کی وہاں سے روانگی کے انتظامات مکمل ہو چکے تھے۔ حسب توقع پولیس والوں نے ایمبولینس کی آمد اور مریض کی وہاں سے منتقلی پر کوئی اعتراض نہیں کیا البتہ راستے میں ایک جگہ چیکنگ ضرور ہوئی۔ فاروق کا جاتو ہنوز ڈاکٹر پرکاش کے میڈیکل باکس میں پڑا تھا جس کی تلاشی لینے کا کسی کو خیال نہیں آیا۔ ناکا بندی والے علاقے سے نکل کر فاروق اور ڈاکٹر پرکاش دونوں نے اطمینان کا سانس لیا لیکن احتیاطاً آپس میں کوئی گفتگو نہیں کی کہ ایمبولینس کا ڈرائیور شک میں مبتلا نہ ہو جائے۔ ہاسپٹل پہنچ کر بھی فاروق کو باقاعدہ ایک مریض ہی کی طرح اسٹریچر پر متعلقہ ڈاکٹر کے پاس لے جایا گیا۔ ڈاکٹر پرکاش کے اس دوست ڈاکٹر نے فاروق کی آنکھوں پر بندھی پٹی کھولی اور اسے بتایا کہ ستار بھائی کے آدمی اسے لینے کے لیے آئے ہوئے ہیں لیکن ڈاکٹر پرکاش نے فوری طور پر فاروق کو روانگی کی اجازت دینے کے بجائے اس سے کہا کہ وہ ہاسپٹل میں موجودگی کا فائدہ اٹھا کر اس کے سر کی تکلیف کی طرف سے اپنا اطمینان کر لینا چاہتے ہیں۔ فاروق تیار نہیں تھا لیکن ڈاکٹر پرکاش کے اصرار پر اسے ماننا پڑا۔ ڈاکٹر پرکاش کے دوست نے

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

ان کی درخواست پر فوری طور پر اس کے ایکسرے کا انتظام کروادیا پھر بھی ڈھائی تین گھنٹے کا وقت گزر گیا۔ ستار بھائی کے بھیجے آدمی صبر سے انتظار کرتے رہے۔ ایکسرے دیکھنے کے بعد ڈاکٹر پرکاش خوش ہوگئے اور فاروق کو بتایا۔

''رپورٹ بالکل ٹھیک ہے، ورنہ تمہاری تکلیف دیکھ کر میں ڈر رہا تھا کہ کوئی انٹرنل پرابلم نہ ہوگئی ہو۔ شاید بہت زیادہ اسٹریس کا اثر تھا کہ ایک ٹکر سے ہی تمہاری حالت خراب ہوگئی۔ دماغ کے معاملات بڑے نازک ہوتے ہیں۔ ایکسرے میں ہر بات کا پتا چلنا پاسیبل بھی نہیں ہے اس لیے تم یہ مت سمجھ لینا کہ تم ہنڈرڈ پرسنٹ فٹ ہو۔ میں کچھ میڈیسنز دے رہا ہوں۔ ان کو ریگولر کھاتے رہنا تاکہ فیوچر میں کوئی پریشانی نہ ہو۔'' ڈاکٹر پرکاش اسے ڈھیروں ہدایات سے نواز رہے تھے۔ وہ ان کے خلوص کا پہلے سے بھی زیادہ قائل ہوچکا تھا اس لیے بغیر کسی حجت کے انہیں یقین دلاتا رہا کہ وہ ان کی ہر بات پر عمل کرے گا۔ وقتِ رخصت ڈاکٹر پرکاش نے اسے باقاعدہ گلے لگا کر رخصت کیا اور بہت خلوص سے بولے۔

''میں چاہتا ہوں تم بہت لمبا جیون پاؤ۔ تم میرے کوئی نہیں ہو لیکن میں اپنے من میں تمہارے لیے بڑا پریم محسوس کرتا ہوں۔ تمہارے اندر بھگوان نے کچھ خاص اٹریکشن رکھی ہے جو لوگوں کو تمہیں چاہنے پر مجبور کرتی ہے۔ میں نے ربن دادا کی تمہارے لیے دیوانگی کو دیکھا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ وہ بھی کوئی رشتہ نہ ہوتے ہوئے تم پر اپنی جان چھڑکتا تھا۔ اب تمہارا بھی کام ہے کہ اپنے اتنے چاہنے والوں کی چاہت کا خیال کرو اور خود کو بے کار خطروں میں ڈالنے کے بجائے لائف کو تھوڑا سیٹل کرنے کی کوشش کرو۔ کیتھرائن کی طرح تم بھی ہندوستان سے چلے جاؤ فاروق! یہاں کی زمین تم پر تنگ ہوچکی ہے اور ضروری نہیں کہ ہر بار بچاؤ کا راستہ نکل آئے۔'' وہ کسی بڑے بھائی کی طرح اسے نصیحتیں کرتے رہے۔ فاروق نے ان کی ہر نصیحت خاموشی سے سنی۔ یہ تو ابھی وہ خود بھی اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ اس کی زندگی کو کن طوفانوں سے دوچار ہونا باقی ہے لیکن اپنے رب کی اس مہربانی پر اس کا دل ضرور گداز ہوا تھا کہ واقعی وہ اس پر اتنا مہربان رہا تھا کہ مشکل ترین حالات میں بھی اس کے لیے راہیں نکال دیتا تھا اور لوگوں کے دل اس کے لیے نرم کردیتا تھا۔ یہ دنیا جہاں بھائی بھائی کا گلا کاٹ دیتا تھا، اس دنیا میں اگر اسے اغیار سے بھی محبتیں ملتی تھیں تو یہ رب کی طرف سے خصوصی انعام کے سوا کیا تھا۔

☆☆☆

''چاند بانو بہت نیک سیرت لڑکی ہے۔ ہمیں اسے دیکھ کر حیرت اور خوشی دونوں ہوتی ہے۔ اتنی کم عمری میں ایسی عبادت گزاری پہلی بار ہمارے مشاہدے میں آرہی ہے۔ اس پر سے وہ خدمت گزار بھی بہت ہے۔ روزانہ ہی اس کے ہاتھوں سے بنا کوئی نہ کوئی پکوان کھانے کو مل جاتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ پھپھی جان کا بھی خیال رکھتی ہے۔ ہم نے محسوس کیا ہے کہ اس کی آمد کے بعد سے پھپھی جان کی صحت پر اچھا اثر پڑا ہے اور وہ پہلے جتنی مایوس اور آزردہ دکھائی نہیں دیتیں۔'' رات کے کھانے کے بعد اسد اللہ مطالعے کے عادی تھے۔ حویلی میں موجود کتابوں کا بیش بہا خزانہ تو لگنے والی آگ میں ہی جل کر راکھ ہوگیا تھا لیکن کتابوں کے دلدادہ اسد اللہ نے سکون میسر آتے ہی یہاں بھی کتابیں جمع کرنا شروع کردی تھیں اور ایک چھوٹی سی لائبریری تشکیل دینے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ دورانِ مطالعہ وہ چائے ضرور پیتے تھے۔ عموماً ملازم ہی انہیں چائے پیش کرتا تھا لیکن کبھی کبھار جولیٹ بھی ان کے لیے چائے لے جاتی تھی۔ آج بھی وہ خود ان کے لیے چائے لے کر آئی تھی۔ ساتھ ایک کپ اپنے لیے بھی تھا جسے دیکھ کر اسد اللہ سمجھ گئے کہ وہ ان سے گفتگو کی خواہش مند ہے چنانچہ خود ہی اسے اپنے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھنے کی دعوت دے ڈالی اور اِدھر اُدھر کی گفتگو کرتے ہوئے بات چاند بانو تک آ پہنچی تو انہوں نے کھل کر اس کی تعریف کی۔

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں پاپا! میں نے بھی محسوس کیا ہے کہ اس کے آنے سے ہمارے گھر کے ماحول پر اچھا اثر پڑا ہے اور وہ، وہ سارے کام کررہی ہے جو ایک بیٹی کی حیثیت سے مجھے کرنے چاہیے تھے۔'' جولیٹ نے اعتراف کیا۔

''ہمارے کہنے کا یہ مقصد نہیں تھا بیٹی! ہم چاند بانو کی خدمت کے معترف ہیں لیکن ہمیں آپ کی ذات سے بھی کوئی شکوہ نہیں ہے۔ ہم زندگی کا اچھا خاصا تجربہ رکھتے ہیں اور ہمیں معلوم ہے کہ دنیا میں ہر شخص مختلف صلاحیتوں اور مزاج کا حامل ہوتا ہے اور اسی حساب سے اس کا دائرۂ کار بھی ہوتا ہے۔ ہم آپ کو گھر میں قید کرکے مکمل طور پر گھریلو امور میں الجھانے کی غلطی نہیں کرسکتے۔ ہمیں معلوم ہے کہ ایسا کرنے سے نہ صرف آپ کی صلاحیتوں کا زیاں ہوگا بلکہ آپ گھٹن کا شکار بھی ہوجائیں گی۔ ہم آپ کے لیے مختلف انداز سے سوچتے ہیں۔ ہماری ذاتی رائے یہ ہے کہ آپ

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

اپنے حالیہ تجربات و مشاہدات کو اپنی ڈائری میں نوٹ کرتی جائیں اور پھر ان کی روشنی میں کوئی عمدہ سی کتاب لکھیں۔ ہم خود اس کتاب کی اشاعت کا انتظام کریں گے۔ آپ نے صحافت کی تعلیم حاصل کی ہے۔ آپ لکھنے کی بہترین صلاحیت رکھتی ہیں تو آپ کو اپنی اس صلاحیت کا بھرپور استعمال کرنا چاہیے۔ آج کل آپ اخبارات میں جو چند ایک کالم وغیرہ لکھ رہی ہیں، وہ ہماری نظر سے گزرے ہیں اور اپنے طویل مطالعے کی وجہ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ آپ میں ایک کالم نگار کے علاوہ مصنفہ بننے کی بھی پوری پوری صلاحیت موجود ہے۔ آپ کو اپنی اس صلاحیت کو ضائع کرنے کے بجائے اس کا بھرپور استعمال کرنا چاہیے۔ ابھی آپ کو اس طرح کے کاموں کے لیے فرصت بھی میسر ہے۔ آنے والے وقت میں جب انشاء اللہ آپ کی اپنی گرہستی ہوگی تو بہت کچھ میسر ہوتے ہوئے بھی آپ خود کو عدیم الفرصت پائیں گی۔ ہمارے ہاں کی خواتین خواہ کتنی بھی تعلیم یافتہ اور پیشہ ورانہ صلاحیتوں کی مالک ہوں، گھر کو اپنی ذات سے بالکل منہا نہیں کرسکتیں۔ گھر کی کشش ان کے بہت سے عزائم اور ارادوں کی راہ میں حائل ہوجاتی ہے اس لیے بہتر ہے کہ آپ اپنے آج کو بہتر طور پر استعمال کرلیں۔''

اسد اللہ نے اس کی بات کے جواب میں بہت تفصیل سے اپنے خیالات و خواہشات سے آگاہ کیا۔ وہ سن کر کچھ دیر کے لیے تو ساکت ہی رہ گئی۔ اس کے دل میں انتقام کی آگ آج بھی نہیں بجھی تھی اور بار بار یہ خیال آتا تھا کہ اسے دلدار آغا سے اپنے ساتھ کیے ظلم کا بدلہ لینا ہے لیکن اپنے انتقامی جذبے کی تسکین کے بعد وہ اپنے باپ کے خوابوں کی تکمیل کیسے کرپاتی۔ انتقام کی راہ پر چلنے والے خود بھی شعلوں کی زد میں آجایا کرتے ہیں۔ اس سے یہ حقیقت چھپی ہوئی نہیں تھی، ایسے میں وہ اپنے باپ کے خواب اور خواہشیں پوری کرنے کی لائق کہاں رہ پاتی... لیکن کیا وہ ایک ایسے شخص کو جو ہمیشہ تشنہ آرزو رہا تھا، ایک بار پھر مایوسی اور دکھوں کے حوالے کرسکتی تھی؟ وہ جنہوں نے زندگی سے کبھی کوئی بڑی خوشی نہیں پائی تھی، کیا عمر کے اس حصے میں اپنی اولاد کے حوالے سے بھی کوئی خوشی، پانے کے حق دار نہیں تھے؟ ایک عجیب سی جنگ تھی جو اس کے دل و دماغ میں چھڑ گئی تھی اور اسد اللہ اس کی کیفیت سے بے خبر کہے جارہے تھے۔

''محب اللہ کے زندہ ہونے کی خبر نے ہمیں بہت پُرامید کردیا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ایک نہ ایک دن ہمارا ان سے رابطہ ہوجائے گا اور وہ واپس اپنوں کے درمیان آجائیں گے۔ وہ دن ہمارے اور بھائی جان دونوں کے لیے بے تحاشا خوشی کا دن ہوگا۔ ہماری خواہش ہے کہ ہم آپ کو اپنے پیارے بھتیجے کے ساتھ منسلک کریں لیکن ہماری طرف سے کوئی جبر یا زبردستی نہیں ہے۔ ہم اپنی خواہش کو آپ کی خوشی پر ترجیح نہیں دیں گے۔ بس یہ درخواست کریں گے کہ اپنی زندگی کے لیے کوئی فیصلہ کرتے ہوئے ہماری خواہش کو بھی مدنظر رکھیے گا۔ محب اللہ نے بے شک اپنی زندگی کے بہت سے ماہ و سال ایک بالکل مختلف ماحول میں گزارے ہیں لیکن وہ ہمارا خون ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ انہوں نے کیچڑ میں رہ کر بھی کنول کی سی زندگی گزاری ہوگی۔ کچھ کمی بیشی رہ بھی گئی ہوگی تو وہ اپنے ماحول میں واپس آکر دور ہوجائے گی۔'' خوابوں اور خواہشوں کا ایک سلسلہ تھا جس کے بوجھ سے جولیٹ دبی جارہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ اسد اللہ اور صفی اللہ جنہوں نے اپنا پورا خاندان گنوا دیا تھا، کیا اتنا حق نہیں رکھتے تھے کہ اپنی نسل کے باقی بچ جانے والے دو افراد کے لیے کوئی خواب دیکھ پاتے؟

''ہم آپ پر محب اللہ کی واپسی کے لامتناہی انتظار کا بوجھ نہیں ڈالیں گے بس کچھ عرصہ ان کا انتظار کرلینا چاہتے ہیں۔ کیا خبر ہماری دعائیں رنگ لے آئیں اور وہ واپس لوٹ آئیں۔'' ان کے لہجے میں امید ہی امید تھی اور فاروق کا سامنا ہونے سے ہمیشہ خائف رہنے والی جولیٹ یہ بھی نہیں سوچ سکتی تھی کہ وہ اپنی امیدوں میں ناکام و نامراد رہ جائیں۔

''اتنی دیر سے ہم اکیلے ہی بات کیے جارہے ہیں اور آپ بالکل خاموش ہیں۔ کیا ہماری اتنی ساری خواہشوں نے آپ کو پریشان کردیا ہے؟'' آخر کار اسد اللہ نے اس کی خاموشی کو محسوس کرلیا اور تھوڑا سا پریشان ہوکر پوچھنے لگے۔ جواب میں جولیٹ نے نفی میں سر ہلایا اور خود کو سنبھال کر دھیرے سے مسکراتے ہوئے بولی۔

''میں سوچ رہی تھی، میرے کیریئر اور فیوچر پر اتنا سوچنے والے میرے پاپا نے کیا میری ذات سے وابستہ ایک اہم ترین مسئلے پر کچھ نہیں سوچا ہوگا۔''

''ہم سمجھے نہیں۔'' اس کی مبہم بات پر اسد اللہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''کیا آپ نے میرے ریلیجن (مذہب) کے متعلق کبھی کچھ نہیں سوچا؟ آپ کا دل تو چاہتا ہوگا کہ آپ کی بیٹی آپ کے مذہب پر چلے۔'' اس نے اپنی بات واضح کی تو اسد اللہ ایک گہرا سانس لے کر متانت سے بولے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

''ہم اپنی کسی بھی خواہش کو زندگی کے کسی بھی معاملے میں آپ پر جبراً نافذ نہیں کرنا چاہتے۔ ہمیں اعتراف ہے کہ اور بہت سی خواہشوں کی طرح ہمارے دل میں یہ خواہش بھی موجود ہے لیکن ہم آپ پر کوئی زبردستی نہیں کرنا چاہتے۔ ہماری خواہشات اپنی جگہ لیکن مذہب سمیت ہر طرح کے انتخاب کے لیے ہماری طرف سے آپ کو مکمل آزادی حاصل ہوگی۔''

''تھینک یو سو مچ پاپا۔ آپ کی اسی وسیع النظری نے آپ کی ذات کو میرے لیے آئیڈیل بنا دیا ہے اور میں اپنے آئیڈیل پاپا کو اپنی ذات سے فوری طور پر ایک خوشی دینا چاہتی ہوں۔'' جولیٹ کی آواز میں ہلکی سی کھنک آ گئی۔

''کیسی خوشی؟'' بہت متین و سنجیدہ ہونے کے باوجود اسد اللہ کی بے چینی زبان پر آ گئی۔

''میں اسلام قبول کرنا چاہتی ہوں پاپا! میں مسلمان ہونا چاہتی ہوں۔'' جولیٹ نے واقعی انہیں عظیم خوشی سے نوازا۔

''کیا واقعی؟'' اسد اللہ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکے اور اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے۔

''جی پاپا! میں حویلی میں آمد کے بعد سے اسلام کا مطالعہ کر رہی ہوں۔ مجھے اسلام اچھا لگا ہے اور خصوصاً چاند بانو سے ملنے کے بعد تو میں بہت زیادہ متاثر ہوئی ہوں۔ اتنے دکھوں اور تکالیف کے باوجود اتنی کم عمری میں وہ صرف اس لیے اتنی کمپوزڈ ہے کہ وہ مسلمان ہے اور اس نے اپنے مذہب میں اپنے لیے سکون کی راہ ڈھونڈ لی ہے۔ میں بھی اپنے لیے سکون چاہتی ہوں اور یقین جانیے اس فیصلے نے مجھے بہت سکون عطا کیا ہے۔'' جولیٹ نے انہیں یقین دلایا۔

''ہم آپ کے اس فیصلے سے بہت خوش ہیں بیٹی لیکن اتنا مشورہ ضرور دیں گے کہ جذباتی ہو کر کوئی فیصلہ نہ کریں۔ مذہب کی تبدیلی کوئی معمولی فیصلہ نہیں ہے۔'' اسد اللہ نے اپنی جذباتی کیفیت پر قابو پا لیا تھا اور اب رسان سے اسے سمجھا رہے تھے۔

''یہ جذباتی فیصلہ نہیں ہے پاپا! اگر مجھے جذبات میں آ کر ہی فیصلہ کرنا ہوتا تو اتنا ٹائم نہیں لیتی۔ میں نے اسلام کے مطالعے کے بعد ہی یہ فیصلہ کیا ہے۔ ویسے بھی میرے لیے تبدیلیٔ مذہب اس لیے اتنا مشکل فیصلہ نہیں ہے کہ میں بھی عیسائیت پر بہت زیادہ کاربند نہیں رہی ہوں۔ مام نے میری تربیت کرتے ہوئے کبھی مذہب پر زیادہ زور نہیں دیا اور شاید ایسا اس لیے تھا کہ وہ خود بھی چاہتی تھیں کہ میں وقت آنے پر اپنے باپ کے مذہب کا انتخاب کر سکوں۔'' جولیٹ نے انہیں اطمینان دلایا۔

''ہاں..... وہ ایسا ہی چاہتی ہوگی۔'' اسد اللہ کے سینے سے ایک سرد آہ نکلی۔ انہیں یاد تھا کہ جوزفین کبھی کبھار اسلام کی طرف اپنے جھکاؤ کا اظہار کیا کرتی تھی۔ اسے موقع ملتا تو شاید وہ اسلام قبول کر لیتی لیکن بعد میں جوزف کے ساتھ نے اسے اس بارے میں سوچنے نہیں دیا ہوگا اور بیٹی کی پرورش کرتے ہوئے اس نے شعوری طور پر اسے مسیحیت کی طرف زیادہ راغب کرنے کی کوشش نہیں کی ہوگی۔ وہ جوزفین تھی..... ان پر مرمٹنے والی جوزفین جس نے ان سے اپنی محبت کو بساط بھر نبھایا تھا اور اب ایک بار پھر انہیں قرض دار کر گئی تھی۔ ان کی بیٹی اتنی آسانی سے ان کا مذہب اپنانے کے لیے راضی ہو گئی تھی تو کیا یہ جوزفین کا ان پر احسان نہیں تھا؟

☆☆☆

''آپ ٹھیک تو ہیں ڈاکٹر پرکاش! میں نے آپ کی اور آپ کی فیملی کی خیریت معلوم کرنے کے لیے فون کیا تھا۔'' ستار بھائی کے ٹھکانے پر بیٹھا فاروق ڈاکٹر پرکاش سے فون پر بات کر رہا تھا۔ ان سے جدا ہونے سے پہلے وہ ان کے گھر کا ٹیلیفون نمبر لے کر آیا تھا۔

''سب ٹھیک ہے بھائی! تم اتنے پریشان کیوں ہو؟'' ڈاکٹر پرکاش ہنسے۔

''مجھے خدشہ تھا کہ پولیس والے بعد میں آپ لوگوں کو تنگ کریں گے اس لیے آپ کی طرف سے پریشان تھا۔'' اس نے وجہ بتائی۔

''تمہارا خدشہ غلط نہیں تھا۔ پتاجی کا وہ اسٹوڈنٹ پولیس والا دوبارہ گھر پر آیا تھا۔''

''پھر.....؟'' ڈاکٹر پرکاش کی دی اطلاع سن کر فاروق مضطرب ہوا۔

''اس نے پتاجی کو بتایا کہ اسے تم پر شک ہو گیا تھا کہ تم ہی اس کے مفرور مجرم ہو لیکن وہ جان بوجھ کر انجان بن گیا۔''

''وہ کیوں؟'' فاروق کو حیرت ہوئی۔

''ایک تو پتاجی کا اسٹوڈنٹ ہونے کی وجہ سے، دوسرے راٹھور سے اپنی ذاتی نفرت کی وجہ سے..... رادھے نام ہے اس شخص کا۔ پتاجی کو بہت زیادہ آئیڈیالائز کرتا ہے اس لیے خود بھی بڑا آنسٹ بندہ ہے اور اپنی جاب بڑی ایمانداری سے کرتا ہے۔ اسے راٹھور کے کردار کا پتا

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

تھا کہ وہ اپنے عہدے سے فائدہ اٹھا کر مسلمانوں کے ساتھ کتنی زیادتی کررہا ہے۔ خود اس نے راٹھور کی بدمعاشی کا تجربہ کیا ہوا ہے۔ اس نے ایک پڑوسی مسلمان خاندان کو اپنے گھر میں پناہ دی ہوئی تھی۔ برسوں کے ساتھ کی وجہ سے ہندو مسلم کا فرق اتنا نہیں رہا تھا اور دونوں خاندانوں میں بہت پریم تھا۔ راٹھور کو کسی طرح اس بات کا پتا چل گیا۔ رادھے اپنی ڈیوٹی پر تھا جب اس نے اس کے گھر پر سادہ لباس میں پولیس والوں کو بھجوا کر زبردستی اس خاندان کو وہاں سے نکال کر انہیں قتل کروا دیا۔ رادھے کے گھر پر اس وقت صرف اس کے بیوی بچے تھے جو کچھ نہیں کرسکے لیکن دہشت نے ان پر اتنا اثر ڈالا کہ رادھے کا چھوٹا بیٹا ابھی تک صدمے کی کیفیت میں ہے اور راتوں کو ڈر کر نیند میں سے چیخ کر اٹھ بیٹھتا ہے۔ ایک طرف اپنے مظلوم پڑوسیوں کی ہلاکت، دوسری طرف بچے کی حالت نے رادھے کو بہت رنجیدہ کررکھا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ یہ سب راٹھور نے کروایا ہے لیکن اس کے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا۔ ہوتا بھی تو راٹھور کو جن لوگوں کا آشیرباد حاصل تھا، وہ اس کے خلاف کوئی کیس چلنے ہی نہیں دیتے اس لیے رادھے کو خاموش ہوکر بیٹھنا پڑا لیکن جب راٹھور مرا تو یقیناً اسے اچھا لگا کہ ایک ظالم اور بے ایمان آدمی سے پولیس ڈیپارٹمنٹ کو مکتی مل گئی اور اسی لیے اس نے سمجھ لینے کے باوجود اپنے ساتھیوں پر تمہارے حوالے سے کسی شک کا اظہار نہیں کیا۔ اس نے پتاجی سے کہا کہ اگر اس شخص نے آپ کے علاوہ کسی اور کے گھر میں پناہ لی ہوئی ہوتی تو شاید میں اپنی ڈیوٹی پوری کرتے ہوئے اسے اریسٹ کرلیتا لیکن میں نے سوچا کہ آپ نے اسے پناہ دی ہے تو کوئی کارن ہوگا اور میں وہی کارن معلوم کرنے آیا ہوں۔ پتاجی نے اسے تمہارے بارے میں ساری ڈیٹیل بتادی۔ وہ سب سن کر بولا کہ اچھا ہوا میں نے اس بندے کو اریسٹ نہیں کیا۔ اسے جب یہ پتا چلا کہ تم وہاں سے نکل گئے ہو تو اور بھی خوش ہوا اور پتاجی کو وچن دیا کہ کبھی اس بارے میں کسی کے سامنے زبان نہیں کھولے گا۔ یوں جناب فاروق صاحب تم ایک بار پھر اپنی گڈلک کی وجہ سے بچ نکلے۔''

ڈاکٹر پرکاش اسے ساری تفصیل سنا کر آخر میں ہلکے پھلکے انداز میں بولے تو فاروق ہنس دیا لیکن ہنستے ہوئے بھی اسے احساس تھا کہ ڈاکٹر پرکاش بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں اور وہ واقعی اپنی خوش قسمتی کی وجہ سے ایک بار پھر بچ گیا ہے۔ گفتگو کے اختتام پر ڈاکٹر پرکاش نے اس کی طبیعت کی بابت چند سوالات کیے اور پھر دوائیں پابندی سے کھانے کی ہدایت کرتے ہوئے رابطہ منقطع کردیا۔ وہ ڈاکٹر پرکاش سے بات کرکے فارغ ہوا تو پتا چلا کہ ستار بھائی واپس آگیا ہے اور اسے ملاقات کے لیے بلا رہا ہے۔ اسپتال سے یہاں پہنچنے کے بعد اس کی ستار بھائی سے ملاقات نہیں ہوسکی تھی۔ وہ اڈے پر موجود نہیں تھا اور رات بھر واپس نہیں آیا تھا۔ اس کے آدمیوں کے مطابق یہ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ ستار بھائی اپنی مصروفیات کی بنا پر یا کسی ذاتی وجہ سے بھی اڈے سے غائب ہوجاتا تھا اور کس کی مجال تھی کہ وہ اس کے غائب ہونے کی وجہ پوچھ پاتا اس لیے فاروق کو مشورہ دیا گیا کہ وہ آرام سے سوجائے، ستار بھائی واپس آنے کے بعد خود اس سے ملاقات کرلے گا۔ بے چینی کے باوجود فاروق کے پاس انتظار کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ صبح ناشتے کے بعد بھی ستار بھائی کی آمد کی کوئی اطلاع نہیں تھی۔ اسے خیال آیا کہ ڈاکٹر پرکاش سے ان کی خیریت معلوم کرلے چنانچہ انہیں فون کرکے فارغ ہی ہوا تھا کہ ستار بھائی کی واپسی کی اطلاع کے ساتھ ہی اپنے لیے بلاوا بھی مل گیا۔

''آجاؤ میرے شیر! تم نے تو دل خوش کردیا۔'' وہ ستار بھائی کے ملاقاتی کمرے میں پہنچا تو اس نے کھڑے ہوکر خوش دلی سے اس کا استقبال کیا اور جوش میں اسے گلے بھی لگالیا۔

''مجھے افسوس ہے ستار بھائی کہ خیرو اور آپ کے دوسرے ساتھی اس مہم میں جان سے چلے گئے۔ وہ لوگ اتنی بہادری اور جانبازی سے کام نہ لیتے تو میں کبھی اپنا کام انجام نہ دے پاتا۔ ان چند آدمیوں نے پولیس فورس کو بڑی کامیابی سے روک کر مجھے راٹھور سے حساب چکتا کرنے کا موقع فراہم کیا تھا۔'' اس نے حقیقی دکھ کے ساتھ ستار بھائی کے آدمیوں کے لیے اپنے افسوس کا اظہار کیا۔

''ہوتا ہے فاروق استاد! ہمارے دھندے میں جان جانا کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔ تم اپنے دل پر کوئی بوجھ نہ لو۔ مجھے خوشی ہے کہ میرے آدمیوں نے میرا بھرم رکھا اور تمہیں کسی شکایت کا موقع نہیں دیا۔'' ستار بھائی نے اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے متانت سے جواب دیا۔

''آپ کے آدمیوں کے ذریعے پولیس آپ تک پہنچنے میں کامیاب نہیں ہوسکی کیا؟'' ستار بھائی کے اشارے پر نشست سنبھالتے ہوئے فاروق نے اس سے دریافت کیا۔

''تم نے ہی تو کہا تھا کہ جانے پہچانے آدمیوں کو تمہارے ساتھ نہ کروں۔ تمہارا یہ مشورہ کام آیا اور پولیس کو

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

کوئی کلیو نہیں ملا۔ تھوڑا اپنے کو بھی دل پتھر کرنا پڑا اور بالکل انجان بن کر بیٹھ گئے۔ پولیس خود ہی ان کے وارثوں کو تلاش کر کے لاشیں ان کے حوالے کردے گی۔ پوچھ گچھ بھی شاید ہو لیکن میرا نام کوئی نہیں لے گا۔'' ستار بھائی پوری طرح مطمئن تھا لیکن فاروق کو عجیب لگا کہ اپنے حکم پر جان قربان کردینے والے اپنے آدمیوں کے لیے ستار بھائی کا یہ انداز ہے۔ اس نے محتاط الفاظ میں اظہار بھی کردیا۔ جواب میں ستار بھائی بولا۔

''دیکھ فاروق استاد! مجھے معلوم ہے کہ ربن دادا اپنے ایک ایک آدمی پر کیسے جان چھڑکتا تھا اور ہر ایک کے لیے کتنا جذباتی تھا لیکن میں ذرا مختلف مزاج کا آدمی ہوں اور اپنے جذبات پر قابو رکھ کر کام کرنے کا طریقہ جانتا ہوں، اسی لیے ربن سے کم صلاحیتیں رکھنے کے باوجود اس سے زیادہ کامیاب ہوں اور میری پہنچ بہت اوپر تک ہے۔ جو لوگ مرگئے وہ مرگئے، اب انہیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑنے والا کہ میں ان سے اپنے تعلق کو تسلیم کروں یا نہ کروں۔ اب اصل اہمیت اس بات کی ہے کہ میں تمہیں، اپنے آدمیوں کو اور خود کو بچاؤں سو میں یہ کام کررہا ہوں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں کوئی بہت خود غرض آدمی ہوں اور مجھے اپنے لیے جان دینے والوں کی کوئی قدر ہی نہیں ہے۔ اگر میں ایسا کرنے والا ہوتا تو میرے حکم پر جان کی بازی کون لگاتا۔ میرے آدمی مجھے جانتے ہیں کہ میں ان کی قدر کس انداز میں کرتا ہوں۔ اب خیر داور اس کے ساتھیوں کے ورثاء کی ذمے داری میری ہوگی۔ جانے والی جان کو لوٹانا میرے بس میں نہیں ہے لیکن اس کے علاوہ ان کے خاندانوں کا بالکل اسی طرح خیال رکھا جائے گا جیسا وہ خود اپنی زندگی میں رکھتے تھے۔ ان کے بیوی بچوں کو بھی کوئی تنگی نہیں ہوگی اور اس وقت تک ان کی کفالت کی جائے گی جب تک ان کے بچے اپنے پیروں پر کھڑے نہیں ہوجاتے۔ میرے اڈے کے اس دستور سے یہاں کا ہر آدمی واقف ہے اسی لیے یہ سب بے دھڑک ہوکر میرے لیے کام کرتے ہیں۔'' ستار بھائی نے سنجیدگی سے فاروق کے اعتراض کا جواب دیا تو اسے قائل ہونا پڑا کہ چاہے ستار بھائی کے پاس ربن جیسی اخلاقی اقدار نہیں ہیں لیکن وہ زیادہ عملی آدمی ہے اور دنیا میں اسی طرح کے لوگ کامیاب رہتے ہیں۔

''تم ان ساری باتوں کو جانے دو اور یہ بتاؤ کہ خود اپنے لیے اب کیا چاہتے ہو؟ بمبئی کی زمین پہلے ہی تمہارے لیے تنگ ہوچکی تھی، یہی حال دہلی کا بھی ہے اور شاید ہندوستان کے کسی اور شہر میں بھی تم سکون سے نہ رہ سکو اس لیے اگر تم چاہو تو تمہاری ساتھی لڑکی کی طرح میں تمہارے بھی یہاں سے نکلنے کا انتظام کرسکتا ہوں۔'' اسے خاموش پاکر ستار بھائی نے خود ہی موضوع بدل دیا اور اسے حقائق کی روشنی میں ایک اچھی پیشکش کی۔ فاروق خود بھی جانتا تھا کہ اب اسے ہندوستان چھوڑنا پڑے گا۔ اسے یہ بھی علم تھا کہ دلدار آغا اب کراچی میں ہوتا ہے اور اسے اس شخص کو اس کے انجام تک پہنچانے کے لیے کراچی تک کا سفر کرنا ہی ہوگا لیکن ساتھ ہی اسے یہ بھی معلوم تھا کہ ایک بار وہ ہندوستان سے نکل گیا تو دوبارہ شاید ہی یہاں آنا نصیب ہو اس لیے وہ ہندوستان چھوڑنے سے پہلے ایک بار حیدرآباد کا چکر لگا لینا چاہتا تھا۔

حیدرآباد جانے کی خواہش کے پیچھے ایک وجہ تو وہاں جولیٹ کی موجودگی تھی۔ وہ ایک آخری بار اس کا دیدار کرلینا چاہتا تھا۔ دوسرے خونی رشتوں کی کشش بھی اسے پکار رہی تھی۔ اس کے علم میں جب سے وجے کے ذریعے یہ بات آئی تھی کہ اسد اللہ خود اسے تلاش کرتے ہوئے بمبئی پہنچے تھے، تب سے دل میں ان لوگوں سے ملاقات کی تڑپ سی پیدا ہوگئی تھی لیکن ربن کے قتل کے عظیم صدمے سے گزرتے ہوئے وہ اپنے دل کی اس خواہش کو بھی نظر انداز کرگیا تھا اور اب جبکہ ربن کے قاتل اپنے اپنے انجام کو پہنچ چکے تھے تو دل کی اس خواہش نے ایک بار پھر سر اٹھالیا تھا۔ بہت طویل عرصہ گزر گیا تھا اسے حویلی چھوڑے ہوئے۔ اس مدت میں اس نے زندگی کے بہت سے نشیب و فراز دیکھے تھے۔ وہ جو شیش محل جیسی حویلی کا باسی تھا، بمبئی کی تنگ و تاریک گلیوں میں اپنی زندگی کے شب و روز گزارتا رہا تھا۔ نواب زادہ محب اللہ سے فاروق استاد تک کے سفر نے اس کی زندگی کو یکسر بدل دیا تھا۔

اگرچہ ربن نے اسے بہت ناز و نعم سے رکھا تھا اور حتی الامکان اسے اڈے کے عملی معاملات سے الگ رکھتا تھا لیکن کوٹلے کی کان میں رہ کر آدمی کو کالک تو لگتی ہی ہے۔ وہ بھی فاروق استاد کہلانے لگا تھا۔ سب کا چہیتا اور لاڈلا فاروق استاد جسے وہ لوگ بالکل شہزادوں کی طرح رکھتے تھے لیکن پھر بھی وہ حویلی کی سی شان بان اور جاہ حشم کہاں سے آتا۔ وہاں تو جنبشِ ابرو پر خواہشات پوری ہوتی تھیں اور خدام کی فوج خدمت کے لیے حاضر رہتی تھی۔ سب سے بڑھ کر ایک الگ طرح کا طرزِ زندگی تھا۔ بات چیت، نشست و برخاست، لباس و پوشاک سے لے کر کھانے پینے

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

تک میں ایک خاص قسم کی انفرادیت تھی جو باہر کی دنیا کے لوگوں کو سحر زدہ کر دیتی تھی۔ اس خاص ماحول سے نکل کر بمبئی کے ایک اڈے پر خود کو ایڈجسٹ کرنے میں اس کا اندرون کتنے مراحل سے گزرا تھا، یہ تو وہ خود ہی جانتا تھا۔ اگر اس کے ساتھ ربن سمیت دیگر افراد کا بے تحاشا خلوص نہ ہوتا تو جانے وہ ان مراحل سے کیسے گزرتا۔ ان لوگوں کی محبتوں نے اس کی مشکل کو آسان بنانے میں بہت مدد کی تھی۔ وہ آج بھی ان محبتوں کا قائل اور قرض دار تھا لیکن جبلت سے تو کوئی ذی نفس خود کو آزاد نہیں کر پاتا۔ خونی رشتوں کی کشش اور محبت ایک ایسی اٹل حقیقت ہے جس سے انکار ممکن ہی نہیں ہے۔ ضد، انا، اصول پسندی انسان کے وجود کو کتنا ہی جکڑ لیں، دل اپنوں کی محبت سے آزاد نہیں ہو پاتا۔ اس نے بھی زندگی کے اتنے برس ان بچھڑ جانے والوں کی محبت دل میں محسوس کی تھی اور اب جبکہ وہ زندگی کے ایک نازک دور سے گزر رہا تھا تو وہ ساری محبتیں شدت سے اس پر حملہ آور ہو گئی تھیں۔ اسے خیال آیا تھا کہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے تو بس وہ اس شام سے پہلے ایک بار اپنوں سے مل لینا چاہتا تھا۔ ان اپنوں سے جن کے درمیان کہیں جولیٹ بھی موجود تھی۔ اس کی زندگی کا وہ جز جسے وہ کسی صورت خود سے الگ نہیں کر سکتا تھا لیکن جسے اپنا بنانے پر بھی اسے کوئی اختیار نہیں تھا۔ تو ستار بھائی کے ہندوستان سے نکل جانے کے مشورے پر وہ ان سے حیدر آباد جانے کی فرمائش کرنے سے خود کو روک نہیں سکا۔

''حیدر آباد.....'' ستار بھائی اس کی فرمائش سن کر حیرت زدہ رہ گیا۔

''ہاں۔ وہاں میرا گھر ہے۔ ہندوستان چھوڑنے سے پہلے میں ایک بار اپنے گھر والوں سے مل لینا چاہتا ہوں۔'' اس نے ستار بھائی کو سچ بتا دیا۔ اس بار وہ کچھ نہیں کہہ سکا۔ خود بھی آدمی تھا اور آدمی کی فطرت کو سمجھتا تھا کہ جب زندگی میں اتنی بڑی تبدیلی پیش آنے جا رہی ہو تو وہ کس طرح کے ردعمل کا مظاہرہ کرتا ہے۔ فاروق بھی زندگی کے اس موڑ پر جذباتی ہو رہا تھا تو یہ کچھ ایسا غلط نہیں تھا۔ وہ ہمیشہ کے لیے ہندوستان چھوڑنے والا تھا اور اس سے پہلے اپنے گھر والوں سے ملنا چاہتا تھا تو یہ عین انسان کی فطرت کے مطابق تھا۔

☆☆☆

جولیٹ کی زندگی میں وہ ایک بالکل نیا اور مختلف دن تھا۔ صبح اٹھنے کے بعد وہ اپنے کمرے سے باہر آئی تو سب سے پہلے چاند بانو نے اسے بہت محبت اور جوش سے گلے لگایا۔

''کیا بات ہے بھئی! کیا آج عید کا دن ہے؟'' جولیٹ نے اس کی گرم جوشی پر تعجب سے پوچھا۔

''عید کا دن ہی سمجھیے۔ جس دن کا آغاز اتنی بڑی خوش خبری سے ہو رہا ہے، اسے کسی طور عید کے دن سے کم نہیں سمجھا جا سکتا۔'' چاند بانو کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

''کیا تمہارے صاحب بہادر کی کوئی خبر ملی ہے؟'' جولیٹ نے اسے چھیڑا۔

''وہ بھی انشاء اللہ مل جائے گی۔ ابھی تو ہمیں آپ کے والد صاحب نے ایک خوش خبری سنائی ہے اور ہم اسے سن کر بہت مسرور ہیں۔'' چاند بانو نے اسے جواب دیا تو وہ سمجھ گئی کہ اسد اللہ نے چاند بانو کو اس کے قبولِ اسلام کے فیصلے سے آگاہ کر دیا ہے۔

''شکریہ چاند بانو! تم دعا کرنا کہ میرے اس فیصلے کے اچھے نتائج مرتب ہوں۔''

''انشاء اللہ تعالیٰ ایسا ہی ہوگا۔ فیصلہ اتنا اچھا ہے تو اس کے نتائج کیسے اچھے نہیں نکلیں گے۔'' چاند بانو نے اسے تسلی دی اور ہاتھ تھام کر کھانے کے کمرے کی طرف لے جاتے ہوئے بولی۔ ''چلیں، چل کر ناشتا کر لیں۔ بڑے اور چھوٹے نواب صاحب وہاں آپ کے منتظر ہیں۔''

جولیٹ اس کے ہمراہ کھانے کے کمرے میں پہنچی تو دروازے سے ہی اشتہا انگیز خوشبوؤں کی لپٹیں آ رہی تھیں۔ اسے دیکھتے ہی صفی اللہ اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے۔ جولیٹ نے احتراماً ان کے قریب جا کر انہیں سر جھکا کر آداب کہا تو وہ اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے بے تحاشا دعائیں دینے لگے۔ اپنے لیے اتنی دعائیں سن کر جولیٹ کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ ''رویئے نہیں بیٹی۔ آج اتنے دنوں بعد تو غم کے بادل چھٹے ہیں اور ہم نے کسی خوشی کو محسوس کیا ہے۔ آج ہم آنسوؤں کو اس کوٹھی میں داخلے کی اجازت نہیں دیں گے۔ آج یہاں صرف خوشیاں ہی خوشیاں ہوں گی۔'' صفی اللہ نے اسے ٹوکا تو اس نے فوراً اپنی آنکھوں کو صاف کر ڈالا۔ واقعی آج پہلی بار وہ صفی اللہ کے چہرے پر خوشی کے رنگ دیکھ رہی تھی ورنہ وہ تو غم کی چادر اوڑھے گویا بس اپنی زندگی کے دن پورے کر رہے تھے۔ محب اللہ کے مل جانے کی ہلکی سی آس نہ ہوتی تو شاید وہ زندہ ہی نہ رہتے۔

''آ جایئے بھئی۔ ناشتا آپ لوگوں کا منتظر ہے۔ آج ہماری بیٹی چاند بانو نے بہت خصوصی انتظام کیا ہے۔ انہیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

ان کی محنت پر داد دینے کے لیے زیادہ انتظار کروانا مناسب نہیں ہے۔'' اسد اللہ کی آواز میں بھی آج کھنک سی تھی۔ ہر ایک کو اتنا خوش پاکر خود جولیٹ کے دل کے تاروں نے بھی خوشی کا راگ چھیڑ دیا اور وہ اپنے فیصلے پر خود کو پہلے سے زیادہ مطمئن محسوس کرنے لگی۔ ناشتا بہت خوش گوار ماحول میں کیا گیا۔ چاند بانو کو اس کی محنت پر خوب دل کھول کر داد دی گئی۔ وہ جھینپی جھینپی سی سب کی تعریفیں وصول کرتی رہی۔ ناشتے کے بعد اسد اللہ، جولیٹ سے مخاطب ہوئے اور بولے۔

''آج کے دن آپ گھر پر ہی تشریف رکھیں۔ حسنِ اتفاق سے آج جمعے کا مبارک دن ہے اور ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ جامع مسجد کے خطیب صاحب کے ہاتھ پر آپ کو مشرف بہ اسلام کروانے کا اہتمام کروائیں گے۔''

''جیسی آپ کی مرضی۔'' جولیٹ نے ان کی خواہش کے سامنے سر جھکا دیا۔ ناشتے کے بعد اسد اللہ گھر سے روانہ ہو گئے۔ جولیٹ نے کچھ وقت ندرت جہاں کے کمرے میں گزارا اور انہیں بھی اپنے فیصلے سے آگاہ کیا تو ان کی آنکھیں بھی خوشی سے جگمگانے لگیں۔ جولیٹ نے باقی وقت چاند بانو کے ساتھ گزارا۔ آج اسے احساس ہو رہا تھا کہ چاند بانو کو اپنے گھر لانے کا فیصلہ خود اس کے اپنے حق میں بہت اچھا تھا۔ چاند بانو نے اس کی تنہائی کو بانٹ لیا تھا اور عمر میں کم ہونے کے باوجود اس کے ساتھ کسی بڑی بہن کی سی محبت اور خلوص کے ساتھ پیش آتی تھی۔ اسی کے مشورے پر جولیٹ نے نمازِ جمعہ کا وقت ہونے سے پہلے نہا کر نیا جوڑا پہنا اور اسد اللہ کا انتظار کرنے لگی۔ اسد اللہ گھر آئے تو انہوں نے بھی نمازِ جمعہ کے لیے بالاہتمام تیاری کی اور بتایا کہ خطیب صاحب سے ان کی بات ہوگئی ہے۔ وہ قبل از جماعت جولیٹ کو مشرف بہ اسلام کرنے کے خواہش مند ہیں کیونکہ مسجد میں خواتین کے لیے بھی پردے میں باجماعت نماز کا اہتمام ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ جولیٹ مسلمان ہو کر نماز باجماعت میں شرکت کرے۔

جولیٹ کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا، وہ تو تیار ہی تھی۔ اسد اللہ نے ثروت بیگ کے گھر میں بھی اطلاع کر دی تھی چنانچہ جب وہ لوگ جامع مسجد کی طرف روانہ ہوئے تو ایک گاڑی میں نواب ثروت بیگ کے علاوہ ان کے اہلِ خانہ بھی موجود تھے۔ جامع مسجد پہنچنے پر خطیب صاحب نے پردے کے پیچھے سے پہلے تو جولیٹ سے اس بات کی تصدیق کی کہ وہ بہ رضا و رغبت بغیر کسی جبر کے دائرۂ اسلام میں داخل ہونے کی خواہش مند ہے پھر اسے اسلام کی چند بنیادی تعلیمات سے آگاہ کیا اور پھر کلمہ پڑھایا۔ اس پورے عمل سے فارغ ہونے تک نماز کا وقت خاصا قریب آچکا تھا۔ وہاں موجود خواتین نے جولیٹ کو گلے لگا کر مبارک باد دی اور پھر سب خطبۂ جمعہ سننے کے لیے خاموشی اور احترام کے ساتھ بیٹھ گئیں۔ جولیٹ جسے اسد اللہ کی خواہش پر جمیلہ کا نام دیا گیا تھا، چاند بانو کے ساتھ ایک طرف بیٹھی ہوئی تھی۔ کچھ خواتین نے اس کے گلے میں پھولوں کے ہار بھی ڈالے تھے جو اس نے اپنے ..... گلے سے اتار کر دائیں جانب احتیاط سے رکھ دیے تھے۔ پھولوں کی خوشبو، ماحول کی پاکیزگی اور خطیب صاحب کے پُراثر الفاظ نے مل کر عجیب ہی سماں باندھ رکھا تھا۔ جولیٹ جو اب جمیلہ تھی، ایسا محسوس کر رہی تھی کہ آسمان سے نور کی برسات ہو رہی ہے اور وہ سرتاپا اس برسات میں بھیگتی جا رہی ہے۔ اس نے پورے حضورِ قلب کے ساتھ نماز میں شرکت کی۔ نماز کے بعد اس کے قبولِ اسلام کا اعلان کیا گیا اور مٹھائی تقسیم کی جانے لگی۔

وہ بہت بڑی مسجد تھی اور جمعے کی نماز میں خصوصاً بہت زیادہ نمازی ہوتے تھے۔ اس لیے مٹھائی کی بہت بڑی مقدار کا انتظام کیا گیا تھا۔ بے تحاشا خوش اسد اللہ، صفی اللہ کے ہمراہ کھلے ہوئے چہرے کے ساتھ لوگوں کی مبارک بادیں قبول کر رہے تھے۔ یہاں سے فارغ ہو کر وہ لوگ گھر پہنچے تو معلوم ہوا یہاں بھی خصوصی اہتمام ہے۔ صدقے کے بکرے منگوائے گئے تھے اور آس پڑوس والوں کی دعوت کے علاوہ غریبوں کے لیے لنگر کا بھی انتظام تھا۔ وہ ان بے تحاشا خوشیوں کو دیکھ رہی تھی اور اسے لگ رہا تھا کہ آسمانوں سے اس کے فیصلے کی تائید ہو رہی ہے۔ آج بہت عرصے بعد اس کی زندگی میں وہ دن آیا تھا جب اس کے دل میں نفرت و انتقام کی کوئی لہر نہیں جاگی تھی اور وہ صرف اپنے دل میں اترے سکون کو محسوس کر رہی تھی۔

☆☆☆

یہ وہ کہاں آ گیا تھا؟ یہ بھلا کونسی جگہ تھی؟ وہ جس حویلی کو چھوڑ کر گیا تھا، وہ تو کسی شیش محل کے مانند تھی جہاں خدمت گاروں کی فوج ظفر موج موجزن رہتی تھی اور اب وہاں بس ایک اجڑا ہوا ویرانہ ہی باقی رہ گیا تھا۔ فنِ تعمیر کا شاہکار کہلانے والی حویلی کے جلے ہوئے در و دیوار دیکھ کر دل کو ایک وحشت سی محسوس ہو رہی تھی۔ یہ حالت دیکھ کر اس کا دل چاہا کہ خوب بلند آواز میں سب کو آوازیں دے اور پوچھے کہ اے شیش محل کے رہنے والو..... تم کہاں ہو۔ دیکھو!

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

تمہارے شیش محل کا ایک شہزادہ لوٹ کر تم لوگوں سے ملنے کے لیے آیا ہے لیکن حویلی کی ویرانی نے اسے یہ بھی نہیں کرنے دیا کہ اسے احساس ہوگیا تھا کہ اس ویرانے میں آواز دے کر بھی اسے اپنی آواز کی بازگشت کے سوا کچھ سننے کو نہیں ملے گا۔ ملکی حالات اس کے بھی علم میں تھے، سو کسی بہت بڑی گڑبڑ کے احساس نے اسے نڈھال سا کر دیا اور وہ وہیں سر تھام کر بیٹھ گیا۔ بیٹھے بیٹھے جانے کتنی دیر گزری تھی کہ کسی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے پکارا۔ اس نے سر اٹھا کر پکارنے والے کی طرف دیکھا۔

''کون ہیں میاں آپ اور ایسے ادھر کاہے کو بیٹھے ہیں؟'' عمر رسیدہ شخص نے اس کو متوجہ پا کر اس سے سوال کیا۔

''میں یہاں اس حویلی میں آیا تھا۔ یہ..... یہ نواب سلیم اللہ کی ہی حویلی ہے نا؟'' وہ جیسے خود ہی تذبذب میں پڑ گیا تھا کہ وہ صحیح جگہ پہنچا بھی ہے یا نہیں۔ دل کو اس حویلی کا راستہ گو کہ اتنے برسوں میں بھی بھولا نہیں تھا لیکن اب یہاں کھڑے ہو کر خواہش جاگ رہی تھی کہ کاش کوئی کہہ دے کہ وہ غلط جگہ آ گیا ہے اور یہ تو نواب سلیم اللہ کی حویلی ہے ہی نہیں۔

''ہاؤں میاں! یہ نواب سلیم اللہ کی حویلی اچ ہے، پر آپ بتائے نہیں کہ آپ کون ہیں؟''

مخاطب نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے اس کی خواہش کے برخلاف جواب دیتے ہوئے پوچھا۔

''یہ..... یہ سب کیا ہوا اور یہ حویلی اس حال تک کیسے پہنچی؟'' اس کے سوال کو نظر انداز کر کے فاروق نے اس سے پوچھا۔

''کیا بتائیں میاں! کوئی قیامت سی قیامت تھی جو اس حویلی پر ٹوٹی اور سب کچھ راکھ ہوگیا۔ میں نے برسوں اس حویلی کا نمک کھایا ہوں اور اس کا یہ حال دیکھ کر میرا دل خون کے آنسو روتا ہے پھر بھی روز ادھر کا ایک چکر لگا جاتا ہوں کہ اپنی وفاداری نبھانے کو میرے کنے بس یہی اچ ایک کام باقی رہ گیا ہے۔'' بتانے والے کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

''کیا ہوا تھا؟ کیا بلوائیوں کا حملہ.....؟'' فاروق نے اپنے خدشات کی تصدیق چاہی۔

''ہاؤں۔ ظالم بلوائی سب برباد کر دیے۔ اجاڑ ڈالے اس بھری پُری حویلی کو۔'' اب اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔ ان آنسوؤں کے بیچ وہ پوری داستان سناتا چلا گیا۔

''بڑے اور چھوٹے نواب زادہ صاحب ان حالات سے اتنے دل برداشتہ ہوئے کہ اپنی پھپھی بیگم سمیت پاکستان ہجرت فرما گئے۔ میں بھی ان کے ساتھ اچ جانے کی ضد کرتا لیکن یہاں مالکوں کی قبریں بھی تو ہیں۔ میں رک گیا کہ ان قبروں کی دیکھ بھال کر کے اچ اتنے برسوں سے کھایا حویلی کا نمک حلال کرتا رہوں گا۔'' بلوے کی پوری داستان سنانے کے بعد اس نے فاروق کو موجودہ صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ فاروق کی آنکھوں کے آگے تو زمین و آسمان گھوم گئے۔ وہ اپنے جس خاندان سے ملنے کے لیے آیا تھا، وہ خاندان ہی باقی نہیں رہا تھا..... یہ خبر کسی قیامت سے کم تو نہیں تھی۔

''آپ اپنا بتائیے نہیں میاں کہ آپ کون ہیں؟''

اس کی غیر ہوتی حالت دیکھ کر بوڑھے ملازم نے ایک بار پھر اس کی شکل غور سے دیکھی اور ہمدردی سے پوچھنے لگا۔ فاروق کے شناسا سے نقوش اس کے دل کو بھی بے چین کر رہے تھے اور وہ اس کے چہرے میں حویلی والوں ہی کی سی جھلک واضح طور پر محسوس کر رہا تھا۔

''میں محب اللہ ہوں شمس بابا! آپ کو یاد ہوگا نا کہ آپ بچپن میں مجھے اپنے کاندھوں پر اٹھا کر گھومتے تھے۔'' فاروق کی آواز بھیگ گئی اور اس نے حویلی کے پرانے ملازم کو شناخت کر کے اسے اس کے نام سے پکارا۔

''محب اللہ..... آپ نواب زادہ محب اللہ ہیں؟''

فرطِ مسرت سے بوڑھے شمس کی آواز کانپ گئی۔

''جی ہاں۔ میں بدنصیب محب اللہ ہی ہوں۔''

فاروق نے ایک بار پھر تصدیق کی۔ اس تصدیق کے بعد تو شمس کی حالت دیدنی تھی۔ بوکھلاہٹ میں اسے سجھائی نہیں دیتا تھا کہ فاروق کو پلکوں پر بٹھائے کہ ہتھیلیوں پر سمیٹ لے۔ وہ بہت اصرار اور محبت سے اسے اپنے ساتھ اپنے گھر لے کر گیا۔ اس کی خاطر تواضع کی کوشش کی اور اسے اس کے اصرار پر ایک ایک بات تفصیل سے بتاتا رہا۔ غم کے بوجھ سے نڈھال فاروق کے لیے کچھ کھانا پینا تو ممکن نہیں تھا لیکن وہ باریک بینی سے سارے حالات کا کھوج لگاتا رہا۔ شمس نے اسے ان لوگوں کے متعلق بتایا جن سے اسد اللہ نے اب بھی کسی نہ کسی طرح رابطہ رکھا ہوا تھا اور جن کے ذریعے شمس کو ان کے حالات کی خبر ملتی رہتی تھی۔ فاروق نے سنا لیکن پہلے شہداء کی قبروں پر حاضری کی خواہش ظاہر کی۔ اتنے بڑے صدمے سے گزرتا ہوا وہ ایک بار پھر اپنے اندر شعلے سے بھڑکتے محسوس کر رہا تھا۔ وہی شعلے جو رہن کے قاتلوں کو ان کے انجام سے ہمکنار کرنے کے بعد بجھ گئے

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

تھے، ایک بار پھر بھڑک اٹھے تھے اور بس نہ چلتا تھا کہ اپنے خاندان کی بربادی کے ذمے داروں کو بھی ایسی ہی کسی آگ میں دھکیل دے جیسی آگ نے ہنستی بستی حویلی کو اجاڑ دیا تھا۔ اپنے خون کے رشتوں کے بچھڑنے کے ساتھ ساتھ اسے جولیٹ کی طرف سے بھی تشویش تھی۔ اس کے یقین کے مطابق تو جولیٹ حویلی ہی آئی تھی۔ اسد اللہ کی بمبئی آمد اور جولیٹ ہی کے مکان میں قیام اس کی یہاں آمد کا بین ثبوت تھا لیکن وہ شمس سے جولیٹ کے متعلق کیا اور کیسے پوچھتا۔ اسے تو اندازہ ہی نہیں تھا کہ جولیٹ کس حیثیت سے حویلی میں موجود رہی ہوگی۔ وہ شمس کے ساتھ قبرستان گیا اور اسی کیفیت سے گزرا جس کیفیت سے اسد اللہ گزرے تھے۔ اپنے پیاروں کی قبروں پر نوحہ کناں دل کے ساتھ حاضری دیتے ان ہی قبروں کے درمیان اس ایک کے ہونے اور نہ ہونے کی کشمکش سے گزرنا آسان نہیں تھا جو دل سے بہت قریب تھی اور جس کی حیثیت کسی طور خونی رشتوں سے کم نہیں تھی۔ ماں، بھائی اور بہن کی قبروں پر دعائے مغفرت کرتے ہوئے تو قدرتی طور پر اس کی حالت بہت ابتر ہوگئی۔ وفادار ملازم شمس کا دم غنیمت تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح اسے سہارا دیے ہوئے تھا۔

''مجھے اس رگھو کا اتا پتا بتائیں شمس بابا جس نے ہمارے خاندان کو اجاڑنے میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ میں اس سے جا کر پوچھوں گا کہ اپنے ساتھ ہوئی زیادتی کا بدلہ میرے بے قصور خاندان سے لے کر اتنا بڑا ظلم کیوں کیا؟'' قبرستان سے واپس آتے ہوئے فاروق نے شمس سے کہا۔ شمس نے رگھو نامی اس شخص کے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا جو کبھی نواب سلیم اللہ کے دوست کے بیٹے کے ہاتھوں برباد ہوا تھا اور انتقامی جذبات نے اسے بلوائیوں کے ساتھ ناتا جوڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔ رگھو کی وجہ سے ہی پہلے نواب سلیم اللہ اپنے دوست کے خاندان کے ساتھ شدید زخمی ہونے کے بعد موت سے دوچار ہوئے تھے اور پھر رگھو ہی نے لالچی بلوائیوں کے ساتھ مل کر حویلی پر حملہ کیا تھا۔

''کیا کریں گے میاں آپ اس کا اتا پتا معلوم کر کے...... وہ ظالم تو خود قدرت کے انتقام کا شکار ہو گیا اور آج نشانِ عبرت بن کر پاگل کتے کی طرح حیدرآباد کی گلیوں میں لوٹتا رہتا ہے۔'' شمس نے اسے جواب دیا۔

''کیوں؟ کیا ہوا اسے؟'' فاروق چونکا۔

''اللہ کی لاٹھی نے کام دکھایا ہے۔ سنا ہے کسی بلوے میں حصہ لینے کو گیا تھا، وہیں اچ بری طرح زخمی ہو گیا۔ دونوں بازو کٹ گئے اور ٹانگوں میں ایسے زخم آئے کہ ناسور بن گئے۔ ناکارہ آدمی کو کون ساتھ رکھتا ہے۔ پھینک گئے اس کے ساتھی اسے خاک میں رلنے کو۔ پیروں کے زخموں میں کیڑے پڑ گئے ہیں۔ خود کو ہلا جلا بھی نہیں پاتا۔ نوالہ منہ میں ڈالنے کے لیے ہاتھ سلامت نہیں ہیں۔ کوئی رحم کھا کر کھانے کو کچھ ڈال دے تو جانوروں کی طرح منہ مار کر اس کھانے سے پیٹ کی آگ بجھاتا ہے۔ زخموں سے ایسی بدبو آتی ہے کہ کسی کے اندر اس کے پاس بیٹھ کر اسے کھانا کھلانے کی ہمت نہیں ہے دوسرے اہل حیدرآباد کو اس کے کردار کی وجہ سے اس سے شدید نفرت بھی ہو گئی ہے اس لیے سوائے کھانا ڈال دینے کے کوئی اس کے ساتھ کسی قسم کی ہمدردی بھی نہیں کرتا۔'' شمس نے اسے آگاہ کیا تو وہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ جسے قدرت نے اتنی بڑی سزا دے دی ہو، وہ اس کے ساتھ مزید کیا انتقام لے سکتا تھا۔ حیدرآباد میں مزید رکنا بھی بے سود تھا۔ اس نے اسد اللہ کا پاکستان کا پتا حاصل کیا اور ستار بھائی کو اپنی واپسی کی اطلاع دے کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔

دہلی کے حالات اب کافی بہتر ہو گئے تھے اور شہر میں کرفیو ختم ہو گیا تھا۔ پہلے کی طرح قدم قدم پر پولیس والوں سے سامنا ہونے کا اندیشہ نہ ہونے کے باوجود وہ بہت احتیاط کے ساتھ ستار بھائی کے ٹھکانے پر پہنچا تو وہاں ایک حیرت اس کی منتظر تھی۔ رامو اور وجے اس سے ملنے آئے ہوئے تھے۔ وہ اس کے اپنے تھے، دل پر غم کا بہت سا بوجھ لیے وہ ان سے ملا تو بہت سے آنسو ان کے شانوں پر بہا ڈالے اور اپنے غم کا بوجھ ان کے ساتھ بانٹتے ہوئے پہلی بار انہیں اپنے بارے میں سب کچھ بتا ڈالا۔ وہ سنتے رہے۔ ان کے لیے یہ کوئی اتنے تعجب کی بات نہیں تھی کہ وہ جسے ہمیشہ شہزادہ کہتے رہے اور شہزادوں کی طرح اس کے لاڈ اٹھاتے رہے، وہ سچ مچ ایک بڑے آن بان والے خاندان سے تعلق رکھنے والا نواب زادہ نکلا تھا۔ ربن کے غم کے بعد ایک اور عظیم غم سے گزرتے فاروق کو انہوں نے بہت سلیقے اور محبت سے سمیٹا اور صلاح دی کہ اسے اپنے خاندان والوں کے پاس پاکستان چلا جانا چاہیے۔ رامو بولا۔

''دیکھ شہزادے! تو اپن کی دنیا کا آدمی تھا ہی نہیں۔ تو شیش محل کا باسی تھا جو حالات کے ہاتھوں بھٹک کر ہمارے درمیان پہنچ گیا تھا۔ بھگوان کی کرنی تھی کہ اس نے تیرے من میں ہمارے لیے اور ہمارے من میں تیرے لیے پریم ڈالا۔ ہم نے ایک دوسرے کے ساتھ ایک لمبا سمے.....

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

اپنے ..... دکھ سکھ بانٹتے ہوئے بہت اچھا گزارا اور تیرے سے الگ ہونا ہمارے من کو دکھی کرے گا لیکن تو اپنی دنیا میں، اپنے اصل کے ساتھ عجت (عزت) کی چندگی (زندگی) گزارے گا تو اس سے ہم سب کا من زیادہ خوش رہے گا۔ یہاں تو ویسے بھی اب تیرے لیے حالات بہت خراب ہیں۔ ہمارے بیچ رہے گا تو پولیس والوں کی نظروں میں بھی آجائے گا اور وہ تجھے چھوڑنے والے نہیں۔ تیرے پیچھے بھی انہوں نے اڈے پر بڑی اکھاڑ پچھاڑ کی ہے۔ گیتھی کے تھانے سے فرار کے بعد سالے اڈے پر گرفتاریاں ڈالنے آئے تھے لیکن اپنے پاس سارا بندوبست تھا۔ غلام و چاچا سمیت محلے کے کئی لوگوں نے بولا کہ اس رات اپن اڈے پر ہی تھا۔ اشوک بچن نے بھی قانونی داؤ پیچ کھیلے تو اپنی جان چھوٹی، پر اب وہ پہلے سی بات نہیں رہی جو دادا کے زمانے میں تھی۔ اپن نے ساتھیوں کو دادا کا بھی بتا دیا۔ اپن کی طرح وہ سالے بھی بہت روئے پیٹے لیکن رو کر بھی تو صبر کرنا ہی تھا، سو اپنی موٹی کھال کے ساتھ سب جی رہے ہیں۔ اپن اپنے طور پر اڈا سنبھالنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ادھر مجو والا اڈا نانا کے ساتھ بانٹ لیا ہے۔ مل جل کر کسی نہ کسی طرح گاڑی چل رہی ہے۔ اپن کو تو جیسے تیسے اسی دھندے میں رہنا ہے لیکن تو نکل سکتا ہے اس چکر سے، اس لیے اچھا ہے کہ نکل جا۔''

رامو اسے بہت دیر تک سمجھاتا رہا۔ خود وہ بھی پاکستان جانے کا فیصلہ کر ہی چکا تھا۔ دوستوں کے مشورے نے اس فیصلے پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی اور وہ دل پر بہت سے دکھوں کے بوجھ کے ساتھ تھوڑی سی آس لیے ایک بار پھر ہجرت کے لیے تیار ہو گیا۔ پہلی ہجرت میں اس نے اپنے خونی رشتوں کو چھوڑا تھا اور دوسری ہجرت میں وہ دوبارہ ان رشتوں کی طرف واپس لوٹ رہا تھا۔

☆☆☆

کبھی کبھی ایک فیصلہ انسان کی پوری زندگی کو بدل دیتا ہے۔ جولیٹ کی زندگی بھی بدل گئی تھی اور اب وہ جولیٹ کے بجائے جمیلہ تھی جس کے دن کا آغاز نمازِ فجر سے ہوا تھا۔ نماز اس نے چاند بانو کے ساتھ پڑھی اور پھر تیار ہونے کے لیے دوبارہ اپنے کمرے میں واپس آ گئی تھی۔ جوزفین نے شروع سے اسے بہت قرینے کا لباس پہننے کی عادت ڈالی تھی۔ حویلی میں قیام کے عرصے میں اس نے شلوار قمیص اور دوپٹے کا استعمال شروع کر دیا تھا اور آج جمیلہ کی حیثیت سے اپنے دن کا آغاز کیا تو دوپٹا اوڑھتے ہوئے خود بخود ہی چاند بانو کی طرح اسے نماز کے انداز میں لپیٹ ڈالا۔ اپنا یہ روپ آئینے میں دیکھا تو خود کو بھی بہت اچھا لگا۔ ابھی وہ خود کو آئینے میں دیکھ رہی تھی کہ چاند بانو نے دستک دے کر کمرے میں جھانکا اور اطلاع دی۔

''جمیلہ باجی! لاہور سے آپ کے لیے ٹیلیفون آیا ہے۔'' اطلاع سن کر وہ فوراً گول کمرے کی طرف دوڑی جہاں ٹیلیفون سیٹ رکھا ہوا تھا۔

''السلام علیکم آپی! کیا حال ہے آپ کا؟'' ریسیور اٹھاتے ہی دوسری طرف سے عاکف کی کھنکتی ہوئی آواز سنائی دی۔

''وعلیکم السلام! بہت لمبی عمر ہے تمہاری۔ میں تم لوگوں کو یاد کر ہی رہی تھی اور آج میرا خود کا ارادہ تھا فون کرنے کا۔'' اس نے عاکف کو بتایا اور وہ واقعی آج ان لوگوں کو فون کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ تھوڑے عرصے کی رفاقت میں بیگم آصفہ علی کے خاندان سے اس کی گہری وابستگی ہو گئی تھی اس لیے وہ انہیں اپنے مسلمان ہو جانے کی اطلاع دینا چاہتی تھی۔

''اصل میں خوشی اتنی بڑی تھی کہ میں نے صبح ہونے کا انتظار بھی مشکل ہی سے کیا ہے، آپ کو خوشخبری سنانے کے لیے طبیعت بے چین ہو رہی تھی۔'' عاکف کے لہجے کی کھنک میں اضافہ ہوا۔

''جلدی سے سنا ڈالو کہ کیا خوشخبری ہے پھر میں بھی تمہیں ایک اچھی خبر سناؤں گی۔''

''تو پہلے آپ ہی سنا دیں۔'' عاکف نے اس سے کہا۔

''نہیں، پہلے تم اپنی خوش خبری سناؤ۔ تم نے فون کرنے میں پہل کی ہے۔'' اس نے زور دیا تو عاکف نے بھی خبر سنانے میں دیر نہیں لگائی اور خوشی سے لبریز لہجے میں بتانے لگا۔

''انجلی نے اسلام قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے آپی! اب وہ ہمیشہ یہیں، ہم لوگوں کے ساتھ رہنا چاہتی ہے۔''

''واقعی یہ تو بہت خوشی کی بات ہے۔ تمہیں بہت مبارک ہو عاکف! تمہاری سچی محبت رنگ لے آئی۔'' اس نے دل کی گہرائیوں سے عاکف کو مبارک باد دی۔ وہ گواہ تھی اس کی انجلی کے لیے بے قراری کی۔ کم عمری کی محبت نے عاکف کو بہت اضطراب میں مبتلا کر رکھا تھا اور اس کی سوچ کا محور و مرکز بس انجلی تھی۔ وہ خوف زدہ رہتا تھا کہ کہیں انجلی ان کا گھر چھوڑ کر اپنے رشتے داروں کے پاس بھوپال جانے کا فیصلہ نہ کر لے۔ اب انجلی کے مسلمان ہو جانے کے فیصلے سے اس کے سارے وسوسے اور اندیشے دور ہو گئے

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

ہوں گے۔

''اب آپ سنائیں کہ آپ کے پاس کیا خوش خبری ہے؟''

''میں نے بھی اسلام قبول کرلیا ہے عاکف اور اب میرا نام جمیلہ ہے۔'' اس نے بتایا۔

''امیزنگ..... یہ تو بہت ہی زبردست نیوز ہے۔ میں ابھی امی کو بتاتا ہوں۔'' عاکف سن کر پُرجوش ہوگیا اور فوراً بیگم آصفہ علی کو آوازیں دینے لگا۔ انہوں نے خبر سنی تو مبارک باد کے ساتھ ڈھیروں دعائیں بھی دے ڈالیں۔ ان لوگوں سے بات کرکے سرشاری کیفیت میں اس نے معمول کے مطابق سب کے ساتھ ناشتا کیا۔ چاند بانو بھی ناشتے میں شریک تھی۔ اس کی حیثیت گھر کے فرد کی سی ہوچکی تھی اور اسد اللہ کا حکم تھا کہ وہ کھانے کے اوقات میں لازماً گھر والوں کے ساتھ حاضر رہے۔ وہ بھی بہت خلوص سے اس گھر کا انتظام سنبھال رہی تھی۔ دل کے نہاں خانوں میں دبی ایک گھر کی تمنا اس طرح پوری ہورہی تھی تو اس نے بھی کہیں کوتاہی نہیں کی تھی اور بہت محبت سے اس گھر میں اپنے شب و روز گزار رہی تھی۔ ساتھ ہی مہاجرین کے بچوں کے لیے سویٹر بُننے کا کام بھی کرتی رہتی تھی۔ آج بھی جولیٹ ناشتا کرنے کے بعد کیمپ جانے کے لیے روانہ ہونے لگی تو اس نے اپنے تیار کردہ چار پانچ سویٹر اس کے حوالے کردیے۔

''تم بھی کمال ہو چاند بانو! پتا نہیں کیسے اتنا کچھ کرلیتی ہو۔ اتنی عبادت، گھر کی اتنی ساری ذمے داریاں اور اس پر سے یہ کام۔ تھکتی نہیں ہو کیا اتنا سب کرکے؟'' اس نے بہت محبت سے چاند بانو کو ٹوکا۔

''تھکن کیسی۔ معصوم جانوں کی زندگیاں بچانے کے لیے یہ تھوڑی سی مشقت تو میرے نزدیک عبادت کا درجہ رکھتی ہے اور عبادت سے مجھے تھکن نہیں سکون محسوس ہوتا ہے۔'' چاند بانو نے مسکرا کر اسے جواب دیا۔

''تمہارا یہ سکون ہی تمہاری سب سے بڑی دولت ہے۔ تمہیں دیکھ کر میں سوچتی ہوں کہ وہ شخص کتنا شاندار ہوگا جو تم جیسی عمدہ لڑکی کے دل کا انتخاب ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ کبھی اس شخص سے ملوں اور اسے بتاؤں کہ تم کتنے خوش قسمت انسان ہو کہ چاند بانو جیسی پیاری لڑکی تمہیں اتنا بے تحاشا چاہتی ہے۔'' اس کے لہجے میں چاند بانو کے لیے سچی ستائش تھی۔ چاند بانو اس کی بات سن کر دھیرے سے مسکرائی اور انکساری سے بولی۔

''یہ تو آپ کا حسنِ نظر ہے جو آپ کو ہم میں اتنی خوبیاں نظر آتی ہیں ورنہ ہم تو بہت عام سی لڑکی ہیں۔ ہاں، اُن کی بات الگ ہے۔ وہ بالکل شہزادوں کی سی آن بان رکھتے ہیں۔''

''مجھے تو یہ بھی تمہاری نظر کا کمال لگتا ہے جس نے ایک انسان کو جانے کیا سے کیا بناڈالا ہے۔'' اس نے چاند بانو کو چھیڑا۔

''نظر نہیں، یہ محبت کا کمال ہوتا ہے جو ایک انسان کو دوسرے کے لیے بہت خاص، سب سے منفرد اور اعلیٰ بنا دیتی ہے لیکن یقین جانیے کہ وہ ہیں ہی بہت خاص۔ ان کی خاندانی شرافت اور کردار کی پاکیزگی ان کے ماتھے پر لکھی نظر آتی ہے۔ وہ ان لوگوں میں سے ہیں جنہیں اللہ کی طرف سے ایک خاص کشش عطا کی جاتی ہے اور لوگ خود بخود ہی ان کی محبت میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ ایک صرف ہماری ذات کی ہی بات نہیں ہے ہم نے ان کے اردگرد کے دوسرے افراد کو بھی انہیں بے تحاشا چاہتے ہوئے دیکھا ہے۔'' موضوع گفتگو فاروق تھا تو چاند بانو کی زبان کیونکر خاموش رہ پاتی۔ اس نے بولنا شروع کیا تو بولتی چلی گئی۔

''اوکے بابا! کبھی قسمت نے ملایا تو دیکھیں گے تمہارے صاحب بہادر کی خوبیوں کو، ابھی تو مجھے اجازت دو، مجھے کیمپ پہنچنا ہے۔''

وہ ہنس پڑی اور پھر چاند بانو کو اللہ حافظ کہتی ہوئی گھر سے روانہ ہوگئی۔ اسد اللہ اس سے پہلے ہی روانہ ہوچکے تھے۔ صفی اللہ کی دنیا تو تھی ہی ان کے کمرے تک محدود۔ کھانے کے اوقات میں بھی وہ محض اسد اللہ کے خیال سے ہی باہر نکلتے تھے البتہ کچھ روز سے ان کے معمولات میں یہ فرق آیا تھا کہ وہ عبادت کی طرف زیادہ مائل ہوگئے تھے اور پنج وقتہ نماز کے علاوہ بھی نفلی نمازیں پڑھ کر بچھڑے ہوئے بیٹے کی واپسی کی دعائیں مانگتے رہتے تھے۔ جولی کا خیال تھا کہ ان کی اس تبدیلی میں بھی چاند بانو ہی کا کردار ہے۔ اس سے متاثر ہوکر ہی وہ اس طرف راغب ہوئے ہیں۔ بہرحال جو بھی تھا، اچھا تھا۔ جیسے وہ بھی جمیلہ بن کر بھی جولی کہلاتی تھی۔ اسد اللہ نے اسے بتایا تھا کہ انہوں نے اس کے لیے جمیلہ نام اس لیے منتخب کیا تھا کہ اس کا نک نیم تبدیل نہ ہو۔ جمیلہ سے جولی پکارنا بھی برا نہیں لگتا تھا۔ کیمپ میں بھی اس نے اپنی تبدیلیِ مذہب سے سب کو آگاہ کردیا تھا اور بتادیا تھا کہ اب اسے جولیٹ کے بجائے جمیلہ اسد اللہ کہہ کر پکارا جائے۔ زیادہ تر لوگوں نے اس کے فیصلے پر خوشی کا اظہار کیا تھا، کچھ طنزیہ نظروں سے بھی دیکھتے رہے تھے لیکن اسے کسی کی پروا نہیں تھی۔ وہ یہاں کام کرنے آئی تھی

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

اور کر رہی تھی۔ اس وقت بھی اس نے کچھ ضروری دفتری کام انجام دیا اور انتظامی امور کا جائزہ لینے کے خیال سے باہر نکلی۔ باہر نکلتے ہی اس کی قادر شاہ سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ ماجدہ کے غیاب کے بعد سے وہ اسے نظر نہیں آیا تھا۔ آج نظر آیا تو برداشت نہیں ہوا اور اس کے سر پر جا پہنچی۔ قادر شاہ اسے دیکھ کر مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوا طنزیہ انداز میں مسکرایا۔

''ماجدہ کہاں ہے؟'' قادر شاہ کی مسکراہٹ نے اس کے تن بدن میں آگ لگا دی اور اس نے سخت لہجے میں دریافت کیا۔

''اتنے غصے سے کیوں بات کرتی ہیں میڈم..... آپ کی طرح ہم بھی سوشل ورکر ہیں۔'' اس نے لفظوں پر زور دیتے ہوئے مضحکہ اڑانے والے انداز میں جواب دیا۔

''لعنت ہے تم جیسے آدمی پر جو سوشل ورک کے نام پر دلالی کرتا پھرتا ہے۔'' اس کا غصہ اور بھی سوا ہوگیا۔

''آپ مانو نہ مانو، دلالی بھی سوشل ورک ہے۔ بے چاری غریب بے آسرا لڑکیوں کو ہم دلالوں کی وجہ سے روٹی، کپڑا اور ٹھکانا مل جاتا ہے اور کسی ''ضرورت مند'' کی ضرورت پوری ہوجاتی ہے۔'' اس کی ڈھٹائی کی انتہا تھی کہ وہ اپنے مکروہ دھندے سے انکار کرنے کے بجائے اس کے حق میں دلائل دے رہا تھا۔

''ضرورت مند..... تم عیاشوں کو ان کی عیاشی کا سامان فراہم کرنے کے لیے مجبور لڑکیوں کو غلاظت میں دھکیل دیتے ہو اور ان ہوس پرستوں کو ضرورت مند قرار دے رہے ہو۔'' اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ قادر شاہ کا منہ تھپڑوں سے سرخ کردے لیکن پھر اس نے خود پر قابو پایا اور ذرا معتدل لہجے میں پوچھنے لگی۔

''ماجدہ کہاں ہے؟ مجھے اس کا پتا بتاؤ۔''

''چھوڑو جی! آپ اس کا پتا ٹھکانا معلوم کر کے کیا کریں گی۔ ایک کو یہاں سے نکال کر لے گئی ہیں، کافی ہے۔ زیادہ..... کا مجمع لگایا اپنی کوٹھی پر تو لوگ کہیں گے نواب صاحب نے چکلا کھول لیا ہے۔'' قادر شاہ خباثت سے ہنس کر بولا تو وہ اپنی جگہ تاؤ کھا کر رہ گئی۔ حقیقتاً وہ خود بھی ماجدہ کو فوری طور پر کوٹھی لے جانے کا فیصلہ اسی لیے نہیں کر پائی تھی کہ اس کی بدنامی اسد اللہ کی نیک نامی کے لیے داغ نہ بن جائے۔ چاند بانو کا معاملہ مختلف تھا۔ اس کے اندر خیر کی خواہش تھی اور وہ مشکل حالات میں بھی عزت کی زندگی جینے کی جدوجہد کر رہی تھی جبکہ ماجدہ نے گندگی کو اپنا نصیب سمجھ کر قبول کرلیا تھا اور آسائشات کے حصول کے لیے اپنے تئیں ایک آسان راہ ڈھونڈ لی تھی۔

عارف کی خودکشی کے بعد اس کے اندر کچھ بدلاؤ نظر آرہا تھا اور اس نے سوچا تھا کہ ماجدہ صدمے کی کیفیت سے نکل آئے تو اس کے لیے کوئی مناسب انتظام کردے گی لیکن اس کے کچھ کرنے سے پہلے ہی قادر شاہ کا داؤ چل گیا اور وہ ماجدہ کو لے اڑا۔

''آپ ماجدہ کی فکر چھوڑ دیں میڈم! وہ مزے میں ہے اور بہت بڑے آدمی کے گھر عیش سے رہ رہی ہے۔ اس نے بس نکاح نہیں پڑھایا، باقی ماجدہ پورے بیوی والے مزے کر رہی ہے۔ اس بے چارے کی اپنی بیوی تو کسی کام کی نہیں ہے۔ سنا ہے بیمار ہے اور بستر پر ہی پڑی رہتی ہے۔ کچھ لوگ یہ بھی بولتے ہیں کہ پاگل شاگل ہوگئی ہے اس لیے میاں کمرے میں بند کر کے رکھتا ہے۔ اب جو بھی بات ہو، آدمی کو عورت کی ضرورت تو ہے نا اور میں نے ماجدہ کو وہاں پہنچا کر اس کی ضرورت پوری کردی تو کیا برا کیا۔ یہی تو سوشل ورک ہے۔'' قادر شاہ نے مستقل اس کے ساتھ تمسخرانہ انداز اختیار کر رکھا تھا۔

''کون ہے وہ آدمی! مجھے اس کا نام بتاؤ؟'' اس نے قادر شاہ کے انداز کو نظر انداز کر کے بہت ضبط سے پوچھا۔

''اس آدمی کا نام جان کر آپ کیا کرلیں گی میڈم! وہاں آپ کا زور نہیں چلنے والا۔ وہ آپ کے باپ کی عمر کا آدمی ہے بلکہ ان سے زیادہ حیثیت رکھتا ہے۔ نواب صاحب تو لٹ پٹ کر آئے ہیں اور کلیم بھر بھر کر اپنا کام چلا رہے ہیں، اس کا تو یہاں بڑا کاروبار چل رہا ہے اور بہت بڑے بڑے لوگوں سے تعلقات ہیں۔ آپ بہت زور لگا کر بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ پائیں گی۔'' قادر شاہ کا انداز بدستور وہی تھا۔

''میں کیا کرسکتی ہوں اور کیا نہیں، یہ تمہارا مسئلہ نہیں۔ تم مجھے اس آدمی کا نام بتاؤ؟'' اس نے قادر شاہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنی بات پر زور دیا۔

''آپ اتنی ضد کر رہی ہیں تو بتا دیتے ہیں نام۔ اس کا نام ہے.....'' قادر شاہ نے جو نام لیا، اسے سن کر وہ اپنی جگہ سکتہ زدہ رہ گئی۔ اس نام سے شاید اسے زندگی میں کبھی نجات نہیں ملنے والی تھی۔

زندگی کے تلخ و ترش حقائق اور
محبت کی فریب کاریوں کا مزید
احوال اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

دوراہا

وسیلہ خاتون

کبھی کبھی فرض اور احسان کے درمیان بڑی دلچسپ معرکہ آرائی ہو جاتی ہے۔ احسان کہتا ہے میری برتری تسلیم کی جائے اور فرض کہتا ہے مجھے ہر صورت ادا کیا جائے... ایسے میں مطلوب مشکل کا شکار ہو کر اس رستے پر ہی چلنا چھوڑ دیتا ہے جس پر یہ دونوں آمنے سامنے کھڑے ہوتے ہیں۔ اس نے بھی تیسرا رستہ اختیار کر کے احسان کو بھی خوش کر دیا اور فرض کی ناراضگی سے بھی بچ گیا۔

جرائم کی دنیا میں دیانت داری کی تلوار پر کھڑے پولیس آفیسر کی جرأت مندی

دستک کی آواز سے اس کی آنکھ نہیں کھل سکتی تھی کیونکہ وہ بہت ہلکی تھی، وہ ڈور بیل کی آواز تھی جس نے اسے گہری نیند سے بیدار کر دیا تھا۔ لیفٹیننٹ کلنٹن تھوڑی دیر پہلے تھکن سے چُور بستر پر لیٹا تھا اور لیٹتے ہی غافل ہو گیا تھا۔

اسے دو روز بعد سونا نصیب ہوا تھا۔ ایک دولت مند آدمی رینالڈ کے قتل کی واردات نے شعبۂ قتل کے تمام افراد کی نیندیں حرام کی ہوئی تھیں۔ گو کہ وہ مجرم کی شخصیت سے ابھی ناواقف تھے لیکن اس کے گرد پھیلا ہوا جال بڑی تیزی سے سمیٹا

WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

Downloaded From Paksociety.com

جارہا تھا اور توقع تھی کہ آئندہ چوبیس گھنٹوں کے دوران وہ مجرم کو کسی چوہے کی طرح گھیر کر شکنجے میں کس دیں گے۔ یہی وجہ تھی کہ کیپٹن نے اسے گھر جا کر سونے کی ہدایت کی تھی تاکہ چند گھنٹوں کی نیند لے کر وہ تازہ دم ہو جائے۔ اسے سفاک قاتل کے مقابلے میں بیدار ذہن اور چست جوانوں کی ضرورت تھی۔ تھکے ہوئے، نیند کے مارے ہوئے ماتحت کسی مجرم کا پوری صلاحیتوں کے ساتھ مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔

لیفٹیننٹ کلنٹن کی بیوی اور بارہ سالہ بچی اسکول کی چھٹیاں گزارنے دو ہفتے کے لیے ایک عزیز کے گھر دور افتادہ قصبے میں گئے ہوئے تھے۔ کھانا وہ پولیس ہیڈ کوارٹر ہی میں کھا چکا تھا۔ اس لیے گھر آتے ہی وہ لباس تبدیل کیے بغیر بستر پر دراز ہوا اور لیٹتے ہی گہری نیند میں ڈوب گیا۔ اب گھنٹی کی آواز سن کر آنکھ کھلی تو اسے محسوس ہوا جیسے وہ ایک لمحے کے لیے بھی نہ سویا ہو۔ وہ آنکھیں بند کیے چپ چاپ پڑا رہا۔ گھنٹی کی آواز دوبارہ آئی۔ بہت مختصر سے وقفے کے لیے جیسے کسی نے ڈور بیل کے بٹن پر انگلی رکھ کر فوراً ہٹالی ہو اور پھر ہلکی سی دستک۔

''کون ہے؟'' لیفٹیننٹ نے جھلا کر کہا اور جسم کی ساری توانائی سمیٹتے ہوئے بستر چھوڑنے کی تیاری کرنے لگا۔ دستک کی آواز درمیان میں ادھوری رہ گئی۔

اس نے دروازہ کھولا تو ایک اجنبی کو اپنے دروازے پر کھڑا پایا۔ پورچ میں لگے ہوئے ہلکی قوت کے بلب کی روشنی میں لیفٹیننٹ کلنٹن نے نیند سے بوجھل آنکھیں پھاڑ کر نووارد کو پہچاننے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ اجنبی نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور بڑی بے تکلفی سے اس طرح اندر داخل ہوا جیسے وہ اس کا اپنا مکان ہو۔ لیفٹیننٹ کلنٹن نووارد کے رویے پر کچھ حیران ہوتا ہوا ایک طرف ہٹ گیا اور اجنبی نے اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر دیا۔ پھر اس نے دروازے سے ٹیک لگائی اور پیشانی پر جھکا ہوا ہیٹ ڈرامائی انداز میں اوپر اٹھا دیا۔ جیسے اسے توقع ہو کہ اس کا میزبان فوراً ہی اسے پہچان لے گا۔

''میں سوچ رہا تھا کہ شاید تم کبھی دروازہ نہ کھولو۔'' اس نے کہا۔ ''میں نے..... اگر اپنی آنکھوں سے تمہیں اندر جاتے ہوئے نہیں دیکھا ہوتا تو یہی سمجھتا کہ مکان میں کوئی بھی موجود نہیں ہے۔''

''کون ہو تم؟''

نووارد اس طرح دروازے سے ٹیک لگائے گہرے سانس لے رہا تھا جیسے اعصابی کشیدگی کم کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ ''تو تم مجھے نہیں پہچانتے؟'' اس نے طنز کرتے ہوئے عجیب سے لہجے میں کہا۔

کلنٹن زندگی بھر وہ مخصوص لب ولہجہ فراموش نہیں کر سکتا تھا۔ وہ فوراً نووارد کو پہچان گیا۔

''تو تم مجھے نہیں پہچانتے یا پہچاننا نہیں چاہتے؟'' اس نے طنزیہ لہجے میں دوبارہ کہا اور اس کی نظریں بھٹکتی ہوئی لیفٹیننٹ کلنٹن کی بارہ سالہ بچی بار برا کی تصور پر جا کر رک گئیں اور چند لمحے بعد پلٹ کر لیفٹیننٹ کی طرف لوٹ آئیں۔ ان آنکھوں میں اب مضحکہ اڑانے والی چمک پیدا ہو چکی تھی۔ وہ خاموش رہا، اسے کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ لیفٹیننٹ کلنٹن اسے پہچان گیا تھا۔ نووارد سے اس کی ملاقات پانچ سال قبل ہوئی تھی۔ جب وہ صرف سراغ رساں ہوا کرتا تھا۔ پانچ سال قبل گزرے ہوئے وہ ناقابلِ فراموش لمحات لیفٹیننٹ کلنٹن کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگے۔

☆☆☆

سراغ رساں کلنٹن ڈیوٹی سے فارغ ہو کر پولیس ہیڈ کوارٹر کی عمارت سے باہر نکلا۔ اس نے گیراج سے اپنی آٹھ سال پرانے ماڈل کی بھاری بھرکم گاڑی نکالی سگریٹ سلگایا اور گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

وہ اپنی زندگی سے بہت مطمئن اور آسودہ تھا۔ اس کی عمر پینتیس سال تھی۔ وہ ایک بہت اچھی بیوی کا شوہر اور ایک بہت پیاری بچی کا باپ تھا۔ اس کے سامنے ایک وسیع اور خوشگوار مستقبل تھا۔ ابھی وہ صرف اول درجے کا سراغ رساں تھا۔ اس کے بعد اسے لیفٹیننٹ اور کیپٹن کی سیڑھیاں چڑھنی تھیں اور وہ اس سے اوپر بھی جا سکتا تھا۔ پولیس کے شعبے میں ترقیاں ملنے کی رفتار بہت سست ہوتی ہے لیکن ناقابلِ حصول نہیں ہوتیں۔ اصل مشکل کیپٹن کے عہدے کے بعد شروع ہوتی ہے۔ وہ رات بہت خوبصورت تھی۔ زندگی بہت حسین تھی، بے اختیار وہ ایک مقبول دھن گنگنانے لگا۔

اس کا مکان شہر کے نواحی علاقے میں ایک پہاڑی پر واقع تھا جس کے دامن میں ایک جھیل تھی۔ ایک تعمیراتی ادارے نے کچھ عرصہ قبل اس پہاڑی پر مکانات تعمیر کر کے فروخت کیے تھے۔ اس نے گاڑی چڑھائی پر ڈال دی اور پھر گیراج میں کھڑی کرنے کے بجائے دروازے کے پاس روک دی کیونکہ وہ بیوی اور بچی کے ساتھ فلم دیکھنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس نے زور سے ہارن بجایا۔ پورچ کی بتی روشن

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

ہوئی، اس کی بیوی دہلیز کی نچلی سیڑھی پر رک گئی۔ بچی اڑتی ہوئی آئی اور اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر جھول گئی۔

جو دیکھتا تھا، وہ یہی کہتا تھا کہ بچی بہت خوبصورت ہے، بڑی پیاری ہے۔ وہ انہیں سات سال پہلے قدرت کی طرف سے تحفے میں ملی تھی۔ ''چلو جلدی کرو، ہم لوگ فلم دیکھنے شہر جارہے ہیں۔''

اس کی بیوی جو بے تابی سے دور کھڑی اس کے قریب آنے کا انتظار کررہی تھی، یہ سن کر اچانک حرکت میں آگئی۔ ''ہم لوگ کھانا کھا چکے ہیں۔ تمہارا کھانا میز پر لگا ہوا ہے ڈارلنگ ..... بار برا! ادھر آؤ، دیکھو تمہارا ہیٹ کہاں رکھا ہوا ہے۔''

اس نے گاڑی موڑ کر پہاڑی کے نیچے جانے والے رخ پر ڈال دی۔ ان کے پاس وقت کم تھا اور کھانے کے بعد وہ فوراً روانہ ہونا چاہتا تھا۔ بچی ہیٹ پہنے ہوئے دوڑتی ہوئی مکان سے باہر نکلی۔

''آپ کھانا کھالیں پاپا! میں گاڑی میں آپ کا انتظار کررہی ہوں۔'' وہ بہت خوش نظر آرہی تھی۔

وہ مسکرادیا۔ ''ٹھیک ہے، دیکھو پارن مت بجانا۔''

وہ اندر داخل ہوا اور بیوی کو آغوش میں بھر کر ایک طویل بوسہ دیا۔ میز پر کھانا چنا ہوا تھا جسے دیکھ کر یکا یک اس کی بھوک بھی چمک گئی۔ اس نے ایک کرسی پیچھے گھسیٹی جس کا رخ دروازے کی طرف تھا۔ اس کی بیوی ایک پلیٹ اس کی طرف بڑھانے لگی۔ بس یونہی اس نے سر اٹھا کر پورچ کی طرف دیکھا تو وہاں کوئی گڑبڑ محسوس کی۔ وہ کرسی پر بیٹھتے بیٹھتے فضا میں معلق ہوگیا۔ پورچ خالی پڑا تھا اور اس کی گاڑی غائب تھی۔

کرسی لڑھکتی ہوئی فرش پر گری، اس سے پہلے ہی وہ نشست گاہ سے گزرتا ہوا پورچ تک پہنچ چکا تھا۔ عقب میں زنانہ سینڈلوں کی کھٹ کھٹ سنائی دے رہی تھی۔ وہ دوڑتا ہوا پورچ سے باہر نکلا۔ اس کی نظروں کے سامنے ڈھلان تھی اور اس کی گاڑی پھسلتی ہوئی پہاڑی سے نیچے جارہی تھی۔ اس کی رفتار لحہ بہ لحہ بڑھتی جارہی تھی۔ انجن خاموش تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ بار برا نے ہینڈ بریک ہٹادیا تھا۔

سڑک کے دونوں طرف تیز روشنی والے بلب لگے ہوئے تھے جن کی وجہ سے سڑک خوب روشن تھی۔ ان کی ایک قطار سیدھی جھیل کی طرف جاتی تھی اور دوسری قطار دائیں جانب مڑتی ہوئی شہر کی طرف نکل جاتی تھی۔ آٹھ سال پرانے ماڈل کی فورڈ گاڑی بھاری بھرکم تھی .....

سڑک پر بغیر لہرائے بالکل سیدھی جارہی تھی۔ ایک لمحے کے لیے ایک چھوٹا سا ہاتھ کھڑکی سے باہر نکلا اور پھر فوراً اندر چلا گیا۔ کلٹن کو عقب میں کوئی آواز سنائی نہیں دی لیکن پیچھے مڑکر دیکھے بغیر ہی اسے معلوم ہوگیا کہ اس کی بیوی بے ہوش ہوکر زمین پر گر پڑی ہے۔ وہ پہاڑی سے نیچے کی طرف اتنی تیزی سے دوڑا کہ اس نے زندگی میں کبھی اتنی تیز دوڑ نہیں لگائی تھی۔

دیکھتے ہی دیکھتے اس کی نظروں کے سامنے سب کچھ انتہائی تیزی، انتہائی خاموشی کے ساتھ ختم ہوگیا۔ ایسا دہشت ناک منظر جو زندگی میں کبھی کبھار ہی کسی کو نظر آیا ہو۔ چند لمحے پردۂ بینائی پر ساکت فلم کی طرح وہ منظر قائم رہا اور پھر غائب ہوگیا۔ لیکن دیکھنے والے کی نظروں کے سامنے وہ مرتے دم تک قائم رہتا۔ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ آہستہ آہستہ اس کے اور گاڑی کے درمیان فاصلہ کم ہوتا جارہا تھا، لیکن فاصلہ مٹنے سے پہلے ہی گاڑی پہاڑی کے نیچے پہنچ گئی جس کے دامن میں بڑی خوبصورت جھیل واقع تھی۔ گاڑی اچھل کر فٹ پاتھ پر چڑھی جس کے دوسری طرف تین فٹ اونچی دیوار کھڑی تھی۔ وہ دیوار توڑتی ہوئی اس کی نظروں سے غائب ہوگئی۔ وہاں بس دھول اور مٹی کے سوا کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا۔

وہ اندھادھند جھیل کی طرف بھاگا۔ اس کے پیروں کے قریب بہت زور سے بریک چیخے، کوئی غصے سے چیخا۔ وہ پیچھے دیکھے بغیر تین فٹ اونچی دیوار پھلانگتا ہوا کوٹ سمیت جھیل میں کود گیا۔ جس مقام پر اس کی گاڑی جھیل میں ڈوبی تھی، وہاں بے شمار بلبلے اٹھ رہے تھے۔ پانی سے ٹکراتے ہی اسے یاد آیا کہ وہ تو پیراکی کی ابجد سے بھی واقف نہیں ہے لیکن اس حقیقت نے اس پر ذرا بھی گھبراہٹ طاری نہیں کی۔ وہ صرف ایک تیزی سے گزرتا ہوا خیال تھا۔ اس وقت اس کی پوری کائنات ایک ننھے سے وجود میں سمٹ آئی تھی جو گاڑی میں بند جھیل کے اندر موت وزیست کی کشمکش میں مبتلا تھا۔

اس نے چھلانگ ہی غلط لگائی تھی، وہ چھاتی کے بل پانی پر گرا اور پانی کی ٹکر نے اس کا وجود ہلا دیا۔ پیٹ اور سینے پر شدید چوٹ لگی، وہ ہاتھ پیر مارتا ہوا نیچے بیٹھنے لگا پھر پانی نے آہستہ سے اسے اوپر دھکیل دیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ گہرائی میں کیسے داخل ہو۔ اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ پانی میں سانس کس طرح لی جاتی ہے، وہ دوبارہ پانی میں ڈوبتا چلا گیا..... جلد ہی اس کے پھیپھڑے

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

سانس گھٹنے کے باعث دہکتے ہوئے انگارے بن گئے۔ اس پر غشی کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ ایک لمحے کے لیے وہ پانی کی سطح پر ابھرا لیکن ایسے موقعوں سے فائدہ اٹھانے کا اس کو سلیقہ نہیں تھا۔ وہ ایک مرتبہ پھر پانی میں ڈوب گیا۔ اب وہ خود مر رہا تھا۔

اسے پتا نہیں کہ کب اسے طاقت ور، مہربان ہاتھوں نے اپنی گرفت میں لیا اور اسے موت کے جبڑوں سے باہر کھینچا۔ چند لمحوں بعد وہ پانی سے نکل کر ہوا میں آگیا۔ پھر وہ زمین پر لیٹا ہوا تھا، اس کا سینہ دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ کچھ ہوش وحواس بحال ہونے پر اس نے آنکھیں کھولیں، کوئی نامعلوم شخص اس کے قریب کھڑا تھا۔ اس کا لباس پانی میں شرابور تھا لیکن وہ خود پُرسکون نظر آرہا تھا۔ اسے آنکھیں کھولتا دیکھ کر اس کے محسن نے کہا۔ ''تم احمق ہو، جب تمہیں تیرنا نہیں آتا تھا تو تم نے جھیل میں کیوں چھلانگ لگائی؟''

کلنٹن نے کہنیوں کے بل اٹھنے کی کوشش کی۔ اس نے اکھڑی ہوئی سانسوں اور بے تحاشا اٹھتی ہوئی کھانسی کے دوران بڑی مشکل سے اپنے محسن سے کہا۔ ''میری بچی..... وہ گاڑی..... گاڑی میں ہے جو..... جھیل کے اندر.....''

اس کا فقرہ مکمل ہونے سے پیشتر ہی اجنبی اس کے سامنے سے غائب ہوگیا اور کچھ دیر بعد اسے اپنے قریب بار بار اکے کھانسنے کی آواز سنائی دی، وہ اجنبی محسن کی گود میں تھی۔ اس کا چہرہ نیلا پڑ چکا تھا لیکن تنفس کی آمد و رفت جاری تھی۔ کلنٹن نے اپنے محسن کو انتہائی تشکر بھری نظروں سے دیکھا۔ چند لوگ وہاں جمع ہوگئے تھے اور اس نے بچی کو زمین پر لٹا دیا اور ایک شخص پیٹ دبا کر پانی باہر نکالنے لگا۔ جب وہ پُرسکون انداز میں سانس لینے لگی تو کلنٹن نے اٹھ کر اپنی بچی کو سینے سے لگا لیا اور مجمع میں محسن کو تلاش کرتے ہوئے نظریں دوڑائیں۔ ''وہ کہاں گیا؟''

اسے پس منظر میں ایک گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی۔ ''ٹھہرو۔'' کلنٹن پوری قوت سے چیختے ہوئے بے تحاشا گاڑی کی طرف بھاگا۔ وہ بیچ سڑک پر کھڑا ہوگیا۔ گاڑی رک گئی۔ اسٹیئرنگ وہیل کے پیچھے بیٹھے ہوئے شخص نے کھڑکی سے سر نکال کر سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ اجنبی کا دایاں ہاتھ زخمی ہوگیا تھا جس پر اس نے کوئی کپڑا باندھ لیا تھا۔

کلنٹن گاڑی کے قریب آکر جھک گیا۔ اس کے دونوں ہاتھ دروازے کے ہینڈل کے قریب شکر گزاری والے انداز میں پھیلے ہوئے تھے۔ احسان کا بوجھ اتنا وزنی تھا کہ اس کی زبان ساتھ نہ دے پا رہی تھی۔

''اب کیا بات ہے؟'' اجنبی محسن نے روکھے لہجے میں بے صبری سے سوال کیا جیسے اسے کہیں جانے کی بہت جلدی ہو۔

تشکر کے جذبات زبان سے ادا کرنے ویسے ہی مشکل ہوتے ہیں۔ خاص طور پر اس وقت جب دوسرا فریق اپنے احسان کا تذکرہ سننے پر تیار نہ ہو۔ کلنٹن صرف اتنا ہی کہہ سکا۔ ''میں آپ کو بتا نہیں سکتا کہ آپ نے مجھ پر کتنا بڑا احسان کیا ہے۔''

''میں خود حیران ہوں کہ میں نے یہ کیسے کیا۔'' اس نے طنز کرتے ہوئے ایسے لہجے میں کہا جیسے وہ خود پر کوئی فقرہ چست کر رہا ہو۔ ''میں نے اپنی زندگی میں پہلے کبھی کوئی ایسا کام نہیں کیا۔''

''لیکن کیا میں آپ کے لیے کچھ نہیں کر سکتا؟'' کلنٹن نے التجا آمیز لہجے میں کہا۔ ''کم از کم اپنا نام تو بتا دیں؟''

کلنٹن کو اس التجا کا جو جواب ملا وہ زہر میں بجھا ہوا تھا۔ ''تمہیں میرے نام سے کیا لینا ہے؟ میں لوگوں کو اپنا نام بتاتا نہیں پھرتا۔''

شکر گزاری کے جذبات ابلتے ہوئے نکاسی کے متلاشی تھے۔

اس وقت اگر وہ شخص گھونسا مار کر کلنٹن کے دانت بھی توڑ دیتا تو وہ قطعی برا نہیں مانتا۔ جب اجنبی اپنا نام بتانے پر آمادہ نہیں ہوا تو کلنٹن نے اپنا تعارف کرایا۔ چند لمحے اس کا محسن خاموشی سے اسے گھورتا رہا۔ اس نے نظریں جھکا کر کلنٹن کی انگلیوں کی طرف دیکھا جو دروازے کے ہینڈل پر جمی ہوئی تھیں۔ ان نظروں کا مطلب بالکل واضح تھا۔ ہاتھ ہٹاؤ..... مجھے دیر ہو رہی ہے۔

''سب یہی کہتے ہیں۔'' اس کے محسن نے خشک لہجے میں کہا اور دوسرے لمحے گاڑی ایک جھٹکا لے کر تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

☆☆☆

''تم..... تم وہی شخص ہو نا..... وہی جو پانچ سال پہلے..... جھیل پر.....'' لیفٹیننٹ کا چہرہ خوشی اور تشکر کے ملے جلے جذبات سے دمکنے لگا۔ اس نے گرم جوشی سے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا نووارد اسے نظر انداز کرتا ہوا نشست گاہ کی طرف بڑھ گیا۔ لیفٹیننٹ کا چہرہ بجھ گیا۔ وہ نشست گاہ میں داخل ہوا تو اپنے محسن کو بے پروا انداز میں ایک کرسی کے

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

اندر دھنسا ہوا پایا۔ اس کے چہرے کے دائیں جانب خون لگا ہوا تھا۔

لیفٹیننٹ کلنٹن اب پوری طرح بیدار ہو چکا تھا۔ اس نے غور سے پہلی بار اپنے محسن کا جائزہ لیا اور نا قابلِ فہم وجہ کی بنا پر خوفزدہ ہو گیا۔

''تمہیں چوٹ کیسے لگی؟''

نووارد نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

''چوٹ نہیں لگی، ابھی کچھ دیر پہلے تمہارے ہی ایک ساتھی نے مجھ پر گولی چلائی تھی، یہ اسی کا کرشمہ ہے۔''

لیفٹیننٹ کلنٹن کا چہرہ نامعلوم خوف کے زیر اثر آہستہ آہستہ سپید پڑتا جا رہا تھا جیسے کوئی بوند بوند کر کے اس کے چہرے کا خون نچوڑ رہا ہو۔ اجنبی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ذہنی رابطے کی مدد سے وہ کچھ بتانا چاہتا تھا جسے کلنٹن نہیں جاننا چاہتا تھا۔ ''تم مجھ سے یہ کیوں نہیں پوچھتے کہ میں تمہارے گھر میں تمہارے پاس کیوں آیا ہوں؟''

کلنٹن جھجک کر پیچھے ہٹ گیا۔ ''مجھے کوئی ایسی بات مت بتاؤ جس پر بعد میں تمہیں پچھتانا پڑے.....'' اس نے جلدی سے کہا۔

''تم مجھ سے یہ کیوں نہیں پوچھتے کہ میں تمہارے گھر، تمہارے .....'' نووارد دھیمے لہجے میں اپنا سوال دہرانے لگا۔

''خاموش!'' کلنٹن نے چیخ کر کہا۔

''نہیں، میں تمہیں اس کی اجازت نہیں دے سکتا۔''

اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ ''تم اپنے فرار کا راستہ محفوظ رکھنا چاہتے ہو؟ تم نے اپنے دل کے دروازے بند کر لیے ہیں تاکہ چند منٹ بعد تمہارے ساتھی تلاش کرتے ہوئے یہاں پہنچیں تو تمہارا ضمیر تمہیں ملامت نہ کر سکے؟ تم میرا دوسرا روپ بھی پہچان لوگے۔ میں فورمین ہوں۔ رینالڈ کا قاتل، جسے پولیس والے گزشتہ ایک ہفتے سے بڑی شدومد کے ساتھ تلاش کر رہے ہیں۔ اب بتاؤ کیا کرنا چاہتے ہو؟''

''اوہ میرے خدا!'' کلنٹن نے حلق سے کراہتے ہوئے کہا اور سر کے الجھے ہوئے بے ترتیب بالوں میں انگلیاں پھیریں۔ ''تمہیں پتا نہیں ہے، میں کون ہوں؟''

''تو تمہارا خیال ہے کہ اگر مجھے یہ پتا ہوتا تو میں تمہارے قریب بھی نہیں آتا..... کیوں؟'' فورمین نے طنزیہ لہجے میں پھنکارتے ہوئے کہا۔ ''مجھے معلوم تھا کہ تم کون ہو اور اسی لیے میں یہاں آیا ہوں۔ اس دن تم نے خود اپنا تعارف کراتے ہوئے مجھے بتایا تھا کہ تمہارا تعلق پولیس کے شعبۂ قتل سے ہے۔ اس کے بعد میں نے ایک بار تمہاری تصویر اخبار میں دیکھی جب تم نے ایک پولیس آفیسر کے قاتل کو گرفتار کیا تھا اور اسی کارنامے پر تمہیں ترقی دے کر لیفٹیننٹ بنا دیا گیا تھا۔ تم سے بنیادی غلطی یہ ہوئی ہے کہ تم نے مستقل ایک جگہ رہائش اختیار کی ہوئی ہے۔ پولیس والوں کو اپنی رہائش تبدیل کرتے رہنا چاہیے۔ اس سے بڑے فائدے پہنچتے ہیں۔''

لیفٹیننٹ کلنٹن بھناتا ہوا دروازے پر گیا اور دونوں پٹ پورے کھول دیے۔ ''دفع ہو جاؤ۔'' اس نے چیخ کر کہا۔ ''فوراً یہاں سے چلے جاؤ۔ میں بس تمہارے لیے اتنا ہی کر سکتا ہوں۔''

فورمین بچی کی تصویر کو ٹکٹکی باندھے بڑے اطمینان سے اس طرح دیکھتا رہا جیسے وہ کمرے میں تنہا ہو۔ ''کیا اس کے بال واقعی سنہری ہیں، جیسے کہ تصویر میں نظر آ رہے ہیں؟ کیا اس کے ہونٹوں پر ہر وقت ایسا ہی تبسم بکھرا رہتا ہے؟ کیا ہنستے ہوئے اس کے رخساروں میں گڑھے پڑ جاتے ہیں؟''

''نکل جاؤ خونی، قاتل!'' کلنٹن پوری قوت سے چیخا تھا۔

''میری کوئی بچی تو نہیں لیکن مجھے معلوم ہے کہ بچے کس طرح اپنی محبت کا اظہار کرتے ہیں۔ کبھی وہ کرسی کے پیچھے آ کر چپکے سے گلے میں بانہیں ڈال دیتے ہیں اور کبھی وہ سامنے گھٹنوں کے بل زمین پر کھڑے ہو کر گود میں سر رکھ دیتے ہیں۔ پتا نہیں تمہاری بچی کس طرح اپنی محبت کا اظہار کرتی ہے کلنٹن لیکن وہ جو طریقہ بھی اختیار کرتی ہے، محض میرے طفیل ہی تمہیں وہ ہنستی مسکراتی نظر آتی ہے۔ کیا نام ہے تمہاری بچی کا کلنٹن؟''

''بار برا۔'' کلنٹن نے شکست خوردہ انداز میں کہا اور دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا ہوا فورمین کے سامنے بیٹھ گیا۔ بہت دیر تک وہ خاموش بیٹھے رہے، کم از کم کلنٹن کو یہی محسوس ہوا جیسے بہت وقت گزر گیا ہو۔

''تمہارے پاس سگریٹ تو ہوگا؟'' فورمین نے سکوت توڑتے ہوئے بڑی بے تکلفی سے کہا۔

کلنٹن نے کوٹ کی جیبوں پر ہاتھ مارا، اس کے پاس سگریٹ نہیں تھا۔ فورمین اٹھا اور میز پر رکھے ہوئے پیکٹ سے سگریٹ نکالا اور اطمینان سے اپنی جگہ بیٹھ کر تمباکو نوشی سے لطف اندوز ہونے لگا۔

بہت دیر بعد کلنٹن نے خیالات سے چونکتے ہوئے

WWW.PAKSOCIETY.COM

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف

ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ

کتاب کی مُختلف سائزوں میں اپلوڈنگ

ایڈ فری لنکس

ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر

ناولز اور عمران سیریز کی مُکمل رینج

Click on http://paksociety.com to Visit Us

پاک سوسائٹی کو فیس بُک پر جوائن کریں http://fb.com/paksociety

پاک سوسائٹی کو ٹوئٹر پر جوائن کریں http://twitter.com/paksociety1

پاک سوسائٹی کو گُوگل پلس پر جوائن کریں https://plus.google.com/112999726194960503629

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بُک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بُک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

http://paksociety.com

Downloaded From Paksociety.com

سر اٹھایا اور فورمین کی طرف دیکھا۔ ''میں ایک ذمے دار پولیس افسر ہوں فورمین۔'' اس نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''تمام حالات کا جائزہ لینے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ میں تمہارے لیے کچھ نہیں کرسکتا۔''

فورمین نے پُرسکون انداز میں سگریٹ کی راکھ جھاڑی۔ ''تمہیں میرے لیے کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہیں، بس مجھے یہاں اس وقت تک رہنے کی اجازت دے دو جب تک تمہارے ساتھیوں کا جوش و خروش ٹھنڈا نہیں پڑ جاتا۔ پھر تم اپنا رخ دوسری طرف کرلینا اور میں دروازہ کھول کر واپس چلا جاؤں گا۔ اس طرح ہمارا حساب بے باق ہوجائے گا۔''

''تم خونی ہو..... تم نے ایک انسان کو انتہائی سنگ دلی، بے رحمی سے قتل کیا ہے۔''

''لیکن پولیس افسر ہونے کی وجہ سے تم اپنے اخلاقی فرض سے سبکدوش تو نہیں ہوجاتے۔ جس رات میں نے تمہاری بچی کی جان بچائی تھی، اس سے پہلے بھی ایک قتل کرچکا تھا۔ اس کے باوجود تم نے انہی ہاتھوں سے اپنی بچی کی جان قبول کرلی تھی۔ وہ آج اسی طرح سانس لیتی ہے۔ اس کے پھیپھڑے اسی طرح پانی سے خالی ہیں۔ اس کی آنکھیں اسی طرح روشن ہیں جیسے کسی شریف اور قانون کے پابند شہری نے اس کی جان بچائی ہو۔ میں نے جھیل میں کودنے سے پہلے اس عمل کے اچھے اور بُرے پہلوؤں پر تم سے بحث نہیں کی تھی۔ میں نے تمہیں ایک زندگی لوٹائی۔ تم میرے مقروض ہو، میں تم سے ایک زندگی کا مطالبہ کرتا ہوں، اپنی زندگی کا۔''

''تم کچھ پینا چاہتے ہو؟'' کلنٹن نے غضب ناک لہجے میں پوچھا۔ تین مرتبہ وہ غلط سمت کی طرف مڑا۔ تب اسے یاد آیا کہ مشروب کی بوتلیں کہاں رکھی رہتی ہیں۔

فورمین بہت پُرسکون اور پُراعتماد نظر آرہا تھا یا شاید یہ بھی اس کے کھیل کا حصہ تھا، پرسکون اور پراعتماد نظر آنا جیسے اسے کلنٹن کے ردعمل کا پہلے ہی سے علم ہو۔ اسے اس امر کا پورا یقین ہو کہ کلنٹن بالآخر اسے پناہ دینے پر مجبور ہوجائے گا۔ کچھ دیر بعد اس نے مشروب کی چسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ ''اس قدر تردد کرنے کی ضرورت نہیں۔'' پھر اس نے کلنٹن کو ایسی نظروں سے دیکھا جیسے وہ اس قسم کے آدمی کو زندگی میں پہلی بار دیکھ رہا ہو۔ ''تم دیانت دار ہو، کیوں ٹھیک ہے نا؟ اور سچائی کا راستہ کبھی کبھی بے حد تکلیف پہنچاتا ہے۔ میں نے اس دن ہی تمہارے بارے میں یہ اندازہ

قابلِ رحم

لڑکی: کیا تم نے میرے ابا سے میرا رشتہ مانگا تھا؟

لڑکا: ہاں۔

لڑکی: پھر انہوں نے کیا کہا؟

لڑکا: انہوں نے پوچھا بینک میں تمہارا کتنا روپیہ جمع ہے؟ میں نے کہا، دس ہزار۔

لڑکی: پھر؟

لڑکا: انہوں نے وہ ساری رقم مجھ سے ادھار مانگ لی۔

ایک وقت میں ایک

ایک صاحب تقریر کررہے تھے۔ اچانک پنڈال کے پیچھے سے ایک گدھے نے رینکنا شروع کردیا۔

سامعین میں سے کسی نے آواز لگائی۔ ''ایک وقت میں ایک ہی بولے۔''

جواب

دورانِ سفر ریل میں ایک آدمی نے دوسرے سے پوچھا۔

''نماز کس طرف منہ کرکے پڑھوں؟''

جواب آیا۔ ''جس طرف تمہارا سامان رکھا ہوا ہے۔''

مرسلہ: ریاض بٹ، حسن ابدال

لطیفہ

لڑکی۔ ''میری امی کو تم بہت پسند آئے۔''

سردار شرماتے ہوئے۔ ''لیکن میں شادی صرف تم ہی سے کروں گا خالہ سے بولو مجھے بھول جائے۔''

مرسلہ: راحیلہ شفیق، نیو کراچی سندھی ہوٹل

احساس

بیوی نے شوہر سے شکایت کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ جب بھی کسی خوبصورت لڑکی کو دیکھتے ہیں، آپ یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ آپ شادی شدہ ہیں۔''

''بھول کہاں جاتا ہوں۔'' شوہر نے سرد آہ بھر کر کہا۔ ''اس وقت تو یہ احساس اور شدید ہوجاتا ہے۔''

مرسلہ: وزیر محمد خان، بٹل ہزارہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

لگالیا تھا کہ جو شخص پیرا کی سے ناواقف ہو اور پھر بے جھجک پانی میں چھلانگ لگادے' وہ دیانت دار اور اصول پرست ہی ہوسکتا ہے۔ اسی لیے میں یہاں آیا ہوں۔ میں کسی پولیس افسر کے ساتھ اتنا بڑا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ اصول پرست آدمی جہاں بے حد خطرناک ہوتا ہے، وہیں بے ضرر بھی ہوتا ہے۔''

کلنٹن کچھ نہیں بولا۔ وہ خاموشی سے خلا میں کسی غیر مرئی نقطے کو گھورتا رہا۔

''کیا یہاں شراب کی صرف یہی ایک بوتل ہے؟''

کلنٹن نے غائب دماغی سے اثبات میں سر ہلایا۔

اس نے پانی قالین پر گرنے کی آواز سنی تو سر اٹھا کر فورمین کی طرف دیکھا جو مشروب کی بوتل کا منہ کھول کر قالین پر بہا رہا تھا۔ اس نے کچھ بھی نہ کہا، اس جیسی دس لاکھ باتوں کی اس وقت کوئی اہمیت نہیں تھی۔ بس ایک ہی اہم مسئلہ تھا جو اس کی مکمل توجہ کا مستحق تھا۔

''زیادہ پینے سے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں متاثر ہوتی ہیں۔'' اس نے فورمین کو وضاحت کرتے ہوئے سنا۔'' اس وقت ہم دونوں کا ذہن بالکل صاف ہونا چاہیے تاکہ ہم صحیح نتائج اخذ کرسکیں اور ان کی روشنی میں صحیح فیصلے کیے جاسکیں۔''

کلنٹن نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کی حد تک یہ بات درست تھی۔ مشروب کا زیادہ استعمال اسے جذباتی بنا دیتا اور موجودہ حالات میں وہ خطرناک ثابت ہوسکتا تھا۔ جذباتی کیفیت کے زیر اثر وہ اپنے فرض اور اپنے قرض دونوں میں سے کسی کو بھی بہت زیادہ اہمیت دے سکتا تھا۔

اس نے اپنے گلاس میں بچا ہوا مشروب بے رحمانہ انداز میں خود بھی قالین پر انڈیل دیا۔

''تم خاموش نہیں رہ سکتے؟ بولتے ہی رہو گے! تم سو کیوں نہیں جاتے؟'' اس نے خواب گاہ کے کھلے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔'' تم اندر جاکر سو کیوں نہیں جاتے؟ میں تنہائی میں کچھ سوچنا چاہتا ہوں۔''

فورمین نشست سے اٹھ گیا۔ اس نے کھڑے ہوکر ایک طویل انگڑائی لی اور خواب گاہ کی طرف بڑھنے لگا۔

''ٹھہرو۔ تمہارے پاس کوئی ہتھیار ہے؟''

''ہاں، کیوں نہیں۔'' فورمین نے بے پروائی سے ریوالور نکال کر کلنٹن کی طرف بڑھایا۔'' تمہیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ تمہاری حیثیت ترپ کے پتے کی سی ہے۔ میرے پاس ہارنے کے لیے اب کیا رہ گیا ہے۔'' وہ ڈھیلے ڈھالے انداز میں چلتا ہوا خواب گاہ میں داخل ہوگیا۔

چند لمحوں بعد کلنٹن نے فرش پر جوتے گرنے کی آواز سنی پھر بستر کے اسپرنگ چرچرائے اور خاموش ہوگئے۔ وہ فورمین کا ریوالور اٹھا کر اس کی گولیاں نکالنے لگا۔ چند منٹ بعد اسے خراٹوں کی آواز سنائی دی۔ کلنٹن مٹھیاں بھینچتا ہوا اپنی نشست سے کھڑا ہوگیا اور بے چینی سے بیضوی دائرے کی شکل میں قالین پر ٹہلنے لگا۔

دس منٹ بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ کلنٹن کا اٹھتا ہوا قدم فضا میں معلق رہ گیا۔ دستک کی آواز دوبارہ ابھری اور اس کے ساتھ ہی ڈوربیل بجنے لگی۔ وہ ساکت ایک جگہ کھڑا رہا۔

''کلنٹن! کیا تم اندر ہو؟'' باہر سے کسی نے پکار کر کہا۔ کلنٹن اس آواز کو پہچان گیا۔ وہ شعبۂ قتل کے سراغ رساں ٹام کی آواز تھی۔

اس نے پہلے خواب گاہ کا دروازہ بند کیا پھر مکان کا داخلی دروازہ کھولا۔ ٹام کے ساتھ ایک اور سراغ رساں تھا۔ انہوں نے ریوالور ہولسٹر سے باہر نکالے ہوئے تھے۔ کلنٹن پر نظر پڑتے ہی ان کے رخ زمین کی طرف ہوگئے۔

''کیا بات ہے؟'' کلنٹن نے جماہی لیتے ہوئے دریافت کیا۔

''فورمین ایک مرتبہ پھر ہماری ناکا بندی توڑ کر فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا ہے۔ لیفٹیننٹ، بالکل آخری لمحات میں جب ہم اس پر ہاتھ ڈالنے والے تھے۔ ایک ٹیکسی ڈرائیور کا بیان ہے کہ اس نے مجرم کو پہاڑی کے دامن میں اتارا تھا۔ وہ یہاں کہیں چھپا ہوا ہے، ہم ایک ایک گھر کی تلاشی لے رہے ہیں۔''

''وہ میرے مکان میں داخل نہیں ہوا۔'' کلنٹن نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو مدد دینے کی پیش کش نہیں کی۔ اس نے صرف اتنا کہا۔'' مجھ سے آنکھیں نہیں کھل رہیں۔ دو منٹ قدموں پر کھڑا رہنا بھی دشوار ہے اور پھر میں ڈیوٹی پر بھی نہیں ہوں۔''

ٹام نے اسے عجیب نظروں سے دیکھا۔ وہ پلٹا اور اپنے ساتھی کے ہمراہ واپس چلا گیا۔ اس نے جاتے جاتے بلند آواز میں کہا۔'' کوئی بات نہیں لیفٹیننٹ..... آپ آرام کریں۔ مجھے افسوس ہے، ہم نے آپ کی نیند میں خلل ڈالا۔''

کلنٹن نے دروازہ بند کردیا اور سر جھکائے ایک منٹ تک خاموش کھڑا رہا جیسے وہ اپنے جوتوں کو دیکھ رہا ہو لیکن

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

اس کی آنکھیں کچھ بھی نہیں دیکھ رہی تھیں۔ اسے عقب سے فورمین کی خاموش اور پُرسکون آواز سنائی دی۔ ''تو تم نے اپنے ساتھیوں سے غلط بیانی کی، انہیں رخصت کر دیا۔''

کلنٹن نے پلٹ کر اسے دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔

''میں پیٹھ میں چھرا گھونپنے کا قائل نہیں ہوں۔ یہ میرا اصول نہیں ہے، نہ ہی میں تم سے خوف زدہ ہوں۔''

''درست ہے۔'' فورمین نے اعتراف کرتے ہوئے کہا۔ ''تم مجھ سے تو نہیں، اپنے ضمیر سے خوفزدہ ہو اور اپنی بچی کی آنکھوں سے۔''

اب کلنٹن نے پلٹ کر اپنے مہمان کو گھور کر دیکھا۔

''یہ میرا مسئلہ ہے تمہارا نہیں۔ تمہیں بولنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔'' اس نے جارحانہ انداز میں مٹھیاں بھینچتے ہوئے فورمین کی طرف قدم بڑھائے۔ ''تم میری نظروں سے دور رہو ورنہ دونوں ہاتھوں سے اس مسکے کا گلا گھونٹ دوں گا۔''

خواب گاہ کا دروازہ بند ہو گیا اور کلنٹن ایک مرتبہ پھر اپنے خیالوں کے ساتھ تنہا رہ گیا۔ ''اوہ گاڈ!'' اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ ''کیا یہ رات کبھی ختم نہیں ہوگی؟''

☆☆☆

فورمین جب صبح کچن میں ..... داخل ہوا تو کلنٹن ناشتا تیار کر رہا تھا۔ ابھی سورج طلوع نہیں ہوا تھا اور کھڑکی سے باہر سحر انگیز سکون بخش روشنی پھیلی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

فورمین ایک منٹ تک کلنٹن کو خاموشی سے دیکھتا رہا۔

''کیا یہ قیدی کا آخری ناشتا ہے؟ اتنی جلدی ناشتا تیار کرنے کی کیا تک ہے؟''

کلنٹن جواب میں خاموش رہا۔ اس نے مہمان کو ناشتے کی میز پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ فورمین ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ کلنٹن نے کافی سے بھری ہوئی کیتلی اٹھائی اور کیتلی میز پر رکھ کر اپنے مہمان کے سامنے بیٹھ گیا۔

فورمین کچھ دیر اسے دلچسپی سے دیکھتا رہا۔

''تمہارے حلیے سے ظاہر ہوتا ہے کہ تم رات بھر نہیں سوئے۔ میں شرط لگا سکتا ہوں کہ تم نے رات قالین پر ٹہلتے ہوئے گزاری ہے۔''

''میں تین مرتبہ کوشش کرنے کے بعد کافی تیار کرنے میں کامیاب ہوا ہوں۔'' کلنٹن نے سنک کی طرف ..... اشارہ کرتے ہوئے کہا جس کی سطح پر ضائع شدہ کافی کی تہ جمی ہوئی تھی۔ ''اگر ضرورت محسوس ہو رہی ہو تو اپنے لیے کافی نکال لو۔''

وہ میز پر آمنے سامنے کچھ اس طرح چپ چاپ بیٹھے ہوئے کافی پی رہے تھے جیسے وہ گہرے دوست ہوں اور ان کی بیویاں موجود نہ ہوں۔ فورمین نے اچانک سوال کیا۔

''تم اس مکان کا کتنا کرایہ ادا کرتے ہو؟''

''پچاسی ڈالر۔''

''میں نے کبھی کسی مقام پر اتنی دیر قیام نہیں کیا کہ اکٹھے ایک ماہ کا کرایہ بھرنا پڑے۔''

''کاش تم کہیں ٹک کر ایک جگہ رکتے تو شاید آج یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔''

کچن میں پھر سکوت طاری ہو گیا۔ آہستہ آہستہ فضا میں کشیدگی پیدا ہونے لگی جس کا منبع کلنٹن کی ذات تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے کرسی کے کنارے بڑی مضبوطی کے ساتھ پکڑے ہوئے تھے جیسے وہ کسی بھی لمحے اٹھ کر کھڑا ہو جائے گا۔ فورمین جلدی جلدی سگریٹ کے کش لینے لگا، فورمین کی نظریں کلنٹن کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں اور لیفٹیننٹ کبھی کبھی نظریں اٹھا کر اپنے مہمان کو دیکھ لیتا تھا۔

''کیا بات ہے، تمہارے چہرے کا رنگ اڑ گیا ہے؟ تم لمحہ بہ لمحہ سفید پڑتے جا رہے ہو کلنٹن۔ آئینے میں ذرا اپنی شکل تو دیکھو۔''

کلنٹن نے کہا۔ ''تم کچھ کرنا چاہتے ہو تو شروع ہو جاؤ۔ ابھی موقع ہے ورنہ پھر ہم ہیڈ کوارٹر چلتے ہیں۔''

''تم اب تک فرار کا راستہ تلاش کر رہے ہو؟'' فورمین نے تمسخر اڑاتے ہوئے کہا۔ ''کلنٹن، تم ایسا نہیں کر سکو گے۔ تمہیں اپنا فرض چکانا پڑے گا۔''

کلنٹن اپنی نشست سے اٹھا اور خاموشی کے ساتھ کچن سے نکل گیا۔ چند منٹ بعد وہ جب واپس آیا تو اس نے کوٹ پہنا ہوا تھا اور اس کے ہاتھ میں کھلی ہوئی ہتھکڑی لٹک رہی تھی۔ ''چلو جلدی کرو۔'' اس نے لہجہ مضبوط بناتے ہوئے فورمین سے کہا۔ ''ہاتھ آگے بڑھاؤ، ہمیں فوراً ہیڈ کوارٹر چلنا ہے۔''

فورمین نے آہستہ آہستہ ایک ہاتھ میز کی سطح پر پھیلا دیا اور پھر کلنٹن کے چہرے پر نظریں جمائے اس ہاتھ کی آستین چڑھانے لگا۔ کہنی سے اوپر سفید جلد پر ایک لمبے زخم کا نشان واضح طور پر نمایاں تھا جس میں ٹانکے بھی آئے تھے۔ ''اس دن جھیل کے اندر گاڑی کا شیشہ توڑتے ہوئے یہ زخم آیا تھا۔'' اس نے آہستہ آہستہ ایک ایک لفظ چباتے ہوئے کہا پھر وہ خاموش ہو گیا۔ اس کی نظریں بدستور کلنٹن

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں اور ان سے تمسخر جھلک رہا تھا۔
کلنٹن کے ہونٹ سفید پڑ گئے۔ اس نے ایک بار پلکیں جھپکائیں اور ہتھکڑی فورمین کی دوسری کلائی میں ڈال دی۔ کلک کی آواز کے ساتھ ہتھکڑی بند ہوگئی۔
فورمین اپنی نشست سے اٹھ گیا اور کلنٹن کے پیچھے پیچھے کچن سے باہر نکل آیا۔ ''تم نے جس کام کا بیڑا اٹھایا ہے اسے پورا نہیں کرسکو گے۔'' اس نے ٹھہرے ہوئے پرسکون لہجے میں کہا۔ ''ناکامی تمہارے چہرے پر لکھی ہوئی ہے۔ تم اپنے محسن کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کرسکتے۔''
کچن کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ اس پر لٹکا ہوا پردہ ایک کنارے سے کھسکا ہوا تھا۔ کلنٹن نے کھڑکی کے پاس سے گزرتے ہوئے ہتھکڑی کی چابی باہر اچھال دی۔
''تمہیں اپنی ذات پر اعتماد نہیں رہا۔ تمہیں معلوم ہے کہ جو کام تم کرنے جارہے ہو، وہ غلط ہے۔ تم اپنے ضمیر کی ملامت سے خوف زدہ ہو کہ وہ کہیں تمہیں صحیح کام کرنے پر مجبور نہ کردے۔''
بچی کی فریم شدہ تصویر میز پر اوندھی رکھی ہوئی تھی۔ فورمین نے قریب سے گزرتے ہوئے الٹی تصویر کو دیکھا۔ ''تمہیں جرأت پیدا کرنے کے لیے یہ کام بھی کرنا پڑا؟'' اس نے کہا اور کلنٹن نے نشست گاہ سے باہر نکلتے ہوئے بٹن دبا کر روشنی گل کردی۔ تصویر تاریکی میں مدغم ہوگئی۔ باہر اتنی روشنی نہیں پھیلی تھی جو کمروں کے کونوں کو بھی روشن کردیتی۔
''اس سے کیا ہوتا ہے۔'' فورمین نے اس کی توجہ مبذول کراتے ہوئے کہا۔ ''تصویر نہ سہی، تم اپنی بچی کو تو روز دیکھو گے۔ تم اس کا چہرہ تو اس طرح الٹا کر کے نہیں چھپا سکتے، اس کا تم کیا کرو گے؟''
کلنٹن نے داخلی دروازہ کھولا اور فورمین کو ساتھ لے کر باہر نکل آیا۔ ''نہ تو میں گڑگڑاؤں گا، نہ تم سے رحم کی بھیک مانگوں گا۔'' فورمین نے کہا۔ ''میں تمہارے لیے اس معاملے کو اتنا زہریلا بنادوں گا کہ تم اسے حلق سے نیچے نہیں اتار سکو گے۔ اگر میں بزدل ہوتا، کمزور ہوتا تو تمہارے لیے یہ مسئلہ بہت آسان ہوجاتا، کیوں ٹھیک ہے نا؟''
قاتل کا قیاس درست تھا۔ اس کا مشاہدہ غیر معمولی تھا۔ اگر وہ کلنٹن کے سامنے گڑگڑاتا، التجا کرتا، مزاحمت کرتا یا مفرور مجرم کا کردار پیش کرتا تو اپنے احسان کا حق کمزور کرلیتا۔ کلنٹن اسے فوراً زمین پر گھسیٹتا ہوا ہیڈ کوارٹر لے جاتا لیکن اس نے احسان کا قرض وصول کرنے کا جو طریقہ اختیار کیا تھا وہ.....

کلنٹن نے دروازہ مقفل کیا اور دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگے۔
''تمہیں اس کارنامے پر تمغا دیا جائے گا۔'' فورمین نے نشتر چبھوتے ہوئے کہا۔ ''ترقی بھی دی جائے گی۔ تم لیفٹیننٹ سے کیپٹن بن جاؤ گے۔ تمہارے ساتھی رشک بھری نظروں سے تمہیں دیکھیں گے۔ کوئی بھی احسان فراموشی پر تمہیں طعنے نہیں دے گا۔ کوئی بھی تم سے یہ نہیں کہے گا کہ ایک آدمی تم پر اعتماد کر کے تمہاری پناہ میں آیا تھا۔ وہ تمہارا محسن تھا جس نے تمہیں ایک زندگی بخشی تھی اور تم نے اس کے احسان کا، اس کے اعتماد کا یہ بدلہ دیا۔ کلنٹن! تم خدا کی بنائی ہوئی زمین پر حقیر ترین، ذلیل ترین شے ہو۔ کسی آوارہ کتے کو اگر کوئی کبھی ایک لقمہ کھلادے تو وہ کتا بھی ہمیشہ احسان مند ہوتا ہے۔ اس ہاتھ پر کبھی نہیں لپکتا جس نے ایک بار اس کے منہ میں لقمہ ڈالا ہو۔''
''خاموش رہو۔'' کلنٹن نے چیخ کر کہا۔
وہ آہستہ آہستہ پہاڑی پر سے اترتے رہے۔ سڑک کے دونوں جانب استادہ بجلی کے کھمبے روشنی کھو چکے تھے۔ جیسے ہی وہ کونے پر ٹھہرے مقامی تھانے کے دروازے پر جلتا ہوا سبز رنگ کا بلب دور ہی سے نظر آگیا۔ بلب پر نظر پڑتے ہی فورمین اس طرح جھجکا جیسے وہ اندر ہی اندر سکڑ گیا ہو۔
''اگر تم مجھے اندر لے گئے تو وہ مجھے جان سے ماردیں گے۔'' فورمین نے کہا۔ ''تمہیں معلوم ہے، تم جانتے ہو میں غلط نہیں کہہ رہا۔ اس کے بعد تم کچھ بھی کرو، کتنا ہی زور لگاؤ، دنیا کی کوئی طاقت مجھے زندہ باہر نہیں نکال سکے گی۔ ابھی وقت ہے، ابھی کچھ نہیں بگڑا کلنٹن ..... سوچ لو۔ میں نے تمہاری بچی کی زندگی تمہیں لوٹائی تھی۔ اب میں اس کے عوض آخری بار تم سے ایک زندگی طلب کرتا ہوں۔ میری اپنی زندگی، میرا قرض واپس لوٹا دو۔ میرا حساب بے باق کردو۔''
کلنٹن کا چہرہ پسینے میں نہا گیا۔ صبح کی سپیدی میں اس کے چہرے کا رنگ ہلکا سٹیٹی نظر آرہا تھا۔ اس کے جبڑے سختی کے ساتھ بھنچے ہوئے تھے۔ اس نے ایک ہاتھ کی کہنی بلند کی اور فورمین کی پسلیوں میں ٹھوکا دیا۔
''تم انسان نہیں ہو۔'' فورمین نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔
''تم پولیس والے ہو۔'' اس نے سڑک پر تھوک دیا

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

اور بے خوفی سے تھانے کی طرف بڑھنے لگا۔

☆☆☆

لیفٹیننٹ کلنٹن گاڑی سے اترا۔ فورمین اس کے ساتھ تھا۔ وہ بالکل خاموش تھا۔ وہ ساتھ ساتھ ہیڈ کوارٹر کی عمارت میں داخل ہوئے اور ایک طویل راہداری طے کرتے ہوئے ایک کمرے میں چلے گئے۔ میز کے پیچھے شعبۂ قتل کے کیپٹن اسٹرگس نے فون پر کسی سے گفتگو مختصر کرکے ٹیلیفون بند کردیا اور سوالیہ نظروں سے لیفٹیننٹ کلنٹن کی طرف دیکھنے لگا۔

''ملزم فورمین حاضر ہے کیپٹن۔'' لیفٹیننٹ کلنٹن نے عجیب سے سپاٹ لہجے میں کہا۔

کیپٹن اسٹرگس کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا۔ وہ جوش میں اپنے ماتحت کی غیر فطری حالت کو محسوس کرنا بھول گیا۔ اگر اس نے کلنٹن پر طاری وہ عجیب سی کیفیت محسوس کرلی تھی تو اس کی اہمیت سمجھنے میں ناکام رہا تھا اس نے میز میں لگا ہوا بٹن دبا دیا۔

لیفٹیننٹ کلنٹن اس اثنا میں اپنا بغلی ہولسٹر نکال کر کیپٹن کے سامنے میز پر رکھ چکا تھا۔ اس نے سینے پر لگا ہوا شاتی بیج نوچ کر ہولسٹر کے پاس پھینک دیا پھر کوٹ کی اندرونی جیب سے ایک تہ شدہ کاغذ نکال کر اسے احتیاط سے میز پر رکھ دیا۔

''یہ ریوالور ہے ..... یہ بیج ہے اور یہ رہا میرا استعفا۔''

حیرت کی شدت سے کیپٹن اسٹرگس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ مسرت کی وجہ سے چہرے پر امنڈنے والی سرخی زردی میں تبدیل ہوگئی۔ قوتِ گویائی سلب ہوگئی پھر بڑی مشکل سے اس کے حلق سے صرف یہ آواز نکل سکی۔

''استعفا؟''

''میں ایسی ملازمت پر لعنت بھیجتا ہوں جو انسان کو کتے سے بھی بدتر بنا دے۔''

''سنو کلنٹن! ایک منٹ..... ادھر آؤ!''

لیکن لیفٹیننٹ کلنٹن جو صرف کلنٹن رہ گیا تھا، کمرے سے باہر نکل چکا تھا۔

☆☆☆

ٹیلیفون کی گھنٹی نے انہیں چونکا دیا۔ وہ نشست گاہ میں بیٹھے شام کے وقت کافی پیتے ہوئے رگوں میں تازگی پیدا کررہے تھے۔ کلنٹن نے اٹھ کر ریسیور کان سے لگایا۔

''ہیلو کلنٹن ہے۔''

''بول رہا ہوں۔'' آواز پہچانتے ہی اس کے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ ابھر آئی۔

''لیفٹیننٹ ..... اس نے تمہارے لیے آخری پیغام چھوڑا تھا۔ میں نے سوچا کہ میں خود تمہیں وہ پیغام پہنچادوں۔ تم سمجھ گئے نا میں کس کی بات کررہا ہوں؟''

''ٹھیک ہے میں سمجھ گیا۔ کیا کہا اس نے؟'' کلنٹن کی گرفت ریسیور پر مضبوط ہوگئی اور اس کے اعصاب تن گئے۔ کمرے کی فضا یک لخت تبدیل ہوگئی جسے اس کی بیوی اور بچی نے فوراً محسوس کرلیا۔ وہ ہاتھ روک کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔

''اس نے کہا تھا کہ کلنٹن سے کہنا کہ ہماری ملاقات پھر ہوگی۔ وہ جب چاہے مجھے اس کی آنکھوں میں تلاش کرسکتا ہے۔ اس سے کہنا کہ وہ مجھے ہمیشہ اپنا منتظر پائے گا۔''

''شکریہ کیپٹن۔''

''لیکن کلنٹن.....''

کلنٹن نے آہستہ سے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ چند لمحے وہ چپ چاپ اسی طرح کھڑے کچھ سوچتا رہا۔ پھر وہ پلٹا، اس نے اپنی بچی کی طرف دیکھا جو یوں خوشگوار ماحول کو کشیدہ ہوتے دیکھ کر پریشان سی نظر آرہی تھی۔

''باربرا..... ادھر آؤ، میرے پاس۔''

بچی سہمے ہوئے انداز میں کرسی سے اٹھی اور اپنے ڈیڈی کے قریب آکر کھڑی ہوگئی۔ کلنٹن نے جھک کر اس کی نیلی نیلی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا۔

''آپ کیا دیکھ رہے ہیں ڈیڈی؟'' بچی نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا۔ اس کی بیوی دہشت زدہ سی خاموش بیٹھی ہوئی تھی۔

''کچھ نہیں گڑیا۔'' کلنٹن ایک گہرا سانس لیتے ہوئے سیدھا کھڑا ہوگیا۔ ''میں دیکھ رہا تھا کہ کہیں تمہاری آنکھوں میں ایک شیطان تو نہیں چھپ گیا۔''

''شیطان؟'' بچی نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔ ''پھر نظر آیا آپ کو؟''

''شیطان تو نہیں، ہاں تمہاری آنکھوں میں مجھے خالق کی شبیہ ضرور نظر آئی جسے شاید میں کبھی نہ دیکھ پاتا اور شاید آئندہ بھی کبھی نہ دیکھ سکوں۔''

بچی نہ سمجھنے والے انداز میں مسکراتی ہوئی اپنی ماں کے پاس آگئی۔ کلنٹن بھی مسکراتا ہوا اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔ وہ بہت مسرور اور مطمئن نظر آرہا تھا جیسے اس کے سر سے بہت بڑا بوجھ ہٹ گیا ہو۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

نفس کا قیدی

ملک صفدر حیات

جتنی یہ کائنات پرانی ہے شاید زن، زر، زمین کا جھگڑا بھی اتنا ہی پرانا ہے۔ فقط چہرے بدل جاتے ہیں۔ جذبات کا بہاؤ وہی رہتا ہے۔ ویسے ہی نفس اپنی ذات کو اہمیت دیتا ہے اور پھر ہمیشہ کی طرح ایک چور خیال اسے اپنا مفاد حاصل کرنے کے لیے جرائم کی جانب چپکے سے دھکیل دیتا ہے۔ انسان کتنی خوبصورتی اور مکاری سے ایک محبت پانے کے لیے دوسری تمام محبتوں کا خون کرکے جانے کیسے خوش اور مطمئن رہ لیتا ہے... مگر ایسا ہمیشہ ممکن نہیں شاید، کیونکہ ضمیر کی تلوار اسے نہ تو خوش رہنے دیتی ہے اور نہ ہی سکون کا سانس لینے دیتی ہے۔ وہ بھی بھاگتا پھر رہا تھا... اپنے ہی سائے سے خوفزدہ تھا لیکن لہو کی ایک ایک بوند اپنے قاتل کا پتا دے رہی تھی۔ ملک صفدر جیسے مسیحائوں کو انصاف کے لیے ڈھونڈ رہی تھی۔ ایسے میں بھلا بکرے کی ماں کب تک خیر مناتی... اور پھر شر پھیلانے والوں کو خیر کبھی پناہ نہیں دیتا تو اسے کیسے پناہ مل سکتی تھی۔

ایک ماں جائے کی سنگدلی اور خودغرضی کا دلخراش واقعہ

مئی کا مہینا جارہا تھا۔ گرمی عروج پر تھی۔ دھوپ میں ایسی تیزی تھی کہ سورج کی شعاعیں بدن کے آر پار ہوجاتی تھیں اور چند لمحے کھلے آسمان میں رہنے کے بعد یوں محسوس ہوتا تھا کہ کھوپڑی میں سے بھیجا پگھل کر چہرے پر آجائے گا۔

موسم شدید ہو یا لذیذ، سب اسی کی قدرت کا کرشمہ ہے جو کل کائنات کا مالک ہے اور اس کا کوئی بھی کام مصلحت سے خالی نہیں ہوتا۔ مئی میں گندم کی فصل تیار ہوجاتی ہے اور اس فصل کی پکائی کے لیے تیز دھوپ درکار ہوتی ہے۔ انسان اگر صبر اور شکر سے کام لے تو وہ قدرت کی بے بہا رحمتوں سے کما حقہ استفادہ کرسکتا ہے۔

ان دنوں گندم کی کٹائی کا دور چل رہا تھا۔ ایسی ہی ایک حبس زدہ صبح میں تیار ہوکر تھانے پہنچا تو ایک اندوہناک خبر میری منتظر تھی۔ مرزا پور سے دو افراد آئے تھے اور انہوں نے بتایا کہ ایک بندے کا قتل ہوگیا ہے۔

میں نے باری باری اطلاع کنندگان کے چہروں کا جائزہ لیا۔ وہ سیدھے سادے دیہاتی تھے۔ میں نے پوچھا۔ ''کون قتل ہوا؟''

''جیلا.....'' ایک نے بتایا۔ ''اس کا اصل نام تو جمیل ہے مگر لوگ اسے جیلا کہتے ہیں۔''

''قتل کی واردات کس جگہ ہوئی ہے؟'' میں نے سوال کیا۔ ''اور قاتل کون ہے؟''

''قاتل کا تو کچھ پتا نہیں سرکار۔'' مسکین صورت والے ایک دیہاتی نے جواب دیا۔ ''جیلا کی شادی ہونے والی تھی..... اس کی لاش ادھر کھیتوں میں پڑی ہے۔''

میرے استفسار پر انہوں نے بتایا کہ وہ مرزا پور سے تعلق رکھتے تھے اور یہ واقعہ بھی مرزا پور کے علاقے ہی میں پیش آیا تھا۔ ان دنوں میری تعیناتی ضلع شیخوپورہ کے ایک دور دراز تھانے میں تھی۔ مرزا پور میرے تھانے کی حدود میں آتا تھا۔ مرزا پور نامی یہ گاؤں ضلعی سرحد پر

WWW.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

Downloaded From
Paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

Downloaded From Paksociety.com

واقع تھا۔ اس کی مغربی سمت میں ضلع لائل پور (موجودہ فیصل آباد) اور جنوبی سمت میں ضلع اوکاڑہ تھا۔ ضلع اوکاڑہ اور شیخوپورہ کے درمیان دریائے راوی رواں دواں تھا۔ اگر اوکاڑہ سے مشرقی جانب سفر کریں تو راوی کے ساتھ ساتھ ضلع قصور اور پھر ضلع لاہور آتا تھا۔ شیخوپورہ بہ یک وقت راوی کے کنارے سے لاہور، قصور اور اوکاڑہ سے جڑا ہوا تھا۔ یہی راوی آگے مغربی جانب ہڑپہ اور ملتان کو ٹچ کرتا تھا جب کہ اس کا بالائی کنارہ لائل پور اور ٹوبہ ٹیک سنگھ سے لگا ہوا تھا۔

میں نے ایک کانسٹیبل کو ساتھ لیا اور اطلاع کنندگان کے ہمراہ جائے وقوعہ پر پہنچ گیا۔ تاحدِ نگاہ کھیتوں کا وسیع سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ یہ مرزا پور کی زرعی اراضی تھی جو مغربی سمت آگے جا کر ضلع لائل پور کی اراضی سے مل جاتی تھی۔ لائل پور کی حدود میں پہلا گاؤں حویلی مراد تھا۔ مرزا پور اور حویلی مراد میں لگ بھگ آٹھ میل کا فاصلہ تھا۔ یہ دونوں اپنے اپنے ضلع کے سرحدی گاؤں تھے۔

جائے وقوعہ ایک ایسا کھیت تھی جس میں آدھی فصل کی کٹائی ہو چکی تھی اور آدھی فصل ابھی باقی تھی۔ مقتول جمیل عرف جیلا کی لاش کھیت کے اس حصے میں پڑی تھی جہاں کٹائی کا عمل جاری تھا۔

میں اکڑوں بیٹھ کر جیلا کی لاش کا معائنہ کرنے لگا۔ مقتول کی کھوپڑی کا برا حشر کیا گیا تھا۔ سر کے عقبی حصے میں کسی بھاری آہنی شے سے ایسی خوف ناک ضرب لگائی گئی تھی کہ اس کی کھوپڑی چیخ کر رہ گئی تھی۔ کھوپڑی کی حالت بتاتی تھی کہ اس مہلک ضرب کے بعد وہ چند منٹ میں ''انا للہ'' ہو گیا ہوگا۔ سر والی چوٹ سے نکلنے والے خون نے اس کا چہرہ اور بدن کا بالائی حصہ تر بہ تر کر دیا تھا تاہم اس وقت وہ خون جم کر خشک ہو چکا تھا۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق، جیلا کو موت کے منہ میں گئے بارہ گھنٹے سے زیادہ کا وقت ہو چکا تھا۔

میں نے الٹ پلٹ کر جیلا کی لاش کا معائنہ کیا تو اس کے بائیں ہاتھ پر ایک پٹی بندھی دکھائی دی۔ پٹی والا کپڑا بھی خون آلود تھا اور یہ خون اس کے ہاتھ والے زخم سے خارج ہو کر کپڑے تک پہنچا تھا۔ جیلا کی کھوپڑی کے عقبی حصے پر لگنے والی چوٹ سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس کی بے خبری میں سر کو نشانہ بنایا گیا تھا۔ اس کی لاش کے قریب ہی درانتی بھی پڑی ہوئی تھی اور ایک جانب کٹی ہوئی گندم کا انبار بھی دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں قطعاً کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی کہ اپنی موت سے قبل مقتول بڑے انہماک سے گندم کی کٹائی میں مصروف تھا کہ کسی شقی القلب شخص نے کسی بھاری آہنی چیز سے ضرب لگا کر اسے موت کی نیند سلا دیا تھا۔

جیلا کی لاش کا تفصیلی جائزہ کر لینے کے بعد میں نے جائے وقوعہ کا جائزہ لیا۔ آلۂ قتل بازیاب نہ ہو سکا۔ جیلا کی لاش کو چلچلاتی دھوپ میں رکھنا مناسب نہیں تھا لہٰذا میں نے اس کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے ضلعی اسپتال بھجوا دیا پھر موقع پر موجود افراد سے پوچھ گچھ کرنے لگا۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق، وہاں ایک درجن سے زیادہ لوگ موجود تھے جن میں مقتول کا باپ رفیق اور بڑا بھائی شکیل بھی شامل تھے۔ یہ تینوں باپ بیٹے آج کل گندم کی کٹائی میں مصروف تھے۔ رفیق پندرہ ایکڑ اراضی کا مالک تھا اور یہی اراضی ان کا ذریعۂ روزگار تھا۔

رفیق کی عمر پچاس سے متجاوز تھی۔ وہ عام سی شکل صورت کا مالک ایک کسان تھا۔ جوان بیٹے کی موت نے اسے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ میں اسے لے کر ایک درخت کے نیچے آ بیٹھا۔ وہاں پر موجود افراد نے ہمارے لیے ایک چارپائی کا بندوبست کر دیا تھا۔

''رفیق!'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''مجھے تمہارے بیٹے کی المناک موت کا بہت دکھ ہے۔ میں اسے زندہ تو نہیں کر سکتا لیکن یہ میرا وعدہ ہے کہ بہت جلد میں جیلا کے قاتل کو کیفرِ کردار تک پہنچا دوں گا۔''

''تھانے دار صاحب! جیلا کی چند ماہ بعد شادی ہونے والی تھی۔'' وہ روہانسی آواز میں بولا۔ ''پتا نہیں، کس ظالم کی نظر اسے کھا گئی۔''

''جیلا کو جس ظالمانہ انداز میں موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قاتل کے دل میں اس کے لیے بہت زیادہ نفرت تھی۔'' میں نے رفیق کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اب تم مجھے بتاؤ گے کہ جیلا کی دشمنی کس شخص سے تھی؟''

''کسی سے نہیں جناب۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''جیلا تو اپنے کام سے کام رکھتا تھا۔ اس کے نہ تو دوست تھے اور نہ ہی دشمن۔ دونوں بھائی مل کر کھیتی باڑی میں میرا ہاتھ بٹاتے تھے۔''

''لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ کوئی خوامخواہ کسی کی جان نہیں لیتا۔'' میں نے کہا۔ ''میں کسی بھی قیمت پر یہ نہیں مان سکتا کہ بغیر دشمنی کے تمہارے بیٹے کو اتنی بے دردی سے قتل

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

کر دیا گیا.....''

''میں کیا کہوں جی۔'' وہ بے چارگی سے بولا۔ ''سو ہنار ب ہی بہتر جانتا ہے۔''

''تم نے بتایا ہے کہ چند ماہ بعد جیلا کی شادی ہونے والی تھی۔'' میں نے رفیق کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے استفسار کیا۔ ''تم نے مقتول کا رشتہ کہاں طے کیا تھا؟''

''اپنے بڑے بھائی صدیق کی لڑکی سے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''نبیلہ صدیق کی اکلوتی بیٹی ہے۔''

''کیا تمہارا بھائی صدیق بھی مرزا پور ہی میں رہتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں جناب۔'' اس نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بتایا۔ ''صدیق مرزا پور سے آٹھ میل دور ایک گاؤں حویلی مراد میں رہتا ہے جناب۔ وہاں اس کی مٹھائی اور دودھ دہی کی دکان ہے۔''

اگرچہ مرزا پور اور حویلی مراد کے بیچ اور کوئی گاؤں نہیں پڑتا تھا۔ یہ دونوں دیہات زرعی اراضی کے ذریعے ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے لیکن سرحدی تقسیم کی رو سے مرزا پور ضلع شیخوپورہ میں اور حویلی مراد ضلع لائل پور میں شمار ہوتا تھا۔

''رفیق! ایک بات کا سوچ سمجھ کر جواب دینا۔'' میں نے رازدارانہ انداز میں کہا۔ ''اس رشتے کے حوالے سے تمہاری یا جیلا کی کسی سے کوئی ناراضی یا لڑائی وغیرہ تو نہیں ہوئی تھی؟''

''بالکل نہیں تھانے دار صاحب۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔''

''اور ادھر حویلی مراد کے بارے میں کیا کہتے ہو؟''

''جی..... میں سمجھا نہیں!'' وہ اُلجھن زدہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

''میرا مطلب ہے، جیلا سے رشتہ طے ہونے سے پہلے نبیلہ کے لیے کوئی اور رشتہ بھی آیا تھا؟'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''کوئی ایسا رشتہ جسے تمہارے بھائی نے ٹھکرا دیا ہو اور وہ جیلا کا دشمن بن گیا ہو.....؟''

''دیکھیں جی، جس گھر میں بیری کا درخت لگا ہو، وہاں پتھر تو آتے ہی ہیں۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''اسی طرح جس گھر میں جوان لڑکیاں یا لڑکی ہو، وہاں رشتے بھی آیا ہی کرتے ہیں۔ ظاہر ہے، نبیلہ کے لیے بھی رشتے آئے ہوں گے لیکن میرے علم میں ایسی کوئی بات نہیں کہ صدیق کے انکار پر کوئی صدیق کا یا جیلا کا دشمن بن گیا ہو۔ اس سلسلے میں تو صدیق ہی آپ کو بتا سکتا ہے۔''

''ٹھیک ہے، یہ سوال میں صدیق ہی سے کروں گا۔'' میں نے کہا پھر پوچھا۔ ''تم نے بتایا ہے کہ تم تینوں باپ بیٹے مل کر کھیتی باڑی کرتے ہو۔ کیا کل بھی تم تینوں ہی کھیتوں میں موجود تھے؟''

''جی نہیں۔'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''میری کمر میں شدید تکلیف تھی اس لیے میں گھر پر آرام کر رہا تھا۔ جیلا اور شیلا کو میں نے گندم کی کٹائی کے لیے کھیتوں میں بھیج دیا تھا۔''

شیلا سے اس کی مراد جیلا کا بڑا بھائی شکیل تھی۔ میں نے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔ ''اب تمہاری کمر کی تکلیف کا کیا حال ہے؟''

''جناب! کیا بتاؤں.....'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''اس واقعے نے تو میری کمر ہی توڑ دی ہے..... مجھے اپنی کوئی تکلیف یاد نہیں..... میرا جوان جہان پتر قتل ہو گیا.....''

میں رفیق کے جذبات اور احساسات کو بہ خوبی سمجھ رہا تھا۔ جوان بیٹے کی الم ناک موت نے بوڑھے باپ پر قیامت ڈھا دی تھی اور بیٹا بھی وہ جس کی چند ماہ بعد شادی ہونے والی تھی۔

''میں نے جیلا کے بائیں ہاتھ پر ایک پٹی بندھی دیکھی ہے۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''کیا تم اس بارے میں کچھ بتا سکتے ہو؟''

''وہ پٹی تو میں نے بھی دیکھی ہے تھانے دار صاحب۔'' وہ کمزور سی آواز میں بولا۔ ''کل صبح گھر سے جب وہ نکلا تھا تو اس کے دونوں ہاتھ سلامت تھے۔ لیکن فصل کی کٹائی کے دوران میں اس کے ہاتھ پر چوٹ لگ گئی تھی اس لیے پٹی باندھی تھی۔''

''ہوں.....'' میں نے خود کلامی کے انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ''جیلا عموماً کتنے بجے تک کھیتوں سے گھر آجایا کرتا تھا؟''

''ہم تینوں مغرب کی اذان سے پہلے ہی کام روک دیا کرتے تھے۔'' اس نے بتایا۔ ''پھر ایک ساتھ ہی گھر جاتے تھے۔''

''کل تم کمر کی تکلیف کے باعث کھیتوں میں آئے ہی نہیں تھے۔'' میں نے کہا۔ ''کیا جیلا اور شیلا مغرب کی اذان سے پہلے گھر پہنچے تھے؟''

''صرف شیلا پہنچا تھا جناب!'' اس نے جواب دیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

"جیلا اس کے ساتھ نہیں تھا۔ جب میں نے شیلا سے جیلا کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ فصل کاٹتے ہوئے درانتی سے جیلا کا ہاتھ زخمی ہوگیا تھا لہٰذا اس نے جیلا کے ہاتھ پر پٹی باندھی اور اسے گھر جانے کے لیے کہہ دیا پھر وہ خود اپنے کام میں مصروف ہوگیا تھا۔"

"اوہ....." میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔

"جیلا مغرب کی اذان سے پہلے ہی کھیتوں سے روانہ ہوگیا لیکن گھر نہیں پہنچا..... کیا تم بتاسکتے ہو کہ جیلا کتنے بجے کھیتوں سے نکلا تھا؟"

"اگر آپ یہ سوال شیلا سے کریں تو وہ آپ کو بہتر طور پر بتاسکے گا۔" وہ بے بسی سے بولا۔ "میرا دماغ کام نہیں کررہا تھانے دار صاحب۔"

"ٹھیک ہے، باقی کی پوچھ گچھ میں شیلا سے کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "بس، تم آخری سوال کا جواب دے دو....." لمحاتی توقف کرکے میں نے ایک گہری سانس لی پھر پوچھا۔

"جب گزشتہ رات جمیل عرف جیلا گھر نہیں پہنچا تو آپ لوگوں کو تشویش نہیں ہوئی۔ آپ لوگوں نے اسے تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی؟"

"ہم نے پورا مرزا پور چھان مارا تھا۔" وہ دکھی لہجے میں بولا۔ "پوری رات ہم نے پریشانی میں جاگ کر گزاری ہے۔ اس کی ماں کا تو برا حال تھا۔ ہماری نظریں گھر کے دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ ہوا سے دروازہ ہلتا تھا تو یہی لگتا تھا کہ جیلا آگیا ہے لیکن وہ نہیں آیا..... اور پھر صبح اس کی موت کی خبر آگئی....."

"جیلا کی موت کی خبر آپ لوگوں تک کس نے پہنچائی تھی؟" میں نے استفسار کیا۔

"شوکت علی نے۔" رفیق نے بتایا۔

"کون شوکت علی؟"

"مرزا پور ہی کا وسنیک ہے جی۔" اس نے جواب دیا۔ "چار سال پہلے فوج میں بھرتی ہوا تھا۔ آج کل چھٹی پر گاؤں آیا ہوا ہے۔"

"ٹھیک ہے رفیق!" میں نے اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "اب تم گھر جاکر آرام کرو۔ اگر کوئی ضروری بات ہوئی تو میں تمہیں تھانے بلالوں گا یا خود تمہارے گھر آجاؤں گا۔"

میں نے رفیق کو فارغ کرنے کے بعد موقع پر موجود افراد سے بھی پوچھ گچھ کی لیکن کوئی خاص بات پتا نہ چل سکی۔

تھوڑی دیر بعد فوجی جوان شوکت علی بھی وہاں آگیا تو میں نے اس سے بھی دو باتیں کرلیں۔

شوکت علی کی عمر پچیس کے اریب قریب رہی ہوگی۔ وہ ایک گبرو جوان تھا، میں نے رسمی علیک سلیک کے بعد اس سے کہا۔

"شوکت علی! مجھے پتا چلا ہے کہ جیلا کی لاش آج صبح تم نے دریافت کی ہے؟"

"میں نے نہیں..... ڈبو نے۔" وہ ذومعنی انداز میں بولا۔

میں نے الجھن زدہ انداز میں پوچھا۔ "ڈبو کون؟"

"ڈبو میرے کتے کا نام ہے۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

"اوہ....." میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تفصیلات کیا ہیں؟"

"تھانے دار صاحب! میں نے ایک بل ڈاگ پالا ہوا ہے۔" اس نے بتایا۔ "اگرچہ میرا زیادہ تر وقت پاک وطن کی سرحدوں کی حفاظت میں گزرتا ہے لیکن میں جب بھی چھٹی پر مرزا پور آتا ہوں تو ڈبو پر خاص توجہ دیتا ہوں جس میں صبح کی سیر بھی شامل ہے۔" وہ لمحے بھر کو رکا۔ ایک گہری سانس لی پھر سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔

"آج صبح بھی میں ڈبو کے ساتھ دریا کی طرف جارہا تھا۔ جب میں رفیق کے کھیتوں میں سے گزرا تو ڈبو نے ایک طرف گردن اٹھا کر زور زور سے بھونکنا شروع کردیا۔ میں نے اس کی "آواز" پر توجہ دی اور اس کی رسی کو ڈھیلا کردیا پھر خود بھی اس کے ہمراہ بھاگنے لگا۔ ڈبو مجھے اس مقام پر لے گیا جہاں جیلا کی لاش پڑی تھی۔ بس، یہ ہے ساری کہانی۔"

کتا بہت حساس جانور ہے۔ اس کی سونگھنے کی حس بہت تیز ہوتی ہے۔ اسی طرح اس کی سننے کی حس بھی قابلِ ذکر ہے۔ ڈبو نے اپنی قوتِ شامہ اور قوتِ سماعت کی مدد سے جیلا کی لاش کو دریافت کرلیا تھا۔ میں نے سب کو فارغ کیا اور شکیل عرف شیلا سے پوچھ گچھ کرنے لگا۔

مقتول جمیل عرف جیلا کی عمر کا اندازہ میں نے بیس کے آس پاس لگایا تھا۔ شکیل عرف شیلا اپنے مقتول بھائی سے پانچ سال بڑا تھا۔ میں نے نہایت ہی مختصر مگر مناسب الفاظ میں شیلا سے، جیلا کو پیش آنے والے واقعے پر گہرے دکھ اور رنج کا اظہار کیا پھر پوچھا۔

"مجھے پتا چلا ہے کہ تم نے کل جیلا کو شام سے پہلے گھر بھیج دیا تھا لیکن وہ گھر نہیں پہنچا اور آج صبح اس کی لاش ملی ہے۔ یہ کیا معما ہے؟"

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

''میری تو خود کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا نے دار صاحب۔'' وہ خواب ناک لہجے میں بولا۔ ''پتا نہیں، کس ذلیل انسان نے میرے بھائی کی جان لے لی۔ بھائی، بھائی کا بازو ہوتا ہے.....'' اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔ ''اب میں جیلا کے بغیر کیسے جی سکوں گا.....!''

اس کی نم آنکھیں اندر سے کبوتر کے خون کے مانند سرخ ہو رہی تھیں۔ یقیناً رفیق کی طرح وہ بھی ساری رات جاگتا رہا ہوگا۔ یہ لالی رت جگے ہی کی تھی۔ اس پر مستزاد چھوٹے بھائی کی حسرت ناک موت نے اسے اندر باہر سے توڑ کر رکھ دیا تھا۔

''وہ ذلیل انسان زیادہ دیر تک میرے ہاتھ سے بچ نہیں سکتا۔'' میں نے شکیل کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں حوصلے سے کام لینا ہوگا اور میرے ساتھ تعاون بھی کرنا ہوگا۔''

''میں ہر قسم کے تعاون کے لیے تیار ہوں جی۔'' وہ ہاتھ کی پشت سے اپنی آنکھوں میں اتر آنے والے آنسوؤں کو صاف کرتے ہوئے بولا۔ ''آپ حکم کریں۔''

پتا نہیں، کیوں..... مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے اس کا لہجہ، اس کی سوچ کا ساتھ نہ دے رہا ہو۔ مطلب یہ کہ اس کے الفاظ... اور چہرے کے تاثرات میں ربط نظر نہیں آتا تھا۔ شاید یہ فرطِ غم کا نتیجہ تھا۔ جیلا کی ناگہانی موت نے اسے بری طرح نڈھال کر رکھا تھا۔

''مجھے بتایا گیا ہے کہ تم نے پچھلے روز جیلا کو شام سے پہلے گھر بھیج دیا تھا۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''اس کی کوئی خاص وجہ؟''

''گندم کاٹتے ہوئے اس کے بائیں ہاتھ پر درانتی چل گئی تھی جس نے جیلا کی دو انگلیوں کو بری طرح زخمی کر دیا تھا۔'' شیلا وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''میں نے جلدی سے اس کے ہاتھ پر پٹی باندھی اور اسے گھر جانے کے لیے کہا۔ بس، اتنی سی بات ہے۔''

''ہاتھ زخمی ہونے والا واقعہ کل کتنے بجے پیش آیا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''عصر کا وقت تھا جی۔'' اس نے بتایا۔ ''میں نے اذان کی آواز بھی سنی تھی۔''

''تو کیا تمہارے کہنے پر جیلا گھر چلا گیا تھا؟''

''پتا نہیں جناب۔'' وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا۔ ''میں نے دیکھا نہیں تھا۔''

''دیکھا نہیں تھا..... کیا مطلب؟'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''کیا تم دونوں بھائی ایک ہی کھیت میں فصل کی کٹائی نہیں کر رہے تھے؟''

''جی نہیں۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''جیلا تو اسی کھیت میں گندم کاٹ رہا تھا جہاں اس کی لاش پڑی ملی ہے جبکہ میں دوسری جانب ایک اور کھیت میں تھا۔ میں تو یہی سمجھا تھا کہ وہ میرے کہنے پر کام چھوڑ کر گھر چلا گیا ہوگا لیکن یہ تو کوئی اور ہی قصہ نکل آیا۔''

''مثلاً..... کون سا قصہ نکل آیا؟'' میں نے بے ساختہ پوچھا۔

''یہی..... یہی کہ..... وہ گھر نہیں گیا اور.....'' وہ لکنت زدہ انداز میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اور ادھر ہی کام میں لگا رہا اور..... کسی بدذات نے اسے قتل کر دیا.....'' بات کے اختتام پر وہ باقاعدہ ہچکیاں لینے لگا۔

میں نے چند لمحے انتظار کیا کہ اس کی حالت سنبھل جائے پھر پوچھا۔ ''تم کون سے کھیت میں فصل کاٹ رہے تھے؟''

اس نے ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ ''وہاں.....!''

مذکورہ کھیت، جائے وقوعہ سے کافی فاصلے پر تھا۔ ان دونوں کھیتوں کے بیچ چار یا پانچ کھیت آتے تھے جن میں گندم کی فصل تیار کھڑی تھی۔ یہ سارے کھیت (کم و بیش پندرہ ایکڑ اراضی) رفیق کی ملکیت تھے جس میں فصل کی کٹائی کا عمل جاری تھا۔ ایک سرے سے جیلا اور دوسرے سرے سے شیلا گندم کی کٹائی کا کام کر رہے تھے۔ جائے وقوعہ گاؤں کی مخالف والی سمت میں تھا جبکہ جس کھیت میں شیلا کٹائی کر رہا تھا، وہ گاؤں والی سمت کی ایک سائڈ پر تھا۔ شیلا نے مجھے بتایا کہ گزشتہ روز اس نے مغرب سے تھوڑی دیر پہلے اپنا کام روکا اور پھر گھر کی جانب روانہ ہو گیا۔

''جب تم کام ختم کر کے گھر جا رہے تھے تو تم نے جیلا والے کھیت کی طرف جھانکا تھا؟'' میں نے ایک فوری خیال کے تحت پوچھ لیا۔

''نہیں جی، میں نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میرے ذہن میں یہی تھا کہ جیلا گھر جا چکا ہوگا لہٰذا میں بھی سیدھا گھر ہی چلا گیا تھا۔''

''لیکن جیلا گھر نہیں پہنچا تھا اور یہ تشویشناک بات تھی۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ''کیا تم نے یہ پتا کرنے کی کوشش کی کہ وہ کہاں غائب ہو گیا؟''

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

''جی ..... میں نے پورے مرزا پور میں اسے ڈھونڈنے کی کوشش کی۔'' وہ دکھی لہجے میں بولا۔ ''لیکن وہ کہیں نہیں ملا..... آہ! میرا بھائی.....!''

''کیا تم جیلا کو تلاش کرتے ہوئے اپنے کھیتوں کی طرف بھی گئے تھے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں جی ..... میں ادھر نہیں گیا.....'' وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

''کیوں .....؟'' میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔

''سیدھی سی بات ہے جی .....'' میرے سوال کے جواب میں اس نے بتایا۔ ''ادھر اس وقت کون ہوسکتا تھا۔ کھیتوں میں کام کرنے والے لوگ اندھیرا ہونے سے پہلے اپنے اپنے گھروں میں چلے جاتے ہیں اور جیلا کو تو میں نے عصر کے وقت ہی وہاں سے گھر بھیج دیا تھا اس لیے کھیتوں میں جاکر، رات کے اندھیرے میں اسے تلاش کرنے کا خیال میرے ذہن میں آ ہی نہیں سکتا تھا۔''

''تمہارے خیال میں جیلا کی موت کا ذمے دار کون ہوسکتا ہے؟'' میں نے ٹھوس لہجے میں استفسار کیا۔

''مم ..... مجھے ..... کیا پتا..... جناب .....!'' وہ بری طرح گڑبڑا گیا۔ ''میں ..... اس بارے میں کچھ..... نہیں بتا سکتا.....''

''تمہیں کسی پر شک ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''نن ..... نہیں جناب۔''

''دیکھو شکیل! پولیس کے کام کرنے کا اپنا ایک انداز ہے۔'' میں نے اس کی گھبراہٹ کو رفع کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں تفتیش کا آغاز کرنے کے لیے کسی اشارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ تمہارے باپ نے مجھے بتایا ہے کہ جیلا کی کسی کے ساتھ کوئی دشمنی وغیرہ نہیں تھی اور تمہیں بھی کسی پر شک نہیں ہے تو پھر تفتیش کی گاڑی آگے کیسے بڑھے گی .....'' لمحاتی توقف کرکے میں نے ایک آسودہ سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''یہ تم بھی مانو گے کہ جس شخص نے بھی تمہارے بھائی کی جان لی ہے، وہ اس سے شدید نفرت کرتا تھا..... تم نے جیلا کی لاش کا معائنہ کیا ہے نا؟''

''اللہ غارت کرے اس بدبخت کو۔'' وہ آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''پتا نہیں، ہماری خوشیوں کو کس منحوس کی نظر لگ گئی ہے.....''

''مقتول کی کسی سے کوئی دشمنی نہیں تھی اور نہ ہی کوئی رشتے داری کا تنازع تھا۔'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا پھر شکیل سے پوچھا۔ ''کیا جیلا کا کسی سے رقم کے لین دین کا کوئی معاملہ تھا؟''

''نہیں جی۔ میرے علم میں تو ایسی کوئی بات نہیں۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''اگر ایسا کچھ تھا تو وہ جیلا ہی کو پتا ہوگا۔''

یہ تو مجھے احساس ہوگیا تھا کہ فی الحال شکیل سے کام کی کوئی بات معلوم نہیں ہوسکتی تھی لہٰذا میں نے اسے اس تاکید کے ساتھ فارغ کردیا۔

''شکیل! تم اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھنا۔ جیسے ہی تمہیں کوئی خاص بات پتا چلے مجھے فوری اطلاع کرنا۔''

اس نے میری ہدایت پر عمل کرنے کا وعدہ کیا اور میں دوپہر سے تھوڑی دیر پہلے تھانے واپس آگیا۔ یہ وہی وقت تھا جب سورج، بہ قول کسے، سوا نیزے پر آچکا تھا اور ہر گوشت و پوست کے جان دار کو تکا بوٹی بنانے کے موڈ میں تھا۔

☆☆☆

قتل کی کسی بھی واردات کی تفتیش میں دو چیزیں نہایت ہی اہمیت کی حامل ہوتی ہیں۔ اول، قتل کا محرک دوم، آلۂ قتل..... اور جیلا کے قتل کے سلسلے میں، ابھی تک یہ دونوں چیزیں میری دسترس سے باہر تھیں۔ میری اب تک کی پوچھ گچھ کے نتیجے میں یہی بات سامنے آئی تھی کہ مقتول کی کسی کے ساتھ کسی قسم کی کوئی دشمنی نہیں تھی لیکن میں یہ بات ماننے کو ہرگز تیار نہیں تھا کیونکہ جس انداز میں جیلا کی زندگی کا چراغ گل کیا گیا تھا، وہ شدید ترین ناپسندیدگی اور گہری نفرت کو ظاہر کرتا تھا اور جہاں تک آلۂ قتل کا معاملہ تھا تو میرے محتاط اندازے کے مطابق وہ کوئی آہنی سلاخ، کوئی ہتھوڑا یا کوئی بھی لوہے کی بھاری شے ہوسکتی تھی۔ جیلا کی کھوپڑی کا عقبی حصہ اتنی بے دردی سے چٹخایا گیا تھا کہ بھیجا بھی باہر جھانکنے لگا تھا۔ یہ کاری ضرب شدید طیش اور غیظ و غضب کے عالم میں ہی لگائی گئی تھی۔

میں نے اپنے ایک سادہ لباس اہلکار کو اس کام پر مامور کردیا کہ وہ مرزا پور میں گھوم پھر کر یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے کہ مقتول کی کسی شخص کے ساتھ کسی قسم کی کوئی دشمنی یا کم از کم ناراضی تو نہیں تھی۔ میں نے ایسے ہی ایک اور سادہ لباس اہلکار کو حویلی مراد روانہ کردیا۔ رفیق نے مجھے بتایا تھا کہ مقتول جیلا کی اپنے تایا کی بیٹی نبیلہ سے شادی ہونے والی تھی۔ مقتول کا تایا صدیق حویلی مراد نامی گاؤں میں رہتا تھا۔ اس اہلکار نے حویلی مراد میں سن گن لینا تھی کہ شاید قتل کی اس واردات کا کوئی سراغ مل جائے۔ یہ دونوں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

اہلکار خاصے مستعد اور کھوج لگانے کے ماہر ثابت ہوئے تھے جبھی میں نے انہیں اس نوعیت کی ذمے داری سونپی تھی۔

شام سے تھوڑی دیر پہلے ایک اہم اطلاع مجھ تک پہنچی۔ اطلاع کنندہ بھی ایک کسان ہی تھا جس کی زمین شیخوپورہ اور لائل پور کی سرحد کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ مذکورہ کسان کا نام مشتاق باجوہ تھا۔ میں نے مشتاق باجوہ کو فوراً اپنے پاس بلالیا۔

مشتاق باجوہ کی عمر چالیس سے متجاوز تھی۔ وہ ایک پستہ قامت اور فربہ اندام شخص تھا۔ میں نے اسے بیٹھنے کے لیے کہا اور پوچھا۔

''باجوہ جی! کیا خبر لائے ہو؟''

''میرے کھیتوں میں ایک ہتھوڑا ملا ہے سرکار۔'' وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔ ''بس جی..... یہی بتانے آپ کے پاس چلا آیا ہوں۔''

''کیسا ہتھوڑا!'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''کہاں ہے وہ ہتھوڑا؟''

''وہ تو ادھر میرے کھیتوں ہی میں پڑا ہے۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''میں نے اسے اٹھانے یا ہاتھ لگانے کی بھی کوشش نہیں کی۔ مجھے پتا چلا ہے، جیلا کو کسی ایسے اوزار سے ہلاک کیا گیا ہے اسی لیے میں نے اس ہتھوڑے کو بالکل نہیں چھیڑا اور سیدھا آپ کے پاس چلا آیا ہوں۔''

''یہ تم نے عقل مندی کا ثبوت دیا ہے باجوہ۔'' میں نے سراہنے والی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ خوش ہوگیا۔

میں نے ایک کانسٹیبل کو ساتھ لیا اور مشتاق باجوہ کی معیت میں اس مقام پر پہنچ گیا جہاں مذکورہ ہتھوڑا پڑا ہوا تھا۔ دھوپ کا زور تو ٹوٹ چکا تھا تاہم فضا میں ابھی تک حدت اور تمازت موجود تھی... سورج غروب ہونے میں ابھی کم و بیش ایک گھنٹا باقی تھا۔

میں نے اکڑوں بیٹھ کر اس ہتھوڑے کا جائزہ لیا اور میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ ہتھوڑے کے سر پر یعنی اس کے آہنی حصے پر خشک خون لگا ہوا تھا اور اس جمے ہوئے خون میں مجھے چند بال بھی چپکے دکھائی دیے۔ مذکورہ ہتھوڑے کا سر اتنا وزنی تھا کہ اس کی ایک ہی ضرب کسی بھی انسان کی کھوپڑی کو پچکانے کے لیے کافی تھی۔ اگر جمیل عرف جیلا کو اسی ہتھوڑے کی مدد سے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا تو پھر یہ بات بھی طے تھی کہ اس کے سر پر جما ہوا خون اور اس خون کے ساتھ چپکے ہوئے بال یقیناً جیلا ہی کے تھے۔

مشتاق باجوہ سے رسمی سی پوچھ گچھ کے بعد میں مذکورہ متوقع آلۂ قتل کو اپنے ساتھ لے آیا اور مشتاق باجوہ کو ہدایت کردی کہ وہ اگر کوئی بھی غیر معمولی بات دیکھے یا محسوس کرے تو فوراً مجھے اطلاع دے۔ اس نے میرے احکام پر عمل کرنے کا یقین دلایا تھا۔

مشتاق باجوہ کی اراضی شیخوپورہ اور لائل پور کی سرحد کے ساتھ لگی ہوئی تھی تاہم اس کا شمار مرزا پور یعنی شیخوپورہ ہی میں ہوتا تھا۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی بتایا کہ دوسری جانب ضلع لائل پور کا پہلا گاؤں حویلی مراد تھا جہاں مقتول کا تایا صدیق حلوائی رہتا تھا۔ مرزا پور اور حویلی مراد میں آٹھ میل کا فاصلہ حائل تھا جس کے دو میل شیخوپورہ میں اور چھ میل لائل پور کے علاقے میں آتے تھے۔

جیلا کا قتل مرزا پور (شیخوپورہ) میں ہوا تھا اور یہ ہتھوڑا شیخوپورہ کے آخری کنارے پر مشتاق باجوہ کے کھیتوں سے ملا تھا جس سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ اگر اسی ہتھوڑے سے جیلا کو قتل کیا گیا تھا تو قاتل اپنا کام کرنے کے بعد لائل پور کی طرف گیا تھا اور راستے میں اس نے یہ ہتھوڑا مشتاق باجوہ کے کھیتوں میں پھینک دیا تھا۔ اس کا ایک اور بھی مطلب تھا اور وہ یہ کہ قاتل کا تعلق لائل پور کے سرحدی گاؤں حویلی مراد سے ہوسکتا تھا.....!

اس خیال نے میرے اندر سنسنی کی ایک لہر سی دوڑا دی۔ اگر میں درست سمت میں سوچ رہا تھا تو پھر اس امر میں کسی شک و شبہے کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی تھی کہ جیلا کے ساتھ دشمنی حویلی مراد کی جانب سے کسی نے کی تھی۔

میں نے مذکورہ خون آلود ہتھوڑے کو لیبارٹری ٹیسٹ کے لیے ضلعی اسپتال بھجوادیا تاکہ اس بات کی تصدیق ہوسکے کہ اس کے سر پر پائے جانے والے بال جیلا ہی کے تھے یا کسی اور کے۔ ویسے مجھے اس بات کا یقین تھا کہ میں آلۂ قتل تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ اگر یہ ہتھوڑا کسی اور جگہ استعمال ہوا ہوتا تو پھر اس کے سر پر انسانی بالوں کی موجودگی کا کوئی جواز نہیں بنتا تھا اور وہ بھی خون میں چپکے ہوئے بال.....!

اگرچہ مرزا پور اور حویلی مراد کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں تھا لیکن حویلی مراد کا علاقہ میرے تھانے کی حدود میں نہیں آتا تھا کیونکہ حویلی مراد ضلع لائل پور میں تھا اور مرزا پور ضلع شیخوپورہ میں۔ میں نے آئندہ روز حویلی مراد جانے کا پروگرام ترتیب دیا اور اپنے کوارٹر میں آگیا۔

میرے اندر سے یہ آواز آرہی تھی کہ حویلی مراد کا

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

دورہ کافی سودمند ثابت ہوگا۔ شاید یہ میری چھٹی حس تھی!

☆☆☆

آئندہ روز میں علی الصباح لائل پور کے لیے روانہ ہوگیا۔ اگر میں حویلی مراد جانے کے لیے کھیتوں والا راستہ اختیار کرتا تو زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے میں وہاں پہنچ جاتا لیکن مجھے ڈائریکٹ وہاں نہیں جانا تھا۔ اس سلسلے میں محکمہ جاتی خانہ پُری بہت ضروری تھی۔ حویلی مراد ضلع لائل پور میں تھا اور یہ علاقہ میرے تھانے کی حدود میں نہیں آتا تھا لہٰذا وہاں کسی قسم کی تفتیش سے پہلے متعلقہ افراد کو اطلاع دینا ضروری تھا۔

میں پہلے ڈسٹرکٹ ہیڈکوارٹر لائل پور پہنچا۔ وہاں متعلقہ افسران کو اپنی آمد کی غرض وغایت سے آگاہ کیا۔ اس کے بعد میں اس تھانے میں پہنچ گیا جس کی حدود میں حویلی مراد آتا تھا۔ وہاں کا تھانہ انچارج میرا پرانا شناسا تھا۔ اس نے میرا پُرتپاک استقبال کیا اور جب میں نے اسے اپنی آمد کے بارے میں بتایا تو اس نے دوستانہ انداز میں کہا۔

''ملک صاحب! آپ نے خوامخواہ ہیڈکوارٹر میں حاضری لگانے کی زحمت کی۔ سیدھا میرے پاس آجاتے۔ یہ تھانہ بھی آپ ہی کا ہے۔''

''آپ کی محبت اور خلوص کی میں دل سے قدر کرتا ہوں۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن ضابطے کی کارروائی بھی ضروری ہے نا۔ اگر کوئی کام طریقے سلیقے سے ہوجائے تو اس میں کیا حرج ہے۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں ملک صاحب۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''واقعی اس میں کوئی حرج نہیں۔ آپ چاہیں تو میرے عملے میں سے ایک دو اہلکار بھی اپنے ساتھ لے جائیں۔ آپ مجھے ہر قسم کے تعاون کے لیے ہمیشہ تیار پائیں گے۔''

میرا ایک خاص آدمی سادہ لباس میں پہلے سے حویلی مراد میں موجود تھا۔ میں نے تھانہ انچارج کو اس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا، میں نے کہا۔

''آپ کے تعاون کا بہت شکریہ جناب لیکن میں سمجھتا ہوں کہ زیادہ بھیڑ بھاڑ لگانے کی ضرورت نہیں۔ میں بہت سادگی کے ساتھ مقتول کی ہونے والی سسرال سے تھوڑی پوچھ گچھ کروں گا اور واپس چلا جاؤں گا۔''

''جیسی آپ کی مرضی صاحب۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''کسی بھی مرحلے پر اگر میری یا میرے عملے کی مدد کی ضرورت پیش آئے تو کسی تکلف کی ضرورت نہیں۔ میں حاضر ہوں۔''

''ضرور بتاؤں گا۔ اگر ضرورت محسوس ہوئی تو۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اور کوئی خاص بات پتا چلی تو وہ بھی آپ سے شیئر کروں گا۔''

''اس اعتماد اور بھروسے کا شکریہ ملک صاحب!'' وہ زیرلب مسکراتے ہوئے بولا۔

تھانہ انچارج نے ٹھنڈے مشروب سے میری تواضع کی اور مجھے ایک تانگے میں بٹھا کر حویلی مراد کی جانب روانہ کردیا۔

''حویلی مراد'' کا نام چودھری مراد علی کے نام پر رکھا گیا تھا لیکن اب چودھری مراد اس دنیا میں باقی نہیں تھا۔ کافی عرصہ پہلے اس کا انتقال ہوگیا تھا۔ ان دنوں چودھری مراد کا پوتا چودھری امداد اس گاؤں کا والی وارث تھا۔ مجھے پتا چلا کہ چودھری امداد علی کے باپ چودھری شمشاد کا دو سال پہلے انتقال ہوگیا تھا۔ اس کے بعد چودھری امداد علی نے اس گاؤں کی چودھراہٹ سنبھال لی تھی۔ میں چودھری امداد اور اس کی حویلی کو نظرانداز کرتے ہوئے پوچھتا پاچھتا سیدھا صدیق حلوائی کی دکان پر پہنچ گیا۔

مذکورہ دکان بند تھی۔ میں نے پڑوسی دکان دار سے پوچھا۔ ''صدیق نے آج دکان نہیں کھولی؟''

اس نے آنکھیں میچ کر کھولیں پھر گہری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''آپ کو پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ کیا آپ حویلی مراد میں نئے ہو؟''

میں اس وقت سول ڈریس میں تھا۔ اگر میں پولیس کے یونیفارم میں ہوتا تو یہ دکاندار مجھے دیکھتے ہی چونک جاتا۔ میں نے اس عمر رسیدہ شخص کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

''ہاں چاچا..... میں ادھر ایک دو بار ہی آیا ہوں۔''

''کہاں سے آئے ہو جوان؟'' وہ دلچسپی لیتے ہوئے بولا۔

''ٹوبہ ٹیک سنگھ سے آیا ہوں۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''صدیق سے میری دور کی رشتے داری ہے۔ اسی سے ملنے آیا تھا لیکن اس کی دکان بند پڑی ہے۔ لگتا ہے، مجھے اب اس کے گھر ہی جانا ہوگا۔''

''گھر جانے کا بھی کوئی فائدہ نہیں۔'' صدیق حلوائی کے پڑوسی دکاندار نے بتایا۔

''فائدہ کیوں نہیں چاچا؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے اسے گھورا۔

اس شخص کی عمر ساٹھ سے متجاوز تھی تاہم وہ ساٹھا پاٹھا

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

کی عملی تفسیر دکھائی دیتا تھا۔ صدیق حلوائی کی دکان کے برابر میں اس نے پرچون کی دکان کھول رکھی تھی۔ میرے استفسار پر اس نے بتایا۔

''گھر میں کوئی بھی نہیں ہے۔ وہ سب لوگ ادھر مرزا پور گئے ہیں۔''

میری معلومات کے مطابق، صدیق حلوائی کی فیملی میں اس کی بیوی کنیز فاطمہ اور بیٹی نبیلہ کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ میں نے کہا۔

''چاچا! تمہارا مطلب ہے صدیق، اس کی گھر والی اور بیٹی تینوں مرزا پور گئے ہیں؟''

''جی..... میرا یہی مطلب ہے۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''اس وقت صدیق کے گھر پر تالا لگا ہوا ہے۔''

مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں ذرا سی بھی دقت محسوس نہیں ہوئی کہ جیلا کے قتل کی خبر حویلی مراد پہنچ چکی تھی، ورنہ صدیق اینڈ کمپنی کا باجماعت مرزا پور چلے جانے کا کوئی جواز نہیں بنتا تھا۔ اس دکاندار کا نام مجھے خیر دین معلوم ہوا تھا۔

''خیرو چاچا.....'' میں نے تشویش بھرے لہجے میں استفسار کیا۔ ''یہ اچانک صدیق بیوی بچوں کے ساتھ مرزا پور کیوں چلا گیا۔ سب خیر تو ہے نا.....؟''

''خیر نہیں ہے پتر۔'' وہ دکھی شکل بناتے ہوئے بولا۔ ''صدیق نے اپنی لڑکی کی شادی چھوٹے بھائی کے بیٹے سے طے کر رکھی تھی۔ اس لڑکے کو کسی نے قتل کر دیا۔''

''اوہ.....'' میں نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''تم رفیق کے چھوٹے بیٹے جمیل عرف جیلا کی بات کر رہے ہو نا؟''

''ہاں پتر.....!'' اس نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔ ''کل دن میں مرزا پور سے جیلا کے قتل کی خبر آئی تھی اور یہ لوگ کل شام سے پہلے ہی یہاں سے روانہ ہو گئے تھے۔''

چاچا خیرو خاصا باتونی واقع ہوا تھا۔ میں نے اس کی اسی فطرت یا عادت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور بڑے دھیمے اور غیر محسوس انداز میں اسے گھسنے لگا۔

''پچھلی دفعہ جب صدیقا میرے پاس ٹوبہ ٹیک سنگھ آیا تھا تو اس نے بتایا تھا کہ اس سال جیسے ہی گرمیاں ختم ہوں گی، وہ نبیلہ کی شادی کر دے گا۔''

''ہاں پتر..... اس کا ارادہ تو یہی تھا مگر.....'' وہ رنجیدہ ہو گیا۔ ''اب تو جیلا ہی نہیں رہا..... پھر نبیلہ کی اس سے شادی کیسے ہو گی!''

''ہائے، بے چارے صدیقا کی ایک ہی بیٹی ہے اور اس کی خوشیاں دیکھنا بھی نصیب نہ ہوئیں۔'' میں نے دل شکستہ لہجے میں کہا۔

''یہ دنیا دکھوں کی نگری ہے پتر۔'' وہ فلسفیانہ انداز میں بولا۔ ''صدیقا کے پہلے دو بیٹے دو سال اور پانچ سال کی عمر میں فوت ہو گئے تھے۔ یہ نبیلہ امجد اور ماجد کے بعد پیدا ہوئی تھی۔ صدیقا کا خیال تھا کہ وہ نبیلہ کی شادی اپنے چھوٹے بھائی رفیق کے بڑے بیٹے شکیل سے کرے گا۔ دونوں جانب رشتے کی بات چلی لیکن پھر اچانک سب کچھ بدل گیا.....'' وہ بولتے بولتے رک گیا۔

''سب کچھ کیسے بدل گیا؟'' میں نے چونکے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

''پتر! تم نے اپنا نام نہیں بتایا۔'' وہ اچانک مجھ سے مستفسر ہوا۔ ''اور یہ بھی بتاؤ، ادھر ٹوبہ ٹیک سنگھ میں تم کرتے کیا ہو؟''

''چاچا! میرا نام ملک جواد ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اور میں زمین دارا کرتا ہوں۔ اللہ نے چند کلے (ایکڑ) زمین دے رکھی ہے۔ بس عزت شرم سے گزارہ ہو رہا ہے۔''

''ملک جواد.....!'' وہ خود کلامی کے انداز میں بولا۔ ''صدیقا نے کبھی تمہارا ذکر نہیں کیا۔''

''ہماری بہت دور کی رشتے داری ہے چاچا اور ملنا جلنا بھی بہت کم ہوتا ہے۔'' میں نے بات بناتے ہوئے کہا پھر اپنے مطلب کی طرف آتے ہوئے پوچھا۔ ''چاچا! تم بتا رہے تھے کہ صدیقا نبیلہ کی شادی شکیل عرف شیلا سے کرنا چاہتا تھا پھر سب کچھ بدل گیا.....؟''

''ہاں پتر!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''رشتے کی بات تقریباً طے ہونے ہی والی تھی کہ جیلا نے ضد پکڑ لی۔''

''کیسی ضد؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ نبیلہ سے شادی کرنا چاہتا تھا۔'' خیرو چاچا نے بتایا۔ ''صدیقا کو جب اس بات کا پتا چلا تو اس نے زیادہ مزاحمت نہیں کی۔ وہ اپنے چھوٹے بھائی کے دونوں بیٹوں سے بہت محبت کرتا ہے اور انہیں اپنی سگی اولاد کی طرح سمجھتا ہے۔ اس نے رفیق سے کہا۔

''فیکا! میرے لیے تمہارے دونوں بیٹے برابر ہیں۔ نبیلہ کی شادی شیلا سے ہو یا جیلا سے، وہ تمہارے گھر ہی میں جائے گی۔ شیلا کے بارے میں میرا خیال اس لیے تھا کہ وہ بڑا ہے، اصولی طور پر پہلے بڑے بیٹے کی شادی ہونا چاہیے۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

''ہاں صدیق! کہتے تو تم ٹھیک ہی ہو۔'' رفیق نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''لیکن جیلا ضد کر رہا ہے کہ وہ نبیلہ سے شادی کرے گا۔''

''ٹھیک ہے رفیق! ہم جیلا کی ضد پوری کر دیتے ہیں۔'' صدیق نے حتمی لہجے میں کہا۔ ''ہمیں اپنی اولاد کی خوشیوں کا خیال رکھنا چاہیے۔''

''پتر جواد.....!'' اپنی بات کی وضاحت کرنے کے بعد خیرو چاچا مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''میں سمجھتا ہوں، صدیقا کا چونکہ کوئی بیٹا نہیں تھا اس لیے اسے جیلا کی خواہش کی کچھ زیادہ ہی پروا تھی۔ خیر..... دونوں طرف کسی کو کوئی اعتراض نہیں تھا لہٰذا نبیلہ کا رشتہ جیلا سے طے ہو گیا اور صدیق نے سکھ کی سانس لی کہ بیٹی ٹھکانے لگی ورنہ وہ خاصا پریشان رہنے لگا تھا۔''

آخری جملہ خیرو چاچا نے بڑے معنی خیز انداز میں ادا کیا تھا لہٰذا میں نے سوال کرنے میں ذرا دیر نہ کی۔

''صدیقا کس بات کے لیے پریشان تھا چاچا؟''

''پتر! تم کافی سمجھدار اور سیانے ہو۔'' وہ سمجھانے والے انداز میں بولا۔ ''جس گھر میں جوان لڑکی ہوتی ہے وہاں سب کی نظریں لگی رہتی ہیں۔ کوئی بھی رشتہ بھیج دے، آپ اس کے سر میں ڈنڈا تھوڑی مار سکتے ہیں!''

''ٹھیک کہتے ہو چاچا۔'' میں نے کریدکا عمل جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا نبیلہ کے اور بھی رشتے آئے ہوئے تھے؟''

''ہاں..... یہاں حویلی مراد میں بھی بعض لوگ نبیلہ کے رشتے میں دلچسپی لے رہے تھے۔'' اس نے گہری سنجیدگی سے بتایا۔ ''لیکن صدیقا چونکہ نبیلہ کو اپنے بھائی کے گھر میں بیاہنا چاہتا تھا اس لیے وہ سب کو منع ہی کرتا رہا۔ وہ اس ''انکار'' والے معاملات سے خاصا پریشان رہنے لگا تھا کیونکہ بعض لوگ انکار سن کر ناراض بھی ہو جاتے تھے۔ کمالے سے تو اس کی اچھی خاصی منہ ماری بھی ہو گئی تھی۔''

''کون کمالا؟'' میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''کمال دین لوہار پتر۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''ادھر حویلی مراد میں ایک ہی لوہار ہے..... کمالا۔ کمالا اپنے بیٹے جمّا کی شادی نبیلہ سے کرنا چاہتا تھا کیونکہ جمّا، نبیلہ پر عاشق ہو گیا تھا مگر صدیقا نے چٹا انکار کر دیا اور..... اچھا ہی کیا۔''

میرے اندر سنسنی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ کوئی اہم بات سامنے آنے والی ہے۔ میں خیرو کے نزدیک کھسک آیا اور پوچھا۔

''چاچا! تم تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے کمالا کے بیٹے جمّا میں کوئی عیب ہو.....؟''

''اللہ تمہارا بھلا کرے۔'' وہ آنکھیں سکوڑ کر مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''جمّا میں کوئی ایک نقص ہو تو بتاؤں نا۔ اس کی ایک آنکھ کا چراغ گل ہے اسی لیے سب اسے کانا جما کہتے ہیں۔ آج تک کسی نے اسے سیدھے نام ''جمال دین'' سے نہیں پکارا۔ پھر وہ کچھ کرتا کراتا بھی نہیں۔ اپنے بوڑھے باپ کی مدد کرنے کے بجائے وہ سارا سارا دن آوارہ گردی میں گزار دیتا ہے۔ ایسے لفنگے آوارہ سے صدیقا کیسے اپنی پھول ایسی بیٹی کی شادی کر دیتا۔''

''ٹھیک کہتے ہو چاچا! ماں باپ کو اپنی اولاد کے مستقبل کے بارے میں بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا چاہیے۔'' میں نے تائیدی انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ''صدیقا نے اس رشتے سے انکار کر دیا، یہ اس کا حق تھا، پھر منہ ماری کیسی.....؟''

''کمالا تو انکار سن کر خاموش ہو گیا تھا۔'' خیرو نے بتایا۔ ''مگر کانا جمّا اس پر بہت تلملایا تھا۔ اس نے ادھر ادھر ایسی باتیں بھی کیں جن سے دھمکی جھلکتی تھی۔ مثلاً اس نے کسی سے کہا..... میں لوہار کی اولاد ہوں۔ میرا ہاتھ کسی ہتھوڑے سے کم نہیں۔ ایک ہاتھ بھی پڑ گیا تو ہوش ٹھکانے آ جائیں گے۔''

''اوہ..... واقعی.....'' میں نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔ ''جمّا کے اس جملے میں تو خطرناک دھمکی پوشیدہ ہے۔''

''میرا خیال ہے، یہ سب اس کی جھنجلاہٹ کا نتیجہ تھا۔'' خیر دین نے کہا۔ ''جبا کی ایسی باتیں سن کر ہی صدیقا نے کمالا لوہار سے بات کی تھی۔ تھوڑی گرما گرمی ہوئی اور معاملہ رفع دفع ہو گیا تھا۔''

خیرو معاملے کے ''رفع دفع'' ہونے کی بات کر رہا تھا لیکن میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بج اٹھی تھی۔ میں نے جیلا کی لاش کا بہ غور جائزہ لیا تھا۔ اس کے سر کے عقبی حصے میں کسی بھاری آہنی شے سے ضرب لگا کر کھوپڑی کو چٹخایا گیا تھا اور پھر مشتاق باجوہ کے کھیتوں میں سے ایک خون آلود ہتھوڑا بھی برآمد ہوا تھا جس پر جمے ہوئے خون میں انسانی بال بھی چپکے ہوئے تھے۔ اغلب امکان یہی تھا کہ جیلا کو اسی ہتھوڑے کی مدد سے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا اور اب..... خیرو چاچا مجھے کانا جمّا کے نادر خیالات سے آگاہ کر رہا تھا..... میں لوہار کی اولاد ہوں۔ میرا ہاتھ کسی ہتھوڑے سے کم نہیں۔ ایک ہاتھ بھی پڑ گیا تو ہوش

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

ٹھکانے آجائیں گے.....!

میں نے کانا جما کے نام پر دائرہ لگایا لیکن خیر دچاچا پر یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ میری اندرونی کیفیت کیا ہے۔ میں نے سرسری لہجے میں کہا۔

''چاچا! تم نے سن رکھا ہوگا..... جو گرجتے ہیں، وہ برستے نہیں اور جو بھونکتے ہیں، وہ کاٹتے نہیں۔ بس، جما کی وہ بات بھی ایسی ہی ہوگی۔''

''ہاں پتر۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔'' وہ تائیدی انداز میں بولا۔ ''مٹی پاؤ اس کمینے کی باتوں پر.....''

اسی لمحے مجھے اس کانسٹیبل کی جھلک نظر آئی جسے میں نے گزشتہ روز حویلی مراد روانہ کیا تھا۔ وہ مجھ سے کافی فاصلے پر کھڑا تھا لیکن ظاہر ایسا ہی کر رہا تھا کہ اسے خیر دین سے کوئی دلچسپی نہیں۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ کانسٹیبل مجھے دیکھ کر ہی ادھر آیا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے میں نے محسوس کرلیا کہ اس کے پاس کوئی اہم خبر ہے۔ میں نے خیر دین کو نمٹانے کی غرض سے کہا۔

''ٹھیک ہے چاچا! میں اب چلتا ہوں۔ صدیقا واپس آئے تو اسے میرا اسلام ضرور دینا۔ میں اگلے ہفتے دوبارہ چکر لگاؤں گا۔''

''ٹھیک ہے پتر..... میں صدیقا کو تمہارے بارے میں بتادوں گا۔'' اس نے کہا۔

میں اسے سلام کرکے گلی میں ایک جانب چل پڑا۔ میں نے کانسٹیبل کو کسی قسم کا کوئی اشارہ نہیں کیا تھا۔ میں خیر دین پر اس حوالے سے کوئی تاثر نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ مجھے امید تھی کہ کانسٹیبل بھی میرے پیچھے آئے گا..... اور ایسا ہی ہوا۔

میں گلی میں چند قدم ہی چلا تھا کہ کانسٹیبل باسط علی میرے قریب آگیا۔ میری طرح وہ بھی سادہ لباس میں تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ جلدی سے بولا۔

''ملک صاحب! آپ یہاں.....؟''

''ہاں..... میں ذرا صدیق کو چیک کرنے آیا تھا۔'' میں نے جواب دیا۔ ''مگر وہ لوگ تو کل شام سے ادھر مرزا پور گئے ہوئے ہیں۔''

''جی ملک صاحب۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''جیلا کی موت کی خبر جیسے ہی یہاں پہنچی، یہ لوگ روانہ ہوگئے تھے۔''

''تم نے اب تک کیا ریسرچ کی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''جناب! مجھے پتا چلا ہے کہ جب جیلا پچھلی مرتبہ حویلی مراد آیا تھا تو اس کا جیرا سے اچھا خاصا جھگڑا ہوگیا تھا۔'' باسط علی نے بتایا۔ ''اور جیرا نے جیلا کو کافی پھینٹی شینٹی بھی لگائی تھی۔''

''یہ جیرا کون ہے؟'' میں نے چونکے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

''ادھر حویلی مراد ہی کا وسنیک ہے جناب۔'' کانسٹیبل نے بتایا۔ ''اس کا نام تو نذیر ہے مگر پورے گاؤں میں وہ جیرا کے نام سے مشہور ہے۔ تانگا چلاتا ہے۔ لاری اڈے سے سواریوں کو حویلی مراد تک لے کر آتا ہے۔ کافی اکھڑ مزاج اور ہاتھ چھٹ ہے۔''

''اس کا سارا اکھڑ پن تو میں ناک کے راستے نکال دوں گا۔'' میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''بتاؤ، جیرا سے جیلا کا جھگڑا کس بات پر ہوا تھا؟''

''یہ معلوم نہیں ہوسکا ملک صاحب۔'' وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ ''میں نے کئی لوگوں سے اس بارے میں پوچھا ہے مگر کسی نے کوئی معقول جواب نہیں دیا۔ بعض لوگوں کا تو یہ خیال ہے کہ جیرا کو چھڑا کرنے کے لیے کسی وجہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ تو ہواؤں سے بھی جھگڑا کرلیتا ہے۔''

''اس جیرا بلیڈ سے تو ملاقات کرنا ہی پڑے گی۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا پھر پوچھا۔ ''یہ کتنا عرصہ پہلے کا واقعہ ہے جب جیرا اور جیلا میں مار پیٹ ہوئی تھی؟''

''لگ بھگ دو ماہ پہلے جناب۔'' باسط علی نے جواب دیا۔

ہم چلتے ہوئے باتیں بھی کرتے جارہے تھے کہ میں نے سامنے سے دو پولیس اہلکاروں کو اپنی جانب بڑھتے دیکھا۔ وہ سیدھے ہماری ہی طرف آرہے تھے۔ پاس آکر ان دونوں نے مجھے سیلیوٹ کیا پھر ایک نے کہا۔

''ملک صاحب! ہمیں انچارج صاحب نے بھیجا ہے.....''

''کیوں..... سب خیریت تو ہے نا؟'' میں نے سوالیہ نظر سے باری باری ان کی طرف دیکھا۔

''جی خیریت ہے۔'' دوسرے نے جواب دیا۔ ''ہم آپ کے کسی کام میں مداخلت نہیں کریں گے۔ آپ کو جو بھی تفتیش کرنا ہے وہ ضرور کریں۔ انچارج صاحب نے ہمیں حکم دیا ہے کہ آپ کے قریب رہیں اور کسی سلسلے میں آپ کو اگر ہماری مدد کی ضرورت ہو تو ہم آپ کا حکم بجالائیں۔''

میں اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ انچارج نے اپنے دو اہلکاروں کو مجھ پر نگاہ رکھنے کے لیے بھیجا تھا۔ وہ پوچھ گچھ

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

کے لیے مجھے فری ہینڈ دے چکا تھا لیکن حویلی مراد چونکہ اس کے تھانے کی حدود میں آتا تھا لہٰذا وہ باخبر رہنا چاہتا تھا کہ کسی اور علاقے کا تھانے دار اس کے تھانے کی حدود میں کس قسم کی تفتیش کرتا پھر رہا ہے۔ مجھے انچارج کا یہ اقدام بالکل برا نہیں لگا۔ یہ اس کا حق تھا اور فرض شناسی کا حصہ بھی۔

''ٹھیک ہے، تم لوگ ہمارے ساتھ ہی رہو۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''مجھے جب بھی تم لوگوں کی مدد کی ضرورت پیش آئے گی، میں بتادوں گا۔ ویسے مجھے اپنا ایک بندہ یہاں مل گیا ہے.....'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر باسط علی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''یہ بندہ مرزا پور کا رہنے والا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے میری اس سے ملاقات ہوئی ہے۔ اب یہ میرے ساتھ ہی واپس جائے گا۔''

انہوں نے باری باری تنقیدی نگاہوں سے باسط علی کی طرف دیکھا لیکن کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ میں نے ایک سے پوچھا۔

''کانا جما کس طرف رہتا ہے؟''

''جما جج نال.....'' اس نے زیرِلب مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''وہ کمال دین لوہار کا بیٹا ہے جی۔ اس کا گھر ادھر مسجد کے ساتھ ہی ہے۔''

''ہوں.....'' میں نے پُرسوچ انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ''یہ جما جج نال کی کیا کہانی ہے؟''

''یہ اس کا تکیہ کلام ہے ملک صاحب۔'' اس نے بتایا۔ ''وہ اکثر یہ جملہ دہراتا رہتا ہے۔''

''میں نے سنا ہے، وہ غصے کا بہت تیز ہے۔''

''بس جناب! رگی لوگوں میں کچھ نہ کچھ مسئلہ تو ہوتا ہی ہے نا۔'' وہ معنی خیز انداز میں بولا۔ ''جما بھی بس ایسا ہی ہے۔''

''رگی'' سے اس کی مراد تھی ''کانا'' یعنی ایسا شخص جس کے اندر کوئی عیب موجود ہو..... جس کی کوئی رگ ٹیڑھی ہو۔

''اور جیرا کوچوان کے بارے میں کیا کہتے ہو؟'' میں نے سوالات کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے پوچھا۔

''وہ بھی ادھر حویلی مراد ہی میں رہتا ہے۔'' اس نے بتایا۔

''میں نے سنا ہے، جیرا کا دو ماہ پہلے مقتول جیلا کے ساتھ کوئی پھڈا ہو گیا تھا۔'' میں نے کہا۔

''ہو سکتا ہے، ایسا کوئی واقعہ پیش آیا ہو لیکن ہمیں اس کی خبر نہیں۔'' وہ صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔

''ہمارے پاس جب تک کسی کی شکایت نہیں آتی، ہم کوئی کارروائی نہیں کرتے۔''

''اور جب شکایت آجاتی ہے تو.....؟'' میں نے رک کر سوالیہ نظر سے باری باری ان دونوں کی طرف دیکھا۔

''تو ظاہر ہے جی..... پھر تو ایکشن لینا ہی پڑتا ہے۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''فریادی کی شکایت دور کرنا ہمارا فرض بنتا ہے۔''

''بس تو پھر تم دونوں ایکشن کے لیے تیار ہو جاؤ۔'' میں نے کہا۔ ''سمجھ لو، میں شکایت کر رہا ہوں۔''

ان دونوں نے الجھن زدہ انداز میں پہلے ایک دوسرے کو دیکھا پھر سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگے۔ ایک نے پوچھا۔

''کیسی شکایت ملک صاحب؟''

''گھبرانے کی ضرورت نہیں۔'' میں نے تسلی بخش لہجے میں کہا۔ ''شکایت بہت سادہ سی ہے۔ میں یہاں جمیل عرف جیلا آف مرزا پور کے قتل کی تفتیش کے سلسلے میں آیا ہوں اور مجھے شک ہے کہ اس معاملے میں جما یا جیرا کا کوئی ہاتھ ہو سکتا ہے۔''

''اوہ.....'' اس نے گہری سانس خارج کی پھر مستفسر ہوا۔ ''اس سلسلے میں ہمارے لیے کیا حکم ہے۔ ہمیں جیرا اور جما کے ساتھ کیا کرنا ہے؟''

''ان دونوں کے ساتھ جو بھی کرنا ہے، وہ میں خود کرلوں گا۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''تم ان دونوں کو پکڑ کر تھانے لے آؤ۔ میں تمہارے انچارج صاحب کے پاس جا رہا ہوں۔''

''جی ٹھیک ہے ملک صاحب۔'' یکے بعد دیگرے انہوں نے اثبات میں گردن ہلادی۔

تھانے کی جانب سفر کے دوران باسط علی نے مجھ سے پوچھا۔ ''ملک صاحب! جیرا والا معاملہ تو میں نے آپ کو بتایا ہے۔ یہ جما کا کیا قصہ ہے؟''

''بڑا دلچسپ اور اہم قصہ ہے۔'' میں نے کہا۔ ''جما، مقتول کی منگیتر نبیلہ پر عاشق ہو گیا تھا اور اس نے نبیلہ کا رشتہ بھی بھیجا تھا لیکن ادھر سے چٹا انکار ہو گیا جس پر یہ بہت تلملایا تھا اور مجھے پتا چلا ہے کہ اس نے کچھ الٹی سیدھی باتیں بھی کی تھیں جس سے خطرناک دھمکی کی جھلک نظر آتی تھی۔ ابھی تک میں اس کیس پر اپنی گرفت مضبوط نہیں کر سکا ہوں لہٰذا چھوٹی سے چھوٹی بات کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتا۔''

''یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں ملک صاحب۔'' وہ سنجیدہ انداز میں بولا۔

ہم تھوڑی دیر کے بعد تھانے پہنچ گئے۔ میں نے تھانہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

انچارج کو مختصر الفاظ میں صورتِ حال سے آگاہ کیا اور پھر کہا۔

''میں جیرا اور جما کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔''

اس نے گہری نظر سے مجھے دیکھا اور بولا۔''ملک صاحب! کیا ان بندوں سے یہیں پر پوچھ گچھ نہیں ہوسکتی؟''

''ہوتو سکتی ہے لیکن قتل کی واردات چونکہ میرے تھانے کی حدود میں ہوئی ہے لہٰذا میں ان مشکوک افراد سے تفتیش بھی اپنے تھانے ہی میں کرنا چاہتا ہوں۔''

وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا۔''جیسی آپ کی مرضی ملک صاحب۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ آپ انہیں اپنے ساتھ لے جاسکتے ہیں۔''

''آپ فکر نہ کریں۔ آپ کے علاقے کے بندوں کے ساتھ میرے تھانے میں کسی قسم کی زیادتی نہیں ہوگی۔'' میں نے اطمینان دلانے والے انداز میں کہا۔''یہ دونوں صحیح سلامت آپ کو واپس مل جائیں گے۔''

''او..... نہ جی .....فکر والی کوئی بات نہیں۔'' وہ جلدی سے بولا۔''اگر ان دونوں کا یا ان میں سے کسی ایک کا مقتول والے معاملے سے کوئی کنکشن ملتا ہے تو آپ ان کی ہڈیوں کا سرمہ بھی بنا سکتے ہیں۔''

''میرا خیال ہے، ہڈیوں تک جانے کی نوبت نہیں آئے گی۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔''گوشت اور پوست ہی سے کام چل جائے گا۔''

وہ پُرمعنی انداز میں سر ہلا کر رہ گیا۔

☆☆☆

اگلے روز پوسٹ مارٹم کی ابتدائی رپورٹ آگئی۔ مذکورہ رپورٹ کے مطابق، مقتول جیلا کی موت انیس بیس کے عمر اور مغرب کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ موت کا سبب سر میں لگنے والی وہ کاری ضرب تھی جس نے مقتول کی کھوپڑی کا عقبی حصہ بری طرح چٹخا دیا تھا۔ مقتول کے سر پر یہ وار اس کی بے خبری میں کیا گیا تھا۔

پوسٹ مارٹم رپورٹ کے ساتھ ہی کیمیکل ایگزامنر کی رپورٹ بھی منسلک تھی جس کے مطابق، اس کے معدے سے کسی نشہ آور ادویہ کے آثار ملے تھے۔ یا تو مقتول کسی نشے کا عادی تھا اور یا پھر کھانے کے ساتھ کوئی نشہ آور شے اس کے معدے تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی تھی۔ یہ ایک اہم اطلاع تھی۔

مشتاق باجوہ کے کھیتوں سے ملنے والا ہتھوڑا بھی میں نے تجزیے کے لیے لیبارٹری بھجوا دیا تھا۔ اس کے ٹیسٹ کی رپورٹ بھی آگئی تھی۔ مذکورہ رپورٹ کے مطابق، اس ہتھوڑے پر جما ہوا خون اور اس خون میں چپکے ہوئے بال مقتول جیلا ہی کے تھے لہٰذا اس بات میں کسی شک و شبے کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی تھی کہ جمیل عرف جیلا کو اسی ہتھوڑے کی مدد سے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔

آلۂ قتل میرے ہاتھ لگ چکا تھا۔ اب قتل کے محرک تک پہنچنا باقی تھا۔ اس کے بعد قاتل کی گردن میری گرفت میں ہوتی۔ گزشتہ روز میں حویلی مراد سے جیرا کو چوان اور جما لوہار کو اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ ہم شام کے وقت تھانے پہنچے تھے لہٰذا میں انہیں حوالدار کے سپرد کر کے اپنے کوارٹر میں چلا گیا تھا۔ یہ دونوں ایسے افراد تھے جن سے پوچھ گچھ کافی نتیجہ خیز ثابت ہوسکتی تھی۔

میں نے ضروری کارروائی کے بعد جیلا کی پوسٹ مارٹم شدہ لاش رفیق کے گھر بھجوادی اور حوالدار کو اپنے پاس بلالیا۔

''ہاں فرزند علی!'' حوالدار میرے پاس آیا تو میں نے پوچھا۔''حوالاتیوں نے زبان کھولی یا کوئی اور فارمولا آزمانا پڑے گا؟''

''ملک صاحب! شرافت کا زمانہ کہاں ہے۔'' حوالدار نے جوش بھرے لہجے میں کہا۔''اگر آپ تھوڑی سختی کی اجازت دیں تو ان کے بدن کا ایک ایک جوڑ بولنے پر مجبور ہوجائے گا۔ ابھی تک آپ کے حکم پر میں نے بہت ہلکا ہاتھ رکھا ہوا ہے اسی لیے وہ کچھ قبولنے کو تیار ہی نہیں ہیں۔''

''اگر ضرورت محسوس ہوئی تو میں تمہیں فری ہینڈ دے دوں گا۔'' میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔''فی الحال تم انہیں میرے پاس لے آؤ مگر باری باری.....''

''جی ملک صاحب۔'' اس نے فرمانبرداری سے گردن ہلائی اور پوچھا۔''پہلے کس کو لاؤں جناب؟''

''جمال دین عرف جما کو۔'' میں نے کہا۔

''اوکے سر!'' یہ کہتے ہوئے فرزند علی میرے کمرے سے نکل گیا۔

ایک منٹ کے بعد جمال دین عرف جما میرے سامنے حاضر تھا۔ اس کی عمر تیس کے قریب رہی ہوگی۔ وہ ایک دبلا پتلا اور دراز قامت شخص تھا۔ اس نے چہرے پر ہلکی سی ڈاڑھی بھی رکھی ہوئی تھی اور ایک آنکھ کا چراغ بھی گل تھا۔ اکلوتی آنکھ اور چہرے کے تاثرات میں مکاری اور عیاری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اس نے میرے پاس

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

آتے ہی فریادی لہجے میں کہا۔

''تھانے دار صاحب! میرے ساتھ بڑی زیادتی ہورہی ہے۔ آپ کے بندے نے مجھے ساری رات جگایا ہے۔ آخر میرا قصور کیا ہے؟''

''قصور تمہارا یہ ہے کہ تم جما جانج نال ہو۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''حالانکہ تمہاری اپنی جج کا دور دور تک کوئی امکان نظر نہیں آتا۔''

''میں تو چاہتا ہوں جی کہ میری بھی شادی ہو اور میری بھی جج چڑھے مگر کچھ ہوتا ہی نہیں۔'' وہ مسکین سی صورت بناتے ہوئے بولا۔ ''اوپر سے یہ بھی سمجھ میں نہیں آرہا کہ آپ مجھے اور جیرا کو کیوں پکڑ لائے ہیں۔''

''تم جیرا کی نہیں، صرف اپنی فکر کرو۔'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ''اور تمہیں میں اس لیے پکڑ کر لایا ہوں تاکہ تمہاری شادی کرا سکوں۔ پھر لوگ تمہاری جج میں شامل ہوسکیں.....''

اس نے الجھن اور بے یقینی کے ملے جلے تاثرات سے مجھے دیکھا مگر منہ سے کچھ نہیں بولا۔ میں نے کہا۔

''جما! تمہاری جج چڑھنے میں تو ابھی تھوڑا وقت باقی ہے۔ اس سے پہلے تمہیں ایک بے گناہ کی لاش کو کندھا دینا ہوگا۔''

''آپ..... جیلا کی بات کررہے ہیں.....'' وہ ایک آنکھ سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''لیکن اس کے جنازے سے میرا کیا تعلق؟''

''وہی تعلق جو ایک لوہار کا ہتھوڑے سے ہوتا ہے!'' میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''یا جو تعلق ایک عاشقِ نامراد کا اپنے رقیبِ روسیاہ سے ہوتا ہے۔''

''مم..... میں کچھ سمجھا نہیں جناب۔'' وہ فکرمند لہجے میں بولا۔

''حوالدار کا ایک ہاتھ پڑ گیا تو سب کچھ سمجھ میں آجائے گا جما۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''فرزند علی لوہار تو نہیں مگر اس کا ہاتھ بادان (بڑا ہتھوڑا) سے بھی زیادہ خطرناک ہے.....!''

''پتا نہیں جناب! آپ کس قسم کی باتیں کررہے ہیں۔'' وہ کبھی مجھے اور کبھی حوالدار کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

میں نے حوالدار سے کہا کہ وہ چوبی الماری میں سے آلۂ قتل نکال کر لائے۔ فرزند علی نے فوراً میرے حکم کی تعمیل کردی۔ آلۂ قتل میری میز پر سج گیا تو میں نے مذکورہ

سنہری اقوال

☆ غصے کی حالت میں انسان حق پر قائم نہیں رہ سکتا۔

☆ تارے آسمان کی زینت ہیں اور تعلیم یافتہ انسان زمین کا زیور۔

☆ کردار، اخلاق، جرأت اور استقلال یہ وہ چار ستون ہیں جن پر انسانی زندگی کی عمارت کھڑی ہے۔

☆ تین چیزیں آپس میں محبت کو فروغ دیتی ہیں۔ ایک سلام کرنا، دوسرے مجلس میں دوسروں کے لیے جگہ بنانا تیسرے لوگوں کو اچھے نام سے پکارنا۔

☆ غصے کو پی جانے سے معاف کردینا زیادہ بہتر ہے۔ کیونکہ جو شخص غصہ پی جائے اور معاف نہ کرے تو عین ممکن ہے کہ اس کے دل میں کینہ پیدا ہوجائے، جو دل کے لیے ایک بڑی بیماری ہے۔

☆ بُرے آدمی اچھی چیزوں کو چھوڑ کر ہر چیز میں بُرائی تلاش کرتے ہیں جس طرح مکھی خوبصورت چیزوں کو چھوڑ کر صرف زخم پر بیٹھتی ہے۔

☆ جو گناہ کر کے اترائے، اسے شیطان سمجھو۔

☆ نیک دل انسان دشمنوں کے ساتھ بھی نیکی کرنے سے نہیں چوکتا۔ صندل اس کلہاڑے کا منہ بھی خوشبودار کردیتا ہے جو اسے کاٹتا ہے۔

☆ ظالم سوار کو اس کا گھوڑا گرا دیتا ہے۔

☆ بلند حوصلہ انسان یقیناً اپنی منزل پالیتا ہے۔

انتخاب: ریاض بٹ، حسن ابدال

محل اور تربوز

ایک غریب آدمی نے تربوز خریدا اور گھر آکر جب اسے کاٹا تو اس میں سے جن برآمد ہوا اور بولا۔ ''کیا حکم ہے میرے آقا۔''

غریب آدمی خوش ہوکر بولا۔ ''تم مجھے ایک عالی شان محل بنا دو۔'' اس کی فرمائش سن کر جن غصے سے بولا۔ ''پاگل ہوگئے ہو کیا۔ ارے بے وقوف اگر میں محل بنا سکتا تو کیا خود تربوز میں رہتا؟''

مرسلہ: جاوید اختر رانا، پاک پتن شریف

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

ہتھوڑے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے جما سے سوال کیا۔

''اس ہتھوڑے کو پہچانتے ہو؟''

''جی..... نہیں.....'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔''

''جھوٹ تو نہیں بول رہے؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

''نہیں جی۔'' اس نے ایک مرتبہ پھر نفی میں گردن جھٹکی۔ ''آپ مجھ سے قسم لے لیں جناب۔ میں کیوں جھوٹ بولوں گا۔'' پھر وہ مجھ سے مستفسر ہوا۔ ''اس ہتھوڑے میں کیا خاص بات ہے؟''

''یہ دیکھو.....'' میں نے ہتھوڑے کے آہنی سر کی جانب انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ خون اور خون میں چپکے ہوئے بال جمیل اور عرف جیلا کے ہیں۔ اس ہتھوڑے کی مدد سے دو دن پہلے جیلا کو قتل کیا گیا ہے۔''

''لل..... لیکن.....'' وہ بکھری ہوئی آواز میں بولا۔ ''آپ مجھے یہ ہتھوڑا کیوں دکھا رہے ہیں؟''

''اس لیے کہ جیلا کی موت میں تمہارا ہاتھ ہے۔'' میں نے اس پر دباؤ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''تم نے اس ہتھوڑے سے اتوار کی شام جیلا کے سر میں ایک خوفناک ضرب لگا کر اسے موت کے گھاٹ اتارا پھر اس ہتھوڑے کو مشتاق باجوہ کے کھیتوں میں پھینک کر حویلی مراد چلے گئے۔''

''میں نے ایسا کچھ نہیں کیا تھانے دار صاحب۔'' وہ روہانسی آواز میں بولا۔ ''آپ خوامخواہ مجھ پر الزام لگا رہے ہیں۔''

''اوئے الزام کی اولاد۔'' پیچھے کھڑے حوالدار نے اس کی گردن پر دو ہتڑ رسید کرتے ہوئے کہا۔ ''ملک صاحب کے سوالات کے سیدھے سیدھے جواب دے ورنہ وہ حشر کروں گا کہ آنے والی سات نسلیں دونوں آنکھوں سے محروم پیدا ہوں گی۔''

''دیکھ لیں تھانے دار صاحب! آپ کا حوالدار کیسے مجھ پر ظلم کر رہا ہے۔'' وہ فریادی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''یہ پوری رات بھی اسی قسم کی دھمکیاں دیتا رہا ہے۔''

''ابھی میں نے تمہیں صرف دھمکیاں ہی دی ہیں، ایک آنکھ والے سوکھے سکڑے جن۔'' حوالدار نے قہرناک نظر سے اسے گھورا۔ ''اگر میں نے اپنی دھمکیوں پر عمل کیا تو تمہارا حشر نشر ہو جائے گا۔''

''اور پھر تم کسی سے یہ کہنے کے قابل نہیں رہو گے.....'' میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''..... میں لوہار کی اولاد ہوں۔ میرا ہاتھ کسی ہتھوڑے سے کم نہیں۔ ایک ہاتھ بھی پڑ گیا تو ہوش ٹھکانے آ جائیں گے!''

وہ متوحش نظر سے مجھے تکنے لگا۔ ''یہ بات آپ کو کس نے بتائی ہے؟''

''اسی شخص نے.....'' میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ڈرامائی انداز میں کہا۔ ''جس نے تمہیں جیلا کا قتل کرتے دیکھا تھا۔''

''یہ..... یہ آپ..... کیا کہہ رہے ہیں تھانے دار صاحب۔'' وہ روہانسی صورت بنا کر بولا۔ ''میں نے جیلا کو قتل نہیں کیا۔ کسی نے آپ کو میرے خلاف ورغلا دیا ہے۔ میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں۔''

''قسم کھانے یا آنسو بہانے سے تمہارا کوئی بھلا نہیں ہونے والا جمانجج نال!'' میں نے کٹیلے لہجے میں کہا۔ ''تم قانون کے شکنجے میں پھنس چکے ہو۔''

''آپ کو کوئی غلط فہمی ہوگئی ہے جناب۔'' وہ بے بسی سے گردن جھٹکتے ہوئے بولا۔ ''میرا جیلا کی موت سے کوئی لینا دینا نہیں۔''

''کیا یہ سچ ہے کہ تمہیں صدیقا حلوائی کی بیٹی نبیلہ سے عشق ہو گیا تھا؟'' میں نے اس کی وضاحت کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

''جی یہ سچ ہے۔'' وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ ''نبیلہ مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔''

''تم نے نبیلہ کے لیے اپنا رشتہ بھی بھیجا تھا؟'' میں نے سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن صدیقا حلوائی نے اس رشتے سے چٹا انکار کر دیا تھا۔ اس کے بعد تم نے اس کے خلاف الٹی سیدھی بکواس بھی کی تھی اور جیلا کو اپنا دشمن سمجھنے لگے تھے کیونکہ نبیلہ کی شادی جیلا سے ہونے جا رہی تھی اسی لیے تمہیں جیلا سے شدید نفرت محسوس ہونے لگی تھی پھر.....'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''پھر تم نے نفرت کے اسی جذبے سے مغلوب ہو کر جیلا کو اپنے راستے سے ہٹا دیا..... ہیں نا؟''

''نہیں جی! ایسا کچھ نہیں ہے۔'' وہ زچ ہوتے ہوئے بولا۔ ''یہ ٹھیک ہے کہ میں جیلا کو پسند نہیں کرتا تھا لیکن میں نے اس کی جان نہیں لی۔ آپ کو میری بات کا یقین آئے یا نہ آئے مگر سچ یہی ہے۔''

اس کے ٹوٹے ہوئے لہجے سے مجھے راست گوئی کا سراغ ملا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ان لمحات میں وہ غلط

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

بیانی سے کام نہ لے رہا ہو۔ میں چند لمحات تک ٹٹولتی ہوئی نظر سے اسے گھورتا رہا پھر کہا۔

''جا! میں تم سے آخری سوال کر رہا ہوں۔ سچ بول کر تم اپنی جان بچا سکتے ہو اور اگر غلط بیانی کی تو سیدھے جیل جاؤ گے اور ممکن ہے جیلا کے قتل کے سلسلے میں تمہیں پھانسی بھی ہو جائے.....!''

''تھانے دار صاحب!'' وہ قدرے سنبھلے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''میں نے اب تک آپ سے ایک بھی جھوٹ نہیں بولا۔ آپ جو بھی سوال کریں گے، میں اس کا بالکل سچا اور کھرا جواب دوں گا۔ آپ پوچھیں، کیا پوچھنا چاہتے ہیں۔''

میں نے پوچھا۔ ''انیس مئی بہ روز اتوار، جیٹھ کی پانچ تاریخ کو عصر اور مغرب کے درمیان تم کہاں تھے؟''

''میں ادھر حویلی مراد ہی میں تھا جناب۔''

''حویلی مراد میں کس جگہ پر تھے؟'' میں نے پوچھا۔

''اور اس وقت کیا کرتے پھر رہے تھے؟''

''میں اپنے دوستوں کے ساتھ تھا۔'' اس نے بتایا۔

''اور ہم لوگ تاش کھیل رہے تھے..... منگ پتا!''

''منگ پتا.....'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''سوکھا ہی یا کچھ لگا کر؟''

''نہیں جناب۔'' وہ بڑی شدت سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ہم پیسوں کی نہیں، بس کھانے پینے کی شرط لگا کر منگ پتا کھیلتے ہیں۔''

''منگ پتا'' تاش کا ایک ایسا گیم ہے جو شرط لگا کر کھیلا جاتا ہے۔ یہ شرط پیسوں کی بھی ہو سکتی ہے اور کسی دوسری چیز کی بھی۔ میں نے جما سے پوچھا۔

''اس روز تم لوگوں نے کھانے پینے کی کس چیز کی شرط لگا رکھی تھی؟''

''ہندوانوں کی۔'' اس نے جواب دیا۔ ''ہم نے چار ہندوانے (تربوز) لیے اور دریا کی طرف چل پڑے۔ ہندوانوں کو ہم نے ایک تھیلے میں ڈال کر راوی میں پھینک دیا تاکہ اچھی طرح ٹھنڈے ہو جائیں۔ اس تھیلے کو ایک رسی کی مدد سے درخت کے ساتھ باندھ دیا تھا پھر ہم درختوں کے نیچے بیٹھ کر تاش کھیلنے لگے۔ جب چند بازیوں کے بعد یہ فیصلہ ہو گیا کہ آج کے ہندوانوں کے پیسے کون دے گا تو پھر ہم راوی میں کود کر کنارے کنارے نہانے لگے۔ شام سے تھوڑی دیر پہلے ہم نے دریا سے وہ ہندوانے نکال کر کھائے اور پھر گاؤں کی طرف چلے گئے تھے۔ جب ہم اپنے گھروں کو پہنچے تو مغرب کی اذان ہو رہی تھی۔''

''مغرب کی اذان کا مطلب یہ ہوا کہ تم لوگ لگ بھگ سات بجے واپس آئے تھے؟'' میں نے پوچھا۔

انیس مئی کو شیخوپورہ اور لائل پور کے آسمان پر غروب آفتاب کا وقت چھ بج کر ستاون منٹ تھا۔ عموماً غروب آفتاب کے دو چار منٹ بعد ہی مغرب کی اذان ہوا کرتی ہے۔

جما نے جواب دیا۔ ''جناب! میں ٹائم کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ہو سکتا ہے، سات ہی بجے ہوں۔''

''اور تم لوگ کتنے بجے ہندوانوں کے ساتھ دریا کی طرف گئے تھے؟''

''کوئی تین، ساڑھے تین بجے جناب۔'' اس نے بتایا۔

اگر وہ لوگ واقعی ساڑھے تین بجے سے شام سات بجے تک حویلی مراد میں موجود تھے تو پھر جما کا جیلا کے قتل میں کوئی ہاتھ نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے ایک فوری خیال کے تحت پوچھا۔

''وقوعہ کے روز تمہارے ساتھ اور کون کون راوی پر نہانے، ہندوانے کھانے اور منگ پتا کھیلنے گیا تھا؟''

''ہم چار دوست تھے جناب۔'' اس نے بتایا۔ ''ایک میں اور باقی تین قادر، ناصر اور حفیظ تھے۔''

''کیا قادر، ناصر اور حفیظ کا تعلق بھی حویلی مراد ہی سے ہے؟''

اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

''تم یہ نہیں سمجھنا کہ میں آنکھیں بند کر کے تمہاری کہانی پر یقین کر لوں گا۔'' میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''میں ابھی ایک بندے کو حویلی مراد روانہ کر رہا ہوں۔ وہ وہاں جا کر قادر، ناصر اور حفیظ سے ملاقات کرے گا۔ اگر ان تینوں نے اس بات کی تصدیق کر دی کہ تم وقوعہ کے روز سہ پہر ساڑھے تین بجے سے لے کر شام سات بجے تک ان کے ساتھ تھے اور اس دوران میں تم ایک لمحے کے لیے بھی ادھر ادھر نہیں ہوئے تو پھر میں تمہاری بات کا یقین کر لوں گا اور اس کے بعد تمہیں یہاں سے جانے کی اجازت ہو گی۔''

''آپ ضرور اپنے بندے کو حویلی مراد بھیجیں جی۔'' وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ''اللہ کے حکم سے آپ کا شک دور ہو جائے گا۔''

میں نے جما کو حوالات میں بھیج کر جیرا کو چوان کو اپنے پاس بلا لیا۔ جما کو میں نے خالی خولی دھمکی نہیں دی تھی بلکہ اسی لمحے میں نے خصوصی ہدایات کے ساتھ باسط علی کو دوبارہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

حویلی مرادروانہ کردیا تھا تاکہ وہ جما کی اسٹوری کی تصدیق یا تردید کرسکے۔

جیرا کوچوان گٹھے ہوئے بدن کا مالک تھا۔ اس کی عمر پچیس کے اریب قریب تھی۔ اس کی رنگت گندمی تھی اور وہ ہاتھ پاؤں کا خاصا مضبوط دکھائی دیتا تھا۔ وہ میرے سامنے گردن جھکا کر کھڑا ہوگیا۔ میں نے کہا۔

''جیرا! کیا تمہیں پتا ہے کہ میں تمہیں یہاں کیوں لے کر آیا ہوں.....؟''

''آپ جیلا کے قتل کی تفتیش جو کررہے ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''لیکن یہ سمجھ نہیں آیا کہ میرا اس بندے سے کیا تعلق واسطہ۔''

''بہت گہرا تعلق ہے اور بہت مضبوط واسطہ۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''وہ ماہ پہلے کا واقعہ بھول گئے ہو کیا؟''

''کون سا واقعہ جی؟'' وہ سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

''جب تمہارا جیلا سے جھگڑا ہوگیا تھا۔'' میں نے... بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم نے مار مار کر جیلا کے کپڑے کھول دیے تھے اور اسے خطرناک نتائج کی دھمکیاں بھی دی تھیں.....دی تھیں یا نہیں؟''

''وہ جناب.....'' وہ ناگواری سے بولا۔ ''اس نے بات ہی ایسی کردی تھی کہ مجھ سے برداشت نہیں ہوسکا اور میں نے اس پر ہاتھ اٹھا دیا تھا۔''

''اس نے تمہیں ایسا کیا کہہ دیا تھا؟'' میں نے تیز لہجے میں استفسار کیا۔ ''کیا جیلا نے تمہیں کوئی ماں بہن کی گالی دی تھی؟''

''ماں بہن کی گالی تو میں شاید برداشت کرجاتا۔'' وہ سلگتے ہوئے انداز میں بولا۔ ''لیکن میں رانا جی کے خلاف ایک لفظ نہیں سن سکتا۔''

''کون رانا جی؟'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''رانا اقبال جناب۔'' اس نے بتایا۔ ''میں نے رانا جی کا نمک کھایا ہے اور ان کے مجھ پر بہت سارے احسان ہیں۔ یہ جو میں گھوڑا تانگا چلاتا ہوں نا..... یہ بھی انہوں نے ہی مجھے بنا کر دیا ہے۔ وہ میرے ان داتا ہیں تھانے دار صاحب۔''

''اچھا جی.....'' میں نے خود کلامی کے انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ''جیلا نے تمہارے رانا جی کی شان میں ایسی کون سی گستاخی کردی تھی کہ تم نے اسے روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا؟''

''اس نے رانا جی کا مذاق اڑایا تھا۔'' جیرا نے بتایا۔ ''وہ کہہ رہا تھا، یہ نقلی رانا ہیں۔ ایک دو نسل پہلے یہ لوگ کمہار ہوا کرتے تھے، کھوتے چراتے تھے اور مٹی ڈھوتے تھے۔ پھر اچانک یہ رانا بن گئے.....'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''جیلا کی یہ بکواس سن کر تو میرے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی۔ وہ تو لوگوں نے بیچ بچاؤ کرادیا ورنہ میں اس کمینے کی.....''

''جان لے لیتا.....!'' اس کے ادھورے جملے کو میں نے مکمل کرتے ہوئے کہا۔ ''ہیں نا.....تم یہی کہنے والے تھے نا؟''

''ایسا ہو بھی سکتا تھا، تھانے دار صاحب!'' وہ جوش میں بول گیا۔

''اس موقع پر لوگوں نے بیچ بچاؤ کرادیا اور ایسا نہیں ہوسکا۔'' میں نے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''لیکن تم مسلسل اس تاک میں رہے کہ جیلا کو ٹھکانے لگا سکو اور پھر انیس مئی کو تمہیں ایسا موقع مل گیا اور تم نے ہتھوڑے کا مہلک وار کرکے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔''

''یہ غلط ہے جی۔'' وہ جلدی سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں نے جیلا کو قتل نہیں کیا۔ میں تو اس طرف آیا بھی نہیں اور انیس مئی کو تو میں گھر میں بھی نہیں تھا۔''

''گھر میں نہیں تھے.....'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''پھر کہاں تھے تم؟''

''میں لاہور گیا ہوا تھا اپنی خالہ سے ملنے۔'' اس نے بتایا۔

''تمہاری خالہ لاہور کے کس علاقے میں رہتی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''باغبان پورہ میں۔'' اس نے جواب دیا۔

''تمہاری خالہ کا نام کیا ہے اور اس کے گھر کا پتا کیا ہے؟''

''خالہ غفوراں۔'' اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا پھر غفوراں کا ایڈریس مجھے نوٹ کروادیا۔

''تم غفوراں سے ملنے کب لاہور گئے تھے؟'' میں نے پوچھا۔ ''اور تمہاری واپسی کب ہوئی تھی؟''

''میں اتوار انیس مئی کی صبح لاہور کے لیے روانہ ہوا تھا اور دوپہر کا کھانا میں نے غفوراں خالہ کے ساتھ اس کے گھر میں کھایا تھا۔'' اس نے بتایا۔ ''پھر اگلے دن یعنی سوموار کی صبح میں واپس آیا تھا۔''

جیرا کے بیان کے مطابق، وہ وقوعہ کے وقت اپنی

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

خالہ غفوراں کے پاس لاہور میں تھا۔ اگر اس کے بیان میں کوئی ہیر پھر نہیں تھا تو پھر وہ جیلا کے قتل میں ملوث نہیں ہوسکتا تھا کیونکہ مرزا پور کے کھیت، باغبان پورہ لاہور سے کافی میلوں کی دوری پر تھے اور جیرا کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ بہ یک وقت ان دو مقامات پر پایا جائے۔

''کیا غفوراں خالہ تمہارے اس بیان کی تصدیق کرے گی؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیوں نہیں جناب۔'' وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ''خالہ غفوراں ضرور میری بات کی گواہی دے گی۔''

''ٹھیک ہے، میں کسی اہلکار کو لاہور بھیج کر خالہ غفوراں سے تمہارے بیان کی تصدیق کرواتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''جب تک تم سرکاری مہمان کی حیثیت سے ادھر حوالات ہی میں رہو گے۔''

''جیسی آپ کی مرضی جناب۔'' وہ مسکین سی صورت بنا کر بولا۔ ''میں تو عاجز اور بے چارہ سا بندہ ہوں۔''

''تم جتنے عاجز اور لاچار ہو نا، یہ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔'' میں نے طنز میں بجھے ہوئے الفاظ میں کہا۔ ''تمہارے جیسے اکثر جیرا بلیڈ سے میرا واسطہ پڑتا رہتا ہے۔''

وہ کچھ نہیں بولا اور میں نے اسے حوالات میں بھجوا دیا۔ جس زمانے کا یہ واقعہ ہے اس وقت فنگر پرنٹس اٹھانے کا رواج عام نہیں ہوا تھا اور اگر کوئی مستعد تفتیشی افسر ایسی جرأت رندانہ کر بھی گزرتا تھا تو عدالت اس کی کوشش کو خاطر خواہ اہمیت نہیں دیتی تھی۔ کسی بھی ملزم کو مجرم ثابت کرنے کے لیے بڑے ٹھوس ثبوت عدالت میں پیش کرنا پڑتے تھے۔ آج کل کی طرح ہمارے زمانے میں آسانیاں میسر نہیں تھیں۔

اگر اس وقت فنگر پرنٹس کا رواج عام ہوتا اور عدالت بھی ان کی اہمیت کو قدر کی نگاہ سے دیکھتی تو میں آلۂ قتل کے چوبی دستے پر سے انگلیوں کے نشانات کو اٹھا کر جیرا بلیڈ اور جمانجٹ نال کے فنگر پرنٹس سے میچ کر کے فوراً اس بات کا اندازہ لگا سکتا تھا کہ ان دونوں کا جیلا کے قتل سے کوئی تعلق ہے یا نہیں اور یہی عمل دیگر مشکوک افراد کے ساتھ بھی دہرایا جاسکتا تھا۔

میں نے جیلا کی لاش اس کے ورثاء کے حوالے کردی تھی اور مجھے پتا چلا تھا کہ اس کی تدفین عصر اور مغرب کے بیچ کردی جائے گی۔ مجھے جیلا کی الم ناک موت کا بہت دکھ تھا اور میری دلی خواہش یہی تھی کہ میں جلد از جلد اس کے قاتل تک پہنچ کر اسے عبرت ناک انجام سے دوچار کروں۔

☆☆☆

دوپہر کے بعد ایک ادھیڑ عمر شخص مجھ سے ملنے تھانے آیا۔ میں نے اسے کمرے میں بلا لیا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد جب اس نے اپنا تعارف کرایا تو میں چونک اٹھا۔

''ملک صاحب! میرا نام رانا اقبال ہے۔''

جیرا بلیڈ نے مجھے بتایا تھا کہ وہ رانا اقبال کا نمک خوار اور احسان مند ہے۔ میں نے فوراً اندازہ قائم کرلیا کہ وہ اپنے چمچے کے پیچھے آیا تھا۔ اس کے چہرے پر رعونت تھی۔

''رانا صاحب! آپ حویلی مراد سے تشریف لائے ہیں نا؟'' میں نے کہا۔ ''آپ کو اپنے بندے کی بہت فکر ہوگی۔''

''اپنے جاں نثاروں کی فکر تو کرنا ہی پڑتی ہے نا ملک صاحب۔'' وہ سینہ چوڑا کرتے ہوئے بولا۔ ''مجھے پتا چلا ہے کہ آپ نے جیرا کو جیلا کے قتل کے الزام میں تفتیش کے لیے یہاں بند کر رکھا ہے۔''

''آپ کو بالکل ٹھیک پتا چلا ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تفتیش جاری ہے۔''

''جیرا نے آپ کو یہ نہیں بتایا کہ وقوعہ کے روز وہ نہ تو حویلی مراد میں تھا اور نہ ہی مرزا پور میں۔'' وہ مجھے کچھ سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

''جی رانا صاحب! اس نے مجھے بتایا ہے۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''وہ اپنی خالہ غفوراں سے ملنے لاہور گیا ہوا تھا۔''

''پھر بھی آپ نے اسے تھانے میں بند کر رکھا ہے؟'' وہ شکایتی لہجے میں بولا۔ ''ایک بندہ جائے وقوعہ سے درجنوں میل دور تھا پھر وہ اس معاملے میں کیسے ملوث ہوسکتا ہے.....!''

''اگر انیس مئی کی شام جیرا واقعی باغبان پورہ لاہور میں اپنی خالہ غفوراں کے پاس تھا تو پھر یقیناً اس کا جیلا کی موت سے کوئی تعلق نہیں جوڑا جاسکتا۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''لیکن یہ جیرا کا اور آپ کا بیان ہے۔ ابھی اس بیان کی تصدیق نہیں ہوگی اور جب تک تصدیق نہیں ہوجاتی، جیرا کو شک سے پاک اور اس کیس سے بری الذمہ نہیں سمجھا جاسکتا۔''

''آپ کس قسم کی تصدیق کرنا چاہتے ہیں؟'' وہ سپاٹ آواز میں بولا۔

''میں نے اپنے ایک بندے کو ماسی غفوراں کی

WWW.PAKSOCIETY.COM

http://paksociety.com

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

Downloaded From Paksociety.com

طرف روانہ کردیا ہے۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔

'' وہ جیسے ہی واپس آئے گا، جیرا کے بیان کی تصدیق یا تردید ہوجائے گی اور اس کے بعد ہی میں جیرا کے بارے میں کوئی فیصلہ کرسکوں گا۔''

''میں جانتا ہوں، آپ نے جیرا کو ایک معمولی سے واقعے کی وجہ سے اٹھالیا ہے۔'' وہ جذبات سے عاری لہجے میں بولا۔'' کچھ عرصہ پہلے جیرا کا جیلا سے جھگڑا ہوگیا تھا اور آپ کو شک ہے کہ جیرا نے اسی بنا پر جیلا کو ٹھکانے لگا دیا ہے ..... ہیں نا؟''

''بات تو آپ کی درست ہے رانا صاحب۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔'' لیکن شاید آپ کو پتا نہیں کہ قانون کی نظر میں معمولی سے معمولی بات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ اگر جیرا بے قصور ثابت ہوا تو میں اسے چھوڑ دوں گا۔''

''اچھا ہوتا، آپ جیرا کو ابھی میرے ساتھ جانے دیتے۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔'' میں اس کی ضمانت دینے کو تیار ہوں۔''

''اتنا تیز نہ بھاگیں رانا صاحب.....!'' میں نے اسی کے انداز میں جواب دیا۔'' ابھی ضمانت کا وقت نہیں آیا۔ اگر میں نے آپ کے بندے کے خلاف پرچہ کاٹ دیا تو پھر آپ عدالت میں جاکر اس کی ضمانت کرانے کی کوشش کیجیے گا۔''

وہ چند لمحات تک خشمگیں نظر سے مجھے دیکھتا رہا پھر ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔'' یہ آپ ٹھیک نہیں کررہے ملک صاحب۔ آپ نے میرا مان بھی نہیں رکھا.....!''

''میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ قانونی تقاضے پورے کرنے کے لیے میں کیا ٹھیک کررہا ہوں اور کیا غلط۔'' میں نے واشگاف الفاظ میں کہا۔'' اور جہاں تک آپ کے مان اور احترام کا تعلق ہے تو میں بڑے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے آپ کو بہت عزت دی ہے۔''

جب اس نے دیکھا کہ میرے سامنے اس کی دال نہیں گل سکتی تو وہ خفگی بھرے انداز میں مجھے'' خدا حافظ'' کہہ کر تھانے سے رخصت ہوگیا۔

شام سے پہلے یہ ثابت ہوگیا کہ جیلا کو پیش آنے والے افسوس ناک واقعے سے نہ تو جما کا تعلق ہے اور نہ ہی جیرا کا کیونکہ حویلی مراد سے جما کے بیان کی اور لاہور سے جیرا کے بیان کی تصدیق ہوگئی تھی۔ جب یہ دونوں افراد جائے واردات سے کافی دور تھے تو پھر انہیں مزید رگڑنا مناسب نہیں تھا لہٰذا میں نے اس ہدایت کے ساتھ انہیں جانے کی اجازت دے دی کہ وہ مجھے اطلاع دیے بغیر اپنا علاقہ چھوڑ کر کہیں نہیں جائیں گے۔

اگلی صبح میں نے مقتول کے باپ رفیق کو تھانے بلالیا۔ اس کا بڑا بھائی صدیق عرف صدیقا بھی ساتھ ہی چلا آیا تھا۔ میں نے دونوں کو اپنے سامنے بٹھالیا پھر رفیق سے پوچھا۔

''جی، تھانے دار صاحب۔'' اس نے دکھ بھرے لہجے میں جواب دیا پھر سوالیہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

''جیلا کے قاتل کا کچھ پتا چلا جی؟''

''ابھی تک کچھ پتا نہیں چلا لیکن بہت جلد قاتل میری گرفت میں ہوگا۔'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔'' میں نے اسی سلسلے میں تمہیں یہاں بلایا ہے۔''

''میں کیا کرسکتا ہوں جناب!'' وہ بے بسی سے بولا۔

''تم بہت کچھ کرسکتے ہو رفیق۔'' میں نے اس کی ہمت بندھاتے ہوئے کہا۔'' تفتیش کو کچھ نئے رخ ملے ہیں۔ میں اسی سلسلے میں تم سے کچھ پوچھ تاچھ کرنا چاہتا ہوں۔''

''جی ضرور..... میں حاضر ہوں۔'' وہ کمزور سے لہجے میں بولا۔

''تھانے دار صاحب! مجھے پتا چلا ہے کہ آپ نے حویلی مراد سے کانا جما اور جیرا کو چوان کو بھی پوچھ تاچھ کے لیے تھانے بلایا تھا۔'' صدیقا حلوائی نے معتدل لہجے میں مجھ سے استفسار کیا۔'' انہوں نے کچھ اگلا کہ نہیں؟''

'' انہوں نے کچھ نگلا ہی نہیں تھا تو اگلتے کہاں سے۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔'' بہرحال، میں نے ان دونوں سے کڑی تفتیش کی ہے اور ان دونوں کو اس سلسلے میں بے قصور پایا ہے۔ وقوعہ کے روز وہ دونوں مرزا پور سے بہت دور تھے۔ کانا جما اپنے دوستوں قادر، ناصر اور حفیظ کے ساتھ سہ پہر ساڑھے تین بجے سے شام سات بجے تک راوی میں نہا تا رہا تھا، ہندوانے کھاتا رہا تھا اور تاش کھیلتا رہا تھا جبکہ جیرا کو چوان اس دن اپنی خالہ غفوراں سے ملنے لاہور کے ایک محلے باغبان پورہ گیا ہوا تھا۔ ان دونوں کا جیلا کے قتل سے کوئی تعلق واسطہ نہیں اس لیے میں نے انہیں جانے کی اجازت دے دی۔'' لمحاتی توقف کرکے میں نے ایک گہری سانس لی پھر صدیقا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''کل رانا اقبال بھی میرے پاس آیا تھا۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

صدیقا حلوائی کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات نمودار ہوئے۔ اس نے تیز لہجے میں پوچھا۔ ''وہ یہاں کیا لینے آیا تھا؟''

''اپنے نمک خوار جیرا کو چوان کو لینے۔'' میں نے بتایا۔ ''لیکن میں نے اسے سوکھا ہی ٹرخا دیا۔''

''اچھا کیا آپ نے۔'' وہ اطمینان کی سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''مجھے یہ بندہ زہر لگتا ہے۔''

مجھے یوں محسوس ہوا کہ صدیقا حلوائی اپنے دل میں رانا اقبال کے لیے غم و غصے کے جذبات رکھتا تھا۔ میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

''تمہیں رانا اقبال کیوں زہر لگتا ہے؟''

''وہ کم ذات اور کمینہ ہے۔'' وہ نفرت بھرے لہجے بولا۔

''میں نے سنا ہے، وہ اصلی رانا یعنی راجپوت بھی نہیں۔'' میں نے کریدنے والے انداز میں صدیقا حلوائی سے پوچھا۔ ''اس نے اپنی ذات بدل رکھی ہے۔''

''جناب! تین چار نسلیں پہلے یہ لوگ کمہار ہوتے تھے۔'' وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''اس وقت یہ کہیں اور رہتے تھے۔ پھر ان کے پاس کہیں سے پیسا آ گیا۔ جب یہ ہمارے علاقے میں آ کر بسے تو خود کو رانا کہلوانا شروع کر دیا۔ یہ ہے ان کی ہسٹری۔''

''اوہ.....!'' میں نے سر ہنے والی نظر سے صدیقا کو دیکھا۔ ''تم تو ان لوگوں کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہو۔ تمہیں یہ بھی علم ہوگا کہ ان کے پاس دولت کہاں سے آ گئی تھی؟''

''مجھے صحیح طور پر تو پتا نہیں لیکن سنا ہے، انہوں نے کوئی بہت بڑا ڈاکا ڈالا تھا۔'' اس نے بتایا۔ ''اس ڈاکے سے حاصل ہونے والے مال و دولت نے انہیں کمہار سے رانا بنا دیا۔ کھوتے چرانے والے زمین دار بن گئے۔''

''یہی بات جیلا نے اپنی موت سے دو ماہ پہلے جیرا کوچوان سے کہی تھی۔'' میں نے صدیقا حلوائی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''جس پر جیرا کو طیش آ گیا تھا اور اس نے جیلا کے ساتھ مار پیٹ کی تھی۔''

''یہ بات آپ کو جیرا نے بتائی ہے؟''

''ہاں۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔

''تو پھر اس نے آپ کو آدھی بات بتائی ہے جناب۔'' اس نے کہا۔

''آدھی بات..... کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''یہ سچ ہے کہ جیلا نے اس روز رانا اقبال کے بارے میں ایسی بات کی تھی جس پر جیرا کوچوان آپے سے باہر ہو گیا تھا۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''لیکن جیلا نے... خوامخواہ ایسی بات نہیں کی تھی۔ اس سے پہلے جیرا میری بیٹی نبیلہ کے حوالے سے کافی کچھ کہہ چکا تھا۔ جیلا نے تو اس کی بکواس کا جواب دیا تھا۔''

یہ ایک نیا زاویہ سامنے آ رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''ایک بات سمجھ نہیں آئی صدیقا۔ جیرا کی تمہاری بیٹی سے کیا دشمنی کہ وہ اس کے بارے میں الٹی سیدھی بکواس کرتا پھرے؟''

''جیرا کی نہیں، اس کے پرائیویٹ باپ رانا اقبال کی نبیلہ سے دشمنی ہے۔'' وہ زہر خند لہجے میں بولا۔ ''جیرا نے تو رانا کو خوش کرنے کے لیے اس دن جیلا سے مار پیٹ کی تھی۔''

''میں اب بھی کچھ نہیں سمجھا؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''نبیلہ اور رانا اقبال کی دشمنی کی کیا تک بنتی ہے؟''

''میں آپ کو سمجھاتا ہوں تھانے دار صاحب۔'' وہ بڑے رسان سے بولا۔ ''اصل بات یہ ہے کہ کچھ عرصہ پہلے رانا اقبال نے نبیلہ سے شادی کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ وہ بیوی بچوں والا ہے۔ آپ خود سوچیں، اس رشتے کے لیے میں کیسے ہاں کر دیتا۔ میں نے اسے صاف انکار کر دیا۔ اس نے میرے انکار کو اپنی توہین سمجھا اور ایک روز وہ نبیلہ کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ نبیلہ اس وقت اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھیتوں کی طرف جا رہی تھی۔ نبیلہ نے اس سے بچنے کی کوشش کی لیکن وہ بدتمیزی پر اتر آیا۔ نبیلہ کا بھی دماغ گھوم گیا۔ اس نے رانا کو خوب کھری کھری سنا دیں۔ اس ہنگامے پر وہاں کافی لوگ جمع ہو گئے اور معاملہ رفع دفع کرا دیا گیا لیکن رانا ایک کمینہ اور کینہ پرور شخص ہے۔ وہ اپنی بے عزتی کو بھولا نہیں اور جب میں نے نبیلہ کا رشتہ جیلا سے طے کر دیا تو اس نے نبیلہ کے بارے میں الٹی سیدھی باتیں کرنا شروع کر دیں لیکن میں نے اس کی بکواس پر توجہ نہیں دی مگر جب اس کے چچیرے جیرا نے جیلا کے سامنے نبیلہ کے بارے میں غلط الفاظ استعمال کیے تو وہ برداشت نہ کر سکا اور اس نے بھی رانا اقبال کی اصلیت کھول کر بیان کر دی جس کے نتیجے میں ان کے درمیان مار پیٹ ہوئی تھی۔''

تو گویا یہ ''ایک انار، سو بیمار'' والا قصہ تھا۔ نبیلہ کا رشتہ تو جیلا سے طے ہوا تھا لیکن اس رشتے سے پہلے حویلی مراد

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

میں اس سے شادی کے کئی خواہش مند موجود تھے..... میں نے صدیقا حلوائی سے ایک اہم سوال کیا۔

''تم کیا کہتے ہو..... کیا جیلا کو پیش آنے والے واقعے میں رانا اقبال کا کوئی ہاتھ ہوسکتا ہے؟''

''اللہ ہی بہتر جانتا ہے تھانے دار صاحب!'' وہ ایک گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔ ''میں خوامخواہ کسی پر الزام لگا کر اپنی مٹی خراب نہیں کرنا چاہتا۔ ویسے میں اتنا جانتا ہوں کہ وہ بہت کمینہ اور بدذات ہے۔''

میں رانا اقبال سے گزشتہ روز مل چکا تھا۔ صدیقا حلوائی کچھ غلط بھی نہیں کہہ رہا تھا۔ میں نے اس شخص میں کافی غرور پایا تھا۔ بہرحال، صدیقا کی زبانی جو حالات مجھ تک پہنچے تھے ان کی روشنی میں، میں رانا اقبال کو یکسر نظر انداز نہیں کرسکتا تھا۔ اس کی نگرانی کا بندوبست کرنا ضروری تھا۔

''رفیق!'' میں نے مقتول کے باپ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم نے مجھے رانا اقبال کے بارے میں پہلے کیوں نہیں بتایا تھا؟''

''مجھے بھی ابھی پتا چلا ہے جناب۔'' وہ جلدی سے بولا۔

میں نے سوالیہ نظر سے صدیقا کی طرف دیکھا۔

''فیکا ٹھیک کہہ رہا ہے تھانے دار صاحب۔'' صدیقا نے تصدیق کرتے ہوئے کہا۔ ''اسے صرف اتنا پتا تھا کہ حویلی مراد میں نیلہ کے کئی رشتے آئے ہوئے تھے لیکن میں نے اسے رانا اقبال کی کمینگی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔''

''ٹھیک ہے، میں آپ لوگوں کی بات کا یقین کرلیتا ہوں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا پھر رفیق سے مخاطب ہوتے ہوئے اضافہ کیا۔

''میں نے کل جیلا کی لاش تمہارے گھر بھجوادی تھی تاکہ اس کی تدفین میں کوئی مزید تاخیر نہ ہو لیکن اس لاش کے ساتھ اسپتال سے جو رپورٹ آئی ہے، اس میں بعض باتیں ایسی لکھی ہوئی ہیں کہ ان کی تصدیق یا تردید صرف تم ہی کرسکتے ہو اور میں نے اسی لیے آج تمہیں تھانے بلایا ہے۔''

وہ ہمہ تن گوش ہوگیا۔ صدیقا حلوائی بھی سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے فیکا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''کیا جیلا کوئی نشہ وغیرہ بھی کرتا تھا؟''

''نہیں جناب، بالکل نہیں۔'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔

''کوئی سگریٹ، پان، افیون، چرس، حقہ، تمباکو یا کچھ اور.....؟'' میں نے کہا۔ ''یا کوئی دوا وغیرہ؟''

سگریٹ، حقہ، تمباکو اگرچہ ان نشے میں شمار نہیں ہوتے تھے جیسا کیمیکل ایگزامنر کی رپورٹ میں لکھا گیا تھا لیکن میں نے روا روی میں فیکا سے سب کچھ پوچھ لیا تھا۔

''کچھ بھی نہیں سرکار۔'' وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ''میرے دونوں بیٹوں نے کبھی کسی قسم کا کوئی نشہ نہیں کیا۔ آپ یہ بات کیوں پوچھ رہے ہیں؟''

''میں اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ اس کی رپورٹ میں یہی لکھا ہے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''جیلا کے معدے سے حاصل ہونے والے مواد میں کسی نشہ آور چیز کی آمیزش پائی گئی ہے۔ اگر وہ کسی قسم کا نشہ نہیں کرتا تھا تو پھر کھانے میں اسے کچھ ملا کر دیا گیا تھا۔ یا صبح کے ناشتے میں اور یا پھر دوپہر کے کھانے میں.....'' میں نے لمحاتی توقف کرکے گہری نظر سے فیکا کو دیکھا پھر ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

''اور رپورٹ میں یہ بھی لکھا ہے کہ جیلا پر اس کی بے خبری میں وار کیا گیا تھا یعنی جب اس کی موت واقع ہوئی تو وہ کسی نشہ آور شے کے زیر اثر تھا۔ اگر یہ پتا چل جائے کہ اس کے معدے میں وہ نشہ آور چیز کس نے پہنچائی ہے تو پھر قاتل تک پہنچنا بہت آسان ہوجائے گا اور..... اس سلسلے میں صرف تم ہی راہ نمائی کرسکتے ہو۔''

''میں کیا کہوں تھانے دار صاحب۔'' وہ عاجزانہ انداز میں بولا۔ ''میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جیلا کسی قسم کا نشہ نہیں کرتا تھا۔ میں نے اسے کبھی سگریٹ تک پیتے نہیں دیکھا۔''

''وقوعہ کے روز صبح گھر سے نکلتے وقت اس نے کیا ناشتا کیا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''جناب! جب کھیتوں میں باقاعدہ کٹائی یا بجائی کا کام چل رہا ہوتا ہے تو ہم لوگ صبح سویرے خالی پیٹ ہی نکل جاتے ہیں تاکہ دوپہر سے پہلے زیادہ سے زیادہ کام کھینچ لیں۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اس روز بھی یہ دونوں بھائی کھائے پیے بغیر ہی کھیتوں کی طرف چلے گئے تھے۔''

''میں جانتا ہوں۔'' میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔ ''جب کسان خالی پیٹ علی الصباح کھیتوں میں پہنچ کر کام میں جت جاتا ہے تو دوپہر سے پہلے اس کے گھر کی کوئی عورت ناشتا پانی لے کر کھیتوں کی طرف ضرور

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

جاتی ہے۔ عموماً کھیت میں کام کرنے والے افراد دس اور گیارہ بجے کے درمیان گھر سے آیا ہوا ناشتا کرتے ہیں اور پھر دوبارہ اپنے کام میں جت جاتے ہیں۔ یہ ناشتا اتنا توی ہوتا ہے کہ پھر دوپہر کے کھانے کی ضرورت باقی نہیں رہتی اور کسان شام میں واپس آ کر گھر ہی میں سیر ہو کر کھانا کھاتا ہے۔ فیکا جی! تم سے میرا سوال یہ ہے کہ.....'' میں نے لمحاتی توقف کر کے اس کی آنکھوں میں جھانکا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''انیس مئی کو جیلا کے لیے کھانا لے کر کون کھیتوں کی طرف گیا تھا.....تم یا تمہاری بیوی آسیہ؟''

''جب ہم تینوں باپ بیٹے کھیتوں میں مصروف ہوتے ہیں تو میری گھر والی ہمارے لیے ناشتا کھانا لے کر کھیتوں میں جاتی ہے۔'' رفیق عرف فیکا نے جواب دیا۔

''لیکن میں نے آپ کو پہلے بھی بتایا ہے نا، اس روز میری کمر میں بہت زیادہ تکلیف تھی اور میں کام پر نہیں گیا تھا۔''

''تو تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ آسیہ کھانا لے کر کھیتوں میں گئی تھی؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں جی، آسیہ تو سارا دن میری دیکھ بھال میں لگی رہی تھی۔'' اس نے بتایا۔

''پھر کھانا کس نے پہنچایا؟'' میں نے کڑے لہجے میں دریافت کیا۔ ''اب یہ نہیں کہنا کہ اس دن کھانا گیا ہی نہیں۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ بتاتی ہے کہ جب جیلا کو موت کے گھاٹ اتارا گیا، اس کے معدے میں کھانا موجود تھا اور اس کھانے کے اندر کسی نشہ آور شے کے آثار بھی پائے گئے ہیں.....!''

''جی، میں آپ سے جھوٹ کیوں بولوں گا۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''اس دن شیلا اور جیلا کے لیے کھانا گیا تھا۔''

''کون لے کر گیا تھا ان کا کھانا؟''

''اس بندے کا نام صفدر ہے جی۔'' اس نے بتایا۔

''میری گھر والی نے صفدر کے ہاتھ ان دونوں کا کھانا بھجوایا تھا۔''

''یہ صفدر کون ہے؟'' میں نے ٹٹولنے والی نظر سے رفیق عرف فیکا کو گھورا۔ ''اور کہاں مل سکتا ہے؟''

مجھے شک گزر رہا تھا کہ کہیں اس بندے نے کھانے میں کچھ ملا تو نہیں دیا تھا جس کی وجہ سے جیلا بے خبری کی حالت میں چلا گیا اور قاتل کو اپنا کام کرنے میں کسی دشواری کا سامنا نہیں ہوا۔ ان خیالات کے دوران ہی میرے ذہن نے یہ بھی سوچا، کہیں یہ صفدر ہی جیلا کے قتل میں ملوث تو نہیں؟

''صفدر ادھر مرزا پور ہی کا رہنے والا ہے تھانے دار صاحب!'' رفیق نے کہا۔ ''اس وقت وہ کھیتوں میں ہوگا۔''

میں نے فوراً ایک اہلکار کو کھیتوں کی طرف دوڑایا کہ وہ صفدر کو اپنے ساتھ لے آئے پھر میں رفیق عرف فیکا کی جانب متوجہ ہو گیا۔

''یہ صفدر کس قماش کا بندہ ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''بھلا مانس ہے جناب.....!''

''مطلب تمہیں صفدر پر پورا بھروسا ہے؟''

''اگر آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ صفدر نے کھانے میں کچھ ملا دیا ہوگا تو ایسی کوئی بات نہیں تھانے دار صاحب۔'' وہ سنجیدہ لہجے میں بولا۔ ''ہم نے پہلے بھی کئی بار صفدر کے ہاتھ کھانا بھیجا ہے۔ اس کی ہم لوگوں سے کوئی دشمنی نہیں۔''

''اس روز کھانے میں کون کون سی چیزیں شامل تھیں؟'' میں نے ایک دوسرے زاویے سے سوال کیا۔

''تندور (تنور) کی روٹیاں تھیں۔'' رفیق نے بتایا۔ ''اس کے ساتھ لسی تھی، اچار تھا اور دیسی آم تھے۔''

ان دنوں آم پک چکے تھے اور آم کے باغات میں ہر جانب رونق نظر آتی تھی۔ گرمیوں کے موسم میں اچار روٹی اور لسی کا بڑا عمدہ میل بنتا ہے اور اگر سیر ہو کر کھانا کھا لیں تو پھر کسی سایہ دار درخت کے نیچے لمبی تان کر بھی سونے کو جی چاہتا ہے۔ ایک امکان یہ بھی تھا کہ جیلا اسی کھانے کے زیر اثر اپنے ماحول سے غافل ہو گیا ہوگا لیکن یہاں پر ایک اہم سوال سر اٹھاتا تھا اور وہ یہ کہ..... یہ کھانا تو دونوں بھائیوں نے کھایا تھا پھر شیلا (شکیل) پر غفلت کی کیفیت طاری کیوں نہ ہوئی؟

اس سوال کے ذیل میں یہ سوال بھی موجود تھا..... کہیں ایسا تو نہیں کہ شیلا نے کھانا کھایا ہی نہ ہو؟

ان تمام سوالات کے جواب حاصل کرنے کے لیے شکیل عرف شیلا کا تفصیلی انٹرویو بہت ضروری تھا۔ میں نے بیس مئی کو جائے وقوعہ پر اس سے سرسری پوچھ تاچھ کی تھی تاہم اس وقت تک یہ کیس مکمل اندھیرے میں تھا لیکن اب اس کے بہت سے پہلو کھل کر سامنے آ چکے تھے لہٰذا اس مرحلے پر شیلا سے بات چیت سود مند ثابت ہو سکتی تھی۔ میں نے رفیق سے پوچھا۔

''شکیل اس وقت کہاں ہے؟''

''وہ ادھر گھر پر ہی ہے جناب۔''

''تم جب گھر پہنچو تو اسے میرے پاس بھیج دینا۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

میں نے کہا۔ ''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔'' میں نے تسلی بھرے انداز میں کہا۔ ''بس معمول کی پوچھ گچھ کرنا ہے۔ ہوسکتا ہے، کوئی ایسی بات سامنے آجائے جو جیلا کے قاتل تک رسائی کو آسان بنادے۔''

''جی بہت اچھا۔'' وہ تعاون آمیز انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں ابھی اسے آپ کے پاس بھیجتا ہوں۔''

''تھانے دار جی!'' صدیقا نے براہِ راست مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ نے جیرا اور کانا جما سے جو تفتیش کی ہے، اس سے کوئی ایسا سراغ ہاتھ لگا جو جیلا کے قاتل کو پکڑوا سکے؟''

''ابھی تک تو کوئی ایسا سراغ میرے ہاتھ نہیں لگا۔'' میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ''اسی لیے میں نے ان دونوں کو جانے کی اجازت دے دی تھی لیکن مجھے یقین ہے کہ آنے والے دو تین دن میں، میں قاتل کی گردن ناپنے میں کامیاب ہوجاؤں گا۔''

''ان شاءاللہ.....!'' فیکا نے تہِ دل سے کہا۔

صدیقا بولا۔ ''اللہ آپ کو کامیابی دے تھانے دار صاحب۔''

یہ ''دو تین دن'' والی بات میں نے بے ساختہ کہہ دی تھی۔ اس کے پیچھے کوئی خاص منطق نہیں تھی۔ بس میرے اندر سے یہ آواز اٹھ رہی تھی کہ یہ کیس حل ہونے میں اب زیادہ دن نہیں لگیں گے۔

''تم کب تک مرزا پور میں ہو؟'' میں نے صدیق سے پوچھا۔

''بس جی، آج ہم لوگ واپس چلے جائیں گے۔'' اس نے بتایا۔ ''ہمیں جیلا کی موت کا دکھ تو بہت ہے مگر کیا کریں جی۔ جو اللہ کی مرضی.....!''

''بالکل، اللہ کی مرضی بڑی اہم ہے۔'' میں نے کہا۔ ''جیلا کی موت نے ہر ذی روح کو سوگوار کردیا ہے۔ اللہ کو منظور ہی نہیں تھا کہ نبیلہ کی جیلا سے شادی ہو۔ شاید اللہ نے تمہاری خواہش کو پورا کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔''

''میری کون سی خواہش تھانے دار صاحب؟'' وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔

''گھبرانے کی ضرورت نہیں۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''میں اللہ کی مرضی کی بات کررہا ہوں۔ میں نے سنا ہے، تم نبیلہ کی شادی شکیل سے کرنا چاہتے تھے لیکن جمیل نے ضد کی اور نبیلہ کا رشتہ جمیل سے طے ہوگیا..... ہیں نا؟''

''میری یہ خواہش بڑی اصولی تھی سرکار۔'' وہ صفائی پیش کرتے ہوئے بولا۔ ''شکیل بڑا ہے۔ اس کی شادی پہلے ہونا چاہیے تھی لیکن جب جیلا نے ضد پکڑلی اور فیکا اس کے سامنے مجبور ہوگیا تو پھر میں نے اپنی خواہش کو ایک طرف ڈال دیا۔ میرے لیے دونوں بھائی ایک جیسے تھے۔'' وہ ایک لمحے کے لیے رکا پھر سرسراتی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔

''مگر آپ کو یہ بات کس نے بتائی؟''

پھر وہ اپنے چھوٹے بھائی فیکا کی طرف دیکھنے لگا۔ میں نے اس کی نگاہ کے مفہوم کو کیچ کرلیا اور کہا۔

''تم غلط سمجھ رہے ہو صدیقا۔ یہ بات مجھے رفیق نے نہیں بتائی بلکہ خیرو چاچا پرچون فروش نے بتائی ہے۔''

''خیرو.....!'' اس کی حیرت دو چند ہوگئی۔ ''مگر وہ تو ادھر حویلی مراد میں ہوتا ہے۔''

''تو میں نے کب کہا کہ وہ وہاں نہیں ہوتا؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''خیرو یہاں آیا تھا یا آپ وہاں گئے تھے؟'' اس نے سوال کیا۔

''میں وہاں گیا تھا اکیس تاریخ کو مگر تھانے دار کی حیثیت سے نہیں بلکہ تمہارا ایک دور کا رشتے دار بن کر۔ میں نے خیرو کو اپنا نام ملک جواد بتایا تھا اور کہا تھا کہ میں ٹوبہ ٹیک سنگھ سے آیا ہوں۔ خیرو کے ساتھ میری کافی گپ شپ رہی تھی۔ تم جب واپس جاؤ گے تو وہ تمہیں میرے بارے میں ضرور بتائے گا۔''

''اچھا جی۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

میں نے کہا۔ ''صدیقا! اب جتنی جلدی ممکن ہو، نبیلہ کی شادی شکیل سے کردینا تاکہ ان لوگوں کا دکھ کم ہو.....''

''میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں تھانے دار صاحب۔'' وہ گمبھیر لہجے میں بولا۔ ''اللہ کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور ہوتی ہے۔ نبیلہ کے نصیب میں جیلا تھا ہی نہیں .....'' بولتے بولتے وہ خاموش ہوگیا۔ اس کی آنکھوں میں اداسی اتر آئی تھی۔ چند لمحات کے بعد وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''ماتم والے گھر میں ذرا سکون ہوجائے تو پھر اس بارے میں کچھ سوچتے ہیں۔''

وہ دونوں بھائی مزید کچھ دیر تک میرے پاس بیٹھے رہے پھر مجھے سلام کرکے رخصت ہوگئے۔ صدیقا کو آج ہی واپس حویلی مراد جانا تھا لہٰذا وہ زیادہ دیر یہاں نہیں رک سکتا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

تھوڑی دیر کے بعد میرے تھانے کا اہلکار صفدر کو لے کر آ گیا۔ میں نے پوچھ گچھ کے لیے فوراً اسے اپنے پاس بلالیا۔

صفدر ایک عام سی شکل صورت کا مالک تھا۔ اس کی عمر تیس کے قریب تھی۔ وہ اپنے تھانے بلائے جانے پر کافی گھبرایا ہوا تھا۔ میں نے اسے بیٹھنے کے لیے کہا اور پوچھا۔

''کیا بات ہے صفدر! تمہارے چہرے پر ہوائیاں کیوں اڑ رہی ہیں؟''

''بس جی، کبھی پولیس یا تھانے سے واسطہ جو نہیں پڑا۔'' وہ کمزور سی آواز میں بولا۔

''واسطہ رکھا کرو نا!'' میں نے اس سے تفریح لیتے ہوئے کہا۔ ''پولیس والے بھی تمہاری طرح انسان ہی ہوتے ہیں..... اپنے پاس آنے والے کو کچا نہیں چبا جاتے!''

وہ بڑی فرمانبرداری سے بولا۔ ''ٹھیک ہے جی۔ اب میں آپ کے تھانے میں آتا رہوں گا۔''

''جب بھی ادھر سے گزرو، مجھے سلام کرلیا کرو۔ میں نے کہا پھر پوچھا۔ ''جانتے ہو، میں نے اس وقت تمہیں یہاں کیوں بلایا ہے؟''

''آپ جیلا کے قتل کی تفتیش کر رہے ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''اسی سلسلے میں آپ مجھ سے بھی پوچھ گچھ کرنا چاہتے ہیں۔''

''شاباش!'' میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ''بس، تو پھر شروع ہو جاؤ۔ مجھے بتاؤ کہ جیلا کو کس نے قتل کیا ہے؟''

''میں کیا بتا سکتا ہوں جی۔'' وہ بے چارگی سے بولا۔ ''میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔''

''میں نے سنا ہے، وقوعہ کے روز تم ہی جیلا اور شیلا کو کھانا دینے گئے تھے؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''جی، آپ نے بالکل ٹھیک سنا ہے۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور بتایا۔ ''اس دن چاچا فیکا بیمار تھا۔ چاچی آسیہ اس کی دیکھ بھال میں لگی ہوئی تھی لہٰذا جب میں ان کے گھر کی طرف سے گزرا تو انہوں نے کھانا مجھے تھما دیا اور میں کھانا لے کر کھیتوں کی جانب چل پڑا۔''

''اس کھانے میں کیا کیا تھا؟''

''لسی کا ڈول (بالٹی) تھا، روٹیاں تھیں، اچار تھا اور دیسی آم تھے۔'' اس نے فیکا کے بیان کی تصدیق کرتے ہوئے کہا۔

''تم نے وہ کھانا کس کے حوالے کیا تھا؟'' میں نے پوچھا۔ ''جیلا کو دیا تھا یا شیلا کو؟''

''شیلا کو جناب۔'' اس نے بتایا۔ ''میرے راستے میں سب سے پہلے وہی آتا تھا۔''

میں نے جائے وقوعہ کا تفصیلی معائنہ کیا تھا۔ جہاں جیلا کو قتل کیا گیا تھا، وہ حصہ گاؤں کی مخالف سمت میں پڑتا تھا جبکہ شیلا گاؤں والی سمت میں فصل کی کٹائی کر رہا تھا۔ دونوں مقامات میں چار پانچ کھیت کا فاصلہ حائل تھا جس میں گندم کی پکی ہوئی فصل کھڑی تھی۔ صفدر کا بیان منطقی اور جغرافیائی طور پر درست تھا۔ گاؤں کی جانب سے آنے والے کسی بھی شخص کا واسطہ پہلے شیلا سے پڑتا تھا۔

''کیا ان دونوں نے تمہارے سامنے کھانا کھایا تھا؟'' میں نے سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں جناب!'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''میں وہ کھانا شیلا کو تھما کر آگے بڑھ گیا تھا۔ انہوں نے کب کھانا کھایا، کھایا یا نہیں کھایا، میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔''

''جیلا کی پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق، جیلا نے اس روز کھانا کھایا تھا۔'' میں نے بہ دستور اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''اور اس کھانے میں کوئی نشہ آور شے بھی ملی ہوئی تھی جس کی وجہ سے جیلا غفلت کا شکار ہو گیا تھا چنانچہ قاتل نے اس کی بے خبری کا فائدہ اٹھایا اور اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔''

''ایسی نشہ آور چیز اس کے کھانے میں کون ملا سکتا ہے اور کیوں؟'' وہ حیرت بھرے لہجے میں بولا۔

اس کی حیرت میں مجھے کہیں مصنوعی پن نظر نہیں آیا تاہم میں نے صفدر پر چڑھائی جاری رکھی اور کہا۔

''ان دونوں سوالات کا جواب تم مجھے دو گے!''

''میں کیوں جی۔'' وہ متوحش لہجے میں بولا۔ ''میرا اس معاملے سے کیا تعلق؟''

''دیکھو صفدر!'' میں نے بڑی رسان سے کہا۔ ''جیلا کی ماں آسیہ بی بی نے وہ کھانا تمہارے حوالے کیا۔ کوئی ماں اپنے بیٹے کے کھانے میں نشہ آور چیز کیسے ملا سکتی ہے؟ تم نے وہ کھانا لا کر شیلا کے حوالے کر دیا۔ شیلا، جیلا کا بڑا بھائی ہے۔ وہ بھی اس قسم کی گھٹیا حرکت نہیں کر سکتا۔ اب آ جا کے تم ہی باقی بچتے ہو.....!''

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ تڑپ کر بولا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

"جناب! مجھے یقین ہے کہ آسیہ چاچی اور شیلا، جیلا کے ساتھ کوئی دشمنی نہیں کر سکتے لیکن میں آپ کو بالکل سچ بتا رہا ہوں کہ میرا اس معاملے سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ آپ چاہیں تو مجھ سے بڑی سے بڑی قسم بھی لے سکتے ہیں اور پورے مرزا پور کے لوگوں سے پوچھ سکتے ہیں۔ کبھی میری جیلا سے کھٹ پٹ نہیں ہوئی۔ میں اس کا دشمن نہیں بن سکتا تھانے دار صاحب۔"

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ تمہاری جیلا سے براہِ راست کوئی دشمنی نہ ہو۔" میں نے ایک امکان کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "تم نے یہ کام کسی اور شخص کے کہنے پر کیا ہو۔ کوئی ایسا شخص جو اپنے دل میں جیلا سے شدید نفرت کرتا ہو.....؟"

"یہ تو ٹھیک ہی ہے کہ جس کسی نے بھی جیلا کی جان لی ہے، وہ جیلا کو سخت ناپسند کرتا ہوگا۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ "میں نے جیلا کی لاش کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے لیکن آپ میری بات کا یقین کریں کہ میں اس معاملے میں کسی بھی طور ملوث نہیں ہوں۔"

اس کی باتوں سے سچائی اور راست گوئی کی خوشبو آتی تھی۔ اگر وہ کوئی بہت بڑا جذبات کا ماہر اداکار نہیں تھا تو میرا پیشہ ورانہ تجربہ بتاتا تھا کہ وہ غلط بیانی سے کام نہیں لے رہا تھا۔ اس کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے صفدر! میں تمہاری بات کا یقین کر لیتا ہوں۔ تم یہاں سے جا سکتے ہو لیکن مجھے پیشگی اطلاع دیے بغیر تم مرزا پور سے باہر کہیں نہیں جاؤ گے۔"

"اس کا مطلب ہے، آپ کا شک پوری طرح ختم نہیں ہوا؟" وہ شاکی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

"صفدر!" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "پولیس ڈیپارٹمنٹ میں "شک" کی بہت اہمیت ہے کیونکہ پولیس کی تفتیش کی گاڑی شک کے پیٹرول ہی سے چلتی ہے۔ بہرحال....." میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"تم بے فکر ہو کر جاؤ اور اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھنا۔ اگر تمہیں اس قتل کی واردات کے حوالے سے کوئی بھی خاص یا عام بات پتا چلے تو فوراً میرے پاس چلے آنا۔"

اس نے مجھے، میری ہدایات پر عمل کرنے کا یقین دلایا اور سلام کر کے تھانے سے رخصت ہو گیا۔

☆☆☆

انیس مئی کو عصر اور مغرب کے درمیان جمیل عرف جیلا کو کھوپڑی پر آہنی ہتھوڑے کی ایک طوفانی ضرب لگا کر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔ آلۂ قتل میں بازیاب کر چکا تھا لیکن ابھی تک اس قتل کا محرک کھل کر سامنے نہیں آ سکا تھا لہٰذا قاتل کی گردن میرے آہنی ہاتھوں کی گرفت سے ابھی دور تھی۔

میں نے پچھلے تین چار دن میں جو بھی تفتیش کی تھی، اس کے خاطر خواہ نتائج حاصل نہیں ہو سکے تھے۔ کچھ واقعات و شواہد ابھر کر سامنے آتے تھے لیکن چند قدم آگے بڑھنے کے بعد اس کیس کے منظر نامے پر تاریکی چھا جاتی تھی اور تفتیش کی گاڑی بند گلی میں پہنچ کر رک جاتی تھی۔

میں نے ہمت نہیں ہاری تھی اور مجھے یقین تھا کہ بہت جلد جیلا کا قاتل میری تحویل میں ہوگا۔ میں اپنی انہی کوششوں میں ذہن اور جسم کو تھکانے میں ہمہ تن مصروف تھا کہ ایک اہم سرا میرے ہاتھ لگ گیا پھر اس کیس کی پرتیں ایک کے بعد ایک کھلتی چلی گئیں۔

تئیس مئی کی صبح سے رات تک میں بے حد مصروف رہا تھا لہٰذا جب میں اپنے کوارٹر میں جا کر سویا تو بڑی گہری نیند آئی۔ میں ایسا بے خبر سویا کہ فجر کی نماز بھی نکل گئی۔ میں عموماً فجر اور عشا کی نماز کو خطا نہیں کرتا الّا یہ کہ کوئی بہت بڑی مجبوری آڑے نہ آ جائے جیسا کہ اس صبح ہوا تھا۔

میں چوبیس مئی کی صبح حسب معمول تیار ہو کر تھانے پہنچا تو ایک چونکا دینے والی خبر میری منتظر تھی اور اس خبر کا ماخذ تھا، مشتاق باجوہ۔ میں نے فوراً اسے اپنے پاس بلا لیا۔

مشتاق باجوہ پستہ قامت، فربہ اور چھوٹا زمیندار تھا۔ اس کی زمین ضلع شیخوپورہ کی سرحد سے لگی ہوئی تھی تاہم اس زمین کا شمار مرزا پور یعنی ضلع شیخوپورہ ہی میں ہوتا تھا۔ آلۂ قتل وہ ہتھوڑا اسی کے کھیت سے ملا تھا۔

جب وہ میرے سامنے بیٹھ چکا تو میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "باجوہ! تمہارے چہرے کے تاثرات بتاتے ہیں کہ کوئی بہت ہی خاص خبر لائے ہو؟"

"آپ کا حکم تھا کہ اگر کوئی بھی غیر معمولی چیز میری نگاہ میں آئے تو میں فوراً آپ کو اطلاع دوں۔" وہ جوش بھرے انداز میں بولا۔ "بس، اسی لیے صبح ہی صبح حاضر ہو گیا ہوں ملک صاحب۔"

میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور مشتاق باجوہ سے پوچھا۔

"اب کون سی اہم اطلاع لے کر آئے ہو؟"

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

''ملک صاحب!'' وہ اپنی جیب کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''آپ کو تو پتا ہی ہے کہ آج کل گندم کی کٹائی کا سیزن چل رہا ہے۔ میں بھی اپنے کھیتوں میں فصل کی کٹائی میں مصروف تھا تو یہ چیز میرے ہاتھ لگ گئی.....''

بات کے اختتام پر اس نے اپنا ہاتھ جب جیب سے باہر نکالا تو مجھے اس کے ہاتھ میں ایک تعویذ دبا ہوا دکھائی دیا۔ اس نے وہ تعویذ میری جانب بڑھا دیا۔ میں نے مذکورہ تعویذ کو اپنے ہاتھ میں لے کر اس کا معائنہ کیا۔

وہ کالی ڈوری میں پرویا ہوا چمڑے کا ایک تعویذ تھا۔ چمڑے کا رنگ سرخ تھا اور اس مستطیل تعویذ کا سائز ایک انچ بائی ڈیڑھ انچ رہا ہوگا۔ تعویذ کی ڈوری کی گرہ کھلی ہوئی تھی۔ میں نے فوراً اندازہ لگا لیا کہ وہ تعویذ حاملِ تعویذ کے گلے سے ایسے چپکے سے گر گیا ہوگا کہ اس شخص کو پتا بھی نہیں چلا ہوگا۔

میں نے اس تعویذ کو ہاتھوں میں گھمانے پھرانے کے بعد مشتاق باجوہ سے سوال کیا۔ ''یہ تعویذ تمہیں کہاں سے ملا ہے؟''

''میرے ایک کھیت میں سے ملک صاحب۔'' اس نے جواب دیا۔ ''یہ کھیت اس کھیت سے جڑا ہوا ہے جہاں سے وہ خون آلود ہتھوڑا ملا تھا۔''

''اوہ.....'' میں نے ایک تشویش بھری گہری سانس خارج کی پھر پوچھا۔ ''کیا تم اس تعویذ کو پہچانتے ہو؟ میرا مطلب یہ ہے کہ کیا تمہیں معلوم ہے، یہ کس کا تعویذ ہوسکتا ہے؟''

''نہیں جناب! میں اس تعویذ کے مالک کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''لیکن ایک بات میں بڑے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اس تعویذ کا جیلا کے قاتل سے کوئی نہ کوئی تعلق ضرور ہے۔''

''تمہاری بات میں خاصا وزن ہے باجوہ!'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''آلۂ قتل اور اس تعویذ کا ایک ہی کھیت سے بازیاب ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ جب قاتل نے وہ آہنی ہتھوڑا تمہارے کھیت میں پھینکا تو یہ تعویذ بھی اس کے گلے سے کھل کر وہیں گر گیا ہوگا۔''

مزید دس پندرہ منٹ کی گفتگو کے بعد میں نے مشتاق باجوہ کو رخصت کر دیا اور حوالدار کو اپنے پاس بلا لیا۔

''فرزند علی!'' میں نے حوالدار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مرزا پور میں کتنے موچی ہیں؟''

''صرف ایک ہی ہے ملک صاحب۔'' اس نے جواب دیا۔ ''اس کا نام خادم حسین ہے..... خیریت تو ہے نا؟''

''ابھی تک تو خیریت ہی ہے۔'' میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لیکن لگتا ہے، خادم حسین کے آنے کے بعد خیریت کا سواستیاناس ہوجائے گا۔''

''ایسا کیا ہونے والا ہے ملک صاحب؟'' اس کے چہرے پر حیرت بھری الجھن پیدا ہوئی۔

میں نے سرخ چمڑے میں سیا ہوا وہ کالی ڈوری والا تعویذ فرزند علی کو دکھایا اور کہا۔

''تھوڑی دیر پہلے مشتاق باجوہ یہ تعویذ لے کر آیا ہے۔ یہ تعویذ بھی اسی کھیت سے ملا ہے جہاں سے پہلے وہ آہنی ہتھوڑا ملا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اس تعویذ کا تعلق جیلا کے قتل سے ہے۔ اگر ہم اس تعویذ کے مالک تک پہنچ جائیں تو پھر قاتل تک رسائی بہت آسان ہوجائے گی۔''

حوالدار نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں ملک صاحب۔ اس تعویذ کی سلائی کو دیکھ کر لگتا ہے کہ اسے کسی نے حال ہی میں تیار کیا ہے۔''

''اور یہ سلائی ایسے ماہرانہ انداز میں کی گئی ہے جو کسی ماہر فن موچی ہی کا کارنامہ ہوسکتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اور تم نے بتایا ہے کہ اس گاؤں میں صرف ایک ہی موچی ہے، خادم حسین.....!''

''بالکل ملک صاحب۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں ابھی خادم حسین کو تھانے بلاتا ہوں۔''

فرزند علی میرے کمرے سے رخصت ہوا تو میں اس تعویذ اور اس کے مالک کے بارے میں سوچنے لگا۔ اغلب امکان یہی تھا کہ مذکورہ تعویذ اسی شخص کا ہوگا جس نے وہ آہنی ہتھوڑا مشتاق باجوہ کے کھیتوں میں پھینکا تھا۔ اس تعویذ کی گرہ والا حصہ بتاتا تھا کہ تعویذ کا گلے سے نکلنا، گرہ کھل جانے کے سبب تھا اور جب تعویذ گرا تو اس شخص کو مطلق احساس نہیں ہوا ہوگا ورنہ وہ یہ سراغ مشتاق باجوہ کے کھیتوں میں چھوڑنے کی غلطی نہ کرتا۔ وہ آہنی ہتھوڑا اس نے اپنی مرضی سے پھینکا تھا اور یہ تعویذ آپوں آپ اس کے گلے سے نکل کر کھیتوں میں پہنچ گیا تھا۔

آدھے گھنٹے کے بعد خادم حسین موچی میرے سامنے بیٹھا تھا۔ وہ گہری رنگت کا مالک ایک سوکھا سڑا عمر رسیدہ شخص تھا۔ چمڑے کے ساتھ دن رات مصروف رہنے کی وجہ سے وہ خود بھی چمڑے ایسا ہی ہوگیا تھا۔

''حکم سرکار۔'' میرے کچھ بولنے سے پہلے ہی اس

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

نے سوال کر دیا۔ ''آپ نے کیسے یاد کیا؟''

''خادم حسین! میں نے تمہارا بہت نام سنا ہے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے پتا چلا ہے کہ تم مرزا پور کے اکلوتے موچی ہو اور آلے دوالے کے گاؤں میں بھی تمہارے مقابلے کا کوئی موچی نہیں ہے۔ میں نے سوچا، آج میں بھی تمہیں چیک کرلوں۔''

''آپ نے میرے بارے میں جو بھی سنا، وہ بالکل ٹھیک سنا ہے تھانے دار صاحب۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''لیکن یہ سمجھ نہیں آیا کہ آپ میری کس قسم کی چیکنگ کرنا چاہتے ہیں.....!''

''میں سمجھتا ہوں۔'' میں نے بڑی رسان سے جواب دیا۔ ''تمہارا نام خادم حسین ہے اور بس میں تمہارے کام ہی کو چیک کرنا چاہتا ہوں۔''

''آپ مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے ہیں ملک صاحب۔'' وہ بے حد سنجیدہ لہجے میں بولا۔ ''ذرا کھل کر بتائیں.....!''

''تم اپنے نام سے حسین کے خادم ہو۔'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ''اب دیکھنا یہ ہے کہ تمہارے اندر امام حسین کے اوصاف بھی موجود ہیں یا بس نام ہی کے خادم حسین ہو.....'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''جی..... میں نے ہمیشہ سچائی کا ساتھ دیا ہے۔'' وہ سینہ پھلاتے ہوئے بولا۔ ''اور کھری بات کرنے کی کوشش کی ہے۔''

''ٹھیک ہے، میں ابھی تمہاری بات کی صداقت کو چیک کرتا ہوں۔'' میں نے کہا پھر وہ چمڑے کا تعویذ اس کی جانب بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا تم اس تعویذ کو پہچانتے ہو؟''

''بالکل پہچانتا ہوں سرکار۔'' وہ کرارے لہجے میں بولا۔ ''میں اپنے ہاتھ کے لگائے ہوئے ایک ایک ترونپے (سلائی) کو دور ہی سے دیکھ کر جانچ لیتا ہوں۔''

میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور پوچھا۔ ''پھر تو تمہیں یہ بھی یاد ہوگا کہ یہ تعویذ تم نے کس کے کہنے پر بنایا تھا؟''

میں نے ابھی تک خادم حسین کو مذکورہ تعویذ کی ہسٹری نہیں بتائی تھی۔ اس نے خاصی توانا آواز میں جواب دیا۔

''جی بالکل یاد ہے..... بہت اچھی طرح یاد ہے۔ یہ تعویذ میں نے جیلا کے بڑے بھائی شیلا کے لیے بنایا تھا.....!''

''کیا.....؟'' میں اپنی سیٹ پر اچھل کر رہ گیا۔

''شیلا نے مجھ سے کہا تھا کہ میں اس کے تعویذ کو لال چمڑے میں منڈ کر کالی ڈوری ڈال دوں۔'' وہ اپنی ہی دھن میں بولتا چلا گیا۔ ''اس نے جس بابا سے یہ تعویذ لیا تھا، اس کی ہدایت تھی کہ لال رنگ کے کچے چمڑے میں اسے منڈنا ہے۔ میں نے پہلے اس تعویذ کو موم جامے میں اچھی طرح لپیٹا پھر اپنی تیز نوک والی آر کی مدد سے لال چمڑے کے اندر سی دیا تھا۔ میں نے اس کی سلائی کے لیے موم لگا مضبوط دھاگا استعمال کیا تھا تاکہ کسی قسم کا گرد و غبار یا پانی اس تعویذ کے اندر نہ پہنچ سکے۔''

خادم حسین کے انکشاف نے مجھے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اگر یہ تعویذ واقعی شکیل عرف شیلا کا تھا تو پھر یہ سنسنی خیز سوال پیدا ہوتا تھا کہ تعویذ اس کھیت میں کیسے پہنچا جہاں سے آلۂ قتل دستیاب ہوا تھا۔ کیا شیلا مشتاق باجوہ کے کھیت میں گیا تھا؟ کیا وہ آہنی ہتھوڑا بھی شیلا ہی نے مشتاق باجوہ کے کھیتوں میں پھینکا تھا؟ اور کیا شیلا کا جیلا کی موت میں کوئی ہاتھ تھا؟

بادی النظر میں ایسا دکھائی نہیں دیتا۔ دونوں بھائیوں میں بہت اچھے تعلقات تھے۔ کچھ عرصے بعد جیلا کی شادی ہونے والی تھی اور شیلا اس کی شادی کی تیاریوں میں پیش پیش تھا۔ میرے ذہن میں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوا کہ ممکن ہے، شیلا کو پھنسانے کے لیے کسی نے وہ تعویذ مشتاق باجوہ کے کھیتوں میں پھینک دیا ہو.....

گزشتہ روز جب فیکا اور صدیقا مجھ سے ملنے آئے تھے تو میں نے ان سے کہا تھا کہ وہ گھر جا کر شیلا کو میرے پاس بھیج دیں لیکن شیلا تھانے نہیں آیا تھا۔ میں پچھلے دن اس قدر مصروف رہا تھا کہ شیلا میرے دھیان میں نہیں رہا تھا لیکن خادم حسین کے انکشاف کے بعد میں شیلا سے ملنے کے لیے بے تاب ہو گیا تھا۔ میرے ذہن میں ایسے ڈھیروں سنسنی خیز سوالات جمع ہو چکے تھے جن کے جواب صرف اور صرف شیلا ہی دے سکتا تھا۔

میں نے خادم حسین موچی کو فارغ کیا اور اپنے ایک بندے کو شکیل عرف شیلا کی طرف دوڑا دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ بندہ واپس آیا اور اس نے بتایا۔ ''ملک صاحب! شیلا تو مرزا پور میں ہے ہی نہیں۔''

''کہاں چلا گیا وہ؟'' میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

''مجھے پتا چلا ہے، وہ کل اپنے چاچے بلکہ تایے صدیقا کے ساتھ حویلی مراد چلا گیا تھا۔'' اس نے بتایا۔

میں نے پوچھا۔ ''کچھ پتا چلا، شیلا کی واپسی کب تک

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

ہوگی؟''

''فیکا نے بتایا ہے کہ وہ دو تین دن ادھر ہی رہے گا۔''

''لیکن میں دو تین دن تک اس کا انتظار نہیں کرسکتا۔'' میں نے اضطراری لہجے میں کہا پھر حوالدار کی جانب دیکھتے ہوئے اضافہ کیا۔ ''فرزند علی! تیاری کرو۔ ہم ابھی حویلی مراد جارہے ہیں..... سیدھے صدیقا حلوائی کے گھر۔''

''جی ملک صاحب! بس پندرہ بیس منٹ کے بعد آپ مجھے بالکل تیار پائیں گے۔'' وہ جلدی سے بولا پھر مجھے سیلوٹ کرنے کے بعد روانگی کے انتظامات کرنے چلا گیا۔

☆☆☆

دوپہر کے وقت ہم حویلی مراد میں تھے۔ اس وقت ہم دونوں پولیس کے یونیفارم میں تھے۔ اب کی بار میں نے متعلقہ تھانہ انچارج آف حویلی مراد کی طرف جانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی اور سیدھا صدیقا حلوائی کے گھر کی طرف بڑھ گیا تھا۔ صدیق کی مٹھائی کی دکان گھر والے راستے پر ہی پڑتی تھی اور اس کی دکان کے بازو میں خیر دین پرچون فروش کی دکان تھی۔ میں نے خیر دین کی دکان پر پہنچ کر تیز لہجے میں استفسار کیا۔

''چاچا! کیا میرا دور کا رشتے دار صدیقا حلوائی واپس آ گیا ہے؟''

خیر دین نے مجھے پہلے سول ڈریس میں دیکھا تھا۔ اب جو پولیس کی وردی میں دیکھا تو چونک اٹھا۔ سرسراتی ہوئی آواز میں مستفسر ہوا۔

''جواد پتر! کیا تم پولیس والے ہو؟''

''ہاں چاچا! میں مرزا پور والے تھانے کا انچارج ہوں۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''بس، چاچا! پولیس کی نوکری میں سو سو بھیس بدلنا پڑتے ہیں۔''

''تو اس دن تم سادہ لباس میں تفتیش پر تھے اور آج باوردی آئے ہو۔'' اس نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''لگتا ہے، اب مجرموں کی خیر نہیں۔''

''بس چاچا! دعا کرو، میں جلد از جلد جیلا کے قاتل کو پکڑنے میں کامیاب ہو جاؤں۔'' میں نے کہا۔

''میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں پتر۔'' وہ خلوصِ دل سے بولا۔ ''اللہ تمہیں فتح دے گا۔''

ہم صدیقا حلوائی کے گھر پہنچ گئے۔ اس نے ہمیں بیٹھک میں بٹھایا پھر پریشان لہجے میں بولا۔

''تھانے دار صاحب! سب خیریت تو ہے نا..... آپ یہاں؟''

''بس شیلا سے کچھ سوال و جواب کرنا ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''میں نے کل آپ دونوں کو تاکید کی تھی کہ گھر پہنچتے ہی شیلا کو میرے پاس بھیج دینا لیکن تم نے میری بات کو کوئی اہمیت نہیں دی!''

''تھانے دار صاحب! سچی بات تو یہ ہے کہ پریشانی میں یہ بات ہمارے ذہن سے نکل گئی۔'' وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ ''پھر جب ہم مرزا پور سے روانہ ہو رہے تھے تو فیکا نے زبردستی شیلا کو ہمارے ساتھ کر دیا۔ یہ اپنے بھائی کی الم ناک موت پر بہت دکھی تھا۔ فیکا نے سوچا کہ شیلا چند دن یہاں رہے گا تو اس کا دل بہل جائے گا۔''

میں نے بیٹھک میں اِدھر اُدھر نگاہ دوڑاتے ہوئے استفسار کیا۔ ''اس وقت وہ کہاں ہے؟''

''ابھی تھوڑی دیر پہلے تو وہ گھر کے اندر ہی تھا۔'' اس نے بتایا پھر وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔ ''آپ آرام سے بیٹھیں۔ میں شیلا کو ڈھونڈ کر لاتا ہوں اور آپ کی خاطر تواضع کا بھی بندوبست کرتا ہوں۔''

''اس تکلف کی کوئی ضرورت نہیں صدیقا۔'' میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے منع کرتے ہوئے کہا۔ ''اس گھر کا ماحول سوگوار ہے۔ ہم یہاں پکنک منانے نہیں آئے۔ بس، شیلا سے چند سوالات کرنا ہیں۔ اس کے بعد ہم واپس چلے جائیں گے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے جناب لیکن آپ پہلی مرتبہ میرے گھر آئے ہیں۔'' وہ اصراری لہجے میں بولا۔ ''میں کچھ کھلائے پلائے بغیر آپ کو یہاں سے نہیں جانے دوں گا۔''

''ٹھیک ہے صدیقا! جیسی تمہاری مرضی۔'' میں نے بات کو ختم کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں جو بھی تکلف کرنا ہے، وہ سب بعد میں کرنا۔ فی الفور تم شیلا کو میرے پاس بھیج دو۔''

''جی اچھا جناب.....'' یہ کہتے ہوئے وہ بیٹھک سے نکل گیا۔

میں اس وقت بیٹھک کے داخلی دروازے کے نزدیک بیٹھا ہوا تھا اور حوالدار فرزند علی میرے سامنے دوسری دیوار کے ساتھ۔ میں نے فوراً حوالدار کے ساتھ اپنی جگہ بدل لی۔

اس نے چونکتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''اس کی کوئی خاص وجہ ملک صاحب؟''

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

''بہت ہی خاص الخاص وجہ ہے۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''میں ادھر بیٹھ کر شیلا کا انٹرویو کروں گا اور تم دروازے کے نزدیک بالکل مستعد رہنا۔ ابھی میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ یہاں کیا صورتِ حال پیش آئے گی۔ اگر شیلا کسی بھی زاویے سے اپنے بھائی کے قتل میں ملوث ہے تو میرے سوالات اسے چکرا کر رکھ دیں گے اور عین ممکن ہے، وہ یہاں سے فرار ہونے کی کوشش کرے۔ ایسے موقع پر تم اس کی کوشش کو ناکام بنا دو گے۔''

''جی، اب میں سمجھ گیا۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''آپ فکر نہ کریں۔ شیلا پر گہری نظر رکھوں گا اور اسے یہاں سے ہلنے بھی نہیں دوں گا لیکن مجھے نہیں امید کہ شیلا کا جیلا والے واقعے میں کوئی ہاتھ ہو.....!''

''تم ٹھیک کہتے ہو فرزند علی!'' میں نے تائیدی انداز میں کہا۔ ''لیکن ہم کوئی رسک نہیں لے سکتے ورنہ بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔''

''ہاں جی..... یہ بات تو ہے۔'' وہ معنی خیز انداز میں بولا۔

تھوڑی ہی دیر میں شیلا بیٹھک میں داخل ہوا اور میری جانب بڑھتے ہوئے بہ آوازِ بلند بولا۔

''السلام علیکم تھانے دار صاحب!''

اس کے چہرے پر کوئی خاص پریشانی مجھے نظر نہ آئی۔ ''وعلیکم السلام!'' میں نے اس کے سلام کا جواب دیا اور اسے اپنے قریب ہی سامنے بٹھالیا پھر کہا۔ ''شیلا! اگر تم مرزا پور ہی میں تھوڑی دیر کے لیے میرے پاس تھانے آجاتے تو مجھے تمہارے پیچھے یہاں تک نہ آنا پڑتا۔''

''میں بہت معذرت خواہ ہوں تھانے دار صاحب۔'' وہ ندامت آمیز لہجے میں بولا۔ ''ابا اور تایا اپنی پریشانی میں آپ کا پیغام مجھ تک نہیں پہنچا سکے اور پھر میں ادھر ان لوگوں کے ساتھ ہی آ گیا۔''

اس کے پیچھے ہی صدیقا حلوائی بھی ایک ڈھکی ہوئی ٹرے اٹھائے بیٹھک میں داخل ہوا تھا۔ اس نے مذکورہ ٹرے کو ایک چھوٹی میز پر رکھنے کے بعد اس کا پردہ اٹھایا تو ٹرے کے اندر مجھے پیڑے والی لسی کا بھرا ہوا جگ رکھا دکھائی دیا اور اس جگ کے ساتھ دو کنگ سائز گلاس بھی تھے۔ علاوہ ازیں ٹرے کے اندر دو پلیٹیں بھی رکھی ہوئی تھیں جن میں سے ایک میں برفی کے ٹکڑے اور دوسرے میں کٹے ہوئے آم کی قاشیں سجی ہوئی تھیں۔ صدیق حلوائی تھا۔ یقیناً یہ برفی اسی کی دکان کا تحفہ تھی۔

وہ ہمارے لیے دونوں گلاسوں میں لسی انڈیلنے کے بعد بولا۔ ''تھانے دار صاحب! آپ لسی پانی سے دل بہلائیں اور شیلا سے جو پوچھنا ہے وہ بھی اطمینان سے پوچھ لیں۔ میں باہر چلا جاتا ہوں۔'' پھر وہ شیلا کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''پتر! اگر اور کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے آواز دے لینا۔''

''جی تایا جی! آپ فکر نہ کریں۔'' شیلا نے مضبوط لہجے میں کہا۔

مطمئن ہونے کے بعد صدیقا حلوائی بیٹھک سے نکل گیا اور میں شیلا کی جانب متوجہ ہو گیا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''شیلا! تم سے میری ملاقات صرف اسی دن ہوئی تھی جب میں جائے وقوعہ پر کارروائی کرنے آیا تھا لیکن پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میں بہت سی ایسی چیزیں سامنے آئی ہیں جن کا جواب صرف تم ہی دے سکتے ہو۔''

میں نے دانستہ اپنا انداز بہت دھیما رکھا تاکہ اسے کسی قسم کا شک نہ ہو۔ وہ بڑے اطمینان سے بولا۔

''آپ پوچھیں جی، جو بھی پوچھنا چاہتے ہیں۔ میری تو یہی خواہش ہے کہ جیلا کا قاتل جلد از جلد قانون کی گرفت میں آجائے اور اس کا انجام عبرتناک ہو.....''

''بالکل ایسا ہی ہوگا شیلا۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں بہت دور تک جھانکتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ ''کیا یہ درست ہے کہ وقوعہ کے روز تم لوگوں کا کھانا صفدر نامی ایک بندے نے کھیتوں میں پہنچایا تھا؟''

''جی صفدر ہی نے پہنچایا تھا۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''لیکن اس کھانے کو آپ اتنی زیادہ اہمیت کیوں دے رہے ہیں تھانے دار صاحب؟''

میں نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ ''اس... کھانے میں تنور کی روٹیاں، لسی، اچار اور دیسی آم تھے نا؟''

''جی..... جی ہاں۔''

''کیا تم دونوں بھائیوں نے ایک ساتھ مل کر کھانا کھایا تھا یا الگ الگ؟'' میں نے سوالات کے سلسلے کو دراز کرتے ہوئے پوچھا۔

''ایک ساتھ ہی کھایا تھا جناب.....'' وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا۔

''تم کھیتوں کے جس حصے میں فصل کی کٹائی کر رہے تھے وہاں سے گاؤں زیادہ نزدیک تھا اسی لیے صفدر وہ کھانا

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

تمہیں دے کر آگے بڑھ گیا تھا جبکہ.....'' لمحاتی توقف کر کے میں نے گہری سانس لی بھر بہ دستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''جبکہ جیلا گاؤں کی مخالف سمت والے کھیتوں میں کام کر رہا تھا۔ کیا تم کھانا لے کر اس کے پاس گئے تھے یا وہ تمہارے پاس آیا تھا۔ ایک ساتھ کھانا کھانے کے لیے ضروری تھا کہ تم دونوں ایک ہی مقام پر موجود ہو؟''

''میں نے آواز دے کر جیلا کو اپنے پاس بلا لیا تھا۔'' وہ سنبھلے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''پھر ہم نے ایک ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا تھا۔''

''اس کے بعد جیلا واپس ان کھیتوں کی طرف چلا گیا تھا جہاں وہ فصل کی کٹائی کر رہا تھا؟''

''جی ایسا ہی ہوا تھا۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

''تم نے مجھے بتایا تھا کہ عصر سے پہلے جیلا کا ہاتھ درانتی سے کٹ گیا تھا اور تم نے اس پر پٹی باندھ دی تھی اور اسے گھر جانے کے لیے کہہ دیا تھا کہ وہ زخمی ہاتھ کے ساتھ آرام کر سکے۔'' میں نے کرید کا عمل جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''پٹی کروانے وہ تمہارے پاس آیا تھا یا تم اس کی طرف گئے تھے؟''

''وہی میرے پاس آیا تھا۔'' اس نے جواب دیا۔

''تم نے اس کے زخمی ہاتھ پر پٹی کی اور اسے گھر بھیج دیا؟''

''جی بالکل ایسا ہی ہوا تھا۔''

''کیا جیلا تمہارے سامنے گھر کی جانب روانہ ہو گیا تھا؟''

''جی.....'' اس نے اثبات میں جواب دیا۔

''پھر وہ واپس اسی جگہ کیسے پہنچ گیا جہاں کسی نے اسے موت کے گھاٹ اتارا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''یہی بات تو میری سمجھ میں نہیں آ رہی جناب۔'' وہ مسکین سی صورت بنا کر بولا۔ ''میں نے تو اپنی آنکھوں سے اسے گاؤں کی طرف جاتے دیکھا تھا اور اس کے بعد میں مطمئن ہو کر اپنے کام میں جت گیا تھا۔''

''اور تم نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ شام سے تھوڑی دیر پہلے تم نے کام ختم کیا اور پھر گھر کی جانب چل پڑے تھے؟''

''جی بالکل ایسا ہی ہوا تھا۔'' اس نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

''اچھی طرح سوچ کر بتاؤ شیلا۔'' میں نے اس کے گرد اپنے سوالات کا دائرہ تنگ کرتے ہوئے کہا۔ ''تم وقوعہ کے روز کھیتوں سے نکل کر سیدھے گھر آئے تھے یا کہیں اور بھی گئے تھے؟''

''جی..... میں سیدھا گھر گیا تھا۔''

''اچھی طرح سوچ کر جواب دیا ہے نا؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں بہت دور تک جھانکتے ہوئے پوچھا۔

''جی، جو سچ ہے وہ میں نے آپ کو بتا دیا ہے۔'' وہ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولا۔

مجھے واضح طور پر محسوس ہوا کہ میرے کڑے سوالات نے اسے کافی بے چین کر دیا تھا۔ میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا۔

مختصر... مختصر

جن

شادی کی ایک تقریب میں جن آ گیا۔ اسے دیکھتے ہی لڑکیوں کی چیخیں نکل گئیں۔ ایک بابا جی نے لڑکیوں کو وضو کرنے کے لیے کہا۔ لڑکیاں وضو کر کے آئیں تو انہیں دیکھ کر جن کی چیخیں نکل گئیں۔

کوّا

ایک کوّا مولوی کے ہاتھ سے گوشت لے اڑا۔ مولوی نے چلا کر ایسی بات کہی کہ کوّا گھبرا کر گوشت واپس دے گیا۔ مولوی نے کہا..... بے غیرت صبح اعلان کر دوں گا کہ کوّا حلال ہے۔

دعا

ایک آدمی دعا مانگ رہا تھا۔ مالک تو نے مجھے بچپن دیا چھین لیا، جوانی دی چھین لی، پیسا دیا، واپس لے لیا مگر بیوی دی اور دے کے بھول گیا۔

وعدہ

گاہک نے دکاندار سے کہا۔ ''جب میں نے آپ سے موٹر سائیکل خریدی تھی تو آپ نے وعدہ کیا تھا کہ تین ماہ تک موٹر سائیکل چلاتے ہوئے جو کچھ ٹوٹے گا آپ اس کی جگہ دوسرا سامان لگوا کر دیں گے۔''

دکاندار نے کہا۔ ''جی فرمایئے کیا ہوا؟ کیا ٹوٹ گیا؟''

گاہک بولا۔ ''سامنے کے چار دانت ٹوٹ گئے ہیں۔''

مرسلہ: وزیر محمد خان، عل ہزارہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

''لیکن مجھے ایک بندے نے کچھ اور ہی بتایا ہے.....!''

''کک.....کیا.....'' وہ لکنت زدہ لہجے میں بولا۔

''آپ کو.....کس نے.....کیا بتایا ہے.....؟''

''اس بندے کا نام تو ابھی مجھے یاد نہیں آرہا۔'' میں نے بہانہ بناتے ہوئے کہا۔ ''لیکن اس نے مجھے بتایا ہے کہ انیس مئی کی شام یعنی وقوعہ کی شام اس نے تمہیں مشتاق باجوہ کے کھیتوں کی طرف جاتے دیکھا تھا۔''

''وہ ..... بندہ جھوٹ بولتا ہے..... بکواس کرتا ہے.....'' وہ...کپکپاتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''اسے کوئی غلط فہمی ہوئی ہوگی۔''

''ہاں..... مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔'' میں نے اسے اپنے شیشے میں اتارتے ہوئے کہا۔ ''ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ تم اس روز کام ختم کرنے کے بعد کھیتوں سے سیدھے اپنے گھر گئے تھے۔''

''اللہ آپ کا بھلا کرے تھانے دار صاحب۔ ابھی آپ نے جو کہا یہی سچ ہے۔'' وہ اطمینان بخش سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''لوگ تو پتا نہیں، کہاں کہاں کی اڑاتے رہتے ہیں۔''

''اور میں سب کی سن لیتا ہوں مگر یقین اسی بات کا کرتا ہوں جو مبنی بر حقیقت ہوتی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اگر میں لوگوں کی الٹی سیدھی باتوں پر سنجیدہ ہو جاؤں تو پھر ہوگئی تھانے داری۔''

وہ مطمئن ہو کر تعریفی نظر سے مجھے تکنے لگا۔ میں مختلف زاویوں سے اسے گھسنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔ ہر تھوڑی دیر کے بعد میں اپنے سوالات کا موضوع تبدیل کر دیتا تھا تاکہ وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ میں اسے گھیرنے کی سعی میں ہوں۔

''شیلا! کیا تمہیں تعویذ دھاگے اور بابا لوگوں پر یقین ہے؟'' میں نے ایک نئے انداز سے سوال کیا۔

''جی بالکل!'' وہ بڑے مضبوط لہجے میں بولا۔ ''اگر کوئی بابا پہنچا ہوا ہو تو اس کا تعویذ گولی کی طرح کام کرتا ہے۔''

''مطلب یہ کہ اس تعویذ سے گولی کا کام لے کر ہم کسی بھی شخص کو قتل کر سکتے ہیں؟'' میں نے بڑی معصومیت سے سوال کیا۔

''نہیں جناب.....'' وہ جلدی سے بولا۔ ''میں آپ کو یہ بتانا چاہ رہا تھا کہ اگر پیر کامل ہو تو اس کا تعویذ تیر کی طرح کام کرتا ہے یعنی بڑی تاثیر والا ہوتا ہے۔''

''اچھا.....اب سمجھا۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ''کیا اس سلسلے میں تمہارا کوئی ذاتی تجربہ بھی ہے؟''

''کیسا ذاتی تجربہ جی.....'' وہ الجھن زدہ انداز میں میری طرف دیکھنے لگا۔

''ارے یار.....!'' میں نے دوستانہ انداز میں بڑی بے تکلفی سے کہا۔ ''کیا تم کسی ایسے بابا کو جانتے ہو جس کے تعویذ میں جادوئی اثرات ہوں؟''

''جی بالکل جانتا ہوں۔'' وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ''ادھر ٹوبہ ٹیک سنگھ میں ایک بہت پہنچے ہوئے بابا ہیں۔ وہ ناممکن کو ممکن بنا دیتے ہیں۔''

''اچھا.....!'' میں نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم کبھی ان بابا سے ملے ہو؟ ان سے کوئی تعویذ وغیرہ بھی لیا ہے؟''

''جی..... ایک ماہ پہلے ٹوبہ ٹیک سنگھ والے بابا کے پاس گیا تھا۔'' اس نے بڑے فخر سے بتایا۔ ''اور ان سے ایک تعویذ بھی لیا تھا۔''

''شیلا! میں تم سے یہ نہیں پوچھوں گا کہ تم نے کس مقصد کے لیے تعویذ لیا تھا کیونکہ یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میں تمہاری خواہش کی کرید میں نہیں پڑنا چاہتا۔''

''آپ بہت اچھے ہیں تھانے دار صاحب!'' اس نے ایسے لہجے میں کہا جیسے اس کے سر پر سے منوں وزن اتر گیا ہو۔

''لیکن.....'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ ضرور پوچھوں گا کہ اس بابا کے تعویذ نے کام کیا.....مطلب، تمہاری وہ خواہش پوری ہوگئی جس کی خاطر تم نے وہ تعویذ لیا تھا۔''

''جی تھانے دار صاحب.....'' وہ جذبات سے لبریز لہجے میں بولا۔ ''اس تعویذ نے بڑا ٹھیک ٹھاک کام کیا ہے۔ بس یوں سمجھ لیں کہ بہت جلد میری وہ خواہش پوری ہونے والی ہے۔''

''واہ وا.....'' میں نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں میری طرف سے ایڈوانس مبارک ہو۔''

''بہت شکریہ تھانے دار صاحب۔'' وہ ممنونیت بھرے لہجے میں بولا۔

میں نے فوراً پلٹا کھایا اور اس کے گرد پھیلے ہوئے جال کو سمیٹنا شروع کر دیا۔ میں نے لہجے کا دوستانہ پن برقرار رکھتے ہوئے اس سے کہا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

''شیلا! کیا تم مجھے وہ طلسماتی تعویذ دکھا سکتے ہو؟''

''جی ضرور.....'' بے ساختہ اس کا ہاتھ گردن کی طرف چلا گیا پھر معذرت خواہانہ لہجے میں بولا۔ ''تھانے دار صاحب! وہ تعویذ اس وقت میرے پاس نہیں ہے۔''

''پھر کہاں ہے وہ تعویذ؟''

''وہ میں نے اپنے گھر میں رکھا ہوا ہے۔''

''یعنی مرزا پور والے گھر میں؟''

''جی..... جی..... اسی گھر میں۔'' اس نے بتایا۔

''اچھی طرح سنبھال کر رکھا ہے نا اس تعویذ کو؟'' میں نے تصدیق طلب انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

''بالکل جناب! میں اس کرشماتی تعویذ کے حوالے سے کسی قسم کی بے احتیاطی کیسے برت سکتا ہوں۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''اس تعویذ سے تو میری بہت ساری امیدیں وابستہ ہیں۔''

''اس تعویذ کو اتار کر گھر میں رکھنے کی کوئی خاص وجہ ہے؟''

''جی تھانے دار صاحب!'' وہ بڑی صفائی کے ساتھ مجھے الو بنانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ ''بابا نے کہا تھا کہ اگر گھر میں کسی بچے کی پیدائش ہو یا کسی کی موت واقع ہو جائے تو پھر چالیس دن کے لیے اس تعویذ کو اتار کر گھر میں کسی محفوظ مقام پر رکھ دینا اور میں نے ایسا ہی کیا ہے۔''

''گڈ.....!'' تعویذ کے حوالے سے میں اسے پوری طرح اپنے جال میں جکڑ چکا تھا لہٰذا میں دوسری جانب نکل گیا اور اس سے پوچھا۔ ''شیلا! کیا تمہیں پتا ہے کہ جیلا کی پوسٹ مارٹم رپورٹ میں کیا لکھا ہوا ہے؟''

''نن..... نہیں جی.....'' وہ قدرے محتاط انداز میں بولا۔ ''آپ بتائیں جی۔''

میں نے بتایا۔ ''اس رپورٹ میں واضح طور پر لکھا ہے کہ جیلا کے سر کو اس کی بے خبری میں نشانہ بنایا گیا تھا یعنی ان لمحات میں وہ کسی نشہ آور شے کے زیر اثر تھا۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے جناب.....'' وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

''رپورٹ میں یہی سب لکھا ہے شیلا۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''جیلا کے معدے سے کھانے کا جو مواد لیا گیا تھا، اس کے اندر کسی نشہ آور شے کے اثرات پائے گئے ہیں اور میری معلومات کے مطابق، جیلا کسی قسم کا نشہ بھی نہیں کرتا تھا۔''

''ہاں جی..... وہ کوئی بھی نشہ آور شے نہیں لیتا تھا۔'' وہ پُرسوچ انداز میں بولا۔

''تم دونوں بھائیوں نے وقوعہ کی دوپہر ایک جگہ بیٹھ کر ایک ساتھ ایک جیسا کھانا کھایا تھا۔'' میں نے اپنے لہجے میں قدرے تیزی بھرتے ہوئے کہا۔ ''کیا کھانے کے بعد تمہیں بھی غنودگی یا بے خبری کا احساس ہوا تھا؟''

''بالکل نہیں جناب۔'' وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ''میں ہشاش بشاش اپنا کام کرتا رہا تھا اور پھر شام میں اپنے گھر چلا گیا تھا.....''

''اب تمہارا کیا ارادہ ہے شیلا؟'' میں نے سپاٹ آواز میں کہا۔

''میں دو تین دن ادھر تایا صدیقا کے گھر رہوں گا۔'' اس نے بتایا۔ ''پھر واپس اپنے گھر مرزا پور چلا جاؤں گا۔''

''اور کیا میں تمہاری بے بے کا ملازم ہوں جو یہاں بیٹھا دو تین دن تمہاری بک بک سنتا رہوں گا.....؟'' میں نے رعب دار آواز میں کہا۔

میرے اچانک بدلتے ہوئے تیوروں نے اسے دہلا کر رکھ دیا، لکنت زدہ آواز میں بولا۔ ''مم..... میں سمجھا نہیں..... تھانے دار..... صاحب!''

''باقی کی باتیں میں تمہیں حوالات میں جا کر سمجھاؤں گا ذلیل انسان۔'' میں نے دہاڑ سے مشابہ آواز میں کہا پھر حوالدار کی جانب دیکھتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

''فرزند علی! اس عاقبت نااندیش کو گرفتار کر لو..... فوراً۔''

اس اچانک بدلتی ہوئی صورتِ حال نے اسے چکرا کر رکھ دیا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور بجلی کی سرعت سے دروازے کی سمت دوڑ لگا دی۔

حوالدار نے اس کی ٹانگ میں ٹانگ پھنسا کر اسے روکنے کی کوشش کی۔ وہ فرزند علی کی ٹانگ کے ساتھ ایسا الجھا کہ منہ کے بل دروازے کے باہر صحن میں گرا۔ حوالدار نے چابک دستی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے الٹی ہتھکڑی پہنا دی۔

یہ اٹھا پٹخ دیکھ کر صدیقا حلوائی اور اس کی گھر والی کنیز فاطمہ بھی وہاں آ گئے۔ میں نے زمین پر پڑے ہوئے شیلا کی پسلیوں میں ایک زوردار ٹھڈا رسید کرتے ہوئے گرج دار آواز میں کہا۔

''چپ چاپ اٹھ کر شرافت سے بیٹھ جاؤ ورنہ سر پر اتنے جوتے ماروں گا کہ آنے والی سات نسلیں گنجی پیدا

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

ہوں گی۔''

''یہ آپ کیا کر رہے ہیں تھانے دار صاحب۔'' صدیقا حلوائی اپنے بھتیجے کی حمایت میں مجھ سے مستفسر ہوا۔

''آخر اس کا قصور کیا ہے؟''

''قصور.....!'' میں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ''اس کم ذات نے اپنے سگے بھائی کو قتل کیا ہے..... میں بمبل عرف جیلا کی بات کر رہا ہوں صدیقا۔''

''مگر..... یہ کیسے ہوسکتا ہے.....؟'' وہ بے یقینی سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''شیلا ایسا کیوں کرے گا؟''

''اس لیے کرے گا تاکہ نبیلہ سے اس کی شادی ہوسکے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا پھر اپنی جیب سے سرخ چمڑے میں منڈھا ہوا کالی ڈوری والا تعویذ نکال کر شیلا کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے کاٹ دار آواز میں استفسار کیا۔

''یہ وہی تعویذ ہے نا جو تم کسی توبہ ٹیک سنگھ والے بابا سے لائے تھے اور تمہارے بیان کے مطابق، یہ تعویذ اس وقت مرزا پور میں تمہارے گھر کے اندر ایک محفوظ مقام پر پڑا ہوا ہے.....!''

''یہ آپ کے پاس..... کیسے پہنچ گیا.....؟'' وہ جھرجھراتی ہوئی آواز میں بولا۔

''میں تمہارے توبہ ٹیک سنگھ والے بابا کا بھی باپ ہوں۔'' میں نے کھا جانے والی نظر سے اسے گھورا۔ ''میں نے اپنے جادو کے زور سے اس تعویذ کو تمہارے گھر سے نکال کر مشتاق باجوہ کے کھیتوں میں پہنچا دیا تھا..... جہاں تم نے وہ آہنی ہتھوڑا پھینکا تھا جس کی طوفانی ضرب سے تم نے اپنے بھائی جیلا کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔''

اس کی حالت ''نہ پائے رفتن، نہ جائے ماندن'' والی تھی۔ میں نے نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں صدیقا حلوائی کو اس کے بھتیجے کے کرتوتوں سے آگاہ کیا اور شیلا کو گرفتار کر کے اپنے تھانے لے آیا۔

☆☆☆

میں کیا، کوئی بھی یہ تصور نہیں کرسکتا تھا کہ جیلا کو شیلا نے بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارا ہوگا لیکن حقیقت یہی تھی کہ وہ جیلا کا قاتل تھا۔

اس حقیقت تک رسائی حاصل کرنے کے بعد شیلا کے لیے میرے دل و دماغ میں غصہ بھر گیا تھا لہٰذا میں نے تھانے پہنچ کر اسے فرزند علی کے حوالے کیا اور کہا کہ دل کھول کر اور جی بھر کر اس کی خاطر تواضع کرے۔

شیلا نے ایک رات حوالات میں تختۂ مشق بنے رہنے کے بعد اپنا جو بیان ریکارڈ کرایا، وہ رونگٹے کھڑے کر دینے والا تھا۔ اسے جیلا سے شدید نفرت تھی۔ بچپن سے لے کر جوانی تک (شیلا کے مطابق) جیلا نے اس کی ہر چیز پر قبضہ کرنے کی کوشش۔ کوئی کھانے پینے کی چیز ہو یا کوئی کھلونا، جو شیلا کو پسند آتا، جیلا ضد کر کے اسے حاصل کر لیتا تھا۔ پھر یہ معاملہ جب نبیلہ سے شادی تک پہنچا تو شیلا کی برداشت جواب دے گئی۔ یہاں بھی جیلا نے ضد کر کے نبیلہ سے شادی کی بات پکی کرالی تھی۔

وہ نبیلہ کو حاصل کرنے کے لیے توبہ ٹیک سنگھ والے بابا کے پاس پہنچ گیا۔ اس بابا نے شیلا کو کوئی طلسماتی تعویذ دیا لیکن اس تعویذ نے خاطر خواہ کام نہیں کیا اور جیلا کی شادی سر پر آن پہنچی۔ اس صورتِ حال نے شیلا کا دماغ خراب کر دیا اور وہ مدد کے لیے دوبارہ توبہ ٹیک سنگھ والے بابا کے پاس پہنچ گیا۔ اس بابا نے نہایت ہی رازداری سے شیلا کو ایک آئیڈیا دیا اور شیلا نے اس آئیڈیے کو عملی جامہ پہنا دیا..... جی، جیلا کو آہنی ہتھوڑے کی مدد سے موت کے گھاٹ اتارنے والا آئیڈیا اسی بابا نے شیلا کو دیا تھا۔

شیلا نے پہلے جیلا کے کھانے میں نشہ آور دوا ملائی تاکہ اسے اپنے مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں کسی وقت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ جب جیلا غفلت کی حالت میں پہنچا تو شیلا نے اس کی کھوپڑی پر وزنی آہنی ہتھوڑے کی ضرب لگا کر اسے زندگی کی قید سے آزاد کر دیا تاکہ نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری۔ جیلا کی موت کے بعد ظاہر ہے نبیلہ کی شادی شیلا ہی سے ہونا تھی۔ اس کمینے نے اپنے سوچے سمجھے ڈرامے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے اپنے مردہ بھائی کا ہاتھ درانتی سے کاٹ کر اس پر پٹی بھی باندھ دی تھی تاکہ وہ جو اسٹوری دنیا والوں کو سنانے والا تھا، اس میں کوئی جھول نہ رہے۔

میں نے توبہ ٹیک سنگھ والے شیطان بابا کو بھی گرفتار کر کے شیلا کے شریکِ جرم کی حیثیت سے جیل بھجوا دیا۔

حسد اور جلن بہت تباہ کن جذبات ہیں۔ حسد کی آگ اور جلن کی تپش انسان کو اندر ہی اندر جلا کر کھوکھلا کر دیتی ہے پھر وہ دوسرے انسانوں کی زندگی سے کھیلنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتا۔

شیلا نے جو کچھ کیا، وہ ایک سوچی سمجھی کہانی تھی لیکن اس کے ہاتھ کچھ نہ آیا۔

(تحریر: حُسام بٹ)

WWW.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

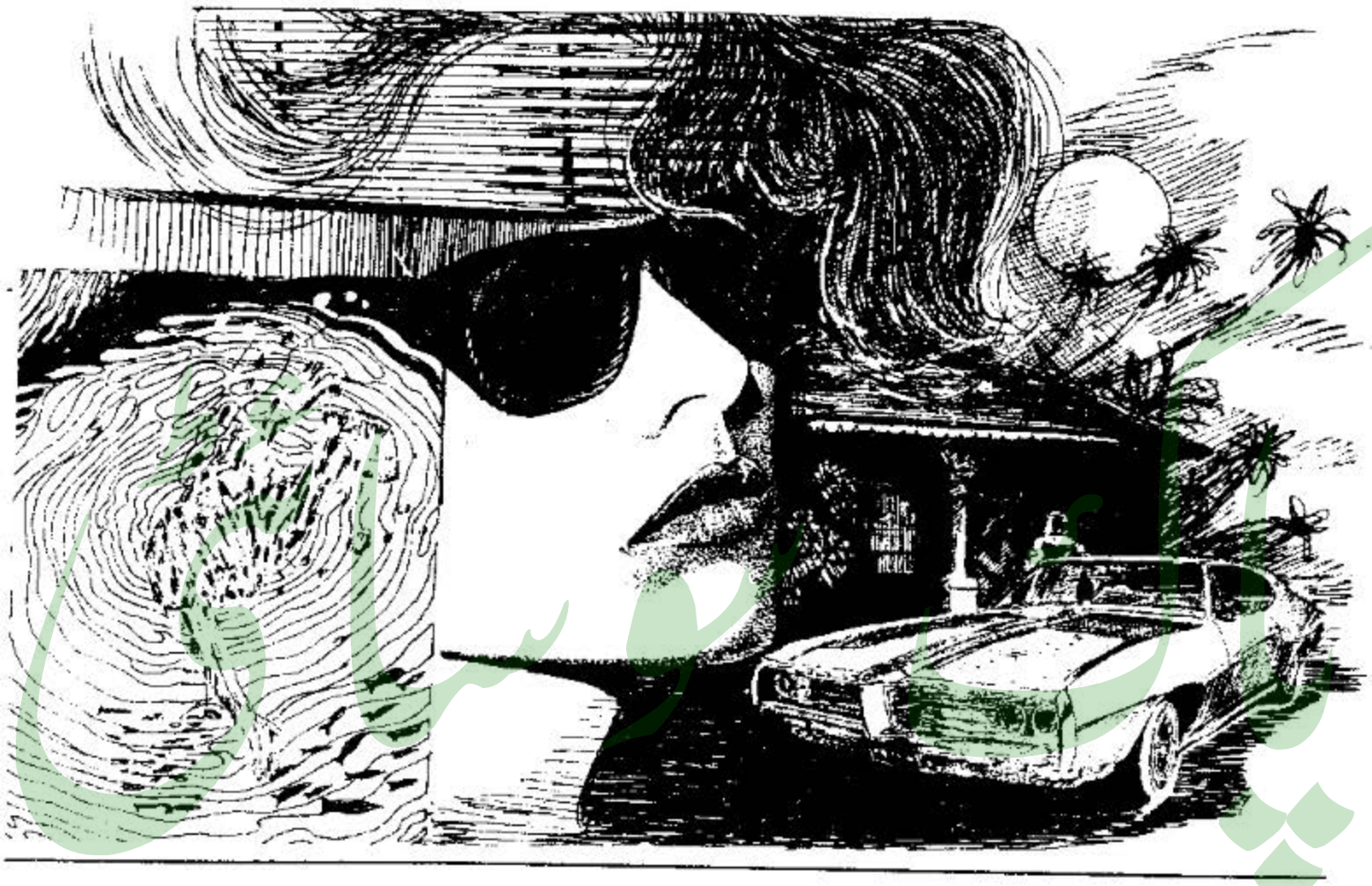

دُہرا انتقام

محمد یاسر اعوان

بدلے کی آگ میں جلنے والے بعض اوقات ایسا روپ دھارتے ہیں کہ ان کی تہ کا کہیں پتا نہیں چل پاتا۔ وہ جو جیون ساتھی بن جانے کے خواب دیکھ رہی تھی اچانک خوابوں کی تعبیر الٹی ہوگئی۔ حقارت آمیز سلوک کسی بھی انسان کو جانور بنا سکتا ہے۔ وہ جو اس کے دل میں بیٹھی تھی اچانک اٹھنے والی درد کی لہر بن کر اس کا دل ہی بند کر گئی۔

خون کی ہولی کھیلنے والی ایک دوشیزہ کے ضمیر کی بے چینی کا احوال

پولیس کے پہنچے پہنچتے جیمز بڑی حد تک اپنی کیفیت پر بہ مشکل قابو پا چکا تھا۔ اس سڑک کی دوسری طرف اس کی بیوی کے خون سے ایک جوہڑ سا بن گیا تھا۔ تفتیش کے دوران اس نے ایک ریستوران میں بیٹھ کر پولیس آفیسرز کو بتایا کہ اس کی بیوی پر موت کس طرح حملہ آور ہوئی تھی۔ وہ ایک فلم دیکھنے شہر آئے تھے۔ تقریباً 8 بجے، سنیما ہاؤس کی جانب بڑھتے ہوئے اچانک اسے یاد آ گیا کہ وہ اپنی کار کی چابی غالباً اگنیشن میں بھول آیا ہے۔ اس نے اپنی بیوی

WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

Downloaded From Paksociety.com

سے رکنے کو کہا اور واپس کار کی طرف بڑھنے لگا جو ایک پرائیویٹ آفس کے عقب میں پارک تھی۔ اس نے مشکل سے چالیس گز کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ اچانک اپنی بیوی کو اپنا نام لے کر چیختے ہوئے سنا۔ وہ گھبرا کر ایک دم پلٹا اور اپنی چالیس سالہ بیوی ریٹی کی طرف بھاگا جو اس وقت سڑک پر بے حس و حرکت پڑی تھی اور اس کی جیکٹ اور پتلون خون سے تر ہو رہی تھی ..... وہ حملہ آور کی ایک جھلک بھی نہ دیکھ سکا تھا لیکن فرطِ غم اور حیرت سے اسے گویا سکتہ سا ہو گیا تھا..... وہ حملہ آور کا پیچھا کرنے کے بجائے بھاگ کر ریستوران میں پہنچا اور کسی سے چیخ کر ایمبولینس طلب کرنے کے لیے کہا۔

ریستوران میں موجود ایک عورت، تفتیش کار کو تفصیلات سے آگاہ کرتے ہوئے بولی۔ ''جب اس شخص نے ریستوران میں آ کر یہ بتایا تو میں چند نیپکن اٹھا کر اس کے ساتھ باہر بھاگی، جہاں وہ عورت پڑی ہوئی تھی۔ ایک ویٹر بھی ہمارے پیچھے آیا تھا۔ میں نے دیکھا وہ خون میں تر تھی۔ ویٹر نے اس کی دھڑکنیں سننے کی کوشش کی اور بتایا کہ دل ہلکے ہلکے دھڑک رہا ہے اور یہ کہ وہ مصنوعی تنفس کے ذریعے اس کی جان بچانے کی کوشش کر سکتا تھا..... میں نے عورت کے منہ سے خون صاف کیا اور اس سے پہلے کہ ویٹر اس کی جان بچانے کی کوشش کرتا، پولیس پہنچ گئی اور مجھ سے کہا کہ میں اس کے شوہر کو واپس ریستوران میں لے جاؤں۔ میں نے کسی سے کہہ کر اس کے لیے برانڈی منگوائی۔ میں سر سے پیر تک کانپ رہی تھی اور اس پر بھی لرزہ طاری تھا۔ یہ بیٹھ گیا اور اس نے اپنے دونوں گھٹنے پکڑ لیے پھر سر پکڑ کر کہا..... اوہ..... وہ جنونی تھا.....''

تھوڑی دیر بعد سراغ رساں اس مقتولہ کے شوہر جیمز سے پوچھ گچھ کرنے ریستوران پہنچ گئے لیکن اس کی درخواست پر وہ اسے اسپتال لے گئے، جہاں اس کی بیوی کو لے جایا گیا تھا۔ وہاں پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ اس کی بیوی دم توڑ چکی ہے..... منگل کی اس ٹھٹھری ہوئی سرمئی شام کو نیو جرسی کی پولیس، ریٹی کے قتل کے عینی شاہدین کو ڈھونڈنے لگی۔ باوردی پولیس آفیسرز نے اس مقام کو گھیرے میں لیا ہوا تھا اور سراغ رساں وہاں آنے جانے والوں سے مختلف سوالات کر رہے تھے۔

جلد ہی انہیں ایک ایسی عورت مل گئی جسے یقین تھا کہ اس نے جیمز اور اس کی بیوی کو دیکھا تھا۔ ''میں نے اس جوڑے کو شانہ بہ شانہ چلتے اور پھر ٹھٹک کر رکتے ہوئے دیکھا تھا۔'' وہ بولی۔ ''پھر مرد مڑ کر میری جانب آنے لگا اور اچانک رک گیا۔ وہ ایک گلی کے قریب تھا۔ میں نے اسے مڑ کر بھاگتے ہوئے دیکھا..... میری سماعت سے کسی کی بھی سی کراہ بھی ٹکرائی تھی۔ میں یہ دیکھنے کے لیے بھاگی کہ کیا ہوا ہے۔ ایسے میں، میں نے ایک سائے کو، جو گھات لگانے کے سے انداز میں بیٹھا تھا، اٹھ کر گلی میں بھاگتے دیکھا۔ میرا اندازہ ہے کہ وہ دبلا پتلا تھا اور اس کا قد درمیانہ تھا۔ تاریکی کی وجہ سے میں کچھ اور دیکھنے سے قاصر رہی۔ لہٰذا کچھ کہہ نہیں سکتی کہ وہ مرد تھا یا عورت۔''

مقتولہ ریٹی کی پوسٹ مارٹم رپورٹ سے یہ بات سامنے آئی کہ اس کے چہرے، سینے، گردن اور پیٹ پر چاقو کے بیس بائیس زخم آئے تھے۔ موت..... دل اور پھیپھڑوں کو خون پہنچانے والی نالی کے کٹ جانے سے واقع ہوئی تھی۔ زخموں سے اندازہ ہوتا تھا کہ چاقو کا پھل تقریباً ساڑھے پانچ انچ لمبا تھا۔ سماگا پورٹ کے علاقے میں، جہاں جیمز اور ریٹی ایک عرصے سے رہتے آئے تھے اس خبر کے پھیلتے ہی دہشت سی چھا گئی تھی۔

سراغ رساں اس علاقے میں جہاں واردات ہوئی تھی، دور تک چھان بین کرتے رہے لیکن کوئی ثبوت یا نشان نہ ملا۔ مقتولہ کا پرس غائب تھا، جو غائب ہی رہا۔ سارے کوڑے دانوں کو کھنگالنے کے باوجود اس کا کوئی پتا نہ چل سکا۔

جب اسی طرح دس دن گزر گئے تو سراغ رسانوں نے جیمز کو ہپناٹائز کر کے پوچھ گچھ کرنے کا فیصلہ کر لیا تاکہ اگر وہ اس سانحے کے سلسلے میں کوئی بات بھول گیا ہو تو اس طرح اسے یاد دلانے کی کوشش کی جا سکے۔ چنانچہ پندرہ اپریل کو اسے ایک سائیکاٹرسٹ نے ہپناٹائز کیا اور اسے یاد آیا کہ اس رات اس نے اپنی کار ایک اطالوی ریستوران کے عقب میں پارک کی تھی کیونکہ ایک مرتبہ ریٹی نے اس سے کہا تھا کہ وہ کبھی اس بار میں نہیں گئی تھی۔ چنانچہ اس نے سوچا کہ فلم دیکھنے کے بعد وہ اسے وہاں لے جائے گا۔

''کار پارک کرنے کے بعد ہم دونوں سڑک کی طرف بڑھنے لگے۔'' وہ تنویمی عمل کے زیر اثر بولا۔ ''جب ہم سڑک پر پہنچے تو میں نے اپنی جیب تھپتھپائی۔ میں ہمیشہ اپنا بیج اور چابیاں جیب میں رکھتا ہوں۔ میں نے دیکھا کہ میری چابیاں غائب تھیں۔ لہٰذا میں نے ریٹی سے کہا، میں ایک منٹ میں آتا ہوں اور مڑ کر سیدھا اپنی کار کی جانب بڑھنے لگا۔ میں سامنے سے آتی ہوئی ایک کیڈی لاک کی ہیڈ لائٹس میں آگے بڑھ رہا تھا، جسے کوئی عورت ڈرائیو کر رہی تھی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

اچانک مجھے یوں لگا، گویا مجھے میرا نام لے کر پکارا گیا ہو۔''

ایک ماہ بعد اسے دوبارہ ہپناٹائز کیا گیا۔ اس مرتبہ ایک ماہر نفسیات نے یہ کام سرانجام دیا۔ ''میں ریٹی کو چیختے ہوئے سنتا ہوں..... جیمز، جیمز!'' وہ بولا۔ ''میں پلٹتا ہوں، لیکن مجھے کچھ نظر نہیں آتا۔ میں ادھر بڑھتا ہوں، جہاں اسے چھوڑا گیا تھا۔ وہ وہاں نہیں ہے، میں دوڑنے لگتا ہوں۔ میں انسانی ہیولوں کی طرف بڑھ رہا ہوں۔ کوئی اس پر جھکا ہوا ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ وہ اس پر چھایا ہوا ہے۔ وہ کسی سیاہ کھوپڑی جیسا لگتا ہے۔ میں بے تحاشا اس کی طرف دوڑنے لگتا ہوں۔ وہ سایہ پلٹ کر مجھے دیکھتا ہے۔ اس کے سر پر اونی کیپ ہے اور اس کیپ پر پیشانی کے پاس سرخ دھاریاں ہیں۔''

''حملہ آور کے جسم پر اور کیسے کپڑے تھے؟'' ماہرِ نفسیات نے پوچھا۔

''نیلی جیکٹ، ایک ماسک جس پر پیشانی کے پاس سرخ دھاریاں ہیں۔ بڑی بڑی آنکھیں، فرکا کالر، سیاہ پتلون، وہ کیپ کوٹ سے منسلک ہے۔ ماسک ہر شے کو چھپا لیتا ہے۔ مجھے باز و نظر نہیں آئے۔ اس کے دونوں ہاتھ دعائیہ انداز میں جڑے ہوئے ہیں اور وہ آگے پیچھے ہل رہا ہے۔ وہ بھاگ رہا ہے..... کاروں اور عمارتوں کے درمیان سے جھک کر فرار ہو رہا ہے۔ اس کی آنکھیں چمکیلی تھیں اور ماسک نیچے تک تھا۔ وہ درمیانے قد کا ہے، موٹا نہیں دبلا ہے۔''

☆☆☆

ریٹی کی تجہیز و تکفین کے کچھ ہی عرصے بعد، اس سے تقریباً اٹھارہ بیس برس چھوٹی ایک عورت نے اس کی جگہ لے لی۔ وہ بہت خوش جمال تھی اور اس کا نام کیتھرین تھا۔ عمر بیس سال تھی اور وہ وال اسٹریٹ کی ایک فرم میں سیکریٹری کی حیثیت سے ملازم تھی۔ وہ اپنے گھر سے جیمز کے گھر میں منتقل ہو گئی جہاں جیمز اپنے بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔

نیو جرسی کی پولیس کیتھرین سے نا آشنا نہیں تھی۔ ریٹی کے قتل کے ٹھیک سات دن بعد، اس نے ایک دھمکی آمیز کال کی رپورٹ کرنے کے لیے ہوبوکن پولیس کو فون کیا تھا۔ ''کسی گمنام شخص نے مجھے فون کال کی تھی۔'' اس نے پولیس کو فون پر مطلع کیا۔ ''وہ کہہ رہا تھا کہ میرا اگلا شکار تم ہو۔''

اس کے دو تین دن بعد ہی وہ جیمز کے ہاں منتقل ہو گئی تھی۔ اگرچہ پولیس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیتھرین اس کیس میں کیسے فٹ ہو رہی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ نوجوان لڑکی کون تھی۔ وہ 1975ء اور 1976ء میں گھر سے بھاگ گئی تھی اور پولیس اسے ڈھونڈ کر واپس لے آئی تھی۔

''سچی بات تو یہ ہے کہ.....'' ایک پولیس آفیسر نے رائے زنی کی۔ ''وہ ان لڑکیوں میں سے ہے، جو کسی کو بھی وردی میں دیکھ لیں تو اس کی دیوانی ہو جاتی ہیں۔ وہ تمہیں ساگا پورٹ یا اطراف کے دوسرے شہروں میں پولیس ہیڈ کوارٹرز کے آس پاس منڈلاتی اور یہ کہتی نظر آئے گی کہ میں فلاں آفیسر سے بات کرنا چاہتی ہوں۔ ایک مرتبہ ساگا پورٹ کے پولیس چیف نے اسے ہیڈ کوارٹر سے باہر نکال دیا تھا کیونکہ وہ ڈیسک کے آس پاس، آفیسروں کو پریشان کر رہی تھی۔''

کچھ دنوں میں کرسمس سے کچھ ہی روز پہلے وہ اچانک جیمز کے گھر سے چلی گئی اور مین ہٹن کے اعلیٰ رہائشی علاقے میں آٹھ سو ڈالرز ماہانہ کرائے کا گھر لے کر اپنی ایک سہیلی کے ساتھ رہنے لگی۔ اگرچہ وہ اپنے نئے علاقے کی رہائش سے خاصی خوش نظر آتی تھی، لیکن وہ اپنی خوشی سے وہاں منتقل نہیں ہوئی تھی۔ جیمز نے اسے دھکے دے کر اپنے گھر سے نکال دیا تھا کیونکہ اس نے ایک اور لڑکی سے تعلقات استوار کر لیے تھے جو کیتھرین سے کہیں زیادہ پُرکشش تھی۔ کیتھرین اس توہین کو وقتی طور پر برداشت کر گئی، لیکن اس کے دل و دماغ میں چنگاریاں سی سلگتی رہتی تھیں جو کسی بھی وقت شعلہ بن سکتی تھیں اور ہوا بھی یہی۔ وہ چار، پانچ ماہ تک بالکل خاموش رہی، پھر ایک دن سہ پہر چار بجے اس نے اپنا ریسیور اٹھایا اور ساگا پورٹ پولیس سے رابطہ کیا۔ ایک پولیس آفیسر نے ریسیور اٹھایا۔ ''مجھے ایک بہت ضروری بات کرنی ہے۔'' وہ بولی۔ ''میں مزید ذہنی دباؤ برداشت نہیں کر سکتی۔ میں ایک بہت بڑے کیس سے پردہ اٹھانا چاہتی ہوں۔''

''کون سا کیس؟'' پولیس آفیسر نے پوچھا۔

''ریٹی جیمز کا قتل.....!''

''ایک منٹ۔'' پولیس آفیسر نے گھبرا کر کہا اور جلدی سے اس کا رابطہ سراغ رساں ولیم ٹیلر سے کرا دیا، جو اس کیس سے اچھی طرح واقف تھا۔

''کیا تم لانگ بیچ میں ہونے والے ریٹی جیمز کے قتل کے سلسلے میں کچھ کہنا چاہتی ہو؟'' سراغ رساں نے پوچھا۔

''ہاں، میں ایک بھیانک انکشاف کرنا چاہتی ہوں۔'' کیتھرین کا لہجہ غیر متزلزل تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

''ایک منٹ۔'' بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔
''میں خود آپ کے پاس آرہا ہوں۔''
''میں انتظار کررہی ہوں۔'' کیتھی نے کہا اور سلسلہ منقطع کرکے ایک وکیل کا نمبر ڈائل کرنے لگی.....
اس روز شام کے چھ بجے اس وکیل کے ٹیلی فون کی گھنٹی دوبارہ بجی۔ اس مرتبہ سراغ رساں ولیم ٹیلر، کیتھرین کے اپارٹمنٹ سے بول رہا تھا۔
''میں نے تمہیں یہ بتانے کے لیے فون کیا ہے کہ ہم کیتھرین کو پوچھ گچھ کے لیے لانگ بیچ لے جارہے ہیں۔'' اس نے کہا اور ریسیور رکھ دیا پھر وہ کیتھی کی طرف مڑا۔ ''تم جیمز سے فون پر بات کرو۔'' اس نے خاص ہدایت کی۔
کیتھرین نے جیمز کا نمبر ڈائل کیا اور اس سے باتیں کرنے لگی۔ پولیس آفیسر دوسری لائن پر یہ ساری باتیں سنتا رہا۔ اگلے روز اتوار تھا۔ سراغ رساں ٹیلر نے ایک بار پھر اسے جیمز سے بات کرنے کی ہدایت کی اور اس نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔
''مجھے تم سے ایک بہت ضروری بات کرنی ہے۔'' وہ فون پر جیمز سے بولی۔ ''تم فوراً لانگ بیچ کے ریستوران میں پہنچو۔ میں وہاں تمہارا انتظار کروں گی۔''
بیالیس سالہ جیمز فوراً وہاں پہنچ گیا اور سراغ رساں ولیم، لیفٹیننٹ تھامسن اور تین دوسرے سراغ رسانوں نے اسے اپنی بیوی کے قتل کی سازش اور سہولتیں فراہم کرنے پر گرفتار کرلیا..... کیتھرین بھی گرفتار ہوگئی۔ اس پر ریٹی جیمز کو بیس بائیس مرتبہ چاقو گھونپ کر قتل کرنے کا الزام تھا۔

☆☆☆

اس گرفتاری کا فوری ردعمل ریلوے پولیس میں ہوا، جس نے جیمز کو فوری طور پر معطل کردیا۔ وہ اپنی بیوی کے قتل کے بعد سے نیویارک ریلوے پولیس ہیڈکوارٹرز میں تعینات تھا۔ اس کی گرفتاری پر سب کو حیرت ہوئی لیکن اتنی نہیں، جتنی ایک یوتھ آرگنائزیشن کو کیتھرین کی گرفتاری پر ہوئی، کیونکہ وہ صرف چند ہی سال پہلے بیس بال کی ایک اسٹار کھلاڑی بن چکی تھی۔
''وہ بے حد پُرجوش اور بے انتہا جارحیت پسند تھی۔'' اس کے سابق کوچ نے اخباری نمائندوں سے رابطہ قائم کرنے پر انہیں کیتھرین کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا۔
''بس یہی اس کی منفی روش تھی لیکن ہر کوچ ایک کھلاڑی کے اندر یہی خوبیاں دیکھنا چاہتا ہے لیکن یہ روش اسے قاتلہ نہیں بناتی۔ وہ باہر سے سخت ہوگی مگر اندر سے ایک بہت ہی پیاری لڑکی تھی۔''
''میں یہ تو نہیں کہہ سکتی کہ میں اس کی سہیلی تھی۔'' اس کی ٹیم کی ایک سابقہ کھلاڑی نے اخباری نمائندوں سے کہا۔ ''لیکن مجھے اس بارے میں سن کر بہت افسوس ہوا۔ وہ عام لڑکیوں سے بہت مختلف تھی۔ اسے ہر وقت کسی کی توجہ چاہیے تھی..... آپ اس سے اچھی اچھی باتیں کریں، آپ کو اس سے بہتر سامع نہیں ملے گا لیکن جو بات اسے زہر لگتی تھی، وہ کوچ کی تنقید تھی۔''
کیتھرین کی ایک اور سہیلی نے رپورٹرز کو بتایا۔ ''جیمز نے اس نوجوان لڑکی کے بہت بڑے خلا کو پُر کیا تھا۔ اسے احساسِ تحفظ دیا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ ہر وقت کوئی اس کے پاس رہے.....''

☆☆☆

دس ستمبر کو کیتھرین تیس سال قید کے عوض ریٹی جیمز کے قتل کا اقرار کرنے اور جیمز کے خلاف گواہی دینے کے لیے تیار تھی۔ مقدمے کی سماعت کے دوران اس نے جج کو بتایا۔ ''قتل کا سارا منصوبہ اس کے سابق محبوب جیمز نے بنایا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ وہ ریٹی کو لے کر فلم دکھانے جارہا ہے، لہٰذا میں سبز رنگ کے کوڑے دان کے پیچھے چھپ جاؤں۔'' اس نے انکشاف کیا۔ ''پھر جب وہ اس کے ساتھ وہاں اس کوڑے دان کے قریب سے گزرنے لگا تو اس نے کچھ اونچی آواز میں کہا کہ وہ اپنی کار کی چابیاں شاید کنیشن میں چھوڑ آیا ہے اور لینے کے لیے پلٹا۔ میں اچھل کر کوڑے دان کے پیچھے سے باہر آگئی۔''
''کیا تم نے ریٹی جیمز کو چاقو گھونپا تھا؟'' وکیلِ استغاثہ نے پوچھا۔
''ہاں۔'' اس نے تیز سرگوشی کی۔ ''میں نے اسے چاقو گھونپا تھا۔''
''کیا تم نے اسے ایک ..... سے زیادہ مرتبہ چاقو گھونپا تھا؟''
''ہاں ایک سے زیادہ مرتبہ۔''
''کیا تمہیں کوئی اقبالِ جرم پر مجبور کررہا ہے؟'' جج نے استفسار کیا۔
''صرف میرا ضمیر۔'' اس نے اطمینان سے جواب دیا۔
اکتوبر کے دوسرے ہفتے کے دوران وکیلِ استغاثہ نے دلائل دیتے ہوئے جیمز کے بارے میں کہا۔ ''اس نے قتل کا منصوبہ بنایا، ایک چاقو خریدا اور اپنی بیوی کو ذبح کرادیا۔ قاتلانہ حملے کے بعد وہ خاموشی سے ایک طرف

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

کھڑا رہا اور ایک بار بھی اپنی دم توڑتی ہوئی بیوی کو دلاسا دینے اس کے قریب نہیں گیا۔''

وکیل دفاع نے دعویٰ کیا... ''جیمز اور ریٹی ایک نارمل زندگی گزار رہے تھے پھر ایک دن ٹرین میں جیمز کی ملاقات کیتھی سے ہوئی۔ ان کے درمیان نگاہوں کے تبادلے ہوئے، جس کے نتیجے میں ان دونوں کے شب و روز ایک ہوٹل میں گزرنے لگے۔ میرا موکل اس خیال سے بے حد مسرور تھا کہ ایک بیس سالہ لڑکی نے اسے پُرکشش اور خواہش انگیز پایا تھا لیکن کیتھرین بیس سال کی کوئی نارمل لڑکی نہیں تھی۔ یہ دہری شخصیت کی مالک تھی۔ کبھی تو یہ بے حد فرض شناس سیکریٹری ہوتی اور کبھی اس قدر ہنگامہ پرور کہ اپنے جذبات پر قابو پانے میں ناکام رہتی۔ پھر اس کے سینے میں انتقام کی بھٹی دہکنے لگی کیونکہ میرے موکل جیمز نے اسے ایک دوسری لڑکی کی خاطر ٹھکرا دیا تھا۔ اس لڑکی نے میرے موکل کو اپنے انتقام کا نشانہ بنانے کے لیے اس کے گرد ایک جال بُنا۔ یہ اسے کھیل سمجھ رہی تھی اور میرے موکل کی گردن پھنسا کر لطف اندوز ہو رہی تھی.....''

اکتوبر ہی کے آخری ہفتے میں کیتھرین نے سرکاری گواہ کی حیثیت سے گواہی دیتے ہوئے کہا۔ ''جیمز نے میری بیسویں سالگرہ پر مجھے پیشگی منگنی کی انگوٹھی دی تھی۔ اس کے دو ماہ بعد وہ میرے ہوبوکن کے اپارٹمنٹ میں منتقل ہو گیا تھا، لیکن پھر یہ کہہ کر نکل گیا کہ میرے بچوں نے مجھ سے کہا تھا اگر آپ کو ہم سے محبت ہوگی تو آپ ہمارے پاس لوٹ آئیں گے۔'' اس نے ایک لمحہ توقف کیا اور پھر اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''جیمز نے ریٹی سے طلاق کے بارے میں بات کرنے کا وعدہ کیا تھا، لیکن کچھ دنوں بعد اس نے مجھ سے کہا کہ ریٹی اسے بلیک میل کر رہی ہے اور طلاق دینے پر راضی نہیں ہے۔ کیونکہ ایک مرتبہ وہ ایک سلگتا ہوا سگریٹ اپنے مکان میں صوفے کے گدے کے نیچے رکھ آیا تھا جس سے گھر میں آگ لگ گئی تھی۔ سب کچھ جل کر راکھ ہو گیا تھا اور انشورنس کمپنی نے جیمز کو پچیس ہزار ڈالرز ادا کیے تھے۔ ریٹی نے اسے دھمکی دی تھی کہ اگر اس نے اس سے طلاق لینے کی کوشش کی تو وہ اس کا پول کھول دے گی۔ ایک اور موقع پر اس نے بلیک میل کیے جانے کی مختلف کہانی سنائی تھی۔''

پندرہ فروری کو کیتھرین نے گواہی دیتے ہوئے مزید کہا۔ ''میں نے ریٹی سے بات کی تھی۔ یہ اسی زمانے کی بات ہے، جب جیمز میرے ہوبوکن کے اپارٹمنٹ سے اپنے گھر لوٹ گیا تھا اور اس نے مجھے یہ کہنے کے لیے فون کیا تھا کہ وہ میرے اپارٹمنٹ میں اب واپس نہیں آئے گا۔ میں نے فون پر ریٹی سے کہا کہ میں کسی کو نقصان پہنچانا نہیں چاہتی، میں تو صرف چاہنے اور چاہے جانے کی خواہش مند ہوں اور جیمز نے مجھے کہا تھا کہ وہ مجھے چاہتا ہے..... جواب میں مجھے ریٹی نے غلیظ القابات سے نوازا اور کہا کہ میں پھر کبھی اس کے شوہر سے نہ ملوں۔ اگر ملی تو وہ میری ناک سے ساگا پورٹ کی ساری سڑکیں صاف کروائے گی۔ اس نے کہا کہ وہ جیمز کو چاہتی ہے اور جیمز بھی اسے چاہتا ہے۔ وہ پہلے بھی اسے دھوکا دے چکا ہے لیکن ہمیشہ اسی کے پاس لوٹ کر آتا ہے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ جیمز بہت جلد مجھ سے بھی اکتا جائے گا اور یہ کہ جیمز اسے اس بارے میں سب کچھ بتا چکا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا وہ جانتی ہے کہ جب وہ اسپتال میں تھی تو میں اس کے بستر پر سوئی تھی۔ اس نے کہا کہ وہ نہیں جانتی۔'' کیتھی نے چند لمحے توقف کیا اور پھر گویا ہوئی۔ ''اس فون کال سے صرف تین روز پہلے میں نے جیمز کے اصرار پر ابارشن کرایا تھا۔

''پھر موسم بہار کے اوائل میں جیمز نے مجھ سے کہا کہ وہ ریٹی سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہے۔ پہلے پہل وہ اسے شوٹ کرنا چاہتا تھا لیکن پھر کہا کہ اگر اس نے بازار سے کوئی ریوالور خرید کر اسے ہلاک کیا تو شبہ اس پر جائے گا۔ وہ چاہتا تھا کہ یہ کام میں کروں، لیکن میرا نشانہ درست نہیں تھا کیونکہ میں نے کبھی گن یا ریوالور نہیں چلایا۔ پھر وہ اسے غسل کے دوران کسی شے سے سر پر ضرب لگا کر ہلاک کرنے کے ارادے کا اظہار کرنے لگا۔ اس نے کہا پولیس یہی سمجھے گی کہ باتھ روم میں اس کا پاؤں پھسل گیا تھا اور وہ سر پر چوٹ لگنے کی وجہ سے ہلاک ہو گئی ہے پھر وہ اسے نشہ آور چیز کھلا کر ہلاک کرنے کا ارادہ ظاہر کرنے لگا مگر پھر کہنے لگا کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے گا۔

''اس نے کار ایکسیڈنٹ کے بارے میں بھی سوچا، مگر پھر یہ سوچ کر ارادہ بدل دیا کہ اگر اس نے کار کے بریک میں کوئی خرابی پیدا کی تو شبہ اسی پر کیا جائے گا اور وہ یہ نہیں چاہتا تھا۔ آخر میں اس نے چاقو استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس فیصلے کے تحت وہ میرے دفتر سے آ کر مجھے لے گیا اور ہم ایک اسٹور میں چلے گئے۔ وہاں سے ہم نے ایک بلیو جینکٹ اور ایک ماسک خریدا، جس پر سرخ دھاریاں بنی ہوئی تھیں۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ ریٹی کو فلم دکھانے لے جائے گا اور اس سے کہے گا کہ وہ کچھ فاصلے پر کار کو پارک

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

سوچا ہے تاکہ وہ لوگ فلم دیکھنے کے بعد ایک اطالوی ریستوران میں ڈرنک کرسکیں۔ اس موقع پر مجھے ایک کوڑے دان کے پیچھے چھپ جانا تھا۔ جب وہ دونوں میرے قریب سے گزرنے لگتے تو وہ اس سے کہتا کہ چابی کار ہی میں بھول آیا ہے۔ ایسے میں مجھے کوڑے دان کے پیچھے سے نکل کر ریٹی پر حملہ کرنا تھا اور اس کا پرس لے کر فرار ہوجانا تھا تاکہ یہ ڈکیتی کی واردات معلوم ہو۔''

وہ کچھ دیر رکی پھر اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے بولی۔

''جیمز صبح سویرے میرے پاس آیا۔ وہ چاقو اپنے ساتھ لایا تھا۔ اس نے چاقو میرے حوالے کیا اور اس پر سے اپنی انگلیوں کے نشانات صاف کیے پھر اس کے دستے پر سیاہ ٹیپ لپیٹ دیا، تاکہ اس پر میری گرفت مضبوط رہے پھر اس نے مجھ سے مشق کرائی کہ کس طرح قاتلانہ حملہ کیا جاتا ہے اور چاقو گھونپا جاتا ہے پھر لکھ کر اس علاقے کا نقشہ بنا کر دیا.....

''اس شام میں نیلی جیکٹ چڑھا کر ڈرائیو کرتی ہوئی لانگ بیچ پہنچ گئی اور کار سے اتر کر کوڑے دان کے پاس کھڑی ہوکر انتظار کرنے لگی۔ کاروں کی آمدورفت جاری تھی پھر کچھ لوگوں کے باتیں کرنے کی آواز سنائی دی، میں ڈر گئی اور واپس اپنی کار میں جا بیٹھی۔ وہاں سے روانہ ہونے کا ارادہ کر ہی رہی تھی کہ اسٹریٹ لائٹس میں وہ مجھے اپنی کار میں کونے سے مڑتا ہوا نظر آ گیا۔ میں اتر کر واپس کوڑے دان کے پاس چلی گئی اور اس کے پیچھے چھپ گئی۔ ماسک چہرے پر چڑھایا اور چاقو نکال کر انتظار کرنے لگی۔ میں کوڑے دان اور ایک نیلی کار کے درمیان تھی۔ وہ دونوں میرے قریب پہنچ چکے تھے۔ میری نظریں جیمز کی نظروں سے ٹکرائیں۔ ریٹی اس کے دائیں طرف چل رہی تھی۔ اس نے اسے اپنی بائیں طرف یعنی میری طرف کردیا اور کہا کہ وہ اپنی چابیاں کار میں بھول آیا ہے اور ایک منٹ میں واپس آتا ہے۔''

''اس کے بعد کیا ہوا؟'' وکیلِ استغاثہ نے پوچھا۔

''میں نے وہی کیا، جو اس نے مجھے کرنے کو کہا تھا۔'' کیتھرین نے نرمی سے جواب دیا۔ ''میں نے ریٹی کو قتل کردیا۔ میں نے اپنی جگہ سے چھلانگ لگائی اور چاقو اس کی پیٹھ میں گھونپ دیا۔ میں نے چاقو کے پھل کو اس کے گوشت میں اترتے ہوئے محسوس کیا۔ وہ بڑی بھیانک آواز میں چیخی۔ میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور جب وہ گرنے لگی تو میں بھی اس کے ساتھ گر پڑی۔''

''کیا تم نے اس پر مزید وار کیے تھے؟'' وکیلِ استغاثہ نے پوچھا۔

''ہاں کیے تھے۔'' اس نے جواب دیا۔

''تم نے اس پر وار کرتے ہوئے کیا محسوس کیا؟''

''میرے دماغ میں جیمز کے صرف وہی جملے گونج رہے تھے، جو اس نے مجھ سے کہے تھے۔'' وہ بولی۔

''جیمز نے تم سے کیا کہا تھا؟'' وکیلِ استغاثہ نے پھر پوچھا۔

''اس نے کہا تھا کہ اس امر کو یقینی بنانا کہ وہ مر چکی ہے اور اس سے کوئی بات نہ کرنا ورنہ اگر وہ بچ گئی تو سمجھ جائے گی کہ یہ ہم تھے۔''

''پھر کیا ہوا؟''

''اسے قتل کر کے میں اس کا پرس اٹھا کر تیزی سے اپنی کار میں جا بیٹھی اور ڈرائیو کرتی ہوئی اٹلانٹک سٹی پہنچ گئی، جہاں میں نے چاقو بحرِ اٹلانٹک میں پھینک دیا۔ پھر ساری رات ایک کیسینو میں گزار دی۔'' اس نے جواب دیا۔

☆☆☆

ارتکابِ جرم کے بعد کیتھرین اپنے کیے پر اس قدر پشیمان اور پریشان تھی کہ پولیس سے رابطہ کرنے سے پہلے دو یاد داریوں اور کئی دوستوں کے سامنے اپنے جرم کا اقرار کرچکی تھی۔ پھر سراغ رسانوں کو اپنا اقبالی بیان دینے کے بعد، وہ ان کے کہنے پر جیمز سے فون پر گفتگو کرنے کے دوران آلۂ سماعت پہننے پر رضامند ہوگئی تھی۔ اسے جیمز سے اپنے جرم کا اعتراف کرانا تھا۔

اس نے عدالت کو بتایا کہ وہ اپنے کیے پر اس قدر پشیمان تھی کہ اس نے پندرہ خواب آور گولیاں نگل کر خودکشی کرنے کی کوشش ...بھی کی تھی۔ اس موقع پر جیمز نے اسے اسپتال لے جانے کی پیشکش کی تھی مگر ایمبولینس طلب کرنے پر رضامند نہیں ہوا تھا اور وہ اس کی کار میں سوار ہونا نہیں چاہتی تھی، کیونکہ اسے ڈر تھا کہ جیمز اسے اسپتال لے جانے کے بجائے مرنے کے لیے کسی جنگل میں چھوڑ کر فرار ہوجائے گا۔ اس نے مزید بتایا کہ گرفتاری کے بعد کاؤنٹی جیل میں بھی اس نے ایک بار پھر فرش صاف کرنے والا کیمیکل پی کر اپنی جان دینے کی کوشش کی تھی لیکن اسے بچالیا گیا۔

''میں چاہتی تھی کہ پولیس مجھے پکڑ لے۔'' اس نے بیان دیتے ہوئے کہا۔ ''لہٰذا میں ان کے لیے جائے واردات پر قصداً اپنا نشان چھوڑ گئی تھی۔ جیمز نے مجھے اس رات زیورات پہننے سے منع کیا تھا کیونکہ قاتلانہ حملے کے

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

دوران ممکن ہے، ریٹی میرے ہار یا آویزے کو نوچنے کی کوشش کرتی لیکن میں نے اس موقع پر سارے زیورات پہن رکھے تھے.....''

''کیا تمہیں جیمز کے خلاف کیس بنانے میں پولیس سے تعاون کرتے ہوئے لطف آیا تھا؟''

''بے حد۔'' اس نے جواب دیا۔ ''میں خود کو پولیس آفیسر تصور کرنا پسند کرتی تھی۔ مجھے ان کی صحبت بہت عزیز تھی اور میں ان سے تعاون کر کے بہت خوش ہوتی تھی۔ انہیں دیکھ کر مجھے تحفظ کا احساس ہوتا تھا۔ میں ان کے شو بہت شوق سے دیکھتی تھی۔ سچ پوچھو تو میں شروع ہی سے پولیس آفیسر بننے کا خواب دیکھتی آئی تھی۔''

''کیا تم جیمز کے لیے جال بچھاتے ہوئے لطف اندوز ہوئی تھیں؟'' وکیل استغاثہ نے سوال کیا۔

''میں صرف یہ چاہتی تھی کہ انصاف ہو۔'' اس نے جواب دیا۔ ''اور میں اس کے تصور سے بے حد لطف اندوز ہوئی تھی۔ میں چاہتی تھی کہ ملزم کو کیفر کردار تک پہنچایا جائے میں اس کے لیے کوئی جال بچھانے کی کوشش نہیں کر رہی تھی۔ اگرچہ میرے دل میں جیمز کے لیے نفرت بھری ہوئی تھی کیونکہ اس نے ایک دوسری لڑکی کی خاطر مجھے ٹھکرا دیا تھا اور اپنے گھر سے بھی نکال دیا تھا۔''

''قتل کے بعد، جیمز سے تمہارے تعلقات کیسے رہے؟''

''بگڑ گئے تھے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''وہ مجھے فالتو بیڈروم میں سونے کے لیے کہتا تھا اور مجھے اس بات پر بڑا غصہ آتا تھا۔''

☆☆☆

بارہ نومبر بروز جمعرات، جیوری نے کیتھرین اور جیمز کے درمیان چار مختلف موقعوں پر ہونے والی گفتگو کا ٹیپ سنا جو کیتھرین نے پولیس کی درخواست پر ٹیپ کیا تھا۔ بیس جون کو ہونے والی گفتگو میں، وہ جیمز سے یہ کہتی ہوئی سنائی دی کہ سراغ رساں ولیم جانتا ہے کہ ہم اس بھیانک قتل میں ملوث ہیں۔ میرے خیال میں وہ سب کچھ جانتا ہے۔ ٹیپ ریکارڈر سے اس کی آواز ابھر رہی تھی۔ ''اور وہ میری مدد کرنا چاہتا ہے۔ وہ مجھ سے سب کچھ اگلوالے گا۔ ممکن ہے، وہ مجھے سو موار تک کی مہلت دے دے اور پھر آ کر گرفتار کرلے..... میں اپنے دفتر میں اس طرح ہراساں کیا جانا اور گرفتار ہونا پسند نہیں کروں گی۔ میرے خیال میں بہتر ہے کہ میں خود اس کے پاس چلی جاؤں اور اپنے جرم کا اعتراف کرلوں۔''

''ایسا مت کرو۔'' جیمز کی ملتجیانہ آواز ابھری۔ ''کیتھی پلیز! میری جان، ایسا مت کرو۔ میں تم سے التجا کرتا ہوں، ایسا مت کرو۔ ایسا کرنا سراسر حماقت ہوگی، حد درجہ حماقت..... میں اس کے سوا اور کیا کہہ سکتا ہوں۔ ہم نے ایک بہت ہی سنگین غلطی کی ہے، جسے اب ہم دونوں ہی بھگت رہے ہیں۔ ایسا مت کرو کہ دوسرے لوگوں کو بھی بھگتنا پڑ جائے۔ تمہارے والدین کو، تمہاری ملازمت کو، تمہارے باس کو..... ذرا ان کے بارے میں سوچو..... ہم نے بہت بڑی غلطی کی ہے۔ اگر ہم اپنا منہ بند رکھیں اور ان سے یہ کہیں کہ ہاں ممکن ہے، میں نے شبنی بگھاری ہو کیونکہ میں نے بہت زیادہ پی رکھی تھی۔ میں نہیں جانتا میں کیا کہہ رہا تھا۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

ایک اور موقع پر جیمز کی آواز ٹیپ سے ابھری۔ ''اور تم خود کو پاگل ثابت نہیں کرسکتیں۔ تم میرے ساتھ چاقو خریدنے گئی تھیں..... میرا مطلب ہے..... جیکٹ اور ماسک خریدنے گئی تھیں۔ ہم نے مل کر منصوبہ بنایا تھا۔ یہ بالکل بے داغ منصوبہ تھا۔ ہم نے اس پر عمل کیا۔ اب معاملہ ختم ہو چکا ہے اور اب تم یہ نہیں کہہ سکتیں کہ تم جانتی ہی نہیں تھیں کہ کیا ہو رہا تھا۔ تمہیں پرسکون رہنا ہوگا اور تم رہ سکتی ہو۔ میں جانتا ہوں کہ رہ سکتی ہو۔ تم کوئی موم نہیں ہو کہ ذرا سی گرمی سے پگھل جاؤ۔ بے بی! اس آزمائش سے گزر جاؤ پلیز۔''

چودہ نومبر کو جیمز اپنی صفائی پیش کرنے کے لیے کٹہرے میں آن کھڑا ہوا۔

''میں نے اپنی بیوی کو قتل کرنے کی کوئی سازش نہیں کی تھی۔'' اس نے کہا۔ ''جو ٹیپ عدالت میں سنا گیا یا سنایا گیا، وہ محض کیتھرین کی اس چال کا ایک حصہ ہے، جو وہ میرے ساتھ چلتی آ رہی ہے۔ میں محض اس لیے اس کی ہر بات کی تائید کر رہا تھا کہ اسے صحیح راہ پر لا سکوں اور حقیقت کی دنیا میں لا سکوں۔ یہ ایک پاگل لڑکی ہے۔ اس کی آنکھوں میں ہر وقت ایک وحشیانہ سی چمک رہتی ہے۔ میں ڈرتا تھا کہ ایک دن یہ پاگل ہم دونوں کو جیل کی ہوا کھلائے گی..... تاہم یہ ایک اچھی بیڈ پارٹنر تھی۔

''میں اپنی بیوی کی موت کے ایک ہفتے بعد سے صرف جسمانی سکون کی خاطر اس سے ملنے لگا تھا، پھر جب میں اس کے بجائے ایک دوسری لڑکی سے ملنے لگا تو اس کے ایک ماہ بعد یہ قتل کی فرضی کہانی گھڑنے لگی۔ اس کی یہ من گھڑت کہانی سن کر مجھے پہلے پہل اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ مجھے سخت دکھ پہنچا اور میں بے حد دہشت زدہ ہو گیا۔ کیونکہ یہ جو کچھ کہہ رہی تھی، اس کی نوعیت بے حد سنگین اور تشویشناک تھی۔ اس کی باتیں ناقابلِ یقین تھیں۔ مجھے صرف اور صرف اس بات کا یقین تھا کہ میری بیوی مر چکی ہے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ یہ میرے خلاف کیا کر سکتی تھی لیکن اس نے مجھ سے کہا کہ جیمز، میں مزید زندہ نہیں رہ سکتی..... میں ایک پادری کے پاس گئی تھی اور میں نے اس کے سامنے اعترافِ جرم کر لیا ہے..... اس پادری نے سب کچھ سن کر کہا..... میں نے سوچا کہ یہ لڑکی، بالکل پاگل ہے... اور پھر اس نے میری گردن پھنسا دی۔ میں نے سراغ رساں ولیم کو کال کرنی چاہی لیکن میں جانتا تھا کہ میں مشتبہ ہوں اور وہ لوگ اس کی بات پر یقین کر لیں گے چنانچہ میں نے کبھی پولیس کو کال نہیں کی۔ مجھے ڈر تھا کہ اس کی وجہ سے میں اس جگہ پہنچا دیا جاؤں گا، جہاں اس وقت کھڑا ہوں۔''

''اپنے ان جملوں کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟'' وکیل استغاثہ نے پوچھا۔ ''ہم نے منصوبہ بنایا تھا۔ یہ بالکل بے داغ تھا۔ ہم نے اس پر عمل کیا اور اب معاملہ ختم ہو چکا ہے۔''

''یہ میں اس کے اور اپنے تعلقات کے بارے میں کہہ رہا تھا۔'' جیمز نے اصرار کیا۔

وکیلِ دفاع نے بحث لپیٹتے ہوئے جیوری سے کہا کہ وہ کیتھرین کی شہادت کو مسترد کر دیں کیونکہ یہ ایک کینہ پرور اور انتقام پرور لڑکی ہے۔

''یہ میرے مؤکل سے صرف اس لیے انتقام لینا چاہتی ہے کہ میرے مؤکل نے اسے ٹھکرا کر کسی اور لڑکی سے ناتا جوڑ لیا تھا۔ یہ ایک انتقام پرور لڑکی ہے، جس نے سب کچھ خود کیا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا میرا مؤکل اس درجہ سفاک اور ظالم ہے؟ کیا یہ درندہ صفت ہے، جس نے اپنی بیوی اور اپنے بچوں کی ماں کے قتل کا منصوبہ بنایا تھا؟ یہ جاننے کا سب سے آسان طریقہ تو یہ ہے کہ آپ سرکاری گواہوں کے بیانات سنیں اور ان کے فراہم کردہ ثبوت دیکھیں لیکن میں آپ کو یہ آسان راستہ اختیار کرنے کا مشورہ نہیں دوں گا۔ کیونکہ چوٹ کھائی ہوئی ناگن اور ٹھکرائی ہوئی عورت سے زیادہ غضب ناک شے اور کوئی نہیں ہوتی۔ اس کا ڈسا پانی بھی نہیں مانگتا۔ قتل کی کوئی سازش نہیں کی گئی تھی۔ میرے مؤکل جیمز نے کوئی آلۂ قتل نہیں خریدا تھا اور نہ ہی اس نے اس سے یہ قتل کرایا تھا۔''

''یہ وہ ابلیس ہے، جس نے اپنی بیوی کی ہلاکت کا سامان کیا۔'' وکیل استغاثہ نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ''ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ کیتھرین کی شخصیت میں کوئی خامی تھی لیکن اس کی نفسیاتی الجھنوں نے اسے عدالت کے روبرو سچ بولنے سے نہیں روکا۔ قتل کا محرک، بلیک میلنگ، حرص یا آزادی کی خواہش، کچھ بھی رہا ہو۔ یہ ساری چیزیں اس کے بیان کی بنیاد کو تقویت پہنچاتی ہیں۔''

اٹھائیس نومبر جمعہ کے روز، جیوری نے سات گھنٹے کے غور و خوض کے بعد جیمز کو اپنی بیوی کو قتل کرنے، قتل کی سازش کرنے اور ساز باز کرنے اور اسے لوٹنے کی سازش کا مجرم قرار دے دیا۔ چنانچہ جج نے 25 ہزار زرِ ضمانت مقرر کرتے ہوئے سزا کے حکم کا انتظار کرنے کے لیے اسے واپس کاؤنٹی جیل بھیجنے کا حکم سنا دیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

میں اس وقت اپنے کلینک میں بیٹھا تھا جب میری سیکریٹری نے مجھے ایک کلائنٹ کی آمد کی ''نوید'' سنائی۔

چند لمحات کے بعد میرے کمرے کا دروازہ کھلا اور میری متوقع کلائنٹ کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کی آمد کے ساتھ ہی خوشبو کا ایک خوشگوار سا جھونکا میرے نتھنوں سے ٹکرایا۔ اس کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ ہوگی۔ لمبا قد، متناسب جسامت، چہرے پر نظر کا چشمہ لگائے وہ نپے تلے قدموں کے ساتھ چلتی ہوئی میرے سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔ اس کا شمار حسین عورتوں میں کیا جاسکتا تھا۔

''تشریف رکھیں۔'' میں نے اپنے لہجے میں خوش

دوسروں کو سمجھنے کا دعویٰ کرنے والوں کا خود سے بے خبری کا انداز

اس نفسا نفسی کے دور میں ہر ایک شخص اپنے نفس کے زندان میں قید دکھائی دیتا ہے اور کوئی یہ نہیں سوچ پارہا کہ مفاد پرستی کا یہ زہر ایک مرض کی شکل اختیار کرتا جارہا ہے۔ وہ جو خود کو مسیحا قرار دیتے تھے خود بھی اسی زندان میں قید ہوگئے البتہ انہیں اپنی اس قید کا ادراک تک نہ تھا۔

نفسیاتی مریض

کبیر عباسی

WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

http://paksociety.com

پاک سوسائٹی پر مُوجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

Downloaded From Paksociety.com

اخلاق سموتے ہوئے کہا۔

وہ جھجکتے ہوئے میرے سامنے بیٹھ گئی۔اس کے چہرے پر تھکن کے ساتھ ساتھ تذبذب کے آثار بھی تھے۔اس کے متعلق مزید بتانے سے پہلے میں آپ کو اپنے بارے میں کچھ بتادوں۔میں ایک نفسیات داں ہوں۔شادی شدہ ہوں اور میرا دو سال کا ایک پیارا سا بچہ بھی ہے۔امام ہمارے شادی کے دس سال بعد پیدا ہوا۔ہم دونوں میاں بیوی کی جان ہر پل اسی میں اٹکی رہتی ہے۔

میری عمر انتالیس سال ہوچکی ہے مگر دیکھنے میں پینتیس سے زیادہ کا نہیں لگتا،سو سب کو اپنی عمر پینتیس سے زیادہ بتاتا بھی نہیں ہوں۔

اسلام آباد کے ایک پوش علاقے میں میرا کلینک ہے۔کچھ عرصہ پہلے تک تو میں ہمیشہ اپنے نفسیات داں بننے پر پچھتاوے کا شکار رہا کیونکہ ہمارے ہاں نفسیاتی علاج کو لوگ ٹھیک نہیں سمجھتے۔وہ سمجھتے ہیں کہ وہ اگر اپنا کوئی نفسیاتی عارضہ لے کر کسی نفسیاتی معالج کے پاس گئے تو لوگ انہیں پاگل سمجھنا شروع کردیں گے۔لوگوں کی اس سوچ کے باعث کیریئر کے آغاز میں مجھے بھی کافی مسائل کا سامنا کرنا پڑا مگر آخر کار کچھ ''جوڑ توڑ'' کر کے میں اس علاقے میں اپنا کلینک بنانے میں کامیاب ہو ہی گیا۔

شروع میں مجھے اپنی یہ سرمایہ کاری بھی ڈوبتی ہوئی نظر آئی مگر آہستہ آہستہ میرا کام چل نکلا۔ملک میں حالات کی خرابی کی وجہ سے تقریباً ہر کوئی کسی نہ کسی نفسیاتی عارضے کا شکار نظر آتا ہے۔میں نے اس چیز کا فائدہ اٹھایا،کیبل پر اپنے کلینک کے اشتہارات چلائے۔کچھ لوگوں کا اشتہاری مہم کے لیے انتخاب کیا۔دراصل یہ لوگ میرے حلقۂ احباب میں سے ہی تھے۔میں نے ان سے کہا کہ وہ میری ''قابلیت'' کی فرضی کہانیاں اپنے حلقۂ احباب میں پھیلا دیں۔اس کے علاوہ نفسیاتی بیماریوں کے متعلق شعور اجاگر کرنا بھی ان کی ذمے داری میں شامل تھا۔جب وہ یہ کام کرنے کے بعد یورپ کی مثالیں دیتے کہ وہاں نفسیاتی معالج سے علاج کرانا اتنا ہی عام ہے جتنا دیگر جسمانی امراض کا علاج،تو لوگ موم ہو ہی جاتے۔

شاید یہ بھی ہمارے لوگوں کا ایک نفسیاتی عارضہ ہی ہے کہ ماڈرن اور ترقی یافتہ کہلوائے جانے کے شوق میں ہم ہر کام میں یورپ کی تقلید کرتے ہیں۔

خیر میں آپ کو اپنی ''مارکیٹنگ فورس'' کی ''فورس'' کے بارے میں بتا رہا تھا۔وہ اس طریقے سے ''گھیر'' کے مریضوں کو میرے پاس بھیجتے اور میں انہیں فی کلائنٹ کے حساب سے کچھ کمیشن دے دیتا۔ویسے تو وہ بھی کھاتے پیتے لوگ تھے بلکہ کچھ تو ٹھیک ٹھاک دولت مند بھی تھے مگر پیسے کسے برے لگتے ہیں۔وہ بھی صرف تھوڑی سی زبان ہلانے کی بدولت،سو اللہ کے کرم سے میرا کام بھی چل نکلا تھا اور میرے دوستوں اور رشتے داروں کو بھی اضافی آمدنی حاصل ہو رہی تھی اور کیا چاہیے تھا ہمیں۔

اب آتے ہیں میری اس خاتون کلائنٹ کی طرف۔وہ میرے سامنے بیٹھ کے اپنے ہونٹ کاٹنے لگی۔ساتھ ہی وہ اپنی انگلیاں مروڑ رہی تھی۔اس کی یہ حرکات اس کے اندرونی اضطراب کی نشاندہی کر رہی تھیں۔

میرے پاس زیادہ تر خواتین کلائنٹس ہی آتی ہیں اور ان میں سے زیادہ تر ایسی ہی ''حرکات'' کر رہی ہوتی ہیں۔میں نے پل بھر میں ہی اس کی کیفیت نوٹ کرلی اور فوراً اس سے زیادہ اہم ''نوٹ'' کرنے کے قابل چیزوں کی طرف توجہ مرکوز کرلی۔

اس کے لباس اور ہینڈ بیگ سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کا تعلق زیادہ دولت مند گھرانے سے نہ سہی،کسی کھاتے پیتے گھرانے سے تھا۔گویا وہ میری آمدنی میں خاطر خواہ اضافے کا باعث بننے کی ''اہلیت'' رکھتی تھی۔آپ کو یہ بات بھی بتادوں کہ میں فیس مریض کی ''مالی حالت'' کا اندازہ لگانے کے بعد ہی طے کرتا ہوں یہ اور بات ہے کہ میں مریض کو یہی بتاتا ہوں کہ فیس ان کے کیس کی نوعیت دیکھ کے طے کی جائے گی۔

میں نے اس کے حلیے کا غیر محسوس انداز میں تفصیلی جائزہ لینے کے بعد مطمئن ہوکر اس کی آنکھوں میں جھانکا تو اسے اپنی طرف دیکھتے ہی پایا۔میں اپنے لہجے میں شیرینی گھولتے ہوئے بولا۔''جی میم!میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''

''مجھے مسز عارفہ مجیب نے آپ کے بارے میں بتایا تھا۔''وہ اتنا بتا کر میری طرف منتظر نظروں سے دیکھنے لگی۔

''اوہ،مس عارفہ میری کلائنٹ ہیں۔وہ کچھ عرصہ میرے پاس زیر علاج رہی ہیں اور اب بالکل ٹھیک ہیں۔امید ہے آپ کا مسئلہ بھی حل ہوجائے گا۔''

عارفہ میرے ایک دوست کی بیوی تھی۔وہ ''مارکیٹنگ'' کے دوران یہی کہانی سنا کر کلائنٹس کو ''گھیرتی'' تھی،سو میں نے بھی اپنی متوقع کلائنٹ کو وہی کہانی سنائی۔

''مسئلہ میرا نہیں ہے۔''میری بات سنتے ہی وہ قدرے

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

تیز انداز میں بولی۔

میں نے اس کا لہجہ نظر انداز کر دیا کہ نفسیاتی مریضوں کے علاج کے لیے ہمیں مختلف قسم کے رویوں کو سہنا پڑتا ہے۔ یہ میرے لیے معمول کی بات تھی۔

کچھ دیر بعد وہ پھر گویا ہوئی۔ اس بار اس کا لہجہ معمول کے مطابق تھا۔

''ڈاکٹر صاحب! آپ ''سائیکالوجیکل پرابلم'' کو کیسے ''ڈیفائن'' کرتے ہیں؟'' اس نے اٹکتے اٹکتے سوال کیا۔

اس کا سوال سن کے میں ہڑبڑا گیا۔ ایف اے کی نفسیات کی کتاب میں نفسیاتی عارضے کی جو تعریف اور اقسام میں نے ''رٹی'' تھیں، وہ اب کہاں یاد تھیں مجھے۔ بہرحال اسے مطمئن کرنا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ میں نے ذہن میں ایک مناسب سی تعریف سوچی... سوچی کیا بلکہ ''گھڑی'' اور گویا ہوا۔

''سائیکالوجی کی رو سے میں آپ کو اس کی تعریف بتاؤں تو شاید آپ کو سمجھنے میں دشواری ہو۔ بس آپ یہ سمجھ لیں کہ جب کسی شخص کا رویہ عمومی رویے کے برعکس ہو تو ہم کہہ سکتے ہیں اسے ''سائیکالوجیکل پرابلم'' ہے۔''

وہ میری یہ ''جامع'' تعریف سن کر مطمئن نظر آنے لگی۔ ''گوروں'' کی زبان میں یہ بہت بڑی خوبی ہے کہ کوئی نامناسب ترین لفظ بھی ہو تو انگریزی میں ادائیگی سے وہ بڑا مناسب لگنے لگتا ہے۔ اب یہی دیکھ لیں کہ ''نفسیاتی مرض'' لفظ کتنا ''آکورڈ'' سا لگتا ہے جبکہ ''سائیکالوجیکل پرابلم'' کتنا اپنا اپنا۔

''ہوں.....! اس کا مطلب ہے وہ واقعی ''سائیکو'' ہیں۔'' وہ خود کلامی کے انداز میں بولی۔

''میم! آپ مجھے کچھ تفصیل بتانا پسند کریں گی؟''

''میرے شوہر سائیکو ہیں۔ میں انہی کے سلسلے میں آپ سے بات کرنے آئی تھی۔'' اتنی دیر میں وہ کافی پُراعتماد نظر آنے لگی تھی اور اب روانی سے بات کر رہی تھی۔

میں ایک رف پیڈ اور پنسل لے کر اس سے بولا۔ ''اس بات کا آپ کو کب اور کیسے پتا چلا کہ وہ ''سائیکو'' ہیں؟''

''مختلف واقعات سے وہ سائیکو ثابت ہوتے ہیں۔ میں تو ان کی عادات سے سخت نالاں ہوں۔ آپ پلیز میری مدد کریں۔'' وہ روہانسے انداز میں بولی۔

''جی، ہم اسی لیے تو یہاں بیٹھے ہیں۔ آپ کچھ واقعات کا ذکر کر رہی تھیں۔'' میں نے فوراً اس کی بات کا رخ اصل مسئلے کی طرف موڑا۔ ورنہ خواتین عام طور پر اچھا خاصا وقت تمہید باندھنے میں ہی ضائع کر دیتی ہیں۔

وہ پھر نروس نظر آنے لگی۔ کچھ دیر کے بعد وہ گویا ہوئی۔ ''اب یہی رات کا واقعہ سن لیں۔ رات کو گیارہ بجے ہم سونے کی تیاری کر رہے تھے کہ اچانک کال بیل بجی۔ ہمارا... بیڈروم دوسری منزل پر ہے، وہاں سے گیٹ نظر آتا ہے۔ انہوں نے کھڑکی کے آگے لگا پردہ اٹھا کر نیچے دیکھا۔

''اوہ، ارشد صاحب، اس وقت..... خیریت تو ہے؟'' وہ نیچے دیکھ کر فکرمندی سے بولے۔

''میں جھنجلا گئی۔ ارشد ہمارا پڑوسی ہے اور اسے ہر دوسرے تیسرے روز ہی کوئی نہ کوئی کام ان سے پڑتا رہتا ہے۔ وہ میری طرف معذرت طلب نظروں سے دیکھتے ہوئے نیچے چلے گئے۔ میں اپنی جگہ پیچ و تاب کھا کے رہ گئی۔

''کچھ دیر بعد ان کی کال آئی کہ ارشد صاحب کا یو پی ایس مسئلہ کر رہا ہے۔ وہ اسے دیکھنے جا رہے ہیں۔ انہوں نے الیکٹریشن کا کام بھی سیکھا ہوا ہے۔ گھر کے یو پی ایس میں کوئی مسئلہ ہو تو بھی خود ٹھیک کر لیتے ہیں۔ گھر کی تو خیر ہے مگر کسی پڑوسی کے یو پی ایس کو دیکھنے رات کے اس پہر جانا کہاں کی تک ہے؟ آپ ہی بتائیں، کیا یہ سائیکالوجیکل پرابلم نہیں؟'' وہ مجھے دیکھتے ہوئے برہمی سے بولی۔

میرا خیال اس سے مختلف تھا۔ یہ نفسیاتی مسئلہ تو نہیں تھا مگر رات کو پڑوسی کے یو پی ایس کو ٹھیک کرنے جانا وہ بھی ''مفت'' میں حماقت کی انتہا ضرور ہے۔ بہرحال میں اس کے خیال کی نفی تو کر ہی نہیں سکتا تھا کہ ایسا کرنے سے میں اس سے ہونے والی متوقع آمدنی سے ہاتھ دھو سکتا تھا اور میں اس کے میاں کی طرح اتنا احمق نہیں تھا کہ ایسی حماقت کرتا، سو میں.... نے کہا۔ ''آپ صحیح کہہ رہی ہیں۔ ان کے بارے میں مزید کچھ بتائیں۔''

''یہ ایسے ہی سب کے کام مفت میں بڑھ چڑھ کر کرتے رہتے ہیں۔ ان سے چھوٹے دو بھائی اور ایک بہن ہے۔ یہ ابھی جاب پر لگے ہی تھے کہ ان کے والد اور والدہ کا ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں انتقال ہو گیا۔ انہوں نے اپنی ذات کو بھلا دیا اور پہلے اپنے بھائیوں اور بہن کی تعلیم مکمل کرائی۔ وہ اپنی تعلیم مکمل کر کے جاب پر لگ گئے۔ اب ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ یہ اب اپنا گھر بسانے کا سوچتے مگر انہوں نے اپنے پیسوں سے سب کی شادیاں کرائیں۔ جب سب اپنے گھر کے ہو گئے تو پھر اپنی شادی پینتیس سال کی عمر میں جا کر کی۔ مجھ سے دس سال بڑے ہیں وہ۔'' اس نے رک کر مجھے دیکھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

یہ عورت بھی اکثر عورتوں کی طرح اپنی عمر کے حوالے سے کافی حساس معلوم ہو رہی تھی جو فوراً وضاحت کرنے لگی۔ خیر مجھے اس کی عمر سے کیا لینا دینا تھا، سو منتظر نظروں سے اسے دیکھنے پر ہی اکتفا کیا۔

وہ کچھ لمحات کے توقف کے بعد پھر گویا ہوئی۔ ''اپنی شادی کے کچھ عرصے بعد انہوں نے اپنا آبائی گھر اپنے بھائیوں کے حوالے کیا اور خود نئے گھر میں شفٹ ہو گئے جو انہیں گورنمنٹ کی طرف سے ملا تھا۔ جن بھائیوں اور بہن کے لیے انہوں نے اتنی قربانی دی، وہ اب بھی ان سے بس غرض کا تعلق قائم رکھے ہوئے ہیں۔ یہ ہر ویک اینڈ پر انہیں اپنے گھر کھانے پر مدعو کر لیتے ہیں۔ وہ سب اپنے بچوں کے ساتھ آ کے مفت میں گلچھرے.... اڑا لیتے ہیں مگر مجال ہے جو ہمیں کبھی کسی نے اپنے گھر کھانے یا چائے پر بھی مدعو کیا ہو۔ میں ان کو سمجھا سمجھا کر تھک چکی مگر ان کے کان پر جوں نہیں رینگتی۔ اب آپ بتائیں کیا ان کا رویہ عمومی رویے کے برعکس نہیں ہے؟'' وہ بولنے پر آئی تو ایک ہی سانس میں بولتی چلی گئی۔

اس عورت کا شوہر تو واقعی کوئی ''مہا احمق'' تھا جو اس دور میں بھی اس انداز میں جی رہا تھا۔

''جی آپ درست کہہ رہی ہیں۔ ان کا رویہ آپ کے ساتھ کیسا ہے؟''

''وہ میرا اور بچوں کا بھی ہر طرح سے خیال رکھتے ہیں مگر بعض اوقات وہ دوسروں کے کام کرتے ہوئے ہمیں بھی نظر انداز کر دیتے ہیں۔'' وہ شکوہ کناں انداز میں بولی۔

''آپ کے میاں کرتے کیا ہیں؟'' میں نے ایک انتہائی ضروری سوال کافی دیر بعد کیا۔ حالانکہ یہ سوال مجھے ابتدا میں کرنا چاہیے تھا۔ میں نے تو اس سے ابھی تک اس کے میاں کا نام تک نہیں پوچھا تھا۔ خیر، نام سے میرا کیا لینا دینا تھا۔ البتہ کام کا پتا ہونا ضروری تھا۔ میں نے ایک بار پھر خود کو کوسا۔

''سی ڈی اے میں اٹھارویں گریڈ کے ملازم ہیں۔'' وہ فخر کے بجائے تنفر سے بولی۔ اب میاں کا اٹھارویں اسکیل میں ہونا تو کافی ''کشش انگیز'' ہوتا ہے نہ کہ نفرت انگیز جس پر بی بی خفا لگ رہی تھیں۔

میں نے بھویں اچکا کے حیرت سے اسے دیکھا۔ وہ میری آنکھوں میں حیرانی دیکھ کر پھر بولی۔ ''وہ ایسی سیٹ پر ہیں جس سیٹ پر باقی لوگوں نے پورے شہر میں اپنے پلازے کھڑے کر لیے ہیں مگر یہ ایک ہی پلاٹ پر اکتفا کیے بیٹھے ہیں۔'' اس کی بات سن کر مجھے اس کی خفگی کی وجہ سمجھ آ گئی۔ گویا بڑے میاں پر بے غرضی کے علاوہ ایمانداری کا بھوت بھی سوار تھا۔

''ڈاکٹر صاحب! یہ تو آپ کو میں نے چند مثالیں دی ہیں آپ ان سے ملیں تو آپ کو اندازہ ہو کہ وہ کہیں سے بھی آج کے دور کے انسان نہیں لگتے۔ اس دور میں جب سب کو اپنی پڑی ہوئی ہے، وہ دوسروں کی فکر میں گھلتے رہتے ہیں۔ اس کے لیے بھی نہ وہ کوئی وقت دیکھتے ہیں نہ حالات۔ آپ پلیز میرے اس مسئلے کو حل کریں۔ ورنہ مجھے لگتا ہے میں ان کی ان عادات کے باعث پاگل ہو جاؤں گی۔'' وہ کنپٹیاں مسلتے ہوئے بولی۔

میں نے اسے ہمدردی سے دیکھا۔ اس کا میاں واقعی ''سائیکو'' تھا کہ اس کا ہر رویہ ہی عمومی رویے کے برعکس تھا۔ اس نفسا نفسی کے دور میں جب ہر شخص، ہر کام صرف اپنے ہی فائدے کو مدنظر رکھ کر کرتا ہے، وہ دوسروں کی فکر میں گھل رہا تھا۔ وہ تو کسی خیالی دنیا کا باشندہ لگ رہا تھا۔ اس کی نفسیات میں واقعی کوئی پیچیدگی تھی جو وہ عام معاشرے کی ڈگر سے ہٹ کے چل رہا تھا۔

میں نے خیالوں ہی خیالوں میں بڑے میاں کی ''حرکات'' کا جائزہ لے کر انہیں ''نفسیاتی مریض'' کا ''سرٹیفکیٹ'' عنایت کر دیا۔

''میم! آپ کا مسئلہ حل ہو جائے گا، بس آپ اپنے میاں کی کہیں بھی مجھ سے ملاقات کرا دیں۔''

میری بات سن کر وہ مطمئن نظر آنے لگی۔ ''جی، یہ ٹھیک رہے گا۔ میں تو پریشان ہو رہی تھی کہ انہیں یہاں کیسے لاؤں گی۔''

''میں سمجھتا ہوں، آپ ان سے میرا بطور نفسیات داں تعارف بھی نہ کرائیے گا۔ میں خود ہی ان سے مل کر... ان سے اپنی مطلوبہ معلومات حاصل کر کے ان کا علاج شروع کر دوں گا۔''

''یہ ٹھیک رہے گا۔'' وہ جوش سے بولی۔ ''مگر آپ ان کا علاج کیسے کریں گے؟'' اگلے ہی لمحے اس کے لہجے میں الجھن در آئی۔

''آپ اس کی فکر چھوڑیں۔ میں پہلے ان کے مرض اور اس کی شدت کو سمجھ لوں پھر علاج بھی ہو جائے گا۔'' میں مسکراتے ہوئے بولا تو اس کی آنکھوں میں تیرتی الجھن کافی حد تک معدوم ہو گئی۔

میں نے اس کی طرف رف پیڈ بڑھایا۔ ''آپ اپنے شوہر کا نام، فون نمبر، گھر کا اور آفس کا ایڈریس اس پر لکھ دیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

اور اگر آپ کے پاس ان کی کوئی تصویر ہے تو وہ بھی دے جائیں۔''

''تصویریں تو ہیں مگر میرے سیل میں ہیں۔'' وہ پریشان کن انداز میں بولی۔

''کوئی بات نہیں، وہ آپ مجھے ''واٹس ایپ'' کر دیجیے گا۔'' میں نے مسکرا کے کہا تو وہ مجھ سے رف پیڈ لے کر اس پر میری مطلوبہ معلومات لکھنے لگی۔

میں بغور اسے دیکھنے لگا۔ رف پیڈ پر قلم گھسیٹتے ہوئے وہ انتہائی مگن سی لگ رہی تھی۔ چند لمحات کے بعد ہی اس نے پیڈ میری طرف بڑھا دیا۔ اس کی لکھائی انتہائی صاف اور واضح تھی۔ میں نے اس کی لکھائی کی تعریف کی تو وہ شرمانے لگی۔

میں نے اپنا کارڈ اس کی طرف بڑھایا۔ ''اس پر میرا سیل نمبر بھی لکھا ہوا ہے۔ اپنے میاں سے کہیں بھی میری ایک ''اتفاقیہ'' ملاقات سیٹ کر کے مجھے انفارم کر دیجیے گا۔ آپ بے فکر ہو جائیں، اب یہ مسئلہ آپ کا نہیں میرا ہے۔'' میری یقین دہانی پر وہ مطمئن انداز میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

''بہت شکریہ، ڈاکٹر صاحب! میں جلد ہی ان سے آپ کی ملاقات کا بندوبست کر کے آپ کو بتا دوں گی۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

''جی ضرور۔'' میں مسکراتے ہوئے بولا۔

اس کے باہر نکلتے ہی میں نے انٹر کام اٹھایا اور اپنی سیکریٹری سے بولا۔ ''پانچ ہزار.....''

چند لمحات کے بعد ہی سیکریٹری نے مجھے انٹر کام پر اطلاع دی کہ اس نے پانچ ہزار بلا رد و قد کے دے دیے ہیں۔ میں نے مطمئن انداز میں سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کے آنکھیں موند لیں۔

یہ اگلے دن کی بات ہے۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ میں آفس میں فارغ بیٹھا تھا کہ میرا سیل بج اٹھا۔ کوئی اجنبی نمبر تھا۔ میں نے کال ریسیو کر کے سیل کانوں سے لگا لیا۔

''ہیلو ڈاکٹر عرفان؟'' دوسری طرف سے کسی نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

''جی فرمائیے، میں عرفان ہی بات کر رہا ہوں۔''

''ڈاکٹر صاحب، میں صنم بات کر رہی ہوں۔ کل آپ کے کلینک بھی آئی تھی اپنے شوہر کا ایک مسئلہ لے کر۔'' وہ جلدی سے بولی تو مجھے یاد آیا کہ کل تو میں نے اس سے اس کا نام تک نہیں پوچھا تھا۔ میں نے اس غلطی پہ خود کو کوسا اور اس

بہترین تحریریں، لاجواب روداد اور
اعلیٰ داستانیں پڑھنے والوں کے لیے
سرگزشت کا مطالعہ ضروری ہے

ماہنامہ سرگزشت کراچی

شمارہ جون 2017ء
کی جھلکیاں

نوائے خلیل
اس قلمکار کی داستانِ زیست جسے ہر گام پر دکھ ملے

بابائے سندھی فلم
پاکستانی فلمی دنیا کے ایک اہم شخصیت کا ذکرِ خاص

نایاب پرندے
ان پرندوں کی کہانی جو تیزی سے نایاب ہو رہے ہیں

خود اعتمادی
ایک دوشیزہ کی سچ بیانی جس نے اپنا ٹوٹتا گھر بچا لیا

ناسور ایک نہایت تیز رفتار طویل کہانی،
شمشال سے ٹورنٹو ایک الگ انداز کی سفر کہانی، جون کی شخصیت، اس ماہ سے جڑی شخصیات کا مختصر مختصر سا تذکرہ

اور بھی بہت کچھ جسے آپ کو پڑھنا چاہیے۔
آپ پڑھنا چاہتے ہیں۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

سے گویا ہوا۔

''جی مس صنم، کیسے کیسے یاد کیا؟ میں تو ابھی تک آپ کے شوہر کی تصاویر کے ''واٹس ایپ'' کا انتظار کر رہا تھا۔''

''اوہ، سوری..... وہ میں بھول ہی گئی۔'' وہ بولی تو اس کے لہجے میں شرمندگی تھی۔

''چلیں کوئی بات نہیں۔ بتائیں ابھی کیسے یاد کیا؟''

''وہ آپ نے کہا تھا کہ میں اپنے شوہر کی آپ سے اتفاقیہ ملاقات کراؤں، تو آج شام فارغ ہیں آپ؟'' وہ تذبذب کے عالم میں بولی۔

''فارغ تو نہیں مگر میں وقت نکال لوں گا۔ آپ بتائیں، کہاں آنا ہوگا مجھے؟''

''وہ اکثر شام کو ایک پارک میں جاتے ہیں۔ میں بھی آج ان کے ساتھ جا رہی ہوں۔ اگر آپ وہاں آجائیں تو میں ان سے آپ کا تعارف کرا دوں گی۔ آپ ان سے بات کر لیجیے گا۔'' اس نے پارک کا نام بھی بتا دیا۔

یہ پارک میرے گھر سے قریب ہی تھا اور اکثر میری بیوی بھی ادھر شام کو جایا کرتی تھی۔ کچھ سوچ کر میں نے اسے اوکے کر دیا اور ساتھ ہی اپنا پروگرام بتا دیا۔

☆☆☆

تقریباً دو گھنٹے بعد میں پارک میں بیٹھا تھا۔ پارک کیا یہ ایک کھلا میدان تھا جس میں کچھ جھولے لگے ہوئے تھے۔ سردیوں کے دن تھے۔ پارک میں اِکا دُکا لوگ ہی نظر آرہے تھے۔

عاتقہ کو بھی میں نے فون کر کے بلا لیا تھا۔ میں اپنے دو سالہ بیٹے امام کے ساتھ کھیل رہا تھا کہ میں نے صنم کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ اس کے ساتھ ایک ہینڈسم سا مرد بھی تھا جو اس کا شوہر ہی ہو سکتا تھا۔ اس نے ٹراؤزر کے ساتھ ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ میرا تو خیال تھا کہ وہ قدرے عمر رسیدہ اور ہولناک سا نظر آنے والا شخص ہوگا مگر میری توقع کے خلاف وہ خاصا جوان اور تروتازہ لگ رہا تھا۔ صنم نے بتایا تھا کہ وہ اس سے دس سال بڑا ہے جبکہ وہ دیکھنے میں اس سے بھی کم عمر لگ رہا تھا۔

وہ میرے قریب پہنچ کر چونکتے ہوئے بولی۔

''اوہ، عرفان صاحب! آپ یہاں؟''

میں بھی جواب میں مسکرایا اور امام کو گود سے نیچے اتارتے ہوئے بولا۔ ''بس فارغ تھا تو سوچا بیٹے کو ذرا باہر کی ہوا لگا لاؤں۔''

''اچھا کیا آپ نے، ورنہ آج کل شوہر حضرات کے پاس بیوی بچوں کے لیے وقت کم ہی ہوتا ہے۔'' اس نے اپنے شوہر کی طرف دیکھتے ہوئے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''اوہ، میں آپ دونوں کا تعارف کرانا تو بھول ہی گئی۔'' وہ ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولی۔

''یہ عرفان صاحب ہیں۔ عارفہ ان کی کزن ہے۔ اس کے گھر چند دن پہلے ان سے ملاقات ہوئی تھی اور یہ ..... یہ میرے شوہر امیر صاحب ہیں۔ یاد رہے، امیر ان کا نام ہے۔ آپ انہیں سچ مچ کا امیر نہ سمجھ لیجیے گا۔'' وہ کھلکھلاتے ہوئے بولی۔

میں نے مسکراتے ہوئے ''نام کے امیر صاحب'' کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ''سنا ہے نام کے اثرات ہوتے ہیں۔ یہ آج نہیں تو کل ضرور امیر ہو جائیں گے۔'' میرے لہجے میں خوش خلقی گھلی ہوئی تھی۔

امیر صاحب میرا ہاتھ تھام کر بولے۔ ''جی بالکل، نام کے اثرات بھی ہوتے ہیں۔ ویسے میں اتنا امیر ہو چکا ہوں جتنا میں ضروری سمجھتا ہوں۔'' اس کے لہجے میں عجب بے نیازی تھی۔

بھلا امارت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ جو یہ صاحب ''اتنی سی'' دولت پر ہی اکتفا کر کے بیٹھ گئے تھے۔ میں ان کے خیالات سے متفق نہیں تھا، سو بس مسکرانے پر ہی اکتفا کیا۔

صنم نے امام کو اٹھانے کی کوشش کی تو وہ رونے لگا۔ اس نے جھینپتے ہوئے اسے واپس نیچے چھوڑ دیا۔ وہ بھاگتا ہوا اپنی ماں کی طرف چلا گیا جو پاس ہی ایک بینچ پر بیٹھی ہمیں دیکھ رہی تھی۔ میں اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ عاتقہ ہے۔ میری بیوی۔''

صنم اس کی طرف بڑھ گئی جبکہ میں امیر کو لے کر ایک دوسری بینچ کی طرف بڑھ گیا۔

''ماشاء اللہ، آپ کا بیٹا بہت کیوٹ ہے۔'' وہ امام کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

میں نے محبت پاش نظروں سے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا جو بینچ سے کچھ فاصلے پر جھولے کے پاس کھڑا تھا۔

اچانک میرا سیل بجنے لگا۔ یہ میرے ایک کلائنٹ کی کال تھی۔ ''ایکسکیوزمی۔'' میں نے معذرت خواہانہ انداز میں امیر کی طرف دیکھا اور بینچ سے اٹھ گیا۔

کچھ دور جا کر میں اپنے کلائنٹ سے بات کرنے لگا۔ بات کرتے کرتے مجھے امام کا خیال آیا۔ وہ مجھے کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔

اچانک میں نے امیر کو چلاتے سنا۔ ''عرفان صاحب!

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

آپ کا بیٹا.....''

میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ ایک طرف کو بھاگ رہا تھا۔ میں نے اس سمت نظر دوڑائی تو ایک اپر پوش کو بھاگتے دیکھا۔ اس نے کندھے کے ساتھ ایک بچے کو لگایا ہوا تھا جو مجھے امام ہی لگا۔

میں نے بھی اس سمت دوڑ لگا دی۔ عاتقہ ہمیں بھاگتے دیکھ کر چلّانے لگی۔

میرے قدموں میں جیسے بجلی بھر گئی تھی۔ وہ شخص اب باہر پہنچ کر روڈ کے کنارے کھڑی ایک کار کا دروازہ کھول رہا تھا لیکن شاید دروازہ کھل نہیں رہا تھا۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے امام کو اٹھایا ہوا تھا جو بالکل خاموش تھا۔

وہ تو کبھی کسی اجنبی شخص کو پاس نہیں آنے دیتا تھا اور کہاں اس شخص کے کندھے سے اتنی خاموشی سے لگا ہوا تھا۔ میں نے بھاگتے ہوئے حیرانی سے سوچا۔

اتنے میں امیر اس کے کافی قریب پہنچ گیا۔ اس شخص نے امیر کو اتنے قریب دیکھا تو جیب سے پستول نکال لیا۔ میں پستول دیکھ کر رک گیا لیکن امیر اب بھی بھاگ رہا تھا۔ اب وہ بھاگتے ہوئے میرے سامنے آ گیا تھا جس کی وجہ سے وہ شخص میری نظر سے اوجھل ہو گیا۔

اچانک میں نے امیر کو گرتے دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اپنے کندھے میں ایک انگارہ سا اترتے محسوس کیا۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ کچھ پل میں ہی میں ہوش و حواس سے بیگانہ ہو چکا تھا۔

☆☆☆

یہ تقریباً ایک ماہ بعد کی بات ہے۔ میں عاتقہ کے ساتھ بہت سے تحائف سے لدا پھندا امیر کے گھر جا رہا تھا۔ شاید یہ میری زندگی کا پہلا موقع تھا جب میں نے بغیر کسی غرض اور لالچ کے کسی کے لیے تحائف خریدے تھے۔

میرے کندھے کا زخم بھر چکا تھا۔ اب مجھے بازو ہلاتے ہوئے تھوڑی تکلیف تو ہوتی تھی مگر یہ تکلیف قابلِ برداشت تھی۔ میرے کندھے میں گولی لگی تھی جس نے کندھے کی ہڈی کو متاثر کیا تھا۔ ڈاکٹرز نے آپریشن کر کے گولی نکال لی تھی۔

میرا کافی خون بہہ گیا تھا۔ بروقت مجھے طبی امداد نہ ملتی تو میری موت واقع ہو سکتی تھی۔

مجھے بعد میں پتا چلا تھا کہ امام کھیلتے کھیلتے دور چلا گیا تھا۔ اسے اکیلا دیکھ کر اس شخص نے اسے بے ہوش کر کے کندھے پر اٹھا لیا تھا۔ اسی وقت امیر کی نظر اس پر پڑی۔ ''خدمتِ خلق'' کا جذبہ تو اس میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ میں اس کے اس ''جذبے'' کا ''علاج'' کرنے کے لیے ہی تو اس سے ملا تھا۔

میں اس سے بھی کچھ فاصلے پر تھا۔ اس نے مجھے آواز لگاتے ہی اس شخص کی طرف دوڑ لگا دی تھی۔

جب اس شخص نے امیر پر فائر کرنے کے لیے پستول سیدھا کیا تو وہ تیزی سے بیٹھ گیا۔ وہ گولی میرے کندھے میں لگی۔

امیر اتنے میں اس شخص کے انتہائی قریب پہنچ چکا تھا۔ اس نے جست لگا کر اس شخص کے پیٹ میں ٹکر ماری تو وہ اڑتا ہوا دور جا گرا۔

امام اور پستول دونوں اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئے۔ امیر نے اس شخص کو پکڑ لیا۔ اتنے میں کچھ اور لوگ بھی موقع پر جمع ہو گئے۔ انہوں نے پہلے تو اس شخص کی خوب دھلائی کی اور پھر اسے پولیس کے حوالے کر دیا۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ شخص اغوا کاروں کے ایک گروہ سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ لوگ بچوں کو اغوا کر کے ان کے اعضا فروخت کرنے کے مکروہ دھندے میں ملوث تھے۔ اس شخص کی نشاندہی پر اس کے دیگر ساتھیوں کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔

میڈیا نے اس واقعے کی بھرپور کوریج کی تھی۔ امیر اس واقعے کا ہیرو تھا۔ اس کی ہمت و جرأت کو خوب خراجِ تحسین پیش کیا گیا۔ وہ یکدم ہی پورے شہر میں مشہور ہو گیا۔

کچھ لوگوں نے مجھے بھی اٹھا کے اسپتال پہنچا دیا۔ اسپتال میں گزرا وقت میرے اندر بہت سی تبدیلیاں لے آیا۔ امام میں تو میری جان تھی۔ اگر امیر اپنی جان پر کھیل کر اسے نہ بچاتا تو میں تو زندہ درگور ہو جاتا۔

اب مجھے احساس ہو رہا تھا کہ نفسیاتی مریض وہ نہیں، میں تھا بلکہ ہمارا پورا معاشرہ ہی نفسیاتی مریض ہے۔ وہ تو شاید معاشرے کا واحد نارمل انسان ہے۔ ''نفسیاتی مریض'' تو ہر وہ فرد ہے جو معاشرے کے ''ساتھ'' چل رہا ہے۔ دوسروں کو دھکیلتے ہوئے، کچلتے ہوئے، ہر جگہ بس اپنے فائدے کو ہی... مدنظر رکھے ہوئے، آگے ہی آگے بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ پتا نہیں حقیقت میں ہم آگے جا رہے ہیں یا پیچھے.....

اس ''نفسیاتی مریض'' نے میری پوری نفسیات ہی بدل ڈالی۔ اب میں نے بھی اس کی طرح عام معاشرے سے ہٹ کے چلنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس راہ میں مشکلات تو ہیں مگر اصل کامیابی بھی اسی راستے پر چل کے ملتی ہے۔ آپ لوگ میرے لیے دعا کیجیے گا اللہ مجھے اپنے فیصلے پر ثابت قدم رکھے۔ آمین۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

محفلِ شعروسخن

❄ مسٹر اینڈ مسز محمد صفدر معاویہ ......خانیوال
گردنیں وار دی گئیں کھالیں اتار لی گئیں
عشق پکارتا ہی رہا یار نہیں تو کچھ نہیں

❄ وسیم اکرم......مہرشاہ، خانیوال
ہم تو اک حرفِ محبت سے بھی مر سکتے ہیں فراز
تیر کیوں ڈھونڈ کے لاتے ہو نشانے کے لیے

❄ محمد نعیم پاشا......ملتان
تو نے اپنا بنا کے چھوڑ دیا
کیا اسیری ہے کیا رہائی ہے

❄ محمد شہباز ناز......سرگودھا
جس شہرِ ستمگر میں ہے بشر بھولا خدا بھی
مل مل کے وہاں روتی ہے مٹی سے گھٹا بھی

❄ انیلہ رشید سیال ......خیر پور میرس، سندھ
وقت اچھا بھی آئے گا ناصر
غم نہ کر زندگی پڑی ہے ابھی

❄ ناہید یوسف ......اسلام آباد
عجب ہے رات سے ان آنکھوں کا عالم
یہ دریا رات بھر چڑھتا رہا ہے

❄ اسد خان ......مانسہرہ
نہ سیو ہونٹ نہ خوابوں میں صدا دو ہم کو
مصلحت کا یہ تقاضا ہے بھلا دو ہم کو
ہم حقیقت ہیں تو تسلیم نہ کرنے کا سبب
ہاں اگر حرفِ غلط ہیں تو مٹا دو ہم کو

❄ عنبرین لاشاری......لندن
اس نے خوشبو کی طرح میری پذیرائی کی
کوبکو پھیل گئی بات شناسائی کی
اس نے ایک لمحے کو ماتھے پہ مرے ہاتھ دھرا
روح تک آ گئی تاثیر مسیحائی کی

❄ ظفر اقبال ظفر ......کامرہ شرقی
بچایا تھا جسے کبھی سورج کی کرنوں سے ہم نے
اب دھوپ اوڑھے پھرتا ہے سارے شہر میں

❄ رعنا رضوی......یوکے
دل کا کسی نگاہ سے ٹکرا کے ٹوٹنا
تھا حادثہ ضرور مگر خوشگوار تھا

❄ ہادیہ ایمان، ماہا ایمان......فورٹ عباس
بعد توبہ کے بھی چھٹکا نہیں جاتا مجھ سے
ہم لیے بیٹھے ہوئے ہیں ٹوٹے ہوئے پیمانے کو

❄ علی خٹک ......خانیوال
تجھ سے دلکش ہے کہیں تیرے تصور کا جہاں
تو میرے پاس بھی ہوتا تو میں تنہا ہوتا

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

❁ لبنیٰ وکیل.....کوئٹہ
دل بھی پاگل ہے کہ اس شخص سے وابستہ ہے
جو نہ کسی اور کا ہونے دے نہ اپنا رکھے
❁ محمد شہباز اکرم نوئی.....پاکپتن شریف
اپنی آنکھوں پہ کروں گا سورۃ توبہ کی تلاوت
دلنشیں یہ تیرے خواب دیکھنے کی گناہ گار ہوئی ہیں

❁ جاوید اختر رانا.....پاکپتن شریف
جانے دے اے تصورِ جاناں نہ کر تلاش
ایسا نہ ہو کہ وہ کہیں دشمن کے گھر ملے
❁ ریاض بٹ.....حسن ابدال
لڑکیاں سب شیش محلوں کی بیاہی جائیں گی
جھونپڑیوں میں بین کرتی بیٹیاں دیکھے گا کون
❁ عظیم احمد ..... جھنگ سٹی
جس عہد میں لٹ جائے فقیروں کی کمائی
اس عہد کے سلطان سے کچھ بھول ہوئی ہے

❁ صبا سحر.....کراچی
فضا میں پھیل چلی میری بات کی خوشبو
ابھی تو میں نے ہواؤں سے کچھ کہا بھی نہیں
❁ زوہیب احمد ملک.....گلستانِ جوہر کراچی
فٹ پاتھ کی دیوار سے چپکے ہوئے پتے
اک روز ہواؤں کو درختوں پر ملے تھے
❁ عبدالجبار رومی انصاری.....لاہور
کوئی ملال کوئی آرزو نہیں کرتا
تمہارے بعد یہ دل گفتگو نہیں کرتا
کوئی نہ کوئی مری چیز ٹوٹ جاتی ہے
تمہاری یاد سے جب بھی وضو نہیں کرتا
❁ محمد قدرت اللہ نیازی.....خانیوال
بہت ممکن تھا رک جاتے، پکارا ہی نہیں تم نے
تیرے کوچے سے تو ہم اتنی عجلت سے نہیں نکلے
قدم چوکھٹ پہ رکھتے ہی یہ بازو پھیل جاتے ہیں
محبت سے نکل آئے ہیں تیری عادت سے نہیں نکلے
❁ وزیر محمد خان .....بل ہزارہ
لہو میں رنگ کی صورت بسا ہے تیرا خیال
میں کس طرح تیری یادوں سے فاصلہ رکھوں

❁ انعم کمال.....حیدر آباد
ہنسنے نہیں دیتا کبھی رونے نہیں دیتا
یہ دل تو کوئی کام بھی ہونے نہیں دیتا
❁ نوشتہ گلزار.....بھکر
چاند بھی ڈوب گیا بجھ گئے تاروں کے دیے
اس کی یادوں کا چراغ ہم نے بجھایا ہی نہیں
❁ شاہینہ مہتاب.....چنیوٹ
اتنی آنکھوں کا تھا آنکھوں میں ٹھہرنا مشکل
ہم نے اسی واسطے ہر اک سے چرائی آنکھیں
❁ عمران شیروانی.....لاہور
میں وہ جنس ہوں یہاں پیار کی جو ملے کسی کو کبھی کبھی
مجھے خرچ کر ذرا سوچ کر میں بہت ہی کم ہوں بچا ہوا
❁ اختر پرویز.....بہار کالونی، کراچی
پاؤں پھیلائے تو پھر دیکھی نہیں چادر ہم نے
تجھ کو چاہا تو پھر اوقات سے بڑھ کر چاہا
زیست آسان ہو بھی سکتی تھی لیکن ہم نے
تیری چاہت کو ہر اک بات سے بڑھ کر چاہا
❁ امتیاز احمد..... بھالیہ
تیرے اختیار میں کیا نہیں مجھے اس طرح سے نواز دے
مری سب دعائیں قبول ہوں مرے لب پہ کوئی دعا نہ ہو
❁ نعیم احمد.....بہاولپور
اس قدر ظرف تو رکھتے ہیں زمانے والے
زندگی چھین کر جینے کی دعا دیتے ہیں
❁ عامر خان آفریدی.....لاہور
دل کے ٹکڑے سرِ بازار لیے پھرتا ہوں
کاش ان سے تیری تصویر بنا دے کوئی
❁ محمد آذین رضوان.....کورنگی، کراچی
فاصلے ایسے بھی ہوں گے یہ کبھی سوچا نہ تھا
سامنے بیٹھا تھا میرے اور وہ میرا نہ تھا
آج اس نے درد بھی اپنے علیحدہ کر لیے
آج میں رویا تو میرے ساتھ وہ رویا نہ تھا
❁ سائرہ نواب.....پشاور
مری ٹوٹی ہوئی کلیو! مرے اترے ہوئے پھولو!
تمہاری ہی مہک سے ذہنِ انساں تازہ دم ہوگا
کھلے گا پھول بن کر، لہلہائے گا چمن بن کر
تمہاری یاد میں اشکوں سے جو رخسار نم ہوگا

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

❊ نادیہ ریاض.....نواب شاہ
پسِ دیوار ہے اک اور بھی دیوار بلند
ایک دیوار کے پیچھے کئی دیواریں ہیں
یہ احاطوں میں احاطے، یہ فصلیں، یہ حصار
وقت کی بات ہے، سب وقت کی رفتاریں ہیں

❊ طارق خان.....اسلام آباد
کچھ تو ہوتے ہیں محبت میں جنوں کے آثار
اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنادیتے ہیں

❊ پلوشہ خان.....ہری پور ہزارہ
بال بکھرا کے ٹوٹی تربت پر جب کوئی ماہ جبین روتی ہے
تو مجھ کو اکثر خیال آتا ہے کہ موت کتنی حسین ہوتی ہے

❊ صبا حمید.....ٹنڈو اللہ یار
تم نے ہی تو کہا تھا میں کشتی پہ بوجھ ہوں
آنکھوں کو اب نہ ڈھانپ مجھے ڈوبتا بھی دیکھ

❊ عاصم خان.....کراچی
دیکھ فرعون کے لہجے میں ہم سے بات نہ کر
ہم تو پاگل ہیں خداؤں سے الجھ جاتے ہیں

❊ جنید احمد ملک.....گلستانِ جوہر کراچی
ایک مٹی کا دیا لو کو سنبھالے کب تک
تیل بھی ختم ہے، طوفاں بھی امڈ آیا ہے

❊ مہتاب احمد.....حیدرآباد
دوستو! رختِ سفر باندھ کے لکھو کہ یہاں
جو پڑاؤ کے لیے رکتے ہیں، رک جاتے ہیں

❊ منیر شگفتہ.....وہاڑی
بھلا کسی کا ستاروں پہ کیا اجارہ چلے
زمانے بھر کے لیے وقف ہیں یہ قندیلیں

❊ اعتزاز ظفر.....اسلام آباد
چمن سے آئیں صدائیں، تو آئیں کانوں سے
کہ زیست قطرۂ شبنم بھی اور سنگ بھی ہے

❊ سلیم قادر.....میانوال رانجھا
صبح میں دیکھتا ہوں شام کے آثار ابھی
زیست ہے میرے لیے مستقل آزار ابھی

❊ شاہد علی.....فیصل آباد
مچل مچل کے ابھرتی ہے جب چراغ کی لو
میں سوچتا ہوں کہ ان لرزشوں میں تُو تو نہیں

❊ ثمینہ ثاقب.....ملتان
سمجھ میں نہ آسکا یہ طلسم لیل و نہار
کہ دن طلوع نہ ہو پائے اور شام آئے

❊ عاصمہ سعید.....سرگودھا
کیا بتلائیں کیا گزری تھی جب ہم کو معلوم ہوا
جن کو حقیقت ہم نے سمجھا وہ تو سب افسانے تھے

❊ عاطف علی.....میرپور خاص
آغاز میں کرتی ہوں سفر دیکھ کے جس کو
وہ شام کا تارا مجھے بھٹکائے بہت ہے

❊ وسیم خان.....چنیوٹ
عجیب لمحوں میں شام و سحر گزار آئی
اذیتوں کی کڑی دوپہر گزار آئی
سفر تھا دھوپ کا اور راستہ بھی شیشے کا
بدن تھا موم کا سو مختصر گزار آئی

❊ اسامہ جنید.....کراچی
من کی آگ میں جلتے ہیں اور انگاروں پہ چلتے ہیں
دشتِ بلا میں لوگ جو کوئی شہر بسانے آتے ہیں

❊ اسلم احمد.....سکھر
جاؤ جہاں بھی جانا چاہو، دل پہ دستک مت دینا
ایسی چاہت کیوں مانگے دل جس میں بس رسوائی ہے

❊ اسما فیصل.....ٹوبہ ٹیک سنگھ
راہِ وفا میں ہم کو اک احساس تھا خاطرداری کا
تجھ کو بھی ہم بھول گئے اور خود کو بھی نہ یاد کیا

کوپن برائے شمارہ جولائی 2017

محفل شعر و سخن

نام: ______________________

پتا: ______________________

WWW.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

نامراد

سلیم انور

عہدِ حاضر کی یہ خاصیت سامنے آئی ہے کہ اپنے سائے پر بھی اعتبار کرتے ہوئے اب انسان کو ہزار بار سوچ لینا چاہیے... وہ بھی ایک دوست کے روپ میں تھی مگر سایہ بن کر ساتھ رہنے والی اس شخصیت کا وار بڑا کاری نکلا ...اور جب اچانک حقیقت سے پردہ اٹھ جانے پر اپنے ہی مہربانوں سے ملاقات ہوئی تو اس پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے... اس کے باوجود اس نے اپنی دوستی نباہنے کا تہیہ کیا ہوا تھا۔

چوٹ کھا کر دوستی کی قدر کرنے والے دو بے وقوفوں کا اعزازِ نظر

رائٹرز ڈنر اس وقت اپنی پوری ترنگ میں تھا جب میں چیلسی کی جانب جھکی اور اسے بتایا کہ میری طبیعت خراب ہو رہی ہے اور مجھے جانا ہوگا۔

''اوہ امینڈا! کیا واقعی؟'' چیلسی کی بھوری آنکھیں میرے چہرے پر جم گئیں۔ مایوسی کے بادل اس کے چہرے پر منڈلانے لگے۔

ایسا ہی ہے مس پرفیکٹ مسٹری رائٹر..... میں جواب میں یہ کہنا چاہتی تھی لیکن میں نے نہیں کہا۔ اس لیے کہ میں نے اس کے لیے اس سے بہتر کسی چیز کا منصوبہ بنایا ہوا تھا۔ ایسا منصوبہ جس سے اس کے دستی بٹوے ...رقم میں قدرے کمی آ جاتی اور میرے دستی بٹوے کی رقم میں خاصا اضافہ ہو جاتا۔

چیلسی نے بھاری جیولری سے لدا اپنا ہاتھ میرے بازو پر رکھ دیا اور پوچھا۔ ''کیا میں تمہیں گھر چھوڑنے کے لیے ساتھ چلوں؟''

میں نے مصنوعی ممنونیت سے اس کی طرف دیکھا۔ ''تھینک یو۔ ہم دونوں کا یوں پہلے چلے جانا مناسب نہیں ہوگا۔''

حقیقت میں میرے منصوبے کا انحصار اس کے یہاں رکنے اور وہ تمام داد و تحسین سمیٹنے پر ہی تھا جو لوگ اس پر

WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

Downloaded From Paksociety.com

نچھاور کرنے کے پابند تھے۔

''ویل..... آل رائٹ۔ تو پھر تم سے گھر پر ملاقات ہوگی۔'' اس نے مجھے رخصت کرتے ہوئے کہا۔

ہمارا وہ گھر جہاں ہم کرائے پر رہتے تھے، بارہ میل کے فاصلے پر تھا۔ چیلسی کی تحریر کی غیر منصفانہ کامیابی میرے حواسوں پر چھائی ہوئی تھی۔ اب چونکہ وہ نوٹوں میں کھیل رہی تھی تو اس نے اپنے لیے شہر کے ایک متمول علاقے میں اپنا ذاتی مکان لینے کا ارادہ کرلیا تھا۔

اس کا مطلب تھا کہ مجھے بھی کرائے کا موجودہ مکان چھوڑنا پڑے گا لیکن مجھے اپنے لیے اس سے بھی چھوٹا مکان لینا پڑے گا۔ اپنی گھٹیا سی ملازمت اور تحریروں سے حاصل ہونے والی حقیری آمدنی سے میرے دیگر اخراجات مشکل ہی سے پورے ہوسکتے تھے۔

میں نے اپنی پرانی فورڈ بیک ڈرائیوے میں چھوڑ دی اور اپنا کام شروع کردیا۔

سب سے پہلے میں نے چیلسی کے بیڈروم کی کھڑکی کی اسکرین چاک کردی۔ پھر احتیاط کے ساتھ کپڑے میں لپٹی ہتھوڑی کی مدد سے کھڑکی کا شیشہ توڑ دیا۔ گو میں اتنی کامیاب مسٹری رائٹر نہیں تھی جتنی کہ چیلسی تھی لیکن میں اتنا ضرور جانتی تھی کہ کسی قسم کی مداخلت کو کیسے یہ ظاہر کیا جاسکتا ہے کہ یہ کسی بیرونی فرد نے سرانجام دی ہے۔

پھر عقبی دروازے سے گھر میں داخل ہونے کے بعد میں نے مکان میں موجود تمام درازیں نکال کر فرش پر گرادیں اور ان میں موجود تمام اشیا یوں بکھیر دیں جیسے کوئی منشیات کا عادی بے تابی سے نقدی کی تلاش میں رہا ہو۔

پھر میں نے چیلسی کی بیش قیمت جیولری کی ہر شے کپڑے کی اس پوٹلی میں بھر لی جس کا منہ ڈوری کھینچ کر بند کیا جاتا ہے۔ ساتھ ہی اپنی معمولی سی جیولری بھی اسی پوٹلی میں منتقل کردی۔ پھر اپنی کار کی جانب چل پڑی۔

میرا ارادہ یہ تھا کہ یہ پوٹلی میں اپنی کار کی ڈکی میں موجود اسپیئر وہیل کے نیچے خالی جگہ میں چھپادوں گی اور پھر گھر میں واپس آنے کے بعد پولیس کو فون کرکے ''نقب زنی'' کی واردات کی رپورٹ درج کرادوں گی۔

میں نے جوں ہی گھر سے باہر قدم رکھا تو سڑک پر ہیڈلائٹ کی روشنی دکھائی دی جو ہمارے ڈرائیوے کی جانب گھوم رہی تھی۔ میں فوراً ہی لپک کر واپس گھر میں چلی گئی۔ چیلسی وقت سے پہلے واپس آگئی تھی۔

اب میں کیا کروں؟

میں کچن کی جانب دوڑ پڑی۔ جیولری کی پوٹلی مجھے اپنے ہاتھوں میں بے حد بھاری محسوس ہورہی تھی۔ میں کچن سے گزر کر لیونگ روم میں آگئی۔ وہاں میری نظر بے ساختہ پتھر کے بنے ہوئے بڑے سے آتش دان پر پڑی اور میں اس کی جانب لپکی۔

میں نے ایک جھٹکے سے فائر اسکرین کو کھولا اور اندر جھک گئی۔ میں نے جیولری کی پوٹلی لکڑی کے تازہ لٹھوں اور آگ جلانے کی چھپٹیوں کے نیچے ٹھونس دی۔

عین اسی لمحے مجھے عقبی دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔

میں آتش دان سے باہر نکلی لیکن اس عجلت میں میرا سر آتش دان کے اوپری کنارے سے اتنی زور سے ٹکرایا کہ میری آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا اور میں لڑکھڑاتے قدموں سے کمرے سے نکل کر ہال وے کے دروازے کے پاس فرش پر جھول کھاتے ہوئے گر پڑی۔

''امینڈا!'' چیلسی چیخ پڑی۔

''چور.....'' میں بڑبڑائی۔ ''میری اچانک آمد نے اسے چونکا دیا۔ اس نے مجھ پر ضرب لگادی۔ میرا سر.....''

''تمہارے سر سے خون بہہ رہا ہے۔'' چیلسی نے کہا۔ ''یہیں ساکت لیٹی رہو۔ میں نائن ون ون پر کال کرنے جارہی ہوں۔''

☆☆☆

میں نے پولیس کو بیان دیتے ہوئے یہی اداکاری کی کہ جیسے میرے سر پر کسی ہتھیار سے ضرب لگائی گئی ہو۔ بیان کے بعد ایک ہینڈسم سا پیرامیڈک میرے زخم کی مرہم پٹی کرنے لگا۔

جب میں لیونگ روم میں پہنچی تو چیلسی وہاں موجود تھی۔ وہ مجھے بتانے لگی۔ ''سراغ رسانوں کا سربراہ سراغ رساں میکنزی ہال میں ہے اور فارنسک ٹیم کے ساتھ چیکنگ کررہا ہے۔''

اور وہ وہی کچھ دیکھ رہا ہوگا جو میں چاہتی تھی کہ وہ دیکھ لے، میں نے سوچا۔ گو حالات میرے اس منصوبے کے مطابق نہیں رہے تھے جیسا کہ میں نے ارادہ کیا ہوا تھا لیکن پرفیکٹ مسٹری رائٹر چیلسی اور گول چہرے والے اوور ویٹ سراغ رساں میکنزی کے پاس ایسا کوئی کلیو نہیں تھا کہ وہ مجھ پر کسی قسم کا شک کرسکتے۔

میری داستان اور ثبوت..... جیسے کہ ٹوٹی ہوئی کھڑکی کا شیشہ، بکھری ہوئی درازیں اور خالی جیولری بکس..... یہ ائر ٹائٹ پرفیکٹ چیزیں تھیں جن میں کسی قسم کا کوئی جھول نہیں تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

’’یقیناً تم اس کے عقبی دروازے سے فرار ہونے کے چند ہی لمحوں بعد پہنچی تھیں۔‘‘ میں نے چیلسی سے کہا۔ ’’خدا کا شکر ہے کہ تم اس وقت اپنے بیڈروم میں نہیں تھیں جب وہ ......‘‘ میں جملہ مکمل نہ کرسکی کیونکہ میری نگاہ بے ساختہ آتش دان کی کھلی ہوئی اسکرین پر جا پڑی تھی۔ جب میرا سر آتش دان کے اوپری کنارے سے ٹکرایا تھا تو چوٹ کھاتے ہی میرا دھیان اس جانب سے ہٹ گیا تھا اور مجھے آتش دان کی اسکرین کو بند کرنے کا موقع ہی نہیں مل سکا تھا۔

اگر چیلسی یا کسی اور نے اس جانب غور سے دیکھ لیا تو پھر......؟ میں فکر مند ہوگئی۔

’’امینڈا! کیا بات ہے؟‘‘ چیلسی نے اپنی توجہ اس جانب مرکوز کرتے ہوئے پوچھا جدھر میری نگاہیں جم کر رہ گئی تھیں۔ میرے حلق سے بے ساختہ ایک چیخ نکل گئی۔

چیلسی نے چونک کر استفہامیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

’’آؤچ! میرے سر میں درد کی ٹیسیں اٹھ رہی ہیں۔‘‘ میں نے چیلسی کو بتایا۔ ’’پلیز، کیا تم میرے لیے کچھ اسپرین لاسکتی ہو؟‘‘

’’کیوں نہیں۔‘‘ وہ یہ کہتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

میں نے لپک کر آتش دان کی فائر اسکرین بند کردی۔

جب چیلسی پانی کا گلاس اور اسپرین لے کر پلٹی تو سراغ رساں میکنزی اس کے ہمراہ تھا۔

جب میں نے اسپرین کی گولیاں پانی کے ساتھ نگل لیں تو سراغ رساں میکنزی گویا ہوا۔ ’’اب تم کیسا محسوس کررہی ہو، میڈم؟‘‘

’’میرا خیال ہے کہ میں ٹھیک ہوں۔‘‘ میں نے جواب دیا۔ ساتھ ہی اسے متاثر کرنے کے لیے ہلکے سے کپکپانے لگی۔

’’اوہ، تمہیں تو سردی لگ رہی ہے!‘‘ چیلسی نے کہا۔ ’’میں ٹھنڈک کم کرنے کے لیے آتش دان میں آگ جلادیتی ہوں۔‘‘ اس نے طاق پر سے ماچس کی ڈبیا اٹھائی اور آتش دان کی فائر اسکرین کھول دی۔

’’نہیں!‘‘ میں ایک دم بول پڑی۔ ’’میرا مطلب ہے اس کی ضرورت نہیں، چیلسی۔ مجھے سردی نہیں لگ رہی ہے۔ صرف درد ہورہا ہے اور......‘‘

لیکن چیلسی نے کھپچیوں کو آگ دکھادی جیسے میری بات سنی ہی نہ ہو۔ باقی الفاظ میرے حلق میں گھٹ کر رہ گئے۔ میری نظریں آتش دان میں بھڑکتے شعلوں پر جم سی گئیں۔

جیولری! میں اسی جیولری پر انحصار کیے ہوئے تھی کہ اسے فروخت کرکے ایک معقول رقم حاصل کرلوں گی لیکن اب......! یہ صحیح نہیں ہورہا تھا۔ مجھے موقع نہیں مل سکتا تھا کہ اب میں کچھ کرسکوں۔

’’کیا کوئی گڑبڑ ہے؟‘‘ سراغ رساں میکنزی نے میری کیفیت بھانپتے ہوئے پوچھا۔

’’گڑبڑ؟‘‘ میں اس کی جانب گھوم گئی۔ ’’یہ کس قسم کا سوال ہے؟ ہمیں لوٹ لیا گیا ہے۔ مجھ پر جسمانی حملہ ہوا ہے!‘‘

’’میرے خیال سے ایسی کوئی بات نہیں، میڈم!‘‘

’’کیا؟‘‘ میں پھٹ پڑی۔

’’تم نے ایک عمدہ کہانی سنائی تھی لیکن نہ ہی میں نے اور نہ ہی مس چیلسی نے اس پر یقین کیا ہے۔‘‘

’’کیوں؟‘‘ میں یہ کہتے ہوئے چیلسی کی جانب گھوم گئی اور میں نے جو دیکھا، وہ منظر مجھے پسند نہیں آیا۔

’’تم نے ایسا کیوں کیا، امینڈا؟‘‘ چیلسی نے پوچھا۔ اس کی آنکھیں افسردہ تھیں۔ ’’کیا یہ میری تحریر سے حسد کا نتیجہ تھا؟ کیا تمہیں رقم کے لیے جیولری کی ضرورت تھی؟‘‘

یہ کہہ کر چیلسی نے کاؤچ کے پیچھے ہاتھ بڑھایا اور جیولری سے بھری پوٹلی نکال کر مجھے دکھاتے ہوئے بولی۔

’’جب تمہارے سر کے زخم کی مرہم پٹی کی جارہی تھی تو اسی وقت میں نے یہ پوٹلی آتش دان میں سے نکال لی تھی۔ میں نے فائر پلیس کی اسکرین کھلی ہوئی دیکھی تو مجھے قدرے تجسس ہوا۔ اس لیے کہ وہ آج سہ پہر اس وقت تک بند تھی جب ہم ڈنر کے لیے گھر سے نکلے تھے۔ پھر کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے شیشے کے ڈرامے نے اس تجسس کو مزید تقویت پہنچادی......‘‘

’’ڈراما؟‘‘ الفاظ میرے حلق میں اٹک سے گئے۔

چیلسی نے اداسی سے اثبات میں سرہلا دیا۔ ’’ٹوٹے ہوئے شیشے کی کوئی بھی کرچی پیروں تلے دبنے سے قالین کے اندر دھنسی ہوئی نہیں پائی گئی جس کا مطلب تھا کہ کوئی شخص کھڑکی کے راستے کمرے میں اندر نہیں آیا تھا۔ کیا یہ درست ہے سراغ رساں میکنزی؟‘‘

بھاری بھرکم سراغ رساں تسلیم بجالایا۔ ’’بے شک۔‘‘

پھر میری جانب دیکھتے ہوئے اس نے اپنی ہتھکڑیاں نکال لیں۔ ’’میڈم! ایسا لگ رہا ہے کہ اب تمہارے ... کے منصوبے میں قدرے تبدیلی رونما ہورہی ہے۔ تمہیں ہمارے ساتھ پولیس اسٹیشن چلنا پڑے گا۔‘‘

میں نے چپ چاپ ہاتھ آگے بڑھا دیے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

قسط نمبر: 3

وقت

حُسام بٹ

موت کے کنویں میں بھی وقت جس کا اہم رکاب تھا، ایک ایسے پُرعزم بازی گر کی بازی گری ..... سنسنی خیز واقعات پر مشتمل ایک دلربا طویل داستان

وقت بادشاہ اور کائنات کی ہر شے اس کی رعایا ہے لیکن . . . اس کی نہ کوئی شکل اور نہ ہی وجود ہے۔ اس کے باوجود یہی وقت روپ بدل بدل کر سامنے آن کھڑا ہوتا ہے۔ جس کی گردش انسان کی زندگی میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ یہ ایک ہی پل میں کسی کو بادشاہت سے نوازتا ہے اور کسی کو زمین کی خاک چاٹنے پر مجبور کردیتا ہے۔ کبھی دن اور رات میں ڈھل کر عمر رواں کا نام پاتا ہے اور موسم کی طرح گزر جاتا ہے۔ کبھی مہربان اور مخلص دوست بن جاتا ہے اور کبھی سفاک دشمن کا کردار ادا کرتا ہے۔ کبھی محبت بن کر ہونٹوں پر ہنسی بکھیرتا ہے اور کبھی درد کی صورت آنسو بن کر دلوں میں گھاؤ ڈال دیتا ہے۔ چونکہ یہ کسی کا غلام نہیں اسی لیے کسی کی پروا بھی نہیں کرتا لیکن . . . اتنا سنگدل ہے جو اس کی پروا نہیں کرتا اسے ایسی مار مارتا ہے کہ پینے کو دو بوند پانی تک نہیں ملتا اور اتنا بے ایمان بھی ہے کہ جس پر اپنی مرضی سے مہربان ہوجائے اس کے لڑکھڑاتے قدموں سے بھی قدم ملا کر عروج عطا کرتا ہے مگر شرارت سے پلٹ کر ان کی طرف بھی دیکھتا ہے جنہیں وہ بیچ بھنور میں تنہا چھوڑ آتا ہے۔ وہ بھی ایک ایسے ہی مہربان لمحے کا اسیر تھا . . . جسے یہ تک خبر نہ تھی کہ وہ کون ہے اور کس خاندان سے وابستہ ہے۔ جس کی اپنی کوئی شناخت نہ تھی، اس کے باوجود اس کی داستانِ حیات میں چاہنے والوں کی کمی نہ تھی۔ دو مختلف معاشروں اور تہذیبوں کا حسین امتزاج . . . ایک ایسا سلسلہ جو برسوں یاد رہے گا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

Downloaded From
Paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

Downloaded From Paksociety.com

گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر ایک دراز قامت دبلا پتلا شخص براجمان تھا۔ اس نے فیلٹ ہیٹ لگا رکھا تھا۔ سینے کے اعتبار سے وہ ہڈیوں کا لم ڈھینگ ڈھانچا نظر آتا تھا۔ اس نے شیشہ گرا کر اپنی سرخ انگارہ آنکھوں سے میری طرف دیکھا پھر سپاٹ آواز میں بولا۔

''مسٹر علی! گیٹ ان۔''

وہ مجھے گاڑی کے اندر بیٹھنے کی دعوت دے رہا تھا اور میری نگاہ اس کے سراپا کا جائزہ لے رہی تھی' خاص طور پر اس کی خون بار آنکھیں، طوطے کی چونچ ایسی ناک اور معنی خیز تاثر والے ہونٹ میرے اندر کسی نامعلوم خوف کو جگا رہے تھے۔ اس کو دیکھ کر میرے ذہن میں فریڈی کروگر کا چہرہ ابھر آیا تھا۔ وہی فریڈی کروگر جو ''اے نائٹ میئر آن ایلم اسٹریٹ'' نامی فلم میں خون آشام اور وحشت ناک حرکتیں کرتا دکھائی دیتا ہے۔ جو لوگ ہارر انگلش موویز دیکھنے کے شوقین ہیں انہوں نے یقیناً ''اے نائٹ میئر آن ایلم اسٹریٹ'' کی سیریز دیکھی ہوگی۔ اس ہارر اینڈ سپر نیچرل فلم میں ٹین ایجرز پہلے خواب میں خود کو قتل ہوتا دیکھتے ہیں' پھر یہ واقعہ حقیقت میں فریڈی کروگر کے ہاتھوں بھی پیش آتا ہے۔

میں یک ٹک اس ڈرائیور کو گھور رہا تھا جو فریڈی کروگر سے گہری مشابہت رکھتا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کوئی ڈرائیور نہیں بلکہ بہ نفسِ نفیس فریڈی کروگر ہی ہو جو مجھے ورغلا کر اپنے ساتھ کہیں لے جانے کا ارادہ رکھتا ہو...... کسی ایسے ویران مقام پر جہاں وہ اپنے استخوانی پنجوں کے خطرناک نکیلے ناخنوں کی مدد سے مجھے انا للہ کر سکے۔ شاید یہ سناٹے دار' تاریک اور پراسرار ماحول کا اثر تھا یا پھر ''ایلم اسٹریٹ'' کے الفاظ کی فسوں گری یا پھر ان دونوں کے باہمی ملاپ کی کرشمہ کاری کہ میں چند لمحات کے لیے کسی سحر میں گرفتار ہو کر ''اے نائٹ میئر آن ایلم اسٹریٹ'' کے ماحول میں پہنچ گیا اور... ائرپورٹ بلیوارڈ کے خواب ناک پس منظر میں وہ ڈرائیور مجھے فریڈی کروگر ہی لگا تھا۔

میری یہ کیفیت عارضی بلکہ لمحاتی تھی۔ جلد ہی میں اس ٹرانس سے نکل آیا۔ اسی لمحے ڈرائیور کی آواز دوبارہ میری سماعت سے ٹکرائی۔ ''مسٹر علی! آئی ایم فرام ڈیلفینا۔ گیٹ ان پلیز......''

اس تسلی بخش تعارف کے بعد میں نے اس کی دعوت قبول کرلی۔ اگلے ہی لمحے میں سیاہ گاڑی کی عقبی نشست پر ''گیٹ ان'' ہو چکا تھا۔ اس مقام سے یوسٹن ولیم ہابی ائرپورٹ کا فاصلہ بہ مشکل دس منٹ کا تھا۔ یہ مسافت کم و بیش ڈیڑھ کلومیٹر کی تھی' اس مختصر سی ہمراہی میں ڈرائیور نے تمام اہم باتیں میرے گوش گزار کر دیں۔

اس نے مجھے اپنا نام نہیں بتایا اور نہ ہی میں نے اس سے پوچھا۔ اس نے مجھے آگاہ کیا کہ یوسٹن سے ڈیلس جانے کے لیے میری سیٹ یونائیٹڈ ائر لائن کی فلائٹ یو اے۔ ون سیون نائن میں بک ہو چکی ہے۔ اس نے مجھے میرا ''پی این آر'' نمبر بھی دیا اور کہا کہ ائرپورٹ پہنچ کر متعلقہ کاؤنٹر سے میں اپنا ٹکٹ حاصل کر سکتا ہوں۔ اس نے مجھے ہدایت کی کہ فلائٹ کی روانگی میں جتنا وقت باقی بچا ہے' وہ ائرپورٹ کے احاطے ہی میں گزارنا ہے اور ادھر ادھر کہیں جانے کی کوشش نہیں کرنا۔ اس منی اسپیچ کے بعد اس نے تصدیق طلب انداز میں میری طرف دیکھا پھر بے تاثر آواز میں بولا۔

''یو گیٹ مائی پوائنٹس مسٹر علی؟''

''یس...... آف کورس۔'' میں نے کہا پھر پوچھا۔ ''کیا یہ تمام ہدایات میڈم ڈیلفینا کی طرف سے ہیں؟''

وہ رکھائی سے بولا۔ ''ایسا ہی سمجھ لو۔''

میں نے اس فریڈی کروگر نما شخص کے کھردرے پن کا برا نہیں منایا اور اپنی اسپورٹ کار کی چابیاں اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ رکھ لو......''

''ان کی ضرورت نہیں۔'' وہ مشینی انداز میں بولا۔

کم بخت نے ایک لمحے کے لیے گاڑی کی چابیوں کی طرف دیکھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی تھی۔ میں نے جھنجلاہٹ آمیز لہجے میں کہا۔

''میری گاڑی ''ہابی ائرپورٹ اِن'' کی پارکنگ میں کھڑی ہے۔ اسے وہاں سے نکالنے کے لیے ان چابیوں کی ضرورت پیش آ سکتی ہے۔''

''میں نے کہا نا...... نہیں!'' وہ دوٹوک انداز میں بولا پھر میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اضافہ کیا۔ ''میرے اندازے کے مطابق' تمہاری سرخ اسپورٹ کار کو ہوٹل کی پارکنگ سے نکال لیا گیا ہے اور اس وقت وہ ایک محفوظ مقام کی جانب رواں دواں ہے۔''

اس کے دیکھنے کے انداز میں ایسی سرد مہری تھی کہ مجھے اپنے پورے وجود میں ایک خوف ناک ٹھنڈک سی اترتی محسوس ہوئی۔ بے ساختہ میرے ذہن میں یہ جملہ ابھرا...... ''میڈم ڈیلفینا تو میڈم ڈیلفینا' ڈیلفینا کا ڈرائیور سبحان اللہ!''

میں نے اس خواب پریشاں یعنی نائٹ میئر سے کسی قسم کی بحث کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اس نے ائرپورٹ پہنچ

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

کر گاڑی روکی تو میں چپ چاپ گاڑی سے اتر کر ائرپورٹ کی عمارت کے اندرونی حصے کی جانب بڑھ گیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ وہاں کچھ دیر رکا تھا یا فوراً ہی رخصت ہوگیا تھا کیونکہ میں نے ایک لمحے کے لیے بھی پلٹ کر اس کی طرف نہیں دیکھا تھا۔

میری فلائٹ صبح سات بیس کی تھی۔ گویا جہاز کی پرواز میں ابھی کافی وقت باقی تھا۔ میں نے سب سے پہلے متعلقہ کاؤنٹر پر جا کر اپنا ٹکٹ حاصل کیا پھر پیٹ پوجا کے لیے ائرپورٹ کے کیفے ٹیریا میں گھس گیا۔ اس وقت مجھے شدید بھوک کا احساس ستا رہا تھا۔

گزشتہ رات میں گیارہ بجے سونے کے لیے لیٹا تھا اور پروگرام کے مطابق' آج صبح سات بجے مجھے بیدار ہونا تھا لیکن مقررہ وقت سے پہلے یعنی رات دو بجے میری آنکھ کھل گئی تھی۔ یہ خلاف پروگرام بیداری کتنی سنسنی خیز تھی، اس کی تفصیل آپ جان چکے ہیں۔ میرے حالات میں جو نیا موڑ آیا تھا، اس نے مجھے ڈیلفینا کی مدد لینے پر مجبور کر دیا تھا اور اس وقت میں جو کچھ کر رہا تھا، یہ ڈیلفینا کی ہدایات کے عین مطابق تھا۔

میں نے ایک طویل جماہی لی اور ناشتے کا آرڈر دے دیا۔ دورانِ سفر میں یونائیٹڈ ائر لائن والے اپنے مسافروں کی خوب خاطر تواضع کرتے ہیں اور میری فلائٹ تو عین ناشتے کے وقت پر تھی لیکن اصل اہمیت ''ضرورت'' کی تھی۔ مجھے طلب ابھی محسوس ہو رہی تھی۔ میں مفتے کے ناشتے کے لیے تین چار گھنٹے بھوکا نہیں بیٹھ سکتا تھا۔

کیفے ٹیریا کا ماحول بہت پُرسکون تھا۔ یہاں بیٹھ کر میں ناشتے کے ساتھ ساتھ اپنے تازہ ترین حالات پر بھی غور کر سکتا تھا۔ میں نے پہلی فرصت میں ڈیلفینا کا سیل نمبر اپنے سیل فون میں محفوظ کر لیا۔ یہ وہی نمبر تھا جس پر تھوڑی دیر پہلے اس نے مجھ سے بات کی تھی۔ اس کے علاوہ ڈیلفینا کا ایک اور نمبر بھی میرے سیل فون میں محفوظ تھا۔ وہ گیلوسٹن کا لینڈ لائن نمبر تھا۔ میں نے پہلے اسی نمبر پر کال کی تھی لیکن مجھے بتایا گیا کہ میڈم ڈیلفینا اس وقت گیلوسٹن میں نہیں بلکہ ڈیلس میں تھی۔

ڈیلفینا کی ذات میرے لیے ایک معما بن کر رہ گئی تھی۔ وہ قدم قدم پر مجھے حیران کر رہی تھی۔ جب وہ پہلی مرتبہ مجھے لیک جنکسن کے ایک ہائی وے پر ملی تھی تو اس وقت میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ زندگی میں کبھی مجھے اس کی مدد کی ضرورت پیش آئے گی۔ ان لمحات میں ڈیلفینا نے مجھے جو کھلی پیش کش کی تھی' آج میں اس پیش کش سے فائدہ اٹھانے پر مجبور ہوگیا تھا۔ وقت بہت ہی سفاک اور ظالم ہے۔ جب یہ کسی پر پڑتا ہے تو لگ پتا جاتا ہے.....!

ڈیلفینا تو پراسرار شخصیت کی مالک تھی ہی' اس کے ساتھ کام کرنے والے بھی کچھ کم عجوبے نہیں تھے۔ رات دو بجے جب میں نے ڈیلفینا کی تلاش میں گیلوسٹن فون کیا تھا تو وہاں سان لوئی ریزورٹ میں اس کا آدمی ہشاش بشاش جاگ رہا تھا اور پھر یہ..... استخوانی پنجر..... فریڈی کروگر کا ہم شکل ڈرائیور بھی اپنی نوعیت کا ایک منفرد شاہکار تھا۔ اس کی ادائیں سپر نیچرل یعنی مافوق الفطرت تو نہیں تھیں تاہم انہیں معقول اور صحت مند بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔

میرا ذہن ڈیلفینا کو سمجھنے سے فی الحال قاصر تھا۔ مستقبل قریب یا مستقبل بعید میں میرے ساتھ کیا ہونے والا تھا، یہ صرف میرے مالک کو معلوم تھا۔ سردست میں حالات کے تیز و تند دھارے میں بہنے پر مجبور تھا اور ڈیلفینا کی طاقت مجھے ہر پل ایک نئی حیرت سے روشناس کرا رہی تھی۔ اس نے جس سرعت اور کمانڈ کے ساتھ مجھے یوسٹن سے ڈیلس پہنچانے اور میری اسپورٹ کار کو محفوظ مقام پر منتقل کرنے کا بندوبست کیا تھا اس سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ بڑے اختیار والی ایک دھانسو قسم کی لیڈی ہے۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ ڈیلس میں اس کے مزید جوہر مجھ پر کھلیں گے.....!

ڈیلفینا کے حوالے سے شارو نے جو تبصرہ کیا تھا، وہ الفاظ اب تک میرے ذہن میں محفوظ تھے۔ ڈیلفینا کے وزیٹنگ کارڈ پر نگاہ ڈالنے کے بعد شارو نے کہا تھا۔ ''اس کے کانٹیکٹ نمبر میں ''ڈبل'' کی تکرار ہے..... ایٹ ڈبل زیرو ڈبل فور فائیو ڈبل زیرو نائن زیرو..... جس سے لگتا ہے' یہ عورت ڈبل کراس قسم کی کوئی شے ہے۔''

ڈیلفینا سنگل کراس عورت تھی یا ڈبل، اس کا فیصلہ تو آنے والے وقت ہی نے کرنا تھا لیکن اس کے بارے میں سوچتے ہوئے آپوں آپ میرا دھیان شارو کی طرف چلا گیا تھا۔ شارو جب سے میری زندگی میں آئی تھی، ہنگاموں نے میرا دروازہ دیکھ لیا تھا۔ اسی کی خاطر میرا لیونارڈو سے پھڈا ہوگیا تھا اور پھر مارا ماری کا یہ سلسلہ اتنا آگے بڑھ گیا کہ میرے ہاتھوں لیونارڈو کا ایک خاص آدمی پیپلو اپنی جان سے چلا گیا۔ میں اس کی زندگی کا چراغ گل کرنے کا ہرگز ارادہ نہیں رکھتا تھا لیکن اس کی زبان کا قفل کھلوانے کے لیے مجھے سختی سے کام لینا پڑا تھا اور یہ ''سختی'' اس کے لیے جان لیوا ثابت ہوئی تھی۔ اس میں افسوس کا پہلو یہ تھا کہ میں پیپلو کی

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

زبان کھلوانے میں کلی طور پر کامیاب نہیں ہوا تھا۔ میں صرف اتنا ہی جان پایا تھا کہ لیونارڈو اس روز کیوبا چلا گیا تھا جس دن شارو منظر عام سے غائب ہوئی تھی۔ مجھے شک نہیں بلکہ یقین تھا کہ شارو کی گم شدگی میں لیونارڈو کا ہاتھ تھا لیکن میرے ہاتھوں عظیم الشان درگت بنوانے کے باوجود بھی پیبلو نے یہ نہیں بتایا تھا کہ لیونارڈو' شارو کو بھی اپنے ساتھ کیوبا لے گیا ہے۔ وہ اسی بات پر ڈٹا رہا تھا کہ وہ شارو کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ ہاں البتہ' اس نے یہ انکشاف کیا تھا کہ کارلوس، شارو سے متعلق تمام معلومات رکھتا تھا۔ کارلوس کے لیے پیبلو نے ''باس'' کا لفظ استعمال کیا تھا۔ تازہ ترین اطلاعات کے مطابق' اسی کارلوس نے لیک جیکسن کی پولیس پر دباؤ ڈال رکھا تھا کہ وہ سرخ اسپورٹ کار والے اس دراز قامت شخص کو جلد از جلد گرفتار کرے جس نے پیبلو کو موت کے گھاٹ اتارا تھا اور...... یہ دراز قامت شخص کوئی اور نہیں بلکہ میں تھا...... اسد علی!

جب میں پیبلو سے ''نمٹ'' کر اپنے اپارٹمنٹ آیا تھا تو اس وقت میں نے یہی سوچا تھا کہ اگلے روز کارلوس تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کروں گا تاکہ اس کی زبان سے شارو کا پتا ٹھکانا اگلوا سکوں لیکن پھر آئندہ صبح میری آنکھ کھلنے سے پہلے ہی حالات نے اتنی تیزی سے پلٹا کھایا تھا کہ میں کارلوس کو تلاش کرنے کے بجائے خود کو بچانے کے لیے لیک جیکسن سے بوسٹن پہنچ گیا تھا اور اب تھوڑی ہی دیر میں ڈیلس کے لیے پرواز کرنے والا تھا۔

شارو کے لیے تو میں فکر مند تھا ہی' علاوہ ازیں میں انکل سلطان کی طرف سے بھی پریشان تھا۔ وہ میرے سرپرست اور سچے خیرخواہ تھے۔ یہ بات میں ان کے علم میں لا چکا تھا کہ پیبلو میرے ہی ہاتھوں جہنم واصل ہوا تھا تاہم ابھی تھوڑی دیر پہلے اس کیس کی جو ڈویلپ منٹ دیکھنے میں آئی تھی، وہ انتہائی خطرناک تھی۔ اب تک میں محفوظ پوزیشن میں تھا لیکن تشویش کی بات یہ تھی کہ لیک جیکسن پولیس کو میرے حوالے سے بہت اہم معلومات حاصل ہو چکی تھیں جن کے سہارے ''ایل جے پی ڈی'' مجھ تک پہنچنے کی کوشش کر سکتی تھی۔ میں نے ڈیلفینا کے توسط سے اپنی تفیتی کا بندوبست ...... تو کرلیا تھا لیکن انکل سلطان ...... یہ خبر زیادہ دیر تک ان سے چھپنے والی نہیں تھی۔

میں نے بوسٹن میں لیٹ نائٹ اس نیوز کا فالو اپ دیکھا تھا تو یقیناً اگلی صبح یہ خبر بے سٹی میں انکل سلطان تک بھی پہنچنا تھی۔ میرے حوالے سے ایسے ہولناک انکشافات کے بعد ان کے دل و دماغ پر کیا گزرتی، اس کا تصور کر کے ہی مجھے وحشت ہونے لگی تھی۔ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی تھی ...... کچھ بھی ہو سکتا تھا...... کچھ بھی!

☆☆☆

یونائیٹڈ ائر لائن کے طیارے یوائے۔ ون سیون نائن نے اٹھاون منٹ فضا میں رہ کر تین سو تریسٹھ کلومیٹر کا فاصلہ طے کیا اور ٹھیک آٹھ بج کر اٹھارہ منٹ پر وہ ڈیلس لو فیلڈ ائرپورٹ پر لینڈ کر گیا۔ ائرپورٹ کے ضروری معاملات سے نمٹنے کے بعد میں نے ایک ٹیکسی ہائر کی اور اپنی منزل کی جانب روانہ ہو گیا۔

ڈیلفینا نے گزشتہ رات مجھے جو ایڈریس ٹیکسٹ کیا تھا، اس تک پہنچنا چنداں مشکل نہیں تھا۔ ڈیلی پلازا اور ایلم اسٹریٹ ڈیلس کی مشہور و معروف جگہیں تھیں کیونکہ ان کے ساتھ ایک ایسے شخص کی یادیں وابستہ تھیں جو کسی زمانے میں اس دنیا کا سب سے طاقتور انسان سمجھا جاتا تھا یعنی امریکا کا پینتیس واں صدر جے ایف کینیڈی۔

یہ ٹھیک ہے کہ جب کا یہ واقعہ ہے اس وقت میں اس دنیا میں موجود نہیں تھا۔ بائیس نومبر انیس سو تریسٹھ میری پیدائش سے بہت پہلے کا زمانہ ہے۔

ڈیلی پلازا کی ایک اپنی تاریخ بھی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہودیوں کی فری میسن تنظیم نے ڈیلس میں اپنا پہلا مرکز اسی پلازا میں قائم کیا تھا۔ پلازا سے ملحق، پندرہ ایکڑ پر مشتمل ایک وسیع و عریض ''ڈیلس سٹی پارک'' بھی ہے' جہاں کی رونق اور چہل پہل دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ ائرپورٹ سے ڈیلی پلازا تک ترپن کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے کے دوران میں' میں ماضی کے دھندلکوں میں جھانکتا رہا اور وقت گزرنے کا ذرا بھی احساس نہیں ہوا۔ ٹھیک دس بجے ٹیکسی نے مجھے ڈیلی پلازا کے سامنے ایلم اسٹریٹ پر ڈراپ کر دیا۔ یہ ڈیلس کا مصروف ترین ڈاؤن ٹاؤن کا علاقہ ہے جہاں پر تین اسٹریٹ آپس میں باہمی ملاپ کرتی ہیں یعنی ایلم اسٹریٹ، مین اسٹریٹ اور کمرشل اسٹریٹ۔ ڈیلی پلازا، ایلم اسٹریٹ اور مین اسٹریٹ کے وسط میں استادہ ہے اور ...... ڈیلس سٹی پارک نے اسے اپنے گھیرے میں لے رکھا ہے' کسی مہربان ماں کے مانند......!

میں ابھی ڈیلی پلازا سے چند میٹر دور ہی تھا کہ اس بلڈنگ کی چھت پر ''ہرٹز رینٹ اے کار'' کا بورڈ نظر آ گیا۔ سرخ رنگ سے ''ہرٹز'' بہت نمایاں لکھا گیا تھا اور نیچے پیلے رنگ سے ''رینٹ اے کار'' کے الفاظ لکھے دکھائی دیتے

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

تھے۔ ساتھ ہی شیورلٹ بھی لکھا ہوا تھا۔ اسی پلیٹ کے اوپر ایک ڈیجیٹل ٹائمر بھی نصب کیا گیا تھا جو دیکھنے والوں کو کافی فاصلے سے وقت بتا دیتا تھا۔ مذکورہ کلاک میں اس وقت صبح کے دس بجے تھے۔ میں ٹیکسی سے نکل کر ڈیلی پلازا کی انٹرنس کی جانب بڑھ گیا۔

ڈیلی پلازا کے کل سات فلور ہیں اور میری منزل یعنی یہ میوزیم چھٹے فلور پر بنایا گیا ہے۔ اسی لیے اسے ''سکستھ فلور میوزیم'' کہا جاتا ہے۔ گہرے بھورے رنگ کی اس بلڈنگ کے داخلی دروازے پر سفید سنگِ مرمر لگا ہوا ہے اور پیشانی پر ''ڈیلس کاؤنٹی ایڈمنسٹریشن بلڈنگ'' کے الفاظ دکھائی دیتے ہیں۔ میں لفٹ کے ذریعے چھٹے فلور پر پہنچ گیا جہاں پر یہ میوزیم قائم ہے۔

ڈیلی پلازا میں واقع ''دی سکستھ فلور میوزیم'' پیر کو دوپہر بارہ بجے سے شام چھ بجے تک کھلا رہتا تھا۔ ہفتے کے باقی دنوں میں صبح دس بجے سے شام چھ بجے تک یہاں پر داخلے کی اجازت تھی۔ داخلہ ٹکٹ جوانوں کے لیے سولہ ڈالر کا تھا' اس کے علاوہ چلڈرن اور سینئر سٹیزنز کو کم مالیت میں ٹکٹ مل جاتا تھا۔

میں منگل کی صبح ڈیلی پلازا پہنچا تھا لہٰذا میوزیم مجھے کھلا ہوا ملا۔ میوزیم کے اندر داخل ہونے سے پہلے میں نے اپنا سیل فون نکال لیا۔ ڈیلفینا نے مجھے جو ٹیکسٹ کیا تھا، اس کے اینڈ پر ایک فون نمبر بھی دیا گیا تھا۔ وہ لینڈ لائن کا نمبر تھا۔ میں نے اپنے سیل فون سے وہ نمبر پنچ کیا۔ دوسری ہی گھنٹی پر کال ریسیو کر لی گئی۔

''دس از سکستھ فلور میوزیم!'' دوسری جانب بولنے والی نے شائستہ لہجے میں کہا۔ ''وھاٹ کین آئی ڈو فار یو؟''

''آئی وانٹ ٹو سی میڈم ڈیلفینا۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔

''یور نیم پلیز؟'' پوچھا گیا۔

''اسد علی!'' میں نے جواب دیا۔ ''فرام یوسٹن۔''

''ہولڈ آن پلیز!'' دوسری طرف سے کہا گیا۔

مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ چند سیکنڈ کے بعد وہی نسوانی آواز دوبارہ میری سماعت سے ٹکرائی۔

''مسٹر علی! آپ میوزیم کی لائبریری میں تشریف لے جائیں۔ مسٹر الیکس وہاں آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔''

''مگر میں تو ڈیلفینا سے ملنے آیا ہوں.....'' میں نے نیم احتجاجی انداز میں کہا۔

''مسٹر الیکس آپ کو میڈم تک پہنچا دیں گے۔'' وہ دو ٹوک انداز میں بولی۔

اس کے انداز نے مجھے بتا دیا تھا کہ اس سے مزید بات نہیں ہو سکتی۔ میں نے فون بند کیا اور میوزیم کی لائبریری کی جانب بڑھ گیا۔

لائبریری میں اس وقت صرف ایک ہی شخص موجود تھا۔ یہ ایک اتفاق تھا یا کوئی منصوبہ بندی' سردست میں اس بارے میں اظہارِ رائے نہیں کر سکتا تھا۔ سبز آنکھوں اور درمیانے قد والا وہ سوٹیڈ بوٹیڈ شخص مجھ پر نگاہ پڑتے ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا پھر زیرِ لب مسکراتے ہوئے مستفسر ہوا۔

''اسد علی؟''

''یس..... آئی ایم۔''

اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''گڈ مارننگ مسٹر علی!''

''گڈ مارننگ!'' میں نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے جواباً کہا۔ ''کیا میں مسٹر الیکس سے شرفِ ملاقات حاصل کر رہا ہوں؟''

''شیور!'' اس نے گرم جوشی سے میرا ہاتھ دبایا اور اضطراری لہجے میں بولا۔ ''آپ میرے ساتھ آئیں۔'' میں چپ چاپ اس کے ساتھ ہو لیا۔

الیکس مجھے مختلف راہ داریوں میں سے گزار کر میوزیم کے عقبی حصے میں لے آیا پھر ایک لفٹ کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے اس نے مجھ سے پوچھا۔

''آپ کا سفر کیسا رہا؟''

''شان دار!'' میں نے مختصر جواب دیا۔

''کوئی دقت یا پریشانی تو نہیں ہوئی یہاں تک پہنچنے میں؟''

میں نے نفی میں گردن ہلائی اور کہا۔ ''بالکل نہیں۔''

''ویٹس گڈ۔'' یہ کہتے ہوئے وہ لفٹ کے اندر داخل ہو گیا۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی۔

یہ وہ لفٹ نہیں تھی جس کے ذریعے میں نیچے سے سکستھ فلور پر پہنچا تھا۔ یہ بالکل ایک الگ تھلگ لفٹ تھی جس سے ''پرائیویٹ اینڈ کانفیڈنشل'' کا تاثر ملتا تھا۔ اب تک ڈیلفینا کی ذات کے حوالے سے مجھے جو تجربات ہوئے تھے، ان کے ہر زاویے سے اسرار اور تجسس جھلکتا تھا لہٰذا اب میں نے حیران ہونا چھوڑ دیا تھا۔

لفٹ بڑی تیز رفتاری سے نیچے کی جانب آئی اور ایک مقام پر آ کر ٹھہر گئی۔ لفٹ کے اندر مختلف فلورز کی نشان دہی کرنے والی ڈیجیٹل اسکرین مجھے کہیں نظر نہیں آئی تھی اور نہ ہی فلورز نمبر والا پینل دکھائی دیا تھا۔ اس کا ایک ہی مطلب

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

تھا کہ مذکورہ لفٹ ''سکستھ فلور میوزیم'' سے کسی خاص فلور تک آمدورشد کے لیے ہی استعمال ہوتی تھی۔ اغلب امکان یہی تھا کہ لفٹ گراؤنڈ فلور پر رکی ہوگی۔

جب الیکس نے لفٹ کا دروازہ کھولا تو میرے ذہن کو ایک جھٹکا لگا۔ ہم اس وقت ڈیلی پلازا کے بیس منٹ میں تھے۔ بلڈنگ کے تہ خانے کے ایک حصے میں چند گاڑیاں کھڑی دکھائی دیں، گویا یہ حصہ پارکنگ کے لیے مختص تھا .....اور وہ بھی مخصوص افراد کے لیے۔

الیکس ایک قیمتی گاڑی کی جانب بڑھتے ہوئے بولا۔ ''آجائیں مسٹر علی۔''

میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ ''کیا میڈم ڈیلی پلازا میں موجود نہیں ہیں؟''

''وہ اپنے بنگلے پر ہیں۔'' اس نے بتایا۔ ''میں آپ کو وہیں لے کر جارہا ہوں۔''

''اوہ.....'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔ ''مطلب ابھی ہمیں مزید آگے کہیں اور جانا ہوگا؟''

''زیادہ دور نہیں۔'' وہ گاڑی کو پارکنگ میں سے نکال کر مین روڈ پر لاتے ہوئے بولا۔ ''بس نو دس کلومیٹر کا سفر ہے۔ ہم پریسٹن ہالو جارہے ہیں۔''

میں نے ''پریسٹن ہالو'' کا نام سن رکھا تھا۔ یہ ڈیلس کا سب سے پوش رہائشی علاقہ ہے۔ یہاں پر بہت بڑے سیاسی راہ نما، بزنس مین اور اسی مرتبے کے افراد رہائش اختیار کرنا افورڈ کرسکتے ہیں۔ کیلی فورنیا میں جو مقام سن ویلی اور بیورلی ہلز کی رہائش کو حاصل ہے، بالکل ویسی ہی یا اس سے قدرے زیادہ اہمیت اور قدر و قیمت ڈیلس کے ''پریسٹن ہالو'' کی ہے۔ اگر ڈیلفینا پریسٹن ہالو میں قیام پذیر تھی تو پھر اس کے اثر و رسوخ کو شک کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاسکتا تھا۔ مجھے یقین ہو چلا تھا کہ وہ ان حالات میں ضرور میری مدد کرے گی۔ اس سوچ سے مجھے گہرا اطمینان محسوس ہوا تھا۔

ڈیلس کاؤنٹی ٹیکساس کے بالائی یعنی شمالی حصے میں واقع ہے اور ہم اس وقت ڈاؤن ٹاؤن ڈیلس سے شمال کی سمت بڑھ رہے تھے۔ ڈاؤن ٹاؤن سے پونے دس کلومیٹر شمال میں ''پریسٹن ہالو'' کا پوش علاقہ ہے۔ ہماری گاڑی ''پریسٹن ڈرائیو'' پر تیرتے ہوئے اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھی۔ پریسٹن ڈرائیو کی حیثیت شہ رگ ایسی ہے اور یہ دو اہم سڑکوں ''نارتھ ویسٹ ہائی وے'' اور ''ایل بی جے فری وے'' کے قلب سے گزرتی ہے۔ ایل بی جے فری وے کا نام ایک سابق امریکی صدر لنڈن بی جانسن سے منسوب ہے۔ پریسٹن ڈرائیو کو ''گولڈن کوریڈور آف ڈیلس'' بھی کہا جاتا ہے۔

اچانک میرا سیل فون جاگ اٹھا۔ میں نے ڈسپلے پر نگاہ ڈالی تو وہاں انکل سلطان کا نام چمک رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے میرے جی میں آئی کہ کال اٹینڈ کرلوں۔ اگلے ہی لمحے میرے ذہن میں خیال ابھرا' ابھی نہیں۔ پہلے ڈیلفینا سے مل لو پھر جو بھی صورتِ حال ہوگی اس کے تناظر میں انکل سے بات کرنا چاہیے۔ میں نے اس خیال کو ترجیح دی اور انکل کی کال کو کٹ کردیا۔

انہوں نے دوبارہ کال کی، میں نے ایک مرتبہ پھر کال کاٹ دی۔

میں اگر چاہتا تو اپنے سیل فون کو سائلنٹ بھی کرسکتا تھا لیکن اس طرح انکل میری طرف سے تشویش میں مبتلا ہوجاتے کہ میں ان کی کال اٹینڈ کیوں نہیں کررہا۔ میں نے دو مرتبہ ان کی کال کٹ کرکے یہ تاثر دیا تھا کہ میں فی الحال فون سننے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ اس کا یہ بھی مطلب تھا کہ میں خود ہی تھوڑی دیر کے بعد ان سے رابطہ کروں گا۔

الیکس نے دورانِ سفر میں مجھ سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ وہ بہت ہی مستعد اور بردبار شخص تھا۔ پونے دس کلومیٹر کے سفر کے بعد ہم پریسٹن ہالو کے رہائشی حصے میں پہنچ گئے۔ الیکس نے ایک عالی شان بنگلے کے سامنے گاڑی روک دی۔ مذکورہ بنگلے کے گیٹ کی بغل میں دیوار پر ''سارا ملر'' کے نام کی تختی لگی ہوئی تھی۔ مجھے گاڑی میں بیٹھا چھوڑ کر وہ نیچے اترا اور بنگلے کا گیٹ کھولنے کے بعد دوبارہ گاڑی میں آگیا۔ اس کی اس سلیف سروس نے مجھے کافی متاثر کیا۔

گاڑی بنگلے کے پورچ میں رکی اور ہم دونوں گاڑی سے باہر نکل آئے۔ الیکس مجھے مختلف راہ داریوں سے گھمانے کے بعد پُرتعیش لیونگ روم میں لے آیا پھر ایک آرام دہ صوفے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''تشریف رکھیں!''

بنگلے کے اندر چھائے سناٹے اور خاموشی سے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہاں میرے اور الیکس کے سوا اور کوئی بندہ بشر موجود نہیں۔ شاید اس نے میری آنکھوں کو پڑھ لیا تھا، میرے کسی سوال سے پہلے ہی وہ بول اٹھا۔

''میں میڈم کو آپ کی آمد کی اطلاع کرنے جارہا ہوں۔''

میں نے محض سر کو اثباتی جنبش دینے پر اکتفا کیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

الیکس کی بات سے یہ تو ظاہر ہو گیا تھا کہ ڈیلفینا اس بنگلے کے اندر موجود ہے۔ میں تنقیدی نگاہ سے لیونگ روم کی آرائش وزیبائش کا جائزہ لینے لگا۔

وہ ایک کنگ سائز لیونگ روم تھا۔ میرے اندازے کے مطابق' وہاں بہ یک وقت تیس چالیس افراد بیٹھ کر میٹنگ کر سکتے تھے۔ مہمانوں کے بیٹھنے کے لیے دیواروں سے تھوڑا فاصلہ رکھ کر آرام دہ بیش قیمت صوفے لگائے گئے تھے۔ صوفوں کے بیچ میں فرش پر ایک عالی شان قالین بچھا ہوا تھا اور اس قالین کے اوپر منقش گلاس ٹاپ چوبی میز بھی رکھی ہوئی تھی۔ ایک دیوار پر بڑا سا ''ایل ای ڈی'' اسکرین نظر آ رہا تھا۔ لیونگ روم کی سینٹر ٹیبل پر ایک لیپ ٹاپ بھی موجود تھا۔ اس کمرے کی تزئین سے صاحبِ خانہ کے اعلیٰ ذوق ہونے کا پتا چلتا تھا۔

مجھے زیادہ دیر تک ڈیلفینا کا انتظار نہیں کرنا پڑا۔ میں لیونگ روم کا جائزہ لینے میں مصروف ہی تھا کہ وہ وہاں پہنچ گئی۔ ڈیلفینا نے جینز پر فی شرٹ پہن رکھی تھی تاہم اس سادہ سے لباس میں بھی اس کی شخصیت کا تاثر بول رہا تھا۔ ہسپانوی لوگ ویسے بھی بہت پُرکشش اور جاذب نظر ہوتے ہیں۔ ڈیلفینا نے اپنی گھنیری زلفوں کو کھلا چھوڑ رکھا تھا۔

یہ ڈیلفینا سے میری دوسری ملاقات تھی۔ پہلی ملاقات لیک جیکسن کے ایک ہائی وے پر ہوئی تھی۔ وہ ملاقات اتنی مختصر تھی کہ میں اس پر توجہ نہیں دے پایا تھا لیکن میں اس وقت اس ہسپانوی دوشیزہ کے گھر میں بیٹھا تھا لہٰذا اس کا رعب حسن مجھ پر اثر انداز ہو رہا تھا۔ اس پر نگاہ پڑتے ہی میں یک بارگی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''بیٹھو..... بیٹھو.....!'' وہ ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے مترنم آواز میں بولی۔

میں بیٹھ گیا۔ وہ ایک شانِ بے نیازی سے چلتے ہوئے میرے سامنے والے صوفے پر براجمان ہو گئی پھر میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مستفسر ہوئی۔

''مجھ تک پہنچنے میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟''

اس کے استفسار سے گہری اپنایت جھلکتی تھی۔ میں نے بھی دوستانہ انداز میں کہا۔ ''میں اس وقت جن حالات سے گزر رہا ہوں، اس میں چھوٹی موٹی تکلیف کا احساس کہاں ہوتا ہے مگر ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی.....!''

''کون سی بات؟'' وہ سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگی۔

''جب ہماری ملاقات پریسٹن ہالو کے اس بنگلے میں ہونا تھی تو پھر مجھے ڈیلی پلازا کیوں بلایا گیا؟'' میں نے اپنی الجھن کو بیان کرتے ہوئے کہا۔ ''اس گھماؤ پھراؤ کی آخر ضرورت کیا تھی؟''

''ضرورت تھی!'' وہ دوٹوک انداز میں بولی۔ ''میں اگر چاہتی تو الیکس کو ائرپورٹ بھیج کر تمہیں ریسیو کروا سکتی تھی۔ وہ تمہیں ائرپورٹ سے سیدھا یہاں لے آتا لیکن میں نے ایسا نہیں کیا.....'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے رکی اور لمحاتی توقف کے بعد دوبارہ گویا ہوئی۔

''میں نے جو کچھ کیا اس کا ایک خاص مقصد ہے۔ بعض اوقات حالات ایسے ہوتے ہیں کہ ہمیں کئی قسم کی احتیاطیں کرنا پڑتی ہیں۔ تم اس وقت جس سچویشن میں پھنسے ہوئے ہو، اس کا تقاضا یہی تھا۔ اینی ہاؤ..... تم فکر نہیں کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''تھینکس!'' میں نے ممنونیت بھرے لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ''اب مجھے کیا کرنا ہے؟''

''اس بات کا فیصلہ تھوڑی دیر کے بعد کرتے ہیں کہ تمہیں کیا کرنا ہے اور مجھے کیا کرنا ہے۔''

وہ معنی خیز انداز میں بولی۔ ''پہلے ہم لنچ کریں گے۔ باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔''

''مجھے بھوک نہیں ہے۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''تم فریش ہو جاؤ۔'' وہ لیونگ روم سے ملحقہ واش روم کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''سفر کی تھکن اترے گی تو تمہاری بھوک خود بہ خود چمک اٹھے گی۔ جب تک میں کھانا لگواتی ہوں۔''

اس نے ایسے دل آویز انداز میں مجھے ''فریش'' ہونے کے لیے کہا تھا کہ میں انکار نہ کر سکا۔ میں نے سیل فون کو سائلنٹ پر سیٹ کیا اور واش روم میں گھس گیا۔

☆☆☆

کھانا بہت لذیذ اور پُرتکلف تھا۔ میں نے خوب سیر ہو کر کھایا۔ ڈیلفینا نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔ فریش ہونے کے بعد میری بھوک بھڑک اٹھی تھی اور میں نے ڈٹ کر پیٹ پوجا کی تھی۔ لنچ سے فارغ ہونے کے بعد ہم دوبارہ لیونگ روم میں آ بیٹھے اور ہمارے درمیان باقاعدہ گفتگو کا سلسلہ چل نکلا۔

''کیا تم اس بنگلے میں اکیلی رہتی ہو؟'' میں نے سوال کیا۔

''ہاں..... فی الحال تو اکیلی ہی ہوں۔'' اس نے گول مول جواب دیا۔

''جہاں تک میرا اندازہ ہے' یہ بنگلا بھی تمہارا نہیں۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

میں نے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''میں نے باہر ''سارا ملر'' کی نیم پلیٹ لگی دیکھی ہے۔''

''یہ بنگلا سارا ملر ہی کا ہے۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''سارا میری بہت اچھی دوست ہے۔ وہ ڈیلس کاؤنٹی کی میئر بھی رہ چکی ہے۔ آج کل وہ اپنی فیملی کے ساتھ آسٹریلیا گئی ہوئی ہے اور اس کا یہ بنگلا عارضی طور پر میرے تصرف میں ہے۔''

''تمہارا اپنا ٹھکانا کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔ ''میرا مطلب ہے، تم کہاں رہتی ہو......؟''

''میں کہیں نہیں رہتی اور میں ہر جگہ رہتی ہوں۔'' اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

''میں سمجھا نہیں۔'' میں نے الجھن زدہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی شخص کہیں بھی نہ رہتا ہو اور وہ ہر جگہ موجود بھی ہو۔ یہ تو خدائی صفت ہے۔''

وہ میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے الٹا مجھ سے پوچھ بیٹھی۔ ''علی! کیا تم نے زمینی خدا کے بارے میں سنا ہے؟''

''ہاں سنا ہے۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔

''لیکن یہاں زمینی خدا کا کیا تذکرہ؟''

''تم نے خود ہی خدا کا ذکر نکالا ہے تو میں نے پوچھ لیا۔'' وہ سرسری انداز میں بولی۔ ''اینی ہاؤ...... ہمیں اپنے ٹاپک پر آجانا چاہیے۔''

''اوکے......'' میں نے سر کو اثباتی جنبش دی۔

''علی! تم اس وقت دو زاویوں سے پریشان ہو۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ''نمبر ایک، تمہاری دوست شارو غائب ہو چکی ہے۔ نمبر دو، لیک جیکسن پولیس ڈیپارٹمنٹ کو تمہاری تلاش ہے۔ وہ پیبلو کے قاتل کی حیثیت سے تمہیں کھوج رہے ہیں۔ ایم آئی رائٹ؟''

''یس، ایبسولیوٹلی رائٹ!'' میں نے کہا۔

''اور ان دو زاویوں میں اہمیت کے لحاظ سے شارو تمہاری ترجیح ہے۔'' وہ بہ دستور میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ ''میں غلط تو نہیں کہہ رہی؟''

''نہیں ...... تم میرے جذبات کی عکاسی کرتے ہوئے بالکل درست انداز میں سوچ رہی ہو۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''شارو کی بازیابی میرے نزدیک زیادہ اہمیت کی حامل ہے اور میں نے اسی سلسلے میں تم سے مدد مانگی ہے۔''

''تم نے مدد مانگی ہے تو میں ضرور تمہاری مدد کروں گی مگر اس سے پہلے چند باتیں طے ہو جانا ضروری ہے۔'' وہ ٹھوس انداز میں بولی۔

''مثلاً کون سی باتیں طے پانا ضروری ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ بھی بتا دوں گی۔'' وہ سرسری انداز میں بولی۔ ''تمہارے نزدیک کون سی بات زیادہ اہمیت کی حامل ہے، یہ تمہارا ذاتی مسئلہ ہے مگر میں سمجھتی ہوں کہ تمہارے دونوں ایشوز ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں اور ان دونوں مسائل کو ایک ساتھ ہی حل ہونا چاہیے۔''

''ٹھیک ہے، جیسے تم مناسب سمجھو۔'' میں نے تائیدی انداز میں کہا۔

''گفتگو کو آگے بڑھانے سے پہلے میں تمہیں کچھ دکھانا چاہتی ہوں۔'' اس نے لیپ ٹاپ کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اس کے بعد ہی ہم صحیح سمت میں معاملات طے کرسکیں گے۔''

میں خاموشی سے اس کی حرکات و سکنات کا مشاہدہ کرنے لگا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ مجھ سے کس قسم کے ''معاملات'' طے کرنے کا ارادہ رکھتی تھی اور یہ سب جاننے کے لیے اس کا جائزہ لینا ضروری تھا۔ میں اس کی جانب متوجہ ہوگیا۔

اس نے لیپ ٹاپ کو اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا پھر اس کے ساتھ مصروف ہوگئی۔ مذکورہ لیپ ٹاپ کیبلز کے ذریعے دیوار گیر ایل ای ڈی سے کنیکٹ تھا۔ اگلے ہی لمحے ایل ای ڈی روشن ہوگیا۔ ڈیلفینا کی مخروطی انگلیاں کی بورڈ پر ہنر مندی کے جوہر دکھانے لگیں تو مجھے چونکنا پڑا۔ ایل ای ڈی پر ایک مانوس چہرے کو دیکھ کر میرے ذہن کو جھٹکا سا لگا تھا۔

''یہی تمہاری دوست شارو ہے نا......؟'' ڈیلفینا نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

''بالکل یہ شارو ہی ہے۔'' میں نے بے ساختہ کہا۔

''مگر اس کی پک تمہارے پاس کیسے آگئی اور...... شارو اس وقت ہے کہاں؟''

شارو کی تصویر کو ڈیلفینا کے لیپ ٹاپ میں دیکھ کر میں حیران رہ گیا تھا۔ اس کا اثر و رسوخ ایک اور کہانی سنا رہا تھا۔ اس نے میرے سوال کے جواب میں کہا۔

''میرے اپنے ذرائع ہیں جن کو استعمال کرکے میں اپنے کام کو آسان بنا لیتی ہوں۔ میرے ساتھ کچھ وقت گزارو گے تو رفتہ رفتہ تمہیں میری طاقت کا اندازہ ہو جائے گا۔''

میں نے اس کی بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا تو وہ سلسلہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

کلام کو جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''البتہ میں تمہارے سوال کا جواب ضرور دوں گی۔ تمہاری دوست شارو اس وقت (Casa Blanca) کا سابلانکا میں ہے۔''

''کا سابلانکا.....'' میں ایسے اچھلا جیسے میں نے بجلی کے ننگے تار کو چھو لیا ہو۔ ''یہ تو مراکش کا ایک شہر ہے۔ کیا شارو کو مراکش کے ساحلی شہر کا سابلانکا پہنچا دیا گیا ہے؟''

''نہیں۔'' وہ پوری قطعیت سے بولی۔ ''یہ راکش والا کا سابلانکا نہیں ہے۔''

''پھر کون سا کا سابلانکا ہے؟'' میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔

''یہ کا سابلانکا کیریبین سی میں واقع جزیرہ نما ملک کیوبا کا ایک شہر ہے۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''کا سابلانکا کیپٹل ہوانا کے ساتھ لگا ہوا ہے اور تمہاری دوست فی الحال کا سابلانکا کے نزدیک ایک علاقے ماریانو میں ہے۔''

پھر اس نے مجھے بتایا کہ کیوبا میں چونسٹھ فی صد آبادی گوروں کی اور دس فیصد سیاہ فام کی ہے جبکہ باقی چھبیس فی صد افراد مولیٹو کہلاتے ہیں۔ گورے اور کالے والدین کے ملاپ سے پیدا ہونے والی مخلوط نسل مولیٹو کہلاتی ہے۔ سیاہ فام اور مولیٹو میں سے اکثر کا تعلق افریقا خصوصاً مراکش سے ہے لہٰذا ایک کا سابلانکا کیوبا کے اندر بھی آباد ہے۔

مجھے کا سابلانکا سے زیادہ دلچسپی شارو سے تھی لہٰذا میں نے اسی سے متعلق سوال کیا۔ ''تم یہ کیوں کہہ رہی ہو کہ شارو فی الحال ماریانو یعنی کا سابلانکا میں ہے۔ کیا اسے وہاں سے بھی کہیں اور شفٹ کیا جانے والا ہے؟''

''تم بالکل درست خطوط پر سوچ رہے ہو۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''میری اطلاعات کے مطابق' چند روز میں شارو کو کا سابلانکا سے ناسو منتقل کر دیا جائے گا۔''

''ناسو!'' میں چونک اٹھا۔ ''یہ تو بہاماز کا کیپٹل ہے۔ کیوبا اور بہاماز بہت قریب واقع ہیں۔''

''دی بہاماز نامی ملک بحرا و قیانوس میں میامی اور کیوبا کے درمیان مگر ذرا ہٹ کر مشرق میں واقع ہے۔'' اس نے کہا۔ ''اس کے تین شہر بہت زیادہ اہمیت کے حامل ہیں جن میں فری پورٹ، لوکایا اور ناسو شامل ہیں۔ یہ دیکھو.....''

پھر وہ ایل ای ڈی پر مجھے دنیا کے نقشے کا وہ حصہ دکھانے لگی جہاں کیریبین سی اور بحرا و قیانوس کے سنگم پر کیوبا، بہاماز اور فلوریڈا کا شہر میامی واقع تھا۔

میں نے پوچھا۔ ''مجھے اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں کہ تمہاری اطلاعات کے ذرائع کیا ہیں کیونکہ میرے پاس ان باتوں کو چیک کرنے کا کوئی پیمانہ نہیں ہے۔ میں تمہاری کہی اور بتائی بات پر یقین کرنے کے لیے مجبور ہوں۔ کیا میں جان سکتا ہوں کہ میری دوست کو بے سٹی سے اٹھا کر کا سابلانکا تک کس نے پہنچایا ہے؟''

''تم اس شخص کو اچھی طرح جانتے ہو۔'' وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

''تمہارا اشارہ لیونارڈو کی طرف تو نہیں؟''

''بالکل ٹھیک سمجھے۔''

''کیا لیونارڈو اس وقت بھی شارو کے پاس کا سابلانکا ہی میں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں۔ وہ اسے وہاں پہنچا کر واپس آ گیا تھا۔'' ڈیلفینا نے بتایا۔ ''لیکن اس کی واپسی سے پہلے تم نے اس کے ساتھی پیلو کو ٹھکانے لگا دیا ہے۔''

''اوہ.....'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔ ''اس کا مطلب ہے' اب ایل جے پی ڈی کے علاوہ کارلوس اور لیونارڈو بھی مجھے تلاش کر رہے ہوں گے.....؟''

''کر رہے ہوں گے نہیں..... بلکہ کر رہے تھے۔'' وہ ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ سجاتے ہوئے بولی۔ ''لیک جیکسن پولیس ڈیپارٹمنٹ کی کارکردگی نے کارلوس اور لیونارڈو کے بھڑکے ہوئے جذبات پر منوں برف ڈال دی ہے..... ان کا دھیان تمہاری طرف سے ہٹ چکا ہے۔''

''کیا مطلب؟'' میرے ذہن کو ایک جھٹکا لگا۔ ''میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا..... تم کہنا کیا چاہ رہی ہو؟''

اس نے میرے سنسناتے ہوئے سوال کا جواب دینے سے پہلے اپنی رسٹ واچ پر نظر ڈالی پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''چند منٹ صبر کرلو پھر سب کچھ تمہارے سامنے آ جائے گا۔''

''تم نے بات ہی ایسی کی ہے کہ میرا دماغ ہل کر رہ گیا ہے۔'' میں نے اضطراری لہجے میں کہا۔ ''صبر کرنا میرے اختیار میں نہیں رہا۔''

''جو چیز اختیار میں نہیں، پہلے اسے قابو میں کرنے کی کوشش کرو۔'' وہ بدستور معنی خیز لہجے میں بولی۔ ''تاکہ تم اپنے دشمن کے سامنے کمزور نہ پڑ سکو۔ یہ کام تمہارے لیے مشکل ثابت نہیں ہونا چاہیے کیونکہ تم سائیکالوجی کے اسٹوڈنٹ ہو، انسانی سوچ کے مختلف زاویوں اور رویوں سے تمہیں مکمل آگاہی ہوگی۔''

''یہ بات تمہیں کس نے بتائی کہ میں سائیکالوجی کا

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

اسٹوڈنٹ ہوں؟'' میں نے حیرت میں ڈوبے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

''میں تمہارے بارے میں کیا، کیا جانتی ہوں اور کیا، کیا نہیں جانتی، اس پر بعد میں تسلی سے غور وفکر کرتے رہنا۔'' وہ لیپ ٹاپ کے کی بورڈ سے کھیلتے ہوئے بولی۔ ''پہلے یہ ویڈیو کلپ دیکھ لو۔ یقیناً تمہیں پسند آئے گا۔''

ادھر ڈیلفینا کی بات ختم ہوئی، ادھر ایل ای ڈی اسکرین پر چرچ چکن ریسٹورنٹ کے کچن کا منظر ابھر آیا۔ اس وقت کچن میں صرف میں اور پبلو تھے اور ہمارے درمیان زبردست مارا ماری کا سلسلہ جاری تھا۔ یہ چونکہ میری خود بیتی تھی لہٰذا اس پھڈے کا ایک ایک سین میری یادداشت میں نقش تھا۔ ہمارے درمیان ہونے والے اس خون ریز معرکے کو کسی نے بڑی مہارت سے ریکارڈ کیا تھا۔ یہ ایک بے آواز ویڈیو کلپ تھا جو میرے اور پبلو کے بیچ ہونے والی لڑائی کی عکاسی کرتا تھا۔ اس ہنگامہ خیز واقعے کا اینڈ بڑا ہولناک تھا۔ پبلو مجھ سے بری طرح پٹنے کے بعد نڈھال ہو کر فرش پر گر گیا تھا۔ اس کے چہرے کے مختلف حصوں سے خون نکل رہا تھا اور فرش پر پڑا ہوا اس کا جسم بے حس وحرکت دکھائی دیتا تھا۔ پبلو کو فرش پر پڑے دیکھ کر یہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اب اس دنیا میں باقی نہیں رہا۔

ڈیلفینا نے مجھ سے پوچھا۔ ''علی! یہ ویڈیو کلپ پسند آیا؟''

''اس میں پسند اور ناپسند کا کیا سوال۔'' میں نے سرسری لہجے میں کہا۔ ''اس رات چرچ چکن ریسٹورنٹ میں میرے اور پبلو کے بیچ جو دنگا فساد ہوا تھا، یہ اس کی ریکارڈنگ ہے۔ کیا یہ ریسٹورنٹ کے سی سی ٹی وی کیمرے کا کمال ہے؟''

''نہیں!'' وہ اٹل لہجے میں بولی۔ ''اگر لیک جیکسن کے چرچ چکن ریسٹورنٹ کے کچن میں کوئی سی سی ٹی وی کیمرا نصب ہوتا تو پھر یہ ریکارڈنگ یقیناً ایل جے پی ڈی کے ہتھے چڑھتی اور اس صورت میں تمہارا بچنا ناممکن تھا۔ اس ویڈیو کلپ میں صاف نظر آرہا ہے کہ پبلو کی موت تمہارے ہاتھوں ہوئی ہے...... کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟''

''تم غلط نہیں کہہ رہیں۔'' میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔ ''لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ پولیس میری تلاش میں ہے ورنہ میں لیک جیکسن سے ہوسٹن اور پھر ہوسٹن سے ڈیلس کیسے پہنچتا!''

''تم ایک اہم بات کو نظرانداز کررہے ہو علی!'' وہ رسٹ واچ پر نگاہ ڈالتے ہوئے بولی۔ ''ایل جے پی ڈی کو ایک دراز قامت شخص کی تلاش تھی جس نے چرچ چکن ریسٹورنٹ کے کچن میں پبلو کا کام تمام کیا تھا اور پھر وئی لاؤنج کی پارکنگ میں سے سرخ اسپورٹ کار پر سوار ہو کر کہیں غائب ہو گیا تھا۔ اس پورے سینریو میں تمہارا نام یا تمہاری شناخت کہیں زیر بحث نہیں آئی لہٰذا یہ بات طے ہے کہ تمہیں پبلو کا قتل ثابت کرنے والا یہ ویڈیو کلپ پولیس کی دسترس سے دور ہے۔''

''پھر یہ ویڈیو کلپ تمہاری دسترس میں کیسے آیا؟'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''اس موضوع پر ہم بعد میں بات کریں گے۔'' وہ ٹالنے والے انداز میں بولی۔

''ابھی کیوں نہیں؟'' میں نے ضدی لہجے میں سوال کیا۔

''کیونکہ ابھی کسی اور چیز کا وقت ہوا چاہتا ہے۔'' وہ بڑی رسان سے بولی۔

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

''کس چیز کا وقت؟''

''نیوز بلیٹن کا۔'' وہ سادگی سے بولی۔ ''آؤ تازہ ترین خبریں سنتے ہیں۔''

بات کے اختتام پر اس نے ایک نیوز چینل لگا دیا۔ اب میری سمجھ میں یہ بات آگئی کہ وہ بار بار اپنی رسٹ واچ کو کیوں دیکھ رہی تھی۔ اسے اس نیوز بلیٹن کا انتظار تھا۔ اگر ڈیلفینا کو کسی شے کا انتظار تھا تو یقیناً وہ کوئی اہم چیز ہی ہوسکتی تھی...... میں نے ایل ای ڈی اسکرین پر نگاہ جمادی۔ اگلے ہی لمحے نیوز آنے لگیں۔

پہلے انٹرنیشنل، پھر نیشنل لیول کی خبریں چلیں۔ اس کے بعد لوکل نیوز کی باری آئی۔ اسی اسپیل میں ایک چھوٹا سا پیکیج بھی دکھایا گیا تھا۔ اس پیکیج کو دیکھ کر میں سناٹے میں آگیا کیونکہ یہ میری ذات سے متعلق تھا اور میرے لیے سراسر ناقابلِ یقین......!

اس مختصر سے پیکیج میں بتایا جا رہا تھا کہ گزشتہ دنوں لیک جیکسن کے ایک ریسٹورنٹ ''چرچ چکن'' میں ہونے والی قتل کی واردات کا معما ایل جے پی ڈی نے حل کرلیا۔ پولیس کو جس دراز قامت شخص کی تلاش تھی اسے ایک گھنٹا پہلے گرفتار کرلیا گیا ہے۔ اس شخص کا نام ایلخیندرو ہے۔ وہ اینگلٹن سے ایلون کی طرف جا رہا تھا کہ پولیس نے اسے ہائی وے تھری فائیو پر دھرلیا۔ پولیس کی تحویل میں ایلخیندرو نے اپنے جرم کا اقبال کرلیا ہے۔ واقعات کے مطابق ایلخیندرو کی پبلو سے پرانی دشمنی تھی۔ دونوں ہسپانوی تھے

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

اور ایک ہی دنیا سے تعلق رکھتے تھے یعنی جرائم کی دنیا ..... پچھلے دنوں پیلو نے کسی معاملے میں ایلخیندرو کو کافی نقصان پہنچایا تھا اور وہ پیلو کو تلاش کرتا پھر رہا تھا۔ وقوعہ کے روز وہ ایلخیندرو کو پلاٹینیشن ڈرائیو پر نظر آ گیا۔ اس نے پیلو کا تعاقب کیا اور وہ دونوں آگے پیچھے چرچ چکن ریسٹورنٹ کے کچن میں پہنچ گئے جہاں ان کے بیچ خونی معرکہ ہوا جس میں پیلو جان کی بازی ہار گیا تھا۔ ایلخیندرو نے اپنے بیان میں پولیس کو بتایا تھا کہ پیلو کی موت کے بعد اسے جائے وقوعہ سے فرار ہونا تھا لہٰذا اس نے ونی لاؤنج نائٹ کلب کی پارکنگ سے ایک سرخ کار چرائی اور وہاں سے غائب ہو گیا۔ پولیس نے ایلخیندرو کی نشان دہی پر وہ سرخ اسپورٹ ہنڈائے کار بھی برآمد کر لی تھی۔ پولیس کی تحقیق کے مطابق مذکورہ گاڑی اسد علی نامی کسی شخص کی ملکیت تھی۔ اسد علی برازو سپورٹ کالج کا اسٹوڈنٹ تھا اور ''وی گیٹ وے'' اپارٹمنٹس میں رہتا تھا۔ اسد علی ان دنوں سیر سپاٹے کے لیے یوسٹن گیا ہوا تھا۔

اس پیکیج کے ساتھ ہی ایلخیندرو کی گرفتاری کے فوٹیج بھی دکھائے گئے تھے اور اس کا وہ ابتدائی بیان بھی نشر کیا گیا تھا جو گرفتاری کے موقع پر اس نے پولیس کو دیا تھا۔ اس پیکیج کی رو سے مجھے کلین چٹ مل گئی تھی۔ میں نے پھیپھڑوں کی گہرائی سے ایک اطمینان بخش سانس لی اور سوالیہ نظر سے ڈیلفینا کو تکنے لگا۔

وہ بھی لیپ ٹاپ کو چھوڑ کر میری طرف متوجہ ہو گئی۔ اس نے میری آنکھوں سے جھلکتے سوال کو پڑھ لیا تھا لیکن جواب دینے کے بجائے وہ معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ مجھ سے مستفسر ہوئی۔

''یہ نیوز پیکیج تو تمہیں یقیناً پسند آیا ہو گا..... ہوں؟''

''بہت زیادہ پسند آیا ہے۔'' میں نے کہا۔

''مبارک ہو..... تم پیلو مرڈر کیس سے صاف بچ نکلے۔'' وہ بہ دستور معنی خیز لہجے میں بولی۔ ''ایل جے پی ڈی نے تو کمال کر دکھایا۔''

''اس میں لیک جیکسن پولیس ڈیپارٹمنٹ کا کوئی کمال نہیں۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''حقیقت وہی ہے جو تھوڑی دیر پہلے تم نے مجھے ویڈیو کلپ میں دکھائی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کوئی نادیدہ طاقت ایل جے پی ڈی کو اپنی انگلیوں پر نچا رہی ہے اور..... یہ ایلخیندرو ویخندرو اور اس کا اقبالی بیان سب فیک ہے..... ایک دم جھوٹ' سفید جھوٹ!''

''سفید جھوٹ..... بہت خوب!'' وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔ ''علی! جب کوئی سفید فام جھوٹ بولے گا تو وہ سفید جھوٹ اور جب کوئی سیاہ فام جھوٹ بولے گا تو وہ سیاہ جھوٹ ہی کہلائے گا لیکن ایلخیندرو تو ہسپانوی ہے۔ اس کا جھوٹ کس کھاتے میں ڈالیں.....؟'' لمحاتی توقف کر کے اس نے گہری نظر سے مجھے دیکھا پھر سنجیدگی سے بولی۔

''میں تمہاری اس بات سے مکمل اتفاق کرتی ہوں کہ کوئی نادیدہ طاقت ایل جے پی ڈی کو اپنی انگلیوں پر نچا رہی ہے اور اس کائنات کی سب سے بڑی حقیقت یہی ہے کہ بڑی طاقت' چھوٹی طاقت کو نچاتی ہے۔ گویا بڑی طاقت کوئی مداری ہے اور چھوٹی طاقت اس کے اشاروں پر ناچنے والا بندر۔''

''تم بات کو فلسفے کے پنگورنے میں بٹھا کر گھماؤ نہیں۔'' میں نے الجھن زدہ انداز میں کہا۔ ''میرا ذہن یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ ایل جے پی ڈی کس طرح کسی طاقت کے ہاتھوں کا کھلونا بن سکتی ہے؟''

''کیا تم کسی علاقے کے پولیس ڈیپارٹمنٹ کو اس کائنات کی سب سے بڑی طاقت سمجھتے ہو؟''

''نہیں!'' میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''لیکن پولیس ڈیپارٹمنٹ کی اپنی ایک ریپو ہے۔ وہ قانون کے دائرے کے اندر رہ کر کام کرتی ہے۔ عوام اس ڈیپارٹمنٹ پر اندھا اعتماد کرتے ہیں۔ پولیس نے اپنی جانوں کو خطروں میں ڈال کر عوام کا اعتماد حاصل کیا ہے۔ وہ اپنی ساکھ کا سوا ستیاناس مارنے کے لیے اس قسم کا ٹوپی ڈراما کیوں رچائے گی؟''

''بات ٹوپی ڈراما رچانے کی نہیں ہے۔'' وہ سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولی۔

''پھر کیا بات ہے ڈیلفینا۔'' میں نے کہا۔ ''پلیز ایکسپلین اٹ۔''

''اوکے!'' وہ سر کو اثباتی جنبش دینے کے بعد وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''تم نے میری بات پر غور نہیں کیا۔ میں نے کہا تھا' اس کائنات میں بڑی طاقت چھوٹی طاقت کو اپنے اشاروں پر نچاتی ہے اور یہ آفاقی اصول ہے۔ تم نے پولیس ڈیپارٹمنٹ کے جن قوانین اور قواعد وضوابط کا ذکر کیا، وہ سب انسان کے بنائے ہوئے ہیں اور جب آفاقی اصول اور انسان کے بنائے ہوئے اصول آمنے سامنے آن کھڑے ہوں تو پھر جیت آفاقی ہی کی ہوتی ہے اور انسان کو اس کی بات ماننا پڑتی ہے۔ اگر چھوٹی طاقت' بڑی طاقت

WWW.PAKSOCIETY.COM

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف

ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ

کتاب کی مُختلف سائزوں میں اپلوڈنگ

ایڈ فری لنکس

ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر

ناولز اور عمران سیریز کی مُکمل رینج

Click on http://paksociety.com to Visit Us

پاک سوسائٹی کو فیس بُک پر جوائن کریں http://fb.com/paksociety

پاک سوسائٹی کو ٹوئٹر پر جوائن کریں http://twitter.com/paksociety1

پاک سوسائٹی کو گُوگل پلس پر جوائن کریں https://plus.google.com/112999726194960503629

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بُک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بُک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

http://paksociety.com

Downloaded From Paksociety.com

کے سامنے گردن نہیں جھکائے گی تو اس کا سر قلم کر دیا جائے گا۔ ہم دن رات جو کچھ دیکھتے ہیں اس میں بیش تر حقیقت نہیں ہوتی اور جو حقیقت ہے وہ آسانی سے آشکار نہیں ہوتی۔ اس تک مکمل رسائی کے لیے بڑی قربانیاں دینا پڑتی ہیں مسٹر علی!''

''کیا میں اس طاقت کے بارے میں سوال کر سکتا ہوں جس نے پیلو مرڈر کیس میں سے مجھے نکالنے کے لیے پولیس کو ہینڈل کیا ہے؟'' میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''ظاہر ہے' وہی طاقت جسے تم نے مدد کے لیے پکارا تھا۔'' وہ سرسری انداز میں بولی۔

''مم..... میں نے تو تم سے مدد مانگی تھی۔'' میں نے حیرت میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کیا یہ سب کچھ تمہارا کیا دھرا ہے..... مطلب' یہ سب تمہارا کمال ہے؟''

''نن..... نہیں۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''میرے اوپر بھی کوئی بیٹھا ہے۔''

''اوہ.....'' میں نے دلچسپی بھری نظر سے اسے دیکھا اور پوچھا۔ ''کیا میں اس طاقت کے بارے میں جان سکتا ہوں جس کے اشاروں پر تم ناچتی ہو؟''

''تمہیں اس عظیم طاقت سے روشناس کرانے کے لیے ہی یہاں بلایا گیا ہے۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''ورنہ تمہارا یہ معمولی سا کام تو تمہارے بوسٹن میں رہتے ہوئے بھی چٹکی بجاتے میں کیا جا سکتا تھا۔''

ڈیلفینا اسرار کی تہوں سے بنی ہوئی تھی۔ ہر بار اپنی ایک پرت اتار کر نئے انداز میں میرے سامنے آجاتی تھی اور مجھے حیران کر دیتی تھی۔ میں نے اضطراری لہجے میں اس سے دریافت کیا۔

''آخر وہ ہے کون جس سے متعارف کرانے کے لیے مجھے یہاں لایا گیا ہے؟''

''سب پتا چل جائے گا اگر تم نے مجھ سے تعاون کیا تو۔'' وہ معنی خیز انداز میں بولی۔ ''اور عدم تعاون کی صورت میں خالی ہاتھ' خالی دامن اور خالی ذہن یہاں سے جاؤ گے۔ پھر زندگی بھر تشنگی تمہارے ذہن کو ڈستی رہے گی اور پچھتاوا تمہاری روح کو ہلکان کرتا رہے گا۔ کیا کرنا ہے' اب یہ فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے.....!''

ڈیلفینا کی انکشاف انگیز باتوں نے میرے دماغ میں ایک طرف طوفان سا برپا کر دیا تھا۔ میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ مجھے اس مجسم اسرار ہسپانوی دوشیزہ کی آخری پرت تک جانا چاہیے تاکہ پتا تو چلے وہ ہے کیا چیز اور وہ کون ہے جس کے اشاروں پر یہ ناچ رہی ہے۔ بے پناہ تجسس نے اس حوالے سے میرے دل و دماغ کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر مضبوط لہجے میں پوچھا۔

''ڈیلفینا! تم مجھ سے کس قسم کا تعاون چاہتی ہو؟''

''یہ تعاون قسط وار ہوگا۔'' وہ سنجیدگی سے بولی۔

''قسط وار.....'' میں نے اس کے الفاظ دہرائے۔ ''کیا یہ کوئی ڈراما سیریل ہے یا..... کوئی سوپ؟''

''نہیں..... ایسی کوئی بات نہیں۔'' وہ قطعی لہجے میں بولی۔ ''یہ چند قسطوں پر مبنی ایک منی ایکٹ ہوگا۔''

''اوکے.....'' میں نے اپنی رضا مندی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''پہلی قسط کا آغاز کیا جائے میڈم ڈیلفینا۔ میں آپ سے تعاون کے لیے تیار ہوں۔''

''تمہیں پہلے مرحلے میں بہتر گھنٹوں تک میرے ساتھ رہنا ہوگا۔'' اس نے کہا۔

''بہتر گھنٹے.....'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''یعنی پورے تین دن اور تین راتیں؟''

''ظاہر ہے۔'' وہ ایک شانِ بے نیازی سے بولی۔ ''ایک دن اور رات کو پورا ہونے میں چوبیس گھنٹے ہی لگتے ہیں۔ اس حساب سے بہتر گھنٹے کے تین دن اور تین راتیں ہی بنیں گے۔''

''ڈن!'' بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

ڈیلفینا کی پراسرار اور دلچسپ باتوں نے مجھے سحر زدہ سا کر دیا تھا اور میں اس طلسماتی و کرشماتی کہانی کے انجام تک پہنچنے کے لیے بے چین ہو رہا تھا۔

''گڈ!'' اس نے سراہنے والی نظر سے مجھے دیکھا۔ ''اور ان بہتر گھنٹوں کے دوران میں تم کسی سے رابطہ نہیں کرو گے۔ تمہارا سیل فون آف رہے گا۔''

''یہ کڑی شرط ہے۔'' میں نے کمزور سے لہجے میں کہا۔

''اگر یہ مشکل لگ رہا ہے تو تم اپنا فیصلہ بدل سکتے ہو۔'' وہ عام سے لہجے میں بولی۔ ''میری طرف سے تم پر کوئی دباؤ نہیں ہے۔''

میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور کہا۔ ''منظور ہے لیکن میں سیل فون آف کرنے سے پہلے ایک کال کرنا چاہوں گا۔''

اس نے چونک کر میری جانب دیکھا۔ ''کسے فون کرنا چاہتے ہو؟''

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

''اپنے انکل کو۔'' میں نے بتایا۔ ''جب میں ڈیلی پلازا سے پریسٹن ہالو کی طرف آرہا تھا تو ان کی کال آئی تھی لیکن میں نے دو مرتبہ لائن کاٹ دی تھی۔ وہ یقیناً میرے لیے سخت پریشان ہوں گے۔''

''شیور ...... تم انہیں کال کرسکتے ہو۔'' وہ اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ ''میں تھوڑی دیر بعد آتی ہوں۔ ویسے مجھے امید ہے کہ تمہاری ذات کے حوالے سے ان کی پریشانی دور ہوچکی ہوگی ...... اس نیوز بلیٹن کو دیکھنے کے بعد۔''

''اوہ ...... تم ٹھیک کہتی ہو۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا اور سیل فون کی جانب ہاتھ بڑھا دیا۔

ڈیلفینا نپے تلے قدموں کے ساتھ لیونگ روم سے نکل گئی۔

میں نے پریسٹن ہالو پہنچ کر اپنے سیل فون کو سائلنٹ موڈ پر سیٹ کر کے بیگ میں ڈال لیا تھا۔ اب جو نکال کر دیکھا تو وہاں درجن بھر کالیں لگی ہوئی تھیں جن میں زیادہ تر انکل سلطان کی تھیں۔ ایک کال جیک خواجہ کی بھی تھی۔ میں آج کل خبروں کی زینت بنا ہوا تھا۔ ممکن ہے ذوالفقار خواجہ نے ٹی وی اسکرین پر مجھے یعنی میری خبر کو ٹی وی اسکرین پر دیکھ لیا ہو۔ ایِنی ہاؤ' میں نے ہر طرف سے دھیان ہٹا کر انکل سلطان کو فون کیا۔

پہلی گھنٹی پر انہوں نے کال ریسیو کر لی اور بے چینی سے بولے۔ ''بچے! تم خیریت سے تو ہو۔ میں نے کتنی بار تمہیں فون کیا مگر تم نے کال پک نہیں کی۔ تمہارے بارے میں ٹی وی عجیب و غریب کہانیاں سنا رہا ہے۔ اس میں کتنی حقیقت اور کتنا فسانہ ہے؟''

پھر انہوں نے مجھے کل والے نیوز فالو اپ اور آج والے پیکیج کے بارے میں بتایا اور اپنی بات کے اختتام پر کہا۔

''میرے بچے! میں تمہارے لیے بہت پریشان ہوں۔''

''انکل! آپ کو میرے لیے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔'' میں نے تسلی آمیز انداز میں کہا۔ ''میں اس وقت ڈیلس میں ہوں اور بہ خیر و عافیت ہوں مگر آپ سب کو یہی بتائیں گے کہ میں سیر و تفریح کے لیے ہوسٹن گیا ہوا ہوں۔''

''وہ تو ٹھیک ہے، میں سب کو یہی بتاؤں گا کیونکہ تھوڑی دیر پہلے نیوز میں بھی تمہارے بارے میں یہی بتایا گیا ہے۔'' وہ بہ دستور الجھن زدہ لہجے میں بولے۔ ''لیکن کچھ پتا تو چلے کہ تم ڈیلس میں کس کے پاس ٹھہرے ہوئے ہو اور کیا کرتے پھر رہے ہو؟''

''میں اپنے ایک دوست کے پاس ٹھہرا ہوا ہوں انکل۔'' میں نے بتایا۔ ''وہ بہت ہی باکمال شخص ہے۔ اسی کی کوشش سے میں پیلو مرڈر کیس سے آزاد ہوا ہوں۔ اس نے دعویٰ کیا ہے کہ بہت جلد وہ شارو کو بھی بازیاب کرا دے گا۔''

''شارو کا کچھ پتا تو چلے کہ وہ ہے کہاں۔ اس کے بعد ہی بازیابی کے بارے میں سوچا جاسکتا ہے۔'' انکل نے قدرے مایوسی سے کہا۔

''میرے دوست نے شارو کو ڈھونڈ نکالا ہے انکل۔'' میں نے انہیں خوش خبری سنائی۔

''کہاں ہے وہ؟'' وہ بے تابی سے بولے۔

''کیوبا میں۔'' میں نے بتایا۔

''کیوبا ...... وہ وہاں کیسے پہنچ گئی؟''

''لیونارڈو اسے اغوا کر کے وہاں لے گیا تھا۔'' میں نے بتایا۔ ''میرے دوست نے یقین دلایا ہے کہ وہ بہت جلد شارو کو واپس لے آئے گا۔''

''تمہارا یہ دوست میری سمجھ میں نہیں آرہا بچے۔'' وہ الجھن زدہ لہجے میں بولے۔ ''کسی نئی مصیبت میں نہیں پھنس جانا۔ تم میرے لیے بہت اہم ہو علی۔''

''میں جانتا ہوں انکل۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''آپ فکر نہ کریں۔ میں آپ کے لیے کوئی مشکل کھڑی نہیں کروں گا۔''

''جیتے رہو۔'' وہ دعائیہ انداز میں بولے پھر پوچھا۔ ''واپسی کب تک ہے؟''

''میں تین چار دن میں واپس آجاؤں گا۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اگر میرا فون آف ملے تو آپ پریشان نہیں ہونا۔ میں خود آپ کو فون کر لیا کروں گا۔''

''وہ تو ٹھیک ہے مگر تمہارا فون آف کیوں ملے گا؟''

اسی لمحے ڈیلفینا لیونگ روم میں داخل ہوئی۔ میں نے بات ختم کرنے والے انداز میں کہا۔

''انکل! کوئی خاص بات نہیں ہے۔ بس احتیاطاً کہہ رہا ہوں۔ بہت سی باتیں فون پر نہیں ہوسکتیں۔ میں واپس آکر آپ کو تفصیل سے آگاہ کروں گا۔ اوکے ......!''

''اوکے!'' دوسری طرف سے انکل نے کہا۔ ''اپنا خیال رکھنا میرے بچے۔''

''شیور!'' میں نے کہا۔

''اللہ تمہاری حفاظت کرے۔''

''آمین ......!''

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

اس کے بعد ہمارے بیچ ٹیلی فونک رابطہ موقوف ہوگیا۔ میں نے اپنے سیل فون کو آف کیا اور ڈیلفینا کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

''میں نے انکل سلطان سے بات کرلی ہے۔ اب تین دن کے لیے تم اسے اپنے پاس رکھ لو۔''

''وہ کیوں؟'' وہ حیرت سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''میں اس کا کیا کروں گی؟''

''تم نے مجھے تین دن تک کسی کو بھی فون کرنے سے منع کردیا ہے نا۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''میرا سیل فون تمہارے پاس رہے گا تو تمہیں اس بات کی تسلی رہے گی کہ میں نے کسی سے رابطہ نہیں کیا۔''

''فضول منطق ہے۔'' وہ زیرلب مسکراتے ہوئے بولی۔ ''کیا دنیا میں رابطہ کرنے کا ذریعہ تمہارے لیے صرف یہی ایک سیل فون ہی ہے؟''

اس کی مسکراہٹ میں بڑی دل کشی اور تازگی تھی۔ اس نے ہلکے پھلکے انداز میں مجھ سے سوال کیا تھا، میں نے بھی اسی ٹون میں جواب دیا۔

''نہیں' ایسی بات نہیں۔ رابطہ کرنے کے ہزاروں ذرائع موجود ہیں لیکن میں نے یہ تین دن تمہاری صحبت میں گزارنا ہیں اس لیے کہہ رہا تھا.....!''

میرے آخری جملے کی معنی آفرینی سے محظوظ ہوتے ہوئے اس نے مصنوعی لہجے میں سوال کیا۔ ''میری صحبت میں وقت گزارنے کا کسی سے رابطہ کرنے یا نہ کرنے سے کیا تعلق؟''

''بہت گہرا تعلق ہے!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں سمجھی نہیں؟'' وہ پلکیں جھپکاتے ہوئے بولی۔

''ویری سمپل!'' میں نے بہ دستور چھیڑ چھاڑ والے انداز میں کہا۔ ''تم اتنی دل کش اور دل فریب ہو کہ تمہاری قربت میں وقت گزرنے کا احساس نہیں ہوتا' کسی اور سے رابطہ کرنے کا خیال کس کافر کو آئے گا!''

''رئیلی؟'' وہ بے یقینی سے مجھے تکنے لگی۔

''آف کورس۔'' میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔ ''تمہاری شخصیت میں ایک جادو سا ہے۔ تم اپنی باتوں سے سامنے والے پر سحر پھونکتی ہو۔ انسان کے ہوش ٹھکانے پر نہیں رہتے۔ تم بڑی زبردست ہو.....''

میرے ان تعریفی کلمات پر جز بز ہونے یا کسمسانے کے بجائے اس نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''علی! تمہارا ایک مسئلہ تو حل ہوگیا۔ پیپلو مرڈر کیس سے تمہارا نام خارج ہوچکا ہے۔ تم جب چاہو واپس جاکر ایک نارمل انسان کی طرح زندگی گزار سکتے ہو۔ تمہاری اسپورٹ کار پولیس کی تحویل میں ہے۔ تم جب لیک جیکسن جاؤ گے تو ان سے وصول کرلینا۔''

''ایک مسئلہ یقیناً نمٹ چکا ہے مگر دوسرا مسئلہ ابھی باقی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''جو کہ پہلے مسئلے سے زیادہ اہم اور سنگین ہے۔''

''وہ بھی نمٹ جائے گا' فکر نہ کرو۔'' وہ بے پروائی سے بولی۔ ''اور ہاں' یہ سیل فون اپنے بیگ ہی میں رکھو۔ میرے نزدیک زبان کی بہت اہمیت ہے۔ تم نے کہہ دیا ہے کہ تین دن تک کسی سے رابطہ نہیں کرو گے تو میں نے تمہاری بات پر یقین کرلیا ہے۔''

''میں زبان کا دھنی ہوں۔'' میں نے سینہ پھلاتے ہوئے کہا۔

''مجھے معلوم ہے۔'' وہ قاتلانہ انداز میں مسکرائی۔ ''میرا ایک ایک سیکنڈ بہت قیمتی ہے۔ میں تم پر خوامخواہ وقت صرف نہیں کررہی۔ کچھ سوچ کر ہی تمہارا انتخاب کیا گیا ہے۔''

ایک مرتبہ پھر ڈیلفینا نے مجھے گہری سوچ میں ڈال دیا تھا۔ وہ جانتی تھی' میں سائیکالوجی کا اسٹوڈنٹ ہوں۔ اسے پتا تھا کہ میں زبان کا دھنی اور معاملات کا کھرا تھا۔ اس نے کسی خاص مقصد کی خاطر میرا انتخاب کیا تھا اور تین دن مجھے اپنے پاس رکھ کر اپنا قیمتی وقت مجھ پر صرف کرنا چاہتی تھی۔ میں اس کے اثر وسوخ اور طاقت کے مظاہرے کو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔ وہ میرے حوالے سے اچھا خاصا ہوم ورک کے بیٹھی تھی مگر سوال یہ پیدا ہوتا تھا..... کیوں؟

اس کیوں کا جواب ڈیلفینا ہی دے سکتی تھی اور میں نے جب بھی جواب لینے کی کوشش کی تھی تو اس نے گفتگو کا اسٹیئرنگ کسی اور سمت گھما دیا تھا۔ اس بار بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔

''کیا میں اپنے منتخب کیے جانے کی وجوہات معلوم کرسکتا ہوں؟'' میں نے پوچھا۔

''تمہیں بہت جلد بتا دیا جائے گا .....سب کچھ تمہارے سامنے آشکار ہوجائے گا۔'' وہ گردن کو بڑی ادا کے ساتھ حرکت دیتے ہوئے بولی۔ ''فی الحال ہم اس سے بھی زیادہ ضروری باتیں کریں گے۔''

''اوکے.....!'' میں نے مصلحت آمیز انداز میں کہا۔

''آج ٹھیک گیارہ بجے تم اس بنگلے میں داخل ہوئے تھے۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ''آج دس جون اور منگل

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

کا دن ہے۔ تیرہ جون جمعے کے دن گیارہ بجے بہتر گھنٹے کی مہلت پوری ہو جائے گی۔ اس کے بعد تم کہیں بھی جا سکتے ہو۔ ہمارے بیچ میں یہی طے پایا ہے نا؟''

''بالکل یہی طے پایا ہے۔'' میں نے اثبات میں جواب دیا۔ ''لیکن ابھی تک تم نے مجھے یہ نہیں بتایا کہ ان بہتر گھنٹوں میں تم میرے ساتھ کیا کرنے والی ہو؟''

''یہ جاننا تمہارے لیے ضروری نہیں ہے۔'' وہ گمبھیر انداز میں بولی۔ ''اطمینان رکھو کہ میری صحبت میں تمہاری جان کو کسی قسم کا کوئی خطرہ نہیں۔''

''اس بات کا تو مجھے صد فی صد یقین ہے جبھی تو میں نے ڈن کیا ہے۔'' میں نے اس پر اپنے اعتماد کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''تم مجھے بچانے والی ہو، مارنے والی نہیں۔ میں تمہیں اپنی سچی دوست، سچی خیر خواہ سمجھتا ہوں اور تم پر مکمل بھروسا کرتا ہوں۔''

''میں تمہارے بھروسے کو کبھی ٹھیس نہیں لگنے دوں گی۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولی۔ ''اور یہ بھی درست ہے کہ میں تمہاری خیر خواہ ہوں لیکن دوسری بات پر میرا یقین نہیں ہے علی۔''

''دوسری بات!'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''مطلب..... سچی دوست؟''

''ہاں۔'' اس نے سر کو اثباتی جنبش دی۔ ''میرے نزدیک دوستی اور محبت نام کی کوئی شے اس دنیا میں نہیں ہوتی۔''

''پھر کیا ہوتا ہے؟''

''ضرورت!'' وہ اٹل لہجے میں بولی۔ ''سب سے زیادہ اہم چیز انسان کی ضرورت ہے۔ انسان اپنی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ہی محبت بھی کرتا ہے اور دوستی بھی۔''

''تم کائنات کے دو عظیم انسانی جذبوں کی نفی کر رہی ہو۔'' میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ''یعنی دوستی اور محبت۔''

''میں اپنا تجربہ بیان کر رہی ہوں۔'' وہ سادگی سے بولی۔ ''ضروری نہیں کہ تم میری بات سے اتفاق بھی کرو۔ ہو سکتا ہے، تمہارا تجربہ مجھ سے مختلف ہو..... بائی دی وے، تم نے اس کائنات کا کتنا حصہ دیکھ رکھا ہے جو یہ بات کر رہے ہو؟''

''میں تو آج ہی پیدا ہوا ہوں۔'' میں نے قدرے بیزاری سے کہا۔ ''ابھی تو اس کائنات میں، میں نے صرف ڈیلفینا کو ہی دیکھا ہے.....!''

''گڈ شاٹ۔'' وہ میرے جملے سے محظوظ ہوتے ہوئے بولی۔ ''ڈیلفینا کو دیکھ لیا۔ بس یہی کافی ہے۔ باقی سب کچھ ڈیلفینا تمہیں خود دکھا دے گی۔''

''فوری طور پر تو میں شارو کو دیکھنا چاہتا ہوں۔'' میں نے شکایتی انداز میں کہا۔ ''تم نے اس کے قصے کو بالکل گول ہی کر دیا ہے۔''

''شارو کا قصہ اگر گول ہو گیا ہے تو شام میں اسے لمبا کر دیں گے ..... ڈونٹ وری۔'' وہ تشفی آمیز انداز میں بولی۔ ''تم ہماری ضرورت ہو لہٰذا تمہاری ضرورت پوری کرنا میرا فرض بنتا ہے، چاہے یہ ضرورت شارو کا حصول ہی کیوں نہ ہو۔''

''تو شارو پر بات شام میں ہو گی؟'' میں نے تصدیق طلب انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

''شیور۔'' وہ حتمی لہجے میں بولی۔ ''اب تم ادھر صوفوں پر ہی ہلکی پھلکی نیند لے لو۔ میں بعد میں تمہارے لیے بیڈ روم کا بندوبست کر دوں گی۔''

''مجھے نیند نہیں آ رہی۔'' میں نے کہا۔

''آنکھیں بند کر کے لیٹو، نیند آ جائے گی۔'' وہ بڑے وثوق سے بولی۔

''تمہیں کیسے معلوم؟'' میں نے پوچھا۔

''آزما کر دیکھ لو۔'' وہ چیلنج کرنے والے انداز میں بولی۔ ''میں بھی آرام کرنے جا رہی ہوں۔ آفٹر نون میں ہم آؤٹنگ کے لیے جائیں گے اور گپ شپ بھی کریں گے .....او کے!''

''او کے.....'' میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

وہ لیونگ روم سے نکلی تو میں ایک کنگ سائز آرام دہ صوفے پر دراز ہو گیا پھر میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ کسی بھی وقت سونا میرے لیے کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ میں اپنے ذہن کو ہدایات دے کر اپنی مرضی سے سو اور جاگ سکتا تھا۔ اس حوالے سے میری اچھی خاصی پریکٹس تھی لیکن سچی بات یہ ہے کہ اس وقت مجھے نیند نہیں آ رہی تھی اور ظاہر ہے، میں سونے کی خواہش بھی نہیں رکھتا تھا۔ یہ سب کچھ میں ڈیلفینا کی فرمائش پر کر رہا تھا۔

میں نے آنکھیں بند کر کے اس پُراسرار دوشیزہ کے بارے میں سوچنا شروع کیا تو اس کا دلکش ہمسپانوی سراپا میرے تصور میں روشن ہو گیا۔ بس مجھے اتنا یاد ہے کہ وہ مجھے دیکھ کر بڑے دل آویز انداز میں مسکرا رہی تھی۔

اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔ کچھ پتا نہیں چلا کہ کب میری آنکھ لگ گئی تھی۔ میں ڈیلفینا سے نظریں چار

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

کرتے کرتے نیند کی وادی کی طرف نکل گیا تھا۔

☆☆☆

شمالی علاقہ جات تو تقریباً ہر ملک کے قابل دید ہی ہوا کرتے ہیں۔ ٹیکساس امریکا کا جنوبی حصہ ہے لیکن ڈیلس ٹیکساس کے شمال میں واقع ہے اور پریسٹن ہالو، ڈیلس کا انتہائی شمالی حصہ سو اس شمالی نسبت کے باعث یہ علاقہ بہت خوب صورت اور نظر فریب بھی ہے۔ یہاں کی زندگی میں فطرت جھلکتی ہے۔ اگرچہ یہ زندگی سادہ نہیں مگر پھر بھی بہت پُرسکون ہے۔

ہم دونوں سہ پہر میں گھر سے نکل آئے تھے اور یہ سب ڈیلفینا کے پروگرام کا حصہ تھا۔ میں تو تین دن کے لیے اس کے رحم وکرم پر تھا۔ وہ جہاں بھی لے جاتی، مجھے جانا تھا۔ اس بات کا مجھے اطمینان تھا کہ میں اس کے ساتھ ہر زاویے سے محفوظ ہوں۔ وہ ان لمحات میں میری نجات دہندہ بنی ہوئی تھی اور نجات دہندہ کبھی بھی ضرر رساں نہیں ہوتا۔

''تمہیں اسپورٹس وغیرہ کا شوق ہے؟'' اس نے مجھ سے پوچھا۔

''مجھے خود کو تن درست رکھنے کا شوق ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اور اس کے لیے میں باقاعدہ جیم جاتا ہوں۔''

''گڈ!'' وہ سراہنے والے انداز میں بولی۔ ''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ تن درستی ہزار نعمت ہے۔ ویسے میرا اشارہ کسی خاص گیم کی طرف تھا جیسے ٹینس، سوکر، سوئمنگ یا اور کچھ.....؟''

اس وقت ہم دونوں ایک شان دار گاڑی میں تھے اور ڈیلفینا ڈرائیو کر رہی تھی۔ میں اس کے برابر پسنجر سیٹ پر تھا۔ یہ گاڑی نہ تو لیکس والی تھی اور نہ ہی سلور اوڈی جس میں ڈیلفینا کو میں نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا' تاہم اس گاڑی کی شان بھی دیکھنے کے لائق تھی۔

''سوکر اور ٹینس تو نہیں البتہ میں سوئمنگ شوق سے کرتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔'' وہ ایک سائڈ اسٹریٹ پر گاڑی کو موڑتے ہوئے بولی۔ ''بنگلے میں سوئمنگ پول بھی موجود ہے۔ اگر تم چاہو تو اپنا سوئمنگ کا شوق پورا کر سکتے ہو۔'' لمحاتی توقف کر کے اس نے بڑی لگاوٹ سے میری طرف دیکھا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

''ویسے اس وقت تو میرا ٹینس کھیلنے کا موڈ ہے۔ کیا تم میرا ساتھ دو گے؟''

ڈیلفینا کے انداز میں ایک خاص نوعیت کا تحکم پایا جاتا تھا لیکن اس تحکم سے فرعونیت نہیں جھلکتی تھی بلکہ ایک خاص قسم کی شبنمی نرمی کا احساس ہوتا تھا جیسے کوئی دھونس دھاندلی سے پیار کو عملی شکل دے رہا ہو۔ اگرچہ ڈیلفینا کا پیار محبت پر ایمان نہیں تھا لیکن اس کی اداؤں سے بسا اوقات یہ چیزیں جھلکتی تھیں۔

''اگر ساتھ دینے کی بات ہے تو مجھے انکار نہیں۔'' میں نے اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''مگر مجھے اس کھیل کا کوئی تجربہ نہیں۔''

''تجربہ تو کھیلنے کے بعد حاصل ہوتا ہے علی۔'' وہ معنی خیز انداز میں بولی۔ ''جو کھیلتے ہیں، وہ ہی ایک دن تجربہ کار کہلاتے ہیں۔''

''یہ تو تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو۔'' میں نے تائیدی انداز میں کہا۔

''میں نے غلط کب کہا ہے.....؟'' وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مستفسر ہوئی۔

''میرا یہ مطلب نہیں تھا۔'' میں نے جلدی سے کہا۔

''ہم ٹینس کورٹ جا رہے ہیں۔'' اس نے بتایا۔

''میں کچھ دیر تک ٹینس کھیلوں گی پھر آرام سے کہیں بیٹھ کر گپ شپ کریں گے۔''

''ٹھیک ہے' جیسے تم مناسب سمجھو۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔

پریسٹن ہالو کی روڈ فورڈی کے دوران میں ہمارے بیچ بات چیت کا سلسلہ جاری رہا۔ جیسا کہ میں نے بتایا' پریسٹن ہالو کا علاقہ اپنی خوب صورتی اور سکون و امن میں بے مثال ہے۔ یہاں پر زیست کرنے کا ایک اپنا ہی مزہ ہے۔

ڈیلفینا نے گاڑی پریسٹن ہالو پارک کی جانب موڑی تو میں نے کہا۔ ''کیا پارک میں چہل قدمی کا ارادہ ہے؟''

''چہل قدمی بھی کر لیں گے لیکن میں پہلے ٹینس کھیلوں گی۔'' وہ بڑے عزم سے بولی۔ ''اور تم نے میرا ساتھ دینا ہے.....او کے!''

''او کے.....ٹھیک ہے۔'' میں نے ہامی بھر لی۔

پریسٹن ہالو پارک میں داخل ہوتے ہوئے ڈیلفینا نے مجھے بتایا کہ یہ یہاں کا سب سے بڑا پارک ہے جو سات اعشاریہ دو ایکڑ رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ اس پارک میں دو بیس بال فیلڈ، دو ٹینس کورٹس، ایک باسکٹ بال کورٹ، ایک سوکر گراؤنڈ اور ایک عمومی کھیل کا میدان ہے۔ پریسٹن ہالو پارک کے بعد دوسرا بڑا پارک ''نیدر لینڈ پارک'' ہے۔

ہم ٹینس کورٹ کی طرف بڑھے تو سامنے سے ایک

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

عورت آتی دکھائی دی۔ ڈیلفینا نے اس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

''علی! اسے جانتے ہو؟''

مذکورہ عورت کا چہرہ مجھے شناسا سا لگا۔ میں نے کہا۔ ''میں نے اسے کہیں دیکھا تو ہے۔ کہاں..... یہ یاد نہیں آرہا۔''

''اگر تم اس سے کبھی ملے نہیں تو پھر تم نے اسے یا تو ٹی وی اسکرین پر دیکھا ہوگا یا پھر کسی سوکر گراؤنڈ میں۔'' اس نے بتایا۔ ''یہ اس وقت کی سب سے زیادہ معاوضہ لینے والی ویمن سوکر پلیئر ہے۔''

فٹ بال کے کھیل کو امریکا میں سوکر کہا جاتا ہے۔ میں نے کہا۔

''میں نے اسے شاید ٹی وی اسکرین پر دیکھا ہو۔ نام کیا ہے اس کا؟''

''مارٹا سلوا ویرا۔'' اس نے بتایا۔ ''اس کا معاوضہ چار سو ہزار ڈالرز ہے۔''

''یعنی چار لاکھ ڈالرز.....!''

''بالکل۔'' وہ قطعی لہجے میں بولی۔ ''اور مارٹا اس وقت دنیا میں سب سے زیادہ معاوضہ لینے والی سوکر کی کھلاڑی ہے۔ اس کا تعلق برازیل سے ہے۔ یہ اپنی ٹیم میں فارورڈ پوزیشن پر کھیلتی ہے۔''

''بہت خوب!'' میں نے ستائشی انداز میں کہا۔

اس دوران میں مارٹا ہمارے قریب پہنچ چکی تھی۔ اس نے ڈیلفینا کی طرف دیکھتے ہوئے بے تکلفی سے ہاتھ ہلایا اور بولی۔

''ہیلو ڈیلفی! کیسی ہو؟''

''ایک دم فٹ۔'' ڈیلفینا نے جواب دیا پھر میری جانب اشارہ کرتے ہوئے تعارف کرانے والے انداز میں کہا۔ ''اس سے ملو۔ یہ میرا دوست ہے' اسد علی۔''

''ویری گڈ!'' مارٹا ویرا نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا پھر میری طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے دوستانہ انداز میں بولی۔ ''ہیلو ہینڈسم..... کیسے ہو؟''

میں نے اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو گرم جوشی سے تھام لیا پھر کہا۔ ''مالک کا کرم ہے۔ آپ کی ڈیلفی نے میرا بہت خیال رکھا ہوا ہے۔''

''بس..... یہ ایسی ہی ہے۔'' وہ معنی خیز انداز میں بولی۔ ''انجوائے ہر کمپنی۔''

پھر وہ ڈیلفینا کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''میں چلتی ہوں۔ ہیلینا میرا انتظار کر رہی ہے پھر ملیں گے۔''

''اوکے..... بائے۔'' ڈیلفینا نے کہا۔

وہ ہم دونوں کو ویو (بائے بائے) کرتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔

''یہ ہیلینا پشیکو کو بہت ریگارڈ کرتی ہے۔'' ڈیلفینا نے کہا۔ ''کیونکہ مارٹا ویرا دراصل ہیلینا پشیکو ہی کی دریافت ہے۔ ہیلینا ویمن سوکر کوچ ہے۔ آج مارٹا ویرا جس مقام پر کھڑی ہے، وہ ہیلینا کی محنت کا کمال ہے۔''

''محنت میں بڑی عظمت ہے۔'' میں نے کہا۔

وہ بولی۔ ''اس میں تو کسی شک کی گنجائش ہی نہیں۔''

''لیکن ایک بات میں شک کی گنجائش پیدا ہو چکی ہے۔'' میں نے ذومعنی انداز میں کہا۔

''کس بات میں؟'' وہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگی۔

''ابھی تم نے مجھے اپنے ایک دوست کی حیثیت سے مارٹا ویرا سے متعارف کرایا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''جبکہ تمہارا تو دوستی پر یقین ہی نہیں ہے؟''

''درست!'' وہ ٹھوس لہجے میں بولی۔ ''میں اپنی بات پر قائم ہوں کہ ہم ایک دوسرے کی ضرورت ہیں۔ اس ''ضرورت'' کو کوئی بھی نام دے دیں، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ دراصل جب ہم پبلک سے ملتے ہیں تو ہمیں دوسرے لوگوں کی ذہنی ترجیحات اور رجحانات کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے تاکہ انہیں آکورڈ فیل نہ ہو۔ پانی کو واٹر کہیں یا آب یا ایکوا..... وہ پانی ہی رہتا ہے۔ اسی طرح ضرورت کو دوستی کہیں، محبت کہیں یا اور کچھ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بس بات سمجھ میں آنا چاہیے۔''

''اور ایک بات میری سمجھ میں آگئی ہے۔'' میں نے خودکلامی کے انداز میں کہا۔

''کون سی بات؟'' اس نے پوچھا۔

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ڈیلفینا کے بجائے ''ڈیلفی'' تم پر زیادہ جچتا ہے۔''

''تھینک یو۔'' وہ دھیرے سے مسکرائی۔ ''یہ میرے نام کی شارٹ فارم ہے۔ میرے دوست مجھے ڈیلفی کہہ کر ہی پکارتے ہیں۔''

''یعنی تمہارے ضرورت مند.....!''

''ویل ڈن!'' وہ ایک قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔ ''تم تو بال کی کھال نکالتے ہو لیکن شاید تمہیں ایک بات کا پتا نہیں.....''

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

''کون سی بات؟'' میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''میں ضرورت پڑنے پر کھال کے بال بھی نکال لیتی ہوں.....!''

یہ جملہ اس نے اتنی سنجیدگی سے ادا کیا تھا کہ مجھے اپنے وجود میں ایک سرد لہر سی دوڑتی محسوس ہوئی۔ اگرچہ اس نے میری ایک خوبی..... ''بال کی کھال نکالنا'' کا جواب دیا تھا لیکن اس کے اندازِ بیاں سے سفاکی جھلکتی تھی۔ ان لمحات میں وہ مجھے ایک مختلف ڈیلفینا نظر آئی تھی۔

ہم نے لباس تبدیل کیا اور ٹینس کورٹ میں اتر آئے۔ یہ ڈیلفینا کی فرمائش تھی ورنہ میں ٹینس کی ابجد سے بھی واقف نہیں تھا۔ بس اس کا دل رکھنے کے لیے میں نے ٹینس کا ریکٹ اٹھالیا تھا۔ نوجوانی میں تھوڑا بہت بیڈمنٹن کھیلا تھا۔ میں اسی لولے لنگڑے تجربے کو کام میں لا کر ڈیلفینا کی خواہش پوری کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ کسی ماہر کھلاڑی کے مانند کھیل رہی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں اس نے مجھے ہانپنے پر مجبور کر دیا۔

اسی لمحے ایک اور کھلاڑی کورٹ میں داخل ہوئی تو ڈیلفینا نے مجھ سے کہا۔ ''علی! تم تھوڑا ریسٹ کرلو۔ میں ایک آدھ گیم اب ایشلے کے ساتھ لگاؤں گی۔''

ایشلے کا تعلق امریکا سے تھا اور وہ ایک معروف ٹینس پلیئر تھی۔ دوسری جانب ڈیلفی بھی کسی سے کم نہیں تھی۔ میں ایک بینچ پر بیٹھ کر ان دونوں کا کھیل دیکھنے لگا۔ ٹینس کی مظلوم اور معصوم بال ان دونوں کے ریکٹس کے طوفانی تھپیڑے کھا کر نیٹ کے آر پار فضائی چکر لگانے میں مصروف ہوگئی۔

مجھے درحقیقت ٹینس کے کھیل سے کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا لیکن لیٹ نائٹ ٹی وی چینلز گھماتے ہوئے اگر کسی اسپورٹس چینل پر ویمن ٹینس کا کوئی میچ آرہا ہوتا تو میں تھوڑی دیر رک کر دیکھ لیا کرتا تھا۔

رقص کو اعضا کی شاعری کہا جاتا ہے۔ ٹینس کا کھیل بھی کسی رقص سے کم نہیں ہوتا۔ بڑے نپے تلے انداز میں اچھل کود کرنا پڑتی ہے۔ ہر شاٹ پر جسمانی طاقت کو توازن کے ساتھ ایک خاص زاویے پر استعمال کرنا ہوتا ہے۔ ذہن ہمہ وقت چاق و چوبند اور نگاہ کسی عقاب کے مانند بال پر لگی ہوئی.....!

ڈیلفی جسم و جان کی پوری توانائی کے ساتھ شاٹ لگاتی تو اس کے بدن کے مختلف اعضا رقص کرنے لگتے۔ مخصوص جاذب نظر مسلز کی یہ معنی خیز جنبش بڑی دل خوش کن اور حیات آفریں تھی۔ اس کے بدن میں بلا کا لوچ تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا' اس کے جسم کے ایک ایک انچ پر اسپرنگ لگے ہوئے ہوں جو اسے مسلسل متحرک رکھے ہوئے تھے۔

میں کافی دیر تک اس کے ہسپانوی حسن کی رعنائیوں اور زرخیز بدن کی شادابیوں میں کھویا رہا۔ پورے کھیل کے دوران میں وہ میرے حواس پر چھائی رہی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ ایشلے کے ساتھ نہیں بلکہ میرے جذبات کے ساتھ کھیل رہی ہو.....!

ہم نے ٹینس کورٹ سے فارغ ہونے کے بعد اورنج جوس پیا اور ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر تھوڑی گپ شپ بھی کی۔ میرے ذہن میں شارو کے معاملے نے بہت اُتھل پتھل مچا رکھی تھی لہٰذا میں نے اس سے پوچھ لیا۔

''ڈیلفی! تم نے بتایا تھا کہ شارو کو چند روز کے بعد کاسابلانکا سے ناسو شفٹ کر دیا جائے گا۔ میں یہ تو نہیں پوچھوں گا کہ تمہاری معلومات کا ذریعہ کیا ہے کیونکہ میں تمہارے اثر و رسوخ کے چند عملی نمونے ملاحظہ کر چکا ہوں لیکن میں یہ ضرور جاننا چاہوں گا کہ اسے کس مقصد کے لیے اغوا کر کے کیوبا پہنچایا گیا ہے اور پھر کیوبا سے بہاماز کیوں شفٹ کیا جائے گا؟''

وہ جوس کا ایک گھونٹ لینے کے بعد بولی۔ ''یہ سب اسکن بزنس کا شاخسانہ ہے۔''

''اسکن بزنس یعنی عصمت فروشی۔'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''یہ تو بہت غلط ہے.....!''

''غلط اور صحیح کا فیصلہ ہر شخص اپنے معروضی حالات کے پیشِ نظر کرتا ہے علی۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ''جن لوگوں کو اس بزنس میں مالی فائدہ ہوتا ہے، ان کے لیے تو اس سے زیادہ نیک کام دنیا میں اور کوئی ہو نہیں سکتا۔''

''نیک کام.....'' میں نے زہرخند لہجے میں کہا۔ ''مجھے تو اس کے تصور ہی سے گھن محسوس ہو رہی ہے..... چھی چھی۔''

اس نے میرے تبصرے پر کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا اور اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔

''کاسابلانکا میں رہتے ہوئے شارو کو مخصوص قسم کی ٹریننگ دی جائے گی تاکہ وہ اس شعبے میں طاق ہو جائے۔ اس کے بعد اسے بہاماز کے کیپٹل ناسو شفٹ کر دیا جائے گا جو کہ ایک الگ تھلگ جزیرہ ہے۔ ناسو کو عیاش مال دار سیاحوں کی جنت بھی کہا جاتا ہے۔ اس ''صفت'' میں ناسو کا شمار ہوائی کے آس پاس ہی ہوتا ہے' خاص طور پر ہوائی کے شہر ہونولولو کے نزدیک اسے مقامِ عیاشی سمجھا جاتا ہے۔ ہونولولو کی طرح ناسو میں بھی عیاشی بہت مہنگی ہے۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

''لیونارڈ میری دوست کو پیشہ کرانے کے لیے وہاں لے گیا ہے۔'' میں نے دانت کچکچاتے ہوئے کہا۔ ''میں اس کی گردن توڑ دوں گا۔''

''کیوبا کو لونلی پلینیٹ یعنی تنہائی کا مارا ہوا سیارہ کہا جاتا ہے۔'' وہ جوس کے گلاس کو خالی کرتے ہوئے بولی۔ ''جرائم کی دنیا کے بے تاج بادشاہوں کی وہاں بہتات ہے۔ تم کس کس کی گردن توڑو گے؟''

''جو بھی گردن میرے اور شارو کے راستے میں آئے گی، اسے ٹوٹنا ہی ہوگا۔'' میں نے نیم جارحانہ انداز میں کہا۔

''تو پھر تم ابھی کاسابلانکا کے لیے پرواز کر جاؤ۔'' وہ سادگی سے بولی۔ ''ڈیلس سے ہوانا ایک ہزار سات سو چوہتر کلومیٹر دور ہے۔ سوا دو گھنٹے کی نان اسٹاپ فلائٹ کے بعد تم ہوانا پہنچ جاؤ گے اور اس کے بعد.....'' اس نے لمحاتی توقف کر کے عجیب سے انداز سے مجھے دیکھا پھر ان الفاظ میں اپنی بات مکمل کر دی۔

''اس کے بعد مجھے یہ نیوز سننے کو ملے گی کہ ہوانا میں درجنوں افراد کو گردنیں توڑ کر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا ہے.....''

''تم میرا مذاق اڑا رہی ہو؟'' میں نے شاکی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''نہیں۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''میں تمہیں یہ سمجھانے کی کوشش کر رہی ہوں کہ جذبات کو قابو میں رکھو۔''

''جذبات کیا خاک قابو میں رہیں گے۔'' میں نے سٹپٹائے ہوئے انداز میں کہا۔ ''میری دوست کو بدکاری کے دھندے پر ڈالنے کی تیاری کی جا رہی ہے اور تم کہتی ہو میں ریلیکس رہوں؟''

''تم میری بات کا غلط مطلب نکال رہے ہو علی۔'' وہ بہ دستور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''آج دوپہر تک لیک جیکسن پولیس ڈیپارٹمنٹ پیلو مرڈر کیس میں قاتل کی حیثیت سے تمہیں تلاش کر رہا تھا..... تلاش کر رہا تھا یا نہیں؟'' اس نے زور دے کر پوچھا۔

''کر رہا تھا۔'' میں نے تصدیق کی۔

''پھر منظر تبدیل ہوا اور ہم نے اس کیس میں سے تمہیں ایسے باہر نکال لیا جیسے مکھن سے بال کو کھینچ کر باہر نکالا جاتا ہے۔'' وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی پھر میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اضافہ کیا۔ ''فکر نہ کرو۔ اگر تم نے ہمارے ساتھ تعاون جاری رکھا تو تمہاری دوست کا سابلانکا سے ناسو نہیں بلکہ سیدھی بے سٹی پہنچا دی جائے گی یا..... تم جہاں کہو گے وہاں پہنچا دیں گے۔''

''کب..... تم یہ نیک کام کب کرو گی؟'' میں نے بے ساختہ پوچھا۔

''جب ہمارے درمیان ایگری منٹ سائن ہو جائے گا۔'' اس نے جواب دیا۔

''کیسا ایگری منٹ؟'' میں نے استفسار کیا۔

''تعاونِ باہمی کا کنٹریکٹ'' اس نے جواب دیا۔ ''جس کی رو سے ہم ایک دوسرے سے تعاون کرنے کے پابند ہوں گے۔''

''میں تو ہر قسم کے تعاون کا یقین دلاتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''پھر کسی ایگری منٹ یا کنٹریکٹ کی کیا ضرورت ہے؟''

''لکھی ہوئی چیز کی اپنی ایک ورتھ، ایک اہمیت ہوتی ہے۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''اس لیے یہ ایگری منٹ سائن ہونا ضروری ہے۔''

''او کے، میں سائن کرنے کے لیے تیار ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''کہاں ہے وہ ایگری منٹ؟''

''ایک آدھ دن میں یہ کام بھی ہو جائے گا۔ تمہیں اگر میں نے یہاں روکا ہے تو اس کا ایک خاص مقصد ہے۔'' وہ نرم لہجے میں بولی۔ ''ایگری منٹ سائن ہونے سے پہلے کے چند اسٹیپ ہیں۔ پہلے تم ان سے گزرو گے، پھر ایگری منٹ بھی سائن ہو جائے گا اور تم اس ایگری منٹ یا کنٹریکٹ پر دستخط..... کرنے یا نہ کرنے کے لیے مکمل طور پر آزاد ہو گے۔ تم پر کسی قسم کا دباؤ نہیں ڈالا جائے گا۔''

''او کے..... تم مجھے مختلف اسٹیپ سے گزارو یا زندگی سے گزارو مگر میری شارو کو کچھ نہیں ہونا چاہیے۔''

''ڈونٹ بی سو ایموشنل۔'' وہ میرا کندھا تھپتھپاتے ہوئے بولی۔ ''سب ٹھیک ہو جائے گا۔ مجھ پر بھروسا رکھو..... آں!''

''تم پر مکمل بھروسا ہے ڈیلفی۔'' میں نے کہا۔

مجھے خود محسوس ہوا کہ ان لمحات میں میں خاصا جذباتی ہو گیا تھا۔ شارو کے حوالے سے جب سے میرے علم میں یہ بات آئی تھی کہ اسے عصمت فروشی کے مذموم کاروبار میں دھکیلا جانے والا ہے، میں کچھ زیادہ ہی فکر مند ہو گیا تھا اور یہی پریشانی میرے اعصاب کو متاثر کر رہی تھی جس کی وجہ سے اپنے جذبات پر کنٹرول نہیں رہا تھا۔ بہ الفاظِ دیگر شارو

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

نے وقتی طور پر مجھے اندر سے کمزور کر دیا تھا۔

''بھروسا بھی کرتے ہو اور پریشان بھی ہوتے ہو۔'' وہ محبت آمیز انداز میں مجھے آنکھیں دکھاتے ہوئے بولی۔ ''اٹھو..... کہیں اور چلتے ہیں۔''

ڈیلفی نے جوس کا بل پے کیا اور ہم ریسٹورنٹ سے نکل آئے۔ بل کی ادائیگی پر بھی ہمارے بیچ تھوڑی کھینچا تانی ہوگئی تھی۔ میں نے اپنا کریڈٹ کارڈ نکالا تو وہ جلدی سے بولی۔

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تم میرے مہمان ہو۔''

اس نے ''مہمان'' کا لفظ اتنی اپنایت سے ادا کیا تھا کہ مجھے اپنا ہاتھ روکنا پڑ گیا تھا۔

واپسی کے سفر میں وہ مجھے خاصی چپ چپ نظر آئی تو میں نے پوچھا۔ ''خاموش کیوں ہو ڈیلفی۔ کیا مجھ سے خفا ہو؟''

''خفا..... وہ کیوں؟''

''شاید تمہیں میری کوئی بات بری لگ گئی ہو۔''

''جس کی بات مجھے بری لگے، وہ میرے برابر میں نہیں بیٹھ سکتا۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ''اگر تم میرے ہم نشین ہو تو اس کا ایک ہی مطلب ہے کہ تمہاری کوئی بھی چیز مجھے بری نہیں لگ رہی۔''

''تھینک یو'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور پوچھا۔ ''پھر خاموش کیوں ہو؟ ایسا محسوس ہو رہا ہے' ریسٹورنٹ سے اٹھنے کے بعد تم کچھ بجھ سی گئی ہو؟''

''ایسی کوئی بات نہیں علی!'' وہ ٹالنے والے انداز میں بولی۔

''پھر کیسی بات ہے ڈیلفی؟''

''اصل میں' میں تمہارے بارے میں سوچ رہی ہوں۔'' وہ ڈرائیونگ جاری رکھتے ہوئے وضاحت کرنے لگی۔ ''تم کافی اکتائے ہوئے لگ رہے ہو۔ تمہاری بوریت دور کرنے کے لیے تفریح کا کوئی سامان ہونا چاہیے۔''

''میں اکتاہٹ کا شکار نہیں' بس ذرا ذہنی دباؤ ہے شاروں کے حوالے سے۔'' میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا پھر سوال کیا۔ ''بائی دی وے' تم نے میری تفریح طبع کے لیے کیا سوچا ہے؟''

''ایک آئیڈیا تو آیا ہے ذہن میں۔''

''کیسا آئیڈیا؟''

''اسٹرپ کلب!'' وہ معنی خیز انداز میں بولی۔

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''کیا تم اسٹرپ کلب جانا ناپسند کرتے ہو؟'' اس نے پوچھا۔ ''اکثر مرد دل بہلانے کے لیے ادھر کا رخ کرتے ہیں۔''

''نہیں..... مجھے ایسا کوئی شوق نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''میں مصنوعی زندگی کو پسند نہیں کرتا۔''

''پریسٹن ہالو میں دنیا کے ٹاپ آف دی لائن سات اسٹرپ کلبس ہیں۔'' وہ بتانے لگی۔ ''اسپیکٹرمنٹ رائنو، کیبرے رائل، بے بی ڈول سیلون، پلاٹینم لی کلب، پینڈورا مینس کلب، دی کلب ہاؤس اور ڈیس کیبرے۔''

میں نے ایک بات خاص طور پر محسوس کی کہ یہ تفصیل بیان کرتے ہوئے اس کے انداز میں ایک شرارت چھپی ہوئی تھی جیسے وہ مجھے چھیڑ رہی ہو یا میرے طبعی میلان کو چیک کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔ اس کے ذہن میں کیا تھا' یہ تو وہی جانتی تھی۔ میں اس حوالے سے کوئی حتمی رائے نہیں دے سکتا تھا کیونکہ میں نے اس مختصر سی مدت میں ڈیلفینا کو بہت گہرا پایا تھا لہٰذا یہ بات میں پورے وثوق سے کہہ سکتا تھا کہ اس نے اسٹرپ کلب کا تذکرہ بلاوجہ نہیں کیا تھا۔ وہ مجھے جانچنا چاہتی تھی۔

اسٹرپ کلب دراصل کلبس کی ایک مخلوط قسم ہے۔ آپ اسے نائٹ کلب اور بار کے سنگم سے تیار ہونے والا ایک تھیٹر سمجھ لیں جہاں پر پینے پلانے کی تمام سہولتوں کے علاوہ کیبرے ڈانس اور دیگر تفریحات کا بھی بندوبست ہوتا ہے۔ اس پر ''اسٹرپ'' کی مہر اس لیے ثبت کی گئی ہے کہ یہاں تفریح فراہم کرنے والی لڑکیاں اپنی لینجریز (زیر جامہ) سے اٹکھیلیاں کرتی ہیں۔ آسان الفاظ میں اس آئٹم کو آپ مجرے کی ایک ترقی یافتہ مادر پدر آزاد قسم کہہ سکتے ہیں۔

''میں نے کہا نا' مجھے مصنوعی زندگی بالکل پسند نہیں۔'' ڈیلفینا کی بیان کردہ تفصیل کے جواب میں' میں نے قطعی لہجے میں کہا۔

''کیا تم مولوی صاحب ہو؟'' اس نے اچانک پوچھا۔

''کیا مطلب؟'' میں الجھ کر رہ گیا۔

''تم مسلم ہو نا؟''

''الحمدللہ!'' میں نے جواب دیا۔ ''مگر تم یہ مسلم اور مولوی صاحب کا کیا ذکر نکال بیٹھی ہو؟''

''ارے یار! میں تو مذاق کر رہی تھی۔'' وہ ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔ ''دراصل جو لوگ عابد و زاہد ہوتے ہیں اور خود کو مولوی صاحب کہلاتے ہیں، وہ ان

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

چیزوں سے دور رہنے کی کوشش کرتے ہیں اس لیے تمہارے کھلے انکار پر میں نے پوچھ لیا کہ کہیں تم کوئی مولوی صاحب تو نہیں ہو۔''

''ڈیلفی! تم نے اس موضوع کو چھیڑا ہے تو میری بھی سن لو۔''

میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''پہلی بات تو یہ کہ میں ایک سیدھا سادہ مسلمان ہوں۔ دوسری بات یہ کہ جہاں تک زہد و تقویٰ کا معاملہ ہے تو دنیا کا ہر مذہب اس کی تلقین کرتا ہے۔ دیٹس آل۔''

''اوکے پروفیسر صاحب! مجھے معاف کردو۔'' وہ زیرِلب مسکراتے ہوئے شرارت بھرے انداز میں بولی۔ ''مجھ سے غلط بٹن دب گیا تھا۔ ویری سوری۔''

''اٹس اوکے!'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''ڈیلفینیا! میں ان حساس موضوعات پر گفتگو کرنے سے پرہیز کرتا ہوں جن کے حوالے سے میری معلومات مکمل نہ ہوں اور یہ بھی ایک ایسا ہی ٹاپک ہے۔''

''تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' وہ تائیدی انداز میں بولی۔ ''میں آئندہ اس بات کا خیال رکھوں گی لیکن میری خاطر تمہیں ایک کام تو کرنا ہی پڑے گا.....'' آخری جملہ اس نے بڑی لگاوٹ سے ادا کیا تھا۔

''کیا کام؟'' میں نے بے حد محتاط لہجے میں پوچھا۔

''کل میرے بنگلے پر ایک جید قسم کے مولوی صاحب آرہے ہیں۔'' وہ دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ بتانے لگی۔ ''تمہیں ان کے ساتھ ایک مختصر سی سٹنگ کرنا ہے۔''

''ٹھیک ہے' میں سٹنگ کرلوں گا مگر میں کسی بحث مباحثے یا مناظرے کے چکر میں نہیں پڑوں گا۔'' میں نے دوٹوک انداز میں اس پر واضح کردیا۔

''بے فکر رہو۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''بحث مباحثے کا کوئی پروگرام نہیں۔ وہ تو ہمارے تعلق کو مضبوط کرنے' ہمیں جوڑنے کے لیے آرہے ہیں۔''

''میں کچھ سمجھا نہیں!'' میری زبان اور آنکھوں میں الجھن ابھر آئی۔

''سب سمجھ میں آجائے گا۔'' وہ پُرمسرت انداز میں بولی۔ ''بس' ایک رات ہی کی تو بات ہے..... لیٹس ویٹ اینڈ سی۔''

وہ مولوی صاحب کا ذکر کرتے ہوئے ایسے خوش ہورہی تھی جیسے وہ ہمارا نکاح پڑھانے آرہا ہو.....!

☆☆☆

رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی اور میں ابھی تک جاگ رہا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ میں نے آج یعنی گزشتہ روز لنچ کے بعد قیلولہ کرلیا تھا۔ اگر انسان دن کے کھانے کے بعد نیپ یعنی مختصر سی نیند لے لے تو پھر رات کو دیر تک جاگنا آسان ہوجاتا ہے۔ میں جاگ رہا تھا اور مسلسل ڈیلفینیا کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس کی بہت سی باتیں اور بہت سی ادائیں میری سمجھ سے بالاتر تھیں۔ اس نے ابھی تک کوئی بھی معاملہ کھول کر میرے سامنے نہیں رکھا تھا۔ وہ ہر معاملے کا اغلب حصہ چھپا کر مجھ سے بات کرتی تھی۔

آدھا سچ ہو یا آدھا جھوٹ، یہ انسان کے ذہن کو الجھاتا ہے اور ان لمحات میں ڈیلفینیا کے حوالے سے میرا ذہن بھی الجھن کا شکار تھا اور شاید یہی میرے جاگنے کا سبب بھی تھا۔ میں پریسٹن ہال پہنچنے کے بعد اب تک پیش آنے والے واقعات پر غور کرنے لگا۔

ڈیلفینیا نے مجھے وہ ویڈیو کلپ دکھایا تھا جس میں' میں نے چرچ چکن ریسٹورنٹ کے کچن میں مار مار کر پیبلو کا حشر کردیا تھا اور وہ میری کٹاس کی تاب نہ لاتے ہوئے دارِفانی سے کوچ کرگیا تھا۔ میں نے ڈیلفینیا سے جب پوچھا کہ یہ ویڈیو اس کے ہاتھ کیسے لگی تو وہ بڑی خوب صورتی سے ٹال گئی تھی۔

یہی انداز اس نے نیوز بلیٹن کے سلسلے میں بھی اپنایا تھا۔ اس نے اس کمال کا سہرا اپنے کسی اوپر والے کے سر باندھ دیا تھا لیکن یہ نہیں بتایا تھا کہ اس کے اوپر کون بیٹھا ہے جس نے مجھے پیبلو مرڈر کیس سے صاف نکال لیا تھا۔ بس اس نے یہ کہا تھا کہ اس کے اوپر جو بھی ہے وہ بڑا طاقت والا ہے۔ اس کا یہ جملہ بھی میرے ذہن میں چکرا رہا تھا..... کیا تم نے زمینی خدا کے بارے میں سنا ہے؟

وہ یہ بھی جانتی تھی کہ میں زبان کا دھنی' معاملات کا کھرا اور سائیکالوجی کا اسٹوڈنٹ ہوں اور انہی صفات کی بنا پر وہ میرے ساتھ کسی قسم کا ایگری منٹ کرنا چاہتی تھی جس کی رو سے ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ بھرپور تعاون کرنا تھا لیکن اس ایگری منٹ کے مندرجات کیا ہوں گے' یہ بتانے سے وہ کنی کاٹ گئی تھی۔ بس یہ کہہ کر مجھے بہلا دیا تھا کہ میں ان کی ضرورت ہوں اور وہ میری ضرورت ہیں۔ اسی مقصد کی خاطر میرا انتخاب کیا گیا تھا۔

اس نے لنچ کے بعد مجھے سونے کی ہدایت کی تھی۔ مجھے اس وقت بالکل نیند نہیں آرہی تھی لیکن اس کا دعویٰ تھا کہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

اگر میں آنکھیں بند کر کے لیٹوں تو مجھے نیند آجائے گی اور پھر اس کا کہا سچ ثابت ہوا تھا۔ کیا وہ ایسی ہی ''کرنی والی'' کوئی باجی اللہ والی تھی یا اس کھانے میں کوئی خواب آور دوا ملائی گئی تھی؟

میرے جذباتی رجحان اور طبعی میلان کو چیک کرنے کے لیے اس نے بڑے شوخ وشنگ انداز میں اسٹرپ کلب کا ذکر بھی کیا تھا اور آخر میں وہ کسی مولوی صاحب کو لے آئی تھی۔ اور کچھ ہو یا نہ ہو لیکن یہ بات طے تھی کہ اس نے میرے حوالے سے اچھا خاصا ہوم ورک کر رکھا تھا۔ اب یہ اس کی ذاتی تحقیق تھی یا کوئی اور شخص اسے یہ معلومات فراہم کر رہا تھا، اس پر بات ہو سکتی تھی۔

ڈیلفینا نے میرے لیے جس بیڈ روم کا انتظام کیا تھا، وہ بھی مجھے کافی عجیب لگا تھا' خصوصاً اس کی ایک دیوار۔ وہ بیڈ روم عام بیڈ رومز ہی کی طرح کا تھا، سوائے ایک دیوار کے کیونکہ وہ دیوار پتھر و خشت کی بنی ہوئی نہیں تھی بلکہ مذکورہ دیوار کو رنگین شیشے کی مدد سے تیار کیا گیا تھا۔ اس دیوار کے شیشے میں پیلے اور سرخ رنگ کی آمیزش تھی۔ یہ دونوں رنگ آپس میں مل کر ڈارک براؤن کلر کا تاثر دیتے تھے جیسا کہ عام طور پر ٹنٹڈ گلاس ہوتے ہیں۔

ٹنٹڈ گلاس کے تصور نے مجھے بے چین کر دیا۔ گاڑیوں میں ایسے شیشے ایک خاص مقصد سے لگائے جاتے ہیں تاکہ گاڑی کے اندر موجود افراد کو باہر سے دیکھا نہ جا سکے لیکن اندر بیٹھے ہوئے لوگ باہر والوں کو آسانی سے دیکھ لیں۔ کیا اس بیڈ روم کی یہ ٹنٹڈ دیوار اسی لیے بنائی گئی تھی کہ بیڈ روم میں موجود شخص کو بہ آسانی دوسری جانب دیکھا جا سکے؟

اس خیال نے میری بے چینی میں کئی گنا اضافہ کر دیا کہ کوئی مجھے دیکھ رہا ہے اور ''یہ کوئی'' ڈیلفینا کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ اس بنگلے میں ہم دونوں کے سوا اور کوئی بندہ بشر موجود نہیں تھا۔ کم از کم میں نے تو پچھلے بارہ چودہ گھنٹوں میں یہاں کسی اور کو نہیں دیکھا تھا۔

بے پردگی کے احساس نے مجھے اٹھ کر بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔ میں بیڈ سے نیچے اتر آیا اور چاروں جانب نگاہ دوڑا کر وہاں موجود ہر شے کا تنقیدی جائزہ لینے لگا۔

بیڈ روم میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ میں نے فریج میں سے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکال کر ایک گلاس پانی حلق سے نیچے اتارا اور سوچنے لگا کہ اگر بیڈ روم میں موجود شخص کو واچ کرنے کے لیے یہ ٹنٹڈ گلاس وال بنائی گئی تھی تو پھر یقیناً کسی خفیہ مقام پر کوئی سی سی ٹی وی کیمرا بھی نصب کیا گیا ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی میرے ذہن میں وہ ویڈیو کلپ گھوم گیا جس میں چرچ چکن ریسٹورنٹ کے کچن کی ریکارڈنگ کی گئی تھی۔ ڈیلفینا ایسی شاطر حسینہ سے کچھ بھی بعید نہیں تھا۔ وہ مجھ پر نگاہ رکھنے کے لیے کوئی بھی ہتھکنڈا استعمال کر سکتی تھی۔

میں غیر ارادی طور پر سی سی ٹی وی کیمرے کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ اس ''نکل کھڑا ہونے'' سے میری مراد بیڈ روم سے باہر جانا ہرگز نہیں تھی۔ میں بیڈ روم کے مختلف حصوں اور باتھ روم میں مذکورہ کیمرا تلاش کر رہا تھا اور اس تلاش میں مجھے مکمل ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ ڈیلفینا نے اگر واقعی اس بیڈ روم میں کوئی سی سی ٹی وی کیمرا نصب کروا رکھا تھا تو وہ میری نگاہ میں نہیں آ سکا تھا۔

کسی چال باز کا مقابلہ چال بازی ہی سے کیا جا سکتا تھا۔ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ ڈیلفینا میری دشمن تھی لیکن یہ طے تھا کہ مجھے اس کے بارے میں مصدقہ معلومات حاصل نہیں تھیں۔ اس نے اپنی زبان سے مجھے جتنا بتایا تھا، میں اسی پر یقین کرنے پر مجبور تھا۔

آنکھ انسان کی ہو یا کیمرے کی، اسے دیکھنے کے لیے روشنی کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں نے پہلی فرصت میں بیڈ روم میں نصب متوقع سی سی ٹی وی کیمرے کو اندھا کرنے کا فیصلہ کیا اور وہاں کی تمام لائٹس آف کر دیں۔ بیڈ روم گہری تاریکی میں ڈوب گیا۔ اگلے ہی لمحے مجھے ایک دھیمی سی آواز سنائی دی۔

وہ کسی کے قدموں کی مخصوص چاپ تھی۔ بے ساختہ میری نگاہ ٹنٹڈ گلاس وال کی جانب اٹھ گئی۔ اگلے ہی لمحے مجھے یاد آ گیا کہ وہ آواز بیڈ روم کے باہر کوریڈور میں ابھری تھی۔ تھوڑی دیر پہلے میں چونکہ اس ٹنٹڈ گلاس وال کے بارے میں سوچ رہا تھا لہٰذا لاشعوری طور پر میری نظر اسی سمت اٹھی تھی۔

بیڈ روم کے باہر سنائی دینے والی انسانی قدموں کی مخصوص آواز نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ اس وقت بیڈ روم کے باہر کوئی موجود تھا اور میں نے جیسے ہی تمام لائٹس آف کیں' وہ وہاں سے کھسک گیا تھا۔

میری معلومات کے مطابق' اس وقت سوائے میرے اور ڈیلفینا کے اس بنگلے میں اور کوئی ذی روح موجود نہیں تھا۔ میں تو اپنے بیڈ روم کے اندر تھا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ڈیلفینا میرے بیڈ روم کے باہر کسی خاص

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

مشن میں مصروف تھی.....!

فطری تجسس کے ہاتھوں مجبور ہوکر میں نے فیصلہ کیا کہ ان انسانی قدموں کا تعاقب کرنا چاہیے جن کی دھیمی چاپ تھوڑی دیر پہلے میری سماعت تک پہنچی تھی۔ اس خیال کے ساتھ ہی میں نے بہ آہستگی ہینڈل گھما کر دروازہ کھولا اور باہر راہ داری میں نکل آیا۔

چاروں جانب خاموشی' سناٹے اور تاریکی کا راج تھا۔ میں نے ابھی تک اس بنگلے کا سروے نہیں کیا تھا۔ جب ایکس نے مجھے یہاں پہنچایا تو لیونگ روم میں ڈیلفینا سے میری تفصیلی ملاقات ہوئی تھی اور سہ پہر تک میں اسی لیونگ روم تک محدود ہوکر رہ گیا تھا۔ پھر ڈیلفینا کے ساتھ باہر نکلا تو رات گئے ہی واپس آیا تھا اور تب ڈیلفینا مجھے مختلف راہ داریوں میں سے گزار کر اس بیڈ روم میں لے آئی تھی اور مجھے بنگلے کے اندرونی حصوں کو دیکھنے کا موقع نہیں ملا تھا البتہ مجھے اتنا معلوم تھا کہ اس بیڈ روم کا دروازہ بنگلے کے عقبی حصے کی جانب کھلتا تھا جہاں ایک وسیع وعریض گراسی لان تھا جس کے بیچ میں ایک پُرشکوہ سوئمنگ پول بنا ہوا تھا۔ یہ مختصر سی معلومات مجھ تک ڈیلفینا عرف ڈیلفی کے توسط ہی سے پہنچی تھیں۔

میں بڑی احتیاط کے ساتھ دبے قدموں راہ داری میں کچھ آگے بڑھ آیا۔ یہاں سے لان اور سوئمنگ پول کو دیکھا جاسکتا تھا لیکن دبیز تاریکی کے باعث وہاں کا منظر واضح دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ لان کے چاروں جانب بنگلے کی باؤنڈری وال کے ساتھ سایہ دار درخت لگے ہوئے تھے جن کے بیچ تھوڑے تھوڑے فاصلے سے پھول دار پودوں کی مختلف کیاریاں تھیں۔ اس لان میں کسی خوب صورت باغ کا عکس دیکھا جاسکتا تھا لیکن اگر وہاں اندھیرا نہیں ہوتا تو.....!

میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تاریکی میں گھورنے لگا۔ میری تجسس بھری نگاہ کو کسی خاص منظر کی تلاش تھی اور پھر مجھے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہوگئی۔ میں نے سوئمنگ پول کی طرف کسی چیز کو متحرک دیکھا تھا۔

''کہیں یہ وہی شخص تو نہیں جو چند لمحے پہلے میرے بیڈ روم کے باہر موجود تھا؟''

ذہن میں ابھرنے والے اس سنسنی خیز سوال نے مجھے آگے بڑھنے پر مجبور کردیا۔ میں خود کو تاریکی کی آڑ میں رکھتے ہوئے بے آواز قدموں سے پیش قدمی کرنے لگا۔ ان لمحات میں میرے دل کی دھڑکن میں اچھا خاصا اضافہ ہوگیا تھا۔ میں وقفے وقفے سے سانس روک کر اپنی ذہنی کیفیت کو کنٹرول کررہا تھا۔ اس مہم تجسس سفر میں' میں کافی آگے نکل آیا اور پھر وہ مجھے دکھائی دے گیا۔

وہ سوئمنگ پول کے اندر تھا۔ میں ایک تناور درخت کی آڑ لے کر کھڑا ہوگیا اور اس شخص پر نگاہ گاڑ دی۔ میں اس وقت ایک محفوظ مقام پر کھڑا تھا۔ کوئی وہاں میری موجودگی کا نوٹس نہیں لے سکتا تھا۔

وہ جو کوئی بھی تھا' سوئمنگ پول میں سوئمنگ کررہا تھا۔ اس کے بازوؤں کی مخصوص حرکات اور سینے کے اسٹروکس سے سوئمنگ پول کے پانی میں پیدا ہونے والی آوازیں میری سماعت تک پہنچ رہی تھیں۔ میں حیرت زدہ تھا کہ اتنی رات گئے کس کو سوئمنگ کا شوق چڑھا ہے۔ میں بڑی شدت سے اس کا چہرہ دیکھنے کا متمنی تھا۔

پھر میری مراد بر آئی۔ جب وہ سوئمنگ کرتے ہوئے میری جانب بڑھا تو مجھے یہ سمجھنے میں کسی دشواری کا سامنا نہیں ہوا کہ وہ کوئی مرد نہیں بلکہ ایک عورت تھی۔ میرا دھیان آپوں آپ ڈیلفینا کی طرف چلا گیا۔ یہ اس کے سوا اور کوئی

ثبوت

جھوٹ سچ کا حال خدا جانے۔ لیکن ایک دوست اپنا تجربہ بیان کرتے ہیں کہ دو ماہ قبل ان کے گلے میں خراش ہوئی، جو ان کے نزدیک بدمزہ کھانے اور گھر والوں کے خیال میں سگریٹ کی زیادتی کا نتیجہ تھی۔ شروع میں تو انہیں اپنی بیٹھی ہوئی آواز بہت بھلی معلوم ہوئی اور کیوں نہ ہوتی؟ سنتے چلے آئے ہیں کہ بیٹھی ہوئی (HUSKY) آواز میں بے پناہ جنسی کشش ہوتی ہے۔ خدا کی دین تھی کہ گھر بیٹھے آواز بیٹھ گئی۔ ورنہ امریکا میں تو لوگ کوکا کولا کی طرح ڈالر بہاتے ہیں جب کہیں آواز میں یہ مستقل زکام کی سی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ لہٰذا جب ذرا افاقہ محسوس ہوا تو انہوں نے راتوں کو گڑگڑا گڑگڑا کر، بلکہ خنخنا خنخنا کر دعائیں مانگیں:

''بارالٰہی! تیری شان کریمی کے صدقے، یہ سوزش بھلے ہی کم ہوجائے، مگر بھراہٹ یونہی قائم رہے!''

لیکن چند دن بعد جب ان کا گلا خالی نل کی طرح بھق بھق کرنے لگا تو انہیں بھی تشویش ہوئی۔ کسی نے کہا ''لقمان کا قول ہے کہ پانی پیتے وقت ایک ہاتھ سے ناک بند کرلینے سے گلا کبھی خراب نہیں ہوتا۔''

ایک صاحب نے ارشاد فرمایا۔ ''سارا فتور پھل نہ کھانے کے سبب ہے۔ میں تو روزانہ نہار منہ پندرہ فٹ گنا کھاتا ہوں۔ معدہ اور دانت دونوں صاف رہتے ہیں۔''

اور ثبوت میں انہوں نے اپنے مصنوعی دانت دکھائے جو واقعی بہت صاف تھے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

نہیں ہوسکتی تھی۔

میں گہری توجہ سے اس کی سوئمنگ کا نظارہ کرنے لگا۔ میں اسے سہ پہر میں ٹینس کھیلتے دیکھ چکا تھا۔ اس کے بدن کے مختلف اعضا اپنی مخصوص حرکات وسکنات سے بڑی دل نشین شاعری کرتے تھے اور سوئمنگ کے دوران میں تو سڈول بدن کی شادابی جنبشوں والی یہ شاعری بام عروج کو چھو رہی تھی۔ میں سحر زدہ ہو کر یک ٹک اس جل پری کو دیکھتا چلا گیا۔

پھر اس نے سوئمنگ روک دی۔ پتا نہیں' وہ تھک گئی تھی یا اس کا شوق پورا ہوگیا تھا۔ اب کی بار جو وہ پول کے اس کنارے کی طرف آئی تو پھر پلٹ کر واپس نہیں گئی۔ اس نے سیڑھیوں کی ریلنگ پکڑلی جو سوئمنگ پول کے اندر اترنے کے لیے استعمال ہوتی تھیں۔ پھر وہ سیڑھیوں پر قدم قدم اوپر اٹھتے ہوئے سوئمنگ پول سے باہر نکل آئی۔

اب وہ مجھے واضح طور پر دکھائی دے رہی تھی۔ وہ ڈیلفینا ہی تھی۔ اگرچہ تاریکی کے باعث میں اس کے چہرے کے خال وخط نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن اس کا قد کاٹھ اور باڈی فریم میری یادداشت میں محفوظ ہوکر رہ گیا تھا۔ میں اس کے سراپا کو تاریکی کے باوجود بھی بہ آسانی پہچان سکتا تھا۔ ڈیلفینا پانی سے باہر آئی تو کسی منہ زور سمندری ریلے کی تفسیر بنی ہوئی تھی۔ مخصوص سوئم سوٹ میں اس کے بدن کی دل کشی پوری آب وتاب کے ساتھ نمایاں ہورہی تھی۔ قریب ہی ایک چوبی بینچ پر جہازی سائز باتھ ٹاول پڑا تھا۔ وہ سوئمنگ کاسٹیوم میں ایک شانِ بے نیازی سے چلتے ہوئے بینچ تک گئی پھر ٹاول کو اٹھا کر اپنے بھیگے ہوئے بالوں کو خشک کرنے لگی۔ ان لمحات میں اس کی پشت میری جانب تھی۔

میں جس درخت کی آڑ میں سانس روکے دبکا کھڑا تھا وہ سوئمنگ پول کے بہت قریب تھا لیکن میرا زاویہ ایسا تھا کہ وہ مجھے نہیں دیکھ سکتی تھی مگر میں اسے خاصی وضاحت کے ساتھ واچ کرسکتا تھا اور..... واچ کر بھی رہا تھا!

بالوں کو ٹاول سے خشک کرنے کے بعد اس نے ٹاول کو ادھر بینچ پر ہی چھوڑ دیا اور واپس جانے کے لیے مڑی اور اسی وقت اس کا چہرہ میری بصارت کی حدود میں آگیا۔ وہ تو مجھے دیکھ نہیں پائی مگر میں اس کی آنکھوں کو دیکھنے میں کامیاب ہوگیا تھا اور اس کامیابی نے مجھے اندر باہر سے لرزا کر رکھ دیا تھا۔

میں نے دیکھا' ڈیلفینا کی آنکھوں میں سے بڑی خطرناک قسم کی سرخ روشنی خارج ہورہی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا' آنکھوں کی جگہ دو دہکتے ہوئے سرخ انگارے رکھ دیے گئے ہوں۔ ان لمحات میں وہ مجھے کسی اور ہی دنیا کی مخلوق نظر آرہی تھی۔

اس کو دیکھ کر مجھے عجیب ہی دہشت اور خوف کا احساس ہوا۔ میری جگہ اگر کوئی کمزور دل شخص اس سناٹے دار تاریک ماحول میں اسے دیکھ لیتا تو اسے دل کا دورہ بھی پڑسکتا تھا۔

وہ ایک سو ایک فیصد آسیب زدہ دکھائی دیتی تھی۔

وہ مشینی انداز میں میرے قریب سے گزری اور بنگلے کے اندرونی حصے کی جانب بڑھ گئی اور..... میرے ذہن میں سوالات کا ایک اور انبار لگا گئی۔

یہ بات تو طے تھی کہ تھوڑی دیر پہلے جو محسوس ہوا تھا کہ میرے بیڈروم کے باہر کوئی کن سوئیاں لے رہا ہے' وہ ڈیلفینا ہرگز نہیں تھی کیونکہ عین اسی وقت پر ڈیلفینا سوئمنگ پول کے اندر سوئمنگ کررہی تھی لیکن رات کے اس پہر سوئمنگ کی کوئی تک سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ اس کے بدن میں کون سی ایسی آگ لگی ہوئی تھی جسے ٹھنڈا کرنے کے لیے وہ نصف شب کے بعد سوئمنگ پول میں اترنے پر مجبور ہوئی تھی؟

یہ سوال اور اس سے ملتے جلتے کئی اور سوال سوچ کے نئے نئے در وا کررہے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی ڈیلفینا کی دہکتی ہوئی انگارا آنکھیں بھی کوئی رونگٹے کھڑے کرنے والی کہانی سنا رہی تھیں۔ میرے ذہن میں سوال اٹھا۔

''کیا ڈیلفینا کوئی انسان ہے یا جن زادی یا..... کوئی آسیب زدہ حسین دوشیزہ.....؟''

وہ جو کوئی بھی تھی' کسی طلسماتی معمے سے کم نہیں تھی۔ میں اس معمے کو حل کرنے کی جتنی کوشش کرتا تھا، یہ پزل... پرسنالٹی اتنا ہی الجھتی جاتی تھی۔ میں نے اس خیال کے ساتھ اس کے تصور کو ذہن سے جھٹکا اور اپنے بیڈروم کی طرف چل پڑا کہ..... صبح میں ڈیلفینا سے اس ''غسلِ نصف شب'' کا راز جاننے کی کوشش کروں گا۔

میں دبے قدموں جیسے اپنے بیڈروم سے نکلا تھا ویسے ہی بہ آہستگی واپس آگیا۔ میں نے بڑی احتیاط کے ساتھ دروازہ بند کیا اور لائٹ جلائے بغیر بیڈ پر آکر لیٹ گیا۔ ارادہ یہی تھا کہ دماغ کو خصوصی ہدایت دینے کے بعد کچھ تان کر سوؤں گا لیکن بیڈروم کی تاریکی میں ایک اور مصیبت میری منتظر تھی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

میں جیسے ہی بستر پر دراز ہوا' میرا پہلو جل اٹھا یعنی..... وہ دیوار روشن ہوگئی جس میں ٹنٹڈ گلاس لگا ہوا تھا اور حیرت کی بات یہ تھی کہ اس ڈارک براؤن کلر کے ٹنٹڈ گلاس کی دوسری جانب کا منظر مجھے پوری آب و تاب کے ساتھ نظر آرہا تھا۔ دوسری جانب بھی ایک بیڈ روم ہی تھا اور کنگ سائز سرخ رنگ کے مخملیں بیڈ پر ڈیلفینا محوِ استراحت تھی.....!

میرا دماغ گھوم کر رہ گیا۔ جب میں رات کے ابتدائی حصے میں اپنے بیڈ روم میں سونے کے لیے آیا تھا تو ڈارک براؤن کلر گلاس سے بنی ہوئی یہ دیوار مجھے یکسر اندھی دکھائی دی تھی اور میں یہی سمجھا تھا کہ یہ باہر سے چوری چوری اندر دیکھنے کے لیے بنائی گئی ہے لیکن یہ تو معاملہ ہی الٹا نکلا تھا۔ میں اپنے بیڈ روم کی تاریکی میں ڈیلفینا کی نگاہ سے اوجھل تھا اور وہ روزِ روشن کی طرح ٹنٹڈ گلاس کی دوسری طرف اپنے بیڈ پر عیاں تھی۔ میں نے تھوڑی دیر پہلے اپنی آنکھوں سے اسے ادھر سوئمنگ پول پر سوئم سوٹ میں دیکھا تھا اور اب یہ سرخ ریشمی نائٹی میں بیڈ پر دراز تھی اور یہی نظر آتا تھا کہ وہ گہری نیند میں ہے۔ اس کے سینے کے زیر و بم میں ایک دھیما پن اور توازن دکھائی دیتا تھا۔ میرے ذہن نے چیخ کر پوچھا۔

''اگر برابر والے بیڈ روم میں ڈیلفینا گہری نیند کے مزے لوٹ رہی ہے تو پھر چند لمحے پہلے سوئمنگ پول میں سوئمنگ کون کر رہا تھا اور اگر سوئمنگ کرنے والی ڈیلفینا تھی تو پھر سرخ نائٹی میں کون محوِ خواب ہے؟ کیونکہ اس دوران میں اتنا وقت نہیں گزر سکتا تھا کہ غسل کرنے والی ڈیلفینا لباس تبدیل کر کے یوں بیڈ پر لیٹ کر گہری نیند کی وادیوں کی سیر کو نکل جائے.....اور یہ ایک ہی شخصیت کے دو پرت تھے تو پھر یہ بہت ہی سنگین اور خطرناک معاملہ تھا۔

اسی وقت ڈیلفینا کے کہے ہوئے الفاظ میری سماعت پر ہتھوڑے برسانے لگے۔ میرے اس سوال کے جواب میں کہ تم کہاں رہتی ہو؟ اس نے کہا تھا..... میں کہیں نہیں رہتی اور میں ہر جگہ رہتی ہوں!

یہ میری نظر کا دھوکا تھا یا ڈیلفینا فورتھ ڈائمینشن کی سائنس پر قدرت رکھتی تھی اور بہ یک وقت ایک سے زیادہ مقامات پر دیکھی جاسکتی تھی.....؟

سرخ بیڈ پر سرخ مخملیں نائٹی میں خوابیدہ ہسپانوی حسن اپنی تمام تر اسراریت کے ساتھ میرے ذہن کو تہ و بالا کر رہا تھا۔ جو کچھ پیش آرہا تھا اس کے تناظر میں میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بج اٹھی کہ یہ ڈیلفینا بہت ہی خطرناک دوشیزہ ہے۔ اس کے سامنے ایک ایک قدم پھونک پھونک کر رکھنا ہوگا اور ایک ایک سانس احتیاط کے ساتھ لینا ہوگی ورنہ کچھ بھی ہوسکتا ہے..... کچھ بھی!

جب ڈیلفینا پر میری پہلی نظر پڑی تھی تو وہ میری ہی جانب کروٹ لیے سو رہی تھی۔ اس کا جسم ساکت تھا لیکن سینے کا اتار چڑھاؤ سانس کی آمد و شد کا پتا دیتا تھا۔ وہ زندہ تھی اور گہری نیند میں ڈوبی ہوئی تھی۔

اچانک اس کے وجود میں حرکت ہوئی اور وہ تھوڑا کسمسانے کے بعد چاروں خانے چت سیدھی ہوگئی۔ اس کے ہاتھ پاؤں میں بڑی دل کش بے ترتیبی پائی جاتی تھی۔ دودھ اور شہد میں گندھا ہوا اس کا کندن بدن ریشمی نائٹی سے بغاوت کرتا دکھائی دیتا تھا۔ مختلف اعضا مخملیں پناہ سے نکل کر پوری آن بان اور شان کے ساتھ سرخ بستر پر جلوہ افروز ہو چکے تھے اور دیکھنے والی آنکھ کو چیلنج کر رہے تھے کہ ہمت ہے تو آؤ اور مجھے سمیٹ لو۔

میری کن پٹیاں سنسنا اٹھیں۔ رگوں میں خون کی گردش اتنی تیز تھی کہ اپنی رفتار میں روشنی کو شرما رہی تھی۔ خون کے سرکش طوفانی ریلے دماغ پر ٹھوکریں رسید کر رہے تھے۔ میرے بازوؤں میں اتنی قوت اور ہمت تو تھی کہ میں ڈیلفینا کے خاموش چیلنج کو قبول کرلوں اور اس کی بکھری ہوئی خوابیدہ شخصیت کو اپنی آغوش میں سمیٹ لوں لیکن میں نے اس مہم جوئی کا ارادہ نہیں کیا اور انواع و اقسام کے لذیذ کھانوں سے سجے دسترخوان سے بھوکا ہی اٹھ آیا۔

میں نے بستر پر دراز ہو کر آنکھیں بند کرلیں اور بدن کو ڈھیلا چھوڑ دیا پھر گہری سانسیں لے کر خون کی حدت اور ماحول کی شدت کو کم کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ ڈیلفینا نے میرے جذبات اور احساسات کو آزمائش کی سولی پر چڑھا دیا تھا۔ ان لمحات میں مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ایک تیز نوک دار آہنی سلاخ میرے دل و دماغ کو چھید رہی ہو۔ اس ہیجانی کیفیت سے نکلنے کے لیے مجھے چند منٹ لگے اور میں نارمل ہوگیا۔

آنکھوں کو بہ دستور بند رکھتے ہوئے میں نے اپنے دماغ کو ہدایت دی۔ ''میں پُرسکون اور گہری نیند سوؤں گا اور جب تک میری نیند پوری نہیں ہوجاتی' میں سوتا رہوں گا۔ اس دوران میں اس بنگلے کے اندر اگر کوئی ایسا واقعہ رونما ہونے کے امکانات پیدا ہوئے جو کسی بھی حوالے سے میرے لیے نقصان دہ ثابت ہوسکتا ہو تو میری آنکھ اس ضرر رساں واقعے کے ظہور سے پہلے ہی کھل جائے گی۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

انسانی دماغ اس دنیا کا پہلا اور آخری عجوبہ ہے۔ اس کے میکانزم کو ابھی تک مکمل طور پر سمجھا نہیں جاسکا۔ جو چیز مکمل طور پر سمجھ میں آجائے وہ پھر عجوبہ کہاں رہتی ہے!

انسان دن بھر جس نوعیت کے حالات سے گزرتا رہتا ہے' خصوصاً رات کو سونے سے پہلے اس کے دماغ میں جو سوچ ہوتی ہے' اسی فی صد خواب وہ اسی سے متعلق دیکھتا ہے۔ اس وقت ڈیلفینا اور اس کی کرشمہ کاریاں میرے دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھیں لہٰذا میں نے خواب میں بھی اسی کو دیکھا اور یہ بڑا معنی خیز خواب تھا۔

میں نے دیکھا کہ ایک بہت بڑا ہال ہے جہاں کم وبیش دو درجن افراد جمع ہیں جن میں خواتین و حضرات سب شامل ہیں۔ اس ہال کا ماحول قدیم زمانے کا ہے۔ بڑے بڑے پتھروں سے بنی ہوئی دیواریں اور اونچی منقش چھت جیسا کہ رومن اور یونانی تہذیب میں نظر آتی ہیں۔ وہاں پر موجود تمام افراد جتنہ نما قیمتی لباس زیب تن کیے ہوئے تھے۔ وہ بہت ہی محترم اور معزز دکھائی دیتے تھے اور ایک دوسرے کے ساتھ بھی بڑے احترام کے ساتھ پیش آرہے تھے۔ انہی مرد وزن کے بیچ مجھے ڈیلفینا بھی نظر آگئی۔

ڈیلفینا کا بناؤ سنگار اور تیاری دیکھنے کے لائق تھی۔ وہ اس طرح بنی سنوری تھی جیسے تقریب اسی کے نام ہو..... اس کی سالگرہ یا منگنی یا شادی یا اسی نوعیت کی کوئی اہم اور یادگار تقریب۔

پھر اس پُرشکوہ ہال میں' میں نے ایک ایسے شخص کو داخل ہوتے دیکھا جس کی حیثیت وہاں مہمانِ خصوصی ایسی تھی۔ اسے دیکھ کر سب باادب' باملاحظہ' ہوشیار ہوگئے تھے۔ اس بارعب شخصیت نے سیاہ پینٹ کوٹ سوٹ پہن رکھا تھا اور اس کے جوتے بھی سیاہ ہی تھے البتہ شرٹ سفید تھی اور اس نے گرے ڈائس والی ٹائی بھی لگا رکھی تھی۔ اس کے سر پر اونچی ٹاپ والا سیاہ ٹال فیڈورا ہیٹ نظر آرہا تھا۔ اس کی آنکھیں سبز تھیں اور اس نے فریم لیس چشمہ لگا رکھا تھا۔ اس کے چہرے پر میڈیم سائز کی ڈاڑھی بھی تھی جس میں سفید اور بھورے بالوں کا تناسب ایک جیسا تھا۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق' اس کی عمر پچاس کے اریب قریب رہی ہوگی۔ وہاں پر موجود افراد میں سے بعض اس سے عمر میں زیادہ بڑے تھے لیکن سب اس کے سامنے ادب سے جھک رہے تھے اور وہ سب کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔

ڈیلفینا کے قریب پہنچ کر وہ رک گیا۔ ڈیلفینا نے بڑے احترام کے ساتھ اس شخص کے ہاتھ چومے۔ اس نے ڈیلفینا کی پیشانی پر بوسہ دیا اور شفقت بھرا ہاتھ اس کے سر پر پھیرا پھر اس تقریب کا باقاعدہ آغاز ہوگیا۔

میں نے دیکھا کہ اس محترم شخصیت نے اپنے ہاتھوں سے ڈیلفینا کو ایک تاج پہنایا جس پر' وہاں موجود تمام افراد نے ڈیلفینا کو مبارک باد دی۔ یہ تاج پوشی ٹائپ کی کوئی تقریب تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ ڈیلفینا کوئی اہم شخصیت ہے اور اس تقریب میں اس کے کسی عظیم کارنامے کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے اسے اعزاز سے نوازا گیا تھا۔

میں اگر یہ خواب نہیں بھی دیکھتا تو ڈیلفینا کی اہمیت پچھلے چوبیس گھنٹوں میں متعدد بار مجھ پر آشکار ہوچکی تھی اور اس خواب میں جانے سے پہلے تو اپنی خواب گاہ میں رہتے ہوئے' حالت نیند میں وہ بہ نفسِ نفیس' بہ بدنِ دیز میری آنکھوں کو خیرہ کرچکی تھی.....!

☆☆☆

آئندہ روز میری آنکھ تیز دستک کی آواز پر کھلی۔

کوئی بے دریغ دروازے کو پیٹ رہا تھا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور دروازے کی طرف تکنے لگا۔ اگلے ہی لمحے ڈیلفینا کی مترنم آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''علی! کیا تم ابھی تک سو رہے ہو؟''

میں نے نگاہ اٹھا کر دیوار گیر کلاک کی طرف دیکھا۔ کلاک گیارہ سے چند منٹ پہلے کا وقت بتا رہا تھا اور ظاہر ہے کہ یہ دن کے گیارہ تھے۔ میں نے بستر سے اٹھتے ہوئے کہا۔

''نہیں..... میں جاگ گیا ہوں۔ تم نے بیڈروم کے دروازے پر اپنی نازک ہتھیلیوں کی طوفانی ضربات سے جو صور پھونکا ہے اس کی ہیبت ناک آواز تو مجھے تاریک قبر کی نیند سے بھی بیدار کرسکتی تھی' یہاں تو میں ٹنڈ گلاس وال والے آرام دہ بیڈروم میں سو رہا تھا۔''

بات ختم کرتے ہی میں بستر سے اترا اور دروازے کی سمت قدم بڑھا دیے۔ میرے ''ٹنڈ گلاس وال'' والے الفاظ نے اس کی بولتی بند کردی تھی لیکن یہ خاموشی لمحاتی تھی۔ اگلے ہی لمحے اس کی سہلی ہوئی آواز سنائی دی۔

''شکر ہے' تم اٹھ گئے۔ میں تو سمجھ رہی تھی تمام گدھے گھوڑے بیچ کر بڑی فراغت سے سو رہے ہو۔ دیکھو تو ٹائم کیا ہوا ہے.....!''

ادھر اس کی بات ختم ہوئی' ادھر میں نے اس کے سامنے بیڈروم کا دروازہ کھول دیا پھر اس کی آنکھوں میں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ٹائم دیکھ چکا ہوں۔ گیارہ بجنے والے ہیں اور.....'' لمحاتی توقف کرکے میں نے ایک گہری سانس لی پھر بہ دستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''ڈیلفی جی! مجھے گدھے اور گھوڑے پالنے کا کوئی شوق ہے اور نہ ہی ان کی خرید و فروخت سے کوئی دلچسپی۔ میں جن حالات سے گزر رہا ہوں اس میں تو یہی محسوس ہو رہا ہے کہ خود کو ہی بیچنا پڑے گا۔''

''تمہاری یہ خواہش ضرور پوری کی جائے گی۔'' وہ بھی جواباً میری آنکھوں میں بہت دور تک دیکھتے ہوئے بولی۔ ''لیکن فی الحال تم جلدی سے فریش ہو کر لیونگ روم میں آجاؤ۔ بس تھوڑی ہی دیر میں ربی بنگلے پر پہنچنے والے ہیں۔''

''کون ربی؟'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''ارے یار! رات میں نے تمہیں بتایا نہیں تھا کہ ایک مولوی صاحب سے تمہاری ملاقات کراؤں گی۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''ربی ہمارے لیے بہت محترم شخصیت ہیں۔''

''اوکے .....میں تیار ہو کر آرہا ہوں۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔

وہ واپس جانے کے لیے پلٹ گئی۔ میں واش روم میں گھس گیا۔

اس وقت میں نے ڈیلفینا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کی تھی اور اس کی آنکھوں میں مجھے وہ شعلہ بار گی دکھائی نہیں دی تھی جو گزشتہ شب سوئمنگ پول پر نظر آئی تھی۔ اس وقت اس کی آنکھیں دہکتے ہوئے انگارے بن گئی تھی لیکن ابھی وہ بالکل نارمل تھیں جیسا کہ عموماً ہوا کرتی تھیں۔

میں نے ڈیلفینا کے تصورات سے کھیلتے ہوئے ایک بھرپور شاور لیا اور تیار ہو کر لیونگ روم میں پہنچ گیا۔ ڈیلفینا پہلے سے ڈائننگ ٹیبل پر موجود تھی۔ ڈائننگ والا پورشن لیونگ روم سے ملحقہ تھا۔ بیچ میں بیڈز والی لڑیاں لٹک رہی تھیں۔ یہ رنگ برنگی بیڈز والی لڑیاں ڈائننگ والے پورشن کو مکمل پرائیویسی فراہم کرتی تھیں۔

ناشتے کے دوران میں ڈیلفینا خاموش رہی تاہم تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد وہ کن انکھیوں سے بڑے معنی خیز انداز میں مجھے دیکھ لیتی تھی۔ اس کی اس اچٹتی ہوئی نظر میں یہ سوال جھلکتا تھا کہ میں اس سے کچھ پوچھ کیوں نہیں رہا ہوں۔ وہ مجھ سے متعدد استفسارات کی توقع کر رہی تھی لیکن میں نے بھی یہ طے کرلیا تھا کہ اب اس سے کوئی سوال نہیں کروں گا۔ اس کی ذات کے حوالے سے مجھے جو کچھ بھی جاننا ہوگا، وہ اپنے ذرائع سے معلوم کرنے کی کوشش کروں گا۔ میں نے اپنے بل بوتے پر اسے ایکسپلور کرنے کی ٹھان لی تھی۔

ہم ناشتے سے فارغ ہو کر لیونگ روم میں آبیٹھے۔ اسی وقت ڈیلفینا کے سیل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کرنے کے بعد کال ریسیو کرلی۔

وہ چند لمحات تک ''ہوں ہاں'' کرتی رہی پھر اٹھ کر کھڑی ہوگئی اور اطلاع دینے والے انداز میں بولی۔

''علی! ربی آگئے ہیں۔ میں انہیں لے کر آرہی ہوں۔ تم ذہنی طور پر تیار رہنا۔''

''میں تیار بیٹھا ہوں۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''لے آؤ جس کو بھی لانا ہے۔''

وہ لیونگ روم سے نکل گئی۔

گزشتہ رات ٹینس کورٹ سے واپس گھر کی طرف آتے ہوئے اس نے مجھے بتایا تھا کہ آج وہ کسی مولوی صاحب سے مجھے ملوائے گی پھر ابھی مجھے بیدار کرتے وقت اس نے وضاحت کردی تھی کہ وہ مولوی صاحب دراصل ان کے ربی ہیں جن کا وہ بہت احترام کرتے ہیں۔ میری معلومات کے مطابق ربی یہودیوں کا مذہبی پیشوا اور روحانی راہ نما ہوتا ہے۔ مسلمانوں میں جو حیثیت عالم دین کی ہے یہودیوں میں اسی حیثیت کا حامل ربی ہوتا ہے۔ اس سے ایک بات واضح ہوگئی تھی کہ ڈیلفینا مذہبی اعتبار سے ایک یہودن تھی یا کم از کم یہودیت کو ماننے والوں میں سے تھی جبھی وہ ایک ربی کو قابل احترام گردان رہی تھی..... لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ وہ مجھے کسی ربی سے کیوں ملوانا چاہتی تھی؟

مذہب کوئی بھی ہو، آپ اس کی تقلید کریں یا نہ کریں مگر اس کا احترام لازم ہے کیونکہ ہر مذہب کو ماننے والوں کی تعداد لاکھوں، کروڑوں اور اربوں میں ہوتی ہے۔ جب آپ کسی مذہب کی بے حرمتی کرتے ہیں تو گویا لاکھوں یا کروڑوں یا اربوں انسانوں کے جذبات کا خون کر رہے ہوتے ہیں۔ احترام آدمیت کا تقاضا یہ ہے کہ آپ ہر عالم کی عزت کریں، چاہے اس کے نظریات سے آپ کو کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو۔ علم ہمیشہ واجب الاحترام ہوتا ہے چاہے وہ آپ کے پاس ہو یا آپ کے دشمن کے پاس۔

ابھی پانچ منٹ بھی نہیں گزرے ہوں گے کہ ڈیلفینا واپس لوٹ آئی۔ اس کے ہمراہ ایک شخص تھا۔ اس شخص پر نگاہ پڑتے ہی میں چونک اٹھا۔ میں نے چند گھنٹے پہلے ہی اسے اپنے خواب میں دیکھا تھا۔

سیاہ سوٹ میں ملبوس اس شخص نے اپنی گرین آنکھوں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

پر فریم لیس چشمہ لگا رکھا تھا۔ سفید شرٹ پر چیک دار گرے ڈائس والی ٹائی اور سر پر سیاہ نال فیڈ وراہیٹ بھی نظر آرہا تھا۔ ''نال فیڈ وراہیٹ'' دراصل ''ٹاپ ہیٹ'' کی ایک شکل ہے جس میں ٹاپ کافی اونچائی پر ہوتی ہے۔ ڈیلفینا کے ساتھ لیونگ روم میں داخل ہونے والے اس شخص کی ڈاڑھی میں سفید اور بھورے بالوں کی کھچڑی سی بنی ہوئی تھی اور اس کی عمر لگ بھگ پچاس سال نظر آتی تھی۔ یہ وہی شخص تھا جس نے میرے خواب میں ڈیلفینا کی تاج پوشی کی تھی۔ وہاں پر موجود ہر شخص اس کا بے حد ادب کررہا تھا اور اب..... ڈیلفینا ایک ربی کی حیثیت سے اسے مجھ سے طوار ہی تھی۔

اس ربی کو دیکھتے ہی میں بے ساختہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ میری اس بے اختیار حرکت میں ایک خاص قسم کا احترام پایا جاتا تھا۔ ربی ڈیلفینا کی معیت میں چلتے ہوئے مجھ تک پہنچا پھر زیر لب مسکراتے ہوئے اس نے میرے سر پر شفقت بھرا ہاتھ پھیرا اور بڑی نرمی سے بولا۔

''بیٹھ جاؤ مائی سن!''

میں نے اس کی بات مان لی۔ وہ بھی میرے سامنے ایک صوفے پر براجمان ہوگیا۔ ڈیلفینا ہم دونوں کے بیچ پل کا کردار ادا کرتے ہوئے سائڈ کے ایک صوفے پر بیٹھ گئی پھر ربی کا تعارف کراتے ہوئے بولی۔

''علی! یہ ہمارے محترم ربی آئزک باروخ لاؤ ہیں۔ تل ابیب سے تشریف لائے ہیں۔ ہماری یہ خوش قسمتی ہے کہ انہوں نے ہمیں کچھ وقت دینے کا فیصلہ کیا ورنہ ان کی اپنی اتنی زیادہ مصروفیات ہیں کہ انہیں اسرائیل سے باہر نکلنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ اسرائیل کے تمام مذہبی اور روحانی معاملات کو دیکھنے کے لیے دو ربی کا انتخاب کیا جاتا ہے جن میں سے ایک اشکے نازی ربی کہلاتے ہیں اور دوسرے سیفارڈی ربی کہلاتے ہیں۔ ان ربیز کا چناؤ دس سال کے لیے ہوتا ہے۔ آئزک باروخ لاؤ اشکے نازی ربی ہیں جبکہ ان کے ساتھی سیفارڈی ربی کا نام یٹ زاک سائمن ہے۔ یہ دونوں چیف ربیز کہلاتے ہیں یہ ان کا چناؤ دو ہزار تیرہ میں کیا گیا تھا۔ مطلب یہ کہ دو ہزار تیس تک یہی دونوں افراد تمام تر مذہبی اور روحانی امور کنٹرول کریں گے۔''

مجھے اس تفصیل سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ آئزک باروخ لاؤ کس پائے کا ربی تھا تاہم اس کی ذات کے حوالے سے میرے ذہن میں ایک خاص نوعیت کا تجسس جاگ اٹھا تھا کیونکہ گزشتہ رات میں نے اسے خواب میں دیکھا تھا۔ بہرحال میں نے معتدل انداز میں کہا۔

''آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔''

''سدا خوش رہو مائی سن۔'' وہ ہونٹوں پر نرم مسکراہٹ سجاتے ہوئے بولا۔ ''میں ایک ضروری کام سے کنگلیٹ آیا ہوا تھا۔ ڈیلفی نے تعریفی انداز میں تمہارا تذکرہ کیا تو میرے دل میں تم سے ملاقات کا اشتیاق پیدا ہوگیا اور میں یہاں چلا آیا تاکہ تمہارے ہاتھوں کو دیکھ سکوں۔''

''میرے ہاتھوں کو.....؟'' میں نے چونک کر حیرت بھرے انداز میں ربی کی طرف دیکھا۔ ''حضرت! میں کچھ سمجھا نہیں۔''

''ڈیلفی نے مجھے بتایا ہے کہ تمہاری ہتھیلی پر دو انتہائی اہم نشان ہیں۔'' ربی آئزک باروخ لاؤ ٹھہرے ہوئے انداز میں بولا۔ ''اس نے مجھے تمہارے ہاتھوں کا پرنٹ بھی بھیجا تھا۔ میں ہاتھ کی لکیروں کا علم جانتا ہوں۔''

اب کی بار میں نے سوالیہ نظر سے ڈیلفینا کی طرف دیکھا۔ وہ میری نگاہ میں چھپے ہوئے استفسار کو فوراً سمجھ گئی جلدی سے جواباً بولی۔

''علی! کل دن میں لنچ کے بعد تم یہاں لیونگ روم کے ایک صوفے پر سو گئے تھے تو میں نے تمہاری ہتھیلیوں کو اسکین کر کے ربی کو بھیج دیا تھا۔''

''اوہ.....!'' میں ایک گہری سانس خارج کر کے رہ گیا۔

پریسٹن ہالو کے اس بنگلے پر میرے ساتھ سب کچھ غیر معمولی اور ناقابل فہم پیش آرہا تھا۔ اب مجھے یقین ہو چلا تھا کہ گزشتہ روز والے لنچ میں کوئی ایسی شے موجود تھی جس نے مجھے اتنا غافل کر دیا تھا اور مجھے یکسر احساس نہیں ہو سکا تھا کہ کب غفلت بھری نیند کے دوران میں ڈیلفینا نے میرے ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو اسکین کر کے ان کے پرنٹس ربی کو بھیج دیے تھے۔

''میں نے اتفاق سے تمہاری ہتھیلی پر وہ اہم نشانات دیکھ لیے تھے۔'' ڈیلفینا اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ ''اس لیے میں نے ربی کو آگاہ کرنا ضروری سمجھا تھا۔ خیر..... تم لوگ باتیں کرو۔ میں ابھی آتی ہوں۔''

اپنی بات ختم کر کے وہ لیونگ روم سے نکل گئی۔ مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی کہ وہ دانستہ وہاں سے ہٹ گئی تھی تاکہ ہم تسلی سے بات کر سکیں۔ بہ الفاظِ دیگر ربی پورے اطمینان سے میرا انٹرویو کر سکے۔

''مائی سن! میرے قریب آجاؤ۔'' ربی نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

اس کی آنکھوں میں بے پناہ مقناطیسی قوت پائی جاتی تھی۔ میں کسی سحر زدہ شخص کی طرح اٹھا اور ربی کے پہلو میں جا بیٹھا۔ وہ میرے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر پڑھنے

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

لگا۔ میرے دائیں ہاتھ کی انگشت شہادت کی جڑ پر اپنی انگلی رکھتے ہوئے اس نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

''مائی سن! انڈیکس فنگر یعنی پہلی انگلی کے نچلے حصے میں تمہیں یہ نصف دائرہ سا بنا ہوا نظر آرہا ہے نا۔ یہ رنگ آف سولومن یعنی سلیمانی انگشتری کہلاتا ہے اور جس مقام پر یہ واقع ہے، اسے ماؤنٹ آف جیوپیٹر یعنی مشتری کا ابھار کہا جاتا ہے۔ کسی ہاتھ میں رنگ آف سولومن کی موجودگی اس شخص کے بلند اقبال اور ہرفن مولا ہونے کو ظاہر کرتی ہے۔ ایسے شخص کے اندر بے پناہ روحانی قوت پائی جاتی ہے اور اس کی چھٹی حس بہت تیز ہوتی ہے۔ وہ زندگی بھر پیسے میں کھیلتا ہے اور اکثر اوقات یہ پیسا کسی اور کا ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ اسے پیسا کمانے کے لیے جدوجہد کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کی کفالت اور مالی معاونت کے لیے کوئی نہ کوئی کھڑا ہوتا ہے یعنی اس شخص کے معاملات ''کمائے گی دنیا' کھائیں گے ہم'' جیسے ہوتے ہیں۔''

ربی سانس ہموار کرنے کے لیے رکا تو میں سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ وہ بالکل سچ کہہ رہا تھا۔ میرے ساتھ تمام تر وہی معاملات تھے جو اس نے بیان کیے تھے۔ مجھے آج تک کسی قسم کی معاشی تنگی کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا اور میری گزر بسر انکل سلطان کے پیسے پر ہو رہی تھی۔ میں نے تعریفی نظر سے اس کی طرف دیکھا تو وہ اپنے علمی تجزیے کو آگے بڑھاتے ہوئے بتانے لگا۔

''یہ دوسری انگلی یعنی مڈل فنگر دیکھ رہے ہو...... اس انگلی کی جڑ میں تمہیں چھ شاخوں والا ایک ستارہ سا بنا دکھائی دے گا جیسے تین لائنوں کو ایک دوسرے کے اوپر ڈرا کر دیا گیا ہو۔ یہ ڈیوڈ اسٹار یعنی ستارۂ داؤدی کہلاتا ہے اور جس مقام پر یہ نظر آرہا ہے، اسے ماؤنٹ آف سیٹرن یعنی زحل کا ابھار کہا جاتا ہے۔ ماؤنٹ آف سیٹرن پر ڈیوڈ اسٹار کی موجودگی حاملِ ہٰذا کو بہت زیادہ کامیاب اور کامران ظاہر کرتی ہے۔ اس شخص کے ہاتھ پارس پتھر کے مانند ہوتے ہیں۔ اگر وہ مٹی کو بھی چھولے تو وہ سونا ہو جاتی ہے لیکن زحل کے ابھار پر ستارۂ داؤدی چند خرابیاں بھی لاتا ہے جن میں لاتعداد دشمن، والدین کی محبت اور شفقت سے محرومی اور بے اولادی سرفہرست ہیں۔'' میری ابھی شادی نہیں ہوئی تھی لہٰذا اولاد کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ جہاں تک لاتعداد دشمنوں والی بات تھی تو اس سلسلے کا آغاز ہو چکا تھا۔ والدین کی

نسوانی حسن میں اضافہ (بلوسم یونانی کریم) کل نہیں آج خوبصورت اور جاذب نظر آئیں

بلوسم بریسٹ ڈولپنگ اینڈ ٹائیٹنگ کریم (ہربل)

چھوٹی بریسٹ میں اضافہ کر کے بریسٹ کی نشوونما کو مکمل کرتی ہے

بریسٹ کی نرمی کو دور کر کے سختی لاتی ہے۔ بریسٹ کو سڈول اور خوبصورت بناتی ہے۔

گزشتہ 30 سال سے آزمودہ

گلیسی یونانی کریم

چہرے کے فاضل بالوں کو ہمیشہ کیلئے ختم کرتی ہے۔

خواجہ اسٹور ایمپریس مارکیٹ صدر کراچی
صدر میڈیکل اسٹور ایمپریس مارکیٹ صدر کراچی
مسلم جنرل اسٹور لیاقت مارکیٹ ملیر کراچی
ابراہیم سن لیاقت مارکیٹ ملیر کراچی
وقاص میڈیکل اسٹور الا آصف اسکوائر این 22 کراچی
تحری اسٹار جنرل اسٹور مدینہ چوک ریشم بازار حیدرآباد
نیو ولی دواخانہ کنور ریڈ روڈ سکھر
خالد دواخانہ صرافہ بازار ایبٹ آباد
قدیمی چینیوٹی دواخانہ کچہری بازار سرگودھا
سلیم پنساری گوجرانوالہ روڈ حافظ آباد
حی القیوم جنرل اسٹور ہسپتال روڈ چکوال
یوپی پنسار اسٹور بری کیشن روڈ کوئٹہ
ناصر دواخانہ 20 صدر روڈ پشاور صدر
کلاسک ہومیو پھور روڈ کوئٹہ
مصطفیٰ دواخانہ رسالہ روڈ حیدرآباد
پنجاب ہومیو سٹور چینوٹ بازار فیصل آباد
عوامی دواخانہ مین بازار مظفرآباد
شفا دواخانہ شاہی بازار بہاولپور
الشفاء ہومیو کلینک پارہ چنار
ملت دواخانہ گھنٹہ گھر پشاور
علی ہومیو سٹور کچہری روڈ ملتان

اپنی PIC روانہ کریں
wetsap: 0311-5800057
Email: bdhdeva@yahoo.com
skype: devapak
کراچی ہوم ڈیلوری 0322-2916250
پنڈی ڈیلوری 0300-2500026

بادشاہ دی ہٹی بوہڑ بازار راولپنڈی 051-5502903-5533528 اپنا ایڈریس SMS کر کے لٹریچر مفت منگوائیں

الحبیب یونانی اسٹور شاپ نمبر 4، زینت میڈیسن مارکیٹ، ڈینسو ہال کراچی 021-32720328, ریاض محمد 69 نیو عالمگیر مارکیٹ شاہ عالم لاہور۔ فون 042-7666264

پورے پاکستان میں گھر پر منگوانے کے لیے اور بریسٹ میں کمی یا اضافہ کے بارے میں مفت طبی مشورے کے لیے حکیم صاحب سے تمام امراض کے مشورے کی سہولت بریسٹ ڈولپر آلہ کے بارے میں معلومات اس نمبر پر حاصل کریں۔ Cell: 0333-5203553, Website: www.devaherbal.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

محبت اور شفقت سے محرومی والی بات بھی صد فی صد درست تھی۔ میں آج تک اپنے والدین کے سائے سے محروم تھا حتیٰ کہ ان کا نام تک نہیں جانتا تھا۔ ربی آئزک کا علم مجھے متاثر کررہا تھا۔ وہ اپنے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔

''اور یہ دیکھو ماؤنٹ آف مون یعنی چاند کا ابھار۔''

اس کے ساتھ ہی اس نے میری ہتھیلی کے اس حصے کی جانب اشارہ کیا جو انگوٹھے کی مخالف سمت میں کلائی کے اوپر اور چھنگلی کے انتہائی نیچے واقع تھا۔ ''چاند کے ابھار پر انیشوشن کی لائن بھی بہت واضح ہے جو ماؤنٹ آف مون سے اٹھ کر چھنگلی کی سمت یعنی ماؤنٹ آف مرکری کی طرف بڑھ رہی ہے۔ یہ لائن خطِ وجدان یعنی انیشوشن لائن کہلاتی ہے۔ جس شخص کے ہاتھ میں خطِ وجدان ہو، وہ وجدانی قوتوں کا مالک اور مستقبل بین ہوتا ہے۔ اس کے اندر کہانت کی صلاحیت ہوتی ہے۔ بعض اوقات اس پر الہامی کیفیت طاری ہوجاتی ہے اور وہ مستقبل میں پیش آنے والے واقعات سے باخبر ہوجاتا ہے۔''

''قبلہ! آپ کا علم سچا ہے۔'' میں نے صدقِ دل سے اس کے کمالِ فن کا اعتراف کیا۔ ''میں پامسٹری کی ابجد سے بھی واقف نہیں ہوں مگر آپ جو کچھ فرمارہے ہیں، وہ ساری باتیں سچی، کھری اور وزن دار ہیں۔''

''اب تم میرے سامنے جا کر بیٹھو۔'' اس نے نرمی سے کہا۔

میں نے اس کی بات کی تقلید کی۔

''سچ اس کائنات کی سب سے بڑی حقیقت ہے مائی سن۔'' وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ ''انسان کو ہمیشہ سچ بولنا چاہیے اور سدا سچ کا ساتھ دینا چاہیے۔''

''میں بھی سچ کو پسند کرتا ہوں۔'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

''صرف پسند کرتے ہو یا سچ بولتے بھی ہو؟'' وہ بہ دستور میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے عجیب سے لہجے میں مستفسر ہوا۔

''بالکل، بولتا بھی ہوں اور ڈنکے کی چوٹ پر بولتا ہوں۔'' میں نے بڑے فخر سے کہا۔

''مائی سن! اگر میں تم سے کوئی ذاتی نوعیت کا سوال پوچھوں تو اس کا سچ سچ جواب دو گے؟'' اس نے گمبھیر انداز میں کہا۔

''جی دوں گا۔'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''آپ پوچھیں۔''

''تمہارے والدین کے نام کیا ہیں؟'' اس نے گہری سنجیدگی سے سوال کیا۔

''میں نہیں جانتا۔'' میں نے راست گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''ہوں.....'' وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا پھر پوچھا۔ ''کسی غریدہ نامی خاتون کو جانتے ہو؟''

''کون غریدہ؟'' میں نے پوچھا۔

''میں میڈم غریدہ کی بات کررہا ہوں...'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ خاتون پاکستان کے ایک بااثر بیوروکریٹ خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ جتنی تمہاری اس وقت عمر ہے یا اس سے ایک دو سال زیادہ عرصہ پہلے میڈم غریدہ پاکستان سے امریکا آئی تھی۔ اس نے کیلی فورنیا کے شہر سان ڈیاگو کو اپنے لیے چنا اور الفریڈ نامی ایک عیسائی مرد سے شادی کرلی پھر ان کا ایک بیٹا پیدا ہوا جس کی عمر کم و بیش تمہارے برابر ہوگی۔ میڈم غریدہ سان ڈیاگو کے علاقے پام ایونیو پر واقع کنوینئنس اسٹور ''سیون الیون'' کی فرنچائز منیج بھی رہی تھی اور پھر ایک دن اچانک یہ تینوں افراد غائب ہوگئے اور آج تک مفقود الخبر ہیں.....''

میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ ربی آئزک نے اپنی گفتگو کا اسٹیئرنگ پامسٹری سے اچانک میری ذات کی طرف موڑ دیا تھا جیسے اسے میرے حوالے سے کسی قسم کی کوئی خاص کھوج ہو۔ میں نے قدرے بیزاری سے کہا۔

''میں ایسی کسی میڈم غریدہ کو نہیں جانتا میرے محترم۔''

''وہ بہت سلم اینڈ اسمارٹ تھی۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''اس کی رنگت سانولی اور بال کالے تھے۔ قد زیادہ نہیں تھا اس لیے وہ عموماً پنسل ہیل والی سینڈلز پہنتی تھی۔ جینز اور ٹی شرٹ اس کا پسندیدہ پہناوا تھا۔''

''ایسا سب ہوگا۔'' میں نے اکتاتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لیکن ان سب باتوں کا مجھ سے کیا تعلق؟''

''اگر کوئی تعلق فی الحال نظر نہیں آرہا تو ممکن ہے، آگے چل کر کوئی گہرا تعلق نکل آئے۔'' وہ پُرمعنی انداز میں بولا۔ ''میں نے تو بس ایسے ہی تم سے پوچھ لیا۔''

لیکن میں جانتا تھا کہ اس نے کچھ ایسے ہی نہیں پوچھا تھا۔ وہ میرے حوالے سے کسی خصوصی تحقیقاتی مشن پر دکھائی دیتا تھا۔ مجھے یہ محسوس کرنے میں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا کہ وہ مجھے اس نامعلوم میڈم غریدہ کا بیٹا سمجھ رہا تھا یا کم از کم وہ یہ بات میرے دماغ میں بٹھانے کی کوشش کررہا تھا اور سچی بات یہ ہے کہ میں نے ربی آئزک باروخ لاؤ کی اس بات کو ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

باہر نہیں کیا تھا۔ یہ نکتہ میرے ذہن میں ایک خاص جگہ بنانے میں کامیاب رہا تھا اور اس کا بھی ایک خاص ہی سبب تھا۔

میں نے جب سے ہوش سنبھالا تھا' اپنی نگاہ کے سامنے انکل سلطان ہی کو دیکھا تھا۔ وہی میرے مربی میرے سرپرست' میرے خیر خواہ اور میرا سب کچھ تھے۔ وہ جانتے تھے کہ میرے والدین کون ہیں۔ انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وقت آنے پر وہ مجھے میرے والدین کے بارے میں سب کچھ بتادیں گے لیکن میں نہیں جانتا تھا کہ وہ خاص وقت کب آئے گا۔ میں نے چونکہ اپنے ماں باپ کو کبھی نہیں دیکھا تھا اور ان کے حوالے سے میری معلومات بھی صفر کے برابر تھیں لہٰذا ربی آنزک نے میڈم غریدہ کا ذکر کیا تو میرے اندر ایک کھلبلی سی مچ گئی تھی۔ فوری طور پر بے ساختہ میرے ذہن میں اس سوال نے سر اٹھایا تھا..... کہیں میں میڈم غریدہ کا بیٹا تو نہیں.....؟

ربی کے یہ الفاظ بھی میرے ذہن کو پراگندہ کررہے تھے کہ..... اگر کوئی تعلق فی الحال نظر نہیں آرہا تو ممکن ہے، آگے چل کر کوئی گہرا تعلق نکل آئے.....!

میں نے اپنے دھیان کو ہٹانے کے لیے ربی سے کہا۔ ''حضرت! گزشتہ رات میں نے آپ کو خواب میں دیکھا ہے۔''

''اوہ..... بہت خوب۔'' وہ ستائشی نظر سے مجھے تکنے لگا۔

''لیکن یہ کیسے ممکن ہے؟'' میں نے الجھن زدہ انداز میں کہا۔

''میں تو آپ کو جانتا تک نہیں۔ آج ہماری پہلی ملاقات ہے پھر میں نے آپ کو خواب میں کیسے دیکھ لیا؟''

''یہ کوئی ایسا ناممکن یا عجیب نہیں ہے۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں سمجھانے لگا۔ ''ہم سب ایک آدم کی اولاد ہیں اور ہمارے بیچ ''برادر ہڈ'' یعنی بھائی چارے کا رشتہ قائم ہے۔ ہم سب ایک خالق کی مخلوق ہیں' ایک سمندر کے قطرے ہیں' ایک درخت کے پتے ہیں' ایک گھڑیال کے کانٹے ہیں ایک فیملی کے ممبرز ہیں اور جہاں تک روحانی میلان کی بات ہے تو.....'' اس نے لمحاتی توقف کرکے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''.....تو تمام ارواح کو ایک ہی وقت پر پیدا کردیا گیا تھا۔ کارخانۂ قدرت میں یہ سب ہم عمر ہیں اور ایک دوسرے کو اچھی طرح پہچانتی ہیں اور جو لوگ روحانی ساتھی یعنی سول میٹ ہوتے ہیں، وہ چاہے زندگی میں کبھی ایک دوسرے سے نہ ملے ہوں لیکن انہیں یقین ہوتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے اور پہچانتے ہیں۔ میں محسوس کررہا ہوں کہ ہم دونوں بھی سول میٹ ہیں۔''

''ہاں' ایسا ہوسکتا ہے۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ''کیا آپ جاننا چاہیں گے کہ آپ میرے خواب میں کیا کررہے تھے؟''

''بتاؤ مائی سن۔ میں ضرور جاننا چاہوں گا۔'' وہ ہمہ تن گوش ہوگیا۔

میں نے جواباً اسے ڈیلفینا کی تاج پوشی والا قصہ سنادیا۔

اس نے پوری توجہ سے میری بات سنی اور میرے خاموش ہونے پر کہا۔ ''مائی سن! میں تمہیں بتاچکا ہوں کہ تمہارے ہاتھ میں چاند کے ابھار پر خط وجدان موجود ہے۔ اس خط کا حامل شخص مستقبل میں جھانکنے کی صلاحیت رکھتا ہے لہٰذا تمہیں بھی خواب کے ذریعے بشارت مل گئی کہ آنے والے دنوں میں ڈیلفینا کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔''

''تو کیا میرا یہ خواب سچا تھا؟'' میں نے اضطراری لہجے میں دریافت کیا۔ ''مستقبل قریب میں کیا واقعی ڈیلفینا کی تاج پوشی ہونے والی ہے۔''

''ایک سو ایک فی صد مائی سن!'' وہ پروثوق انداز میں بولا۔ ''وہ ایک خاص مرحلے کے لیے کوالیفائی کرچکی ہے۔ اس کا ایک پروموشن ڈیو ہے جس کے سلسلے میں اس کی تاج پوشی ہونا ہے لیکن.....''

اس نے جملہ ادھورا چھوڑا تو میں نے سوال کیا۔ ''لیکن کیا محترم ربی؟''

''مائی سن! ہر انسان کے اندر مثبت اور منفی قوت کے حامل دو بچے چھپے ہوتے ہیں۔'' وہ بتانے لگا۔ ''آپ جس بچے کو اپنے جس قسم کے اعمال کا فیڈ ریپلائیں گے، وہ روز بہ روز زیادہ طاقت ور ہوتا چلا جائے گا۔ اگر منفی قوت کا حامل بچہ بالغ ہونے کے بعد جسم بدر ہوجائے تو انسان خدائی صفات کو چھولیتا ہے اور اگر مثبت قوت کا حامل بچہ کمزور پڑنے کے بعد جسم بدر ہوجائے تو انسان شیطانی صفات کا شاہکار بن جاتا ہے لیکن کسی بھی بچے کی ''جلاوطنی'' کا مرحلہ بہت ہی نازک ہوتا ہے کیونکہ جلاوطن ہونے والے بچے کو نکیل ڈال کر رکھنا پڑتی ہے تاکہ وہ آپ کا جینا عذاب نہ کردے۔ اس موقع پر ذرا سی غفلت بھی کوئی بہت بڑی خرابی پیدا کرسکتی ہے اور ڈیلفینا کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا ہے۔''

ربی لمحے بھر کے لیے خاموش رہا تو میں اس کی گہری باتوں پر غور کرنے لگا۔ میں چونکہ سائیکالوجی کا اسٹوڈنٹ تھا اس لیے ان نفسیاتی باتوں کو سمجھنے کے لیے مجھے ذہن پر زیادہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

زور نہیں دینا پڑا۔ وہ اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''ڈیلفینا نے ایک طویل جدوجہد کے بعد منفی قوت کے حامل بچے کو لات مار کر اپنے اندر سے باہر تو پھینک دیا تھا لیکن وہ اسے مناسب انداز میں ڈسپوز آف نہیں کر سکی تھی اور اب یہی منفی قوت اس کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ بنی ہوئی ہے اور اس کے بنے بنائے کاموں کو عین وقت پر بگاڑ کر رکھ دیتی ہے۔''

ربی آئزک نے ڈیلفینا کی بگڑی ہوئی منفی قوت کا ذکر کیا تو میرا دھیان آپوں آپ رات والے پراسرار واقعے کی طرف چلا گیا جب نصف شب کے بعد میں نے ڈیلفینا کو سوئمنگ پول کے اندر سوئمنگ کرتے دیکھا تھا اور جب وہ سوئمنگ سے فارغ ہونے کے بعد نکلی تھی تو مجھے اس کی آنکھوں کی جگہ دہکتے ہوئے دو سرخ انگارے رکھے دکھائی دیے تھے جنہیں دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ وہ ڈیلفینا شیطانی صفات کی حامل نظر آتی تھی۔ میں نے ربی آئزک کو اس واقعے کے بارے میں بتایا تو وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

''مائی سن! تم نے ڈیلفی کے اسی منفی روپ کو دیکھا ہے جو ڈیلفی کے کیے کرائے پر پانی پھیرنے کی کوشش میں مصروف ہے اسی لیے اس کی تاج پوشی کی رسم میں ہر بار کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہو جاتی ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ میں بہت جلد اس منفی ڈیلفینا کو قابو کر لوں گا پھر وہ کبھی ڈیلفی کے راستے کی دیوار نہیں بن سکے گی۔''

''کیا انسان کی شخصیت کا یہ منفی پہلو اس کے مثبت پہلو کا ہم شکل ہوتا ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''بالکل ٹھیک کہا تم نے۔'' وہ تصدیقی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''دونوں دیکھنے میں ایک ہی شکل و شباہت کے حامل ہوتے ہیں جیسے کہ جڑواں انسان لیکن ان میں فرق صرف پولیریٹی یعنی چارج کا ہوتا ہے..... ایک منفی چارج اور دوسرا مثبت چارج ہوتا ہے۔ دیکھنے میں ایک جیسے مگر عمل میں ایک دوسرے کے برعکس۔''

''پھر تو ڈیلفینا ان دنوں بڑے مشکل حالات سے گزر رہی ہے۔'' میں نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔

''بہت زیادہ .....'' وہ متاسفانہ انداز میں ہونٹ سکیڑتے ہوئے بولا۔ ''اور تم نے خواب میں اسے اسی بنگلے کے سوئمنگ پول میں سوئمنگ کرتے دیکھا ہے تو یہ اور بھی تشویش والی بات ہے۔''

''میں نے سرخ انگارا آنکھوں والی ڈیلفینا کو خواب میں نہیں بلکہ کھلی آنکھوں سے سوئمنگ پول میں سوئمنگ کرتے دیکھا ہے۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔

''خواب والا واقعہ تو اس کی تاج پوشی کا تھا۔''

''ہوں .....'' وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ چند لمحات کے بعد اس نے ایک مرتبہ پھر گفتگو کا اسٹیئرنگ میری ذات کی طرف گھما دیا اور میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''تو کیا تم واقعی اپنے ماں باپ کے بارے میں کچھ نہیں جانتے؟''

''اگر جانتا ہوتا تو ضرور آپ کو بتا دیتا۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے غلط بیانی کرنے کا کوئی شوق نہیں۔''

''ڈیلفی نے مجھے بتایا تھا کہ تم اپنے کسی انکل سلطان کے پاس رہتے ہو اور یہی شخص تمہارا سرپرست ہے۔'' وہ بہ دستور میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ ''یہ سلطان تو یقیناً تمہارے والدین کے بارے میں سب کچھ جانتا ہوگا!''

''ہاں ..... انکل کو اس حقیقت کا علم ہے۔'' میں نے مختصر سا جواب دیا۔

ربی آئزک نے پوچھا۔ ''سلطان نے کبھی تمہیں بتایا نہیں؟''

''نہیں!'' میں نے کہا۔

''اور تم نے کبھی پوچھا بھی نہیں؟''

''متعدد بار پوچھا ہے۔''

''پھر.....؟''

''وہ کہتے ہیں' مناسب وقت آنے پر سب بتا دوں گا۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''مناسب وقت .....'' اس نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے میرے الفاظ کو دہرایا پھر اپنی ہی دھن میں بولتا چلا گیا۔ ''غریدہ کا تعلق پاکستان کے علاقے راول پنڈی سے تھا۔ وہ راول پنڈی پاکستان سے' سان ڈیاگو امریکا پہنچی تھی تو اس کی آمد کے پیچھے کوئی خاص مقصد چھپا ہوا تھا پھر یہاں امریکا میں اس نے ایک عیسائی مرد الفریڈ سے شادی کی حالانکہ وہ خود مسلمان تھی' یہ بھی ایک خلافِ معمول اور چونکا دینے والی بات ہے۔ جب ان کا بیٹا پیدا ہوا تو پھر یہ تینوں افراد کہیں غائب ہو گئے۔ ان کا بیٹا تمہارا ہم عمر تھا۔''

بات ختم کر کے وہ کھوجتی ہوئی نظر سے مجھے ٹٹولنے لگا تو میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ ''محترم ربی! آپ مجھے بار بار میڈم غریدہ کا قصہ سنا رہے ہیں۔ اس کا کوئی خاص سبب ہے؟''

''بہت ہی خاص الخاص سبب ہے مائی سن۔'' وہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''میری معلومات کے مطابق' غریدہ اور الفریڈ کا وہ بیٹا ایک غیر معمولی انسان ہے اور ہمیں غیر معمولی انسانوں ہی کی تلاش رہتی ہے۔''

''آپ غیر معمولی انسانوں سے کیا کام لیتے ہیں؟'' میں نے استفسار کیا۔

''ہماری ایک سوسائٹی ہے۔'' وہ گمبھیر انداز میں بولا۔ ''جو دنیا بھر سے ذہین اور غیر معمولی انسانوں کو تلاش کر کے اپنے پاس لاتی ہے۔ ان کی مخصوص ذہنی، جسمانی اور روحانی تربیت کرتی ہے۔ پھر وہ ناقابلِ شکست ہو جاتے ہیں۔''

''میں نے پوچھا تھا کہ آپ ایسے افراد سے کیا کام لیتے ہیں؟'' میں نے سوال کیا۔

''میں اسی طرف آ رہا ہوں مائی سن!'' وہ معتدل انداز میں بولا۔ ''میں نے ابھی جس تربیت کا ذکر کیا ہے' اس دوران میں ان افراد کو مختلف آزمائشی مراحل سے گزارا جاتا ہے تا کہ وہ حاکمیت کا ہنر سیکھ جائیں کیونکہ آگے چل کر انہیں اس دنیا کی باگ ڈور سنبھالنا ہوتی ہے۔ اس دنیا کے معاملات انہی کے اشاروں پر چلنا ہوتے ہیں جیسا کہ ابھی چل رہے ہیں......'' اس نے لمحاتی توقف کر کے ٹٹولتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''اگر تم یہ سمجھ رہے ہو کہ اس دنیا کے مختلف ملکوں کا نظام وہاں کے بادشاہ' صدر' وزیراعظم وغیرہ چلا رہے ہیں یا ان تمام ممالک کو امریکا چلا رہا ہے تو یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ امریکا سمیت پوری دنیا کے تمام ممالک کے نظام کو ہماری سوسائٹی کے ممبرز چلاتے ہیں جنہیں ہر شے پر قدرت حاصل ہوتی ہے۔ وہ اپنی ذات اور اختیار میں زمینی خدا ہوتے ہیں۔''

ربی آئزک باروخ لاؤ کے آخری جملے نے مجھے چونکا دیا اور اسی لمحے ڈیلفینا کی زبان سے ادا ہونے والے الفاظ میرے دماغ میں چکرانے لگے۔ اس نے مجھ سے گفتگو کے دوران میں ایک مرحلے پر...... پوچھا تھا......'' کیا تم نے زمینی خدا کے بارے میں سنا ہے؟''

اب ربی بھی ایسی ہی بات کر رہا تھا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ وہ یہ تمام باتیں مجھے کیوں بتا رہا تھا؟ تھوڑی دیر پہلے اس نے میرا ہاتھ دیکھا تھا اور اپنے پامسٹری کے علم کی بنیاد پر میرے بارے میں چند باتیں بتائی تھیں جو کہ بالکل درست تھیں۔ میری اب تک کی زندگی ایسی ہی گزری تھی۔ آئندہ کیسی گزرنے والی تھی' یہ صرف میرا مالک جانتا تھا جو میرا خالق اور رازق تھا۔ میں صرف اسی پر بھروسا کرتا تھا لیکن یہ بات بھی طے ہے کہ میں ایک انسان تھا لہٰذا انسانی نفسیات کی نفی نہیں کر سکتا تھا اور میری نفسیات اس بات کا تقاضا کر رہی تھی کہ میں ربی سے پوچھوں' وہ میری ذات میں اس قدر دلچسپی کیوں لے رہا ہے؟ اس جیسا اہم اور مصروف شخص تل ابیب کو چھوڑ کر میرے پاس بیٹھا اپنا وقت کیوں برباد کر رہا ہے؟

''محترم ربی!'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ''میں آپ سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔''

''ضرور مائی سن۔'' وہ بڑی رسان بولا۔ ''تم جو بھی پوچھو گے، میں بتاؤں گا اور صدفی صد سچ بتاؤں گا۔''

''میں نے محسوس کیا ہے کہ آپ میری ذات میں بہت زیادہ دلچسپی لے رہے ہیں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ''اس کے ساتھ ہی آپ میڈم غریدہ کے بیٹے پر بھی تحقیق کر رہے ہیں۔ کیا آپ مجھ میں اور غریدہ کے بیٹے میں کوئی کنکشن تلاش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں؟''

''میں نے کہا ہے نا' میں تم سے خالص' کھری اور سچی بات کروں گا۔'' وہ ٹھوس انداز میں بولا۔ ''اور سچی بات یہ ہے کہ ہمیں میڈم غریدہ کے بطن سے الفریڈ کی ولدیت کے ساتھ پیدا ہونے والے شخص کی تلاش ہے۔ اس کے غیر معمولی انسان ہونے میں ہمیں کوئی شک و شبہ نہیں ہے۔ اسی تلاش کے دوران میں تم ڈیلفی سے ٹکرا گئے پھر تمہاری کوئی مجبوری تمہیں ڈیلفی کے قریب لے آئی۔ ڈیلفی بھی ہماری سوسائٹی کی تربیت یافتہ ہے لہٰذا اس کے غیر معمولی ہونے میں بھی کسی شک و شبے کی گنجائش تلاش نہیں کی جا سکتی۔ ڈیلفی نے جب مجھے تمہارے بارے میں بتایا تو میرا دھیان غریدہ کے بیٹے کی طرف چلا گیا۔ اگرچہ تمہارا تو یہی دعویٰ ہے کہ تم غریدہ اور الفریڈ کی اولاد نہیں ہو لیکن تم اپنے اس دعوے کو ثابت نہیں کر سکتے۔ کیونکہ تم تو اپنے والدین کے بارے میں کچھ جانتے ہی نہیں ہو لیکن......'' اس نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''لیکن...... تم بھی ویسے ہی غیر معمولی انسان ہو جیسے افراد کی ہمیں تلاش رہتی ہے۔ تمہارے ہاتھ کی لکیریں بتاتی ہیں کہ تم ہمارے کام کے ہو۔ اگر تم ہماری سوسائٹی کے ممبر بن جاتے ہو تو یہ تمہارے لیے بڑے اعزاز کی بات ہو گی۔ اس کے بارے میں تم ضرور سوچنا۔''

''جی...... میں سوچوں گا۔'' میں نے اس کا دل رکھنے کے لیے کہہ دیا پھر پوچھا۔ ''میرے تو آپ نے ہاتھ دیکھے اور کہہ دیا کہ میں ایک غیر معمولی انسان ہوں لیکن غریدہ کے بیٹے کی تو کوئی بھی شے آپ کے پاس نہیں پھر آپ اس کے

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

بارے میں اتنے پُروثوق کیوں ہیں؟''

''بہت اچھا سوال ہے ..... مبنی بر ذہانت۔'' وہ ستائشی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''مگر میں فی الحال تمہیں اس سوال کا مکمل جواب نہیں دے سکتا۔''

''کیوں ..... اس کی کوئی خاص وجہ؟'' میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ہاں' اس کا خاص سبب ہے۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''مکمل جواب دینے کے لیے مجھے اپنی معلومات کے ذرائع تم سے شیئر کرنا پڑیں گے اور بہت سی ایسی باتیں بتانا ہوں گی جن کی بنا پر تم ان معاملات کو سمجھ سکو لیکن ..... آئی ایم ویری سوری مائی سن! تم ابھی ہماری سوسائٹی کے ممبر نہیں بنے اور ..... غیر متعلقہ افراد سے اس نوعیت کے راز ڈسکس نہیں کیے جاسکتے۔ امید ہے' تم میری بات کا برا نہیں مناؤ گے۔''

''نہیں ..... میں نے ہرگز برا نہیں منایا کیونکہ آپ نے ایک اصولی بات کی ہے۔'' میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ''لیکن آپ کی اس اصولی بات نے میرے اندر تجسس جگا دیا ہے۔''

''تجسس!'' اس کی نظر میں استفسار تھا۔ ''ہماری سوسائٹی کے بارے میں؟''

''جی بالکل۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''آپ نے ایک راز یعنی ایک سیکرٹ کا تذکرہ کیا۔ اس تناظر میں آپ کی سوسائٹی ایک ''سیکرٹ سوسائٹی'' ہوئی نا ..... میرا تجسس ہونا تو بنتا ہے نا.....!''

''مائی سن! تم اپنی جگہ ٹھیک کہہ رہے ہو اور میں بھی اپنی جگہ درست ہوں۔'' وہ مدبرانہ انداز میں بولا۔ ''تاہم تمہاری تشفی کے لیے چند باتیں بتا دیتا ہوں۔''

وہ بولتے بولتے رکا تو میں ہمہ تن گوش ہوگیا۔

''ہماری سوسائٹی اخوت اور بھائی چارے کا درس دیتی ہے اور اس کے تمام ممبرز آپس میں ایک دوسرے کے بھائی کہلاتے ہیں۔ ہر شخص اپنے دیگر بھائیوں کے دکھ درد کو سمجھتا ہے' ان کے مفاد کا تحفظ کرتا ہے اور ضرورت پڑنے پر اپنے بھائیوں کی خاطر جان قربان کر دیتا ہے اور ..... ان کے دشمنوں کی جان لے بھی لیتا ہے۔''

ربی آئزک نہایت ہی سنجیدہ انداز میں میری معلومات میں اضافہ کر رہا تھا۔ اس نے مزید بتایا۔

''میڈم غریدہ پاکستان کے شہر راول پنڈی میں پیدا ہوئی تھی جو کہ تھرٹی تھری پیرلل نارتھ کے بہت قریب واقع ہے۔ وہ راول پنڈی سے امریکا کے شہر سان ڈیاگو پہنچی ہے جو کہ تھرٹی تھری پیرلل نارتھ یعنی تینتیس درجے عرض البلد شمال پر واقع ہے۔ نمبر تینتیس کی ہمارے نزدیک بہت زیادہ اہمیت ہے اور دنیا کے نقشے میں جو بھی ممالک یا دیگر خطۂ ارض تھرٹی تھری پیرلل نارتھ یعنی تینتیس درجے عرض البلد شمال میں واقع ہیں، وہ ہماری نگاہ کے مرکز ہیں اور ہماری تمام تر سرگرمیاں اسی پٹی پر ہوتی ہیں۔ تھرٹی تھری پیرلل نارتھ کی گلوبل اسٹریٹ علمی' مادی اور روحانی خزانوں سے مالا مال ہے۔ اب ذرا تم اس اتفاق پر بھی غور کرو۔''

..... اس نے ذرا دیر کو رک کر سانس ہموار کی پھر بڑی دلچسپی سے بتانے لگا۔

''میڈم غریدہ نے جب الفریڈ سے شادی کی تو اس وقت الفریڈ کی عمر تینتیس سال تھی یعنی تھرٹی تھری اور غریدہ نے پورے تینتیس ماہ تک سیون الیون اسٹور میں کام کیا تھا۔ میرے نزدیک یہ سب اتفاق نہیں ہوسکتا مائی سن!''

ربی آئزک نے مجھے غور کرنے کے لیے کہا تھا اور ربی کی بات مان لینے میں کوئی حرج بھی نہیں تھا لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ ادھر ربی کی بات ختم ہوئی' ادھر فضا میں ایک کرب ناک چیخ سنائی دی۔ یہ درد میں ڈوبی ہوئی ایک نسوانی چیخ تھی۔ ہم نے یک بہ یک چونک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

ربی کا چہرہ متغیر ہوگیا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں کئی رنگوں کو ابھرتے ڈوبتے دیکھا جن میں فکر، تشویش اور پریشانی کے رنگ غالب تھے۔ اس نسوانی چیخ نے اسے مضطرب کر دیا تھا۔

وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا پھر سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''تم ایک منٹ ادھر ہی رکو۔ میں آتا ہوں.....''

بات ختم کرتے ہی وہ تیز قدموں سے چلتے ہوئے لیونگ روم سے نکل گیا۔ اس نے مجھے ایک منٹ وہیں رکنے کو کہا تھا لیکن میں ایسا بھی فرماں بردار نہیں تھا۔ ان لمحات میں ایک منٹ کیا' میں تو ایک سیکنڈ بھی رکنے کا روادار نہیں تھا۔

میں نے ربی آئزک کے پیچھے دوڑ لگا دی.....!

امنگوں، حوصلوں اور آہوں کے بیچ رلاتی، کبھی محبتوں اور چاہتوں کے مدھر گیت سناتی اس ناقابلِ فراموش داستان کے مزید واقعات اگلے ماہ ملاحظہ کریں

WWW.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

قضا

نعمان اسحاق

محبت میں انسان فرشتہ بھی بن سکتا ہے اور سر سے پیر تک انتقام بھی۔ جانے یہ کیسا جذبہ ہے کبھی جان دیتا ہے اور کبھی جان لیتا ہے۔ وہ بھی جو سر سے پیر تک اس کی محبت کے سمندر میں ڈوبی ہوئی تھی کہ تہ میں جانے کیا نظر آیا کہ سراپا انتقام بن گئی...

بھولی بسری یادوں کو حال سے ملاتی ایک چونکاتی کہانی

یوں ہی جب اسے فرصت میسر آئی تو وہ گاہکوں کے لیے بنائی گئی نشستوں پر بیٹھ گیا۔ خالی ذہن نظریں جھکائے بیٹھا رہا اور کسی ایسے ہی پل نظریں اٹھیں اور سامنے لگے قدآدم آئینے میں اپنے عکس پر ساکن ہوگئیں۔

سر پر جالی والی ٹوپی، آنکھوں پر موٹے شیشوں کی عینک کا چشمہ، مونچھوں کے تراشیدہ بال گھاس کے تنکوں جتنی بڑھی ہوئی شیو اور چہرے پر ابھرتی جھریوں کے راز۔ وہ راز جو تجسس ابھارتے ہیں، گزرے وقت کی کہانی سناتے ہیں اور کہانی سننے کی لگن پیدا کرتے ہیں۔

عبدل کی ساری زندگی بھی ایسے ہی گاہکوں کے بال کاٹتے اور شیو بناتے گزری تھی۔ کتنے سال گزر گئے۔ زمانے کے انداز بدلتے رہے مگر اس کی زندگی کا ڈھب نہ

WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

http://paksociety.com

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

Downloaded From Paksociety.com

بدلا۔ جب وہ جوان تھا، یہی کوئی چھبیس سال کا، تب اس نے کرائے کی دکان میں اپنا کاروبار سجایا تھا اور بڑے خوشخط الفاظ میں بورڈ لکھوا کر آویزاں کیا۔

عبدل گرم حمام..... بال کاٹنے، شیو بنانے کے علاوہ اس نے دکان کے ایک کونے میں پانی کی سپلائی لے کر ٹونٹی لگوائی۔ عارضی دیواریں کھڑی کیں اور لکڑی کا سیکنڈ ہینڈ دروازہ لے کر حمام بھی تیار کرلیا۔ بازار سے پہلے اس کی دکان آتی تھی۔ آس پاس کے محلوں کے بچے بال کٹوانے آتے اور فوجی کٹنگ کی فرمائش کرتے۔ نوّے کی دہائی میں فوجی کٹنگ کا عروج تھا۔ عام شہری بھی سائڈوں سے باریک کٹنگ کروا کر خوش ہوتے اور خود کو فوجیوں سے تشبیہ دیتے۔ شام ڈھلے دیگر دکاندار بھی آتے اور شیو بنواتے۔ گھنی مونچھوں والے مونچھوں کی تراش پر اہمیت دیتے اور قینچی چلاتے عبدل کو ہدایات دیتے رہتے۔ باریک مونچھوں اور کلین شیو حضرات کی جانب سے ان ہدایات کی چھٹی ہوتی اور عبدل شیو بنا دیتا۔ ڈاڑھی کا خط بنوانے مولوی صاحبان بھی آتے۔ قریب کی مسجد کے امام صاحب ابتدا ہی سے عبدل کے پاس آتے۔ حجامت سے فارغ ہوکر سامنے لگے آئینے میں بھرپور نظروں سے اپنا جائزہ لینے کے بعد ان کا ہاتھ جیب کی طرف رینگتا۔ پیسے عبدل کی ہتھیلی پر رکھتے اور محبت سے کہتے۔

''بیٹا شیو مت بنایا کرو۔ حرام ہے اور اس کی کمائی استغفراللہ حرام کی کمائی۔''

اور عبدل مسکرا دیتا۔ حلال حرام کے قضیے کبھی اسے خدا سے قریب نہ کرسکے اور وہ وہیں پر کھڑا رہا اور پھر وقت گزرتا گیا۔ نئی صدی، نئے طور طریقے لائی اور پتا بھی نہ چلا نئی صدی کا پہلا عشرہ بھی گزر گیا۔

عبدل گرم حمام کی جگہ بورڈ پر عبدل ہیئر ڈریسر لکھا نظر آنے لگا اور آج کل لکھا تھا۔ ''عبدل مین سیلون۔ کٹنگ، شیونگ، فیشل، مساج'' اور نیچے نسبتاً چھوٹے فونٹ میں لکھا تھا۔ ''یہاں پر دولہے بھی تیار کیے جاتے ہیں۔''

امام صاحب ماشاء اللہ ساری زندگی پیروں پر چل کر آتے رہے۔ حرام کمائی سے ڈراتے رہے۔ عبدل کا دل پگھلا بھی اور اسے خدا سے ڈر بھی لگنے لگا مگر شیو کے گاہکوں کو واپس بھیجنے کی ہمت نہ ہوئی۔ کوئی دوسرا روزگار اپنانے کی ہمت نہ تھی کہ کوئی دوسرا ہنر نہ تھا اور یہ دکان جو کبھی کرائے کی ہوا کرتی تھی، بچوں کو جوان کرنا اور پڑھانے کے علاوہ اس کی ساری زندگی کی کمائی یہ دکان ہی تھی۔ کوئی دس سال پہلے وہ یہ دکان خرید چکا تھا۔ من میں تو آیا چھوڑے اس روزگار کو دکان میں کوئی کریانے کا سامان ہی ڈلوا دیتا ہوں۔ وہ کون سا گھر ہوگا جہاں کریانے کے سامان کی ضرورت نہ ہوگی۔ دوستوں سے مشورہ کیا تو سب نے مخالفت کی۔

''لے عبدل! کیا ضرورت ہے۔ چلتا ہوا تیرا روزگار ہے۔ یوں رزق کے وسیلے بدلنا کفرانِ نعمت ہے۔''

''نہ عبدل تیری ہڈیاں اب کریانے کی دکان کا بوجھ نہ اٹھا پائیں گی۔''

''کریانے کی دکان چلانا تجربے کا کام ہے۔ اب تُو کیا تجربہ حاصل کرے گا۔ اللہ غفور ہے۔ تجھے بھی بخش دے گا اور تو کون سا لوگوں کو پکڑ پکڑ کر زبردستی ان کی شیو بناتا ہے۔ خود ہی تیری دکان کی سیڑھیاں چڑھتے ہیں۔'' جتنے منہ اتنے مشورے مگر کسی ایک ساتھی نے بھی بیوٹی سیلون کو کریانہ اسٹور میں بدلنے کا مشورہ نہ دیا۔ کوئی ایک ساتھی تو ہمت افزائی کرتا.. تو شاید آج یہ بیوٹی سیلون نہ ہوتا، کریانہ اسٹور ہوتا۔

مولوی صاحب کے انتقال کی خبر مسجد کے اسپیکر پر ہی نشر ہوئی تھی اور وہ سکتے میں آگیا۔ یوں اچانک ہارٹ اٹیک انہیں اس دنیا سے اُس دنیا میں لے گیا اور عبدل دل گرفتہ رہ گیا۔ اس نے ہمیشہ نمازِ جمعہ ان کے پیچھے ادا کی۔ عیدیں بھی ان کے پیچھے پڑھیں اور آج.....

اس کی آنکھیں نم ہوتی رہیں اور اُن کی تدفین پر اس نے خود سے عزم بھی کیا۔

''ڈاڑھی رکھوں گا۔ ورنہ مرنے کے بعد اللہ کو کیسے منہ دکھاؤں گا۔'' مگر یہ عزم بھی فقط لفظوں تک ہی محدود رہا اور اس بات کو بھی سال گزرنے کو آن پہنچا۔ ہاں البتہ سر پر جالی والی ٹوپی مستقل طور پر جم گئی۔

پچیس سال ہونے کو آئے یہ کاروبار کرتے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ کبھی بے حد مقبول حجام نہ رہا۔ خیر اب تو لوگ لفظ حجام کو بھولتے جارہے ہیں۔ جوان تو ہیئر ڈریسر اور باربر کہتے نظر آتے ہیں۔ ہر سال دو سال کے بعد کوئی نہ کوئی حجام مشہور ہوا نہ ہوا تو عبدل ہی نہ ہوا مگر شاید یہ اس کا زمانہ تھا۔

ایک روز کچھ ایسی دھن میں تھا کہ اس نے نئے طرز پر بال کاٹے اور بالوں کی وہ کٹنگ جوانوں میں کچھ ایسی مقبول ہوئی کہ دور کے محلے کے جوان بھی عبدل بیوٹی سیلون کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے بالآخر اس کی دکان کی سیڑھیاں چڑھتے نظر آتے اور جب رائج شہری اصولوں کے مطابق جوان بال کٹوانے آتے تو مساج بھی کرواتے۔ رزق کی

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

ایسی فراوانی ہوئی جو پہلے کبھی نہ ہوئی تھی۔

اور یوں آج بڑے دنوں بعد شام کے پہر فرصت نصیب ہوئی تھی۔ خالی ذہن بیٹھے اپنے عکس کو دیکھتے دیکھتے وہ تھکنے لگا تھا کہ ایک نوجوان دکان میں داخل ہوا۔

''بڑی مشکلوں سے آپ کی دکان ملی ہے۔'' احسن کہہ رہا تھا۔ نوجوانی کا زعم اس کے چہرے کی کہانی تھی۔

''اس طرح نہیں اس طرح اور اس طرح.....'' وہ اپنے بالوں کی سیٹنگ کے متعلق بتاتا رہا اور عبدل اس نوجوان کو تکتا رہا۔ جانے کیوں اس کا چہرہ جانا پہچانا محسوس ہوتا تھا۔

''پہلی بار آیا ہوں آج آپ کے پاس۔ مجھے اپنا گاہک بنانے کا سنہری موقع ہے۔'' احسن چرب زبان محسوس ہوتا تھا۔

ذہن کو جھٹکتے ہوئے وہ بال کاٹنے لگا مگر نگاہیں پھسل پھسل کر اس کے چہرے پر جاتیں اور بال کٹواتے ہوئے احسن غیر مطمئن محسوس ہوتا۔ عبدل کیسے بے ڈھنگے پن سے بال کاٹ رہا تھا۔ کہیں وہ غلط باربر کے پاس تو نہیں آ گیا تھا؟ فیضی اور راجو تو اسی باربر کی تعریف کرتے تھے۔

فیچی چلاتے ہوئے عبدل نوجوان کا چہرہ دیکھتا رہا اور پھر اس کے ذہن میں یکدم جھماکا ہوا اور اسے جیسے سب کچھ یاد آ گیا۔

''فردوس..... کیا تم فردوس کے بیٹے ہو؟'' الفاظ بے ارادہ ہی اس کے منہ سے نکلے تھے۔ عبدل ایسا نہ چاہتا تھا مگر منہ سے نکلے الفاظ کہاں واپس لوٹ سکتے تھے۔ نوجوان مڑ کر عبدل کا منہ تکنے لگا۔

یہ باربر اس کی ماں کا نام کیسے جانتا تھا؟ کہیں یہ.....

☆☆☆

وہ صرف حجام ہی تو نہ تھا کہ ابن آدم صرف اس کی حجامت کا قصہ چھیڑتا۔ وہ ایک انسان بھی تھا۔ گھر بار والا۔ بیوی بچوں والا۔

شیما..... اس کی بیوی جس کا اصل نام شمیم تھا۔ شادی سے پہلے شمو کہلاتی، مگر عبدل کو کبھی شمو نام پسند نہ آیا اور شمیم ہر وقت پکارا نہ جاتا۔ چنانچہ ایک دن اس نے شیما پکارا۔ شمیم نیا نام سن کر مسکرا دی۔ جانے یوں مسکرانا دل کو بھایا تھا یا پھر نام ہی عزیز ہوا کہ اس نے شیما پکارنا شروع کر دیا اور وہ شمو سے شیما بن گئی۔ اور اب یا تو وہ لوگ مر چکے تھے جو شمو پکارتے یا نئے لوگ اس نام سے واقف ہی نہ تھے۔

کیسی اچھی زندگی گزاری تھی دونوں نے۔ عبدل لوگوں کے بال کاٹتا اور شیو بناتا رہا۔ شیما گھر سنبھالتی رہی۔

رزاق و مالک

حضرت ابراہیمؑ مہمان کے بغیر کھانا نہ کھاتے تھے۔ ایک مرتبہ تین روز تک کوئی مہمان نہ آیا پھر ایک بوڑھے آتش پرست کافر کا آپ کے دروازے سے گزر ہوا۔ آپ نے اس سے پوچھا ''تو کون ہے؟'' اس نے بتایا کہ آتش پرست ہوں۔ حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا۔ ''تو میرا مہمان بننے کے لائق نہیں ہے'' اللہ تعالیٰ کو یہ بات ناگوار لگی اور ارشادِ الٰہی نازل ہوا۔

''اے ابراہیمؑ! میں تو ستر برس سے اس کی پرورش کر رہا ہوں اور تجھ سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ ایک وقت کی روٹی کا ٹکڑا اسے دے دیتا۔''

مرسلہ: وزیر محمد خان، بطل ہزارہ

عمر رفتہ گزر گئی۔ اب بیٹا قریبی گاؤں کے سرکاری اسکول میں گریڈ نو کا استاد تھا جس کی شادی کا ارادہ اس سال بہار میں تھا اور بیٹی کی تو وہ پہلے ہی شادی کر چکے تھے۔ اپنے گھر میں خوش و خرم تھی۔

''آپ کچھ گم صم ہیں۔'' شیما ناشتے کے برتن اٹھانے آئی تو عبدل کا یوں خاموش خاموش انداز محسوس کرتے ہوئے بولی۔

''ہاں..... کیا کہا؟'' ایسے جیسے سکتہ ٹوٹا ہو۔ عبدل چونک کر شیما کو دیکھنے لگا اور شیما اسے دیکھ کر رہ گئی۔

''کچھ خاموش خاموش سے محسوس ہوتے ہیں۔ طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

''طبیعت..... ہاں تھوڑا سر میں درد ہے۔'' بروقت بہانہ بن گیا۔ ورنہ شیما کہاں بات چند فقروں میں نبٹاتی۔

''اوہ تو پھر آج چھٹی کریں۔ ایک دن آپ کا حجام نہیں کھلے گا تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

''گھر بیٹھ کر کیا کروں گا۔ چلتا ہوں۔'' عبدل اٹھ کھڑا ہوا۔

''چلیں سر درد کی گولی لاتی ہوں، وہی کھا لیں۔''

''نہیں، کچھ اتنا زیادہ درد بھی نہیں کہ گولی کھائی جائے۔'' عبدل چلا آیا۔

دکان کا شٹر اٹھایا۔ کچھ صفائی اور جھاڑ پونچھ کی۔ عموماً صبح کم ہی گاہک آتے اور آج تو عبدل کی خود تمنا تھی کہ گاہک

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

نہ آئیں اور یہ تمنا پوری ہوئی۔

گھنٹا بھر کوئی گاہک نہ آیا اور دل گرفتہ سا عبدل ماضی میں بھٹکنے لگا۔ دل گرفتگی اس کی طبیعت کا حصہ نہ تھی اور نہ ہی وہ ماضی میں کھوئے رہنا پسند کرتا تھا مگر کل یوں اچانک فردوس کے بیٹے کو پہچاننا اور پہچان کر سنگین غلطی، بلا ارادہ ہی سہی مگر تھی تو سنگین غلطی، اس سے پوچھ لینا کہ وہ فردوس کا بیٹا ہے اور اس لڑکے کا اچنبھے سے اسے دیکھنا۔

عبدل نے آنکھیں میچ لیں اور سر پشت کی دیوار سے لگا لیا۔ ماضی کی فلم آنکھوں کے سامنے چلنے لگی۔ ایسے جیسے کل کی بات ہو۔

''میرے قریب مت آؤ۔''

''کیوں؟ کیا تمہیں میری محبت پہ یقین نہیں؟'' عبدل کے لہجے میں خمار تھا۔

''نہیں، یقین ہے اور بے حد ہے مگر یہ سب شادی سے پہلے.....''

''تو کیا فردوس تمہیں لگتا ہے میں تمہیں دھوکا دے رہا ہوں۔ وقت گزاری، محبت کے نام پر کھلواڑ اور تم سے شادی نہیں کروں گا؟'' عبدل بگڑنے لگا۔

''ایسی بات نہیں.....''

''تو پھر.....'' عبدل قریب آنے لگا۔

''لیکن.....''

''کوئی لیکن نہیں۔ تم مجھے دیکھو۔ کیا تمہیں میری آنکھوں میں محبت نظر نہیں آتی؟'' اور فردوس چاہ کر بھی مزاحمت نہ کر پائی اور محبت کے نام پر وہ سب گنوا بیٹھی جس کے بارے میں کہا جاتا ہے..... جان جائے تو جائے مگر مان نہ جائے۔ قدموں کی چاپ نے اسے آنکھیں کھولنے پر مجبور کیا اور جیسے وہ ماضی سے حال میں لوٹ آیا۔

دکان میں کٹنگ اور شیو کی غرض سے آنے والا کوئی مرد نہ تھا۔ کوئی نقاب پوش عورت تھی۔

مین بیوٹی سیلون میں عورت کا کیا کام؟ اس سے قبل کہ عبدل پوچھتا عورت نے اپنا نقاب ڈھلکایا۔

چہرے کے نقوش واضح ہوئے تو عبدل ساکن سا ہو گیا۔

آنے والی کوئی اور نہ تھی۔ فردوس تھی۔ وہ فردوس جو جوانی کے دنوں میں اس کی محبوبہ تھی اور جو ہمیشہ ہی رہی۔ بیوی کے درجے پر فائز نہ ہوئی تو یہ عبدل کی ہی منشا تھی۔

اور وہ فردوس جو یہ سوچ کر آئی تھی کہ عبدل کو گریبان سے پکڑے گی، چلا چلا کر لوگ اکٹھے کرے گی، اس کا منہ نوچ لے گی اور آخر میں اپنے بغل میں دبے پرس سے چاقو نکالے گی اور عبدل کے پیٹ میں گھونپ دے گی... ایسا کچھ نہ کر پائی۔ لرزتے وجود کے ساتھ بس عبدل کو دیکھتی رہی۔

''کیسی ہو فردوس!''

عبدل کے منہ سے اپنا نام سننے کی دیر تھی..... فردوس پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ زندگی گزر گئی، زندگی بدل گئی مگر وہ کبھی اس کمزور لمحے کے سحر سے نہ نکل پائی۔ چھپاتی رہی اور پچھتاتی رہی۔

''یوں روؤ مت۔''

''میں تمہیں قتل کرنے آئی ہوں۔'' روتے روتے فردوس نے اپنا پرس کھولا اور چاقو نکال کر دکھایا کہ وہ واقعی اسی ارادے سے آئی ہے۔

عبدل کی نگاہیں اس چاقو پر جم گئیں۔ وہ ایسا تیز دھار ہرگز محسوس نہ ہوتا تھا۔ یہ چاقو اسے زخمی تو کر سکتا تھا مگر جان نہیں لے سکتا تھا۔ عبدل کا چہرہ ندامت سے جھک گیا۔

''کیا معاف نہیں کر سکتیں؟''

''معاف.....!'' فردوس چلا اٹھی۔ ''زمانے گزر گئے اور میں خود کو آج بھی اس گناہ سے آلودہ محسوس کرتی ہوں۔'' فردوس روتی رہی اور عبدل سر جھکائے کھڑا رہا۔

وولٹر کے قہقہے لگاتے ہوئے آئے۔ قبل اس کے کہ وہ سیلون کا دروازہ پار کرتے، اندر کا منظر دیکھ کر تھم گئے۔

فردوس نے دروازے کے پار اپنے بیٹوں کی عمر کے لڑکوں کو کھڑا دیکھا۔ آنکھیں پونچھیں، ایک ملامت بھری نظر عبدل پر ڈالی اور چاقو پھینک کر جیسے آئی تھی ویسے ہی سیلون سے چلی گئی۔

''بڑی دور سے کٹنگ کروانے آئے ہیں۔ آپ کی کٹنگ کا چرچا تو کہاں کہاں تک جا پہنچا ہے۔'' لڑکے دروازہ پار کر کے اندر آ گئے تھے۔

''میری طبیعت خراب ہے۔ بال کاٹنے سے قاصر ہوں۔'' سوچ بورڈ پر اٹلے سیدھے ہاتھ مار کر عبدل نے پنکھا اور لائٹس بند کیں۔ خود باہر آیا اور لڑکوں کو بھی باہر آنے کا اشارہ کیا۔ لڑکے باہر آئے تو اس نے شٹر گرا دیا اور بوجھل دل کے ساتھ گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

گو کہ زندگی ختم نہ ہوئی تھی مگر بعد از قضا کی کہانی میں صرف ملال کے رنگ تھے۔ وہ اس ایک لمحے کی گرفت سے تو شاید کبھی آزاد نہ ہو سکے..... مگر وہ اذیت جو فردوس کے حصے میں آئی تھی، اب وہ بھی اس میں شریک ہو گیا تھا..... اور جب تک زندگی تھی، یہ اذیت یونہی رہنے والی تھی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ

ضیا تسنیم بلگرامی

شاہوں سے دور بھاگنے اور مٹی سے خوش رہنے والے یہ منکسر المزاج لوگ... جن کا اوڑھنا اور بچھونا فقط مخلوق کی خدمت اور خالق کی رضا کے سوا کچھ نہ ہو تو ایسے ہی لوگوں کے قدموں تلے بادشاہت مٹی بن کر رہ جاتی ہے۔ اللہ نے ایسے برگزیدہ بندوں کا ظرف بنایا ہی اتنا اعلیٰ اور مضبوط ہے کہ کائنات کے تمام خزانے ان کی نظروں سے پوشیدہ بھی نہیں اور ان کے دلوں میں ان کی طمع بھی نہیں... یہ سب کرامات پر انسان کے حصے میں نہیں آتیں... اور جن کے حصے میں آجائیں وہ عام انسان نہیں ہوتے۔ آپ کا شمار بھی ایسی ہی مضبوط اور اعلیٰ مقام ہستیوں میں ہوتا ہے۔

دنیاداری کو ٹھکرانے والے اور آزمائشوں میں خوش رہنے والے ایک ولی کا قصہ

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے گھر میں جب پہلی اولاد ہوئی تو انہوں نے اپنے بیٹے کے دو نام رکھے' تاریخی نام غلام حلیم رکھا گیا جس سے بچے کے سنِ پیدائش کا پتا چل جاتا تھا۔ یہ رمضان کی 25 اور سنِ ہجری کا 1159 واں سال تھا۔ بچے کا دوسرا نام عبدالعزیز رکھا گیا اور یہ وہ نام ہے جس نے برصغیر کی تاریخ میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ بچے کی کشادہ پیشانی دیکھنے والوں کو بتا رہی تھی کہ ایک نہ ایک دن یہ بچہ تاریخِ ہند کا غیر معمولی اور عظیم انسان ثابت ہوگا۔ پورے گھر میں جوش و خروش نے

WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

Downloaded From Paksociety.com

خوشیوں کے ڈونگرے برسا دیے۔

بچہ ماہ بہ ماہ اور سال بہ سال بڑھنے لگا۔ شاہ ولی اللہ کو یہ فکر پریشان کرنے لگی کہ اسے تعلیم و تربیت کی خاطر کس کے حوالے کیا جائے۔ آخر کار شاہ صاحب کی نظرِ انتخاب اپنے دو خلیفہ پر پڑی۔ خلیفہ مولانا محمد عاشق حسین اور خلیفہ مولانا خواجہ امین اللہ صاحب۔ بچے کے دو نام تو رکھ دیے گئے تھے مگر تاریخ شاہد ہے کہ تاریخی نام غلام حلیم محض تاریخ کا ایک حصہ بن کر رہ گیا اور دوسرا نام عبدالعزیز زبان زدِ عام و خاص ہو گیا۔

پانچ سال کے ہوئے تو انہیں مذکورہ دونوں خلفاء کے سپرد کر دیا گیا۔ دونوں استادوں نے عبدالعزیز کو بڑی دلجمعی اور یکسوئی سے تعلیم دی اور دو سال کے اندر انہوں نے مربی کے مختلف فنون میں حیرت انگیز ترقی حاصل کر لی۔

جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں پر نمازِ عشا کے بعد فارسی قصہ گو مجمع لگا کر بیٹھ جاتے تھے۔ اس مجمع میں عوام اور اعلیٰ طبقوں کے لوگ ایک ساتھ بیٹھتے تھے۔ فارسی دانی کے لیے ان مجمعوں میں شریک ہونا بہت ضروری تھا۔ شاہ عبدالعزیز نے بھی ان فارسی قصہ خوانوں سے فائدہ اٹھایا۔ اتفاق کی بات کہ شاہ ولی اللہ کے مریدوں میں لاڈلی خانم نامی ایک عورت کو قصہ خوانی میں کمال حاصل تھا۔ شاہ عبدالعزیز لاڈلی خانم کے گھر چلے جاتے اور اس سے قصہ گوئی کی فرمائش کرتے۔ لاڈلی خانم فارسی داستان گوئی شروع کر دیتی اور شاہ عبدالعزیز اس میں محو ہو جاتے۔ اس عورت نے آپ کی فارسی زبان کی تدریس اور تحصیل میں بڑی مدد کی۔

یہ اس دور کی بات ہے، جب اردو کے مشہور شاعر آرزو، سودا، میر تقی میر، مظہر جان جاناں اور میر درد کی کمال شاعری کا ڈنکا بج رہا تھا اور اس زبان کی تحصیل کو ضروری اور لازمی تصور کر لیا گیا تھا۔ شاہ عبدالعزیز نے بھی میر درد کا سہارا لیا اور ان کی خدمت میں حاضریاں دینے لگے۔ یہاں محاورات کی مدد سے اردو کو حسین سے حسین تر بنایا جا رہا تھا۔ شاہ عبدالعزیز نے ایک دن اپنے والدِ بزرگوار سے پوچھا۔ ''باوا جان! کیا میر درد کے علاوہ ایک بھی ایسا شخص نہیں ہے جو ہمیں اردو زبان سکھا سکے؟''

شاہ ولی اللہ نے جواب دیا۔ ''بیٹے! تیرا سوال اپنی جگہ، اس کا جواب یہ ہے کہ خواجہ میر درد اردو کے موجد اور مجتہد ہیں۔ آپ کی صحبت کے بغیر اس زبان کی دستگاہ مشکل ہے اور خواجہ میر درد چراغِ سحری ہیں، معلوم نہیں کب یہ چراغ بجھ جائے۔''

آپ نے عبرانی زبان بھی حاصل کی تھی۔ یہ زبان آپ نے کس سے حاصل کی تھی؟ اس سوال کا جواب تا حال نہیں مل سکا ہے۔

آپ کی یادداشت اور حافظے کا یہ حال تھا کہ جب آپ کی عمر پانچ یا چھ سال کی تھی اور آپ نے اپنے والدِ بزرگوار کو اس حال میں دیکھا کہ وہ کسی مسئلے کی وضاحت اور اس کا جواب مرحمت فرما رہے ہیں۔ آپ نے اس کو سن کر اپنے حافظے میں بٹھا لیا اور سالہا سال کے بعد جب اس مسئلے پر گفتگو شروع ہوئی تو آپ نے اپنے والد کی ساری گفتگو بیان فرما دی۔

آپ نے تیرہ سال کی عمر میں صرف و نحو، فقہ، منطق، کلام، عقائد، ہندسہ ہیئت اور ریاضی میں مہارت حاصل کر لی تھی۔ آپ ابھی سترہ سال کے تھے کہ والد حضرت شاہ ولی اللہ وصال فرما گئے۔ آخری لمحات میں والدِ بزرگوار نے عبدالعزیز کے برادرِ خورد شاہ رفیع الدین کا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دے دیا اور کہا۔ ''عبدالعزیز! یہ رفیع الدین تیرا چھوٹا بھائی نہیں تیرا بیٹا ہے، چنانچہ اس کی ساری ذمے داری تیرے سر ہے۔''

آپ نے باپ کی وصیت کا پوری زندگی احترام اور پاس کیا اور اپنے چھوٹے بھائی رفیع الدین کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دے کر انہیں ہندوستان کی نادرۂ روزگار شخصیت بنا دیا۔

آپ نے اپنے والد کی تحریک کو جاری رکھا۔ ان دنوں اسلام اور مسلمانوں کی زبوں حالی کا یہ عالم تھا کہ نام نہاد اقتدار تو مسلمانوں کے ہاتھ میں تھا مگر مسلمان ہی سب سے مظلوم تھے۔ مرہٹے، سکھ، انگریز اور مسلمانوں کا ایک فرقہ جو اپنے عقائد کی رو سے شاہ عبدالعزیز اور فرقۂ احناف کا نہ صرف مخالف بلکہ دشمن تھا، یہ لوگ مسلمانوں پر الگ الگ اور کبھی کبھی مل جل کر ظلم و ستم ڈھانے میں مشغول رہتے تھے۔ ملک کا بادشاہ مغل تھا مگر اس کی حیثیت شاہِ شطرنج سے زیادہ نہیں تھی۔ بازی گر اور شاطر اپنی اپنی چالیں چلتے اور بادشاہ بے جان مہرے کی طرح ان کی چال اور حکمتِ عملی کا پابند اور معمول ہوتا۔ ان حالات میں پہلے تو شاہ ولی اللہ نے جہاد کیا اور مسلمانوں کی زندگی میں فکل کل نظام (یعنی سیاسی اور سماجی زندگی کے ہر شعبے میں انقلاب۔ ہمہ جہت اور ہمہ گیر انقلاب) کا تصور پیش کیا۔ چونکہ اس دور میں برصغیر پریس سے محروم تھا اس لیے فک کل نظام کا منصوبہ پروان نہیں چڑھ سکا۔ شاہ ولی اللہ کے بعد شاہ عبدالعزیز نے اس مشن کو جاری رکھا اور مسلمان ان سے راہنمائی حاصل کرنے لگے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

شاہ عبدالعزیز محدث دھلوی

کہتے ہیں، اس دور میں پورے ملک کے نامی گرامی علمائے کرام میں سے ایک شخص بھی ایسا نہیں تھا جس نے شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز کے مدرسے سے فیض نہ حاصل کیا ہو۔

شاہ عبدالعزیز کو اپنے مخالفین کا مختلف محاذوں پر مقابلہ کرنا پڑتا تھا۔ ان کی تربیت ہی کچھ اس طرح ہوئی تھی کہ وہ بیک وقت دین اور دنیا میں شامل اور داخل رہتے تھے۔ شاہی دربار، امراء، نوابین اور عہدے داران شاہی سے ہمیشہ دور دور رہے اور ان سے کبھی بھی مالی مدد نہ چاہی اور نہ ہی قبول کی۔ ان کے اوقات کار میں سے کچھ تو مراقبوں اور مجاہدوں میں صرف ہو جاتا اور کچھ مسلمانوں کی راہنمائی اور تعلیم و تدریس میں صرف ہو جاتا۔

خدا نے شاہ عبدالعزیز کو تقریر اور تحریر کی بے مثال صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ وہ ایک طرف تصنیف و تالیف کی شکل میں گراں مایہ خدمات انجام دے رہے تھے۔ دوسری طرف منگل اور جمعے کو کوچۂ چیلان کے مدرسے میں خواص اور عوام سے خطاب فرمایا کرتے تھے۔ ان دونوں کے اجتماع میں آپ کے دوست اور دشمن یکساں شرکت کرتے تھے۔ مخالفین اس لیے شریک ہوتے تھے کہ وہ اگر آپ کی تقریر یا خطابت میں کوئی قابل اعتراض بات پائیں تو اسے آپ کے خلاف استعمال کریں اور خوب خوب اچھالیں مگر انہیں ہمیشہ مایوس ہونا پڑا اور مخالفین کی اکثریت آپ کے مریدوں اور ارادت مندوں میں داخل ہو گئی۔

ایک دن آپ کہیں تشریف لے جا رہے تھے آپ نے راستے میں ہٹو بچو کی آوازیں سنیں تو ایک طرف ہو گئے اور رواں دواں ہجوم کی طرف دیکھ کر کسی سے پوچھا۔ ''کیوں بھائی! یہ کس کی سواری جا رہی ہے؟''

جواب ملا۔ ''شہزادہ ولی عہد کی۔''

اس دوران سواری رک گئی اور اس میں سے شہزادہ ولی عہد نمودار ہوا اور بھاگ کر آپ کے قریب آ گیا۔ آپ کے دونوں ہاتھ پکڑ کر بوسے دیے اور عرض کیا۔ ''اس غلام کی ہمیشہ یہ خواہش رہی ہے کہ کسی دن آپ میرے کاشانے میں قدم رنجہ فرمائیں تاکہ میں بھی اپنی قسمت پر ناز کروں۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''اب فقیر میں استادم نہیں ہے کہ وہ آپ لوگوں کی دعاؤں میں الجھ کر رہ جائے۔''

شہزادہ ولی عہد نے عرض کیا۔ ''بس حضرت! صرف ایک بار۔''

آپ نے فرمایا۔ ''لوگو! اس شہزادے کی باتیں سن رہے ہو؟ یہ مجھے اپنے گھر بلا رہا ہے جبکہ میں غربا کے گھر تو اکثر چلا جاتا ہوں لیکن خدا کا شکر ہے کہ میں نے امراء سے پرہیز کیا ہے۔''

شہزادہ ولی عہد کے ساتھ ایک نواب بھی مجو سفر تھا، اس نے شہزادہ ولی عہد کی اجازت سے آپ سے ملاقات کی اور عجز و انکسار سے عرض کیا۔ ''حضرت! میرے غریب خانے تشریف لے چلیں اور مجھ کو فخر اور تحسین و آفرین کا موقع مرحمت فرمائیں۔''

آپ نے فرمایا۔ ''ابھی کچھ دیر پہلے شہزادہ ولی عہد نے بھی اسی قسم کی دعوت دی تھی لیکن میں نے اس کو قبول نہیں کیا۔ پھر تیری دعوت کیونکر قبول کر لوں؟''

نواب شرمندہ ہو کر پیچھے ہٹ گیا۔ کچھ دیر بعد شہزادہ ولی عہد اور نواب کی سواریاں گزر گئیں۔ ان کے چلے جانے کے بعد آپ بھی روانہ ہو گئے۔

اس زمانے میں عیسائی مشنریز بڑی لگن اور محنت سے تبلیغی فرائض انجام دے رہی تھیں۔ پادریوں نے آپ کا بڑا شہرہ سن رکھا تھا اور ان میں سے بیشتر کی یہ خواہش تھی کہ وہ کسی طرح شاہ عبدالعزیز سے باتیں کر کے اپنی تبلیغی ذمے داریاں انجام دیں۔

دہلی کے انگریز ایجنٹ گورنر منکاف سے ایک پادری نے کہا۔ ''جناب والا! میں کافی دنوں سے دہلی اور اس کے مضافات و نواح میں تبلیغی خدمات انجام دے رہا ہوں اور میں نے ہندی اچھوتوں میں خاصی کامیابیاں بھی حاصل کی ہیں مگر مجھ کو مسلمانوں پر سخت غصہ آتا ہے کہ ان پر میری تقریر اور تبلیغ کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ آپ مشورہ دیں کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟''

منکاف نے جواب دیا۔ ''فادر! اس شہر میں ایک ایسا خاندان بھی ہے جس کا مسلمانوں پر گہرا اثر ہے۔ شاہ ولی اللہ کا خاندان۔ اس خاندان کے ایک بزرگ شاہ عبدالعزیز ہر منگل اور جمعے کو خواص و عوام سے خطاب کیا کرتے ہیں۔ بس ان کی یہی خطابت ڈھال اور سپر کا کام کرتی ہیں اور ان کی تبلیغی مساعی بار آور ہوتی ہیں۔''

پادری نے کہا۔ ''جنابِ والا! میں اس شاہ سے بھی ملنا چاہتا ہوں۔ میں اس سے مناظرے کروں گا اور دیکھوں گا کہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

کون مجھ سے جیتتا ہے۔آپ میری اتنی مدد کردیں کہ اس شاہ کو مناظرے پر آمادہ کرلیں، بقیہ کام میں خود کرلوں گا۔''
مٹکاف نے جواب دیا۔''فادر! یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔میں آپ کی شاہ صاحب سے ملاقات کرادوں گا کیونکہ شاہ عبدالعزیز بہت ہی منکسر المزاج انسان ہیں لیکن اس ملاقات کے بعد جو مناظرہ ہوگا اور جب مناظرے میں ہار جیت کا فیصلہ ہوگا تو اس میں یہ شرط رکھی جائے کہ جو جیتے گا، ہارنے والا اس کو دو ہزار روپے ادا کرے گا۔''
مٹکاف کی تجویز پادری کو بہت پسند آئی، بولا۔''مجھے تمہاری بات منظور ہے۔خدا نے چاہا تو میں شاہ صاحب کو قائل کرلوں گا اور وہ خود بھی......''
مٹکاف نے کہا۔''فادر! میری ایک بات سن لیجیے۔شاہ صاحب ایک درویش صفت انسان ہیں۔اول تو وہ شرط پر آمادہ ہی نہیں ہوں گے اور جب وہ آمادہ ہی نہیں ہوں گے تو یہ شرط لگا کر مناظرہ کرنا کب پسند آئے گا۔''
پادری نے کہا۔''تمہیں جو کچھ کہنا ہے، صاف صاف کہہ دو۔میں ذرا بھی پریشان نہیں ہوں۔''
مٹکاف نے کہا۔''میں شاہ صاحب کے کردار اور عظمت سے اچھی طرح واقف ہوں۔اگر وہ ہار گئے تو ان کی رقم میں دوں گا، آپ ان سے نہیں مانگیں گے۔''
پادری نے حیرت سے پوچھا۔''شرط کی رقم تم کیوں دو گے؟''
مٹکاف نے کہا۔''میں نے کہہ جو دیا، شاہ صاحب شرط پر آمادہ ہی نہ ہوں گے۔''
پادری نے پوچھا۔''پھر یہ مناظرہ کب اور کہاں ہوگا؟''
مٹکاف کو غصہ آرہا تھا مگر اس نے بڑے ضبط اور تحمل سے کام لیا۔پادری نے کہا۔''گورنر بہادر! تم شاہ صاحب کو مناظرے پر آمادہ کرلو۔میں اس کا انتظار کررہا ہوں۔''
مٹکاف نے اسی دن شاہ صاحب سے رابطہ کیا اور عرض کیا۔''حضرت! مجھے آپ کی علیت کا اندازہ ہے لیکن پادری صاحب کو اس سے انکار ہے۔وہ آپ سے مناظرہ کرنا چاہتے ہیں۔''
آپ نے متبسم ہوکر پوچھا۔''درمیان میں کوئی شرط بھی رکھی جارہی ہے؟''
مٹکاف نے جواب دیا۔''ہاں، ایک شرط رکھی تو جارہی ہے۔''
آپ نے فرمایا۔''میں شرط کو پسند کرتا ہوں بشرطیکہ اس میں روپوں کے لین دین کا ذکر نہ ہو۔شرط یہ ہونی چاہیے کہ مناظرے میں جو جیت جائے، ہارنے والا جیتنے والے کا دین اختیار کرلے۔''
مٹکاف نے جواب دیا۔''اس شرط کو فادر نہیں پسند کریں گے۔ان کا تو خیال ہے کہ ہارنے والا جیتنے والے کو دو ہزار روپے ادا کرے۔میں نے ان سے یہ وعدہ کرلیا ہے کہ اگر آپ ہار گئے تو شرط کی رقم آپ کی طرف سے فادر کو میں ادا کروں گا۔''
شاہ صاحب نے فرمایا۔''نہیں، ایسا نہیں ہوگا۔اگر مناظرے میں میری شکست ہوگئی تو یہ رقم بھی میں ہی ادا کروں گا۔''
مٹکاف نے پوچھا۔''تو فادر کو میں مطلع کردوں کہ آپ مناظرے پر آمادہ ہیں؟''
آپ نے جواب دیا۔''میں تیار ہوں۔''
مٹکاف نے پوچھا۔''کس دن اور کہاں؟''
آپ نے فرمایا۔''دن اور جگہ کا انتخاب بھی آپ کے فادر ہی پر چھوڑتا ہوں۔''
مٹکاف نے کہا۔''اچھا پھر میں جاتا ہوں اور دن اور جگہ کا مسئلہ بھی حل کرتا ہوں۔''
مٹکاف اسی وقت پادری کے پاس چلا گیا اور اس کو یہ خوش خبری سنائی۔''فادر! شاہ صاحب مناظرے پر آمادہ ہیں اور مجھ کو یہ اجازت دے دی ہے کہ میں جب اور جہاں چاہوں فیصلہ کردوں، وہیں اور اسی دن مناظرہ ہوجائے گا۔''
پادری نے کہا۔''پھر دیر کیوں؟ کل ہی مناظرہ ہوجانا چاہیے۔''
مٹکاف نے آپ کو مطلع کردیا کہ فادر مناظرے کے لیے ہر وقت تیار ہیں۔
جس دن مناظرہ تھا، پورے شہر کو بتادیا گیا تھا کہ مسیحیت اور اسلام میں ایک زبردست مناظرہ ہونے والا ہے۔جو لوگ اس مناظرے میں شریک ہونا چاہیں شریک ہوجائیں، ان کا خوشی سے استقبال کیا جائے گا۔
اس دن شہر کے بہت سارے لوگوں نے پادری کی قیام گاہ کا رخ کیا۔پادری اور مٹکاف کی طرف سے شاہ عبدالعزیز کا بڑی بے چینی سے انتظار کیا جارہا تھا۔اسی عالم میں شاہ صاحب کی سواری ہجوم کو چیرتی ہوئی پادری کے دروازے پر رکی۔عقیدت

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

شاہ عبدالعزیز محدث دھلوی

مندوں نے زندہ باد کے نعرے لگائے اور گورنر بہادر نے اپنی جگہ چھوڑ دی اور چند قدم چل کر شاہ صاحب کا استقبال کیا۔

شاہ صاحب کو پادری کے سامنے بٹھا دیا گیا۔ کچھ دیر تو دونوں طرف سکوت طاری رہا۔ سامعین اور ناظرین نے خاموشی اختیار کر لی تھی۔

آخر کچھ دیر بعد پادری نے کہا۔ ''شاہ صاحب! میں اس وقت جس موضوع پر بات کرنے والا ہوں، میری خواہش ہے کہ بات اسی موضوع پر ہو اور اس کے ہوتے ہوئے کسی اور موضوع کو زیر بحث نہ لایا جائے۔''

آپ نے فرمایا۔ ''میں بھی یہی چاہتا ہوں۔''

کچھ دیر بعد پادری نے کہا۔ ''شاہ صاحب! میں آپ سے سوال کروں گا اور آپ اس کا جواب دیں گے لیکن جواب کے سلسلے میں آپ پر یہ پابندی عائد ہوگی کہ میرے سوال کا جواب معقول ہو منقول نہ ہو۔''

آپ نے فرمایا۔ ''میں اس کی پابندی کروں گا۔''

پادری نے کھنکھار کر کہا۔ ''شاہ صاحب! میں جاننا چاہتا ہوں کہ آپ کے پیغمبر کیا ہیں؟''

شاہ صاحب نے جواب دیا۔ ''رحمت اللعالمین بھی ہیں اور حبیب اللہ بھی۔''

پادری نے کہا۔ ''میں آپ سے شرمندہ ہوں شاہ صاحب! میں نے آپ سے دوبارہ ملاقات کی تو اس طرح، خوب!''

شاہ صاحب نے فرمایا۔ ''یہ وقت فضول باتوں کا نہیں ہے۔''

پادری نے پھر شاہ صاحب سے کہا۔ ''جناب والا! میں اس محفل میں آپ سے مناظرے کی غرض سے آپ سے باتیں کرنے آیا ہوں، تو میں نے آپ سے کیا پوچھا تھا ابھی ابھی؟''

شاہ صاحب نے جواب دیا۔ ''یہ کہ میرے پیغمبر زمان کی تعریف میں اللہ نے کیا فرمایا ہے؟''

پادری نے کہا۔ ''ہاں تو میرے علم میں ابھی ابھی یہ بات آئی ہے کہ آپ کے پیغمبر کو خدا نے حبیب اللہ کہا ہے۔''

آپ نے فرمایا۔ ''ہاں، میرا اتنا ہی جواب تھا آج۔''

پھر مزید یہ سوال ہوئے اور آپ نے ہر سوال کا بڑا بامعنی جواب دیا لہٰذا۔ بالآخر پادری شرمندہ ہو گیا اور دو ہزار روپے آپ کے سامنے رکھ دیے۔ آپ نے فرمایا۔ ''محترم بزرگ! آپ اپنے روپے اٹھا لیں، ہاں اگر آپ کے دل پر شرط کی جیت اور میری بات کا کوئی اثر ہوا تو آپ اسلام قبول فرما لیں، میرے لیے یہ بہت کافی انعام ہوگا۔''

لیکن پادری نے آپ کی بات نہیں مانی اور اپنے روپے لے کر چلا گیا۔

مکاف نے پادری سے کہا۔ ''کیا آپ کو یہ نہیں بتا دیا تھا کہ شاہ صاحب سے جیتنا بہت مشکل ہے۔''

پادری نے جواب دیا۔ ''میرے بچے! میں تجھ سے متفق ہوں۔ شاہ صاحب کی ذہانت اور فطانت کا کوئی جواب نہیں۔''

آپ کے اس مختصر سے مناظرے کا دہلی میں بڑا چرچا ہوا۔ مسلمان بہت خوش تھے اور عیسائیوں کو اس سے بڑا دکھ پہنچا۔ انگریز ریذیڈنٹ کے دل پر اس کا بڑا اثر پڑا۔ وہ مہینوں پیچ و تاب کھاتا رہا۔ آخر ایک دن آپ کی خدمت میں حاضری دی اور عرض کیا۔ ''شاہ صاحب! اس وقت میں آپ کی خدمت میں ایک پیچیدہ مسئلہ لے کر حاضر ہوا ہوں۔ آپ کی ذہانت، فراست اور علمیت سے یہی توقع رکھتا ہوں کہ بہت معقول جواب پا لوں گا۔''

شاہ صاحب نے فرمایا۔ ''ارشاد فرمائیں، اگر خدا کی توفیق شاملِ حال رہی تو میں آپ کو ضرور مطمئن کر سکوں گا۔''

ریذیڈنٹ نے کہا۔ ''شاہ صاحب! میں نے اپنا یہ سوال کئی جگہ دہرایا مگر کسی نے بھی اس کا جواب نہیں دیا مگر امید ہے کہ آپ مجھے مایوس نہیں کریں گے۔''

شاہ صاحب نے فرمایا۔ ''آپ سوال تو کریں، اللہ نے چاہا تو اس کا جواب بھی مل جائے گا۔''

ریذیڈنٹ نے کہا۔ ''ایک مسافر محوِ سفر ہے لیکن راہ چلتے چلتے اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ راستہ بھول چکا ہے۔ اس نے اپنے آس پاس دیکھا تو اسے ایک شخص بیٹھا دکھائی دیا اور دوسرا سویا ہوا نظر آیا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مسافر راستہ کس سے پوچھے؟''

شاہ صاحب نے جواب دیا۔ ''مسافر کو چاہیے کہ وہ وہاں بیٹھ جائے اور انتظار کرے کہ جب سویا ہوا شخص بیدار ہو تو اس سے راستہ دریافت کرے۔ رہ گیا وہ شخص جو بیدار ہے اور بیٹھا ہوا ہے، وہ خود راستے سے بے خبر ہے کیونکہ راستے کا تعلق چلنے سے ہے، بیٹھنے سے نہیں ہے۔ یہ بیٹھا ہوا شخص گویا خود کسی کا منتظرِ راہنمائی ہے۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

ریذیڈنٹ اپنا سا منہ لے کر رہ گیا کیونکہ مسافر سے اس کی مراد عام انسانوں سے تھی۔ بیٹھے ہوئے شخص سے اس کی مراد حضرت مسیحؑ سے تھی اور سوئے ہوئے سے اس کا اشارہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تھا۔

اس واقعے نے بڑی شہرت حاصل کی۔ مسلمانوں کا آپ پر اعتقاد اور اعتماد بہت زیادہ بڑھ گیا تھا مگر عیسائیوں اور ہندوؤں کو ان سے بڑی تکلیف پہنچ رہی تھی اور پادریوں کو آپ پر رہ رہ کر بڑا غصہ آ رہا تھا۔

آپ جامع مسجد دہلی میں درسِ قرآن فرما رہے تھے۔ دور تک آدمی ہی آدمی نظر آ رہے تھے۔ ان میں ایک پادری بھی موجود تھا۔ دورانِ درس وہ اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا اور شاہ صاحب سے کہا۔ ''حضرت! آپ کی طاقت لسانی کا کوئی جواب نہیں، امید ہے کہ آپ مجھے مایوس نہیں کریں گے۔''

آپ نے فرمایا۔ ''آپ سوال کر کے تو دیکھیے، اللہ نے چاہا تو میں اس کا شافی وکافی جواب دوں گا۔''

پادری نے کہا۔ ''حضرت شاہ جی! ذرا اپنے سوال کا کوئی معقول اسلوب تو اختراع کر لوں۔''

آپ نے فرمایا۔ ''اس کی کوئی ضرورت نہیں، آپ اپنا مافی الضمیر بیان فرما دیں، میرے لیے وہی کافی ہے۔''

پادری نے کہا۔ ''شاہ صاحب! آپ کے پیغمبرؐ زمین کے اندر دفن ہیں اور ہمارے پیغمبر چوتھے آسمان پر تشریف فرما ہیں۔ اب میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ مرتبے و مقام میں کون بڑا ہے؟''

شاہ صاحب نے تبسم فرمایا اور جواب دیا۔

کسے بگفت کہ عیسیٰؑ ز مصطفےٰؐ اعلیٰ است	کہ ایں بہ زیرِ زمیں، او بہ اوجِ سما است

بگفتمش کہ نہ ایں حجتِ قوی است	حباب برسرِ دریا، گہر تہِ دریا است

(کسی نے کہا۔ حضرت عیسیٰؑ کا مقام رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اعلیٰ ہے کیونکہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم زیرِ زمیں دفن ہیں اور حضرت مسیحؑ چوتھے آسمان پر تشریف فرما ہیں۔ سننے والے نے اس کا جواب یوں دیا کہ پانی کے بلبلے ہمیشہ سطحِ آب پر رہتے ہیں اور گہر ہمیشہ دریا کی تہ میں رہتا ہے)

پادری کا سر چکرا گیا اور سامعین وناظرین نے نعرۂ تکبیر بلند کیا۔

آپ نے پادری کو بالکل لاجواب کر دیا تھا۔ اس مناظرے کی بھی دہلی اور اس کے نواح میں بڑی دھوم مچ گئی اور ہر طرف سے آپ کو مبارکبادیں وصول ہونے لگیں۔

☆☆☆

اس سال بارش نہیں ہوئی تھی۔ خشک سالی نے ہر شخص کو پریشان کر دیا تھا۔ اسی عالم میں بادشاہ کے ایک مصاحب نے خواب میں دیکھا کہ ایک بزرگ جبہ و دستار پہنے سامنے کھڑے تھے۔ ان کے پاؤں میں لکڑی کی کھڑاؤں تھی اور ہاتھ میں لاٹھی پکڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے بادشاہ کے مصاحب سے پوچھا۔ ''اے شخص! تو بادشاہ کا مصاحب ہے نا؟''

مصاحب نے جواب دیا۔ ''ہاں، میں بادشاہ کا مصاحب ہوں مگر اس سوال سے تیرا مقصد؟ تیرا مطلب؟''

بزرگ نے فرمایا۔ ''کل بادشاہ کو بتا دے کہ خشک سالی کی وجہ سے لوگ ادھر ادھر بھاگ رہے ہیں۔ اگر بادشاہ کو اپنی ذات اور رعایا سے ہمدردی ہے تو وہ شاہ عبدالعزیز کی خدمت میں جائے اور ان سے کہے کہ آپ کو بادشاہ نے یاد فرمایا ہے اور جب شاہ صاحب تشریف لے آئیں تو ان سے فرمائیں کہ شہر کے دروازے پر ایک نقش لکھ کر آویزاں فرما دیں۔ اس نقش کی برکت سے خدا بارش بھی فرما دے گا اور شہر سے وبا کو بھی دفع کر دے گا۔''

بادشاہ کے مصاحب کی آنکھ کھلی تو علی الصباح بادشاہ کے پاس چلا گیا اور ملاقات ہوتے ہی اپنا خواب سنا دیا۔ بادشاہ سے عرض کیا۔ ''آقائے ما! میں نے سنا ہے کہ بارش نہ ہونے کی وجہ سے شہر کے بعض حصوں میں وبا پھوٹ پڑی ہے۔ اگر یہ خبر درست ہے تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ وہ دن دور نہیں جب پورا شہر اس وبا کی لپیٹ میں آ جائے گا۔''

بادشاہ نے پوچھا۔ ''پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟''

مصاحب نے جواب دیا۔ ''آپ اسی وقت ایک ایلچی شاہ عبدالعزیز کی خدمت میں روانہ فرما دیجیے۔ وہ شاہ صاحب کو میرے خواب کی تفصیل بتا کر نمازِ استسقا کے لیے انہیں طلب کر لے گا۔''

بادشاہ نے مصاحب کی اس تجویز پر عمل کیا۔ ایک شخص کو بلوا کر اسے اپنا ایلچی بنایا۔ واقعات اور خواب کی تفصیل لکھوا کر ایلچی کے حوالے کر دی اور کہا۔ ''شاہ صاحب کو بہر قیمت جامع مسجد کی سیڑھیوں تک لانا ہے۔''

جب شاہ عبدالعزیز کی خدمت میں بادشاہ کا ایلچی پہنچا اور آپ نے غایتِ طلبی جان لی تو اپنے مریدوں کے سامنے

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

اعلان کر دیا کہ میں کل صبح فجر کے بعد بادشاہ کے پاس جاؤں گا۔ جس جس کو میرے ساتھ چلنا ہو، اس وقت تک تیار ہو جائے۔

دوسرے دن فجر کی نماز کے بعد آپ نے اپنے ساتھ چھوٹے بھائی رفیع الدین کو لے لیا اور ان دونوں کے ساتھ ان کے مریدوں اور ارادت مندوں کا ہجوم چلا۔ بادشاہ کے حکم سے جامع مسجد کے سامنے انسانوں کا ایک سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ بادشاہ آپ سے پہلے ہی پہنچ چکا تھا اور وہ شاہ صاحب کی آمد کا منتظر تھا۔ بادشاہ نے آپ کی آمد کا اندازہ دور سے دیکھ کر ہی لگا لیا تھا۔ اپنے وزراء اور مصاحبین سے کہا۔ ''صاحبان! شاہ عبدالعزیز صاحب تشریف لے آئے ہیں۔'' حاضرین آپ کی طرف دوڑ پڑے مگر آپ نے صبر و تحمل سے کام لیا۔

بادشاہ مسجد کی سیڑھیوں پر کھڑا آپ کا انتظار کر رہا تھا۔ آپ نے بادشاہ کے احساسات کا اندازہ لگا لیا تھا چنانچہ آپ بھی مسجد کی سیڑھیاں طے کرتے ہوئے آگے بڑھے۔ ایک جگہ بادشاہ اور شاہ صاحب کا آمنا سامنا ہو گیا۔ جامع مسجد کی سیڑھیوں پر، اس طرح کہ اوپری زینوں پر بادشاہ اپنے مصاحبین کے ساتھ کھڑا تھا۔ دونوں کا آمنا سامنا ہوا تو بادشاہ نے ہاتھ بڑھا کر آپ سے مصافحہ کیا۔ بادشاہ نے بڑی عقیدت سے عرض کیا۔

''شاہ صاحب! میں نے آپ کو بڑی زحمت دی۔ خدارا اس کو محسوس نہ فرمایئے گا۔''

آپ نے فرمایا۔ ''اے شخص..... اے بادشاہ! میں یہاں اس لیے نہیں آیا ہوں کہ میں نے آپ کی دعوت اور طلبی کا احترام کیا ہے بلکہ میں یہاں اس لیے آیا ہوں کہ خلق خدا کے کام آؤں۔''

بادشاہ نے کہا۔ ''سبحان اللہ! بجا ارشاد فرمایا آپ نے۔'' پھر کچھ توقف کے بعد کہا۔ ''شاہ صاحب! آگے بڑھیے اور نماز پڑھایئے۔''

آپ نے فرمایا۔ ''مجھ کو زحمت نہ دیجیے۔''

بادشاہ نے کچھ سوچ کر کہا۔ ''شاہ صاحب! اگر آپ کسی وجہ سے نماز نہیں پڑھانا چاہتے تو پھر اپنے بھائی رفیع الدین کو حکم دیجیے کہ وہ آگے بڑھیں اور ان سب کو نماز پڑھائیں۔''

شاہ عبدالعزیز نے فرمایا۔ ''اس کی بھی کوئی ضرورت نہیں۔ جامع مسجد کا امام موجود ہے' آپ اس کو حکم دیجیے وہی نماز پڑھائے گا۔''

بادشاہ نے جامع مسجد کے امام کو حکم دیا کہ وہ نماز دوگانہ پڑھائے۔

امام جامع مسجد مستعد ہو کر کھڑا ہو گیا۔ بادشاہ جہاں کھڑا تھا وہیں کھڑا رہ گیا۔ شاہ صاحب نے موقع غنیمت دیکھا اور فوراً جگہ بدل دی اور ایک ایسی جگہ پہنچ کے دم لیا جہاں ایک شخص بھی ایسا نہیں تھا جو بادشاہ کے مقربین اور متوسطین میں سمجھا جاتا ہو۔

امام نے نماز دوگانہ پڑھائی اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھ گئے۔ بادشاہ کی نظریں شاہ صاحب کو تلاش کرنے لگیں۔ بادشاہ کا مصاحب سمجھ گیا کہ بادشاہ کسی کو بے چینی سے تلاش کر رہا ہے۔ اس نے بادشاہ کے پاس جا کر عرض کیا۔ ''کیا حضورِ والا شاہ صاحب کو تلاش فرما رہے ہیں؟''

بادشاہ نے جواب دیا۔ ''معلوم نہیں کیوں شاہ صاحب مجھ سے اجتناب و احتراز فرما رہے ہیں..... آخر کیوں؟ اس کی کوئی خاص وجہ؟''

مصاحب نے برا سا منہ بنایا۔ ''یہ ناچیز کوئی وجہ کیا بتائے گا لیکن میں خیال سے یہ بتا سکتا ہوں کہ ایسا کیوں ہے۔''

بادشاہ نے کہا۔ ''اچھا وجہ بیان کر۔''

مصاحب نے کہنا شروع کیا۔ ''حضورِ والا! شاہ صاحب اور ان کے اسلاف نے کبھی بھی کسی بادشاہ سے کوئی مدد نہیں لی۔ بس یہی تکبر اور غرور انسانوں کی بربادیوں کا سبب بن جاتا ہے۔''

بادشاہ نے مصاحب کو منع کیا کہ ایسی بات نہ کرو ورنہ اگر یہ بات برسرِ عام ہوئی تو نقصِ امن کا اندیشہ پیدا ہو جائے گا۔

بادشاہ نے اپنا ایک آدمی شاہ صاحب کی خدمت میں بھیجا کہ آ جایئے، میں آپ کا بے چینی سے انتظار کر رہا ہوں۔

بادشاہ کا آدمی آپ کے پاس پہنچا اور بادشاہ کا پیغام پہنچا دیا۔ آپ طوعاً و کرہاً بادشاہ کے پاس پہنچے اور کہا۔ ''بادشاہ سلامت کو فقیر کے قرب پر اصرار نہیں کرنا چاہیے کیونکہ شاہی اور فقیری یک جا نہیں رہ سکتیں۔''

بادشاہ نے کہا۔ ''شاہ صاحب قبلہ! لیکن میں یہ عجیب و غریب منظر دنیا کو دکھانا چاہتا ہوں۔ آپ میرے پاس ہی بیٹھیں۔''

آپ بہ جبر و اکراہ بادشاہ سے ایک بالشت دور بیٹھ گئے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

بادشاہ نے کہا۔ ''حضرت! کچھ ارشاد فرمائیں۔''
آپ نے توبہ کلمہ اور دعا پر گفتگو شروع کردی اور کچھ دیر بولنے کے بعد فرمایا۔ ''دہلی میں شاہ غلام علی نامی بزرگ کی ذات ایسی ہے کہ اگر کسی نے ان کو نہیں دیکھا اور ان کی باتیں نہیں سنیں تو گویا وہ بہت بڑی عظمت اور بزرگی کے قرب سے محروم رہا۔''
بادشاہ نے پوچھا۔ ''کیا یہاں شاہ غلام علی موجود ہیں؟''
آپ نے جواب دیا۔ ''ہاں، وہ موجود ہیں۔ اگر بادشاہ سلامت مناسب سمجھیں تو انہیں بھی یہیں بلوالیا جائے۔''
بادشاہ نے فوراً اجازت دے دی، کہا۔ ''حضرت! اس میں تکلیف کیوں؟ فوراً بلوائیے اور ملاقات کرائیے۔''
آپ نے ایک آدمی بھیج کر شاہ غلام علی کو بلوالیا۔ شاہ غلام علی نے آتے ہی ازراہِ احترام آپ کے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ بادشاہ ان کے احترام میں کھڑا ہوگیا۔ شاہ صاحب نے فرمایا۔ ''تو یہ ہیں شاہ غلام علی..... یہ جہاں موجود ہوں گے، شرف اور نیکی وہیں پر سایہ فگن ہوجائے گی۔''
بادشاہ، شاہ غلام علی سے باتیں کرنے لگا اور آپ خاموشی سے ہٹ گئے۔ کچھ دیر بعد جب بادشاہ کو آپ کی عدم موجودگی کا خیال آیا تو کسی سے پوچھا۔ ''یہ شاہ صاحب کہاں چلے گئے؟''
بادشاہ کو جواب ملا۔ ''شاہ صاحب بادشاہ کے قرب سے پریشان تھے چنانچہ بہ تدبیر شاہ غلام علی کو بادشاہ سے ملوا کے خود چلے گئے۔''
بادشاہ نے آپ سے کہلوایا کہ آپ ایک نقش لکھ کر شہر کے کسی دروازے پر چسپاں کرادیں۔ آپ نے مخلوق کی فلاح کی خاطر سولہ نقش تیار کیے اور شہر کے سولہ دروازوں پر چسپاں کرادیے۔
ان کارروائیوں کی برکت سے شہر میں بارش بھی ہوئی اور وبا بھی جاتی رہی۔

☆☆☆

بادشاہ اکبر شاہ ثانی کئی سال بعد پھر بارش نہ ہونے کی مصیبت کا شکار ہوگیا۔ پورا شہر پریشان تھا۔ اکبر شاہ ثانی نے آپ کے پاس پیغام بھیجا۔ ''قبلہ شاہ صاحب! میں عیدگاہ پہنچ رہا ہوں، براہِ کرم! خدا کی مخلوق کے لیے آپ بھی وہاں پہنچ جائیں اور نمازِ استسقا پڑھائیں۔''
آپ اسی وقت عیدگاہ روانہ ہوگئے۔ اس وقت آسمان ابر آلود تھا۔ کہیں کہیں بادلوں کے آوارہ ٹکڑے تیر رہے تھے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ نمازِ استسقا کے بعد یہی بادل برس پڑیں گے۔
جب آپ عیدگاہ پہنچے تو وہاں بادشاہ کے پاس ایک نواب کو بیٹھے دیکھا۔ یہ نواب اپنے عقیدے کی رو سے تصوف اور صوفی پر یقین نہیں رکھتے تھے اور ان نواب صاحب کو جب بھی کوئی موقع ملتا تھا، بزرگانِ دین اور تصوف کو برا بھلا کہنا شروع کردیتے تھے۔ شاہ صاحب نے ان نواب صاحب کو دیکھا تو طبیعت میں تکدر پیدا ہوگیا۔ نواب صاحب بھی شاہ صاحب کو دیکھ کر مسکرائے۔
شاہ صاحب نے نمازِ استسقا پڑھائی اور بارش کے لیے دعا مانگی۔
نواب صاحب نے آہستہ سے پوچھا۔ ''شاہ صاحب! بادل تو فضا میں پہلے ہی موجود ہیں، اگر بارش ہوگئی تو اس میں آپ کا یا آپ کی نمازِ استسقا کا کیا کمال ہوگا؟''
آپ نے جواب دیا۔ ''بات تو اعتقاد اور یقین کی ہے، رہ گئے بادل تو یہ جھوٹے ہیں، ان سے بارش نہیں ہوگی۔''
نواب صاحب نے حیرت سے پوچھا۔ ''شاہ صاحب! جھوٹے بادل کی اصطلاح بھی خوب گھڑی ہے آپ نے۔ اصل اور سچے بادل کب آئیں گے جن سے بارش ہوگی؟''
شاہ صاحب نے فرمایا۔ ''جب فضا ان جھوٹے بادلوں سے پاک ہوجائے گی۔''
نواب صاحب طنزیہ مسکرا رہے تھے۔ کہنے لگے۔ ''شاہ صاحب! آپ کی دکانداری بھی خوب ہے، کبھی میرا بس چلا تو میں آپ لوگوں کو درست کردوں گا۔''
شاہ صاحب نے جواب دیا۔ ''نواب صاحب! ایسی باتیں نہ کریں، اصلاح اور درستگی اللہ کے اختیار کی چیزیں ہیں۔ وہی تجھ کو بھی ٹھیک کرسکتا ہے اور اسی نے فرعون کو بھی ٹھیک کردیا تھا۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

شاہ عبدالعزیز محدث دھلوی

خوبصورت باتیں

☆ خلوص اور عزت بہت نایاب تحفے ہیں، اس لیے ہر کسی سے ان کی امید نہ رکھو کیونکہ بہت کم لوگ دل کے امیر ہوتے ہیں۔
☆ اگر دوست نہ ہوتے تو کبھی یقین ہی نہ ہوتا کہ اجنبی لوگ بھی اپنوں سے زیادہ پیار کر سکتے ہیں۔
☆ زندگی جینے کے دو بہترین انداز۔ بھول جاؤ انہیں جنہیں معاف نہیں کر سکتے اور معاف کر دو انہیں جنہیں بھلا نہیں سکتے۔
☆ کبھی بھی کسی کے چہرے کو مت دیکھو بلکہ اس کے دل کو دیکھو کیونکہ اگر سفید رنگ میں وفا ہوتی تو نمک زخموں کی دوا ہوتا۔
☆ ندامت کے آنسو زندگی میں چراغوں کا کام کرتے ہیں کیونکہ ان سے دل روشن ہو جاتا ہے۔

(مرسلہ: عبدالجبار رومی انصاری۔ چوہنگ سٹی لاہور)

قابل توجہ

☆ انسان اپنے دانتوں اور زبان سے اپنی قبر کھودتا ہے۔ (لقمان حکیم)
☆ انسانی ذہن کی مثال تالاب کی سی ہے اور آپ کے لفظ وہ پتھر ہیں جو اسے گدلا یا پاکیزہ کر سکتے ہیں۔ (ارسطو)
☆ کسی بھی اونچے پہاڑ پر چڑھنے کے لیے آہستہ آہستہ چلنا چاہیے۔ (شیکسپیئر)
☆ میں نے شجر علم کا میوہ توڑا ہے۔ جس پر لکھا ہے، کامیابی ان کے لیے ہے جو کوشش کرتے ہیں۔ (ڈومٹر اینلی)
☆ سب سے بڑا علم نیکی ہے اور سب سے بڑی جہالت بدی ہے۔ (سقراط)
☆ لالچی اور رقیبوں کو سکون نہیں مل سکتا۔ (رابعہ بصری)
☆ موت شکست سے بہتر ہے۔ (طارق بن زیاد)

(مرسلہ: ریاض بٹ۔ حسن ابدال)

نواب صاحب غصے سے دانت پیس کر رہ گئے۔

جب نمازِ استسقا کے بعد لوگ اپنے اپنے گھروں کو جا رہے تھے تو انہوں نے آسمان پر آوارہ بادلوں کا ایک ٹکڑا بھی نہیں دیکھا۔

آسمان بالکل صاف ہو چکا تھا۔ نواب صاحب اپنا گھوڑا دوڑاتے ہوئے شاہ صاحب کے پاس پہنچے اور طنزیہ سلام کے بعد پوچھا۔ ''حضرت! اگر اجازت دیں تو ایک بات پوچھوں؟''

آپ نے اجازت دے دی۔ ''بشوق..... کیا پوچھنا چاہتے ہو؟''

نواب صاحب نے کہا۔ ''شاہ صاحب! آپ عیدگاہ میدان ابرو بارش طلب کرنے کے لیے تشریف لے گئے تھے یا بادلوں کو دفع کرنے کے لیے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''نواب صاحب! اللہ کے بندوں کی دل آزاری سے باز آئیں۔ کیا میں نے اسی وقت یہ بات نہیں بتا دی تھی کہ آسمان پر موجود بادل جھوٹے ہیں اور بارش ان سے نہیں ہوگی بلکہ جب یہ دفع ہو جائیں گے تو ان کی جگہ دوسرے بادل آ جائیں گے اور ان سے بارش ہوگی۔''

نواب صاحب نے مسکرا کر کہا۔ ''میں کرسی ڈال کر بیٹھ جاتا ہوں اور آپ کے بتائے ہوئے سچے بادلوں کا انتظار کرتا ہوں۔''

آپ ناراض اور دل برداشتہ گھر واپس چلے آئے۔

بارش دوسرے دن بھی نہیں ہوئی مگر تیسرے دن واقعی گہرے سرمئی بادلوں نے آسمان کی نیلاہٹ پر پردہ ڈال دیا اور زور و شور سے بارش ہونے لگی۔

شاہ صاحب کو نواب صاحب کی زہریلی کٹیلی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ آپ بھیگتے ہوئے نواب صاحب کے گھر تشریف لے گئے۔ نواب کو اس کے ملازمین نے بتلایا کہ شاہ صاحب بھیگتے ہوئے تشریف لا رہے ہیں۔ اس نے کھڑکی میں سے جھانک کر شاہ صاحب کو آتے دیکھا اور گھر کے دروازے بند کر کے بیٹھ گیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

آپ نے اس کے در پر دستک دی اور کہا۔ ''نواب صاحب! دروازہ کھولیے۔ بخدا میں آپ کو شرمندہ کرنے نہیں آیا ہوں بلکہ میں یہ بتانے آیا ہوں کہ سچے بادل کیسے ہوتے ہیں۔''

نواب نے اندر سے جواب دیا۔ شاہ صاحب! میں بہت شرمندہ ہوں اور اس گھڑی کو برا بھلا کہہ رہا ہوں جب میں نے آپ کا مذاق اڑایا تھا۔''

شاہ صاحب نے مزید تسلی دی۔ ''نواب صاحب! میں نے کہہ جو دیا کہ میں آپ کو شرمندہ کرنے نہیں آیا ہوں، آپ دروازہ تو کھولیے۔''

نواب صاحب نے دروازہ کھول دیا۔ شاہ صاحب اندر داخل ہوئے تو نواب صاحب، شاہ صاحب سے بغلگیر ہو گئے، کہا۔ ''شاہ صاحب! فی الواقعی خراب بادل چلے گئے اور اچھے بادل آئے اور برس گئے۔ میں اپنی جگہ بے حد پشیمان ہوں۔''

☆☆☆

آپ بچپن میں جس مغلانی لاڈلی بیگم سے فارسی قصے سنا کرتے تھے، اس کے بارے میں اچانک اطلاع ملی کہ وہ قطب صاحب کی زیارت کو گئی تھی کہ بے ہوش ہو کر گر گئی اور اس کا دم نکل گیا۔ آپ اس کو دیکھنے اس کے گھر چلے گئے۔ اس وقت لاڈلی خانم کے عزیز و اقارب رو دھو رہے تھے اور کچھ تجہیز و تکفین میں مشغول تھے۔ گھر والوں کو آپ کی تشریف آوری کا جیسے ہی علم ہوا، آپ کو چاروں طرف سے گھیر کر رونا شروع کر دیا۔ آپ نے پوچھا۔ ''لاڈلی خانم کی میت کہاں ہے؟''

مرحوم کے رشتے داروں نے آپ کو میت کے سامنے پہنچا دیا۔ اس وقت آپ کو کفنی پہنائی جا رہی تھی۔ آپ نے لاڈلی خانم کے چہرے پر نظریں جما دیں اور لوگوں سے پوچھا۔ ''کیا یہ واقعی مر چکی ہے؟''

انہیں جواب دیا گیا۔ ''کیا آپ کو اس کی موت کے بارے میں اب بھی کسی قسم کا شبہ ہے؟''

آپ نے فرمایا۔ ''اس کو ابھی دفن نہ کرنا، انتظار کرو۔ یہ ابھی زندہ ہے۔''

لوگوں کو آپ کی باتوں پر یقین نہیں آیا مگر آپ کی عظمت پر اعتقاد تھا۔ وہ لوگ رک گئے، کچھ دیر تک آپ لاڈلی خانم کو گھورتے رہے، آخر اس کی آنکھوں کو جنبش ہوئی اور پلکیں حرکت میں آ گئیں، پھر آنکھیں کھل گئیں۔ لاڈلی خانم نے اپنے آس پاس لوگوں کا ہجوم دیکھا تو گھبرا کر بیٹھ گئی اور حیرت سے پوچھا۔ ''لوگو! یہ کیا ہو رہا ہے؟ میں کہاں ہوں؟ تم سب کون ہو؟''

ایک شخص نے جواب دیا۔ ''لاڈلی خانم! تم مر چکی تھیں۔ یہ سارے لوگ تمہاری آخری رسوم ادا کرنے آئے تھے۔''

لاڈلی خانم نے گھبرا کر جواب دیا۔ ''لوگو! میں ابھی زندہ ہوں۔ میں مُردہ نہیں، زندہ ہوں۔''

لاڈلی خانم کی زندگی نے سبھی کو حیران اور پریشان کر دیا تھا۔ آپ اسی وقت یہ کہہ کر واپس چلے آئے۔ ''میں دو دن بعد لاڈلی خانم سے دوبارہ ملوں گا۔''

چنانچہ تین دن بعد آپ نے لاڈلی خانم کو اپنے گھر بلوایا۔ جب وہ آ گئی تو آپ نے اس سے پوچھا۔ ''ہاں لاڈلی خانم! اب بتاؤ یہ کیا معاملہ تھا؟''

لاڈلی خانم نے جواب دیا۔ ''شاہ صاحب! میں کیا عرض کروں، جب میں قطب صاحب کی زیارت کر رہی تھی تو مجھے اپنے پاؤں کے انگوٹھے میں سرسری سی معلوم ہوئی اور ایسا لگا، گویا میرا دم کھنچا جا رہا ہے۔ میرے جسم کی طاقت سلب ہونے لگی اور میں بے ہوش ہو گئی پھر میرے دوسرے حواس کام کرنے لگے اور میں نے دیکھا کہ میں ایک بزرگ کے سامنے پیش کر دی گئی ہوں۔ جو لوگ مجھے لے گئے تھے، میرے موجودہ حواس ان کی نشاندہی نہیں کر سکتے۔ میرا حافظہ جواب دے چکا ہے اور میں چشم تصور سے انہیں دیکھ تو رہی ہوں مگر اسے لفظوں میں نہیں بیان کر سکتی۔ میں نے سنا، بزرگ نے میرے لے جانے والوں سے پوچھا۔ ''یہ تم لوگ کس لاڈلی خانم کو لے آئے؟''

ان لوگوں نے جواب دیا۔ ''جس کو آپ نے طلب فرمایا تھا۔''

بزرگ نے ڈانٹ کر فرمایا۔ ''میں نے تو لاڈلی خانم بنت رمضان خان کو طلب کیا تھا، وہ سنہری مسجد کے قریب رہتی ہے۔''

''اس کے بعد مجھے رہا کر دیا گیا اور جب میں نے آنکھ کھولی تو میں نے آپ کو اپنے سامنے کھڑا دیکھا۔''

شاہ صاحب نے اسی وقت ایک مرید کو سنہری مسجد کی طرف یہ کہہ کر روانہ کر دیا کہ وہ وہاں یہ معلوم کر کے آئے کہ آج سے تین دن پہلے وہاں کسی لاڈلی خانم نامی عورت کا انتقال ہوا ہے۔

آپ کے مرید نے چند گھنٹوں بعد بتلایا کہ حضرت وہاں جا کر معلوم ہوا کہ تین دن پہلے ایک عورت لاڈلی خانم کا انتقال

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

شاہ عبدالعزیز محدث دھلوی

حاجت روائی اللہ سے طلب کرنی چاہیے

ایک مرد درویش انسانی آبادیوں سے دور جنگل میں جا کر گوشہ نشین ہوا۔ ایک روز اس ملک کے بادشاہ کا ادھر سے گزر ہوا۔ درویش نے بادشاہ کی طرف توجہ ہی نہ دی۔ بادشاہ بڑا حیران ہوا کہ لوگ اس کے رعب اور دبدبے سے مرعوب ہو جاتے ہیں۔ ایک یہ درویش ہے کہ جس نے مجھے نظر اٹھا کر دیکھا تک نہیں۔ بادشاہ نے غصے میں آ کر وزیر سے کہا۔

''یہ درویش اور گدڑی پوش تو جانوروں کے مانند ہوتے ہیں۔ نادان میں عقل ہوتی ہے نہ انسانیت۔ اس فقیر کو دیکھو اسے خبر ہی نہیں کہ یہاں سے اس ملک کا بادشاہ گزر رہا ہے۔''

وزیر اس درویش کے پاس آیا اور اس سے اس بے نیازی کی وجہ پوچھی اور یہ بھی کہا کہ وہ بادشاہ کو دیکھ کر آداب کیوں نہ بجالایا۔ درویش نے جواب دیا۔ ''اپنے بادشاہ سے جا کر کہو کہ وہ خدمت اور آداب بجالینے کی توقع اس سے کرے جس کو اس نے انعام واکرام سے نوازنا ہو۔ اسے یہ بھی بتا دینا کہ بادشاہ کے ذمے رعایا کی نگہبانی ہوتی ہے اور رعایا بادشاہ کی اطاعت گزاری کے لیے نہیں ہوتی۔ بھیڑیں چرواہے کے لیے نہیں ہوتیں بلکہ چرواہا بھیڑوں کی رکھوالی کے لیے ہوتا ہے۔''

وزیر واپس بادشاہ کی طرف جانے کے لیے مڑا ہی تھا کہ درویش نے پیچھے سے آواز دے کر کہا۔

''بادشاہ سے کہنا اس دنیا کی زندگی مختصر ہے، صرف چند روزہ۔ تو دیکھ لے گا کہ ظالم کی کھوپڑی کے بھیجے کو مٹی کھا جاتی ہے۔ تقدیر ایسا وار کرتی ہے کہ بادشاہی اور غلامی کی تمیز مٹ جاتی ہے۔ قبر کے اندر مالدار اور فقیر میں سب فرق مٹ جاتا ہے۔''

بادشاہ نے اس درویش کی باتیں وزیر کی زبانی سنیں تو تعجب کے ساتھ ساتھ اسے خوشی بھی ہوئی اور یہ باتیں اسے اچھی لگیں۔ وہ خود درویش کے پاس گیا اور بولا۔ ''اے مرد درویش! مانگ کیا مانگتا ہے۔''

درویش نے بڑی بے نیازی سے کہا۔ ''میں آپ سے صرف اور صرف یہ مانگنا چاہوں گا کہ آپ دوبارہ میرے پاس آنے کی زحمت نہ کریں۔''

بادشاہ لاجواب ہو گیا تو درویش سے درخواست کی۔ ''اے مرد بزرگ! مجھے کوئی نصیحت کر۔''

فقیر بولا۔ ''اے بادشاہ! اس وقت تیرے ہاتھ میں اللہ کی نعمتیں ہیں، ان سے فائدہ اٹھا لے۔ یہ مال و دولت اور اقتدار دائمی نہیں ہوتے، یہ ہاتھ بدلتے رہتے ہیں۔''

مرسلہ: ایشا ہدایت، ملتان (ممتاز آباد)

ہو چکا ہے۔

آپ نے لاڈلی خانم سے پوچھا۔ ''وہ بزرگ جنہوں نے تجھ کو واپس بھیجا ہے، ان کی شکل صورت کیسی تھی؟''

لاڈلی خانم نے عرض کیا۔ ''شاہ صاحب! کیا عرض کروں، میرا حافظہ کام ہی نہیں کر رہا۔''

آپ نے لاڈلی خانم سے پوچھا۔ ''اچھا پھر ان لوگوں کا حلیہ بتا جو تجھ کو اس دنیا سے لے گئے تھے؟''

لاڈلی خانم نے جواب دیا۔ ''شاہ صاحب! جیسا کہ میں عرض کر رہی ہوں، میرا حافظہ کام نہیں کر رہا۔''

آپ نے پوچھا۔ ''اچھا ان کی آوازیں کیسی تھیں اور وہ کس زبان میں باتیں کر رہے تھے؟''

لاڈلی خانم نے جواب دیا۔ ''میں نے کہہ جو دیا کہ میرا حافظہ بالکل کام نہیں کر رہا۔''

آپ نے لاڈلی خانم کو کھانا کھلایا۔ کھانے میں گوشت تھا۔ ترکاریاں تھیں، حلوا تھا اور چٹنی تھی۔

لاڈلی خانم نے سب کچھ کھایا اور آخر میں منہ بنا کر بولی۔ ''شاہ صاحب! کھانے میں مزہ نہیں آیا، عجیب سیٹھا سیٹھا کھانا ہے۔''

اس کے بعد اس نے کھٹائی کھائی اور خوب کھائی، بولی۔ ''شاہ صاحب! یہ چیزوں کو ہو کیا گیا ہے کہ کسی چیز میں اس کی اصل لذت باقی ہی نہیں رہی۔''

شاہ صاحب کے ایک مرید نے کھٹائی کو چکھا تو اس میں زبردست ترشی موجود تھی، بولا۔ ''بی بی! اس میں تو بلا کی ترشی پائی جاتی ہے۔''

شاہ صاحب نے مرید کا ہاتھ دبا کر خاموش کر دیا۔

لاڈلی خانم سے کسی مرید نے کہا۔ ''خانم! کوئی قصہ سنائیے۔''

لاڈلی خانم نے ذہن پر بڑا زور دیا، مگر کچھ یاد نہ آیا۔ بولیں۔ ''کون سی داستان؟ کون سا قصہ؟''

مرید نے جواب دیا۔ ''وہ جو آپ سنایا کرتی تھیں۔''

لاڈلی خانم نے ایک بار پھر حافظے پر زور دیا۔ ''میں سنایا کرتی تھی؟ کب سنایا کرتی تھی؟ مجھے تو کچھ یاد نہیں پڑتا۔''

مرید نے کہا۔ ''بی بی! آپ کے حافظے کو یہ کیا ہو گیا ہے؟''

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

شاہ صاحب نے ایک بار پھر مرید کا ہاتھ دبایا اور آہستہ سے کہا۔ ''اس کو کسی بات پر مجبور نہ کرو۔''

لاڈلی خانم کے انداز واطوار یہ بتاتے تھے کہ وہ شاہ صاحب کے پاس ہی رہے گی۔ آخر شاہ صاحب نے پوچھا۔

''لاڈلی خانم! کیا تم اپنے گھر نہیں جاؤ گی؟''

لاڈلی خانم نے حیرت سے شاہ صاحب کی طرف دیکھا۔ ''اپنے گھر؟ میرا گھر کہاں ہے؟ کون سا میرا گھر؟''

شاہ صاحب نے جواب دیا۔ ''سنہری مسجد کے پاس۔''

لاڈلی خانم نے بدستور حیرت سے کہا۔ ''سنہری مسجد؟ یہ کہاں ہے؟''

شاہ صاحب نے کہا۔ ''لاڈلی خانم! تمہیں یاد نہیں آرہا' ورنہ تمہارا بھی ایک گھر ہے۔''

لاڈلی خانم نے بے بسی سے جواب دیا۔ ''شاہ صاحب! اگر میرا کوئی گھر ہے تو مجھے وہاں بھجوا دیں' میں وہاں چلی جاؤں گی۔''

ایک مرید لاڈلی خانم کی پشت پر بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ لاڈلی خانم نے اس کی طرف دیکھے بغیر ہی کہا۔ ''اے شخص! تجھ کو ہنسی کیوں آرہی ہے..... تو مجھ پر کیوں ہنس رہا ہے آخر؟''

شاہ صاحب نے ایک مرید کو آواز دی اور اس کو حکم دیا۔ ''لاڈلی خانم کو اس کے گھر پہنچا دو۔''

وہ مرید لاڈلی خانم کو اپنے ساتھ لے کر چل دیا۔ لاڈلی خانم کے چلنے کا انداز بھی ذرا مختلف تھا۔ وہ اس طرح چل رہی تھی گویا نابینا ہو مگر ٹکرائے ٹھوکر کھائے بغیر وہ چل رہی تھی۔

جب وہ چلی گئی تو شاہ صاحب نے اپنے مریدوں سے کہا۔ ''لاڈلی خانم واقعی مر چکی ہے اور اس کے حواسِ خمسہ اب کام نہیں کر رہے ہیں۔ ہاں' ایسا لگتا ہے کہ ان حواس کی جگہ کوئی اور حس کام کر رہی ہے جس کی مدد سے وہ اپنی پشت کو بھی دیکھ سکتی ہے۔''

لاڈلی خانم تین سال زندہ رہ کر چل بسی۔

کسی مرید نے پوچھا۔ ''شاہ صاحب! کیا مرنے کے بعد روح کا تعلق جسم سے باقی رہتا ہے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''ہاں، یہ تعلق کچھ عرصے باقی رہتا ہے، تقریباً کچھ سال تک۔ اس کے بعد کم ہو جاتا ہے مگر اولیائے کرام اس سے مستثنیٰ ہیں۔''

ایک مرید نے پوچھا۔ ''کیا مرحوم لوگوں کی ارواح اپنے اعزہ کے پاس آتی ہیں؟''

آپ نے فرمایا۔ ''ہاں آتی ہیں اور خصوصاً نزع کے وقت، کیونکہ مرنے والا ایک مسافر کی طرح اپنی زندگی گزار کر جب اپنے وطن واپس جا رہا ہوتا ہے تو اس کے مرحوم اعزہ کی روحیں اس کے استقبال کے لیے حاضر ہو جاتی ہیں۔''

کسی مرید نے عرض کیا۔ ''لیکن شاہ صاحب! جب ہمارے ایک چچا کا انتقال ہوا تو عالمِ نزع میں وہ جن مرحوم اعزہ کا ذکر کر رہے تھے، ان میں چچا کے والد کا نام نہیں تھا۔ گویا چچا کے والد کی روح، یعنی دادا کی روح ان کے پاس نہیں آئی تھی۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''وہ روحیں جو اس مادی اور فانی دنیا سے متقرض گئی ہیں، انہیں ان کی قرض خواہ روحیں پکڑ لیتی ہیں اور کہیں آنے جانے کی اجازت نہیں دیتیں۔ بس یہ روحیں حاضری دینے سے معذور ہو جاتی ہیں۔''

اس دن لوگوں کو شاید پہلی بار اس بات کا اندازہ ہوا کہ قرض لے کر مرجانا کتنا برا ہے۔ سبھی دیر تک توبہ و استغفار کرتے رہے۔

☆☆☆

آپ دارالعلوم کے صدر مدرس تھے مگر وہاں سے لیتے کچھ بھی نہ تھے۔ آپ کے معاشی حالات ناگفتہ بہ تھے۔ گھر میں پرانے وقتوں سے ایک ملازمہ چلی آرہی تھی۔ ایک بار کئی وقتوں کے فاقوں کے بعد ملازمہ سے بچوں کی حالت نہیں دیکھی گئی... اور اس نے گھر کا حال ایک متمول مرید سے بیان کر دیا۔ اس مرید نے مال و دولت سے آپ کی مدد کرنا چاہی۔ آپ نے فرمایا۔ ''مجھے اس مال و دولت کی حاجت نہیں ہے۔''

مرید نے کہا۔ ''یہ آپ کس طرح کہہ رہے ہیں جبکہ مجھ کو معلوم ہے کہ آپ کے بچوں نے کئی وقتوں سے کچھ بھی نہیں کھایا۔''

آپ نے فرمایا۔ ''یہ تم کس طرح کہہ سکتے ہو؟ یہ بات تمہیں کس نے بتائی؟''

مرید نے جواب دیا۔ ''بس مجھے معلوم ہو گئی کسی طرح۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

آپ نے اصرار کیا۔ ''جب تم نے اتنی بڑی بات کہی ہے تو تمہیں اس شخص کا نام ضرور بتانا پڑے گا جس نے میرے بچوں کے فاقوں کی خبر تمہیں دی ہے۔''

مرید نے جواب دیا۔ ''افسوس کہ میں اس کا نام نہیں بتا سکتا۔''

آپ نے فرمایا۔ ''پھر میں تمہاری مدد بھی نہیں قبول کر سکتا۔''

مرید نے کہا۔ ''اگر میں اس کا نام بتا دوں تو کیا آپ میرا عطیہ قبول فرمالیں گے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''میں تمہارے عطیے پر غور کروں گا۔ قبول کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ اس وقت نہیں کر سکتا۔''

مرید نے عرض کیا۔ ''مجھ کو فاقوں والی بات آپ کی ملازمہ نے بتائی ہے۔''

آپ اسی وقت اندر تشریف لے گئے اور ملازمہ کو بلا کر پوچھا۔ ''میرے مرید سے تو نے یہ کہا تھا کہ میرے بچوں نے کئی وقتوں سے کچھ کھایا نہیں؟''

ملازمہ انکار نہ کر سکی۔ جواب دیا۔ ''میاں جی! مجھ سے بچوں کی حالت زار دیکھی نہیں گئی۔''

آپ نے فرمایا۔ ''اب تو اس گھر سے جا سکتی ہے، افسوس کہ میں تجھ کو نہیں رکھوں گا۔''

ملازمہ نے پوچھا۔ ''لیکن میرا قصور؟ میری خطا؟''

آپ نے فرمایا۔ ''تیرا قصور یہ ہے کہ تو نے ہمارے گھر کا راز افشا کر دیا۔''

آپ نے اس ملازمہ کو معاف نہیں کیا اور اپنے گھر سے علیحدہ کر دیا۔

آپ نے جن محاذوں پر اپنی جنگ جاری کر رکھی تھی، وہ آپ کے لیے بلائے جان بن گئی۔ یہ جنگ آپ کو اپنے والد شاہ ولی اللہ کی طرف سے ورثے میں ملی تھی۔ آپ نے اپنے مریدوں اور مسلمانوں کو حکم دیا۔

''خدا پرستی اختیار کرو۔ خوف خدا اور پاکبازی کا سچا جذبہ پیدا کرو۔

ملوکیت اور شاہ پرستی کے جراثیم کو اپنے دماغوں سے نکال پھینکو۔

جذبہ فدائیت پیدا کرو یعنی اپنے نصب العین کے لیے قربان ہو جانے کا شوق پیدا کرو۔

نوع انسان کی ہمدردی، غم خواری کرو، خود تکلیف اٹھا کر دوسروں کو آرام پہنچاؤ۔

شاہانہ تکلفات ختم کر دو اور سادہ زندگی کے عادی بنو۔

فوجی جذبہ پیدا کرو۔ جفاکشی، محنت اور ہر قسم کے حالات برداشت کرنے کے عادی بنو۔

تم ایسی رسومات کو ترک کر دو جو معاشرے کو پستی کی طرف لے جا رہی ہوں۔

عیاشی کے اڈے ختم کر دو اور ایسے تمام جراثیم کی اصلاح کرو جو معاشرے کو عیش پرست، آرام طلب اور پست ہمت بنا رہے ہوں۔''

آپ معاشی میدان میں اپنے والد کی مشہور زمانہ انقلابی تصنیف حجۃ اللہ البالغہ کے حوالے سے عام اور خاص لوگوں کو بتا رہے تھے۔

۱۔ دولت کی اصل بنیاد محنت ہے۔ مزدور اور کاشت کار قوت کا سبب ہیں، توافق للبقا (باہمی تعاون) مدنیت (شہریت) کی روح رواں ہے، جب تک کوئی شخص ملک اور قوم کے لیے کام نہ کرے، ملک کی دولت میں اس کا کوئی حصہ نہیں۔

۲۔ جوا، سٹے اور عیاشی کے اڈے ختم کیے جائیں کیونکہ ان کی موجودگی میں تقسیم دولت کا صحیح نظام قائم نہیں ہو سکتا۔

۳۔ مزدور، کاشت کار اور وہ لوگ جو ملک اور قوم کے لیے دماغی کام کریں، دولت کے اصل مستحق ہیں۔ جو نظام ان قوتوں کو دبائے، وہ ملک اور قوم کے لیے خطرناک ہے۔ اس کو ختم ہو جانا چاہیے۔

۴۔ جو سماج محنت کی صحیح قیمت ادا نہ کرے، مزدوروں اور کاشت کاروں پر بھاری ٹیکس لگائے، قوم کا دشمن ہے۔ اس کو ختم ہو جانا چاہیے۔

۵۔ ضرورت مند مزدور کی رضامندی قابل اعتبار نہیں جب تک اس کی محنت کی وہ قیمت ادا نہ کی جائے جو امداد باہمی کے اصول پر لازم آتی ہے۔

۶۔ کام کے اوقات محدود کیے جائیں۔ مزدوروں کو اتنا وقت ضرور ملنا چاہیے کہ وہ اخلاقی اور روحانی اصلاح کر سکیں۔

۷۔ وہ کاروبار جو دولت کی گردش کو کسی خاص طبقے میں منحصر کر دے، ملک کے لیے تباہ کن ہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

۸۔ وہ شاہانہ نظامِ زندگی جس میں چند اشخاص یا چند خاندانوں کی عیش و عشرت کے سبب سے دولت کی صحیح تقسیم میں خلل واقع ہو اس کا مستحق ہے کہ اسے جلد از جلد ختم کر کے عوام کی مصیبت ختم کی جائے اور انہیں مساویانہ نظامِ زندگی کا موقع دیا جائے۔

آپ یہ ساری باتیں تحریر اور تقریر کے ذریعے عوام اور خواص تک پہنچا رہے تھے۔ امراء اور ذمے دار کار پردازانِ حکومت نے آپ کو متنبہ کیا کہ اگر تم ان سے باز نہ آئے تو تمہیں شہر بدر کر دیا جائے گا۔

آپ نے انہیں جواب دیا۔ ''میں اپنی کوششوں سے ہرگز باز نہ آؤں گا اور اس سلسلے میں ہر صعوبت برداشت کرنے کو تیار ہوں۔''

چنانچہ آپ کو جلاوطن کر دیا گیا اور حکم ملا کہ جونپور چلے جاؤ۔

اس حکم کے بعد آپ نے دہلی کو چھوڑ دیا۔ سواری کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے تھے کہ انہیں دوسرا حکم ملا کہ انہیں اپنے بھائی رفیع الدین کے ساتھ یہ سفر پیدل کرنا ہے۔ چنانچہ آپ نے اپنے بھائی کے ساتھ یہ سفر پیدل ہی طے کیا۔ اس دشوار اور المناک سفر نے آپ کو بینائی سے محروم کر دیا۔

آپ کی عدم موجودگی میں آپ کا مکان ضبط کر لیا گیا۔

ایک عرصے بعد آپ کو دوبارہ دہلی بلا لیا گیا۔ یہ وہ دور تھا جب دہلی کا تاج و تخت تو مغل فرمانروا ... کے قبضے میں تھا مگر اقتدار اور حکومت انگریزوں کے ہاتھ میں تھی۔ ریذیڈنٹ جو چاہتا تھا ہو جاتا تھا۔ بادشاہ کا چاہا مشکلوں سے ہوتا تھا۔

ان حالات میں شاہ عبدالعزیز کا روحانی اور مادی دنیاؤں میں جنگ و جہاد کرنا بہت ہی دشوار کام تھا۔

جن دنوں آپ دہلی واپس آ چکے تھے، آپ کو بعض عجیب و غریب واقعات کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک شب ایک شخص حواس باختہ، مضطرب و بے قرار آپ کے پاس آیا۔ اس وقت بھی آپ کے آس پاس مرید موجود تھے۔ یہ شخص چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔ کچھ دیر بعد آپ نے اس سے پوچھا۔ ''ہاں بھائی! تیرا کیا کام آ پڑا ہے مجھ سے؟''

وہ شخص روہانسا ہو رہا تھا۔ بولا۔ ''میں آپ سے تخلیہ میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ براہِ کرم یا تو تخلیہ فرما دیں یا پھر کچھ دیر کے لیے ہم دونوں یہاں سے ہٹ چلیں۔ جیسا مزاجِ عالی میں ہو، مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں، اس کو بھی نہایت غور سے سماعت فرما لیں۔''

آپ اس شخص کو تخلیہ میں لے گئے اور فرمایا۔ ''ہاں، اب سب کچھ سچ سچ بتا دے مجھے۔''

اس شخص نے کہنا شروع کیا۔ ''حضرت! میں ایک شادی شدہ شخص ہوں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو بے حد چاہتے تھے اور رشک اور حسد کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔ کل رات وہ بیت الخلاء جانے کے لیے اٹھی اور مجھ سے کہا...... میں پیشاب کی حاجت محسوس کر رہی ہوں۔ اگر آپ میرے ساتھ چلیں تو نوازش، شکریہ۔ چنانچہ میں اس کو بیت الخلاء لے گیا۔ وہ اندر چلی گئی اور میں باہر کھڑے ہو کر اس کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ کافی دیر کی مایوسی کے بعد میں نے اپنی بیوی کو آواز دی کہ میں تیرا کہاں تک انتظار کروں، تو آ کیوں نہیں جاتی۔

''دوسری طرف سے جواب ندارد رہا۔ میں نے ایک بار پھر آواز دی کہ نیک بخت! آخر بات کیا ہے؟ اس کے بعد میں ہمت کر کے اندر چلا گیا اور یہ دیکھ کر حیران اور حواس باختہ ہو گیا کہ اندر کوئی بھی نہیں تھا۔ میری بیوی کا کہیں کوئی پتا نہ تھا۔

''میں نے باہر نکل کر جس سے بھی اپنا حال بیان کیا، اس نے میرا مذاق اڑایا۔ آخر میں آپ کے پاس آ گیا۔ آپ میری مدد فرمائیں۔''

آپ نے فرمایا۔ ''میں کل رات تیرا کام کر دوں گا، تو اگر صبر کر سکے تو کر۔ صرف آج کی رات۔ اللہ نے چاہا تو میں کل رات تیرا کام کر دوں گا۔''

جاری ہے

ماخذات

علمائے ہند کا شاندار ماضی۔ مولانا سید محمد میاں... ملفوظاتِ شاہ عبدالعزیز۔ مترجمین: مولوی محمد علی لطفی، مولوی انتظام اللہ شہابی... انفاس العارفین۔ شاہ ولی اللہ دہلوی ...تذکرہ علمائے ہند۔ مولوی رحمٰن علی... رودِ کوثر۔ شیخ محمد اکرم

WWW.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

مقصدِ حیات

ایم اے راحت

اللہ تعالیٰ نے وقت کی بہترین شکل انسان میں ڈھال دی ہے۔ وقت کا آغاز ہو یا اختتام... وقت کی خوبصورتی ہو یا بدصورتی... حتیٰ کہ وقت کی گردش ہو یا وقت کا انجام... یہ سب انسان کے حالات و واقعات سے ہی ظاہر ہوتا ہے۔ زیرِ نظر کہانی میں وہ جو خود کو قانون کے رکھوالے کہتے تھے مگر درحقیقت قانون کو ہاتھوں میں رکھنے والے بہت طاقتور اور عقلِ کل سمجھتے تھے... اس کہانی کے مصنف ایم اے راحت جنہوں نے ایک عرصے تک اپنے قلم کے ذریعے ادارہ جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشن سے رابطہ برقرار رکھا بالآخر وقت کے اختتام پر رختِ سفر باندھ بیٹھے... لہٰذا ثابت ہوا کہ مقصد بھی جب تک ساتھ دیتا ہے جب تک حیات باقی رہتی ہے... تاہم فکشن میں ان کا منفرد اسلوب تھا۔

اپنی تحریروں میں ہمیشہ زندہ رہنے والے مصنف کی یادگار تحریر

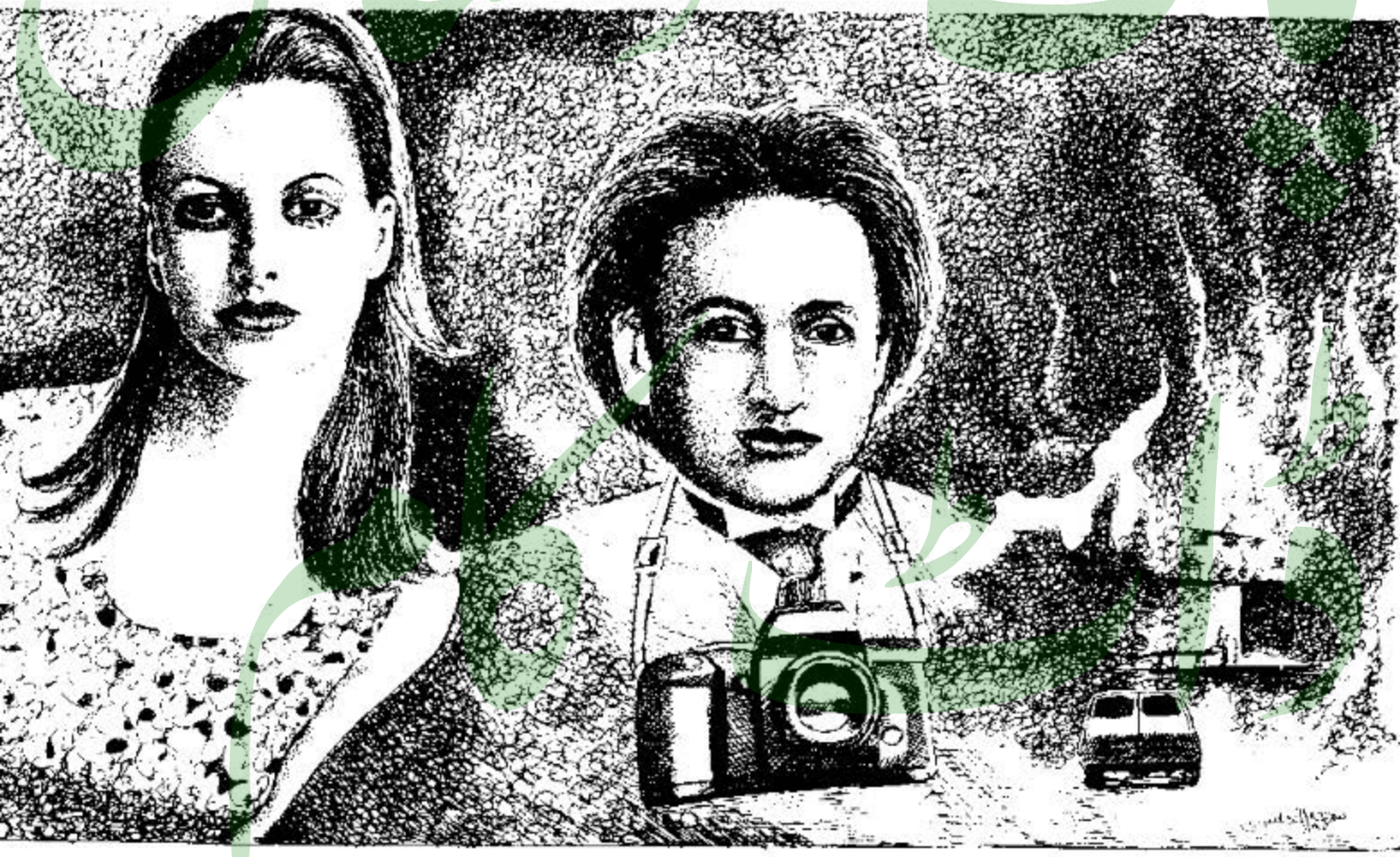

دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے تھے۔

''پچھلے دو انٹرویوز میں تو آپ سے ملاقات نہیں ہوئی تھی، خدانخواستہ طبیعت تو ناساز نہیں تھی؟''

''یہ بات نہیں ہے۔ میں نے تین ماہ کی چھٹی لی ہوئی تھی۔ تین ماہ قبل پندرہ انٹرویو دیے اس کے بعد گھر کا فالتو فرنیچر بیچ دیا اور پنڈی چلا گیا۔ وہاں سے پشاور، سوات، مری اور ہنزہ۔ پیسے ختم ہو گئے تو واپس آ گیا..... لیکن پھر بھی آرام کرتا رہا کیونکہ کچھ پیسے بچ گئے تھے۔ اب نئی سہ ماہی کا

WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

Downloaded From Paksociety.com

آغاز ہے۔''

''اب کیا ارادہ ہے؟'' شاہ میر نے پوچھا۔

''وہی تین ماہ۔ اس کے بعد بائک بیچ دوں گا، پاسپورٹ بنوالیا ہے اس بار سری لنکا جانے کا ارادہ ہے۔''

''سری لنکا ہی کیوں؟''

''بچپن سے ذہن پر سوار ہے، غالباً اس خطے سے میرا کوئی روحانی رشتہ ہے۔''

دونوں بلڈنگ سے نکل آئے۔ انٹرویو ہو چکا تھا، وہی گھسے پٹے سوالات۔ وہی آخری جملہ۔ بہتر ہے، آپ کو بذریعہ ڈاک اطلاع دے دی جائے گی۔

''چائے کہاں پی جائے؟'' منصور نے پوچھا۔

''گلزار ٹی ہاؤس میں مگر پیسے تو ہیں نا؟'' شاہ میر نے بے دھڑک پوچھا۔

''ہاں..... کیا تمہارے پاس نہیں ہیں؟''

''نہیں کل شام کو جوتے میں نیا سول لگوالیا تھا۔ باقی واپسی کے لیے کرائے کے پیسے بچالیے ہیں۔ اصل میں اب بس کنڈیکٹر بھی سمجھدار ہوگئے ہیں، کالج کارڈ پیش کرو تو بحث کرتے ہیں کہ صاحب آپ اسٹوڈنٹ تو نہیں لگتے چنانچہ یہ آسانی ختم ہوگئی ہے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ تم مسلسل انٹرویو دے رہے ہو۔'' بائک ایک مناسب جگہ پر کھڑی کرکے دونوں ٹی ہاؤس میں آبیٹھے اور ویٹر کو چائے لانے کو کہا۔ منصور نے پوچھا۔ ''انٹرویو کیسا رہا؟''

شاہ میر نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''بہت اچھا، ویسے آج میں نے اس نیلے سوٹ والے بندر کو بہت پریشان کیا۔ بڑا لطف آیا۔ بے تکے سوالات پوچھ رہا تھا۔''

''تم کہاں رہتے ہو؟'' منصور کے پوچھنے پر شاہ میر نے اپنی رہائش کا پتا دہرادیا اور پھر بولا۔

اس دن کے بعد سے دونوں دوست بن گئے۔ دونوں کے حالات یکساں تھے۔ شاہ میر اپنی ماں کے ساتھ تین کمروں کے ایک گھر میں رہتا تھا جن میں سے اوپر کے دو کمرے کرائے پر دیے ہوئے تھے۔ اس کرائے سے شاہ میر کی تعلیم کا خرچہ برداشت کیا جارہا تھا۔ پتا نہیں رضیہ سلطانہ پر شاہ میر کو تعلیم دلانے کا جنون کیوں سوار تھا۔ شوہر کے انتقال کے بعد دونوں بالکل تنہا رہتے تھے۔ شوہر نے نہ جانے کس طرح یہ تین کمروں کا گھر خریدا تھا اور یہی ان کی کل کائنات تھی۔ پھر بی اے کے بعد اس نے نوکری کی تلاش شروع کردی۔ کوئی آمدنی نہ ہو تو گھر کے حالات کیا بہتری اختیار کرسکتے ہیں۔ تعلیم معمولی چیز نہیں ہوتی اور پھر اس کے اپنے اخراجات بھی ہوتے ہیں۔

رضیہ سلطانہ سلائی کا جو کام کرتی تھیں، اس سے اخراجات پورے نہیں ہوتے تھے۔ مجبوراً ایک ایک کرکے اوپر کے دونوں کمرے کرائے پر اٹھانا پڑے تھے۔ ماں بیٹے کے لیے نیچے موجود بڑا کمرا ہی کافی تھا۔ رضیہ سلطانہ کا خیال تھا کہ شاہ میر ملازم ہوجائے گا تو سارے دلدّر دور ہوجائیں گے۔ اب تو سال سوا سال ہو چکا تھا نوکری تھی کہ ملنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔

دوسری طرف منصور کی حالت بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ اس کے ماں باپ نہیں تھے۔ مرتے وقت کچھ روپیہ بینک میں چھوڑ گئے تھے۔ ایک بائک تھی جو باپ نے اپنے لیے خریدی تھی، البتہ پاکستان کوارٹر میں ان کے ایک دوست کا کوارٹر تھا جو اس نے مستقل طور پر ان لوگوں کو دے رکھا تھا اور اب بھی وہ گھر منصور ہی کے قبضے میں تھا مگر وہ تنہا رہتا تھا۔ اس نے بھی گریجویشن کرکے نوکری کی تلاش شروع کر رکھی تھی۔ دفتروں میں انٹرویوز دینے کے سلسلے میں دونوں کی ملاقات اسی طرح ہوئی اور وہ دونوں ایک دوسرے کے اچھے دوست بن گئے۔ منصور اتوار کے روز شاہ میر کے گھر پہنچ گیا اور رضیہ سلطانہ اسے دیکھتے ہی پہچان گئیں۔ منصور نے اپنا نام ہی دہرایا تھا۔

''آجاؤ منصور بیٹے..... شاہ میر مجھے تمہارے بارے میں سب کچھ بتا چکا ہے۔'' دوپہر کو دال بھری روٹیاں پودینے کی چٹنی کے ساتھ کھائیں تو منصور کا منہ تعریفیں کرتے نہ تھکا۔ اس نے کہا کہ نہ جانے کتنے عرصے بعد اسے ماں کے ہاتھوں کی خوشبو محسوس ہوئی ہے۔ ان کے درمیان بے روزگاری کا رشتہ قائم ہوگیا اور دونوں کی دوستی خاصی مستحکم ہوتی چلی گئی۔ اب اگر کبھی انٹرویو دینا ہوتا تو منصور، شاہ میر کو اپنی موٹر سائیکل پر بٹھا کر لے جاتا تھا۔ یہ معاملہ چلتا رہا۔ ایک دن منصور، شاہ میر کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔

''تمہاری سہ ماہی پوری ہونے والی ہے، اس کے بعد کیا ارادہ ہے؟''

''اب ان میں تبدیلیاں کرنی پڑیں گی۔ شاہ میر! پہلے تو جیسا کہ میں نے تمہیں بتایا ہے، یہی سوچا تھا کہ موٹر سائیکل بیچوں گا اور سری لنکا چلا جاؤں گا۔ جتنے دن گزر سکے گزاردوں گا اس کے بعد پھر واپسی ہوگی مگر اب تمہیں اکیلا چھوڑ کر نہیں جاسکتا۔''

''تو تمہیں جانے کون دے گا۔ خیر چھوڑو آج کا اخبار دیکھ لیا؟ ملازمتوں کے بے شمار اشتہارات ہیں۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

''یار! ان دنوں میں ملازمتوں کے اشتہار نہیں دیکھ رہا بلکہ اخبار کے فرنٹ پیج پر غور کر رہا ہوں۔''
''کیا مطلب؟''
''تم شاید اشتہارات کے علاوہ کچھ نہیں پڑھتے۔''
''پڑھتا ہوں لیکن اخبارات میں اور ہوتا ہی کیا ہے، صرف سیاسی خبریں......''
منصور ٹھنڈی سانس لے کر پُرخیال انداز میں گردن ہلانے لگا۔ پھر سرگوشی کے انداز میں بولا۔
''ایک بات بتاؤں شاہ میر..... کیا ہم نئی نسل کے نمائندے نہیں ہیں؟''
''اس بات سے تمہارا کیا مطلب ہے؟''
''کیا ہمارے ہاتھ پاؤں بے جان ہیں؟ ہم لوگ مضبوط قوتِ بازو نہیں رکھتے؟''
''یار! جو کچھ کہنا ہے صاف الفاظ میں کہو۔''
''بڑے اطمینان سے لوگ بینکوں میں گھس جاتے ہیں، گن مین سے بندوق چھین لیتے ہیں، وہاں موجود تمام لوگوں کے ہاتھ بلند کر دیتے ہیں اور کیشیئر جو پہلے سے رقم تیار کیے ہوئے بیٹھا ہوتا ہے خاموشی سے ان کا قرض انہیں واپس کر دیتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ بینک کے اندر موجود کسٹمرز بھی قرض ادا کرنے پر مجبور ہوتے ہیں کیونکہ بہر حال انہیں بھی زندہ رہنا ہے۔ میں کبھی کبھی یہ سوچتا ہوں کہ ہمارا بھی تو اس دنیا پر بہت قرض ہے۔''
''تت..... تو..... تمہارا مطلب ہے کہ.....''
''بالکل صحیح سمجھے ہو تم..... بالکل صحیح۔ بھئی دیکھونا، کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ملک میں بہت سی چیزوں کی کمی ہے۔ نہ تو یہاں آرٹس اسکول ہیں، نہ ہی جرم سکھانے کے انسٹی ٹیوٹ، آدمی اگر تجربہ کاری سے کوئی جرم بھی کرنا چاہے تو اس کی تربیت کا کوئی معقول بندوبست نہیں ہے۔'' دونوں ہنسنے لگے۔ منصور نے کہا۔
''دوست..... واقعی بدقسمتی ہے، مگر وہ جو کہتے ہیں نا کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہوتی ہے۔ ہم لوگ خود اس سلسلے میں اپنی تربیت کیوں نہیں کرتے؟''
''تمہارا مطلب ہے کہ ہم اس کام کو باقاعدہ کاروبار کی حیثیت سے کریں اور اس سلسلے میں اپنی مناسب تربیت بھی کریں؟''
''میں یہی کہنا چاہتا ہوں کہ اگر یہ نہیں کرو گے تو پھر کیا کرو گے؟ اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو پچھلی سہ ماہیوں میں جن لوگوں کے ساتھ ہمارے انٹرویو ہوئے ہیں، ان میں سے بیشتر نوجوان اب تمہیں اچھے ملبوسات میں کسی اچھی سی کار میں گھومتے نظر آئیں گے کیونکہ انہوں نے اپنے لیے منزل تلاش کر لی ہے۔''
''نہیں میری جان...... یہ غلط سوچ ہے۔ اپنے بہتر حالات کے لیے اپنے ہی جیسے کسی انسان کی زندگی لینا ہم دونوں میں سے کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ ویسے بھی کار چھیننے کا معاملہ جو ہے نا وہ ذرا زیادہ ٹیکنیکل ہے۔''
''تو پھر ڈاکوں کا پروگرام کیسا رہے گا؟ چلو مصروف ترین شاہراہوں پر ڈاکے نہیں ڈال سکتے، کسی اکیلے گھر میں دروازے پر دستک دے کر یہ کہہ کر کہ دبئی سے سامان آیا ہے، یا ہم میٹر ریڈنگ کرنے آئے ہیں۔ اہلِ خانہ کو کسی طرح دھمکایا جائے اور اس طرح کام چلایا جائے۔''
دونوں چند لمحوں تک سنجیدگی سے غور کرتے رہے پھر شاہ میر نے کانپتے ہوئے کہا۔
''اور اخبارات میں کبھی کبھی خبریں بھی تو آ جاتی ہیں کہ اہلِ خانہ نے ڈاکو کو پکڑ لیا اور اہلِ محلہ نے اس کے بدن کی کھال اتار کر اس کا بقیہ حصہ پولیس کے حوالے کر دیا۔ نہیں بھائی، یہ اپنے بس کی بات نہیں ہے۔''
''چلو یہ بھی گیا، منشیات کے دھندے کے بارے میں کیا خیال ہے؟''
''خیر اب یہ اتنا آسان بھی نہیں ہے۔ منشیات کا کاروبار بے شک اس وقت زور پکڑے ہوئے ہے، بلکہ سچی بات یہ ہے کہ اسمگلنگ، ڈاکا زنی یہ سارے دھندے پیچھے رہ گئے ہیں لیکن مجھے ایک بات بتاؤ میری جان...... سڑکوں پر جانوروں کی طرح گھسٹتے ہوئے لوگ، وہ بے بس گھرانے جن میں معصوم بچے ماؤں کی آغوش میں سہمے ہوئے، بھوکے پیاسے بیٹھے ہوئے نظر آئیں اور ان کے گھروں کے مرد نشے میں ڈوبے ہوئے کسی نالی کے کنارے منہ رگڑتے ہوئے دکھائی دیں تو کیا دل کو دکھ نہیں ہوتا؟ تم بتاؤ جب ہم اپنی شاندار کار میں بیٹھ کر اپنے بنگلے سے باہر نکلیں گے اور ہم سے کچھ فاصلے پر کوئی مظلوم خاندان فریاد کرتا ہوا نظر آئے گا کہ اس کا سربراہ، اس کا سرپرست نشے کا عادی ہے، گھر کا سارا سامان بیچ چکا ہے اور اس کے پاس سر چھپانے کا ٹھکانا بھی نہیں ہے تو کیا وہ کار اچھی لگے گی ہمیں؟''
''یار! تم تو جذباتی ہو گئے۔''
''دوست! ایک بات بتاؤں، زندگی کا سارا تعلق جذبات سے ہی تو ہے۔ ہم اگر اپنے جذبات کا سرمایہ بھی کھو بیٹھیں تو پھر کیسے جئیں گے؟ ہماری تمہاری دوستی میں کونسی چیز

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

مشترک ہے؟ محبت کے جذبات ہی ہیں نا، اب تم بتاؤ کہ ہم جذبات کے سوداگر کیسے بن جائیں؟''

منصور گردن جھکا کر کچھ سوچنے لگا پھر اس نے آہستہ سے کہا۔

''ایک اور کاروبار ہے جو میرے خیال میں ان تمام برے دھندوں سے ذرا بہتر ہے۔''

''وہ کیا؟''

''بلیک میلنگ۔'' منصور نے جواب دیا اور شاہ میر سر جھکا کر کچھ سوچنے لگا، پھر نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

''یہ ذرا بہتر ہے، اس میں بہت سے خطرات ٹل جاتے ہیں۔ بلیک میل انہی لوگوں کو کیا جاتا ہے جو اپنی زندگی میں کوئی برائی کر بیٹھے ہوں اور یہ لوگ معمولی نہیں ہوتے۔ ظاہر ہے کسی غریب کو بلیک میل کیا ہی نہیں جاسکتا۔ اگر اس نے کوئی جرم کیا بھی ہے تو زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ اسے پولیس کے حوالے کردو۔ اس کے جرم کو طشت از بام کردو۔ وہ سرعام رسوا ہو جائے گا۔ لینے دینے کے لیے اس کے پاس کیا ہوگا لیکن اگر کوئی کروڑ پتی جرم کرلے اور دنیا سے چھپائے رکھے اور ہمیں اس بارے میں علم ہو جائے تو اس سے کچھ رقم وصول کرنا کم از کم دل کو اذیت نہیں کرے گا۔ ویسے سچ تو یہ ہے کہ وہ کمزور لوگ ہی ہوتے ہیں جو بلیک میل ہوتے ہیں۔ ہم اس کام کو بہت ہی اعلیٰ پیمانے پر نہ کریں بلکہ ذرا کچھ درمیانہ رہیں تو مناسب رہے گا۔''

''گویا تم اس بات سے متفق ہو؟''

''ہاں، میں سمجھتا ہوں کہ اگر اس کے لیے کوشش کرلی جائے تو زیادہ برا نہیں ہے، حالانکہ یہ بھی ایک اخلاقی جرم ہے۔''

''اخلاقی جرم وہ لوگ نہیں کرتے جو پہلے سے طے شدہ ملازمتوں کے اشتہارات دیتے ہیں؟ شناساؤں کو رکھ لیتے ہیں؟ میرٹ کا کوئی خیال نہیں رکھتے؟ کوٹے مقرر کردیے گئے ہیں، آپ اگر ملازمت کے لیے نااہل بھی ہیں، اچھی رشوت یا سفارش رکھتے ہیں تو ملازمت آپ کی ملکیت، اخلاقی جرم وہ نہیں ہے؟''

''ارے بھئی تم نے تو تقریر شروع کردی۔ کام کی بات یہ ہے کہ اپنے طور پر زندگی گزارنے کے لیے اپنے بہتر مستقبل کا تعین ہمارا بنیادی حق ہے اور ہم اس پر بحث کررہے ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بلیک میلنگ کے لیے بلیک میلنگ اسٹف بھی درکار ہوتا ہے، اس کے بارے میں بھی تو سوچو۔''

''سوچو سوچو، یہ بات ذرا دل کو لگتی ہے۔'' شاہ میر نے کہا اور دونوں پُرخیال انداز میں گردن ہلانے لگے، پھر منصور نے کہا۔

''اس کے لیے ہمیں شہر گردی کرنا پڑے گی۔ ویسے اس شہر میں بھی اخلاقی اور معاشرتی جرائم کی بھرمار ہے۔ دوسرے قسم کے جرائم بھی ہوتے ہیں لیکن ہمیں یہ خیال رکھنا ہوگا کہ ہم زیادہ تر اخلاقی جرائم پر توجہ دیں۔ کیونکہ معصوم لوگ کسی کو لینے دینے میں کوئی عار نہیں محسوس کرتے۔ وہ سوچتے ہیں کہ چلو بھئی دو بدمعاشوں کو تاکہ جان چھوٹے۔ بھئی کام چلتے رہنا چاہیے، ذرا نیچے پیمانے پر ہو بے شک، بس جاری رہے۔''

''تو پھر اس کے لیے ہمیں کل سے اپنے کام کا آغاز کردینا چاہیے۔ میں ایک کیمرا حاصل کرلوں گا۔ یہ میرے لیے مشکل نہیں ہوگا بلکہ یوں سمجھ لو کہ کسی زمانے میں اپنا قیمتی کیمرا کسی شناسا کو دیا تھا، واپس مانگا ہی نہیں کیونکہ اس وقت وہ میرے کسی مصرف میں نہیں تھا لیکن اب تو اس کی اشد ضرورت ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ کیمرا میرے پاس اچھی حالت میں واپس آجائے گا۔ اور پھر بات رہی سواری کی تو بائک میرے پاس موجود ہے، چنانچہ اس کے لیے کارروائی کرتے ہیں۔''

''تو پھر ملاؤ ہاتھ، اپنا کاروبار بہر طور نوکری سے زیادہ اچھا ہوتا ہے۔'' دونوں نے پرجوش انداز میں ہاتھ ملایا۔

☆☆☆

فاروق بیگ ایک کامیاب ترین بیرسٹر تھے۔ عدالت میں ان کا طوطی بولتا تھا۔ وہ ہر طرح کے کیس لے لیا کرتے تھے اور انہیں کامیاب بنانا ان کی ذمے داری تھی۔ پچھلے چند برسوں میں ان کا نام جس طرح ابھر کر سامنے آیا تھا، وہ بے مثال تھا۔ وکالت تو وہ طویل عرصے سے کررہے تھے لیکن بس بعض اوقات انسان کی اپنی کوششیں اس کے لیے زیادہ کارآمد نہیں ہوتیں۔ وقت خود فیصلے کرتا ہے اور یہ بتا دیتا ہے کہ تقدیر بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ پچھلے چند سالوں نے ان کی مالی حالت بھی کافی بہتر بنادی تھی۔ لے دے کر ایک ہی بیٹی تھی۔ بیوی اور بیٹی کے ساتھ ایک پرانے مکان میں رہتے تھے۔ مکان اپنا تھا اور ان سالوں میں اس مکان میں زندگی کی تمام سہولیات مہیا ہوچکی تھیں۔ یہی نہیں بلکہ وہ اپنے فرض واحد سے بھی خاصی حد تک آزاد ہوچکے تھے اور انہوں نے بیٹی کی منگنی بڑی دھوم دھام سے کردی تھی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

لڑکا ڈاکٹر تھا، ہاؤس جاب کررہا تھا لیکن ایک اچھا مستقبل سامنے تھا اور پھر چند پیشے ایسے ہوتے ہیں جن میں مستقبل میں وارے نیارے ہوجاتے ہیں۔ ڈاکٹر کا پیشہ بھی انہی میں سے ایک ہے۔ بس انسان ذرا غیر جذباتی ہو اور مریض کو خوفزدہ کرنا جانتا ہو، بہرحال یہ گرکی باتیں تھیں جو ابھی وہ اپنے داماد کو نہیں بتا سکتے تھے۔ سوچا تھا بعد میں اس کی تربیت کردیں گے۔ ویسے بھی وہ غیر مطمئن نہیں تھے۔ اطمینان بخش زندگی چل رہی تھی۔ طرح طرح کے لوگوں سے شناسائی تھی۔ بہت سے ان کے مستقل کلائنٹ بھی تھے جن کے مفادات کی قانونی نگرانی فاروق بیگ کیا کرتے تھے۔ انہی میں اکبر حسین بھی شامل تھے جو بیرسٹر فاروق بیگ کی نگاہوں میں ایک انوکھے کردار کی حیثیت رکھتے تھے۔ اکبر حسین کو جائدادیں بنانے کا شوق تھا۔ شہر میں بہت سے مکانات خریدے ہوئے تھے۔ پہلے کاروبار بھی کرتے تھے۔ امپورٹ ایکسپورٹ کی ایک فرم کھولی ہوئی تھی لیکن کچھ عرصے قبل یہ فرم انہوں نے بند کردی تھی۔ بس مزاج عجیب تھا۔ بہت ہی کنجوس قسم کے انسان تھے۔ غالباً ملازمین کو تنخواہ دینا انہیں ناپسند تھا۔ کئی بار فاروق بیگ سے ان کی پرائیویٹ ملاقاتیں بھی ہوئی تھیں اور فاروق بیگ نے ان سے بہت سارے سوالات کر ڈالے تھے۔ ایک بہت بڑی کوٹھی میں تنہا رہتے تھے۔ اس کوٹھی میں صرف دو ملازم تھے جن کے سپرد تمام ذمے داریاں تھیں۔ ایک ملازم گھر کا کھانا پکاتا تھا، صفائی کرتا تھا۔ ایک طرح سے ہاؤس کیپر تھا۔ دوسرا مالی کا کام بھی کرتا تھا، ڈرائیور بھی تھا اور اکبر حسین کا پرائیویٹ سیکریٹری بھی کیونکہ کچھ پڑھا لکھا آدمی تھا۔ فرم ختم کرنے کے سلسلے میں فاروق بیگ نے اکبر حسین صاحب سے پوچھا تھا کہ ایک اچھی خاصی چلتی ہوئی فرم کو وہ کیوں فروخت کررہے ہیں تو انہوں نے کہا وہ بہت زیادہ محنت نہیں کرنا چاہتے۔ پچھلے کچھ عرصے سے جسمانی تھکن محسوس کررہے ہیں اور پھر اتنے بڑے کاروبار کو پھیلانے سے فائدہ بھی کیا۔ ان کا کون ہے جس کے لیے وہ یہ سب کچھ چھوڑ جائیں۔ اکبر حسین صاحب نے شادی بھی نہیں کی تھی۔ کچھ عرصے پہلے ہی فاروق بیگ کو پتا چلا کہ اکبر حسین صاحب اسپتال میں داخل ہیں۔ وہ امراضِ قلب کے اسپتال میں داخل تھے بہرطور رابطہ کیا تھا چنانچہ فاروق بیگ نے ان سے ملاقات کی۔ پتا چلا کہ اکبر حسین صاحب کو دل کا عارضہ لاحق ہوچکا ہے۔ گو ان پر کوئی اٹیک تو نہیں ہوا تھا لیکن ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ کسی بھی وقت اٹیک ہوسکتا ہے چنانچہ مزید احتیاط ضروری ہے۔

اکبر حسین صاحب گھر واپس آچکے تھے لیکن گھر آنے کے بعد وہ مسلسل بیمار تھے۔ دولت کی فراوانی تھی۔ کوٹھیوں کا کرایہ ہی اتنا آتا تھا کہ اس سے وہ ایک نسل کو پال سکتے تھے لیکن بیچارے ملازمین بھی مفلوک الحال ہی نظر آتے تھے۔ اس دن اپنے آفس ہی میں فاروق بیگ کو اکبر حسین صاحب کا فون موصول ہوا۔ انہوں نے فاروق بیگ سے کہا تھا کہ جونہی انہیں فرصت ملے، وہ اکبر حسین صاحب سے مل لیں۔ شام کو ساڑھے چار بجے فاروق بیگ اپنے معمولات سے فارغ ہونے کے بعد اکبر حسین صاحب کی کوٹھی پر پہنچ گئے۔

اکبر حسین صاحب اپنی کوٹھی میں کیاریوں کی دیکھ بھال کررہے تھے۔ غالباً مالی کا کام کرنے والے ڈرائیور پلس سیکریٹری کو ڈانٹ بھی رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر اس کی جان چھوٹ گئی۔ ڈرائیور سے کہا کہ کرسیاں باہر لاکر ڈال دے۔

قدیم طرز کی کرسیاں ایک میز کے ساتھ باہر آگئیں اور کرسیوں پر فاروق بیگ، اکبر حسین کے سامنے بیٹھ گئے۔

''آپ کی صحت کیسی ہے؟'' فاروق بیگ نے سوال کیا۔

''کچھ اچھی نہیں ہے بیرسٹر صاحب۔ ان دنوں میں خاصی تشویش کا شکار ہوچکا ہوں اپنے بارے میں۔''

''میری مانیے تو ملک سے باہر چلے جائیے اور باقاعدگی سے اپنا علاج کرائیے۔''

اکبر حسین صاحب نے نگاہیں اٹھا کر انہیں دیکھا اور پھر پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔

''جینے کا کوئی نظریہ نہیں ہے میرے سامنے۔ بس جب تک زندگی ہے جی رہا ہوں۔ جب جانا ہوگا چلا جاؤں گا۔ پھر زندگی کی ڈور پکڑنے کے لیے بھاگ دوڑ کیا حیثیت رکھتی ہے فاروق صاحب۔''

''معاف کیجیے گا اکبر حسین صاحب! آپ یقین کریں جب بھی آپ کے بارے میں سوچتا ہوں، بڑی حیرت کا شکار ہوجاتا ہوں۔''

''کیوں؟'' اکبر حسین صاحب نے بھویں اٹھا کر پوچھا۔

''آپ نے اپنی زندگی کو اتنا خشک بنالیا ہے کہ مجھے آپ کے جینے پر حیرت ہوتی ہے۔ نہ آپ کے زیادہ ملاقاتی، نہ دوست ہیں۔ بس کوٹھی، کوٹھی اور کوٹھی..... کیسے جی رہے ہیں آپ؟''

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

''ہر شخصیت کے پیچھے ایک پس منظر ہوتا ہے بیرسٹر صاحب..... میری زندگی کا ایک حصہ ایسا نہیں تھا لیکن دوسرے حصے میں یہ تبدیلیاں رونما ہوگئیں اور ان کا کچھ پس منظر تھا۔ انسان اپنے حالات اپنے خیالات کو بعض اوقات خود تک ہی محدود رکھنا پسند کرتا ہے لیکن کچھ لمحات ایسے آجاتے ہیں جب اپنے بارے میں کسی کو کچھ بتانا انتہائی ضروری محسوس ہونے لگتا ہے۔''

''اگر آپ مجھے اس قابل سمجھتے ہیں تو میں اپنے آپ کو خوش قسمت قرار دیتا ہوں۔''

''نہیں میاں، ظاہر ہے میرے حالات جاننے سے تمہاری تقدیر پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ نہ تمہیں میری کہانی سننے کا کوئی معاوضہ ملے گا۔ ہمارے تمہارے درمیان جو کچھ جس انداز میں چل رہا ہے اسی انداز میں چلتا رہے گا۔ معاف کرنا یہ صاف گوئی تمہیں پسند نہیں آئے گی لیکن بہرحال.....'' فاروق بیگ کو واقعی یہ صاف گوئی پسند نہیں آئی تھی کیونکہ اس میں ان کے کسی مالی مفاد کا تذکرہ نہیں تھا لیکن سن لینا ضروری تھا۔ اکبر حسین بولے۔

''اصل میں جوانی سب پر ہی آتی ہے، مجھ پر بھی آئی تھی۔ میرا ایک بھائی تھا ساجد حسین۔ والدین کا انتقال ہو چکا تھا۔ خاندان میں کچھ اور افراد بھی تھے۔ دور دراز کے خاندان میں ایک خاتون تھیں جو مجھے پسند تھیں اور ساجد کو بھی۔ ہم ان کے گھر آتے جاتے رہتے تھے۔ میں نے ان سے کہا میں ان سے شادی کا خواہش مند ہوں تو ان کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیل گئے۔ بعد میں مجھے علم ہوا کہ وہ تو ساجد کو چاہتی ہیں اور ان سے شادی کرنے کی خواہش مند بھی ہیں۔ بے شک ساجد میرا بھائی تھا لیکن میرے دل میں رقابت کے جذبے نمودار ہوگئے تھے۔ اپنے بھائی کو کوئی نقصان تو نہیں پہنچا سکتا تھا۔ لیکن بس دل میں ایک کھوٹ پیدا ہوگیا تھا۔ وہ مجھ پر فوقیت حاصل کر گیا تھا۔ مجھے اپنی محبوب شخصیت کی اس کی جانب رغبت قطعی پسند نہیں آئی اور میں سوچتا رہا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ بالآخر میں نے فیصلہ کیا کہ ملک سے باہر نکل جاؤں، دولت کماؤں اور پھر دولت کے بل پر اپنی مطلوب کو حاصل کروں۔ میں نے ان سے کہہ دیا کہ ساجد انہیں زندگی میں وہ تمام خوشیاں نہیں دے سکے گا جو میں دے سکتا ہوں۔ وہ میرا انتظار کریں۔ زندگی صرف محبت ہی کا نام نہیں ہے۔ اس کی کچھ اور ضرورتیں بھی ہوتی ہیں۔ ان خاتون نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور میں ملک سے باہر چلا گیا۔ کافی عرصے تک مارا مارا پھرتا رہا اور بالآخر اپنا مقصدِ حیات حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔

''وہ ایک الگ اور طویل داستان ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ اخذ کرلیں آپ کہ میری مالی حالت بہتر سے بہتر ہوتی چلی گئی۔ میں نے خوب دولت کمائی اور اس کے بعد بڑے فخر اور بڑی شان سے واپس لوٹا۔ میں جانتا تھا کہ ساجد ایک معمولی ملازم ہے۔ وہ بھلا اپنی زندگی کے لیے کیا کر سکے گا۔ یہ تصور بھی تھا میرے ذہن میں کہ ہوسکتا ہے میری محبوبہ کی شادی ہوگئی ہو۔ میں وطن واپس آیا اور اس کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ میری محبوبہ کی شادی ہوگئی ہے اور میرے ہی بھائی کے ساتھ۔ یہ سن کر مجھ پر غم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ مجھے زبردست ذہنی دھچکا برداشت کرنا پڑا تھا، اس حادثے نے میرے ہوش و حواس معطل کردیے تھے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔

''بہرطور اس کے بعد میرے دل میں انتقامی جذبے پیدا ہوگئے۔ ساجد سے میں نے کوئی باقاعدہ ملاقات نہیں کی لیکن اس کے بارے میں مجھے تمام معلومات حاصل تھیں۔ وہ معمولی سی نوکری کرتا تھا۔ شہر کے ایک گندے علاقے کے گھر میں رہتا تھا۔ ایک بچے کا باپ بن چکا تھا۔ تاہم وہ لوگ میری نسبت خوشیوں سے بھرپور زندگی گزار رہے تھے۔ میں نے یہاں اپنی حیثیت بنانا شروع کردی۔ باقی دولت سے جائدادیں خریدیں۔ میں اب ایک ایسی شکل میں ان لوگوں کے سامنے جانا چاہتا تھا جو بہت بڑی حیثیت کی مالک ہو۔ چنانچہ میں نے پہلے اپنے آپ کو چاروں طرف سے مضبوط کیا اور اس کے بعد ساجد کو اپنی آمد کی اطلاع دی۔ میاں بیوی، بچے سمیت دوڑے چلے آئے تھے۔

''بظاہر وہ محبت کا اظہار کرنے آئے تھے لیکن میں جانتا تھا کہ وہ میرے دل پر چرکے لگانے آئے تھے۔ میں نے بھی اسی انداز میں ان کا استقبال کیا بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ میں نے ان کی کافی تذلیل کی اور اس کے بعد ساجد سے کہا کہ میرے اور اس کے معیارِ زندگی میں بہت فرق ہے۔ چنانچہ وہ مجھ سے زیادہ ملاقاتوں کی کوشش نہ کرے۔ ہاں جب بھی مجھے ضرورت ہوگی، میں اس سے مل لوں گا۔ ساجد کو بڑی مایوسی ہوئی تھی لیکن یہ بات وہ بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ میں دل میں کیا تصور رکھتا ہوں۔ آدمی غیور تھا، اس کے بعد وہ مجھ سے نہیں ملا اور یوں زندگی کا سفر طے ہوتا رہا۔ میں نے لاکھ کوشش کی کہ اپنے آپ کو یہاں کے ماحول میں ڈھال لوں۔ شادی کرلوں اور زندگی گزاروں لیکن دل پر ایسی...

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

پژمردگی چھائی ہوئی تھی کہ میں کافی.... کوشش کے باوجود وہ سب کچھ نہیں کرسکا جو میرے دل میں تھا۔ ایک عجیب سا مزاج بن گیا تھا اور اسی مزاج کے تحت بیرسٹر صاحب، میں نے زندگی کا ایک طویل ترین سفر طے کر ڈالا۔ اس دوران مختلف حادثات ہوئے۔ ساجد کا انتقال ہوگیا۔ وہ لوگ کبھی زندگی میں سکون نہیں حاصل کرسکے۔ کچھ تبدیلیاں ہوئیں لیکن اب میں ان سے کبھی ایک طرح سے لاتعلق ہوگیا تھا اور میں نے ان کی خبر گیری کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ بس یوں سمجھ لیجیے کہ یہ مزاج بننے کی ایک وجہ تھی اور وہ وجہ میں نے آپ کو بتادی۔''

''بہت عجیب واقعات ہیں، بعد میں آپ نے ان خاتون سے رجوع کرنے کی کوشش نہیں کی؟''

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے بعد میں ان کھنڈرات کا کیا کرتا جو خس ہو چکے تھے لیکن میری دلی خواہش تھی کہ انہیں ایسے ذہنی چرکے پہنچاؤں جس سے وہ تڑپ تڑپ اٹھیں۔ یہ بات وہ لوگ بھی جانتے ہیں کہ میں یہاں ایک صاحب حیثیت انسان کی زندگی گزار رہا ہوں۔ لیکن انہوں نے بھی اپنی انا کو زندہ رکھا، کبھی مجھ سے ملاقات نہیں کی۔ البتہ یہ دل کی بات میں آپ کو ضرور بتا رہا ہوں میری خواہش تھی کہ کسی وقت کبھی نہ کبھی وہ مجھ سے مدد مانگنے آئیں۔ اپنے مشکل حالات کا تذکرہ کریں مگر انہوں نے کبھی ایسا نہیں کیا۔ ساجد کی موت پر بھی میں ان کے پاس نہیں پہنچا۔ بس یہ خبر میرے کانوں تک پہنچ گئی کہ میرا بھائی اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ اصل میں یہ کہتے ہوئے مجھے کوئی شرم نہیں محسوس ہوتی کہ اس واقعے کے بعد بھائی سے میرا خون کا رشتہ بھی ختم ہوگیا تھا۔ یہ ہیں وہ عوامل جن کے تحت آپ مجھے زندگی گزارتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔ سب کچھ ہے میرے پاس لیکن سچی بات ہے کہ زندگی سے کبھی لطف اندوز نہیں ہوسکا۔ بس دل کا کوئی ایسا خانہ زخمی ہوگیا تھا کہ وہ زخم کبھی ٹھیک ہی نہیں ہوسکا۔ یہاں تک کہ اس زخم نے مجھے دل کے روگ میں مبتلا کردیا اور فاروق بیگ صاحب، اب میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ میری زندگی میں زیادہ وسعت نہیں رہی ہے۔ شاید شام ہونے والی ہے اور میں اسی شام کا انتظار کررہا ہوں۔''

''آپ نے اپنے آپ کو یہ سارے روگ خود لگائے ہیں اکبر صاحب..... یہ بڑی عجیب بات ہے کہ کسی سے محبت بھی کی جائے اور اسے اس طرح نظرانداز بھی کردیا جائے۔ اگر آپ ملک سے باہر گئے بھی تھے تو آپ کو کم از کم ٹھوس بنیادوں پر یہ طے کرکے جانا چاہیے تھا کہ آپ کی واپسی تک وہ خاتون شادی نہ کرتیں لیکن آپ ایسے ہی چلے گئے اور اس کے بعد ظاہر ہے اتنی دولت حاصل کرنے کے لیے آپ نے ایک طویل عرصہ باہر گزارا ہوگا۔''

''ہاں، بہت سی باتیں ہیں لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ اگر میں یہاں ملک میں ہوتا تب بھی میں اس سنگدل عورت کو متاثر نہیں کرسکتا تھا۔ میرے بھائی کا جادو اس پر پوری طرح چل چکا تھا۔ اس نے ساری زندگی بے کسی اور بے بسی میں گزار دی اور اب بھی اپنے بیٹے کے ساتھ ایک حسرت زدہ زندگی گزار رہی ہے۔''

''کیا حالیہ طور پر آپ نے ان کی خبر گیری کی؟''

''بالکل نہیں۔''

''کیوں؟''

''مجھے اس کی ضرورت ہی کیا تھی۔ میں اپنی دنیا کا انسان بن کر رہ گیا تھا۔ جب کسی سے کچھ لینا دینا ہی نہ ہو تو پھر اس کی خبر گیری سے کیا فائدہ۔ گویا ایک طرح سے میری زندگی ضائع ہی ہوگئی لیکن اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ سب کچھ ہوا انہی لوگوں کی وجہ سے۔ بہتر ہی ہوگا اس تبصرے سے آپ کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ البتہ جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں اس بات کو ذرا آپ غور سے سن لیجیے۔ میں نے اس لیے آپ کو زحمت دی ہے کہ میں اپنا وصیت نامہ تیار کرانا چاہتا ہوں۔''

''جی..... لیکن اس کی ضرورت؟''

''میری جو صحت ہے اس سے مجھے یہ خوف لاحق ہوگیا ہے، اب میں زیادہ عرصے زندہ نہیں رہ سکوں گا۔ اب آپ دیکھیے نا یہ کروڑوں روپے کی جائداد اور دولت وغیرہ ہے، اس کا کوئی مصرف تو ہونا چاہیے۔ آپ اس بات کا اندازہ لگا سکتے ہیں فاروق بیگ صاحب کہ میری موت کے بعد میرا وارث کون ہوسکتا ہے۔''

فاروق بیگ کچھ دیر سوچتے رہے پھر بولے۔

''قانونی طور پر ساجد حسین کا بیٹا۔''

''بالکل درست خیال ہے آپ کا، لیکن کیا ایسا ہوسکے گا؟ کیا ایسا ہونا چاہیے، کیا میں ایسا ہونے دوں گا؟'' اکبر حسین صاحب شدت جوش میں سیدھے ہوکر بیٹھ گئے۔ ان کے چہرے پر سرخی نظر آرہی تھی، پھر انہوں نے کہا۔

''میں اپنی دولت کو مٹی میں ملا دینا پسند کروں گا، لیکن میں ساجد کے بیٹے کو یہ سب کچھ نہیں دوں گا۔ اس لیے میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ میں اپنا وصیت نامہ تیار کرالوں۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

http://paksociety.com

پاک سوسائٹی پر مُوجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

Downloaded From Paksociety.com

''وصیت نامے میں آپ یہ دولت کس کے نام کرنا چاہتے ہیں؟''

''میں اپنی اس دولت کو وقف کر دینا چاہتا ہوں، کسی بھی نیک کام میں صرف ہو جائے لیکن اس میں سے ایک پیسا بھی ان لوگوں کو نہ ملے۔ میں نے کمایا ہے ان کے لیے نہیں اپنے لیے..... ضائع ہوتا ہے تو ہو جائے۔ میں نے اپنی ساری زندگی اس طرح ضائع کر دی اور اب میں اپنی دولت ان کے نام چھوڑ جاؤں..... نہیں قطعی نہیں۔''

فاروق بیگ سر کھجانے لگے۔ چند لمحوں تک سوچتے رہے پھر انہوں نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ کو شدید ذہنی صدمے سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ بہر طور آپ اس کے حق دار ہیں کہ اپنی محنت سے کمائی ہوئی وہ دولت جو آپ کے پاس موجود ہے، کسی بھی شخص کو دے جائیں یا اس کا کوئی بھی مصرف کر جائیں۔ آپ اگر اسے ٹرسٹ کرنا چاہتے ہیں تو ٹھیک ہے۔ کوئی ایک ادارہ بنا دیا جائے یا کسی ایک ادارے سے منسوب کر دیا جائے اسے۔''

''اس کا فیصلہ آپ کو کرنا ہے۔ میرے نام پر ایک ٹرسٹ قائم کر دیا جائے اور اس دولت سے ضرورت مندوں کی مدد کی جائے لیکن ان ضرورت مندوں میں ساجد کا بیٹا یا اس کی بیوہ شامل نہ ہو۔''

''خیر اس کے لیے ہم کوئی تعین نہیں کر سکتے۔ میں بھی سوچتا ہوں اور آپ خود بھی غور کر لیجیے کہ اس سلسلے میں کیا کرنا ہے؟''

''غور کرنے کے بعد ہی میں نے آپ کو زحمت دی ہے بیرسٹر صاحب! آپ میری وصیت تیار کیجیے اور میرے نام پر ایک ٹرسٹ بنا دیجیے جو کچھ امور کے لیے کام کرے گا اور ان امور کی تفصیلات میں آپ کو فراہم کر دوں گا۔''

''میں آپ کی پسند کے مطابق تمام کام کرنے کو تیار ہوں۔''

''بس تو آغاز کر دیجیے اس کا، زیادہ انتظار نہ کریں۔ وصیت نامے پر مجھ سے دستخط کرا لیں اور اس کی جو کچھ بھی قانونی نوعیت ہو وہ آپ کر لیں۔ مجھے آپ پر مکمل اعتماد ہے۔''

بیرسٹر فاروق بیگ نے اس بات کی ہامی بھر لی لیکن واپسی میں راستے بھر وہ یہ سوچتا رہا کہ یہ کچھ عجیب سی وصیت ہوگی اور یقینی طور پر اس کی پیشہ ورانہ زندگی میں یہ کہانی بہت ہی دلچسپ نوعیت کی ہے۔ ایسی کہانیاں مل تو بہت جاتی ہیں لیکن کم از کم بیرسٹر فاروق بیگ کو پہلی بار ایسی کہانی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

☆☆☆

منصور اور شاہ میر مختلف انداز میں زندگی کا رخ اختیار کیے ہوئے تھے۔ بلیک میلنگ کے لیے مواد کا حصول آسان بات نہیں تھی۔ آخر کس طرح وہ ان رازوں کو حاصل کر سکتے ہیں جن کے تحت کسی کو بلیک میل کیا جائے۔ ہوٹلوں میں، پارکوں میں کبھی کبھی گھروں پر، یا سڑکوں کے کنارے کسی پلیا پر بیٹھ کر یہی منصوبہ بندی کی جاتی تھی کہ آخر وہ کیا طریقہ کار ہو جس کے تحت کوئی شکار ان کے جال میں پھنسے۔ اس دوران میں انٹرویوز کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ جہاں جہاں درخواستیں دی گئی تھیں وہاں سے اگر کال آتی تو جاتے ضرور تھے لیکن اب ان کا ایمان پختگی اختیار کر گیا تھا کہ شاید ان کی تقدیر میں ملازمت ہے ہی نہیں۔

اس دن بھی جھیل کے کنارے بیٹھ کر مایوسی سے ایک دوسرے کی صورت دیکھ رہے تھے۔ چاروں طرف سناٹے کا راج تھا کہ اچانک ہی منصور کی نظر سفید رنگ کی ایک کار پر پڑی جو پارکنگ میں آ کر رکی تھی۔ ایک لڑکی کار ڈرائیو کر رہی تھی، پھر وہ نیچے اتر گئی۔ اس نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھا اور پھر ٹہلنے کے انداز میں آگے بڑھ گئی۔ منصور کی نگاہیں اس کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

''شاہ میر! اس لڑکی کو دیکھ رہے ہو۔ یہ تنہا بوٹ بیسن کی سیر کرنے آئی ہے۔''

''میں بھی یہی جائزہ لے رہا تھا، کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی میں بار بار وقت دیکھنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس لڑکی کو کسی کا انتظار ہے۔'' دفعتاً ہی منصور اچھل پڑا۔

''کیا کسی محبوب کا انتظار..... آہ یہ تپتی ہوئی دوپہر، بوٹ بیسن کی ویرانی اور سناٹا اور ایک تنہا لڑکی جو اپنی کار ڈرائیو کرتی ہوئی آئی ہے اور یہاں کسی کی منتظر ہے۔ یار کہیں ہماری تقدیر تو نہیں جاگ رہی۔''

''مطلب؟''

''جس کا انتظار کیا جا رہا ہے، وہ محبوب بھی ہو سکتا ہے۔''

''تت..... تو پھر۔'' شاہ میر نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

''اور یہ تنہا ملاقات سناٹے کا یہ منظر، اوہ مائی گاڈ..... اگر ہمارا اندازہ درست ہے تو پھر تو کچھ کام بن جائے گا۔''

لڑکی ٹہلتی ہوئی دور نکل گئی تھی اور اس کے انداز سے بے چینی واضح تھی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

''کیمرا لاؤ، ہوسکتا ہے آج کچھ کام بن ہی جائے۔''

''ٹھیک ہے، میں لاتا ہوں۔'' منصور انتظار کرنے لگا۔ شاہ میر نہ صرف کیمرا لے آیا بلکہ اس نے کار کا نمبر بھی نوٹ کرلیا تھا۔ دونوں بلیک میلر ذہانت سے اپنا کام کررہے تھے۔ شاہ میر نے منصور کو بتایا کہ اس نے کار کا نمبر بھی نوٹ کرلیا ہے تاکہ اس کے ذریعے کار کے مالک کا پتا چلایا جاسکے۔ دونوں کی تقدیر واقعی یاوری کررہی تھی کیونکہ تھوڑی ہی دیر کے بعد وہاں ایک اور گاڑی آکر رکی تھی اور اس سے ایک خوبصورت نوجوان باہر نکل آیا تھا۔ اس نے مخصوص کار کو دیکھا اور پھر گردن اٹھا کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ لڑکی ایک درخت کے سائے میں اسے ہاتھ ہلا ہلا کر اشارہ کررہی تھی اور کچھ دیر کے بعد دونوں یکجا ہوگئے۔ انہوں نے غالباً کسی سنسان گوشے کی تلاش شروع کردی تھی۔

پھر پھولوں کے ایک کنج میں انہیں موقع مل گیا اور دونوں کے دل بے اختیار دھڑکنے لگے۔ منصور اور شاہ میر آہستہ آہستہ اپنی پوزیشن تبدیل کرنے لگے۔ کیمرا منصور ہی آپریٹ کرتا تھا اور وہ پوری طرح تیار تھا۔ پھر انہیں ایک ایسا زاویہ مل گیا جہاں سے وہ ان دونوں کی مشترکہ تصاویر لے سکتے تھے اور اس کے بعد منصور نے دھڑا دھڑ کئی تصویریں بنا ڈالیں۔ فلیش کے جھماکے ہوئے تھے حالانکہ دن کا وقت تھا لیکن پھر بھی منصور کو یہ اندازہ تھا کہ ان لوگوں کو اس فوٹو گرافی کی خبر ہوگئی ہوگی۔ دونوں ہی بے اختیار کھڑے ہوگئے تھے۔ بائک کے پاس پہنچ کر منصور نے کیمرا شاہ میر کے حوالے کیا اور خود سیٹ پر بیٹھ کر بائک اسٹارٹ کردی۔ پھر دونوں وہاں سے ہوا ہوگئے۔ حالانکہ شاہ میر مسلسل اس خوف کا شکار رہا تھا کہ ابھی عقب سے گولی چلے گی اور اس کی پشت میں سوراخ ہوجائے گا لیکن شاید وہ لوگ غیر مسلح تھے۔ دونوں کے دل بری طرح دھڑک رہے تھے۔ کافی دور پہنچنے کے بعد انہوں نے سانس لی۔ بائک ایک جگہ کھڑی کردی گئی اور دونوں ایک ہوٹل میں آبیٹھے۔ سنہرا مستقبل نگاہوں کے سامنے آگیا تھا۔ یقینی طور پر کار ڈرائیو کرنے والی لڑکی..... اچھی حیثیت کی مالک ہوگی۔ منصور نے چائے کے گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

''میں تمہیں اپنے کام کے اس افتتاح کی مبارک باد دیتا ہوں شاہ میر..... لیکن اب ہمیں نہایت احتیاط سے کام کرنا ہوگا۔''

''لڑکی چہرے سے عام سی نظر آتی تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ قابو میں آجائے گی لیکن ہم اس سے پہلی بار کتنی رقم کا مطالبہ کریں گے؟''

''پچاس ہزار..... میں نے فیصلہ کرلیا ہے... لیکن دوست کام بہت اعلیٰ پیمانے پر کرتا ہے۔ اب سب سے پہلے ہمیں رجسٹریشن آفس سے اس کار کے مالک کا نام اور پتا حاصل کرنا ہے۔''

''کچھ دینا لینا پڑے گا؟''

''تم فکر مت کرو، ظاہر ہے ابتدا میں اخراجات تو ہوتے ہی ہیں۔ کاروبار میں انویسٹمنٹ تو بہرحال کرنا پڑتی ہے نا۔''

دونوں خوش تھے۔ دوسرے دن رجسٹریشن آفس سے کار کے مالک کا نام اور پتا معلوم کرلیا گیا۔ اس کے بعد ایڈریس کے ذریعے فون نمبر بھی ٹریس کرلیا گیا۔ آج کی یہ کارکردگی انتہائی شاندار تھی۔ ویسے بھی انہیں امید نہیں تھی کہ لڑکی ذہنی طور پر تیار ہوگی اور اس کا ساتھی مرد بھی۔ منصور نے کہا۔

''اس شخص کو لفٹ دینا تو بالکل بیکار ہی ہوگا، نہ تو ہم نے اس کی کار کا نمبر وغیرہ نوٹ کیا ہے۔ پھر مرد زیادہ پاور فل ہوتے ہیں اور کسی بھی طرح پیش آسکتے ہیں لیکن لگتا ہے لڑکی قابو میں آجائے گی۔''

''کیا اس کے بارے میں مزید تفصیلات کی ضرورت ہے؟''

''مل جاتیں تو اچھا تھا کیونکہ کام خطرناک ہے اور خاص طور سے اس شکل میں جب لڑکی کو یہ احساس ہوگیا تھا کہ اس کی تصاویر بنائی گئی ہیں۔''

''بہرحال اب کیا خیال ہے، ٹیلی فون کہاں سے کیا جائے؟''

''آج کا دن انتظار کرو، ذرا ایک آدھ دن گزر جائے گا تو اس کے دل میں خوف بڑھ جائے گا مگر فون کہاں سے کیا جائے؟''

''کسی بھی فون بوتھ سے؟''

''گڈ..... شاندار آئیڈیا ہے۔''

پھر پروگرام کے مطابق ایک ٹیلی فون بوتھ سے حاصل شدہ نمبر ڈائل کیا گیا۔ دوسری طرف سے کسی کی آواز سنائی دی، آواز نسوانی ہی تھی۔

''کون بول رہا ہے؟''

''آپ کو کس سے بات کرنی ہے؟''

''ایک خاتون یہاں رہتی ہیں، ان کا تعلق بوٹ بیسن پر پھولوں کے کنج میں کسی واقعے سے ہے۔ اگر وہ آپ ہیں تو براہِ کرم بات کریں اور اگر آپ نہیں ہیں تو پھر اس گھر میں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

اور جو کوئی بھی خاتون بوٹ بیسن سے متعلق ہوں ان سے بات کرائیے۔''

''آپ کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں؟''

''میڈم! اگر آپ سے تعارف حاصل ہو جاتا... تو ہم بھی دل کی بات آپ کو بتا دیتے۔'' منصور نے کہا۔

''میں سمجھ گئی کہ تم کون ہو سکتے ہو، تم نے وہاں بوٹ بیسن پر میری تصاویر اتاری تھیں نا؟''

''ویری گڈ، ویری گڈ..... اس کا مقصد ہے کہ تقدیر ہمارے ساتھ اچھا سلوک کرنا چاہتی ہے، براہِ راست آپ ہی سے بات ہو گئی ورنہ جانے کس کس کے کانوں سے یہ بات گزرتی اور آپ تو سمجھتی ہیں، وہ کہتے ہیں نا کہ ''زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو''۔ شاید میں غلط مصرع پڑھ گیا ہوں۔ تو خیر، خاتون آپ کا اندازہ بالکل درست ہے، ہم آپ کے وہی کرم فرما ہیں۔''

''وہ کیا بدتمیزی تھی؟ میں نے تم لوگوں کو دیکھا تھا۔ تم نے ہماری تصویریں کیوں بنائی تھیں؟''

''بس یوں سمجھ لیجیے کہ عزت اس کائنات میں سب سے بڑی چیز ہے۔ ایک معزز خاتون اگر ایک نوجوان لڑکے کے ساتھ بوٹ بیسن کے ایک سنسان گوشے میں راز و نیاز میں مصروف نظر آئے تو ان عزت داروں کو کتنا دکھ ہوگا جنہوں نے ان سے بہت سی توقعات وابستہ کر رکھی ہیں۔ دراصل ہم نہیں چاہتے کہ آپ کے کباب میں ہڈی بنیں لیکن محترمہ اس کے لیے آپ کو فی الحال پچاس ہزار روپے خرچ کرنا ہوں گے۔''

''اوہو بلیک میلنگ۔''

''جی..... لیکن اس مہنگائی کو دیکھ لیجیے، حالات کو دیکھ لیجیے، زندگی گزارنا کتنا مشکل کام ہے اور پھر پچاس ہزار نہ ہونے کے برابر ہیں۔ آپ کے لیے پچاس ہزار روپے کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ بہت سستے پیسوں میں چھوٹ رہی ہیں آپ۔''

''ہوں..... پچاس ہزار روپے، ٹھیک ہے..... میں تمہیں یہ رقم ادا کرنے کے لیے تیار ہوں، لیکن مجھے تصویریں اور نیگیٹو مل جانے چاہئیں۔''

''میڈم آپ بالکل مطمئن رہیں۔ ہم بدنیت نہیں ہیں جو کہہ رہے ہیں سو کریں گے۔''

''کہاں چاہتے ہیں یہ رقم؟''

''جہاں آپ مناسب سمجھیں۔ ویسے بوٹ بیسن کا وہ علاقہ دوپہر کو دو بجے اتنا سنسان ہوتا ہے، اس سے پہلے ہمیں بھی معلوم نہیں تھا، لیکن شرط یہ ہے میڈم کہ آپ نہ تو پولیس کو اس کی اطلاع کریں گی اور نہ ہی کوئی اور ذریعہ اختیار کریں گی۔ ورنہ اس کے بعد جو کچھ ہوگا، اس کی ذمے دار آپ خود ہوں گی۔ ہم بہت ہی نیک لوگ ہیں، ہمیں بدی پر آمادہ صرف آپ کریں گی۔''

''نہیں..... میں اکیلی ہی آؤں گی، وعدہ کرتی ہوں۔''

''تو پھر کب تشریف لا رہی ہیں؟''

''جب تم پسند کرو۔''

''کل دو بجے کا وقت نہایت مناسب رہے گا، البتہ خیال رکھیے گا۔ ہم لوگ ذرا بھی خطرہ محسوس کریں گے تو آپ کے قریب نہیں پہنچیں گے۔''

''میں نے تم سے کہہ دیا ہے کہ میں بالکل تنہا آؤں گی پھر بھی تم اپنا اطمینان کر سکتے ہو۔'' دوسری طرف سے جواب ملا اور منصور نے فون بند کر دیا۔ دونوں کے چہرے خوشی سے سرخ ہو رہے تھے۔ پورے پچاس ہزار روپے اور اس کے بعد رنگین خوابوں کی ایک دنیا آباد ہو گئی تھی۔ زیادہ تر نشستیں گھٹیا درجے کے ہوٹلوں میں ہی ہوا کرتی تھیں۔ ایک معمولی سے ہوٹل میں بیٹھ کر وہ اپنے مستقبل کے فیصلے کرنے لگے۔ شاہ میر نے کہا۔

''اصل میں، میں اس بات سے خوفزدہ تھا کہ اگر ہم کسی سے بہت زیادہ رقم کا مطالبہ کریں گے تو وہ بھڑک جائے گا۔ لڑکی کتنی آسانی سے پچاس ہزار روپے دینے پر آمادہ ہو گئی۔''

''اس کے باوجود جانِ من، دنیا بہت بری جگہ ہے، ہمیں پورا پورا خیال رکھنا ہوگا۔''

''لڑکی کے لہجے سے یہ اندازہ ہوتا تھا تمہیں؟''

''بالکل نہیں ہوتا تھا۔ اصل میں وہ خوفزدہ ہو گئی تھی، لیکن خود کو نڈر ظاہر کر رہی تھی۔''

''چلو ٹھیک ہے، اب اس کے بعد بہت زیادہ تفصیل میں جانے کی کیا ضرورت ہے۔ ویسے کیا خیال ہے اس پتے پر ایک چکر لگایا جائے؟''

''تمہارا مطلب ہے کہ تم اسے دیکھ لو؟''

''خیر یہ آسان کام نہیں ہے لیکن پھر بھی ذرا حیثیت کا اندازہ ہو جائے گا۔''

''ہوں..... سوچنے دو۔'' منصور نے گردن ہلاتے ہوئے کہا اور چائے کی پیالی سے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لینے لگا۔

☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

بیرسٹر فاروق بیگ ان دنوں گہری سوچوں میں ڈوبے رہتے تھے۔ان کا ذہن بہت سے منصوبے بنا رہا تھا۔وصیت نامہ انہوں نے تیار کرلیا تھا حالانکہ اکبر حسین کی طرف سے کوئی ایسی جلد بازی ظاہر نہیں کی گئی تھی لیکن اب جبکہ بیرسٹر فاروق بیگ کا ذہن ذرا مختلف انداز میں سوچ رہا تھا تو پھر یہ کارروائی جلد از جلد کرلینا مناسب تھا۔بہرحال وہ وصیت نامہ تیار کرکے اکبر حسین کی کوٹھی پر پہنچ گئے۔اکبر حسین عموماً اپنی کوٹھی ہی پر رہا کرتے تھے چنانچہ ملاقات میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔دونوں میں رسمی گفتگو ہوئی اور اس کے بعد بیرسٹر صاحب نے وصیت نامے کی تحریر نکال کر اکبر حسین کے سامنے رکھ دی اور اکبر حسین آنکھوں پر چشمہ لگا کر تحریر کو پڑھنے میں مصروف ہوگئے۔بیرسٹر صاحب نے صوفے کی پشت سے گردن ٹکا کر آنکھیں بند کرلی تھیں۔اکبر حسین نے پوری تحریر پڑھی اور مطمئن انداز میں بولے۔

''بالکل ٹھیک، میں اس وصیت نامے سے پوری طرح مطمئن ہوں۔آپ اس کی رجسٹریشن کرادیجیے، میں دستخط کیے دیتا ہوں۔''

بیرسٹر فاروق بیگ سیدھے ہوکر بیٹھ گئے۔انہوں نے کہا۔''اکبر حسین صاحب! آپ اگر پسند کریں تو وصیت نامے کی تحریر کو اپنے پاس رکھ لیں۔غور کرلیں کہ جو کچھ آپ کررہے ہیں اس سے پوری طرح مطمئن ہیں۔جلد بازی کی ضرورت نہیں ہے۔''

''بیرسٹر صاحب! جو کام میں کرنا چاہتا ہوں اس میں دیر کرنے سے کیا فائدہ۔میں نے یہ فیصلہ ایک دن میں نہیں کیا ہے، اس پر میں نے بہت غور کیا ہے۔آپ خود بتائیے میری محنت کی کمائی ہوئی دولت میرے بعد ان لوگوں کو مل جائے گی جن سے مجھے دلی نفرت ہے۔میں اس لڑکے سے زیادہ اس عورت سے نفرت کرتا ہوں جس نے میرے بھائی کو مجھ پر ترجیح دی۔اس نے بڑی عظمتوں کا اظہار کیا، دولت کو ٹھکرا دیا۔عظیم عورت ہونے کا ثبوت دیا، میرا انتظار نہیں کیا۔مجھے قبول نہیں کیا۔اب زندگی بھر ایڑیاں رگڑتی رہے، میں بھلا اپنی دولت اس کی اولاد کو کیوں دوں گا؟''

''ان لوگوں کو آپ کی واپسی اور حیثیت کا علم ہے۔اور اگر ہے تو کیا انہوں نے کبھی آپ سے کسی قسم کی مالی امداد حاصل کرنے کی کوشش کی.....؟''

''میری ان سے کوئی ملاقات نہیں ہوئی ہے، بس اتفاقیہ طور پر مجھے اس لڑکے کی تصویر حاصل ہوگئی ہے۔وہ اس طرح کہ اس لڑکے نے ایک فرم میں ملازمت کی کوشش کی تھی اور اس کے لیے ایک درخواست دی تھی، جس میں درخواست گزار کی تصویر بھی مانگی گئی تھی۔میرے دوست نے صرف اس بنیاد پر تصویر کے خدوخال میرے چہرے سے ملتے ہیں، یہ تصویر مجھے دکھائی تھی اور کہا تھا کہ یہ میری نوجوانی کی تصویر معلوم ہوتی ہے۔لیکن اصل میں یہ مجھ سے زیادہ میرے بھائی ساجد حسین کی نوجوانی کی تصویر ہے۔خیر اس طرح یہ تصویر میرے پاس رہ گئی ورنہ مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔''

جس نوجوان کی تصویر اکبر حسین صاحب نے فاروق صاحب کو دکھائی تھی، وہ ایک اچھی شکل وصورت کا طرح دار نوجوان تھا۔چہرے پر نوجوانی کی شوخی اور معصومیت بکھری ہوئی تھی۔آنکھوں سے کھلنڈرے پن کا احساس ہوتا تھا۔تصویر زیادہ پرانی نہیں تھی۔فاروق بیگ دیر تک اس تصویر کو دیکھتے رہے تھے۔

بوڑھے بزنس مین کو احمق سمجھنا خود اپنی حماقت ہوتی اس لیے انہوں نے زیادہ چھان بین نہیں کی اور تصویر اکبر حسین صاحب کو واپس کردی لیکن نوجوان کے خدوخال ان کے ذہن میں محفوظ ہوگئے تھے۔اکبر حسین صاحب نے وصیت نامے پر دستخط کردیے اور قانونی کارروائیوں کے لیے فاروق بیگ نے اسے اپنی تحویل میں لے لیا اور اکبر حسین صاحب کو یقین دلایا کہ بہت جلد وہ اس سلسلے کی بقیہ کارروائی کی تکمیل بھی کرلیں گے۔ویسے اکبر حسین صاحب کی صحت اب قدرے بہتر معلوم ہوتی تھی۔غرضیکہ یہ سارے معاملات اب تک فاروق بیگ کی خواہش کے مطابق ہی طے ہوتے رہے تھے۔

اس شام انہوں نے اپنی بیٹی رومانہ کو اپنے پاس طلب کیا اور اسے لے کر کوٹھی کے اوپری حصے میں ایک نسبتاً کھلی جگہ جا بیٹھے۔رومانہ اپنے باپ سے بہت زیادہ مانوس تھی اور ان کے ذاتی معاملات میں بھی دلچسپی لیا کرتی تھی۔عموماً فاروق بیگ اپنے الجھے ہوئے پیچیدہ کیسوں میں رومانہ سے بحث کرکے نکتہ نکالا کرتے تھے۔اس وقت بھی رومانہ نے یہی سمجھا کہ فاروق بیگ صاحب اس سے کسی خاص موضوع پر گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔وہ مسکراتی ہوئی نگاہوں سے باپ کی طرف دیکھنے لگی پھر اس نے کہا۔

''میرا خیال ہے ڈیڈی، کوئی الجھا ہوا کیس آپ کے پاس آگیا ہے؟''

''ہاں رومانہ یہی سمجھ لو لیکن اس بار کیس بہت الجھا ہوا ہے اور تمہیں بہت غور وخوض کرکے میرے اس کیس میں میری

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

مدد کرنی ہے۔ ویسے ذیشان کیسا ہے..... کب سے ملاقات نہیں ہوئی اس سے تمہاری؟'' فاروق بیگ نے اپنے ہونے والے داماد کے بارے میں پوچھا۔

''ذیشان ٹھیک ہیں ڈیڈی، اکثر ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ ہاؤس جاب مکمل ہونے کے بعد کسی اچھے اسپتال میں ایڈجسٹ ہونا چاہتے ہیں۔ ویسے ان کے دل میں اس بات کی بھی شدید آرزو ہے کہ اپنا کوئی کلینک کھولیں۔ ظاہر ہے ابھی یہ ممکن نہیں ہے۔''

''ممکن ہوسکتا ہے بشرطیکہ تم اس کی مدد کرنا چاہو۔'' فاروق بیگ نے پُراسرار انداز میں کہا تو رومانہ چونک کر انہیں دیکھنے لگی۔

''میں سمجھی نہیں۔''

''دیکھو بھئی، میں خود بھی یہی چاہتا ہوں کہ تم لوگوں کا مستقبل شاندار ہو۔ جو کچھ میرے پاس ہے وہ تمہارا ہی ہے بیٹی لیکن وہ اتنا نہیں ہے کہ وہ ذیشان کے خوابوں کی تعبیر بن سکے۔ ہاں اس کے لیے میرا ذہن اور تمہاری کارکردگی کارآمد ہوسکتی ہے۔ اصل میں ذرا سی گڑبڑ ہوگئی اگر ذیشان سے تمہاری منگنی نہ ہوئی ہوتی تو میں ایک اور ہی کھیل کھیلتا لیکن اب تو یہ سوچنا بھی حماقت ہے۔ اصل میں میرے ذہن میں ایک منصوبہ ہے، اس پر تم سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔''

رومانہ کو باپ کی بات بڑی عجیب لگی' ذیشان سے اگر منگنی نہ ہوئی ہوتی تو وہ کوئی اور کھیل کھیلتے۔ بہرطور وہ سوالیہ نگاہوں سے فاروق بیگ کو دیکھنے لگی، فاروق بیگ پُرخیال انداز میں بولے۔

''اس دنیا میں ایسے ایسے الٹے سیدھے لوگ ہوتے ہیں کہ بعض اوقات یقین نہیں آتا کہ ان کا تعلق اس دنیا سے ہے۔ میرے ایک کلائنٹ ہیں اکبر حسین صاحب، بہت بڑے آدمی ہیں۔ کروڑوں روپے کی دولت ہے ان کے پاس اور یہ دولت اس شخص نے اپنے قوتِ بازو سے حاصل کی ہے۔ یہاں بڑی جائدادیں ہیں اور بینک بیلنس بھی بہت بڑا ہے لیکن جانتی ہو اس شخص کا اس دنیا میں کوئی بھی نہیں ہے۔ نہ بیوی، نہ بچے، نہ کوئی اور۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگ اس قدر تنہا ہونے کے باوجود اتنی دولت کیوں کما لیتے ہیں اور پھر طرّہ یہ کہ انتہائی کنجوس آدمی ہے، پائی پائی بچا کر رکھتا ہے۔''

''یہی تو اس کی دولت کا راز ہے ڈیڈی۔''

''ہاں، یہ بھی کہہ سکتی ہو تم۔ بہرطور اس دولت کا وارث کوئی نہیں ہے اور وہ شخص اس دولت کو ٹرسٹ کر دینا چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے اپنے نام سے ایک ٹرسٹ بنائے اور اپنی تمام دولت کا یہ مصرف کرے۔''

''ویری گڈ، بہرحال ایک اچھا ارادہ ہے اس کا۔ ڈیڈی آپ کا کیا خیال ہے اس بارے میں؟''

''اس کا ایک اور پہلو بھی ہے۔ اس داستان کا ایک اور حصہ بھی ہے اور وہ حصہ ہے اس کی ایک محبوبہ جس نے اس سے شادی کرنے کے بجائے اس کے غریب بھائی سے شادی کرلی اور اسے ٹھکرا دیا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس وقت وہ اتنا دولت مند نہیں تھا بلکہ دولت کے حصول کی کوششوں میں مصروف تھا۔ اس عورت نے اس کے بھائی سے شادی کرلی اور جب اکبر حسین کو یہ علم ہوا تو اس کے دماغ میں آگ سلگ اٹھی۔ بہرحال کوئی انتقامی کارروائی تو اس نے نہیں کی کیونکہ اس ذہن کا آدمی نہیں تھا لیکن اس نے یہ فیصلہ کرلیا کہ اپنی دولت میں سے اپنے بھائی اور اپنی محبوبہ یعنی عورت جو اب اس کی بھاوج بن چکی تھی کو ایک پیسا بھی نہیں دے گا۔ وہ لوگ نہایت کسمپرسی کی زندگی بسر کرتے رہے۔ یہاں تک کہ اس کے بھائی ساجد حسین کا انتقال ہوگیا۔ اس کا ایک بیٹا ہے جو اب نوجوان ہو چکا ہے، وہی غربت کی زندگی ہے اس کی اور وہ بے بسی سے اپنا مستقبل تلاش کرتا پھر رہا ہے۔ اکبر حسین بیمار آدمی ہے، عارضۂ دل کا شکار۔ وہ یہ چاہتا ہے کہ اس کی دولت سے ایک ٹرسٹ بن جائے تاکہ اس کی موت کے بعد اس کے واحد حق دار یعنی اس کے بھتیجے کو کچھ نہ مل سکے۔''

''اوہ..... بہرحال اس کی اپنی دولت ہے ڈیڈی۔ وہ اس کا جو کچھ بھی کرنا چاہے کرے۔''

''یہ تو تم نے بالکل ٹھیک کہا لیکن اتنی بڑی دولت اس طرح ضائع ہوجائے تو کیا یہ مناسب ہے؟''

''میں سمجھی نہیں۔''

''وہ میرا کلائنٹ ہے اور ابھی وصیت نامہ تیار ہی ہوا ہے۔ میں چاہوں تو اس وصیت نامے کو بہت عرصے ملتوی کیے رکھ سکتا ہوں اور اس عرصے میں رومانہ میری آرزو ہے کہ ایسا ذریعہ پیدا ہوجائے جس سے ہم اس دولت پر قبضہ جما سکیں۔ ٹرسٹ میں جانے سے روکنے کے لیے ہمارا اس دولت پر قابض ہونا ضروری ہے اور اس کے لیے ہمیں کوئی ایسی چال چلنا ہوگی جس سے ہمارا یہ کام بن جائے۔ اصل میں، میں نے ذیشان کے کلینک کی بات اس لیے کی تھی کہ اگر تم چاہو اور اس دولت کے حصول میں میری مدد کرو تو ذیشان

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

کے لیے کلینک بن جانا کوئی مشکل کام نہیں ہوگا۔'' رومانہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے اپنے باپ کو دیکھنے لگی، اس نے کہا۔

''ڈیڈی! کیا یہ مجرمانہ حرکت نہیں ہوگی؟''

''اس سلسلے میں اگر مجھ سے کوئی تقریر سننا چاہتی ہو تو دوسری بات ہے ورنہ اتنی سنجیدگی سے نہ سوچو۔''

''آپ نے کہا تھا کہ اگر میری منگنی ذیشان سے نہ ہوئی ہوتی تو؟''

''ہاں تو اس وقت بڑی آسانی سے میں تم سے یہ کہہ سکتا تھا کہ اس نوجوان کو تلاش کرو اور اسے اپنے جال میں گرفتار کرو اور میں اس سے تمہاری شادی کردوں۔ اس دولت کے حصول سے پہلے اور اس کے بعد باقی کام میرا رہ جاتا ہے پھر مجال تھی کہ یہ کہیں باہر نکل سکتی تھی، لیکن میں ذیشان سے بھی مخلص ہوں اور ایسی کسی احمقانہ حرکت کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔''

''نہیں ڈیڈی! ذیشان..... ذیشان.....'' رومانہ شرم کی وجہ سے اپنا جملہ پورا نہ کرسکی۔

''جانتا ہوں، بہت غور کیا ہے میں نے۔ تمہاری وہ سرپھری دوست اب کس حال میں ہے؟''

''کون..... مہوش کی بات کررہے ہیں آپ؟''

''بالکل..... بالکل..... اس لڑکی کے خیالات بڑے باغیانہ ہیں۔ معاشرے سے اکتائی ہوئی ہے وہ، میں نے تمہاری اور اس کی گفتگو سنی ہے۔ بلکہ اس دن اس نے میرے سامنے جو گفتگو کی تھی اس نے میرے ذہن میں یہ تاثر قائم کیا تھا کہ یہ لڑکی اگر اسی انداز میں سوچتی رہی تو کبھی نہ کبھی کوئی جرم کر بیٹھے گی۔''

رومانہ کی آنکھیں خیالات میں ڈوب گئیں۔ مہوش اس کی گہری دوست تھی، ایک نوجوان خوبصورت لڑکی..... لیکن مفلس اور بے بسی کا شکار، اس دنیا میں ماں کے علاوہ اس کا کوئی نہ تھا۔ پھر ماں بھی چل بسی اور اب مہوش اس دنیا میں تنہا رہ گئی تھی۔ بہت تیز فطرت کی لڑکی تھی اور کہتی تھی کہ دنیا میں اگر انسان دولت مند نہ ہو تو اسے خودکشی کرلینا چاہیے، وہ بس ایسی ہی باتیں کرتی رہتی تھی، رومانہ سے اکثر اس کی ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں اور رومانہ کبھی کبھی اس کی مالی امداد بھی کردیا کرتی تھی۔ بہت ہی گہری دوستی تھی ان دونوں کے درمیان۔ فاروق بیگ نے کہا۔

''کیا خیال ہے تمہارا رومانہ، وہ لڑکی صرف زبانی گفتگو کرسکتی ہے یا عملی طور پر بھی کوئی کام سرانجام دے سکتی ہے؟''

رومانہ نے پُرخیال انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ڈیڈی! اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ وہ جنون کی حد تک اس بات کی قائل ہے کہ انسان جیے تو دولت مند ہوکر جیے ورنہ اسے جینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ مجھ سے بہت سی باتیں کرتی رہتی ہے، وہ کہتی ہے کہ کوئی قبر زدہ بوڑھا، لیکن دولت مند ہو اس سے بخوشی شادی کی جاسکتی ہے۔''

''کیا وہ لڑکی اس سلسلے میں کارآمد ہوسکتی ہے؟'' فاروق بیگ نے پُرخیال نگاہوں سے بیٹی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''مگر ڈیڈی منصوبہ کیا ہے..... یہ تو بتایئے؟'' رومانہ نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔ یہ بات اس کے لیے بہت خوش کن تھی کہ کوئی ایسا ذریعہ نکل سکتا ہے کہ ذیشان کو اپنا کلینک بنانے کا موقع مل جائے۔

''منصوبہ یہ ہے کہ ہم اس لڑکے کو ٹریپ کریں گے جو مستقبل میں اکبر حسین کی دولت کا مالک بننے والا ہے۔ اکبر حسین اگر طبعی موت مرجاتا ہے تو ٹھیک ہے، اس کے لیے ایک پیریڈ مقرر کرلیا جائے اور اگر اسے مرنے میں دیر لگے تو پھر اسے راستے سے ہٹا دینا ہوگا۔ اس وصیت نامے کی تکمیل سے پہلے، اگر وصیت نامہ باقاعدہ رجسٹر ہوگیا تو پھر صورتِ حال ہمارے ہاتھ میں نہیں رہے گی۔'' رومانہ نے ایک جھرجھری سی لی، پھر آہستہ سے بولی۔

''مگر ڈیڈی یہ.....''

''رومانہ! احمقانہ باتیں مت سوچو۔ میں نے بڑے اعتماد کے ساتھ تم سے اس گفتگو کا آغاز کیا ہے۔ ایک قریب المرگ آدمی اگر وقت سے کچھ پہلے اس دنیا سے چلا جاتا ہے تو کون سی قیامت آجائے گی۔ جانا تو ہے ہی اسے اور پھر ہم تو یہ کہتے ہیں کہ وہ خود چلا جائے۔ اور اس کے لیے کچھ طریقہ کار دریافت کیے جاسکتے ہیں۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ خیر مطلب یہ ہے کہ مہوش کو کسی ایسے جال میں پھانس لو جس سے وہ ہمارے چنگل میں رہے۔ اس سے سیدھی سیدھی بات کرلو۔ اسے حاصل شدہ دولت میں سے اتنا حصہ مل جائے گا کہ وہ بھی عیش وعشرت کی زندگی بسر کرسکے گی لیکن اسے مکمل طور پر اپنے آپ کو ہمارے ہاتھوں فروخت کرنا ہوگا۔ اتنا زیادہ کہ وہ کبھی ہم سے منحرف نہ ہوسکے۔ اس کے بعد بقیہ کام میرا ہے۔ وصیت نامہ اس انداز میں تیار ہوگا کہ اکبر حسین صاحب یہ آرزو کریں گے کہ ان کی دولت ان کے بھتیجے کے نام منتقل کردی جائے اور یہ کام میں کرلوں گا۔ اس کے لیے تم بالکل بے فکر رہو۔ ویسے بھی قانونی طور پر وہی دولت کا جائز حق دار قرار پائے گا اور اس کا یہ حق کوئی بھی

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

نہیں چھین سکتا۔''

''مہوش سے بات کرنی پڑے گی ڈیڈی..... ویسے منصوبہ بہت شاندار ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ اس طرح ہمارا کام بہ آسانی بن جائے گا۔''

''اب ہمیں نہایت ہوشیاری سے دو کام کرنے ہیں۔ پہلی بات تو یہ اس نوجوان کی تلاش۔ دوسری بات یہ کہ مہوش کو بہت سنجیدگی سے اس بات پر آمادہ کرو کہ اس کام کو وہ رازداری سے سرانجام دے سکے گی یا نہیں۔''

''میرا خیال ہے ڈیڈی مہوش بہت کام کی لڑکی ہے۔ شرط بس یہی ہے کہ وہ ہمارے چنگل میں رہے۔''

''اس کے لیے بھی متعدد منصوبے ذہن میں ہیں جن کی تفصیل تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔''

''او کے ڈیڈی! آپ بالکل مطمئن رہیں۔ میں اس کام کو پوری خوش اسلوبی سے سرانجام دینے کی کوشش کروں گی۔'' رومانہ نے کہا اور فاروق بیگ پُرخیال انداز میں گردن ہلانے لگا۔

☆☆☆

دونوں کے چہروں کے رنگ پیلے پڑے ہوئے تھے، دن کے بارہ بجے ہی بوٹ بیسن پر پہنچ گئے تھے۔ نہ کھانے کو دل چاہ رہا تھا نہ پینے کو۔ بدن پر ہلکی ہلکی کپکپی طاری تھی۔ جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا، جسم کی گویا جان نکلتی جا رہی تھی۔ پولیس کی ایک موبائل وہاں پہنچی تو دونوں جیسے گرتے گرتے بچے۔ موبائل نے ایک چکر لگایا ان کی جانب دیکھا بھی نہیں تھا، لیکن گاڑی کی آواز سر میں دھمک رہی تھی۔ بس یہ احساس ہو رہا تھا کہ ابھی پولیس والے نیچے اتریں گے، دونوں کو گردنوں سے پکڑیں گے اور اٹھا کر گاڑی میں بٹھا لیں گے۔ دو خطرناک بلیک میلر گرفتار ہو گئے۔ اخبارات میں تصاویر چھپیں گی۔ گھر والے حیرت سے سوچیں گے کہ یہ لوگ یہ کاروبار کر رہے تھے۔ نہ جانے کیا کیا خیالات دل میں آ رہے تھے۔ موبائل چلی گئی تو دونوں کی جان میں جان آئی۔ شاہ میر نے کہا۔

''یار! وقت کتنا آہستہ آہستہ گزر رہا ہے آج تو یوں لگتا ہے کہ ایک ایک لمحہ ایک ایک گھنٹا ہو گیا ہے۔''

''کچھ نہیں، اصل میں ہم بہت زیادہ خوفزدہ ہو گئے ہیں، یار سنبھالو اپنے آپ کو اس طرح کاروبار ہو گا؟ یار بھلا وہ عام سی لڑکی ہمارا کیا بگاڑے گی۔ اگر کسی ایسے بزنس مین یا صنعت کار کو بلیک میل کرنا پڑا جس سے بڑی رقم ملنے کی توقع ہو تو کیا اس طرح کام کریں گے ہم لوگ؟''

''لعنت ہے ہم پر۔''

دونوں اپنے آپ پر لعنتیں بھیجنے لگے اور اپنی کیفیت درست کرنے لگے۔ منصور نے کہا۔

''یار! مجھے بھوک لگی ہے۔''

''ابے چپ ہو جا۔ کھا پی لیں گے تو بدن بھاری پڑ جائیں گے نہ جانے کیسے حالات کا سامنا کرنا پڑے۔ آدمی کو ہلکا پھلکا ہونا چاہیے، بس ٹھیک ہے برداشت کرو۔ بیٹے پچاس ہزار روپے کی کمائی ایسے نہیں ہوتی۔''

وقت گزرتا رہا، پھر خدا خدا کر کے وہ مقررہ وقت آیا۔ دونوں نے بائیک کافی فاصلے پر ایک جگہ کھڑی کی ہوئی تھی، پھر لڑکی نیچے اتر آئی۔ چست سا لباس پہنے ہوئے تھی۔ بال ایک مخصوص انداز میں باندھے ہوئے تھے۔ پیروں میں نہایت نرم کینوس کی پمپی تھی۔ وہ اپنی جگہ کھڑی ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگی پھر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس جگہ پہنچ گئی جہاں اس کی تصاویر بنائی گئی تھیں۔ اس کی نگاہیں چاروں طرف بھٹک رہی تھیں اور دونوں اس کا گہرا جائزہ لے رہے تھے۔ لڑکی کی نگاہوں سے بچنے کی کوشش بھی کر رہے تھے پھر جب یہ اطمینان ہو گیا کہ کوئی خطرناک صورت حال نہیں ہے تو دونوں آہستہ آہستہ اس کی جانب بڑھے اور کچھ دیر بعد اس کے سامنے پہنچ گئے۔ لڑکی نے چونک کر انہیں دیکھا۔ دیکھتی رہی اور پھر اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''آپ لوگ بلیک میلر ہیں؟'' اس نے سوال کیا۔

''زیادہ ہوشیار بننے کی کوشش نہ کرو، رقم لائی ہو؟''

''ہاں، آپ لوگ نیگیٹو اور تصویر لائے ہیں؟''

''دونوں کا تبادلہ ایک ساتھ ہی ہو گا، پہلے رقم دو۔''

''ذرا تصویریں تو دکھاؤ کیسی آئی ہیں؟'' لڑکی نے سوال کیا۔

''تم اس کا حق نہیں رکھتیں لڑکی..... وقت ضائع کرنے کی کوشش مت کرو۔ صرف ایک منٹ، اس کے بعد ہم لوگ یہاں سے چلے جائیں گے۔''

''ارے ارے۔ یہ تمہاری آواز کیوں کانپ رہی ہے۔ افوہ تم پر تو لرزہ طاری ہو رہا ہے۔ اس طرح کرتے ہیں بلیک میلنگ..... کب سے یہ دھندا کر رہے ہو؟''

''تم مسلسل بکواس کیے جا رہی ہو، میں پوچھتا ہوں پیسے لائی ہو یا نہیں؟'' منصور دہاڑا تو لڑکی کے منہ سے ہنسی چھوٹ گئی۔

''اپنی حالت تو سنبھالو، اناڑی معلوم ہوتے

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

ہو، ایسے کرتے ہیں بلیک میلنگ؟ کوئی ڈھنگ کا کام کیوں نہیں کرتے۔ نوکری وکری کرو، نہ تمہاری عمریں ایسی ہیں اور نہ تمہاری شکل وصورت۔''

''میں دس تک گنتی گنتا ہوں، بس اس کے بعد جو کچھ ہوگا اس کی ذمے دار تم خود ہوگی۔''

''دیکھو، یہ سب بہت برا ہے۔ بعض اوقات اس کے نتائج غیر متوقع نکل آتے ہیں۔ یہ پتا نہیں کس گدھے نے تمہیں اس کاروبار کا مشورہ دیا ہے۔ چلو خیر اس کے بعد آئندہ ایسی کوئی حرکت نہ کرنا۔ شاباش۔''

''ایک، دو، تین، چار، پانچ.....''

''نہیں نہیں۔ گنتی گننے میں بہت جلدی کررہے ہو، میں اصل میں تمہیں تمام صورتِ حال سمجھانا چاہتی ہوں۔'' لڑکی نے کہا اور دوپٹا شانوں سے اتار کر کمر پر کس لیا۔ اس نے ایک طرف کھڑے ہوکر جوتے بھی اتار دیے تھے۔ منصور نے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا اور پھر شاہ میر کو دیکھنے لگا جو خود بھی لڑکی کی ان حرکات پہ حیران تھا۔ لڑکی نے اچانک ہی حلق سے کچھ آواز نکالیں اور دونوں ہاتھ سیدھے کرکے کھڑی ہوگئی پھر اس نے کہا۔

''اب تم دونوں اپنی ہڈیاں پسلیاں تڑوائے بغیر یہاں سے نہیں جاسکو گے، اصل میں، میں ایک نیک کام کررہی ہوں۔ تمہیں برے راستے پر چلنے سے روک رہی ہوں۔''

''کک..... کیا بکواس ہے۔ تم کیا بدتمیزی کررہی ہو؟''

''کراٹے سینٹر سے میں بلیک بیلٹ ہوں، یقین نہ آئے تو یہ دیکھو۔''

اچانک ہی لڑکی اپنی جگہ سے اچھلی اور اس نے کراٹے کا ایک ہاتھ شاہ میر کے شانے پر مارا، شاہ میر کا گھٹنا زمین سے ٹک گیا تھا۔ منصور کے منہ سے کوئی آواز بھی نہیں نکل سکی تھی کہ لڑکی کی لات اس کی کمر پر پڑی اور وہ اچھل کر شاہ میر پر جا گرا۔ شاہ میر نے اسے زور سے دھکا دیا اور پھر کھڑا کیا لیکن لڑکی نے پھر پلٹ کر ان پر حملہ کردیا۔ اس کے حلق سے مسلسل ہا ہو کی آوازیں نکل رہی تھیں اور اس کے ساتھ ہی دونوں کی پٹائی ہورہی تھی۔ چار چھ ہاتھوں ہی میں دونوں کے حلیے بگڑ گئے۔ وہ اٹھنے کی کوشش کرتے تو لڑکی کی ایک نہ ایک لات انہیں پھر زمین پر گرا دیتی۔ دونوں اسے پکڑنے کی کوشش بھی کررہے تھے۔ انہوں نے ہاتھ پاؤں بھی چلائے تھے، لیکن جو ڈوکراٹے سے ان کی کوئی واقفیت نہیں تھی۔ نسوانی ہاتھوں میں یہ کرختگی ناقابلِ یقین تھی۔ منصور کی ہمت جواب دے گئی۔ اس نے ایک لمبی چھلانگ لگائی اور شاہ میر سے چیخ کر بولا۔

''بھاگو، دوڑو.....'' شاہ میر خود اس مصیبت میں گرفتار تھا، لڑکی کھڑا ہونے دیتی تو وہ بھاگنے کی ہمت کرتا، منصور کو یہ موقع مل گیا تھا۔ دفعتاً ہی شاہ میر نے زور سے آواز نکالی۔

''پولیس۔''

لڑکی ایک لمحے کے لیے دوسری جانب متوجہ ہوئی اور اس موقع سے فائدہ اٹھا کر شاہ میر نے بھی دوڑ لگادی۔ لڑکی پیٹ پکڑ پکڑ کر ہنس رہی تھی اور وہ دونوں بائک کی جانب دوڑ رہے تھے، پھر بڑی بدحواسی کے عالم میں انہوں نے بائک اسٹارٹ کی۔

منصور بائک چلا رہا تھا اور اس وقت اپنی شاندار مہارت کا ثبوت دے رہا تھا۔ انہوں نے راستے میں کوئی ایسا رخ اختیار نہیں کیا تھا جہاں سے وہ لڑکی تعاقب کرکے انہیں پکڑ لے۔ دونوں کے جسموں پر شدید ضربیں پڑی تھیں اور یقینی طور پر وہاں سوجن پیدا ہوگئی تھی۔ چہرے بچ گئے تھے، یہی غنیمت تھا۔

بالآخر وہ کافی دور نکل آئے لیکن شکر تھا کہ لڑکی نے ان کا پیچھا نہیں کیا تھا۔ دونوں کی حالت خراب تھی۔ بلیک میلنگ کی پہلی ہی کوشش کا یہ نتیجہ نکلے گا، اس کا انہوں نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ ایک ہوٹل میں پہنچنے کے بعد انہوں نے لباس وغیرہ درست کیے۔ حالت بری ہورہی تھی۔ ایک دوسرے سے کچھ کہہ نہیں پارہے تھے۔ کچھ دیر بعد منصور نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''تقدیر ہی خراب ہے، کمبخت بلیک بیلٹ نکلی۔''

''اس کو چھوڑو، یہ بتاؤ ہوگا کیا۔ اس نے ہمیں پہچان بھی لیا ہوگا۔ جہاں بھی ملے گی پولیس کے حوالے کردے گی۔''

''میرا خیال ہے اس نے جو کچھ خود کرلیا ہے وہی کافی ہے۔ پولیس سے مدد لینے کی بھلا اس جیسی لڑکیوں کو کیا ضرورت پیش آسکتی ہے؟''

''لیکن چھوڑیں گے نہیں..... اسے زمانے بھر میں رسوا کرکے چھوڑیں گے۔''

''ہمارے پاس اس کے خلاف مواد موجود ہے۔''

''چائے منگواؤ یار..... پیسے ہیں؟''

''ہاں منگواتا ہوں۔''

''کچھ کھانے کو بھی منگوالینا۔ صبح سے کچھ بھی نہیں کھایا۔ میں تو دو توس اور ایک پیالی چائے پی کر چلا تھا۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

"تو میں نے کون سے انڈے پراٹھے کھائے تھے۔"

منصور نے کہا اور اس کے بعد انہوں نے ایک ایک بن مکھن چائے کے ساتھ منگوا کر کھایا اور چائے کی مزید ایک ایک پیالی اور پی تا کہ کم از کم کچھ تو تقویت پہنچے۔ جسم کے مختلف حصے درد کر رہے تھے۔ شاہ میر نے کہا۔

"یار جوڈو کراٹے سیکھنے چاہئیں۔"

"ابے بکواس مت کر، اب فیصلہ یہ کرنا ہے کہ ہمارا آئندہ کا قدم کیا ہوگا۔ اگر اس فیلڈ میں بھی ناکام رہے تو پھر کیا کرو گے؟"

"بیٹے میں نہ کہتا تھا کہ جو لوگ یہ سب کچھ کرتے ہیں وہ ہمارے جیسے معمولی لوگ نہیں ہوتے۔ جانے کیا کیا جتن کرنے کے بعد وہ اپنے اندر اتنی ہمت پیدا کرتے ہیں۔ مذاق اڑا رہی تھی کہ ہم کانپ رہے ہیں۔"

"ایسے نہیں چھوڑیں گے اسے۔ اس نے ہمارے ساتھ جو سلوک کیا ہے اس کا انتقام تو لیں گے اس سے۔ رسوا کر دیں گے اسے زمانے بھر میں۔ سمجھتی کیا ہے کراٹے ماسٹر خود کو۔" بالآخر یہ فیصلہ کیا گیا کہ اب اس کے گھر پہنچ کر اس کے لواحقین سے رابطہ قائم کیا جائے۔ پچاس ہزار کے مطالبے کو کسی قیمت پر نہیں چھوڑا جائے گا۔

☆☆☆

"سوچ لو مہوش، اس میں واقعی کوئی مذاق کا پہلو نہیں ہے.... اور تمہیں یہ سب کچھ نہایت ہوشیاری سے کرنا ہوگا۔ جلد بازی بالکل مت کرو۔ میں ایک بار پھر تمہیں سوچنے کا موقع دیتی ہوں۔ سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا۔" رومانہ نے مہوش سے کہا، مہوش بہت پُرجوش ہو رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"خدا کی قسم میں بالکل سنجیدہ ہوں، تمہیں شاید میری کیفیت کا صحیح اندازہ نہیں ہے۔ پچھلے دنوں کئی بار خودکشی کے بارے میں سوچ چکی ہوں.... زندگی سے عاجز ہوں، زندگی گزارنے کا کوئی راستہ نہیں ہے میرے سامنے۔"

"نہیں مہوش خودکشی حرام ہے۔ انسان کو اپنی زندگی میں.... جدوجہد کرنی چاہیے..... اگر اس میں بھی ناکامی ہو تو پھر خودکشی کرنے کا بہترین طریقہ ہے کہ کسی اور کو ہلاک کر دو خود کیوں مرو۔"

"تم میری زندگی کے تمام حالات جانتی ہو رومانہ، میں نہ تو عشق و محبت کی ماری ہوئی ہوں، نہ میرے حالات ایسے ہیں کہ دور دور تک کوئی سنہری مستقبل میرے سامنے ہو۔ اصل میں خود آگے بڑھ کر جام اٹھانے کی ہمت نہیں تھی مجھ میں، لیکن اگر کوئی ایسا مسئلہ میرے سامنے ہے تو اپنی تمام تر صلاحیتیں صرف کر دوں گی۔ میں بالکل مذاق نہیں کر رہی۔ تم دیکھ لینا کسی بھی مرحلے پر کمزور نہیں پڑوں گی تم سے۔"

"تو پھر ڈیڈی سے تمہاری ملاقات کرا دوں؟"

"بالکل کرا دو۔ ان سے کہہ دو کہ تم نے مجھے اچھی طرح ٹھونک بجا کر دیکھ لیا ہے۔ میں ان کی خواہش کے مطابق کام کرنے پر تیار ہوں۔"

رومانہ نے فاروق بیگ صاحب سے اس موضوع پر بات کی اور وہ دلچسپی سے بولے۔

"تم نے اسے کیا بتایا، ذرا مجھے تفصیل سے بتاؤ؟"

"میں نے اس سے یہی کہا ہے ڈیڈی کہ اسے ایک شخص سے عشق کا ڈراما رچانا پڑے گا۔ وہ شخص مستقبل میں کروڑپتی ہونے والا ہے۔ مہوش کو اس سے محبت کی پینگیں بڑھانی ہیں اور اسے اپنے جال میں گرفتار کرنا ہے۔ اسے اس شخص سے شادی بھی کرنی ہوگی۔ فی الحال وہ کیسے ہی حالات کا شکار ہے اس پر توجہ نہ دی جائے۔ بس ایسا کر لیا جائے کہ وہ مہوش کے شکنجے سے نکل نہ سکے۔ میں نے اسے تمام تفصیل بتا دی ہے ڈیڈی...... وہ پوری خوشی کے ساتھ تیار ہے۔"

"تم نے اسے یہ بتا دیا ہے کہ جو دولت اس شخص کے ذریعے حاصل ہوگی، اس پر اسّی فیصد ہمارا قبضہ ہوگا۔"

"ہاں ڈیڈی میں نے اسے بتا دیا ہے۔"

"تو پھر اسے کسی وقت مجھ سے ملوا دو۔"

"ایک سوال میرے ذہن میں اور آتا ہے ڈیڈی۔ وہ یہ کہ مہوش تو اس کام کے لیے فرض کیجیے تیار ہو جائے گی لیکن آپ اس نوجوان کو کیسے تیار کریں گے؟ دولت تو اسی کے نام پر ہوگی نا۔"

"یہ ذمے داری تم مجھ پر چھوڑ دو، میں یہ کام اپنے طور پر کر لوں گا۔"

رومانہ نے مہوش کو فاروق بیگ کے سامنے پیش کر دیا۔ فاروق بیگ بڑے سرد انداز میں اس سے ملے۔ انہوں نے بھاری آواز میں کہا۔

"تمہیں رومانہ نے تمام تفصیل بتا دی ہے اور یہ بات بھی تمہارے علم میں ہے کہ میں قانونی آدمی ہوں، کوئی بھی کام کچی بنیادوں پر نہیں کر سکتا۔ یہ مضمون بنایا ہے میں نے تمہارے لیے۔ اسے اپنی تحریر میں نقل کر دو۔ اس میں تم نے ایک بھیانک جرم کے ارتکاب کا اعتراف کیا ہے۔ یہ مضمون میرے پاس موجود رہے گا اور اگر تم نے اپنی بات سے پھرنے

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

.... کی کوشش کی تو یوں سمجھ لو کہ جیل کی سلاخوں کے علاوہ اور کچھ تمہاری زندگی میں نہیں ہوگا۔''

''ٹھیک ہے انکل، آپ مطمئن رہیں۔ میں رومانہ کو بتا چکی ہوں کہ میں کس حد تک جا چکی ہوں۔ میں آپ کے ہر حکم کی تعمیل کے لیے تیار ہوں۔''

''تو پھر یہ سمجھ لو کہ تمہاری پوری زندگی بہترین گزرے گی۔ اس کا ذمہ میں لیتا ہوں۔ لو یہ مضمون اس کاغذ پر نقل کر دو۔''

فاروق بیگ صاحب نے درحقیقت مہوش کو پوری طرح اپنے شکنجے میں جکڑ لیا تھا اور اس کا اس شکنجے سے نکلنا ممکن نہیں تھا۔

''بس اب آخری کام اور رہ گیا ہے، اس نوجوان کی تلاش..... اور یہ مشکل نہیں ہوگا۔ کسی طرح اکبر حسین سے ہی اس بارے میں معلومات حاصل کروں گا۔ اس کے بعد اس ڈرامے کی ڈائریکشن تمہارے سپرد کر دی جائے گی۔''

☆☆☆

''تیار ہو؟'' منصور نے شاہ میر سے پوچھا۔

''ہاں بالکل..... جب اوکھلی میں سر دیا ہے تو موسلوں کا کیا ڈر۔ ہم ایسے تو نہیں چھوڑیں گے اسے، کمبخت اتنی خوبصورت ہے، بظاہر نرم و نازک دکھائی دیتی ہے لیکن ہاتھ تھے کہ فولاد۔'' منصور ہنسنے لگا۔

دونوں پوری طرح رضامند تھے کہ لڑکی کو کم از کم کیفرِ کردار تک پہنچا کر ہی دم لیا جائے۔ دونوں پوری طرح تیار ہو کر فاروق بیگ کی کوٹھی پہنچ گئے۔ پہلے ایک جگہ سے ٹیلی فون کر کے معلوم کر لیا گیا تھا کہ فاروق بیگ گھر پر موجود ہیں یا نہیں۔ بہرحال فاروق بیگ کے گھر تک پہنچنے میں انہیں کوئی خاص دقت نہیں ہوئی تھی۔ فاروق کے ملازم نے انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ بیرسٹر صاحب یہی سمجھے کہ کوئی کلائنٹ کیس لے کر آیا ہے۔ بڑے کروفر سے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے اور دونوں نوجوانوں کو دیکھا لیکن اچانک ہی ان کے چہرے کی رگیں کھنچ گئیں۔ بالغ نگاہ آدمی تھے ایک نظر میں بہت کچھ بھانپ لیتے تھے۔ انہوں نے شاہ میر کو دیکھا، ان کا اندازہ بالکل غلط نہیں تھا۔ یہ وہی نوجوان تھا جس کی تصویر اکبر حسین نے اپنے بھتیجے کی حیثیت سے دکھائی تھی۔ فاروق بیگ حیرت سے ایک لمحے کے لیے گنگ رہ گئے۔ پھر انہوں نے نہایت پُرتپاک انداز میں دونوں نوجوانوں سے ہاتھ ملایا اور بیٹھ گئے۔

''آپ کا نام فاروق بیگ ہے؟''

''ہاں بیرسٹر فاروق بیگ، کہیے میں آپ لوگوں کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''

''جناب آپ ایک مشکل میں پھنسنے والے ہیں۔ ہم نیک دلی سے آپ لوگوں کو مشکل سے نکالنا چاہتے ہیں۔''

''خیریت، آج تک تو میں لوگوں کو مشکلات سے نکالتا آیا ہوں، آپ پہلے لوگ ہیں جو مجھے کسی مشکل سے نکالنے آئے ہیں، تاہم وہ مشکل کیا ہے، آپ بتانا پسند کریں گے؟''

جواب میں منصور نے جیب سے ایک لفافہ نکالا اور کچھ تصویریں ان کے سامنے ڈال دیں، فاروق بیگ ان تصویروں کو اٹھا کر دیکھنے لگے۔ ایک لمحے کے لیے ...وہ چونکے تھے لیکن دوسرے لمحے نارمل ہو گئے تھے۔

''آپ نے پہچان لیا ہوگا کہ یہ آپ کی صاحبزادی ہیں؟''

''ہاں اور اس کا نام رومانہ ہے۔''

''آپ کو ان کے ساتھ اس نوجوان کو دیکھ کر تعجب نہیں ہوا؟''

''بالکل نہیں کیونکہ میری بیٹی کے ساتھ جو نوجوان ہے، وہ میرا ہونے والا داماد ہے، یعنی میری بیٹی کا منگیتر ان کی منگنی پچھلے سال ہی کی ہے میں نے۔''

دونوں کے منہ بھاڑ کی طرح کھل گئے تھے، چہرے فق ہو گئے تھے اور آنکھوں سے مایوسی ٹپکنے لگی تھی۔

''دو..... داماد۔''

''جی ہاں..... ماشاء اللہ ڈاکٹر ہے اور ابھی ہاؤس جاب کر رہا ہے۔ بہت جلد اس کا ہاؤس جاب مکمل ہو جائے گا اور کچھ عرصے کے بعد میں ان دونوں کی شادی کر دوں گا لیکن یہ تصویریں آپ کے پاس کہاں سے آئیں؟''

دونوں کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ وہ احمقوں کی طرح بیٹھے ایک دوسرے کی صورت دیکھتے رہے، تب فاروق بیگ نے کہا۔

''میں اس سے آگے جاننا چاہتا ہوں نوجوان، بے دھڑک ہو کر آگے کی بات کرو۔ او ہو کیا تم مجھے یہ بتانے تو نہیں آئے کہ میری بیٹی چھپ چھپ کر کسی نوجوان سے ملاقات کرتی ہے۔''

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ دروازے سے رومانہ اندر داخل ہوئی۔ اسے دیکھ کر دونوں کے اوسان خطا ہو گئے۔ رومانہ نے بھی انہیں دیکھا اور اس کے منہ سے چیختی ہوئی سی آواز نکلی۔

''تم۔''

''رومانہ! یہ میرے معزز مہمان ہیں۔ بیٹھو بیٹھو..... تم

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

انہیں جانتی ہو؟''

''ڈیڈی بلیک میلر ہیں یہ دونوں۔انہوں نے میری کچھ تصاویر بنائی ہیں اور اس کے بعد مجھے فون کر کے بلیک میل کرنا چاہتے تھے۔میری ان سے ایک ملاقات ہو چکی ہے،ان تصویروں کے عوض پچاس ہزار روپے کا مطالبہ کر رہے تھے۔اوہو.....شاید تصویریں لے کر آپ کے پاس پہنچ چکے ہیں۔''

''بیٹھو بیٹھو،ویسے یہ دونوں بہت اچھے فوٹو گرافر ہیں،دیکھو کس خوبصورتی سے تمہاری تصاویر بنائی ہیں۔''

رومانہ کے چہرے پر غصے کے آثار تھے،اس نے غراتی ہوئی آواز میں کہا۔

''اور میرے ہاتھوں مار کھانے کے بعد شاید تم میرے ڈیڈی کو یہ بتانے آئے ہو.....گڈ۔ڈیڈی!اب یہ ان تصویروں کے عوض آپ سے رقم کا مطالبہ کریں گے۔''

''مہمان ہیں ہمارے رومانہ،بچے ہیں،میں ان کی اس حرکت پر ناخوش نہیں ہوں۔بلیک میلنگ کرنے پر اتر آئے ہیں،نہ جانے اس کی کیا وجوہات ہوں۔بھئی نوجوان نسل اس وقت بڑی مشکلات سے گزر رہی ہے۔ہم ان نوجوانوں کو اس کا قصوروار قرار نہیں دیتے۔تم بھول جاؤ اس بات کو کہ انہوں نے تمہیں بلیک میل کرنے کی کوشش کی تھی۔ویسے بلیک میلنگ کے لیے کتنی رقم طلب کی تھی انہوں نے تم سے؟''

''پچاس ہزار۔''رومانہ دانت پیس کر بولی۔

منصور اور شاہ میر کے بدن سے جان ہی نکل گئی تھی،انہیں یہ آخری مایوسی برداشت کرنی پڑی تھی۔اتنی محنت کی،اخراجات بھی ہوئے اور نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔وہ تو یہ شخص غیر معمولی طور پر نرم مزاج ہے ورنہ اس وقت نہ جانے کیا ہو جاتا،البتہ رومانہ کے چہرے کی خشونت کم نہیں ہوئی تھی۔

''بھئی چائے وغیرہ پلواؤ ان لوگوں کو،نہ جانے کیوں مجھے ان سے بڑی محبت کا احساس ہو رہا ہے۔''

''ڈیڈی۔''رومانہ نے احتجاجی انداز میں کہا۔

''رومانہ!اگر میں کسی شخص کو اپنا مہمان کہتا ہوں اور تمہارا اس سے اختلاف ہے تو کیا تمہیں مجھ پر فوقیت حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے؟''

فاروق بیگ نے کسی قدر خشک لہجے میں کہا اور رومانہ پاؤں پٹختی ہوئی اٹھ گئی،بہ مشکل تمام منصور کے منہ سے نکلا۔

''نن.....نہیں جناب!ہم معافی چاہتے ہیں،بس ذرا غلط فہمی ہو گئی تھی،اجازت دیجیے۔''دونوں کھڑے ہو گئے۔

''بیٹھو۔''فاروق بیگ کرخت لہجے میں بولے تو دونوں اس طرح بیٹھ گئے جیسے ٹانگوں کی جان نکل گئی ہو،ان کے چہرے فق ہو رہے تھے۔

''جب میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ میں تمہیں عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں اور مجرم نہیں سمجھتا۔اگر تم پروفیشنل بلیک میلر ہوتے تو اتنا معمولی طریقہ کار اختیار نہ کرتے یا مکمل طور پر اپنے کلائنٹ کے بارے میں معلومات حاصل کیے بغیر فوراً ہی اس سے رقم کا مطالبہ نہ کر بیٹھتے۔اس کا مطلب ہے کہ تم باقاعدہ بلیک میلر نہیں ہو۔ہو سکتا ہے کسی مشکل وقت آپڑنے پر تم نے یہ فیصلہ کیا ہو۔''

''یہی بات ہے جناب!خدا کی قسم ب.....بالکل یہی بات ہے۔ہم طویل عرصے سے بیروزگار ہیں،نوکری کی ہر ممکن کوشش کر ڈالی۔لیکن نوکری ملنے کا نام نہیں لیتی،یوں سمجھ لیجیے کہ بس اب خودکشی کرنے پر آمادہ ہیں۔''

''میں جانتا ہوں بچو!میں جانتا ہوں۔وقت بہت سخت ہے،حالات بہت مشکل ہیں،بیٹھو ایک منٹ۔''فاروق بیگ نے کہا اور اٹھ کر ڈرائنگ روم سے باہر نکل گئے۔

''بھب.....بھاگ لو ورنہ پپ.....پولیس آتی ہوگی۔''منصور نے کہا۔''ہاں نکل چلو،ب.....بڑے میاں پولیس ہی کو ٹیلی فون کرنے گئے ہیں۔وہ چالاکی سے ہمیں گرفتار کرنا چاہتے ہیں۔''دونوں برق رفتاری سے اٹھے دروازے تک پہنچے۔خودکار دروازہ فاروق بیگ کے جانے کے بعد بند ہو گیا تھا۔لیکن انہیں یہ اندازہ نہیں تھا کہ اسے باہر سے بند کر دیا گیا ہوگا۔اندر سے اسے کھولنے کی کوشش ناکام رہی اور دونوں کی حالت مزید خراب ہو گئی،وہ چکرانے لگے۔شاہ میر نے آہستہ سے کہا۔

''دروازہ باہر سے بند کر کے گئے ہیں۔''

''بیوقوف تھوڑی ہیں کہ ہمیں بھاگنے کا موقع فراہم کر دیتے۔''

''اب کیا ہوگا؟''

''پھنس گئے،بس اور کیا ہوگا۔تصویریں بھی ہمارے پاس موجود ہیں،رنگے ہاتھوں پکڑے گئے ہیں۔گئے سال دو سال کے لیے۔''

''خدا نہ کرے،ہم.....میری تو ماں میرے بغیر مر جائے گی۔''شاہ میر نے رندھی ہوئی آواز میں کہا اور منصور اسے ہمدردی کی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

''ویسے اس میں کوئی شک نہیں ہے دوست کہ برے کام کے برے ہی نتائج ہوتے ہیں۔ ہم ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جنہیں یہ زندگی راس آجاتی ہے۔''

''بیٹھ جاؤ، اب تو کچھ بھی نہیں ہوسکتا۔ جو تقدیر میں ہوگا وہ ہو ہی جائے گا۔'' کچھ دیر کے بعد دروازے پر آہٹیں ہوئیں اور فاروق بیگ کمرے میں واپس آگئے۔ ان کے ہاتھ میں پانچ سو کے نوٹوں کی ایک گڈی تھی۔ انہوں نے اسے ان کے سامنے میز پر رکھ دیا۔ گڈی دیکھ کر دونوں کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ فاروق بیگ صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولے۔

''موجودہ وقت کی مشکلات میں اچھی طرح جانتا ہوں، تم نے ان تصویروں کی قیمت پچاس ہزار روپے ہی لگائی تھی نا؟ یہ پچاس ہزار روپے رکھ لو میری طرف سے، ایک بزرگ کا تحفہ سمجھ کر۔ اصل میں، میں بہت کشادہ ذہن کا مالک ہوں اور پھر میری بیٹی تعلیم یافتہ بھی ہے۔ وہ اپنے منگیتر کے ساتھ آزادانہ گھوم پھر سکتی ہے۔ آئندہ سال تو مجھے ان دونوں کی شادی کرہی دینی ہے۔ اس لیے میں نے اسے اجازت دے دی ہے۔ یہ کوئی ایسا کیس نہیں ہے جس پر تم کسی کو بلیک میل کرسکو۔'' دونوں انتہائی شرمندگی سے فاروق بیگ کی صورت دیکھنے لگے، فاروق بیگ نے کہا۔

''یہ نوٹ اٹھا کر جیب میں رکھ لو، میں تم سے درخواست کرتا ہوں۔ اور بیٹے مجھے اپنا پتا وغیرہ بتا دو، پریشان نہ ہو۔ میں تمہاری ملازمتوں کے لیے بھی کوشش کروں گا۔ کسی قسم کی غلط فہمی کا شکار نہ ہونا، اس کے نتائج بہتر نہیں ہوتے۔''

دونوں کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ایسے ہمدرد انسان کا اس دور میں تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ رومانہ تو اس کے بعد نہیں آئی، ملازم چائے لے کر آگیا۔ فاروق بیگ نے ان دونوں کو چائے وغیرہ پلائی۔ ان سے ان کا پتا پوچھا اور دونوں نے اپنے اپنے پتے دہرا دیے۔ فاروق بیگ تھوڑی دیر کے بعد انہیں رخصت کرنے دروازے تک آئے تھے۔ دونوں سے ہاتھ ملاتے ہوئے انہوں نے کہا۔

''یہ پچاس ہزار روپے فی الحال تمہاری معاونت کریں گے اور فکر نہ کرنا اگر یہ ختم ہوجائیں اور اس وقت تک تمہیں کوئی ملازمت نہ ملے تو فی الحال مجھ سے ہر ماہ یہ رقم لے لیا کرو۔ میرے لیے مشکل نہیں ہوگی۔ اگر تم نیک راستوں کے راہی بن جاؤ تو میرے لیے اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کوئی نہیں ہوگی۔''

ہم انسان نہ ہوئے

ایک درخت کی شاخ پر ایک چڑیا اور چڑا چہچہا رہے تھے، اچانک چڑیا نے چڑے سے سوال کیا ..... آج کا انسان اس قدر پریشان کیوں نظر آتا ہے؟

چڑے نے جواب دیا۔ رزق کی تلاش میں۔

چڑیا بولی، رزق کی تلاش میں تو ہم بھی رہتے ہیں، ہم پریشان تو نہیں رہتے۔ چڑا بولا دراصل ہم اللہ پر بھروسا کرتے ہیں اور جانتے ہیں کہ رزق اسی کی طرف سے ملتا ہے لیکن انسان اپنے آپ پر بھروسا کرتا ہے اور پھر ایک بات اور ..... ہمیں پیٹ بھرنے کو تھوڑا بہت مل جاتا ہے، ہم اسے پاکر اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں لیکن انسان زیادہ سے زیادہ پانے کی لالچ میں ہے یہی وجہ ہے کہ ہر وقت پریشان رہتا ہے۔

چڑیا بولی، اللہ کا شکر ہے کہ ہم انسان نہ ہوئے۔

مرسلہ: وزیر محمد خان، ملل ہزارہ

بانک پر بیٹھ کر منصور نے شاہ میر سے کہا۔ ''کیا اس دور میں بھی ایسے فرشتوں کا وجود ہے شاہ میر؟''

''یار واقعی یقین نہیں آرہا۔''

☆☆☆

فاروق بیگ انتہائی مسرور انداز میں ڈرائنگ روم سے باہر نکل آئے اور رومانہ کے پاس پہنچ گئے۔ رومانہ اپنے کمرے میں منہ پھلائے بیٹھی ہوئی تھی۔

''میری سمجھ میں کچھ آیا نہیں ڈیڈی۔ وہ کمبخت بلیک میل کرنا چاہتے تھے مجھے۔ میں نے مار لگا دی تھی انہیں، چنانچہ وہ یہاں آپ تک پہنچ گئے اور آپ نے ان کے ساتھ یہ سلوک کیا۔''

''احمق ہو تم، بالکل احمق ہو۔ تم سمجھتی نہیں ہو۔ یوں سمجھ لو گھر بیٹھے دولت ہمارے پاس آگئی ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''ان میں سے ایک نوجوان اکبر حسین کا بھتیجا ہے۔''

''کیا؟'' رومانہ اچھل پڑی۔

''ہاں، وہ جس کا نام شاہ میر ہے، میں نے اس کا پتا وغیرہ معلوم کرلیا ہے۔''

''اوہ..... ڈیڈی..... کیا واقعی؟''

''ہاں.....'' فاروق بیگ نے جواب دیا پھر کہنے لگے۔

''اصل میں جب کوئی کام ہونا ہوتا ہے تو پھر اس کے لیے حالات بنتے چلے جاتے ہیں۔ ہمارا سنہرا مستقبل بلکہ اگر

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

میں یہ کہوں کہ تمہارا سنہرا مستقبل برق رفتاری سے تمہاری جانب بڑھ رہا ہے، تو غلط نہیں ہوگا۔ ورنہ اس نوجوان کو تلاش کرنے کے لیے خاصا کام کرنا پڑتا۔ بہرحال وہ دولت مند شخص احمق نہیں ہے، کسی موقع پر محسوس بھی کرسکتا تھا۔ اس دوران میں جب تک ہم اپنے دوسرے کام شروع کریں۔ مہوش کو اپنا کام شروع کردینا چاہیے، وقت سے پہلے اگر یہ سب کچھ ہوجائے تو بہت عمدہ رہے گا۔''

''پروگرام کیا رہے گا ڈیڈی؟''

''مہوش اس پتے پر جائے گی، کسی کو معلوم کرتے ہوئے اور اگر شاہ میر اسے نہ بھی ملے تو وہ اس کی ماں سے راہ و رسم بڑھا سکتی ہے اور اس کے بعد وہ وہاں جاتی رہے۔ اس قسم کے کام جس انداز میں ہوتے ہیں مہوش کو وہی انداز اختیار کرنا ہوگا۔ تم اس کی تربیت کرتی رہو۔''

''ٹھیک ہے ڈیڈی، میں ابھی مہوش کو تلاش کرتی ہوں۔'' رومانہ نے کہا۔ مہوش کو تلاش کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ رومانہ مسکرا کر اس کے گلے لگ گئی اور اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

''اب تو تمہاری بہت خدمت کرنی ہوگی ہمیں کیونکہ تم مستقبل کی بہت دولت مند لڑکی بننے والی ہو۔'' مہوش نے منہ ٹیڑھا کر کے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''یقین نہیں ہے، اصل میں تقدیر نے کسی ایسے موقع پر ایسا کوئی ساتھ نہیں دیا۔ اس لیے سوچتی ہوں کہ کہیں یہ سلسلہ بھی ناکام ہی نہ رہے۔''

''نہیں مہوش! ہم لوگوں نے جو پروگرام بنایا ہے وہ بہت موثر ہے۔ لیکن شرط یہی ہے کہ اب تم اپنی کاریگری کا ثبوت دو۔''

''ان لوگوں کا..... میرا مطلب ہے اس نوجوان کا کوئی پتا تو چلے؟''

''پتا چل گیا ہے؟'' رومانہ نے جواب دیا۔

''کیا؟'' مہوش اچھل پڑی۔

''ہاں، اس کا پتا چل گیا ہے اور اب میں تمہیں جو کچھ بتاؤں تمہیں اسی کے مطابق کام کرنا ہوگا۔''

''پتا بتاؤ۔'' مہوش بولی اور رومانہ نے وہ پتا دہرا دیا جو فاروق بیگ نے اسے دیا تھا پھر مہوش کو اس سلسلے میں تمام تفصیلات سمجھانے لگی اور اس کے بعد بولی۔

''تو پھر تم کب سے یہ کام شروع کر رہی ہو؟''

''آج سے بلکہ اب سے تھوڑی دیر کے بعد۔ میں سمجھ رہی ہوں کہ مجھے کیا کرنا ہے۔''

''ہاں..... تم اس علاقے کے گھر کے مخصوص دروازے پر دستک دو گی۔ ہوسکتا ہے شاہ میر تمہیں مل جائے۔ وہ نہ بھی ملا تو اس کی ماں ضرور گھر پر ہوگی۔ اس سے اس محبت بھرے انداز میں گفتگو کرنا کہ وہ تمہاری گرویدہ ہوجائے، ماں تک پہنچنے کے بعد بیٹے تک رسائی مشکل کام نہیں ہوگا۔''

''اب تم مجھے یہ نہ سمجھاؤ، تعلیم یافتہ ہوں جاہل نہیں ہوں۔ زندگی بنانے کے لیے محنت کرتی ہوں اور کوشش یہ کروں گی کہ اس میں مجھے کامیابی حاصل ہو۔''

''تم اگر چاہو تو میں تمہیں کسی قریبی جگہ ڈراپ کر سکتی ہوں۔''

''یہ زیادہ اچھا ہوگا۔''

''ویسے تھوڑے پیسے بھی رکھ لو۔ ظاہر ہے اس دوران میں تمہارے اخراجات بھی ہوں گے۔''

''نیکی اور پوچھ پوچھ۔'' مہوش نے ہنس کر کہا۔ کچھ دیر کے بعد رومانہ نے اسے ایک ایسی جگہ اتار دیا جہاں سے وہ اس علاقے میں جاسکتی تھی جہاں شاہ میر کا گھر تھا۔ رومانہ کہنے لگی۔

''ہمیں اس دوران ایک دوسرے سے خاصا دور رہنا ہوگا۔ کم از کم میرا یہی خیال ہے۔ اس بارے میں ڈیڈی سے مزید مشورہ کرلوں گی۔ ایک ساتھ دیکھے جانے سے بہت خطرات لاحق ہوسکتے ہیں۔''

''او کے..... میرے لیے نیک خواہشات کی دعائیں کرنا۔''

مہوش نے کہا اور اس کے بعد وہ مطلوبہ ایڈریس کی جانب چل پڑی۔ پتا تلاش کرنے میں اسے زیادہ جدوجہد نہیں کرنی پڑی تھی۔ چند لمحات کے بعد وہ مطلوبہ گھر کے دروازے پر دستک دے رہی تھی۔

☆☆☆

ذیشان کی ہاؤس جاب مکمل ہوگئی تھی۔ وہ ان دنوں بہت بجھا بجھا سا نظر آتا تھا۔ رومانہ سے اس کی ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔ اس وقت بھی وہ ایک ریستوران میں بیٹھے ہوئے تھے اور ذیشان اپنے مستقبل کی باتیں کر رہا تھا۔ رومانہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

''تو جناب ڈاکٹر صاحب! اب کیا ارادہ ہے آپ کا؟''

''بس رومانہ بہت بددل ہوں ان حالات سے۔''

''کیوں؟''

''ملازمت کی تلاش جاری ہے، اصل میں انسان عمر

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

کے ساتھ ساتھ ہی تجربہ حاصل کرتا ہے۔ میڈیکل کالج میں داخلے کے لیے بھی جتنی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا تمہیں ان کا علم ہے، اس کے بعد جس طرح زندگی کو آگے بڑھایا وہ بھی یقینی طور پر تمہارے علم میں ہے، سوچتا تھا کہ بس امتحان پاس کرلوں اس کے بعد وارے نیارے ہوں گے لیکن اب جب بالغ نگاہ سے اس دنیا کو دیکھا ہے تو بڑی تلخ حقیقتوں کا انکشاف ہوا ہے۔''

''مثلاً۔''

''سب سے پہلی چیز تو یہ کہ ملازمت کا ملنا ہی محال نظر آتا ہے، ہر سال بے شمار ڈاکٹر باہر نکلتے ہیں ان کی کھپت انتہائی مشکل کام ہے، جن حالات سے گزر کر اور جتنی شدید محنت کرنے کے بعد وہ ڈاکٹر بنتے ہیں، تصور تو یہی ہوتا ہے ان کے ذہنوں میں کہ بس اب ایک سنہرا مستقبل ان کا منتظر ہے لیکن پھر جب باہر قدم نکالتے ہیں تو ہر طرف تاریکیاں ہی تاریکیاں بکھری نظر آتی ہیں۔''

''تم اتنے مایوس کیوں ہو ذیشان؟''

''نہیں مایوس نہیں ہوں۔ بس یہ سوچ رہا ہوں کہ جو خواب دیکھے تھے ان کی تعبیر مشکل ہے۔''

''میں تمہارے خوابوں کی تعبیر ہوں ذیشان۔ میں تمہیں کلینک بنا کر دوں گی، تمہاری پسند تمہاری مرضی کے مطابق۔''

ذیشان نے عجیب سی نگاہوں سے رومانہ کو دیکھا پھر بولا۔

''تمہیں رومانہ ہم محبت کا سودا کررہے ہیں، کاروبار نہیں کررہے۔ ظاہر ہے یہ سب کچھ بیرسٹر صاحب کے لیے بھی ممکن نہیں ہے۔ میں ان پر کوئی ایسا بوجھ نہیں ڈالوں گا جس سے ان کی کمر ٹوٹ جائے اور پھر کلینک بنانا معمولی کام نہیں ہے۔''

''خیر آنے والا وقت اس کا صحیح فیصلہ کرے گا۔ میں تم سے صرف اتنا کہہ سکتی ہوں کہ تم بددل نہ ہو۔'' بہت دیر تک رومانہ ذیشان کو دلاسے دیتی رہی۔ پھر اس شام اس نے فاروق بیگ سے بھی اس موضوع پر گفتگو کی۔

''ڈیڈی! آپ کو علم ہے کہ ذیشان کی ہاؤس جاب مکمل ہوگئی ہے۔ وہ بہت مایوس ہے۔''

''کیوں؟''

''بس وہی اس کا اپنا نظریہ، ویسے بھی اس وقت اتنے ڈاکٹر موجود ہیں ہمارے ملک میں کہ ان کی کھپت مشکل ہوگئی ہے۔''

''ذیشان کا مستقبل روشن ہے، تقدیر ہمارا ساتھ دے رہی ہے، بس اب تھوڑا ہی وقت گزر رہا ہے کہ ہمارا کام مکمل ہوجائے گا۔ ویسے مہوش کس پوزیشن میں ہے؟''

''انتہائی شاندار جارہی ہے۔ میں اکثر اس کا تعاقب کرتی رہتی ہوں۔ شاہ میر کے ساتھ موٹر سائیکل پر نظر آتی ہے۔ کبھی کسی پبلک مقام پر، کبھی کسی پارک میں، کبھی کسی ہوٹل میں۔ بس یوں سمجھ لیجیے کہ وہ نہایت برق رفتاری سے اپنا کام سرانجام دے رہی ہے۔''

''ویری گڈ، ویری گڈ! آج شام کو اسے بلالو۔''

''کوئی خاص بات؟''

''ہاں اس دوران اس سے ملاقات نہیں ہوئی ہماری، میں چاہتا ہوں کہ اس سے ایک ملاقات کرلی جائے۔''

مہوش کے لیے رومانہ نے پیغام چھوڑ دیا تھا اور مہوش نے فون کرکے کہا تھا کہ آج رات وہ شاہ میر کے گھر کھانے پر مدعو ہے۔ کل جس وقت بھی وہ کہے مہوش آجائے گی۔ فاروق بیگ نے شام کو پانچ بجے کا وقت دے دیا تھا۔ یہی وقت ان کی تمام مصروفیات سے فرصت کا وقت ہوتا تھا۔

دوسرے دن شام پانچ بجے مہوش پہنچ گئی۔ اس کے چہرے پر نکھار آگیا تھا اور اس کی شخصیت خاصی بدلی ہوئی محسوس ہورہی تھی۔ باپ بیٹی نے اس کا پُرجوش خیر مقدم کیا۔ فاروق بیگ کہنے لگے۔

''اس وقت تم ہماری امیدوں کا مرکز ہو مہوش۔ کہو تمہارا کام کیسا جارہا ہے؟''

''نہایت شاندار انکل! میں ہر ممکن کوشش کررہی ہوں جس سے میری اس خواہش کی تکمیل ہوجائے۔''

''ہاں، میں اب یہی چاہتا ہوں کہ بہت جلد اس ڈرامے کا ڈراپ سین ہوجائے۔ ہم کسی کی زندگی پر قادر نہیں ہوتے، یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ اکبر حسین کتنے عرصے زندہ رہے گا؟''

''یہ سوال میرے ذہن میں بار بار گردش کرنے لگتا ہے انکل کہ سارے کام تو ہوجائیں گے لیکن اس کام کی تکمیل تو اکبر حسین کی موت کے بعد ہی ہوگی۔''

''بے شک اور میں تم سے اسی لیے ملاقات کرنا چاہتا تھا کہ ذرا تمہارے کام کی تفصیلات معلوم کرلوں۔''

''انکل! آپ نے مجھے جو ہدایت کی ہے اس کے مطابق میں سارے کام کررہی ہوں۔''

''شاہ میر کا کیا نظریہ ہے تمہارے بارے میں؟''

''وہ ملازمت کی تلاش میں ہے اور کہتا ہے کہ جونہی اسے ملازمت مل جائے گی، وہ پہلا کام یہی کرے گا۔''

''یعنی تمہارے ساتھ شادی؟''

''جی۔'' مہوش نے سر جھکا کر کہا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

''ہوں..... اس کا مطلب ہے کہ اب ہمیں اپنے کام کا آغاز کر دینا چاہیے۔''

''آپ اس کی تکمیل کس طرح کریں گے انکل؟'' مہوش نے سادگی سے پوچھا تو فاروق بیگ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ پھر انہوں نے کہا۔

''اکبر حسین ہائی بلڈ پریشر کا مریض ہے۔ اسے بعض اوقات شدید ہائی بلڈ پریشر ہو جاتا ہے۔ ایک دو بار اس سلسلے میں اسپتال میں بھی داخل ہو چکا ہے، ڈاکٹروں نے اسے شدید احتیاط کی ہدایت کی ہے۔ میں نے کچی گولیاں نہیں کھیلیں، بس انتظار کر رہا تھا کہ تم اپنا کام مکمل کر لو تو میں اپنے کام کا آغاز کروں۔''

''آپ کیا کریں گے انکل؟'' مہوش نے سوال کیا۔

''میرا تجربہ وسیع ہے بے بی اور اب ہم جبکہ ایک ہی راستے کے مسافر ہیں تو میں تمہیں اپنے منصوبے سے آگاہ کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ ہائی بلڈ پریشر کا مریض عموماً بلڈ پریشر کم کرنے کی دوائیں کھاتا رہتا ہے لیکن دو دوائیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں آپس میں ملا کر ہائی بلڈ پریشر کے مریض کو استعمال کرا دی جائیں تو اس کا بلڈ پریشر انتہا کو پہنچ جاتا ہے اور اس وقت اگر اسے فوری طبی امداد نہ ملے تو پھر یوں سمجھ لو کہ بات زندگی کے اختتام پر ہی ختم ہوتی ہے۔ اب جبکہ تم اس بات کا سگنل دے چکی ہو کہ تم نے اپنا کام مکمل کر لیا ہے اور شاہ میر اب پوری طرح تمہارے قبضے میں ہے تو پھر میں اپنا کام شروع کیے دیتا ہوں۔''

''یعنی..... یعنی آپ.....''

''ہاں..... میرے اکبر حسین سے اچھے تعلقات ہیں، ابھی اس کی وصیت کا سلسلہ چل رہا ہے۔ میں کسی بھی سلسلے میں اس سے ملاقات کر سکتا ہوں۔ چائے کی فرمائش کر سکتا ہوں۔ بس یہ دونوں دوائیں ملا کر مجھے اپنے پاس رکھنا ہوں گی اور ملاقات کے دوران چائے کی نشست میں اس کی چائے میں چند قطرے دوا ملانا ہوگی اور پھر اسی رات کسی بھی لمحے ہمیں اس کی موت کی اطلاع مل جائے گی۔''

''مم..... مگر یہ تو قتل ہوگا انکل؟''

''بے بی! ویسے بھی وہ دل کا مریض ہے۔ کوئی بھی لمحہ اس کا موت کا لمحہ ہو سکتا ہے۔ ہم اگر اس کی یہ مشکل آسان کر دیں تو کیا برا ہوگا، ظاہر ہے ضرورت ایجاد کی ماں ہوتی ہے، ہمیں یہ سب کچھ کرنا ہے۔ اب اس کی موت کا انتظار تو نہیں کیا جا سکتا۔ بعض اوقات دل کے مریض بھی سالہا سال زندہ رہتے ہیں۔ ہو سکتا ہے اکبر حسین بھی طویل عرصے تک زندہ رہے۔ ہم انتظار نہیں کر سکتے مہوش۔ ظاہر ہے اس کے بعد تم بھی اپنے حسین مستقبل کا آغاز کرو گی۔''

''لیکن انکل سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ فرض کیجیے اکبر حسین کو راستے سے ہٹا دیتے ہیں؟''

''ہاں پھر؟''

''اس کے بعد لازمی امر ہے کہ شاہ میر کو تلاش کرنے کا مسئلہ ہوگا۔ حالانکہ آپ اس کے بارے میں جانتے ہیں لیکن پھر بھی آپ کو پورا کھیل ہی کھیلنا پڑے گا۔ فرض کیجیے میری اور شاہ میر کی شادی ہو جاتی ہے تو اس کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ اس کی دولت فوراً ہی میرے قبضے میں آ جائے اور پھر جب اسے دولت مل جائے گی تو وہ اسے اپنی تحویل میں رکھے گا، وہ دولت ہم تک کیسے منتقل ہو سکتی ہے؟''

''اس لیے تو کہتا ہوں کہ کام کا آغاز جلد از جلد ہونا چاہیے۔ کھیل بے شک لمبا ہے مگر اس کے نتیجے میں حاصل ہونے والی دولت بھی بہت ہے، چنانچہ پہلے اکبر حسین کی چھٹی کی جائے گی، اس کے بعد وہ دولت شاہ میر کو منتقل ہو جائے گی اور پھر بے بی تمہیں اپنا کام سرانجام دینا ہوگا۔''

''یعنی انکل، یعنی..... یعنی.....'' مہوش نے مضطربانہ انداز میں کہا تو فاروق بیگ ہنسنے لگے۔

''اصل میں یہ دور بہت جدید ہے، جو لوگ اس دور میں بھی پستول کی گولی یا خنجر سے کام لیتے ہیں یا کسی کو گردن دبا کر ہلاک کرتے ہیں، میری نگاہ ... میں احمق لوگ ہیں۔ کسی تندرست و توانا نوجوان کو اگر صرف ایک ماہ تک کچھ ایسی دوائیں استعمال کرا دی جائیں جو کسی بھی طور زہر نہ ثابت ہوں، لیکن اس کے لیے زہر سے زیادہ قاتل ثابت ہوں تو پھر ہم اسے اس پوائنٹ پر لے آتے ہیں جہاں کسی بھی لمحے کسی بھی وقت اس سے چھٹکارا حاصل کیا جا سکتا ہے۔ شاہ میر کو ہلاک کرنا ہوگا تاکہ اس کی دولت تمہاری جانب منتقل ہو جائے۔''

''اوہ ڈیڈی! اتنا لمبا کام ہے یہ۔ یعنی ابھی ہمیں ایک نا معلوم عرصے تک انتظار کرنا ہوگا۔'' رومانہ نے پریشان لہجے میں کہا۔

''تم فکر مت کرو بے بی، جس قدر جلد ممکن ہو سکے گا ہم یہ کام نمٹا لیں گے اور اس کے بعد تم سب کی نئی زندگی کا آغاز ہوگا۔ تمہیں اندازہ ہے یہ سب کچھ میں اپنے لیے نہیں کر رہا، بس میری نگاہوں کے سامنے تم لوگوں کا مستقبل ہے۔''

رومانہ خاموش ہو گئی۔ مہوش کے چہرے پر بھی عجیب

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

سے تاثرات پھیلے ہوئے تھے۔

☆☆☆

بیرسٹر فاروق بیگ کی کار اکبر حسین کی کوٹھی میں داخل ہوگئی۔ اکبر حسین اس وقت بھی بیرونی حصے کے لان میں بیٹھے ہوئے تھے۔ بیرسٹر فاروق بیگ نے ابھی تھوڑی دیر قبل انہیں ٹیلی فون کیا تھا اور اکبر حسین صاحب نے کہا تھا کہ وہ آسکتے ہیں۔ چنانچہ بیرسٹر فاروق بیگ کیل کانٹے سے لیس ہوکر پہنچے تھے۔

اکبر حسین نے مسکراتی نگاہوں سے بیرسٹر صاحب کو دیکھتے ہوئے ان کا استقبال کیا اور بیرسٹر صاحب کرسی پر بیٹھ گئے۔ انہوں نے کہا۔

''آپ کی صحت خاصی بہتر محسوس ہورہی ہے اکبر حسین صاحب!''

''ہاں میاں، بس تنہا زندگی ہے، کبھی جی چاہتا ہے تو خوش ہولیتے ہیں کسی بات پر ورنہ اور ہے کیا ہماری زندگی میں۔ خیر چھوڑیئے۔ آپ سنایئے، کیسا چل رہا ہے آپ کا کاروبار؟''

''دعائیں ہیں اکبر حسین صاحب! اصل میں آپ سے اس وصیت کے بارے میں مزید کچھ تفصیلات معلوم کرنی تھیں۔ میں آخری بار پھر آپ سے کہنا چاہتا ہوں کہ اگر چاہیں تو اس پر نظر ثانی کرلیں۔''

اکبر حسین کا چہرہ تن گیا، انہوں نے کرخت لہجے میں کہا۔

''آپ عجیب آدمی ہیں بیرسٹر صاحب! آخر آپ مجھے سمجھانے کا کیا حق رکھتے ہیں؟ میرا اپنا ہے سب کچھ، میں اس کے بارے میں جو بھی فیصلہ کروں گا، آپ اس میں مداخلت کیوں کررہے ہیں؟''

''نہیں، میں مداخلت نہیں کررہا۔ بس اپنے طور پر آپ سے آخری بار گفتگو کرنا چاہتا تھا تاکہ اسے فائنل کردوں۔''

''آپ میری خواہش کے مطابق اس وصیت کو فائنل کردیجئے اس میں کسی قسم کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔''

''جیسا آپ پسند کریں، مجھے اعتراض نہیں ہے۔''

''اس کے علاوہ میرے لائق اور کوئی خدمت؟''

''نہیں، بس بہت عرصے سے آپ سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ میں نے سوچا کہ آپ سے مل لوں، اس موضوع پر بھی بات کرلوں، چائے پلوایئے بہت عمدہ سی۔''

''ہاں ضرور۔'' اکبر حسین صاحب نے کہا اور پھر اپنے اس ملازم کو آواز دی جو کیاریوں پر کام کررہا تھا۔ انہوں نے اسے چائے لانے کے لیے کہا۔ بیرسٹر فاروق بیگ کی پیشانی پر بار بار پسینا آجاتا تھا جسے وہ رومال سے خشک کرلیتے تھے۔ اکبر حسین نے کہا۔

''گرمی اتنی تو نہیں ہے، آپ کی پیشانی بار بار پسینے میں کیوں ڈوب جاتی ہے؟''

''پچھلے دنوں سے شاید مجھے بھی کچھ بلڈ پریشر کی شکایت ہوگئی ہے، آپ کی کیفیت کیا ہے؟''

''بس بیرسٹر صاحب! ہم تو دائمی مریض ہیں، ہماری کیفیت کیا ہوگی۔''

''آپ یقینی طور پر بہتر ہوجائیں گے، یہ مرض پیچھا نہیں چھوڑتا لیکن اگر اس کی صحیح طور پر نگہداشت کرلی جائے تو نارمل ضرور ہوجاتا ہے۔ ڈاکٹر نے یقینی طور پر آپ کو اس سلسلے میں بہت سے مشورے دیے ہوں گے۔''

''ہاں کیوں نہیں۔''

مختلف امور پر گفتگو ہوتی رہی۔ اکبر حسین خاصی بہتر حالت میں تھا لیکن بیرسٹر صاحب کو بار بار پسینا آرہا تھا اور اب انہوں نے خوف سے پسینا خشک کرنا بھی چھوڑ دیا تھا کہ اکبر حسین کو کسی قسم کا شبہ نہ ہوجائے۔ کچھ دیر کے بعد ملازم چائے لے آیا۔ اکبر حسین نے ملازم سے ہی چائے بنانے کے لیے کہا اور اس نے نفاست سے چائے کی دو پیالیاں بنا کر سامنے رکھ دیں۔ اب بیرسٹر صاحب اس مشکل کا شکار تھے کہ اپنی کارروائی کیسے سرانجام دیں۔ وہ ننھی سی شیشی ان کی جیب میں موجود تھی جس میں خصوصی قسم کی دوا تیار کرلی گئی تھی۔ یہ مشکل بھی اکبر حسین نے خود حل کردی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھے اور بیرسٹر صاحب سے ایک لمحے کے لیے معذرت کرکے کوٹھی کے اندرونی حصے کی جانب چل پڑے۔ بس اتنا موقع کافی تھا۔ بیرسٹر صاحب نے بڑی ہوشیاری سے اکبر صاحب کی چائے میں دوا کے چند قطرے شامل کردیے تھے۔

کچھ دیر کے بعد اکبر حسین صاحب واپس آئے تو ان کے ہاتھ میں ایک خوبصورت چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر دبا ہوا تھا۔ ٹیپ ریکارڈر لا کر انہوں نے میز پر رکھ دیا۔ پھر اکبر صاحب نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔

''معاف کیجیے گا، اصل میں میری خواہش ہے کہ میں اپنی وصیت ریکارڈ کرکے آپ کے حوالے کردوں تاکہ مزید پختگی ہوجائے۔''

''آپ کے ذہن میں یہ خیال کیوں آیا ہے؟''

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

''آپ میری ذہنی کیفیت نہیں جانتے۔ بہت شدت پسند آدمی ہوں اور یہ چاہتا ہوں کہ جو کچھ میں کر رہا ہوں وہ بھرپور ہو اور اس میں کسی قسم کا کوئی شبہ نہ رہے۔''

''جی۔'' بیرسٹر صاحب نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

اکبر حسین نے انہیں چائے کی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا۔

''آپ اپنی چائے کیوں ٹھنڈی کر رہے ہیں، براہِ کرم لیجیے۔''

''ہاں پلیز۔'' بیرسٹر صاحب نے اکبر حسین صاحب کو ان کی چائے کی پیالی کی جانب متوجہ کرتے ہوئے کہا۔ پھر بیرسٹر صاحب نے اپنی پیالی کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ اکبر حسین صاحب نے ان کا ہاتھ روک دیا۔ اپنے سامنے رکھی ہوئی چائے کی پیالی انہوں نے بیرسٹر صاحب کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

''آپ یہ لیں، وہ مجھے دیں۔''

''جی.....'' فاروق بیگ کا سانس اوپر کا اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔

''ہاں، ایک ہی بات ہے کوئی حرج نہیں ہے۔'' اکبر صاحب نے اپنے سامنے رکھی ہوئی وہ پیالی جو انہوں نے بدل لی تھی، اٹھا کر ہونٹوں سے لگاتے ہوئے کہا اور پھر فاروق بیگ کو اشارہ کر کے کہا۔

''لیجیے پلیز۔''

فاروق بیگ ہکا بکا بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کی چھٹی حس خطرے کی گھنٹی بجا رہی تھی۔ یہ ایک ناقابلِ یقین سی بات تھی۔ بہت حیران کن بات۔ فاروق بیگ کو یوں محسوس ہوا جیسے اکبر حسین ان کی حرکت سے واقف ہو گئے ہوں۔

''چائے لیجیے۔ ٹھنڈی ہو رہی ہے بیرسٹر صاحب۔'' اس بار اکبر حسین کا لہجہ کچھ سخت تھا۔ بیرسٹر صاحب چونک پڑے۔ انہوں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر پستول نکال لیا اور اس کا رخ فاروق بیگ کی طرف کر دیا۔

''چائے پئیں بیرسٹر صاحب ورنہ..... ورنہ میں پستول کی گولیاں آپ کے سینے میں پیوست کر سکتا ہوں، چائے لیجیے۔''

فاروق بیگ نے بے اختیار چائے کی پیالی کی طرف ہاتھ بڑھایا اور پھر کانپ کر رہ گئے۔ ''مم میں کچھ سمجھا نہیں..... یہ پپ..... پستول.....''

''آپ سمجھے نہیں چلیے میں آپ کو سمجھائے دیتا ہوں۔'' اکبر حسین صاحب نے کہا اور سامنے رکھے ہوئے ٹیپ ریکارڈر کا وہ بٹن دبا دیا جس سے کیسٹ پلے ہو جاتا تھا۔ بیرسٹر صاحب کی نگاہیں خوفزدہ انداز میں ٹیپ ریکارڈر کی جانب اٹھ گئیں۔ ٹیپ ریکارڈر پر آواز سنائی دی۔ یہ ان کی اپنی آواز تھی اور اس آواز میں وہ مہوش کو ہدایات جاری کر رہے تھے۔ اسے بتا رہے تھے کہ اب اسے اپنا کام مکمل کر لینا چاہیے اور وہ خود بہت جلد اپنے کام کی تکمیل کر لیں گے۔ یہ مہوش سے ہونے والی آخری گفتگو تھی جس کے بعد انہوں نے مہوش سے کہہ دیا تھا کہ اب وہ ان سے ملاقات نہ کرے، ان کے اور مہوش کے درمیان فاصلہ ہونا چاہیے تاکہ کسی کو ان کے رابطے کی خبر نہ ہو۔ بیرسٹر فاروق بیگ صاحب کو فوراً یہ احساس ہو گیا کہ کیسٹ پر ریکارڈ شدہ گفتگو ان کی گردن میں پھانسی کا پھندا ڈالنے کے لیے کافی ہے۔ اکبر حسین کے ہاتھ میں پستول موجود تھا اور صحیح معنوں میں بیرسٹر فاروق بیگ کا بلڈ پریشر اس وقت بہت ہائی ہو گیا تھا، ان کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

اکبر حسین صاحب کچھ دیر انہیں دیکھتے رہے پھر ملامت آمیز لہجے میں بولے۔

''بیرسٹر صاحب! آپ اپنے پیشے سے واقف ہیں؟ وکالت کرتے ہیں آپ ان پریشان حال لوگوں کی جو اپنی مشکلات کا حل آپ کے پاس تلاش کرنے آتے ہیں۔ بے گناہوں کو مصیبت سے بچانے والے ایک شخص کا کردار اتنا گھناؤنا ہوتا ہے تو آپ کا کیا خیال ہے اس کے بارے میں؟ آپ نے میرے خلاف سازش تیار کی۔ بدقسمتی سے وہ آپ ہی کی گردن کا پھندا بن گئی۔ آپ کو یہ سن کر نہایت افسوس ہوگا کہ آپ کی ساری چالیں آپ ہی کی حرکتوں کی وجہ سے ناکام ہو گئی ہیں۔ لیکن میں آپ کا ایک لحاظ سے شکریہ بھی ادا کرتا ہوں کہ آپ نے میری آنکھیں کھول دیں۔ مجھے یہ احساس دلا دیا کہ خون بہرحال خون ہوتا ہے اور میں نے ساری زندگی غلط فہمیوں میں گزاری ہے اور اپنی انہی غلط فہمیوں نے مجھے ساری کائنات میں تنہا کر دیا ہے۔ میرے سوچنے کا انداز غلط تھا۔ بیرسٹر صاحب! آپ نے اس انسان کو صحیح راستہ دکھا دیا ہے، لیکن بہت برے انداز میں۔ آپ کو یہ سن کر نہایت افسوس ہوگا کہ وہ لڑکی مہوش جو آپ کی بیٹی کی دوست تھی، آپ کی بنائی ہوئی سازش کے تحت جب میرے بھتیجے شاہ میر حسین کی رہائش گاہ پر پہنچی تو وہاں شاہ میر کا دوست منصور بھی موجود تھا۔ آپ کی بدقسمتی سے منصور مہوش کا کلاس فیلو رہ چکا تھا۔ دونوں ایک دوسرے سے متاثر بھی تھے لیکن حوادثِ زمانہ نے انہیں کالج سے نکلنے کے بعد یہ مہلت نہ دی کہ وہ پھر ایک دوسرے سے

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

ملتے۔ وہاں مہوش کی ملاقات منصور سے ہوئی اور مہوش کو علم ہوا کہ منصور، شاہ میر کا دوست ہے۔ مہوش کے ضمیر نے ملامت کی اور اس نے پوری کہانی منصور اور شاہ میر حسین کو سنادی۔ دونوں ششدر رہ گئے۔ شاہ میر کی ماں اور میری بھاوج، وہ عورت جسے میں نے ہمیشہ غلط نگاہ سے دیکھا یہ داستان سن کر تڑپ گئی۔ حالانکہ میں نے ان لوگوں کے لیے ہمیشہ برے انداز میں سوچا تھا۔ اس نے مہوش ہی کی موجودگی میں اپنے بیٹے سے سوال کیا کہ کیا وہ اس سازش میں حصہ لے گا تو شاہ میر نے قہقہہ لگا کر کہا کہ نوکری کی تلاش کرنے اور اس مشکل زندگی کو گزارنے میں جو مزہ ہے، وہ کسی کو قتل کرکے اس کی دولت پر قبضہ جمانے میں نہیں ہے۔ اور پھر وہ شخص جس کے خلاف سازش کی جارہی ہے اس کا اپنا خون ہے، اپنا تایا ابو..... وہ اس کے لیے زندگی دے تو سکتا ہے، اس کی زندگی لے نہیں سکتا۔ یہ مشرقی عورت کی، ایک مسلمان، ایک پاکستانی عورت کی تربیت تھی اپنی اولاد کے لیے، دونوں بچے بیروزگاری کا شکار ہوکر جرم کی دنیا کی طرف جارہے تھے لیکن ان کے ضمیر زندہ تھے۔ شاہ میر اس لیے میرے پاس نہیں آیا کہ کہیں میں یہ نہ سمجھوں کہ وہ اس سازش کا انکشاف کرکے مجھ سے کچھ مراعات حاصل کرنا چاہتا ہے۔ لیکن اس نے اپنے دوست منصور کو پوری تفصیل بتا کر میرے پاس بھیجا اور مجھے ہوشیار کیا کہ میں فاروق بیگ کی سازش کا شکار نہ ہوں۔ جو باتیں مجھے بتائی گئیں، وہ ہوچکی تھیں۔

"یعنی میں نے اپنی دولت ٹرسٹ کرنے کی وصیت کی تھی آپ کو۔ ساری کہانی میں اس قدر سچائی تھی کہ کہیں بھی شبہے کا کوئی عنصر نہیں تھا۔ چنانچہ میں اپنی بھاوج اور بھتیجے سے ملا اور اپنے خون کو میں نے گلے لگالیا جس نے میرے خلاف سازش میں حصہ لینے کے بجائے میرے لیے زندگی تلاش کی۔ میں نے اپنی بھاوج سے معافی مانگی اور اپنے بھائی کی موت پر پہلی بار آنسو بہائے۔ غلط فہمیاں دھل گئیں اور میں نے آپ کو اس سازش کی سزا دینے کا فیصلہ کرلیا۔ جناب بیرسٹر صاحب! لوگ اپنی محنت سے دولت کماتے ہیں، وہ اس قدر احمق نہیں ہوتے کہ آپ جیسے لوگوں کی سازشوں کا شکار ہوجائیں۔ وہ سازش آپ پر الٹ دی گئی۔ مہوش اس میں برابر کی شریک تھی۔ ہم سب مل کر کام کررہے تھے کیونکہ مجھے معلوم ہوا تھا کہ آپ نے مہوش سے ایک ایسی تحریر لے لی ہے جس کے تحت آپ اسے کسی جرم میں ملوث کرسکتے ہیں چنانچہ اس کا توڑ بھی ضروری تھا۔ نتیجے میں مہوش سے آپ کی آخری ملاقات کے وقت مہوش کو ایک چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر مہیا کردیا گیا تھا جس میں اس نے آپ کی وہ تمام آواز ریکارڈ کرلی اور اس کے بعد بالآخر آپ یہاں تک پہنچ گئے۔ غالباً آپ کو یہ تفصیل بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ اس کے بعد کیا کیا ہوا البتہ آپ کی اس حرکت نے بلاشبہ میری زندگی بڑھادی ہے۔ جسے ساری عمر کی تنہائی کے بعد کچھ اپنے مل جائیں تو اس کی زندگی میں اضافہ کیوں نہ ہوگا۔ لیکن اب آپ اپنے بارے میں فیصلہ کیجیے، اس سازش کے نتیجے میں آپ کو کیا کیا مصیبتیں اٹھانی پڑیں گی۔ آپ کو اس کا کچھ اندازہ ہے۔ بیرسٹر صاحب! میں نے ایک نظریہ قائم کیا ہے۔ اس نئی نسل کے بارے میں سوچیں۔ جرم کے دوسرے طریقوں سے جرائم کے خاتمے کی کوشش کی جاتی ہے، لیکن ان نوجوانوں کے لیے وہ سہولتیں مہیا نہیں کی جاتیں جن سے انہیں زندگی گزارنے کے لیے بہترین مواقع فراہم ہوں۔ یہ یورپ نہیں ہے جہاں جرم تفریحاً ہوتا ہے۔ یہاں مجرم بدقسمتی کے سہارے تخلیق پاتے ہیں۔ ہاں آپ جیسے لوگ جو اس معاشرے کے اقدار کو اپنی مٹھی میں کیے ہوئے ہیں اصل مجرم ہیں، بلاتا ہوں میں ان لوگوں کو، ملیے ان سے..... آؤ تم لوگ باہر آجاؤ۔"

اکبر حسین صاحب نے زوردار آواز میں کہا اور مہوش، منصور اور شاہ میر تینوں اندرونی حصے سے باہر آگئے۔ بیرسٹر صاحب کے بدن میں لہو کا ایک قطرہ بھی نہیں رہ گیا تھا۔ ان کے جسم کا لہو خشک ہوگیا تھا۔ تینوں نے بڑے ادب سے فاروق بیگ کو سلام کیا لیکن وہ جواب کیا دیتے، وہ تو ٹکر ٹکر بیٹھے ان کی صورت دیکھتے رہے۔

"فاروق بیگ صاحب! یہاں پولیس بھی ہوسکتی تھی لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ آپ کی وجہ سے میری بھاوج اور بھتیجے مل گئے ہیں۔ ہاں آپ کی زندگی حرام ہوسکتی ہے، اٹھیے اور میری تحریر کردہ وصیت اور مہوش سے لکھوایا ہوا وہ کاغذ لے کر فوراً یہاں پہنچ جائیے۔ میں صرف ایک گھنٹا دیتا ہوں۔ اس ایک گھنٹے میں اگر آپ کی واپسی نہ ہوئی تو آپ کی آواز کا یہ کیسٹ اور چائے کا یہ سیمپل جس میں آپ نے وہ دوا شامل کی ہے، دونوں چیزیں پولیس کی تحویل میں پہنچ جائیں گی کھڑے ہوجائیے۔"

بیرسٹر صاحب فوراً کھڑے ہوگئے۔

"کتنی دیر میں آپ کی واپسی ہوجائے گی؟"

"ایک..... ایک گھنٹے میں۔" انہوں نے جواب دیا اور کار کی جانب سرپٹ دوڑ گئے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

غرقِ محبت

طاہر جاوید مغل

جب جذبات میں ہلچل ہو اور دل کی دھڑکنوں میں تلاطم بپا ہو لیکن آنکھیں محبوب کا عکس قید کیے اسے ساری دنیا سے چھپا لینا چاہتی ہوں تو ایسے میں ہزاروں سوال روح میں چھید کردیتے ہیں... جسے بے تحاشا چاہا جائے اور اس کی بے خبری میں دل و جان فدا ہوجائیں تو دل سے اٹھنے والی ایک سرگوشی جیسے پوری کائنات میں ایک بھونچال لے آتی ہے... "تم کب تک مجھ کو بھولو گے" جسے چاہا جائے اور اپنایا نہ جاسکے... ایسی لمبی مسافت پیروں میں آبلے ڈالنے کے باوجود مسافر کو آگے بڑھنے سے روک نہیں سکتی۔ وہ بھی خود کو نہ روک پایا۔ اگرچہ چلنا محال تھا مگر ارادوں کی پختگی بنا منزل کی آس لیے چلنے پر مجبور کرتی رہی لیکن... قدرت کے اپنے ہی اصول ہوتے ہیں کچھ بھی "بے وجہ" ہونے کی اس کے پاس کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ پھر کیسے اس کا سفر محبت رائگاں جاتا... کسی کے دل میں اٹھنے والا خاموش طوفان یہ ثابت کردیتا ہے کہ محبت اپنے رستے خود بناتی ہے۔ وہ جو سارے موسم اپنے اندر سموئے محبوب کی آمد کا منتظر تھا... وہ لمحہ آیا اور ایک ہی پل میں گویا اپنی پوری زندگی جی گیا...

روح کا روح سے میل تال اور محبتوں کے
بے مثال اور لازوال جذبوں کی سحر انگیز داستان

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف

ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ

کتاب کی مُختلف سائزوں میں اپلوڈنگ

ایڈ فری لنکس

ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر

ناولز اور عمران سیریز کی مُکمل رینج

Click on http://paksociety.com to Visit Us

پاک سوسائٹی کو فیس بُک پر جوائن کریں http://fb.com/paksociety

پاک سوسائٹی کو ٹوئٹر پر جوائن کریں http://twitter.com/paksociety1

پاک سوسائٹی کو گُوگل پلس پر جوائن کریں https://plus.google.com/112999726194960503629

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بُک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بُک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

http://paksociety.com

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

Downloaded From Paksociety.com

سہ پہر ختم ہورہی تھی اور شام ہولے ہولے اپنے سرمئی پر کھول رہی تھی۔ سہ پہر اور شام کے اس درمیانی وقفے میں ایک اداس ہوا چلتی تھی جو اس ریگستانی علاقے میں ریت کے ذرّوں کو یہاں سے وہاں لے جاتی تھی۔ اس اداس ہوا میں ایک سناٹا سا تھا جیسے..... دور بیابانوں میں بانسری کے لطیف سُروں پر کوئی اجنبی ساغم بلکورے لے رہا ہو، سناٹے کا اَن دیکھا پھیلاؤ اسے اچھا لگتا تھا۔ سناٹے کی اَن سنی تانیں اس کے دل کے تار چھیڑتیں، اسے گدگداتی تھیں۔ تنہائی اس کی جنم بھومی تھی۔ ماں جیسی شفیق ہستی سے وہ آشنا ہی نہیں ہوا تھا۔ اس نے جانا ہی نہ تھا کہ باپ کا سایہ کیا ہوتا ہے؟ بہن بھائی، رشتے دار، یہ سب کچھ اس کے لیے بے معنی تھا۔ وہ جیسے تنہا آسمانوں سے پھینکا گیا تھا۔ شاید وہ کسی اور سیارے کی مخلوق تھا جو غلطی سے اس کرۂ ارض پر اتر آیا تھا۔

وہ ماضی کی طرف نگاہ دوڑاتا تو بچپن کی جو پہلی یاد اس کے ذہن میں آتی تھی، وہ یہی تھی کہ وہ ایک کھیت کے کنارے کھالے کے ٹھنڈے پانی میں ہاتھ پاؤں چلا رہا ہے اور تیرنے کی کوشش کررہا ہے۔ ایک احساس اسے بتاتا تھا کہ اگر اس نے ہاتھ پاؤں نہ چلائے تو وہ پانی کے اندر چلا جائے گا اور یہ اچھا نہیں ہوگا۔ اب اس بات کو برسوں بیت چکے تھے۔ وہ کھلے ہاتھ پیر کا ایک مضبوط نوجوان تھا۔ اس کی چھاتی ابھری ہوئی اور سڈول تھی۔ اس کے بازو معمول سے لمبے اور مسل مضبوط تھے۔ اس کی بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں میں جیسے ایک بے قراری سی کروٹیں لیتی رہتی تھی۔ وہی بے قراری جو بندے کو کسی جگہ ٹکنے نہیں دیتی۔ وہ بھی کہاں ٹکتا تھا۔ لاہور میں تھا تو اس نے دو تین ٹھکانے بدلے تھے۔ پھر وہ پنڈی چلا گیا۔ پنڈی میں ایک بندے سے اس کا جھگڑا ہوا۔ جھگڑے نے طول پکڑا تو وہ وہاں سے بھی نکل آیا۔ کراچی کے ساحل نے چار سال تک اس کے پاؤں پکڑے رکھے مگر اس کی بے چین طبع نے اسے وہاں بھی مستقل ڈیرا نہیں ڈالنے دیا۔

ہاں، تنہائی اس کی جنم بھومی تھی۔ اجنبی سناٹے سے اس کا پہلا عشق تھا۔ تنہائیوں، سناٹوں اور اجنبی ویرانوں کی بہترین جگہ ریگستان کے علاوہ اور کوئی نہیں ہوسکتی تھی اور اب وہ وہاں پہنچ چکا تھا۔ پچھلے چار پانچ ماہ سے وہ چولستان میں تھا..... ترنڈا کا ایک قریبی گاؤں منڈ بھیرو اس کا مسکن تھا۔ پنڈی کے ایک پرانے دوست نے کراچی میں اسے دیکھ لیا تھا اور اپنے ساتھ منڈ بھیرو لے آیا تھا..... اور اب پچھلے ڈیڑھ دو ماہ سے وہ اس کے ساتھ اس کے تباہ شدہ گھر کی چھت تعمیر کرنے میں اس کی مدد کررہا تھا۔

ہاں تو سہ پہر ختم ہورہی تھی اور شام ہولے ہولے اپنے سرمئی پر کھول رہی تھی۔ وہ ایک ریتیلے ٹیلے پر نیم دراز دور افتادہ سناٹوں سے اٹھنے والی بانسری کی غم انگیز آوازسن رہا تھا۔ اس نے نشیب میں دیکھا جہاں پانی ذخیرہ کرنے والے وسیع تالاب نما جوہڑ کا پانی سورج کی روشنی میں لشکارے مار رہا تھا۔ اس نے ایک جیپ دیکھی جو دھول اڑاتی، تیزی سے تالاب کے پاس سے گزر رہی تھی پھر اچانک کچھ عجیب ہوا۔ تیز رفتار جیپ نے ایک دو ہچکولے کھائے۔ بری طرح لہرائی پھر ایک خوفناک منظر سامنے آیا۔ جیپ نے باقاعدہ قلابازی کھائی اور ایک زبردست چھپاکے کے ساتھ پانی میں جا گری۔ وہ آڑی گری تھی، اس کے دونوں عقبی پہیے نظر آرہے تھے لیکن پھر دیکھتے ہی دیکھتے یہ دونوں پہیے بھی اوجھل ہوگئے اور صرف پچھلا بمپر اور اسکرین وغیرہ ہی پانی سے باہر رہ گئے۔

آس پاس کوئی نہیں تھا بلکہ دور دور تک کوئی ذی نفس نظر نہیں آتا تھا۔ دلاور نے دائیں بائیں دیکھا۔ اس نے جیپ الٹتے وقت دور سے مدھم سی نسوانی چیخ بھی سنی تھی۔ وہ اٹھا اور کسی چھلاوے کی طرح بے ساختہ ڈھلوان پر دوڑتا چلا گیا۔ اس کے چوڑے مضبوط پاؤں جیسے ریت پر بھنور سے بنا رہے تھے۔ تالاب تک تقریباً 100 میٹر کا فاصلہ تھا جو اس نے آناً فاناً طے کیا اور ایک جست لیتا ہوا پانی میں کود گیا۔ وہ اس تالاب کی گہرائی سے واقف تھا۔ آڑی ترچھی جیپ اب مکمل طور پر پانی میں ڈوب چکی تھی۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید ہاتھ پاؤں مار کر رہ جاتا لیکن وہ لہروں کا شناور تھا، پانی میں اترنا اور اس سے لڑنا جانتا تھا۔ اس نے سانس باہر نکالی اور دس بارہ فٹ نیچے چلا گیا۔ ایک لڑکی کے بال اس کے ہاتھ میں آئے۔ وہ اسے کھینچتا ہوا پانی سے باہر لے آیا اور کنارے پر ڈال دیا۔ لڑکی چند سیکنڈ سے زیادہ پانی میں نہیں رہی تھی مگر مکمل طور پر بے ہوش تھی۔ اس کی بے ہوشی کی وجہ اس کے سر پر لگنے والی کوئی چوٹ تھی۔ وہ خوبصورت تھی اور فیشن ایبل لباس میں تھی۔ لگتا تھا کہ شہر کی رہنے والی ہے۔

شاید دلاور ابھی کچھ دیر مزید اسے دیکھتا رہتا مگر وہ جانتا تھا کہ ابھی کم از کم ایک فرد اور پانی کے اندر ہے۔ اس نے دوبارہ پانی میں جست کی اور غوطہ لگا کر جیپ تک پہنچ گیا۔

دروازہ کھل جانے سے لڑکی تو خود بخود پانی میں گر گئی تھی مگر اس کا ساتھی ابھی تک جیپ میں پھنسا ہوا تھا۔ اس

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

نے سیفٹی بیلٹ بھی لگا رکھی تھی۔ دلاور نے دیکھا کہ اس کی گردن ایک طرف ڈھلک چکی ہے اور آنکھیں بند ہیں، وہ شدید خطرے میں تھا۔ دلاور نے اس کی سیٹ بیلٹ کھولنے کی کوشش کی مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ بیلٹ بری طرح بکل میں پھنسی ہوئی تھی۔ بکل کو توڑ کر یا بیلٹ کو کاٹ کر ہی اس شخص کو آزاد کرایا جاسکتا تھا۔ یہ لمحے اس شخص کی زندگی کے لیے بڑی قیمتی تھے۔ دلاور کا سانس سینے میں گھٹنا شروع ہوگیا۔ اگر وہ تازہ سانس لینے کے لیے سطحِ آب پر چلا جاتا تو پھر شاید دیر ہوجاتی۔ وہ پانی میں ہی رہا اور دیوانہ وار سیفٹی بیلٹ سے الجھتا رہا۔ آخر معجزہ ہوگیا۔ دلاور کے زور لگانے سے بکل کا کیچر ٹوٹ گیا اور بے ہوش شخص اس جان لیوا بندش سے آزاد ہوگیا۔ دلاور نے اسے کھینچ کر جیپ سے نکالنے کی کوشش کی۔ جیپ کے الٹنے سے اسٹیئرنگ کا اینگل ایسا ہوگیا تھا کہ وہ شخص بہ آسانی ڈرائیونگ سیٹ سے جدا نہیں ہو پا رہا تھا۔ دلاور نے کسی نہ کسی طرح یہ مشکل بھی آسان کی اور اس شخص کو اپنے ساتھ کھینچتا ہوا سطحِ آب پر لے آیا۔ قریباً چھ منٹ بعد، بچھڑی ہوئی ہوا دیوانہ وار اس کے پھیپھڑوں میں گھسی اور اس کے جسم و جاں میں پھر سے زندگی دوڑ گئی۔

اس نے اردگرد نگاہ دوڑائی، دور دور تک کوئی دکھائی نہیں دیا۔ بس درخت اور ریتیلی زمین کے نشیب و فراز تھے۔ وہ بے ہوش نوجوان کو اپنے ساتھ کھینچتا ہوا کنارے پر لے آیا اور لٹا دیا۔ تب اس کی نگاہ دوبارہ خوبرو لڑکی پر پڑی۔ اس کی قمیص بھیگ کر اس کے جسم سے چپک گئی تھی۔ بال منتشر تھے اور بھیگی لٹیں مل کھا کر ایک رخسار کو ڈھانپے ہوئے تھیں۔ سورج کی ترچھی روشنی اس چہرے کو کچھ یوں منور کررہی تھی کہ وہ دیکھتا ہی چلا گیا۔ کچھ لمحے بڑے انقلاب آفریں ہوتے ہیں۔ ان میں صدیوں کی وسعت ہوتی ہے اور کوئی ایسی توانائی ہوتی ہے جو پلک جھپکتے میں پوری زندگی کا احاطہ کرلیتی ہے۔ یہ بھی کوئی ایسی ہی ساعتیں تھیں۔ دلاور سب کچھ بھول بھال کر اس چہرے کو دیکھتا چلا گیا۔ کوئی نادیدہ کشش تھی جو اسے اس چہرے کے بالکل قریب لے گئی۔ اس قدر قریب کہ وہ سانسوں کی آہٹ تک محسوس کرنے لگا۔ وہ عجب سوئی جاگی سی کیفیت تھی۔ اسے اتنا یاد تھا کہ وہ بے ساختہ آگے کو جھکا تھا۔ پھر کیا ہوا، کیسے ہوا، سب کچھ ایک سحر انگیز دھندلکے میں چھپا ہوا تھا۔ اس نے ان ہونٹوں کو اپنے ہونٹوں سے چھوا تھا جو شاید دنیا میں سب سے حسین ترین تھے۔ یا پھر وہ سب سے حسین ترین نہیں تھے لیکن اس جادوئی ماحول نے، سورج کی ان ترچھی کرنوں نے اور روہی کی مست کردینے والی ہوا نے انہیں حسین ترین بنا دیا تھا۔

وہ ٹھٹک کر پیچھے ہٹا، اس کا دل اتنی شدت سے دھڑک رہا تھا کہ لگتا تھا پسلیاں توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ مدہوشی کی سی کیفیت تھی لیکن اس کے اندر سے ایک طرح کی ملامت کا احساس بھی نمودار ہورہا تھا۔ وہ ایسا تو نہیں تھا، پھر اس سے یہ کیونکر ہوا؟

اچانک اسے خیال آیا کہ چند فٹ کے فاصلے پر وہ نوجوان بھی اوندھا پڑا ہے جسے اس نے موت کے منہ سے نکالا ہے اور جس کو ابتدائی طبی امداد کی فوری ضرورت ہے۔ وہ پلٹا اور اس نوجوان پر جھک گیا۔ اس کے پیٹ اور پھیپھڑوں میں یقیناً پانی بھرا ہوا تھا۔ وہ اس کی کمر پر دباؤ ڈال کر اس کے اندر سے پانی نکالنے لگا۔ کافی پانی نکلا۔ تب اس نے اسے سیدھا کیا اور اس کے دل کی دھڑکن سننے کی کوشش کی دھڑکن بہت مدھم تھی، جیسے کسی اتھاہ کنویں میں پانی ہلکورے لے رہا ہو۔ وہ اس کے سینے پر دباؤ ڈال کر دل کو پمپ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ بے ہوش نوجوان کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی۔ اس کو کھانسی کا شدید دورہ پڑا، پھر اس نے دو الٹیاں کیں..... وہ زندگی کی طرف لوٹ رہا تھا۔ دلاور کی مسلسل کوشش بے ثمر نہیں رہی تھی۔ اس دوران میں خوبرو لڑکی بھی ہوش میں آچکی تھی۔ وہ خالی خالی نظروں سے اردگرد دیکھ رہی تھی پھر اس کی نگاہ بے ہوش نوجوان پر پڑی۔

''شاہ زمان..... شاہ زمان!'' وہ چلاتی ہوئی اٹھی اور اس سے لپٹ گئی۔ وہ اس کے بھیگے بالوں میں انگلیاں چلا رہی تھی۔

دلاور نے حوصلہ کرکے لڑکی کو مخاطب کیا۔ ''میڈم! آپ حوصلہ رکھیں۔ یہ جلد ہوش میں آجائیں گے..... یہ دیکھیں..... ان کی پلکوں میں حرکت ہورہی ہے۔''

''اوہ گاڈ..... یہ کیا ہوگیا ہمارے ساتھ۔'' لڑکی کبھی اپنے ساتھی کی طرف اور کبھی اس تالاب کی طرف دیکھتی تھی جہاں ان کی جیپ پانی کے اندر گئی تھی۔

کچھ دیر بعد نوجوان کے حواس بھی بحال ہونے لگے۔ وہ مچی مچی آنکھوں سے تالاب کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے جسم پر کچھ چوٹیں آئی تھیں لیکن چہرے پر کوئی ایسا خاص نشان نہیں تھا۔ دلاور کو لڑکی کا نام سویرا معلوم ہوا۔ اس نے جدید تراش کی شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ اس کو جو واحد چوٹ لگی تھی وہ اس کے سر پر تھی۔ کنپٹی کی طرف ایک گومڑ بن گیا تھا جس میں سے خون بھی رس رہا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

اسی دوران میں قریبی گوٹھ سے بہت سے لوگ بھاگتے ہوئے جائے حادثہ پر پہنچ گئے۔ ان لوگوں کو بکریاں چرانے والے ایک چودہ پندرہ سالہ لڑکے نے حادثے کی اطلاع دی تھی۔ آناً فاناً شاہ زمان اور سویرا کو ایک اونٹ گاڑی پر بٹھا کر گوٹھ میں ایک ڈیرے پر پہنچا دیا گیا۔ پاؤں کی شدید چوٹ کی وجہ سے شاہ زمان کو چلنے میں سخت دشواری محسوس ہو رہی تھی۔

گوٹھ کا چودھری ''رحیم سائیں'' شاہ زمان کے بڑے بھائی کو اچھی طرح جانتا تھا۔ فوری طور پر ان کو طبی امداد دی گئی۔ سویرا کو ڈیرے سے تھوڑی دور ایک حویلی کے زنان خانے میں بھجوا دیا گیا۔ سویرا کی ایک کلائی پر گہری خراش دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے علاوہ بھی چھوٹی موٹی خراشیں تھیں لیکن شاہ زمان کی حالت پتلی تھی۔ اس کا ایک بازو نہیں ہل رہا تھا، جبکہ ٹخنے کے قریب گہرا زخم آیا تھا۔ اس زخم کی وجہ یہ تھی کہ جیپ الٹتے وقت یہ پاؤں بریک پیڈل میں پھنس گیا تھا۔

رحیم سائیں نے فوری طور پر گاؤں کے ماہر کمپاؤنڈر کو بلایا اور اپنے سامنے شاہ زمان کے ٹخنے اور بازو کی ڈریسنگ کروائی۔

رات آٹھ بجے کے لگ بھگ ڈیرے پر دو جیپیں آ کر کھڑی ہوئیں۔ ان میں سے دھڑا دھڑ لوگ اترنے لگے۔ وہ سب کے سب مسلح تھے۔ ان کی قیادت کرنے والا پیر فضل تھا۔ بھاری تن و توش، گہری گندمی رنگت، سفید چھدری ڈاڑھی اور سر پر مخصوص چولستانی پگڑی۔ وہ سیدھا شاہ زمان کے پاس آیا۔ شاہ زمان نیم دراز تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر شاہ زمان کو اپنے ساتھ لگایا اور ساتھ پڑی کرسی پر بیٹھ کر بولا۔ ''دھی رانی تو ٹھیک ہے نا؟''

''ہاں چاچا! وہ ٹھیک ہے، بس معمولی چوٹ آئی ہے۔'' وہ نقاہت سے بولا۔

''گھبرانے کی ضرورت نہیں..... تو بہر شیر ہے۔ میں نے جیپ پانی میں سے نکلوالی ہے۔ اپنے بندے ٹارچوں کی روشنی میں گڈی کا معائنہ کر رہے ہیں۔ ایک ٹائر میں ہوا نہیں ہے۔ کہیں کوئی فائر شائر تو نہیں لگا؟''

''نہیں چاچا! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔''

''تو پھر ہوا کیا ہے؟''

''بس قسمت میں یہ چوٹیں لکھی تھیں۔ اسپیڈ تھوڑی سی تیز تھی۔ ایک کھڈے کی وجہ سے جیپ اچھلی اور کنٹرول سے باہر ہو گئی؟''

''تجھے کتنی دفعہ کہا ہے پتر! گڈی کو گڈی سمجھا کر، ہوا کا گھوڑا نہ سمجھا کر۔'' وہ اپنی بھاری مونچھوں پر ہاتھ پھیر کر بولا۔ اسی دوران میں اس کی نگاہ قریب کھڑے دلاور پر پڑی۔ دلاور بڑے دھیان سے ساری گفتگو سن رہا تھا۔

''یہ منڈا کون ہے؟'' پیر فضل، دلاور کو بغور دیکھ کر بولا۔

''یہی تو ہے چاچا..... جس نے ہم دونوں کو موت کے منہ سے نکالا ہے۔'' شاہ زمان نے جذباتی لہجے میں کہا۔

''کیا نام ہے تمہارا..... اور کہاں کے رہنے والے ہو؟'' پیر فضل کا لہجہ اچانک نرم پڑ گیا۔

''دلاور نام ہے جی..... میں منڈ بھیرو..... میں رہتا ہوں۔''

''یہاں کے تو نہیں لگتے۔ کہاں سے آئے ہو؟'' پیر فضل نے پوچھا۔

''میرا دوست مجھے کراچی سے یہاں لایا ہے۔ چند مہینے سے یہاں اس کا مہمان ہوں۔''

اسی دوران میں ڈیرے کا مالک رحیم سائیں اپنے مسلح کارندوں کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ پیر فضل نے کھڑے ہو کر اس سے معانقہ کیا اور اچھے الفاظ میں اس کا شکریہ ادا کیا۔

رحیم سائیں نے کہا۔ ''بچوں کی جان بچ گئی ہے، اس سے بڑی خوشی کی بات اور کوئی نہیں اور اس خوشی میں سے یہ خوشی بھی نکلی ہے کہ آپ لوگ ہمارے غریب خانے پر تشریف لائے ہیں۔ یہ بڑے بخت کی بات ہے۔''

رحیم سائیں اور پیر فضل ساتھ ساتھ بیٹھے۔ ان کے بیٹھنے کے ساتھ ہی میزوں پر کھانا چن دیا گیا۔ پیر فضل کے بے حد انکار کے باوجود انہیں کھانے کی دعوت قبول کرنا پڑی۔ شاہ زمان کی طبیعت ابھی پوری طرح بحال نہیں تھی۔ اس نے بس چند لقمے لینے پر اکتفا کیا۔ کھانے کے دوران میں جب دلاور کو علیحدہ سے کھانا دیا جانے لگا تو شاہ زمان نے منع کر دیا اور اسے اپنے برابر میں بٹھا کر کھانا کھلایا۔

شاہ زمان خاموش تھا مگر تھوڑی تھوڑی دیر بعد بڑی عجیب نگاہوں سے دلاور کی طرف دیکھتا تھا۔ ان نگاہوں میں احسان مندی کے رنگ لہریں لیتے تھے اور احسان مندی کیوں نہ ہوتی۔ جان بچانے والا تو اللہ ہوتا ہے لیکن جو کچھ دلاور نے کیا تھا، شاید کوئی اور نہ کر سکتا۔ جیپ تو مکمل ڈوب چکی تھی۔ وہ اپنی جان کی پروا کیے بغیر گہرے غوطے میں گیا تھا اور سخت کوشش کر کے پہلے سویرا اور پھر اسے نکال لایا تھا۔ اگر اس کا سانس ٹوٹ گیا ہوتا تو پھر..... شاید

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

تالاب سے تین لاشیں ہی نکلتیں۔

پُرتکلف کھانے سے فارغ ہوکر پیر فضل نے سگار سلگا لیا اور موبائل فون پر شاہ زمان کے بڑے بھائی شاہ فرمان کو خیر خیریت کی اطلاع دی اور بتایا کہ وہ لوگ جیپ کو فی الحال یہیں پر چھوڑ رہے ہیں تاکہ اسے چلنے کے قابل بنایا جاسکے۔ اس کے بعد پیر فضل اور شاہ زمان نے رحیم سائیں کا پھر شکریہ ادا کیا اور سویرا کو بلوانے کا کہا۔

سویرا کا نام سن کر یکبارگی دلاور کا دل زور سے دھڑک اٹھا۔ تھوڑی دیر بعد جب سویرا بڑی سی چادر میں لپٹی لپٹائی باہر آمدے میں آئی تو پیر فضل نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور بولا۔ ''جیوندی رہ دھی رانی۔''

سویرا نے سر جھکا کر پیار وصول کیا۔ اسی دوران میں کریم کلر کی پھولدار چادر میں لپٹی ہوئی سرو قد سویرا نے ذرا ترچھی نظر سے دلاور کی طرف دیکھا۔ یہ نظر جیسے کسی ورمے کی طرح دلاور کے سینے سے آر پار ہوگئی۔ وہ بس ''ایک'' نگاہ ہی تھی۔ اس کے بعد وہ لوگ جتنی دیر وہاں کھڑے رہے، سویرا بالکل لاتعلق ہی رہی۔

وقتِ رخصت رحیم سائیں نے مٹھائی کے دو بڑے بڑے تھال پیر فضل کو پیش کیے اور صدقے کے طور پر ایک کالے بکرے کی قربانی ان کے سامنے کی۔

شاہ زمان کو کرسی پر بٹھا کر دو کارندوں نے اٹھالیا۔ جیپ میں بیٹھنے سے پہلے شاہ زمان نے ایک کارندے سے کہا۔ ''دیکھو، دلاور کہاں ہے؟''

دلاور جیپ کی دوسری جانب کھڑا تھا۔ کارندہ دلاور کو بلا لایا۔

شاہ زمان، دلاور کو خاموشی سے دیکھتا رہا..... پھر جیسے وہ کسی نتیجے پر پہنچ گیا۔ میٹھے لہجے میں بولا۔ ''دلاور! اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو ہمارے ساتھ چلو۔ دو چار دن حویلی میں ہمارے مہمان رہو۔ تمہارے ساتھ کچھ وقت گزار کر ہم سب کو بہت اچھا لگے گا۔''

دلاور کے کانوں میں جیسے شادیانے سے بج اٹھے۔ ایک بار پھر وہی چہرہ اور وہی ہونٹ اس کی آنکھوں کے سامنے آگئے۔ وہ کیا لمحے تھے؟ وہ کیا جادو تھا؟ وہ سب کچھ کیوں ہوگیا تھا؟ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ کوئی مقناطیس سا تھا جو اپنی بے پناہ طاقت سے اسے اپنی طرف کھینچ رہا تھا..... اور اس کی تمنا کے عین مطابق اسے چلنے کی دعوت دی گئی تھی۔

اس نے پہلے تو تھوڑی سی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا، پھر اپنے احسان مند میزبانوں کے ساتھ چلنے پر راضی ہوگیا۔

منڈ بھیرو کے جنوب مغرب میں تقریباً بیس کلومیٹر کے فاصلے پر یہ ایک ریگستانی گاؤں تھا۔ ''چوڑیرو'' نامی اس گاؤں کی خاص بات وہ خوبصورت نخلستان تھا جو ریگستانی پٹی کے ساتھ ساتھ چودہ پندرہ کلومیٹر تک چلا گیا تھا۔ وہاں مال مویشی چرتے تھے۔ فربہ بھینسیں آزادانہ گھومتی تھیں اور خاص قسم کی بھیڑیں تھیں جن کے منہ سفید اجلے اور جسم پر خوبصورت چتکبرے دھبے سے تھے۔ قریباً ایک ہزار نفوس پر مشتمل یہ ایک خوبصورت گاؤں تھا۔ بڑے سائیں کی قریباً پانچ ایکڑ پر پھیلی ہوئی حویلی مغلیہ دور کے کسی قلعے کی یاد دلاتی تھی۔ بلند فصیلیں، تین فٹ چوڑی دیواریں، اصطبل، نایاب گھوڑوں کے جتھے، دو کوہانی سفید اونٹ، شکاری کتے، چھیل چھبیلی ملازماؤں کی چہل پہل، دست بستہ ملازموں اور ہرکاروں کی فوج..... دلاور نے یہ شاندار حویلی دیکھی اور بس دیکھتا رہ گیا۔

درحقیقت دلاور کے پاؤں سے بگولے بندھے ہوئے تھے۔ وہ آزاد طبع رکھتا تھا۔ کسی ایک جگہ ٹک کر رہنا شاید اس کے لیے ممکن ہی نہیں تھا۔ دوسرے لفظوں میں وہ کسی بندھن میں نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ شتر بے مہار تھا۔ اسی لیے اس نے پنڈی چھوڑا، اسی لیے شہر لاہور کے دلکش بھنور، جو بہت سوں کو جکڑ کر مفلوج کردیتے ہیں، اس کا راستہ نہ روک سکے، اسی لیے شاید وہ کراچی کے ساحل کی گیلی ریت کو پاؤں سے دھکیلتا ہوا وہاں سے بھاگ نکلا۔

اور اب وہ یہاں اس حویلی میں تھا۔ منڈ بھیرو سے چلتے وقت دلاور نے اپنے دوست ملتانی کو بھی اپنے ساتھ لے جانے کی خواہش ظاہر کی تھی اور ملتانی بھی اس کے ساتھ ہی یہاں پہنچا تھا۔ پیر فضل تو حویلی میں داخل ہوتے ہی اپنے دو گن مین لے کر حویلی کے جنوب کی طرف چلا گیا۔ شاہ زمان اس عظیم الشان عمارت میں داخل ہوتے ہی سرتاپا ''بڑا سائیں'' نظر آنے لگا تھا۔ اس کے استقبال کے لیے بہت سی خواتین کھڑی تھیں۔ اس کی کرسی جب برآمدے میں رکھی گئی تو وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ شاہ زمان کا رنگ گورا، بال گھنگرالے، بھویں موٹی اور آپس میں ملی ہوئی تھیں۔ چوڑے جبڑے اس کی سخت مزاجی کو ظاہر کرتے تھے۔ وہ لنگڑاتا ہوا خواتین کی طرف بڑھا۔ سب سے پہلے آگے بڑھ کر جس عورت نے اس کا ماتھا چوما، وہ ادھیڑ عمر آپا صوفیہ تھی۔ سب انہیں بڑی آپا کہتے تھے۔ وہ شاہ زمان کے بڑے بھائی شاہ فرمان کی سب سے بڑی بیوی تھیں۔ وہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

دلاور کو ایک باوقار اور نہایت زیرک عورت لگیں۔ ایک ایسی خاتون جس نے بہت دکھ سہہ کر اور زمانے کا بہت سا ''سرد گرم'' دیکھ کر اب اپنی زندگی کے لیے مناسب راستے ڈھونڈ لیے ہوں۔

انہوں نے دراز قد شاہ زمان کے دونوں کندھوں پر ہاتھ پھیرا اور بولیں۔ ''آپا صدقے، تو ٹھیک تو ہے نا؟''

شاہ زمان بولا۔ ''بڑی آپا! خدا کا شکر ہے، اس نے نئی زندگی دی ہے ہم دونوں کو۔''

بڑی آپا نے شاہ زمان کے سر پر ہاتھ پھیرنے کے بعد سویرا کو گلے سے لگا لیا۔ وہ ہچکیوں کے ساتھ رونے لگی۔ دلاور فاصلے پر کھڑا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اس کی نگاہ جتنی بار بھی سویرا پر پڑی تھی، بس وہیں جم کر رہ گئی تھی۔ اسی دوران میں حویلی کی دیگر خواتین آگے بڑھ کر سویرا اور شاہ زمان کی بلائیں لینے لگیں۔ دلاور کو ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ سویرا اور شاہ زمان کا آپس میں کیا رشتہ ہے؟

اسی دوران میں شاہ زمان نے دلاور کو اشارے سے اپنے پاس بلایا اور بڑی آپا کو بتایا کہ یہی وہ بندہ ہے جس کے وسیلے سے آج ان دونوں کی جان بچ پائی ہے۔ بڑی آپا نے دلاور کو سرتاپا دیکھا پھر بڑے شائستہ انداز میں اس کے لیے شکریے اور تعریف کے الفاظ ادا کیے۔ بڑی آپا نے دلاور کی طرف دیکھ کر شاہ زمان کے کان میں ایک دو سرگوشیاں بھی کیں۔

دلاور اور ملتانی کو بڑی محبت کے ساتھ مہمان خانے کے ایک شاندار کمرے میں ٹھہرایا گیا۔ ان کی میزبانی میں کسی طرح کی کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی گئی۔ ملتانی خوش خوراک تھا۔ موجودہ صورتِ حال اس کے لیے بہت اطمینان بخش تھی۔ ملتانی کو اخبار پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ کھانے والی اشیا کے اشتہار وہ خاص رغبت سے دیکھتا تھا۔ ویسے وہ پانچ چھ جماعتیں ہی پڑھا تھا۔ اس کے برعکس دلاور نے کھینچ تان کر ایف اے پاس کر رکھا تھا۔ وہ صرف کھانے کے اشتہاروں کے لیے اخبار نہیں دیکھتا تھا بلکہ اسے پڑھتا بھی تھا۔

اگلے روز ملتانی حویلی میں تھوڑا سا گھوما پھرا۔ اس نے ملازمین سے باتیں کیں اور تھوڑی بہت سن گن بھی لی۔ اسے پتا چلا کہ شاہ زمان کے بڑے بھائی شاہ فرمان نے چار شادیاں کر رکھی ہیں۔ اس کی سب سے بڑی بیوی آپا صوفیہ اور سب سے چھوٹی جو حال ہی میں بیاہی گئی ہے، شاہدہ کے نام سے جانی جاتی ہے۔ شاہ زمان حالانکہ چھوٹا ہے پھر بھی اسے بڑا سائیں کہا جاتا ہے اور وہ اس لیے کہ وہ بڑے بھائی سے زیادہ قابل اور سمجھ دار ہے..... اور چوڈیرو کے لوگ اس کی بے پایاں صلاحیتوں کی وجہ سے اسے ہی بڑا سمجھتے ہیں، جبکہ اصل بڑا یعنی شاہ فرمان زیادہ تر نشے میں غرق رہتا ہے۔ شاہ زمان کے بارے میں ملتانی کو معلوم ہوا کہ وہ ابھی تک غیر شادی شدہ ہے لیکن جلد ہی اس کی شادی رچنے والی ہے۔

شام کے وقت دلاور نے کمرے کی کھڑکی میں سے باغیچے کی طرف دیکھا۔ وہاں شاہ زمان کھڑا تھا۔ زخمی پاؤں کی وجہ سے اس نے ہاتھ میں واکنگ اسٹک تھام رکھی تھی۔ اس کے قریب وہی ماہ رخ، پری پیکر تھی جس نے پلک جھپکتے ہی دلاور کے دل کی دنیا زیروزبر کر ڈالی تھی..... ہاں وہ سویرا تھی۔ لمبے بال کمر تک جا رہے تھے، ریشمی اوڑھنی ان بے بہا بالوں کو سنبھالنے میں ناکام تھی۔ وہ شاہ زمان سے بات کر رہی تھی۔ شاہ زمان مونچھوں پر انگلی پھیر رہا تھا اور بڑی پُرتپش نظروں سے سویرا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ شرمانے والے انداز میں مسکرائی اور پھر رخ پھیر کر سفید گلابوں کی کیاری کی طرف متوجہ ہو گئی۔ ایک خاص دلکشی تھی اس کے نقوش میں۔

دلاور کے دل میں جیسے ایک کانٹا سا چبھ گیا۔ تو کیا سویرا ہی وہ لڑکی تھی جس سے شاہ زمان کی شادی کی تیاری ہو رہی تھی؟ وہ بے ساختہ سویرا کی طرف دیکھتا چلا گیا۔ آس پاس کا سارا منظر جیسے فیڈ آؤٹ ہو گیا۔ اس کے سامنے بس وہ دلکش مرمریں مورتی رہ گئی جو کسی بات پر مسکرا رہی تھی۔ اس کی مسکراہٹ اس کی مجموعی خوبصورتی کی طرح لاجواب تھی۔ اس نے سوچا..... بے پناہ خوبصورت لوگوں کی ہنسی بھی ایسی ہی لاجواب ہونی چاہیے۔ اچانک اس نے خود کو اس ''فرانس'' میں سے نکالا۔ یہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا تھا؟ وہ ایسا تو نہیں تھا؟ وہ تو کسی کی بھی پروا نہیں کرتا تھا۔ پھر یہ کیسا منہ زور جذبہ تھا جو اسے اپنے ساتھ بہائے چلا جا رہا تھا۔ یہ کیسی کشش تھی جو اس کے وجد کی طنابیں کھینچ رہی تھی؟

شاید کچھ معاملات انسان کے بس میں ہی نہیں ہوتے۔ کچھ بے پناہ لمحے ایسے ہوتے ہیں جو انسان کو بے بس کر دیتے ہیں۔ کچھ احساسات، جن کی ڈوریاں دستِ غیب سے حرکت میں آتی ہیں۔

سویرا آسمان پر چمکتا ہوا چاند تھی اور دلاور زندگی کے صحرا میں اڑنے والا ریت کا ایک ذرّہ۔ وہ چوڈیرو کی امیرزادی تھی اور وہ نگر نگر گھومنے والا بنجارا جسے اپنی ابتدا، اپنے ماضی کا بھی علم نہیں تھا۔ انجانے میں ایک جذبہ تھا جو

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

دلاور کے دل میں نمو پا چکا تھا۔ انسان کے اندر کوئی بھی تبدیلی رونما ہوتی ہے تو اس کا ادراک سب سے پہلے خود اسی کو ہوتا ہے۔ دلاور سمجھ چکا تھا، کوئی بہت بڑی تبدیلی احساسات میں آچکی ہے۔

یہ دوسری رات کی بات ہے، وہ ایک لمحے کے لیے بھی سو نہ سکا۔ بیڈ روم بہت شان دار تھا۔ ملتانی نے مرغ پلاؤ اور خالص دودھ کی کھیر بہت سیر ہو کر کھائی تھی۔ اب وہ سو سیر کا ریچھ اوندھے منہ پڑا خراٹے لے رہا تھا مگر دلاور کی آنکھوں سے نیند روٹھ چکی تھی۔ وہ جونہی آنکھیں بند کرتا، دو گلابی ہونٹ اس کی آنکھوں میں جھلملاتے اور وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھتا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے بھی یہی ہوا تھا، وہ اچانک بستر سے اٹھ بیٹھا تھا۔ اس نے سنگِ مرمر کی تپائی سے جگ اٹھایا، پانی گلاس میں ڈالا اور ایک ہی بار میں پی گیا۔ اسے گرمی محسوس ہونے لگی، دل گھبرانے لگا۔ وہ بیڈ سے اترا، ہولے سے دروازہ کھولا اور باہر نکل آیا۔ رات کا شاید پچھلا پہر تھا۔ مشرق کی طرف سے ہلکی صحرائی ہوا چل رہی تھی۔ وہ صحن میں آیا۔ یہاں زنانے اور مردانے حصے کے درمیانی احاطے میں ایک طرف دو جھولے لگے ہوئے تھے۔ اس سے آگے کافی وسیع گراسی لان تھا جہاں انواع و اقسام کے پھول اور پھل دار پودے تھے جن میں سے زیادہ تر جنوبی پنجاب سے منگوا کر یہاں لگائے گئے تھے۔ لان کے اختتام پر اینٹوں کی سولنگ والا ایک اور احاطہ تھا جہاں جیپیں اور دیگر گاڑیاں کھڑی کرنے کے لیے جگہ بنائی گئی تھی۔ اس سے آگے ملازمین کے رہائشی کوارٹرز تھے۔ کوارٹرز کی بائیں جانب زنانے حصے کی دو منزلہ عمارت تھی جو درختوں کے پیش منظر میں آدھی چھپی، آدھی ظاہر ہو رہی تھی۔ اسی عمارت کی بالائی منزل کے کچھ کمروں میں مدھم روشنی تھی جو بیش قیمت پردوں سے چھن چھن کر باہر آ رہی تھی۔ اس نے سوچا ایسے ہی کسی کمرے میں سویرا سو رہی ہوگی۔ وہ بے مثل حسن سوتے میں کیسا لگتا ہوگا؟ کیا حسن کے سونے کا انداز بھی حسین ہوتا ہے؟ ایک بار پھر وہی دو لب...... تھوڑے سے نم...... تھوڑے سے گرم اس کے تصور میں آن دھمکے۔ اس نے سوچا اگر اس وقت تالاب کے کنارے، کوئی اسے یہ حرکت کرتے دیکھ لیتا تو کیا ہوتا؟

اس نے جھرجھری سی لی اور خیالات کے نرغے سے باہر آنے کی کوشش کرنے لگا۔

چہل قدمی کرتا ہوا وہ ملازمین کے کوارٹرز سے آگے چلا گیا۔ وہاں کھجوروں کے بہت سے درخت تھے۔ وہ ابھی واپس مڑنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اسے درختوں سے آگے کچھ کھٹ پٹ سی سنائی دی۔ وہ چونک گیا اور دبے پاؤں چل کر سرعت سے ایک دیوار کی اوٹ میں ہو گیا۔ چند لمحے بعد اس نے ایک حیران کن منظر دیکھا۔ وہ چند ملازمین تھے جو ڈھائی تین فٹ مربع کے تین چار چوبی ڈبے اٹھائے ایک کمرے میں داخل ہو رہے تھے۔ تجسس کے سبب اس کی تمام خوابیدہ حسیات جاگ اٹھیں۔ وہ جس جگہ کھڑا تھا، وہاں سے ملازمین کی نظر میں نہیں آسکتا تھا۔ اس نے تھوڑی سی ہمت کی اور درمیانی فاصلہ کچھ اور کم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہاں سے منظر تھوڑا اور واضح ہو گیا۔ وہ پانچ افراد تھے جو لکڑی کے چوکور ڈبوں کو بڑی احتیاط سے اٹھائے ایک تاریک دروازے میں داخل ہو رہے تھے۔ ڈبوں میں چھوٹے چھوٹے سوراخ بھی نظر آ رہے تھے۔

ان ڈبوں میں کیا تھا؟ رات کے اس پہر اتنی رازداری سے یہ کام کیوں کیا جا رہا تھا؟ کئی سوال دلاور کے ذہن میں کلبلانے لگے۔ ملازمین تاریک دروازے میں داخل ہو کر اوجھل ہو چکے تھے۔ باہر سناٹے میں بس مدھم صحرائی ہوا کی سرگوشی تھی۔ وہ دبے پاؤں چلتا ہوا تاریک دروازے تک پہنچ گیا۔ دروازے سے آگے سیڑھیاں کسی تہ خانے میں اتر رہی تھیں۔ ملازمین سیڑھیوں کے نچلے سرے تک پہنچ چکے تھے۔ دلاور دروازے کی اوٹ سے یہ مناظر دیکھ رہا تھا۔ تاہم وہ اپنے عقب سے بھی بے خبر نہیں تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ وہیں کھڑا رہے یا پلٹ جائے۔ اس سے پہلے کہ وہ کسی فیصلے پر پہنچتا، نیچے کسی ملازم کے ہاتھوں سے ڈبا چھوٹ کر فرش پر جا گرا۔ پھر اچانک کوئی چیز پھڑپھڑانے لگی۔ پورے تہ خانے میں جیسے بھگدڑ مچ گئی۔ ملازمین میں افراتفری پھیل گئی۔ وہ ایک دوسرے کو کوس رہے تھے اور ان میں سے کوئی ایک ننگی گالیاں بھی دے رہا تھا۔

پھر ایک ملازم تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتا ہوا اوپر آیا۔ دلاور نے بڑی تیزی سے اپنی جگہ چھوڑی۔ اگر وہ ایک لمحے کی تاخیر کر دیتا تو اس شخص کی نظر میں آجاتا۔ اس شخص نے بڑی عجلت میں تہ خانے کا دروازہ ایک دھماکے سے بند کر دیا۔

دلاور دیوار سے پشت لگائے ساکت و جامد کھڑا تھا۔ یہ ابھی، اس نے کیا دیکھا تھا۔ لکڑی کے چوکور ڈبے میں کیا تھا جو نکلا تھا اور پھڑپھڑانے لگا تھا؟

دور کہیں مغرب کی جانب کسی ریگستانی گلی کی چھوٹی سی مسجد سے اذانِ فجر کی آواز بلند ہونے لگی تھی۔ اس نے

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

اپنی جگہ چھوڑ دی۔ مہمان خانے میں پہنچا تو ملتانی جاگ چکا تھا اور اس کی غیر حاضری پر بے حد پریشان دکھائی دے رہا تھا..... دلاور کو دیکھتے ہی بولا۔ ''کہاں غائب ہو گئے تھے؟''

''میں ذرا چہل قدمی کے لیے نکلا تھا۔ پیٹ میں اینٹھن سی ہو رہی تھی۔''

ملتانی بولا۔ ''کھانا تو میں ڈٹ کر کھاتا ہوں اور اینٹھن تمہارے پیٹ میں ہونے لگتی ہے۔''

''یہی تو سچی دوستی کا ثبوت ہے۔'' دلاور نے بستر پر گرتے ہوئے کہا۔

ملتانی تو تھوڑی دیر باتیں کرنے کے پھر بعد سو گیا مگر دلاور جاگتا رہا۔ اس کا ذہن بار بار تہ خانے والے واقعے کی طرف جا رہا تھا۔

صبح دلاور کے لیے بے حد خوبصورت تھی۔ بیڈ روم سے نکل کر جب وہ نشست گاہ میں آیا تو سویرا ایک ملازمہ کے ساتھ ایک چھوٹی ٹیبل پر ناشتا لیے بیٹھی تھی۔ چہرہ پر سوں رات سے بھی زیادہ پیارا اور روشن دکھائی دیتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ دودھ اور میدے سے نہا کر نکلی ہے۔ ملازمہ جھک کر ناشتے کی چیزیں ترتیب سے میز پر رکھ رہی تھی۔ سویرا تمکنت سے بیٹھی مسکرا رہی تھی۔ اب تک کے مشاہدے میں دلاور نے نوٹ کیا تھا کہ سویرا نہ صرف پڑھی لکھی اور روشن خیالات والی لڑکی ہے بلکہ کافی حد تک صاف گو اور بے تکلف بھی ہے۔ بے شک حویلی کا ماحول جاگیردارانہ رنگ ڈھنگ کا تھا مگر سویرا اپنے حلیے سے لے کر اپنی بول چال تک بالکل ماڈرن لگتی تھی۔

''ہیلو مسٹر دلاور۔'' وہ دلکش انداز میں مسکرائی۔ ''تمہارا وقت کیسا گزر رہا ہے؟''

دلاور کا دل یکبارگی بے طرح دھڑک اٹھا۔ وہ کتنی بے تکلفی سے اسے مخاطب کر رہی تھی۔ وہ مؤدب انداز میں اس کے سامنے بیٹھ گیا اور بولا۔ ''سویرا بی بی! آپ کی مہمان نوازی کا بہت شکریہ لیکن..... آج رات میں..... ایک پل کے لیے بھی سو نہیں سکا۔''

وہ تھوڑی پریشان ہو گئی۔ ''کیوں؟ کوئی مسئلہ تھا؟''

وہ کہنا چاہتا تھا..... سب سے بڑا مسئلہ تو آپ ہیں سویرا بی بی..... لیکن کہہ نہیں سکا۔ ''اصل میں مجھے نئی جگہ نیند نہیں آتی۔'' اس نے نگاہیں جھکاتے ہوئے کہا۔

''پھر تو تمہیں بڑی مشکل پیش آتی ہو گی..... میرا مطلب ہے، تم نے خود ہی بتایا ہے کہ تم شہر شہر اور بستی بستی گھومتے ہو۔''

وہ کچھ جھینپ سا گیا۔ اسی دوران میں سویرا نے چائے کا کپ اس کی طرف بڑھایا۔ وہ بڑی احتیاط سے کپ سویرا کے ہاتھ سے لیتے ہوئے بولا۔ ''نہیں..... پہلے دو چار دن مشکل پیش آتی ہے، پھر میں عادی ہو جاتا ہوں۔''

سویرا کی تیز نگاہیں دلاور کی حرکات و سکنات کو بغور دیکھ رہی تھیں۔ وہ کچھ نروس سا ہونے لگا۔ اپنی گھبراہٹ کو دور کرنے کے لیے اس نے بیڈ روم کی طرف رخ کر کے ملتانی کو آواز دی۔ اس دوران میں سویرا نے ایک جیم کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اس کی کلائی میں ہفت رنگ چوڑیاں کھنکھنا اٹھیں۔ وہ ایک سلائس پر جیم لگاتے ہوئے بولی۔ ''دلاور! تم کچھ پریشان نظر آتے ہو؟''

''نن..... نہیں..... ایسی تو کوئی بات نہیں۔''

سویرا نے ملازمہ سے کہا کہ وہ بیڈ روم سے ملتانی کو بلا لائے۔ ملازمہ جونہی کمرے سے نکلی، سویرا تھوڑا آگے ہوئی اور اس نے نہایت بے تکلفی اور اعتماد سے اپنا ہاتھ دلاور کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ بڑے جذباتی لہجے میں بولی۔ ''تھینک یو ویری مچ دلاور! تم نے ہم دونوں کی جان بچا کر ہم پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ بچانے والا تو بیشک اوپر بیٹھا ہے مگر وہ بچانے کا کام اپنے ہی کسی بندے کو سونپتا ہے نا۔''

دلاور کا سارا وجود جیسے اس نرم و نازک ہاتھ کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا۔ اس کا دل چاہا، گھڑیاں ختم جائیں، وقت رک جائے..... اور وہ اسی مہرباں بوجھ تلے پڑا رہے۔ اس نے سویرا کی بات کا جواب دیتے ہوئے بہ مشکل کہا۔ ''میں کسی قابل نہیں ہوں سویرا بی بی! بس اوپر والے نے مجھ سے یہ کام لینا تھا، لے لیا.....''

سویرا کی کنپٹی پر ابھی تک ایک چھوٹی سی بینڈیج موجود تھی۔ وہ بے دھیانی میں اپنی اس چوٹ کو سہلاتے ہوئے بولی۔ ''جب جیپ پانی میں گری، تم اس وقت کہاں تھے؟''

دلاور نے اسے تفصیل سے سب کچھ بتایا۔ کیسے اس نے جیپ کو لہراتے اور زوردار آواز سے پانی میں گرتے دیکھا۔ کیسے وہ پانی میں اترا، غوطہ لگایا، دونوں کو باہر لانے کے لیے اس نے کیا کیا کوشش کی۔ اس نے سب کچھ بتایا مگر ان جادوئی لمحوں کے بارے میں کچھ نہیں بتایا جب اس نے سویرا کو بالکل سیدھا، ریت پر لیٹے دیکھا تھا..... اس کی نگاہیں، اس کے دلکش چہرے پر پیوست ہو کر رہ گئی تھیں اور پھر وہ کچھ ہوا تھا جس کا اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ وہ ارد گرد کی ہر چیز کو فراموش کر کے اس کے بے مثل چہرے پر جھک

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

گیا تھا..... اور وہ یہ سب کچھ بتا بھی کیسے سکتا تھا؟ یہ تو ایک ایسا سنہری راز تھا جسے وہ زندگی کی آخری سانس تک اپنے سینے میں چھپا کر رکھنا چاہتا تھا۔

گفتگو کے دوران میں سویرا نے اچانک کہا۔

"دلاور! کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ تم ہمارے ساتھ یہاں اس حویلی میں ہی رہو۔ شاہ زمان صاحب کوئی بھی مناسب کام تمہارے اور ملتانی کے ذمے لگا سکتے ہیں؟"

کل شاہ زمان نے بھی اس سے ملتی جلتی بات کی تھی مگر دلاور کوئی جواب نہ دے پایا تھا۔ پتا نہیں کیوں اس حوالے سے اس کی دلی کیفیت کچھ عجیب سی تھی۔ کبھی تو اس کا دل چاہتا تھا کہ اس حویلی کو اور اس میں "رہنے والی کو" ایک پل کے لیے بھی اپنی نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دے..... اور کسی وقت دل میں آتا تھا کہ کہیں دور بھاگ جائے اور پھر بھول کر بھی ان راہوں پر قدم نہ رکھے جو اسے اس حویلی کی طرف اور اس کے مکینوں کی طرف لاسکیں۔ اب بھی وہ سویرا کو کوئی ٹھوس جواب نہ دے پایا اور صرف اتنا کہا کہ ان کی مہربانی کا بہت شکریہ۔ وہ اس بارے میں سوچے گا۔

ملازمہ شگفتہ ناشتے کے برتن اٹھا کر چلی گئی۔ کچھ دیر بعد سویرا بھی اپنے سیل فون پر کال سنتی ہوئی باہر نکل گئی۔ دلاور اور ملتانی وہیں بیٹھے رہے۔ ملتانی کو یہاں جو کچھ کھانے کو مل رہا تھا، اس نے اس کی ساری سوچیں اس کے معدے میں جمع کردی تھیں۔ وہ آج کل جیسے دماغ سے نہیں معدے سے سوچ رہا تھا۔ اس نے دلاور کو گردن سے پکڑ کر ذرا جھنجوڑتے ہوئے کہا۔ "اوئے نا نہجار! کیوں عزت کی روزی روٹی کو لات مار رہا ہے۔ دو ٹکے کے لوگ نہیں ہم اور یہاں ہمیں سر آنکھوں پر بٹھایا جارہا ہے۔ اگر یہ لوگ آفر کررہے ہیں تو مان جا۔ اگر کچھ زیادہ نہ بھی ہوا تو ان کا چھوٹا ملازم تو ضرور بن جائے گا تو..... اور چھوٹے ملازموں کو یہ وڈے لوگ اپنی جان سے لگا کر رکھتے ہیں۔"

دلاور جیسے ملتانی کی بات سن ہی نہیں رہا تھا۔ وہ کھوئے کھوئے انداز میں حویلی سے آگے، درختوں سے پرے..... مشرق کی جانب اس دشت کو دیکھنے لگا جسے مقامی لوگ روہی کہتے تھے۔ ان ریتیلے راستوں پر تند ہوائیں گشت کرتی تھیں۔ گرم جھونکوں کی تپش میں ایک بے نام سی اداسی اور تڑپ چھپی رہتی تھی۔ یہ ہوائیں اجنبی سناٹوں کی کوکھ سے جنم لیتی تھیں..... اور اجنبی سناٹے..... اس کا پہلا عشق تھے۔ اب یہ بے وجود عشق ایک ہیولے کی شکل اختیار کررہا تھا، ایک چہرے میں ڈھل رہا تھا۔

☆☆☆

منظر ہال نما کمرے کا تھا۔ بیش قیمت قالین، شاندار مسہری، دلکش فانوس، کھڑکیوں پر بھاری کامدار پردے۔ سویرا گرمیوں کے ہلکے پھلکے لباس میں تھی۔ وہ مسہری کے پاس ہی غالیچے پر آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی۔ اس کی چچازاد رمشا، مسہری پر یوں بیٹھی تھی کہ اس کے پاؤں سویرا کی گود میں تھے۔ سویرا اس کے پاؤں کے ناخنوں پر کیوٹکس لگا رہی تھی۔

رمشا نے کہا۔ "یہ بندہ کوئی شے ہی لگتا ہے۔ کل میں نے اسے زمان بھائی کے ساتھ باغیچے میں گھومتے دیکھا تھا۔ لگتا تھا کہ پی ٹی وی کی کسی سیریل سے کوئی ہینڈسم ہیرو اٹھ کر ہماری حویلی میں چلا آیا ہے۔"

"تو تیرے کیا ارادے ہیں؟" سویرا نے ذرا شوخی سے کہا۔

"اگر تیری طرح میرے گلے میں بھی منگنی والی رسی نہ ہوتی تو ہوسکتا تھا میں اسے..... تین لفظ بول دیتی۔" وہ مزاحیہ انداز میں بولی۔

"ہائیں، تین لفظ؟" سویرا نے آنکھیں نکالیں۔ "یعنی شادی سے پہلے ہی اسے طلاق طلاق طلاق کہہ دیتیں۔"

"صرف یہی تین لفظ نہیں ہوتے۔ آئی لو یو بھی تو تین لفظ ہوتے ہیں۔" رمشا نے کہا اور شرمانے کی اداکاری کرنے لگی۔

"دُر فٹے منہ تیرا..... اور تیری عقل کا بھی۔" سویرا نے اطمینان سے کہا۔

"اور تیری عقل بھی کوئی آسمان کو نہیں چھو رہی۔ یہ طلاق والا لفظ عورتیں نہیں بولتیں۔ انہیں کچھ کہنا ہی پڑے تو پھر کہتی ہیں۔ خلع..... خلع..... خلع....."

"اچھا بکواس بند کر اپنی۔" سویرا نے قدرے بیزاری سے کہا۔

رمشا نے مسہری چھوڑی اور دھپ سے سویرا کے سامنے غالیچے پر آبیٹھی۔ سویرا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ "میں تجھے ایک بات بتانا تو بھول ہی گئی۔"

"کیا؟"

"میں کل کچن سے نکل رہی تھی کہ اچانک بڑی آپا کی آواز کان میں پڑی۔ وہ تمہاری شادی کی بات کررہی تھیں، بے بے جی سے۔"

"کیا کہہ رہی تھیں؟" سویرا نے نظریں جھکائے

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

جھکائے پوچھا۔

''دل میں لڈو پھوٹنے لگے ہیں نا..... دیکھو دیکھو ذرا..... میری سوہنی سہیلی کا مکھڑا کیسے لال گلابی ہوتا جارہا ہے۔''

''اپنی چونچ بند کرو اور اگر کوئی بات ہے تو بتاؤ۔''

''بڑی آپا، بے بے جی سے کہہ رہی تھیں۔ وڈے بھا (شاہ فرمان) نے کہا ہے، دسمبر میں بہت سے کاروباری مسئلے ہیں، زمینوں کے ٹھیکے وغیرہ دینے ہیں اور بھی کئی کام ہیں، شاہ زمان کی شادی دسمبر کے بجائے اکتوبر میں ہی رکھ لی جائے۔''

سویرا کے دودھیا چہرے پر اب واقعی سرخی دوڑ گئی۔ یہ شرم کی سرخی تھی۔ اس کا سر جیسے بے ساختہ جھک گیا۔

رمشا خاموشی سے اسے دیکھنے لگی پھر اس نے ایک گہری سانس لی اور ایک دم سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ ''سویرا! تمہیں یقین ہے کہ شاہ زمان تمہیں بہت چاہتا ہے؟''

''اس میں کوئی شک نہیں۔'' سویرا نے بھی سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

''تم شہر کی پڑھی لکھی لڑکی ہو۔ شاہ زمان بھی کوئی ان پڑھ نہیں ہے لیکن جو کچھ بھی ہے، وہ زمینداری والا ذہن رکھتا ہے۔ یہاں حویلی کا ماحول بھی تم سے کوئی ڈھکا چھپا نہیں ہے۔''

''کیا کہنا چاہتی ہو؟''

''اس کے مزاج کو اور یہاں کے رسم و رواج کو بدل پاؤ گی؟''

''ارادہ تو مضبوط ہے۔'' وہ ہولے سے مسکرائی۔

رمشا کچھ دیر خاموشی سے اسے دیکھتی رہی پھر بولی۔ ''اور اگر..... کچھ غلط ہونا شروع ہوگیا تو؟ میرا مطلب ہے..... مثلاً..... اگر..... دو چار سال بعد..... اپنے بزرگوں کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے شاہ زمان نے بھی.....''

سویرا نے اس کا جملہ مکمل نہیں ہونے دیا اور تیز لہجے میں بولی۔ ''نہیں رمشا! میں نے کہا ہے نا کہ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ زمانہ بدل گیا ہے..... حویلی بھی بدل رہی ہے۔ ہمیں اچھے کی امید رکھنی چاہیے اور یہ امید میرے اندر موجود ہے۔''

''لیکن..... فرض کرو..... ایسا ہوگیا تو..... کچھ عرصے بعد تم سے شاہ زمان کو بانٹنے کے لیے کوئی اور آ گئی تو؟''

''تمہیں کہا ہے نا کہ ایسا نہیں ہوگا۔ اگر ہو گیا تو سب کچھ ختم ہو جائے گا.....'' شاید سویرا کچھ اور بھی کہتی لیکن اسی دوران میں کہیں پاس سے وڈے بھا شاہ فرمان کی بھاری بھرکم آواز سنائی دی اور دونوں لڑکیاں جیسے ڈر کر خاموش ہوگئیں۔

☆☆☆

دلاور بہت بے چینی میں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جو کچھ اس کے سینے میں پنپ رہا ہے، وہ کسی بھی صورت میں ہو نہیں سکتا۔ وہ محلوں میں پلنے والی شہزادی تھی، وہ ایک بے نام بے ہنر بے کار انسان تھا۔ ان کا میل ہوتا بھی تو کیسے؟ اس نے اس کی جان بچائی تھی، وہ اس کی عزت کرتی تھی، اسے خاص اہمیت دیتی تھی مگر یہ کوئی فلمی سچویشن تو نہیں تھی کہ وہ اس کی محبت میں گرفتار ہو جاتی۔ اپنی منگنی تڑوا دیتی اور اس کے ساتھ کھیتوں کھلیانوں میں محبت کی پینگیں بڑھانے لگتی۔ کسی وقت وہ سوچنے لگتا تھا کہ جونہی شاہ زمان گاؤں واپس آئے گا، وہ اس سے سیدھی سیدھی بات کرے گا اور اس سے جانے کی اجازت طلب کرے گا۔

کسی وقت اس کے دماغ میں وہ تہ خانے اور لکڑی کے ڈبوں والے مناظر بھی چکرانے لگتے تھے۔ اس کا فطری تجسس بیدار ہوتا اور وہ سوچنے لگتا کہ وہ کیا قصہ تھا۔ اب بھی رات کا دوسرا پہر چل رہا تھا اور وہ انہی سوچوں میں گم مہمان خانے کے وسیع برآمدے میں چکر لگا رہا تھا۔ اس کے قدم جیسے بے ساختہ اس تہ خانے کی طرف اٹھ گئے۔ ابھی وہ تہ خانے سے کافی فاصلے پر ہی تھا کہ اسے دو پرچھائیاں بڑی تیزی سے چھت پر حرکت کرتی نظر آئیں۔ یہ یہاں کے پہریدار تو نہیں ہو سکتے تھے۔ انہیں اس طرح بھاگنے کی کیا ضرورت تھی۔ اچانک تہ خانے کی سیڑھیوں کی طرف کوئی بلند آواز سے للکارا۔ ''اوئے..... کون ہو تم..... کون ہو.....'' اس کے ساتھ ہی ایک فائر کی آواز آئی۔ تاریکی میں شعلہ سا چمک کر رہ گیا۔ آٹو میٹک رائفل کا فائر ایک زبردست ہنگامے کی شروعات ثابت ہوا۔ ایک دم ہی جیسے حویلی کا سناٹا چکنا چور ہوگیا تھا۔ بھاگو دوڑو کی آوازیں آئیں، دروازے دھڑدھڑائے، کھڑکیاں کھلیں، بلب روشن ہوئے اور پھر جیسے کہرام سا مچ گیا۔ ایک دم ہی اندھا دھند فائرنگ ہونے لگی۔

دلاور نے خود کو ایک چوکور ستون کی اوٹ میں کرلیا۔ ہر طرف چنگاریاں سی بکھر رہی تھیں۔ اصطبل کی طرف گھوڑے ہنہنا رہے تھے اور رکھوالی کے کتے شور مچا رہے تھے۔ ملتانی بھاگتا ہوا باہر نکلا۔ وہ بدحواس بھینسے کی طرح عین گولیوں کی زد میں جا رہا تھا۔ دلاور نے عقب سے اس کی قمیص کا کالر دبوچا اور گھما کر ایک چٹائی پر پھینک دیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

ملتانی ہراساں آواز میں بولا۔ ''یہ کیا ہو رہا ہے دلاور؟''

''برات روانہ ہو رہی ہے تیری ..... دیکھ نہیں رہا، فائرنگ ہو رہی ہے۔ سر نیچے رکھ۔'' آخری الفاظ دلاور نے چلّا کر کہے اور خود بھی ستون کی اوٹ میں سمٹ گیا۔

چند گولیاں سنسناتی ہوئی ان کے بالکل پاس سے گزریں۔ یکا یک ایک شخص بھاگتا ہوا آیا اور اوندھے منہ ان سے دس پندرہ فٹ کے فاصلے پر گرا۔ دلاور نے پہچان لیا۔ یہ حویلی کا ہی ایک کارندہ تھا۔ گولی غالباً اس کی کمر میں لگی تھی اور وہ گرتے ہی بے حرکت ہو گیا تھا۔

وہ جس جگہ پڑا تھا، وہاں اسے کسی بھی وقت مزید گولیاں لگ سکتی تھیں لیکن اسے وہاں سے ہٹانا بھی آسان نہیں تھا۔ ہٹانے والا براہِ راست گولیوں کی زد میں آجاتا۔ آخر دلاور کی فطری دلیری نے اسے مہمیز کیا۔ وہ ستون کی اوٹ سے نکلا اور جھک کر..... اور لپک کر، مضروب تک پہنچ گیا۔ اس نے اس کا ایک بازو پکڑا اور گھسیٹتا ہوا محفوظ آڑ میں لے آیا۔

یہی وقت تھا، جب پیر فضل بھی ہانپتا کانپتا وہاں پہنچ گیا۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹی نال والی رائفل تھی اور آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں۔

''شاباش دلاور! تم نے بڑی ہمت دکھائی۔ ورنہ یہ مارا جاتا۔'' اس کا اشارہ زخمی کارندے کی طرف تھا۔

''یہ کیا ہو رہا ہے فضل صاحب؟'' دلاور نے پوچھا۔

''حضور چانڈیو کے بندے گھس آئے ہیں۔ حرامزادے پکھیرو لینے آئے ہیں۔ پکھیرو تو ان کو ملے گا ایسا کہ ساری زندگی یاد رکھیں گے۔''

اسی دوران میں دو کارندے زخمی کارندے کو اٹھا کر مہمان خانے کے اندرونی کمروں کی طرف لے گئے۔ حویلی کا خاص کارندہ شیرو دوڑتا ہوا آیا۔ اس کی رائفل کی نال سے دھواں خارج ہو رہا تھا۔ بھاری بھرکم چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ وہ تہ خانے کی طرف سے آیا تھا۔ اس نے تمتمائے چہرے کے ساتھ پیر فضل کو اطلاع دی۔ ''پکھیرو کو کچھ نہیں ہوا جی۔ وہ کنجر سیڑھیوں تک تو آ گئے تھے مگر اندر نہیں جا سکے۔''

دو گولیاں شیرو کے بالکل قریب دیوار پر لگیں اور بہت سا پلستر اکھڑ کر برآمدے کے فرش پر جا گرا۔

شیرو نے دانت پیس کر ایک گالی دی اور جوابی فائرنگ کرتا ہوا آگے نکل گیا۔ پیر فضل نے بھی اپنے کارندوں کو اشارہ کیا۔ انہوں نے برآمدے کے آخری سرے پر جا کر مختلف جگہوں پر پوزیشنیں لے لیں۔ اسی دوران میں پیر فضل کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ اس نے کال ریسیو کی ..... پھر گرج کر بولا۔ ''حضور چانڈیو کے بندے ہیں۔ آج ان بدمعاشوں کو ایسا مزہ چکھا دو پھر کبھی ایسی جرأت نہ کریں۔'' وہ بات کرتا ہوا اور دیوار کی آڑ لیتا ہوا آگے نکل گیا۔

دلاور گم صم کھڑا تھا۔ حضور چانڈیو، تہ خانہ ..... پکھیرو..... یہ سب کیا گورکھ دھندا تھا۔ اچانک اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ کہیں لکڑی کے ان ڈبوں میں پکھیرو یعنی پرندے تو بند نہیں تھے۔ ڈبوں میں سوراخ تھے اور اس رات دلاور کو ایک ڈبے سے پھڑ پھڑاہٹ بھی سنائی دی تھی۔ اگر یہاں کسی پرندے کی بات ہو رہی تھی تو پھر وہ کیا ہو سکتا تھا؟ کہیں یہ کوئی باز یا عقاب قسم کی چیز تو نہیں تھی؟ اسے معلوم تھا کہ یہ زمیندار وڈیرے باز عقاب اور شاہین وغیرہ کے شکار کے شوقین ہوتے ہیں۔

اچانک دلاور کو بالائی منزل سے چلّانے کی آواز آئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ بالائی برآمدے میں اسے بڑی آپا دکھائی دیں۔ وہ ایک حملہ آور پر جھپٹی تھیں اور اس سے رائفل چھیننے کی کوشش کر رہی تھیں۔ رائفل بردار نے ہنسا کر بڑی آپا کو زور سے دھکا دیا۔ وہ سیڑھیوں سے لڑھکتی ہوئی کئی فٹ نیچے گریں۔ یہ منظر کسی اور نے بھی دیکھا تھا اور جس نے دیکھا تھا، وہ طیش سے دیوانہ ہو کر حملہ آور پر جھپٹ پڑا تھا اور یہ جھپٹنے والا کوئی اور نہیں تھا، سویرا تھی۔ وہ شیرنی کی طرح اس ''حملہ آور'' پر آئی جس نے بڑی آپا کو دھکا دیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ہاکی تھی۔ اس نے یہ ہاکی پورے زور سے حملہ آور کی کلائی پر ماری۔ اس کے ہاتھ سے رائفل چھوٹ کر جنگلے سے ٹکرائی اور پھر نیچے احاطے میں جا گری۔ سویرا نے دوسرا وار حملہ آور کے سر پر کیا۔ یہ وار حملہ آور نے اپنے ہاتھوں پر روکا اور سویرا سے ہاکی چھیننے کے لیے اس سے گتھم گتھا ہو گیا۔ دلاور نے یہ منظر دیکھا تو اپنی جگہ کھڑا نہ رہ سکا۔ وہ یہ سب کچھ کیسے دیکھ سکتا تھا۔ دیکھ ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ تو اس کی جان تھی۔ اس کی رگوں میں لہو بن کر دوڑ رہی تھی۔ سانس بن کر اس کے سینے میں چل رہی تھی۔ وہ برآمدے میں اندھا دھند بھاگتا ہوا سیڑھیوں تک پہنچا۔ کئی گولیاں اس کے آس پاس سے گزری ہوں گی لیکن اسے کچھ پتا نہیں چلا۔ وہ سیڑھیاں پھلانگتا ہوا بالائی برآمدے میں آ گیا۔

جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، حملہ آور کی ایک کلائی ٹوٹ گئی تھی۔ حملہ آور سویرا سے ہاکی چھین نہیں پایا تھا۔ وہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

اب بے دریغ اسے پیٹ رہی تھی مگر وہ اس بات سے بے خبر تھی کہ حملہ آور کا ایک ساتھی اس کی مدد کے لیے پہنچ چکا ہے۔ اس کے ہاتھ میں قریباً نو انچ لمبے پھل کا تیز دھار چاقو تھا۔ وہ سویرا پر جھپٹ رہا تھا جب دلاور اس کے راستے میں دیوار بن گیا۔ حملہ آور نے دیوانہ وار ہاتھ چلایا۔ چاقو دلاور کی چھاتی کو افقی رخ پر چیرتا ہوا نکل گیا۔ ایک آتشیں لکیر سی دلاور کے سینے سے لے کر کندھے تک چلی گئی۔ پہلا وار سہنے کے بعد اس نے دوسرے وار کا موقع نہیں دیا اور وحشت کے عالم میں چاقو بردار کو روئی کی طرح دھنک ڈالا۔ دلاور کے سر کی ایک خوفناک ضرب اپنے چہرے پر کھانے کے بعد چاقو بردار، جنگلے سے ٹکرانے کے بعد کوئی پندرہ فٹ نیچے پختہ صحن میں گرا اور پھر بری طرح لنگڑاتا ہوا ایک طرف اوجھل ہوگیا۔ فائرنگ کی شدت اب حویلی کے عقبی گیٹ کی طرف تھی اور اس صورتِ حال سے پتا چل رہا تھا کہ باقی حملہ آور بھی تیزی سے پسپا ہو رہے ہیں۔

سویرا نے اسی اثنا میں حملہ آور کی ایک دو ہڈیاں مزید توڑ ڈالی تھیں۔ پھر حویلی کے مسلح محافظ وہاں پہنچ گئے اور انہوں نے زخمی کو دبوچ لیا۔ یہی وقت تھا جب سویرا کی نگاہ دلاور کے خون سے لت پت سینے پر پڑی۔ چاقو گہرائی میں تو نہیں گیا تھا مگر اس کے سینے کے گوشت کو چوڑائی کے رخ پر ایک طویل کٹ لگا گیا تھا۔ سویرا ملازموں کی طرف دیکھ کر پکاری۔ ''ان کو اسپتال لے جاؤ۔ جلدی کرو..... بہت خون نکل رہا ہے۔''

☆☆☆

دلاور کو بہاولپور کے بڑے اسپتال میں لے جایا گیا۔ وہاں اس کی چھاتی پر کافی سارے ٹانکے لگے اور خون کی ایک بوتل بھی دینا پڑی۔ اگلے روز سویرا اور شاہ زمان اس کی تیمارداری کے لیے اسپتال بھی آئے۔ یہ شاہ زمان کا اثر رسوخ تھا کہ اسپتال کا عملہ اور ڈاکٹرز وغیرہ اس کے سامنے بچھے جا رہے تھے۔ اس کے ساتھ مسلح گارڈز کی ایک فوج تھی۔ کچھ اسپتال کے اندر تھے، کچھ باہر۔

شاہ زمان نے مسکراتے ہوئے دلاور کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولا۔ ''تم ہمارے لیے بڑے لکی ثابت ہو رہے ہو۔ شاید تم بروقت وہاں نہ پہنچتے تو سویرا کو کوئی نقصان پہنچ جاتا۔''

شاہ زمان کی بات پر دلاور بس اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔ اس نے یہ نہیں بتایا کہ وہ نہ صرف بروقت وہاں پہنچا تھا بلکہ اس نے سویرا کی طرف بڑھنے والا مہلک چاقو بھی اپنی چھاتی پر جھیلا تھا۔ غالباً سویرا کو بھی پتا نہیں چل سکا تھا کہ وہاں ان لمحوں میں اصل صورتِ حال کیا ہوئی تھی۔

دلاور نے بات بدلتے ہوئے کہا۔ ''بڑی آپا صاحبہ کا کیا حال ہے؟''

''وہ سیڑھیوں سے گر کر بے ہوش ہوگئی تھیں۔ مگر اللہ کا شکر ہے کہ تھوڑی دیر بعد ہوش میں بھی آ گئیں۔'' سویرا نے جواب دیا۔

''اللہ نے بڑا کرم کیا ہے۔'' دلاور نے تہِ دل سے کہا۔

''اب ہم نے تمہیں کہیں جانے نہیں دینا۔ تم واقعی ہمارے لیے بہت لکی ہو۔'' شاہ زمان نے کہا۔

''میں کس قابل ہوں جی۔ یہ تو آپ کی نظر کی مہربانی ہے۔''

''اگر میں یہ کہوں کہ میں تمہیں حویلی میں کوئی ملازمت دینا چاہتا ہوں، تو تمہارا جواب کیا ہوگا؟''

''آپ مجھے جس کام کے قابل بھی سمجھیں گے، میرے لیے بڑی خوشی کی بات ہوگی لیکن.....''

''لیکن نہیں.....'' شاہ زمان نے اس کی بات کاٹی۔ ''لیکن کے بعد بہانہ شروع ہو جاتا ہے۔'' پھر وہ اپنی گھنی مونچھوں کو سہلا کر بولا۔ ''تم نے ہمارے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ میں اب نہیں چاہتا کہ تم ہماری نظروں سے دور رہو۔''

اس نے دوبارہ دلاور کو سرتاپا دیکھا۔ جیسے نظروں نظروں میں اس کی جسمانی طاقت اور ذہنی چستی کو تول رہا ہو۔ اس کی نگاہوں میں دلاور کے لیے چاہت تو تھی لیکن اس چاہت میں مفاد اور ملکیت کا احساس بھی جھلک دکھا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ایک طرح کا احسان بھی تھا۔ جیسے وہ خاموشی کی زبان میں کہہ رہا تھا..... تمہاری حیثیت اور حسب نسب اس قابل تو نہیں کہ تمہیں اپنے اتنا قریب رکھا جائے لیکن چونکہ حالات نے تمہیں ہماری ایک بے مثال ''خدمت'' کا موقع دیا ہے اس لیے تمہیں برداشت کیا جا سکتا ہے..... اور آگے بڑھنے کے موقعے بھی دیے جا سکتے ہیں.....

وہ بولا۔ ''تم اسپتال سے ڈسچارج ہو کر سیدھے حویلی جاؤ گے۔ سمجھو یہ تمہارے لیے میرا پیار بھرا حکم ہے۔ میں بھائی صاحب (شاہ فرمان) سے بات کر لوں گا۔ وہ تمہیں اور تمہارے دوست کو مستقل طور پر حویلی میں رکھنے کا انتظام کر لیں گے.....''

دلاور نے خاموش رہنے میں ہی عافیت سمجھی۔

شاہ زمان نے مختصر الفاظ میں دلاور کو بتایا کہ حویلی میں گھس کر فائرنگ کرنے والے ان کی ایک مخالف پارٹی کے لوگ تھے۔ ان کو قرار واقعی جواب ملا ہے۔ ان کا ایک

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

بندہ جان سے گیا ہے۔ دو سخت زخمی ہوئے ہیں۔ ان کے خلاف دو ایف آئی آر بھی کٹوائی گئی ہیں......

وقتِ رخصت شاہ زمان نے دلاور کا شانہ تھپکا تو سویرا نے بھی کمال بے تکلفی سے، اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

وہ بہت فرینک...... بے جھجک اور شفاف لڑکی تھی۔ اندر باہر سے ایک جیسی، کوئی بناوٹ نہیں تھی اس میں۔ دلاور نے کئی بار دیکھا تھا وہ حویلی کے عام ملازموں میں گھل مل جاتی تھی۔ ان کے کوارٹرز میں بیٹھ کر ان سے باتیں کرتی تھی۔ شاہ فرمان اور شاہ زمان کی پروا کیے بغیر ملازمین کے دکھ درد میں شریک ہو جاتی تھی۔

کمرا وہی عالی شان تھا جس میں اس نے سویرا کی یاد میں بے چین راتیں گزاری تھیں۔ اس کی تیمارداری ہونے لگی۔ اس کی بہترین نگہداشت ہونے لگی۔ زخم دینے والا چارہ گر بن جائے تو قیامت ٹوٹتی ہے۔ دلاور پر بھی دن رات قیامت بیتنے لگی۔

سویرا حویلی کے گھٹے ہوئے ماحول کو ہرگز خاطر میں نہیں لاتی تھی۔ وہ اپنی مرضی کرنے والی لڑکی تھی۔ وہ دوپہر اور رات کا کھانا اپنے سامنے ملازمہ سے لگواتی اور جب تک وہ کھانہ چکتا، وہ وہیں رہتی۔ اکثر اس کے ساتھ رمشا بھی ہوتی۔ وہ دن رات دلاور کے لیے کیف آور تھے اور اذیت ناک بھی۔ جب تک سویرا وہاں رہتی وہ گھڑیاں اس کی خوشبو سے معطر رہتیں۔ وہ چلی جاتی تو اذیت کا زہریلا دھواں اس کے سینے میں بھر جاتا۔ اس کا دم گھٹنے لگتا۔ اس نے دو تین بار چاہا کہ سویرا سے اس ہنگامے کے بارے میں تفصیل سے پوچھے جس نے حویلی میں تہلکہ مچایا تھا لیکن نہیں پوچھ سکا۔ نہ ہی اس نے سویرا کو یہ بات بتائی تھی کہ اسے چھاتی پر لگنے والا زخم دراصل اسے بچاتے ہوئے لگا تھا۔ پتا نہیں کیوں سویرا سے بات چھپانا اسے اچھا لگ رہا تھا۔

وہ ایسی ہی دھوپ چھاؤں والی دوپہر تھی۔ سویرا ملازمہ کے ساتھ...... دیسی بٹیر کی یخنی اور مکئی کی روٹی لے کر آئی تھی۔ رمشا آج اس کے ساتھ نہیں تھی۔ ملازمہ کھانا چن کر چلی گئی۔ سویرا روزانہ تر و تازہ ہوتی تھی مگر آج کچھ زیادہ ہی خوش تھی۔ وہ تھوڑی دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی پھر یخنی پلیٹ میں ڈالتے ہوئے بولی۔ ''دلاور! تم نے ابھی تک شہر تو بہت سے گنوائے ہیں مگر یہ بتایا ہی نہیں، تم پیدا کس شہر میں ہوئے؟''

''سویرا بی بی! مجھے معلوم ہی نہیں......'' وہ اداسی سے بولا۔

''کیا مطلب......؟'' سویرا نے حیرانی سے کہا۔

''سویرا بی بی! میرا آگے پیچھے کوئی نہیں ہے۔ سمجھیں میں اس دنیا میں اکیلا ہوں۔'' وہ تھوڑا سا آگے ہوئی اور اس نے اپنا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ دیا۔ بہت میٹھے اور نرم لہجے میں بولی۔

''تم خود کو اکیلا مت سمجھو...... ہم سب لوگ تمہارے ساتھ ہیں۔'' اسے لگا کہ اتنی سی بات دلاور کی تشفی کے لیے کافی نہیں ہے۔ وہ چند لمحے سر جھکائے دلاور کو خاموشی سے دیکھتی رہی پھر جیسے کچھ سوچ کر ایک دم سے چہکی۔ گردن کو ایک نرالے زاویے پر حرکت دے کر بولی۔

''آج میں تم سے بہت سے سوال پوچھنا چاہتی ہوں۔ چلو ایک کام کرتے ہیں۔ آج سے تم اور میں اچھے دوست ہیں۔ تم جتنے دن حویلی میں رہو گے، مجھے سویرا بی بی نہیں بلکہ صرف سویرا کہو گے۔ مگر تب جب صرف تم اور میں اکیلے ہوں گے۔ دوسرے لوگوں کی موجودگی میں سویرا بی بی ہی چلے گا...... سمجھے تم۔'' دلاور کو اپنا دماغ سن ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ جواب میں کچھ کہنا چاہتا تھا مگر گنگ ہو کر رہ گیا تھا۔

وہ پھر سے بولی۔ ''اور دوستی کا تقاضا یہ ہے کہ دوست سے کوئی بات بھی چھپائی نہیں جاتی۔'' پہلی بار دلاور نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ یوں نظر آتا تھا جیسے روتا بچہ من پسند کھلونا مل جانے کے بعد آنسو پونچھتے ہوئے مسکرانے لگے۔

سویرا پڑھی لکھی تھی۔ سندھ یونیورسٹی سے ماسٹرز کر چکی تھی۔ کو ایجوکیشن میں ''یاری دوستی'' نبھا چکی تھی۔ شاعری اسے پسند تھی۔ خود بھی شعر لکھتی تھی۔

شاعر رومان پرور ہوتا ہے۔ شاہ زمان سویرا کے دور کے رشتے داروں میں سے تھا۔ کسی تعمیراتی کام کے سلسلے میں چار، چھ دفعہ یونیورسٹی جانا ہوا جہاں سویرا کی کشش نے اسے دیوانہ کر دیا۔ یونیورسٹی کے چکر بڑھ گئے۔ کام لمبا ہو گیا، سویرا کے بچپن میں ہی اس کے ماں باپ میں علیحدگی ہو گئی تھی۔ ماں یورپ کے کسی ملک میں تھی جبکہ باپ امریکا میں اپنی زندگی گزار رہا تھا۔ سویرا کو اس کی پھپھو نے پالا تھا۔ کسی عید شب برات وغیرہ پر...... ماں باپ کی طرف سے علیحدہ، علیحدہ کارڈ موصول ہوتے جن کو دیکھے بغیر وہ ردی کی ٹوکری میں پھینک دیتی تھی۔

اس کا کل جہاں اس کی پھپھو عالیہ ہی تھیں۔ پھپھو عالیہ سندھ یونیورسٹی کی پروفیسر اور بڑی آپا کی فرسٹ کزن تھیں۔ شاہ زمان نے بڑی آپا کے ذریعے سویرا سے شادی کا پیغام بھیجا...... جو چند ماہ کی سوچ بچار کے بعد پھپھو عالیہ نے سویرا کی رضامندی سے قبول کر لیا۔ شاہ زمان خوش شکل

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

تھا۔ مال و دولت اور اثر و رسوخ والا تھا۔ یونیورسٹی میں پڑھنے والی سویرا اور دنیا کو پڑھانے والی پھپو عالیہ بخوبی جانتی تھیں کہ ایسے رشتے قسمت سے ہی دروازے پر دستک دیتے ہیں۔ زمانہ خراب تھا۔ غیروں سے نبٹنے کی تاب پھپو بھتیجی میں نہیں تھی...... اسی لیے کچھ تحفظات کے باوجود ہامی بھر لی گئی تھی۔ اب پچھلے ڈیڑھ ماہ سے سویرا اپنی پھپو اور ان کی بیٹی رمشا سمیت اس حویلی میں مقیم تھے۔

سویرا نے ماسٹرز کرلیا تھا۔ جس دن پھپو کا ٹرانسفر بہاولپور یونیورسٹی میں ہوا، وہ لوگ سامان سمیٹ کر بہاولپور آ گئے۔ بہاولپور میں ہوتے ہوئے بڑی آپا انہیں کرائے کے مکان میں کہاں رہنے دے سکتی تھیں۔ وہ دوسرے دن ہی بہاولپور گئیں اور ان کو اٹھا کر حویلی میں لے آئیں۔

پھپو عالیہ نے سو ہاتھ پیر مارے مگر بڑی آپا کے آگے ایک نہ چلی۔ انہوں نے صاف کہہ دیا۔ ''حویلی اتنی بڑی ہے تین لوگوں کے آنے سے کم نہیں پڑنے والی اور اگر انکار کرو گی...... تو ...... رشتہ ختم......'' ظاہر ہے آخری بات انہوں نے مذاق میں کی تھی۔ چار و ناچار انہیں بڑی آپا کی بات ماننا پڑی۔ ان کو اوپری منزل پر شاندار کمرے دے دیے گئے...... ایک کمرے میں پھپو عالیہ رہ رہی تھیں جبکہ دوسرے کمرے میں سویرا اور رمشا تھیں۔

پھپو عالیہ نے کبھی گھاٹے کا سودا نہیں کیا تھا۔ وہ جہاندیدہ اور دور اندیش پروفیسر تھیں۔ لالچی نہیں تھیں مگر زمانے سے خوبصورتی کا خراج وصول کرنا بھی اپنا حق سمجھتی تھیں۔ حویلی کھلے دل اور کھلے پیسے والوں کی تھی...... تین عورتیں تو کیا...... چوڑی حویلی تین سو لوگوں کو بھی خود میں سمو سکتی تھی۔

تو سویرا کی بات پر پہلی دفعہ دلاور نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔ اس کے دل میں شادمانی ہلکورے لیتی تھی۔ سویرا نے دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا، وہ ہاتھ کیسے جھٹک سکتا تھا۔ سویرا عجیب دل لگی کے موڈ میں تھی یا شاید وہ مغموم دلاور کا دل بہلانا چاہ رہی تھی۔

وہ بولی۔ ''دلاور! تم نے لاہور تو دیکھا ہوگا...... بتاؤ کیسا ہے؟'' آنکھوں میں تجسس بھری چمک تھی۔

''اچھا ہے...... بلکہ بہت اچھا ہے۔'' اس نے کہا اور ذہن کے دریچے میں تنگ گلیاں اور ساتھ ساتھ جڑی چھتوں کی دھوپ پھیل گئی۔

''ایک دفعہ یونیورسٹی کا ٹرپ لاہور گیا تھا...... میں بیمار پڑ گئی، نہ جا سکی...... جس کا قلق ہمیشہ رہے گا۔''

''تو آپ اب چلی جائیں...... آپ کو کس نے روکا ہے۔'' وہ خاموشی کے خول سے رفتہ رفتہ باہر آنے لگا تھا۔

''تم چلو گے میرے ساتھ...... میں پرانا لاہور دیکھنا چاہتی ہوں...... تنگ گلیاں...... پُر پیچ بازار۔'' وہ خیالوں میں جیسے کہیں دور چلی گئی تھی......

''آپ جب حکم کریں گی...... مجھے تیار پائیں گی۔''...... وہ مؤدب لہجے میں بولا۔ اس کی نگاہیں نیچی تھیں...... گلابی ہونٹوں سے دور......

سویرا بازو میں پڑی چوڑی کو گھماتے ہوئے بولی۔ ''دلاور! تم ہمیں بچاتے ہوئے اپنی جان پر کھیل گئے......''

''اس میں کوئی خاص بات تو نہیں سویرا......'' سویرا کہتے ہوئے دقت پیش آ رہی تھی مگر وہ کہنے پر مجبور تھا۔

''مگر لوگ ایسے نہیں ہوتے، کسی کے جھگڑے میں اپنی جان خطرے میں نہیں ڈالتے...... تم جو نظر آتے ہو، وہ ہو نہیں۔'' وہ ترچھی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی تو دلاور گڑبڑا گیا۔ فوراً سنبھلتے ہوئے بولا۔

''آپ کی جگہ کوئی بھی ہوتا میں ایسا ہی کرتا۔'' سویرا بڑے غور سے اسے دیکھنے لگی۔ وہ کچھ بولنا چاہتی تھی کہ ملازمہ آن ٹپکی...... اس کی آمد سویرا کو بری لگی۔ وہ اسے کسی بہانے سے بھیجنا چاہتی تھی کہ رمشا اسے بلانے آ گئی۔ دلاور نے غور کیا رمشا اور ملازمہ کی موجودگی میں سویرا پوری کی پوری ''سویرا بی بی'' نظر آنے لگی تھی...... پُروقار...... اور وضع دار۔

اگلے دو دن سویرا نہیں آئی۔ حویلی میں ایک عجیب سی ہلچل نظر آ رہی تھی۔ اس نے بلند کھڑکی کے پردے سرکا کر دیکھا تھا، حویلی کی باؤنڈری وال کے گرد خاردار تاریں لگائی جا رہی تھیں۔ ملازمین بڑی مستعدی کے ساتھ یہاں سے وہاں بھاگے چلے جاتے تھے۔ یہ تیسرے دن دوپہر کی بات ہے، سویرا ملازمہ کے ساتھ کھانا لے کر آئی۔ ملازمہ کھانا رکھ کر چلی گئی تو سویرا بولی۔ ''تم میرا حال نہیں پوچھو گے، میں دو دن بیمار پڑی رہی۔''

دلاور کے دل میں ایک ٹیس اٹھی۔ وہ شاید عشق کے ابتدائی اسباق کو نہیں سمجھ پا رہا تھا۔ جب کسی سے محبت ہو جاتی ہے تب اس کی ہلکی سی تکلیف بھی عاشق کو تڑپا دیتی ہے۔ یہ تیسرا موقع تھا جب وجود میں ہونے والی حیرت انگیز تبدیلی نے اسے پریشان کیا تھا۔ پہلا موقع تب آیا تھا جب وہ ڈوبتی سویرا کو بچا کر پانی سے باہر لایا تھا۔ وہ پہلی نظر پہلا احساس اور پہلا گھاؤ تھا۔ دوسرے موقع پر اس نے حویلی پر

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

حملے کے وقت سویرا کو ایک حملہ آور سے دست و گریباں دیکھا تھا اور ایک دم تڑپ سا گیا تھا۔ اب بھی سویرا نے اپنی بیماری کا بتایا تھا تو اس کا دل جیسے کسی غم کے اندھیرے کنویں میں ڈوب گیا تھا۔ وہ بے تابی سے بولا۔

''سویرا! آپ اپنا دھیان رکھا کیجیے۔ آپ کمزور لگ رہی ہیں۔''

دلاور کی پریشانی سویرا سے چھپی نہ رہ سکی..... وہ یک ٹک ایسے دیکھتی رہی..... پھر مسکراتے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''اتنا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اب ٹھیک ہوں۔ ویسے تمہیں خود پر زیادہ دھیان دینے کی ضرورت ہے۔'' وہ رکی پھر بولی۔ ''ظفر بتا رہا تھا تمہارا زخم پہلے سے بہتر ہے۔''

''جی! میں کل چل کر باہر تک بھی گیا تھا.....'' دلاور اندرونی کشمکش کو اعتدال پر لانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ دلاور کی اندرونی کیفیت کو سویرا نے جیسے اس کے چہرے سے پڑھ لیا تھا۔ دلاور خود میں پشیمان ہوا جا رہا تھا۔ اسی خفت کو مٹانے کی خاطر اس نے فوراً گفتگو کا رخ پھیرنے کی کوشش کی اور بولا۔ ''سویرا! ایک بات پوچھوں، آپ بُرا تو نہیں منائیں گی؟''

''ہاں بولو.....''

''تھوڑے دن پہلے حویلی میں جو کچھ ہوا وہ سب کیا تھا؟''

سویرا ایک دم سے خاموش ہوگئی جیسے وہ اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ دلاور جواب کا انتظار کرتا رہا، سویرا خاموش رہی تو وہ بولا۔ ''لگتا ہے..... آپ اس موضوع کو نہیں چھیڑنا چاہتیں۔''

اس کے جواب میں سویرا نے بڑی تیزی سے نفی میں سر ہلایا جس سے دوپٹا کھسکا اور چند نسواری لٹیں چہرے پر پھیل گئیں۔ اس نے ہاتھ سے انہیں سر پر جمایا۔ دوپٹا سر پر سیدھا کیا اور تھوڑا مسکراتے ہوئے بولی۔ ''میں تمہیں کہہ چکی ہوں..... دوست سے کوئی بات چھپائی نہیں جاتی..... تو میں اس پر قائم ہوں۔''

سویرا نے محتاط اور مختصر لفظوں میں جو کہانی سنائی، وہ کچھ اس طرح سے تھی کہ حویلی پر حملہ ''شوکت سیال'' نے کروایا تھا۔ وہ رحیم یار خان کے ایک ایم پی اے حضور چانڈیو کا جگری دوست تھا۔ شوکت سیال نہایت بدمزاج، منہ پھٹ اور بات بات پر لڑنے مرنے پر اتر آنے والا بندہ تھا۔ اسے حضور چانڈیو کی پوری پشت پناہی حاصل تھی۔ حویلی پر حملہ کسی ''باز'' کو چرانے کے لیے کیا گیا تھا۔ خیال ظاہر کیا جا رہا تھا کہ وہ ''باز'' نہایت قیمتی اور تربیت یافتہ ہے۔ پولیس کے پہنچتے ہی حملہ آور اپنے دو زخمی ساتھیوں کے ساتھ فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے تھے جبکہ ان کا ایک ساتھی دھر لیا گیا تھا۔ قیمتی باز محفوظ رہا تھا۔

حویلی پر حملے کا سن کر شاہ فرمان اپنی نئی نویلی بیوی کے ساتھ فوراً کراچی سے واپس آ گیا تھا جبکہ شاہ زمان ایک دن بعد ترنڈا سے واپس پہنچا تھا۔

سویرا بات مکمل کر چکی تو دلاور کافی سنبھل چکا تھا، بولا۔ ''سویرا! کیا یہ باز بہت زیادہ قیمتی ہے؟''

''ہاں شاید..... سدھائے ہوئے عقاب قیمتی ہی ہوتے ہیں۔''

''آپ کے خیال میں کیا قیمت ہوگی اس کی.....؟''

دلاور نے کہا تو سویرا نے بڑی دلچسپی سے دلاور کی طرف دیکھا اور بولی۔ ''سننے میں آ رہا ہے..... آٹھ..... دس لاکھ کے قریب قریب ہوگی۔''

''مگر مجھے اس کے پیچھے کوئی اور کہانی ہی معلوم ہوتی ہے۔ آٹھ دس لاکھ کے باز کے پیچھے حویلی پر اتنا بڑا حملہ..... اور آپ کے خیال کے مطابق حملہ شوکت سیال اور حضور چانڈیو نے پل کر کروایا ہے..... دس لاکھ ایسے لوگوں کے لیے بہت بڑی رقم تو نہیں ہے۔''

سویرا نے غور سے دلاور کی طرف دیکھا اور بولی۔ ''مجھے لگتا ہے..... تم کسی سراغ رساں..... فرم کے لیے کام کرتے رہے ہو۔'' لہجے میں شوخی تھی۔ آج کی سویرا اور تھوڑے دن پہلے والی سویرا میں بہت فرق تھا۔ وہ دلاور سے یوں روانی سے باتیں کر رہی تھی جیسے اسے برسوں سے جانتی ہو یا شاید یہ کوا بجوکیشن یونیورسٹی کے ماحول کا اثر تھا۔

دلاور ہنس دیا بولا۔ ''میں تو خود آج تک گم شدہ ہوں۔ میں کسی کا سراغ کیا لگاؤں گا۔''

دن گزرنے لگے۔ ہر روز ایک نیا ہنگامہ ہوتا۔ ایک علیحدہ کہانی ہوتی۔ ایک دن سویرا اپنی ڈائری لے کر آئی۔ اس پر نثر اور شاعری کی مشق کی گئی تھی۔ اس میں ایک آزاد نظم تھی۔

تم کب تک مجھ کو بھولو گے
اس دشت کی تنہا راتوں میں اک درد جو ٹھہرا ہوتا ہے
وہ درد بھی طعنے دیتا ہے، چپ چاپ سسکیاں لیتا ہے
اک ٹیس بھی اٹھ کے کہتی ہے
تم کب تک مجھ کو بھولو گے

نظم دلاور کے دل کو چھو گئی۔ وہ ہر لحہ اس کی گرداں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

کرنے لگا۔ جس ڈر نے تھوڑے دن پہلے اس کے دل میں جگہ بنائی تھی، وہ اسے بہت پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ وقت نے اسے ورغلا لیا تھا۔ حالات نے اسے خاموش طوفانوں سے بے خبر کر دیا تھا۔ وہ عشق کی منزلیں بڑی بے خبری سے طے کرنے لگا تھا۔ سویرا نے جو رومال اسے دیا تھا، وہ اس نے سنبھال کر رکھا تھا۔ اسے یوں لگتا تھا جیسے سویرا کی خوشبو رومال کے راستے اس کے پھیپھڑوں میں داخل ہو کر اور اسے مدہوش سا کر دیتی ہے۔ پتا نہیں کیوں اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ دن بدن سویرا کے عشق میں ڈوبتا چلا جا رہا ہے۔ وہ سب کچھ جانتا بوجھتا تھا پھر بھی عشق کی بے پناہ آگ کی طرف بڑھتا چلا جا رہا تھا۔

وہ دھوپ بھرا بڑا چمکیلا ریگستانی دن تھا۔ دلاور کافی حد تک صحت یاب ہو چکا تھا۔ وہ بستر کی چادر درست کر رہا تھا کہ سویرا آن ٹپکی اس نے بے بی پنک کلر کا سوٹ پہن رکھا تھا جس پر اسی کلر کا کیمش کا دوپٹا تھا۔ آدھے بازو کے کناروں پر میرون کلر کے موتی جھول رہے تھے۔ ان کپڑوں میں سویرا کا حسن قیامت ڈھا رہا تھا۔

وہ جھک کر بیڈ کی چادر درست کرواتے ہوئے بولی۔ ''دلاور! جو کام تم کر رہے ہو، یہ کام گھروں میں عورتیں کرتی ہیں۔''

''میرا کوئی گھر ہوتا..... تو شاید کوئی عورت بھی ہوتی اور اگر عورت ہوتی تو وہ چادر درست کرنے والا کام ضرور کرتی.....'' دلاور نے مسکرا کر کہا۔

''یہی تو میں کہہ رہی ہوں..... عورت ہے..... کہاں؟''

وہ چادر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے شوخی سے بولی تو دلاور کا دل جیسے مٹھی میں آ گیا۔

وہ کچھ اور کہنا چاہتی تھی مگر خاموش ہو گئی۔ باریک دوپٹے کو سر پر درست کرتے ہوئے بولی۔ ''تم نے پوچھا ہی نہیں میں اس وقت تمہارے کمرے میں کیوں آئی ہوں..... حالانکہ دوپہر کے کھانے میں ابھی دو گھنٹے باقی ہیں۔''

''آپ خود ہی بتا دیجیے۔'' دلاور نے نظریں جھکا کر کہا۔

''صبح..... شاہ زمان نے تمہیں بلایا ہے..... تم نے کیا فیصلہ کیا ہے.....؟''

''کس بارے میں.....؟''

''حویلی میں رہنے کے بارے میں..... میرا مطلب ہے مستقل طور پر رہنے کے بارے میں؟''

دلاور اسے کہنا چاہتا تھا۔ ''سویرا! اب اس حویلی کے سوا تو میرا کوئی ٹھکانا ہی نہیں رہا ہے۔ حویلی بھی اس لیے کہ اس میں تم رہتی ہو..... تمہاری خوبصورت باتوں کی چہکار اس حویلی کی فضاؤں میں رقص کرتی ہے۔ تمہاری خوبصورتی کے رنگوں کی قوس قزح اس ماحول میں ٹھہری ہوئی ہے۔ جس ہوا کو میں اپنے پھیپھڑوں میں اتارتا ہوں، اس ہوا میں تمہاری سانسوں کی خوشبو گھلی ہوئی ہے۔ تمہارے چہرے کی ہنسی کے کھلتے گلاب میرے دل میں تہلکہ مچاتے ہیں۔ اب تم ہی مجھے بتاؤ میں حویلی چھوڑ کر کہاں جاؤں گا۔''

وہ یہ سب کچھ اسے نہ کہہ پایا۔ نہایت دھیمی تھکی سی آواز میں بولا۔ ''مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اب مجھے حویلی سے چلے جانا چاہیے۔''

''خبردار! ایسی بات دوبارہ کی تو..... تمہیں یہیں اسی حویلی میں رہنا ہے۔ یہی بات میں تمہیں کہنے آئی تھی.....''

دلاور کا دل بھر آیا بولا۔ ''کس حیثیت سے..... کہنے آئی ہیں مس؟''

''ایک دوست کی حیثیت سے.....''

''اگر نہ رہوں.....؟''

''دوست کا دل ٹوٹ جائے گا..... اور ایسے دوست کا..... جو خود کو تمہارا قرض دار بھی سمجھتا ہے اور رہتی زندگی تک سمجھتا رہے گا۔'' سویرا نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا اور تیزی سے کمرے سے نکل گئی.....

چند لمحے دلاور خاموشی سے اس دروازے کو تکتا رہا جہاں سے تھوڑی دیر پہلے سویرا گئی تھی۔ پھر ڈھول پر ایک زوردار چوٹ پڑی..... ایک، دو، تین، چار..... دھن دھنا دھن دھن..... دھن دھنا دھن دھن..... ڈھول کی تھاپ پر میلے میں رقص کرنے والا ملنگ جیسے دیوانہ وار خون کی آبیاری کرنے والی رگوں میں دھمالیں ڈالنے لگا..... دلاور کا انگ انگ ناچنے لگا۔ اس کا دل پھڑکنے لگا۔ سویرا خاص طور پر اسے کہنے آئی تھی کہ اسے حویلی میں ہر صورت رہنا ہے۔ وہ تو چاہتا ہی یہ تھا۔ وہ تو حویلی سے اب دور رہ ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ تو یوں ہی..... تکلفاً سویرا کو حویلی سے جانے کا کہہ رہا تھا۔ کس کافر کو یہاں سے جانا تھا۔ صبح وہ شاہ زمان کے روبرو پیش ہوا۔ شاہ فرمان بھی وہیں تھا..... اس کے چہرے پر سنگدلی اور بے رحمی کا کھچاؤ سا تھا۔ کثرتِ مے نوشی سے آنکھوں کے نیچے کاماس ابھر آیا تھا۔ دلاور چند منٹ وہاں بیٹھا۔ بات ہو گئی۔ معاملات طے ہو گئے۔ دلاور کو ڈرائیور کم محافظ کی صورت میں رکھ لیا گیا۔ ڈرائیوری وہ بہت اچھے سے جانتا تھا۔ پنڈی میں جس دوست کے ساتھ مل کر کام کرتا تھا، اس کی کار دلاور ہی ڈرائیو کرتا تھا۔

ان دنوں دلاور میں انقلابی تبدیلیاں آئیں جن پر وہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

خود بھی حیرت زدہ رہ گیا۔ کم گو، شرمیلا دلاور باتونی اور خوش اخلاق ہوگیا۔ عشق نے اس کے دل میں جوت جگائی تھی اور وہ سودائی ہوگیا تھا۔ جیسے صوفی اور ملنگ ہوگیا تھا۔

وہ ہر کسی کی خوشی کا خیال رکھتا تھا۔ وہ ہر کسی کی مدد کے لیے کمربستہ رہنے لگا تھا۔

ایک دن وہ گاڑی چکا رہا تھا۔ زنان خانے کی سواریوں کو لانے لے جانے کی ڈیوٹی اسی کی تھی۔ بڑی آپا نے ''زہر پیر'' جانا تھا۔ ان کے ساتھ ایک عورت آئی جو ایک ٹانگ سے معذور تھی۔ اس نے آدھے چہرے کا نقاب بھی کیا ہوا تھا۔ دلاور نے اچٹتی نگاہ ڈالی تو نقاب کے نیچے کچھ عجیب سا محسوس ہوا۔ جیسے ناک والی جگہ پر ناک نہ ہو..... کوئی خلا سا ہو۔ سارے رستے بڑی آپا دلاور سے باتیں کرتی رہیں، وہ ان کے جواب دیتا رہا۔ اپنی پرانی کہانیاں بھی سناتا رہا مگر اس کا ذہن نقاب والی عورت میں اٹکا رہا۔ وہ عورت سارے رستے ایک دفعہ بھی نہیں بولی۔

آخر دلاور سے نہ رہا گیا بولا۔ ''بڑی آپا! گستاخی معاف۔ مجھے کوئی حق تو نہیں پہنچتا مگر پھر بھی میں پوچھ رہا ہوں۔ یہ محترمہ کون ہیں؟''

خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا یہاں تک کہ دلاور کو پشیمانی ہونے لگی کہ اس نے یہ سوال کیوں کیا۔

پھر اچانک بڑی آپا کی گمبھیر آواز گونجی۔ ''یہ شاہ فرمان کی تیسری بیوی اور میری سوتن نگینہ ہے۔''

دلاور ..... آگے کچھ نہ بول سکا۔ واپسی کا رستہ بھی خاموشی سے کٹا۔

ظفری دلاور کا روم میٹ اور حویلی کا پرانا ملازم تھا۔ وہ دلاور سے کافی مانوس ہوچکا تھا۔ اس رات سوتے وقت دلاور نے داہنی طرف کروٹ لی اور ظفری سے بولا۔ ''ظفری یار! یہ نگینہ بی بی کون ہیں؟''

''تو نے اسے کہاں دیکھا؟'' ظفری حیرت سے بولا۔

''بڑی آپا کے ساتھ آج ''زہر پیر'' تک گئی تھیں۔''

''یہ بڑی لمبی اور دردناک کہانی ہے۔'' وہ لمبی سانس کھینچ کر بولا۔

''تو پھر سنا نا..... میرا آج جلدی سونے کا موڈ نہیں ہے اور تو..... تو آدھی رات تک جاگتا رہتا ہے۔''

ظفری دلاور کی بات پر ہنس دیا اور بولا۔ ''یارا! چوڑیرو حویلی کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ یہ سمجھ لو کہ چوڑیرو حویلی کے بڑے بوڑھوں کی ایک قدر مشترک تھی۔ وہ تین سے چار شادیاں کرتے تھے۔ یہ ریت ابھی تک چلی آرہی ہے۔ شاہ زمان تو ابھی جوان ہوا ہے۔ شاہ فرمان بڑا ہے اور اب تک چار بیاہ رچا چکا ہے۔''

''چار بیاہ.....!'' دلاور نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں..... ہاں چار بیاہ..... اور پانچویں کی باری بھی جلدی آجائے گی۔ شاہ فرمان کی پہلی شادی بڑی آپا سے ہوئی جن سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ اگر اولاد ہوتی تو بھی وہ دوسری، تیسری، چوتھی شادی ضرور کرتا۔ دوسری شادی رخشندہ سے ہوئی..... جو بے اولادی میں ہی شادی کے تیسرے سال مرگئی۔ تیسری شادی نگینہ سے ہوئی..... اور اب چوتھی شادی شاہدہ سے ہوئی ہے۔''

''حویلی کی کوئی عورت نقاب نہیں کرتی مگر یہ نگینہ بی بی ..... تو پوری کی پوری پردے میں تھیں، یہ کیا ماجرا ہے؟''

ظفری کے چہرے پر خوف پھیل گیا بولا۔ ''یارا! یہ شاہ فرمان بڑا ظالم بندہ ہے..... چوتھی شادی پر نگینہ نے واویلا مچایا اور طلاق مانگی تو شاہ فرمان نے اپنے ہاتھ سے اس کی ناک اور ہونٹ کاٹ ڈالے۔'' ظفری کانوں کو ہاتھ لگانے لگا۔

''اور نگینہ نے احتجاج نہیں کیا؟''

''او بدھو، سائیں..... احتجاج کی وجہ سے ہی تو ناک اور ہونٹ کاٹے گئے تھے۔ اور ایک اور ستم ظریفی سنو۔ حویلی کی کوئی بہو نہ طلاق لے سکتی ہے، نہ حویلی سے بھاگ کر کہیں جاسکتی ہے۔ یہ چوڑیرو حویلی کا صدیوں پرانا اصول ہے..... جو ابھی تک چلا آرہا ہے۔''

''ظفری! شاہ زمان کو سب بڑے سائیں کیوں کہتے ہیں؟ حالانکہ وہ شاہ فرمان سے دس بارہ سال چھوٹا لگتا ہے۔''

ظفری بولا۔ ''بدکرداری..... شاہ فرمان شروع سے ہی آوارہ اور بے پروا تھا۔ ''بڑے سرکار'' نے اپنی آخری وصیت میں شاہ زمان کو اپنا گدی نشیں چنا تھا۔ اسی وجہ سے اب شاہ زمان ''بڑے سائیں'' کے رتبے پر فائز ہیں۔''

''شاہ فرمان بڑا ہے، اسے کبھی شرمندگی محسوس نہیں ہوتی جب سب لوگ اس کے سامنے چھوٹے بھائی کو ''بڑا سائیں'' کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔'' دلاور نے کہا۔

''میرا نہیں خیال اس سے شاہ فرمان کو کوئی فرق پڑتا ہو بلکہ میرے خیال سے وہ اس میں خوش ہے۔ بڑے سائیں کہلوانے میں بڑی قباحتیں ہیں۔ بہت سی پابندیاں ہیں۔ ایسی پابندیاں جو شاید شاہ فرمان جیسا عیش پرست بندہ نہیں نبھا سکتا..... اب اس دن حویلی پر ہونے والا حملہ ہی دیکھ لو ..... وہ سب کچھ شاہ فرمان کی غلطی کی وجہ سے ہی ہوا تھا۔''

''شاہ فرمان کی غلطی کی وجہ سے؟ میں تمہارا مطلب

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

نہیں سمجھا.....'' دلاور نے الجھن سے کہا۔ ظفری بستر سے اٹھ کر بیٹھ گیا اور اس نے سگریٹ سلگالیا۔ گہرا کش لے کر اسی سگریٹ سے دوسرا سگریٹ سلگا کر دلاور کو پکڑاتے ہوئے بولا۔

''یارا! اس حویلی کے ایک تہ خانے میں..... قیمتی پکھیرو کچھ عقاب ٹائپ چیزیں رکھی جاتی ہیں۔ بعد میں سدھائے ہوئے قیمتی پکھیرو..... عرب ملکوں میں بھیجے جاتے ہیں اور عربوں سے لاکھوں کمائے جاتے ہیں۔ یہ سب کام شاہ فرمان کرتا ہے۔ ''بڑے سائیں'' یہ سب جانتے ہوئے بھی جان بوجھ کر آنکھیں موندھے ہوئے ہیں بلکہ کچھ لوگوں کا تو یہ بھی خیال ہے کہ ''بڑے سائیں'' بھی اس دھندے میں برابر کے شریک ہیں۔ صرف دنیا کو دکھانے کے لیے انجان بنے ہوئے ہیں۔''

''اچھا تو حویلی پر جو حملہ ہوا' وہ لوگ قیمتی پکھیرو چرانے آئے تھے۔'' دلاور نے کہا۔

ظفری مسکرا دیا دائیں بائیں سر کو نفی میں حرکت دیتے ہوئے رازدارانہ لہجے میں بولا۔ ''چرانے نہیں آئے تھے بلکہ اپنا چرا کے لایا ہوا ایک قیمتی ''باز'' واپس لینے آئے تھے۔''

''چرا کے لایا ہوا باز..... میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا؟''

''او یارا..... ایک تو تمہیں بات بڑی دیر سے سمجھ میں آتی ہے۔ شاہ فرمان نے اپنے سب سے خطرناک کارندے ''شیرو'' سے رحیم یار خان کے ایک گوٹھ سے ایک باز چوری کروایا اور حویلی میں لے آیا۔''

دلاور باز کے متعلق سویرا سے سن چکا تھا پھر بھی انجان بنتے ہوئے بولا۔ ''کیا..... وہ باز..... قیمتی ہے؟''

''قیمتی نہیں بلکہ بہت قیمتی ہے۔ بلکہ یوں سمجھ لو..... وہ ایک سادہ چیک ہے۔'' ظفری نے کہا۔

''ایسی کیا بات ہے اس میں؟''

''یہ بہت اندر کی باتیں ہیں..... رہنے دو.....''

دلاور نے خاموشی اختیار کرلی تو ظفری خود ہی بولا۔

''تم پوچھو گے نہیں..... اندر کی بات کیا ہے؟''

دلاور ہنس دیا، بولا۔ ''خود ہی تو تم نے کہا تھا..... رہنے دو..... میں نے رہنے دیا.....''

''او یدھو سائیں! تمہیں اپنا یار کہا ہے اور یار سے کوئی چیز بھی چھپائی نہیں جاتی۔ حویلی میں بہت کم لوگوں کو اس بات کا علم ہے کہ ''شان'' نامی باز اتنا اہم اور قیمتی کیوں ہوگیا ہے۔ اصل میں اس کی وجہ دو شیخوں کی لڑائی بیان کی جارہی ہے۔''

''دو شیخوں کی لڑائی۔''

''ہاں..... ہاں..... ایک شارجہ کا کوئی بڑا بزنس مین ہے..... دوسرا دبئی کا ارب پتی امیر زادہ ہے۔ دونوں کی آپس میں ٹھن گئی ہے۔ دونوں شاہ کے دعوے دار ہیں اور اسے حاصل کرنے کے لیے منہ مانگی قیمت دینے کے لیے تیار ہیں''۔ ظفری باتیں کرتے کرتے سو گیا۔ دلاور اس کا منہ دیکھتا رہ گیا۔ ظفری کو دو بجے سے پہلے نیند نہیں آتی تھی مگر دو بجتے ہی اس کی آنکھیں بند ہونے لگتیں اور وہ بیٹھے بیٹھے خراٹے لینے لگتا۔ دلاور نے مسکرا کر اسے دیکھا، بستر پر اسے سیدھا کیا اور خود دوسری طرف کروٹ لے کر لیٹ گیا۔ آج رات نیند آنی مشکل تھی' اسے صبح سویرا کو یونیورسٹی لے کر جانا تھا۔ وہاں سے پھر سویرا کو بازار جانا تھا۔ وہ وقت کا حساب لگانے لگا۔ دو ڈھائی گھنٹے کی ڈرائیو تو بن جاتی تھی۔ وہ گاڑی تھوڑی سست چلاتا تو تین گھنٹے بھی لگ سکتے تھے۔ ڈھائی تین گھنٹے، بہت وقت تھا۔ وہ سوچنے لگا سویرا سے کیا کیا باتیں کرے گا۔ سویرا کے بارے میں سوچنے کے ساتھ ساتھ وہ اس ''بازوالی بات'' میں بھی الجھا ہوا تھا۔

مگر صبح اس کے تمام ارمانوں پر اوس پڑ گئی۔ وہ صبح سے گاڑی چکائے جارہا تھا، وہ اس سیٹ کو بار بار صاف کررہا تھا جہاں سویرا نے آکر بیٹھنا تھا۔ سویرا تو آئی مگر اس کے ساتھ پھپھو عالیہ بھی تھیں۔ سویرا نے بہت ہلکا میک اپ کررکھا تھا، یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ابھی تازہ تازہ کوئی گلاب کی کلی کھلی ہے۔ گاڑی میں بیٹھی تو ہر سو اس کی خوشبو بکھر گئی۔ دلاور نے بیک مرر پہلے سے سیٹ کررکھا تھا۔ سفر شروع ہوا۔ وہ بار بار کن انکھیوں سے اسے دیکھنے لگا۔ سویرا کے چہرے پر سوچ کی پرچھائیاں تھیں۔ وہ کچھ خاموش تھی۔ سفر خاموشی میں کٹا۔ جو کچھ اس نے رات جاگ کر سوچ رکھا تھا، سب اس سے الٹ ہورہا تھا۔ ایک دو دفعہ اس نے خود بات کرنے کا سوچا مگر دونوں کی گمبھیر خاموشی دیکھ کر اس کی ہمت نہیں پڑی۔ اس سے پہلے وہ جب بھی حویلی سے کسی کو لے جاتا تھا تو بے تکان بولتا تھا۔ پھپھو عالیہ، سویرا، رمشا، بڑی آپا سب سے بے تکلفی سے بات چیت کرتا تھا بلکہ سب مستورات اس کی ڈرائیونگ سے زیادہ اس کی خوش اخلاقی اور خوش گفتاری سے خوش تھیں مگر آج کچھ گڑبڑ تھی..... دونوں عورتوں کی گمبھیرتا کے پیچھے کچھ ناپسندیدہ حالات کی پرچھائیاں نظر آتی تھیں۔

یونیورسٹی آئی تو پھپھو عالیہ اور سویرا اندر چلی گئیں۔ ان کی واپسی آدھے گھنٹے بعد ہوئی۔ دلاور نے اتر کر باری

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

باری دونوں دروازے کھولے۔ پہلے سویرا بیٹھی' بعد میں پھپھو عالیہ بیٹھیں مگر انہوں نے گاڑی کا دروازہ بند نہیں کیا۔ ایک لمحے کے لیے کچھ سوچا پھر گاڑی سے نیچے اترتے ہوئے بولیں۔ ''سویرا! یوں کرو تم اکیلی بازار ہو آؤ..... مجھے واپسی پر یہاں سے پک کر لینا.....'' سویرا نے خاموشی سے اثبات میں سر ہلایا..... دروازہ بند ہوا اور گاڑی آگے بڑھ گئی۔ ڈھول کی تھاپ پر دھمال ڈالنے والا رنگیلا شخص دلاور کے وجود میں بھنگڑے ڈالنے لگا۔ اسے کانوں کے قریب ڈھول کی دھمکیں دھمائیں سنائی دینے لگی۔ سویرا اس کے ساتھ گاڑی میں اکیلی تھی۔

''سویرا! آج آپ کو اس طرح دیکھ کر میرا دل دکھی ہے۔'' دلاور ہمت کرتے ہوئے بولا۔

''تم کیوں دکھی ہو..... پریشان تو میں ہوں۔'' سویرا نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''دوست کو پریشان دیکھ کر دوست تو دکھی ہوگا۔''

''ہاں..... شاید.....'' سویرا گاڑی کے شیشوں سے پار کہیں دور دیکھتے ہوئے بولی۔

''بڑے کہتے ہیں کہ شیئر کرنے سے پریشانی کم ہوجاتی ہے۔ بوجھل دھڑکنوں کو قرار آجاتا ہے۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو..... پریشانی کم ہوجاتی ہے..... مگر واہموں کا کوئی علاج نہیں ہے۔ یہ پل پل ڈستے ہیں۔'' سویرا نے عجیب سے دکھ بھرے لہجے میں کہا تو..... دلاور سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے آج سے پہلے سویرا کو یوں منتشر نہیں دیکھا تھا۔ اس نے ایک لمحے میں فیصلہ کیا اور شروع ہوگیا۔ ''سویرا بی بی دیکھیں..... (اس نے جان بوجھ کر بی بی کا اضافہ کیا تھا) ''وہم کا علاج لقمان حکیم کے پاس بھی نہیں تھا بلکہ اس کے دادا کے پڑ دادا کے پاس بھی نہیں تھا۔ یہ ایک منفی جذبہ ہے جو بدگمانی سے جنم لیتا ہے۔ زندگی بہت مختصر ہے، اتنی مختصر جیسے ایک سانس ابھی ہے..... دوسرے پل میں نہیں۔ اتنی چھوٹی زندگی کے لیے ..... اتنی فکر..... اتنی پریشانی..... کیوں.....؟ ہمیشہ مثبت سوچو..... ہمیشہ..... اچھا سوچو.....''

بیک ویو مرر میں دلاور نے دیکھا کہ سویرا کے خزاں رسیدہ چہرے پر دھیمی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی ہے۔

دلاور کے دل میں خوشی ناچ اٹھی۔ وہ بولا۔ ''اچھا آپ ساری باتیں چھوڑیں ..... مجھے صرف ایک بات کا جواب دیں۔''

''ہاں پوچھو.....؟'' سویرا نے دوپٹا سر پر سیدھا کرتے ہوئے کہا۔

''اتنی دلکش لڑکی..... واہموں..... اور اندیشوں سے اس قدر پریشان کیسے ہوسکتی ہے۔ اس کی آنکھوں میں تو دنیا کے سب سے خوبصورت رنگ اترتے ہیں۔ ان پیارے رنگوں سے دکھ کا رنگ میل نہیں کھاتا..... اس بدصورت رنگ کو اپنی آنکھوں سے ہٹا دیجیے۔''

سویرا کے چہرے پر شفق کے رنگ بکھر گئے۔ چہرہ شرم سے گلنار ہوگیا۔ صنف نازک کو خود کی تعریف اچھی لگتی ہے۔ یہ ایک فطری عمل ہے اور دلاور نے یہ کام ایسے وقت میں کیا تھا جب سویرا غمگین تھی۔ تیرنشانے پر بیٹھا تھا۔ سویرا کی پریشانی جو کوئی بھی تھی، وہ ایک لمحہ اس پریشانی کو کافور کرنے میں کامیاب ہوا تھا۔ سویرا اپنی اصل حالت میں واپس لوٹ آئی۔

وہ واقعی ایک من موجی لڑکی تھی۔ وہ باز آگئی۔ اس نے بھرپور شاپنگ کی۔ دلاور کے لیے خوبصورت سی گھڑی خریدی۔ واپس آکر خود اپنے ہاتھ سے اس کی کلائی پر باندھی اور بولی۔ ''شکریہ دلاور..... تم ایک بہترین دوست ہو.....''

''مگر..... شاید..... یہ بہت قیمتی گھڑی ہے۔ میں اسے.....''

سویرا نے اسے روک دیا۔ ''خاموش رہو..... یہ تم سے زیادہ قیمتی نہیں ہے..... YOU MAKE MY DAY''

واپسی پر دلاور تحفے کے بوجھ تلے دبا رہا۔ یونیورسٹی پہنچنے سے تھوڑی دیر پہلے سویرا نے خاموشی توڑی، شوخی سے بولی۔ ''اگر تم مجھے لاہور نہیں لے کر گئے تو میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔ میں تمہارا گھر تمہاری جنم بھومی دیکھنا چاہتی ہوں۔''

''میں تفصیل بتاؤں گا تو آپ ارادہ ترک کردیں گی۔'' دلاور بھی شوخی کے موڈ میں آگیا۔

''ایسی کیا بات ہے؟'' وہ بچوں کی طرح منہ پھلا کر ایک ادا سے بولی۔

''جس گلی سے آپ کو گزرنا پڑے گا، وہاں سے دو انسان اکٹھے نہیں گزر سکتے۔''

''تو کیا ہوا..... میں تمہارے پیچھے چل پڑوں گی۔ تم مجھ سے آگے چلنا.....''

''اس گلی میں اندھیرا اور سیلن زدہ بو ہوگی۔ ایک سائڈ پر گندی نالی ہوگی جہاں اکثر بچے رفع حاجت کرتے ہوئے دکھائی دیں گے۔ یہ نظارہ سہہ پائیں گی آپ.....؟'' دلاور کی ہنسی چھوٹ گئی..... سویرا نے ایک

WWW.PAKSOCIETY.COM

http://paksociety.com

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

Downloaded From Paksociety.com

جھرجھری سی لی.....

دلاور، سویرا کو اچھی طرح جان گیا تھا۔ وہ کسی کے ہاتھ کا کٹا پھل نہیں کھاتی تھی۔ جس گلاس کو کسی نے چھوا ہوتا، وہ اس میں پانی نہیں پیتی تھی۔ پھوپھو عالیہ اسے برہمن کہتی تھیں مگر وہ عادت سے مجبور تھی۔ مگر وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ کسی نے اس کی بے خبری میں اس کے ہونٹوں کو بہت دیر تک چھوا ہے۔

یونیورسٹی کا موڑ آنے والا تھا جب سویرا نے پیچھے سے ہاتھ بڑھا کر اس کا بایاں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور بولی۔ ''تم نے پوچھا ہی نہیں کہ میں نے تمہیں بہترین دوست کیوں کہا؟''

دلاور کو خاموش پا کر بولی۔ ''اس لیے کہ تم نے میرے کہنے پر حویلی سے جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور اتنا بڑا فیصلہ ایک بہترین دوست ہی کر سکتا ہے۔''

دلاور کی زندگی نے یکا یک ایک بہت بڑا موڑ لیا تھا۔ یہ موڑ اتنا بڑا تھا کہ دلاور خود بھی چکرا کر رہ گیا تھا۔ اس نے پنڈی چھوڑا تھا، لاہور کو خیر آباد کہا تھا۔ کراچی سے بھاگ نکلا تھا مگر روہی کی فضاؤں میں کوئی سحر تھا۔ چولستانی ہواؤں کے جھونکوں میں ایک غیر مرئی گرفت تھی جن سے آزادی ناممکن تھی۔

وہ پورا کا پورا سویرا کے عشق میں بھیگ چکا تھا۔ بات دور نکل چکی تھی۔ واپسی ناممکن تھی وہ سوچنے لگا، جس شدت سے وہ سویرا کو چاہنے لگا تھا، کیا سویرا کے دل میں بھی، اس کے لیے کوئی جذبہ موجود ہے؟ جواب ''ہاں'' میں آیا۔ سویرا نے کچھ خوبصورت اشارے دیے تھے۔ اس نے کہا تھا۔ ''دلاور! تمہیں حویلی میں رہنا ہے۔ میں یہی بات تم سے کہنے کے لیے آئی تھی۔'' پھر اس نے کہا تھا۔ ''دوست کا دل ٹوٹ جائے گا۔ ایسے دوست کا جو خود کو تمہارا قرض دار سمجھتا ہے۔ اور رہتی زندگی تک سمجھتا رہے گا۔'' اس نے ایسا کیوں کہا تھا؟

اس کے دل میں کیا نہاں تھا۔ آج اس نے دلاور کو ایک خوبصورت سی گھڑی تحفے میں دی تھی اور کہا تھا۔ ''تم بہترین دوست ہو.....'' اس نے دلاور کو اپنا بہترین دوست کیوں کہا تھا؟ کیا اس کے دل کا موسم تبدیل ہو چکا تھا؟ اس کے اور شاہ زمان کے درمیان کوئی دراڑ پیدا ہو چکی تھی؟ عورت کی دوستی سے غلط مطلب تو مرد لیتے ہی ہیں۔ کہیں وہ بھی تو غلط مطلب نہیں لے رہا تھا؟

ساری رات وہ جاگتا رہا۔ باتوں کی کڑیاں ملاتا رہا..... صبح تک اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ لکھنا جانتا تھا۔ جو باتیں زبان بیان نہیں کر سکتی تھی، اس نے خط میں لکھ دیں۔

کاغذ تہ کر کے جیب میں رکھ لیا۔ دل میں فیصلہ کیا کہ جس دن سویرا کا موڈ سب سے اچھا ہوگا۔ وہ سارے اندیشے بالائے طاق رکھ کر اس دن وہ کاغذ کا ٹکڑا سویرا کو تھما دے گا۔ اس کے بعد جو بھی ہو دیکھا جائے گا.....

مگر اگلے آٹھ دس دن میں بھی وہ موقع پیدا نہ ہو سکا۔ پانچ دن کے لیے اسے شاہ زمان کے ساتھ رحیم یار خان جانا پڑا..... وہی قیمتی باز والا معاملہ تھا..... شاہ زمان کی معاملہ فہمی اور سمجھداری سے یہ مسئلہ ختم ہونے کے قریب تھا۔ چھٹے دن یہ لوگ حویلی واپس آ گئے..... تہ کیا ہوا کاغذ اس کی جیب میں ہی تھا۔ وہ دن میں کئی دفعہ ٹٹول کر اس کی موجودگی کا اندازہ لگاتا تھا۔ حویلی پہنچ کر اسے مایوسی ہوئی۔ اس نے رحیم یار خان میں پانچ دن کانٹوں پر بسر کیے تھے۔ اب حویلی پہنچ کر معلوم ہوا کہ سویرا رمشا کے ساتھ فورٹ عباس رمشا کی کزن کے گھر گئی ہوئی ہے۔ سویرا کے بغیر اسے حویلی سونی سونی لگی..... ایک دم خالی اور بکواس۔ سویرا کی واپسی چوتھے دن ہوئی..... مگر اگلے تین دن بھی سویرا کی شکل نظر نہیں آئی۔ دلاور کے حلق میں نمکین آنسوؤں کا ذائقہ گھل گیا۔ پہلی دفعہ اسے سویرا پر غصہ آیا..... وہ سر تا پا انتظار بنا بیٹھا تھا اور سویرا کو جیسے کوئی پروا ہی نہیں تھی۔ وہ رات اس نے آنکھوں میں کاٹ دی..... اگلا سارا دن بھی گزر گیا مگر سویرا نہیں آئی۔ انتظار کی تاریکی طویل ہوتی چلی گئی۔ دیدار کا اجالا نہیں پھیلا۔ اس کا وجود مسلسل انتظار کی تپش سے پھٹنے لگا۔ رگ رگ میں آگ سی بھرنے لگی..... ایک دو دفعہ اس کا دل چاہا خط کو نکالے اور اس کے ٹکڑے کر کے پھینک دے۔

وہ ایک دھندلی یا شاید سیاہ دوپہر تھی۔ صحرا کے جنوب کی سمت سے دور کچھ بگولے سے اٹھے تھے جنہوں نے سورج کی روشنی کا راستہ روک لیا تھا۔ یہ صحرائی بگولے حویلی سے کئی میل دور دکھائی دے رہے تھے۔ یہ بگولے اوپر ہی اوپر اٹھ رہے تھے جیسے سورج کو چھونا چاہتے ہوں۔

ظفری کمرے سے نکل کر حویلی کے جنوب کی طرف بھاگ گیا تھا۔ کمرے سے نکلتے وقت اس نے دلاور سے کہا تھا۔ ''مجھے لگتا ہے..... ابھی تھوڑی دیر بعد طوفان آنے والا ہے..... میں سیبوں والی حویلی کے دروازے بند کر آؤں۔'' سیبوں والی حویلی احاطے کے اندر ہی ایک طرف واقع تھی۔

ظفری کو گئے ابھی تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ دروازہ کھلا

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

اور کوئی اندر آ گیا.....

دلاور کا کمرا روشنی سے جگمگا اٹھا۔ وہ سویرا تھی۔ ہوا کا ایک جھونکا آیا۔ سویرا کا دوپٹا سر سے اتر کر اس کے شانوں پر پھیل گیا۔ نسواری زلفیں منتشر ہوئیں تو دلاور کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ بے ترتیب کھلے بالوں نے اس کے حسن کو کئی گنا زیادہ کر دیا تھا۔ وہ بال سمیٹ رہی تھی، سرکش ہوا شرارت کے موڈ میں تھی۔ سویرا نے شولڈر بیگ لٹکا رکھا تھا۔ یوں لگتا تھا وہ ابھی کسی کے ساتھ آئی ہے۔ پھر اس بات کی تصدیق بھی ہوگئی۔ اس نے دلاور کو بتایا کہ وہ ابھی ابھی شاہ زمان اور رمشا کے ساتھ بازار سے لوٹی ہے۔ شاہ زمان نے ایک مہنگی دکان سے سینڈوچ خریدے..... رمشا اور شاہ زمان نے تو اپنے حصے کے کھا لیے۔ اس نے اپنا سینڈوچ بچا لیا پھر وہ دلاور کی طرف سیدھی ہوئی اور بولی۔ ''بوجھو..... میں نے سینڈوچ کیوں نہیں کھایا.....''

دلاور کے وجود میں تو ہر طرف آتش بازی چھوٹ رہی تھی مگر اس نے اپنے چہرے پر خفگی کا پہرا بٹھا لیا اور سویرا کے سوال پر کچھ نہ بولا۔

سویرا کو کچھ گڑبڑ کا احساس ہوا۔ وہ تھوڑا آگے ہوئی۔ دلاور کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولی۔ ''کیا بات ہے..... کوئی مسئلہ ہے؟''

دلاور نے نفی میں سر ہلا دیا۔ اس کے وجود میں ایک طوفان برپا تھا۔ اس نے پورے پندرہ دن سویرا کا انتظار کیا تھا۔ اس نے ایک ایک سیکنڈ میں اسے سو سو دفعہ یاد کیا تھا۔ اس کے بس میں ہوتا تو آگے بڑھ کر سویرا کو گلے لگا لیتا..... تب تک اسے چومتا چلا جاتا جب تک انتظار کی کڑھن آنکھوں کے رستے بہہ نہ جاتی۔

سویرا کمرے میں بہت خوش خوش داخل ہوئی تھی مگر دلاور کو یوں دیکھ کر بجھ سی گئی تھی۔ سویرا کی ایسی حالت دیکھ کر دلاور کو فتح مندی کا احساس ہونا چاہیے تھا مگر اس کا دل غم سے بھر گیا۔ حلق میں پھندا سا لگ گیا۔

''مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہے۔ اگر ایسا انجانے میں بھی ہوا ہے تو پلیز مجھے معاف کر دو۔'' سویرا نے بڑے دکھی لہجے میں کہا تو دلاور کا سینہ شق ہوگیا۔ جذبات کی شدت سے اس کی آنکھوں میں وہی نمی امڈ آئی جو تالاب کے پاس سویرا کو بچانے کے بعد اس کی آنکھوں میں در آئی تھی۔

وہ سویرا کو پریشان نہیں دیکھ سکتا تھا، گلوگیر لہجے میں بولا۔ ''سویرا! پلیز مجھے معاف کر دیں۔ مجھے آپ کے ساتھ ایسا برتاؤ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اصل..... میں.....''

اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔ ''اصل میں کیا.....؟'' آنکھوں میں ہلکی سی شوخی کی چمک تھی۔

''اصل میں..... میں آپ سے ناراض تھا۔ اتنے دن آپ کی شکل نہیں دیکھ سکا اسی لیے دل تھوڑا سا باغی ہوگیا تھا اور پھر آپ کو بھی تو کوئی خیال نہیں آیا۔'' لہجہ دھیما اور شکوہ کناں تھا۔

''اب تو میں آ گئی ہوں نا..... اب خوش ہو جاؤ..... میرے پاس تمہارے لیے ایک سرپرائز ہے۔'' وہ کہنا چاہتا تھا کہ اس کے پاس بھی سویرا کے لیے ایک چیز ہے جو وہ پچھلے چودہ پندرہ دن سے جیب میں ڈالے پھر رہا ہے مگر وہ اتنی ہمت اکٹھی نہ کر پایا۔

سویرا نے شولڈر بیگ سے سینڈوچ نکال کے دلاور کی طرف بڑھایا۔ سینڈوچ اس نے لے لیا اور بولا۔ ''آپ نے نہیں کھایا۔''

''نہیں..... تم کھاؤ.....'' اس نے کہا اور شولڈر بیگ کی سائڈ والی زپ کھول کے کچھ ڈھونڈنے لگی۔ بالوں کی ایک سرکش لٹ کو کان کے پیچھے اڑستے ہوئے بولی۔ ''دلاور! تمہیں پتا ہے میں آج بہت خوش ہوں۔ اتنی جتنی میں کبھی آج سے پہلے نہیں تھی۔'' دلاور کا دل بری طرح دھڑک اٹھا۔ غیر ارادی طور پر اس کا ہاتھ جیب میں پڑے کاغذ کے ٹکڑے کو ٹٹولنے لگا۔ وہ سچ بولنا چاہتا تھا۔ وہ اپنے دل کی بات کہہ دینا چاہتا تھا۔ چاہے وہ کتنی بھی غلط تھی، چاہے وہ کتنی بھی انوکھی تھی۔ ''تم نے کہا تھا..... ہمیشہ مثبت سوچنا چاہیے۔ میں نے تمہاری بات پر عمل کیا دلاور! اور یقین جانو، مسئلہ حل ہوگیا۔ تھوڑے دن پہلے جس وہم نے میری زندگی اجیرن کر دی تھی، وہ ختم ہوگیا۔ میں بے چین کر دینے والے اندیشوں سے نکل آئی۔''

وہ پتا نہیں کن واہموں اور کیسے اندیشوں کی بات کر رہی تھی۔ دلاور کا دل تو بس کاغذ کے اس ٹکڑے پر اٹکا ہوا تھا جو اس کی جیب میں تھا۔ سویرا نے ایک دیدہ زیب کارڈ نکال کر دلاور کی طرف بڑھایا اور بولی۔ ''بوجھو..... یہ کیا ہے؟'' دلاور نے نفی میں سر ہلایا..... تو وہ بے حد شوخ نگاہوں سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے بولی۔ ''یہ شادی کا کارڈ ہے.....''

''کس کی شادی کا.....'' وہ ڈبے میں پیک سینڈوچ کو سائڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے بولا۔

''کس کی شادی کا ہوسکتا ہے.....؟'' آنکھوں کی چمک مزید بڑھ گئی تھی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

''اب میں نجومی تو ہوں نہیں..... آپ ہی بتا دیجیے۔''

''نہیں، تم خود ہی پڑھ لو.....'' اس نے کارڈ دلاور کے ہاتھ میں تھما دیا۔ دلاور نے کارڈ پڑھا۔ زمین و آسمان اس کی نگاہوں میں گھوم گئے۔ ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا۔ دروازہ اتنی زور سے بجا کہ یوں محسوس ہوا چوکھٹ سمیت نیچے گر پڑا ہو۔ ظفری نے ٹھیک ہی کہا تھا، طوفان آ رہا ہے۔ سویرا سہم گئی، جلدی سے بولی۔ ''مجھے لگتا ہے تیز آندھی آ رہی ہے۔ میں چلتی ہوں۔'' وہ مڑی پھر رک کر بولی۔ ''میرا سرپرائز کیسا لگا؟'' جھوٹی مسکراہٹ لبوں پر سجانا کس قدر مشکل ہوتا ہے، یہ اس روز دلاور کو معلوم ہوا۔

سویرا چلی گئی۔ اس کی خوشبو بھی اس کے ساتھ ہی کمرے سے رخصت ہوگئی۔ سویرا کی شادی کا کارڈ اس کے ہاتھوں میں تھا اور آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی تھی۔ پندرہ دن بعد اس کی شادی شاہ زمان کے ساتھ ہو رہی تھی۔ کراچی میں سمندر کے کنارے بیٹھ کر وہ اکثر سوچا کرتا تھا، خدا نے اتنا زیادہ پانی ایک جگہ کیسے اکٹھا کر دیا ہے مگر آج اس کی آنکھوں میں شاید اتنا پانی خدا نے اکٹھا کر دیا تھا۔ ریت کے طوفان نے چوڈیرو حویلی، اس سے باہر رہی اور اس سے آگے منڈ بھیرو کے ریتیلے بازاروں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ ہر طرف اندھیرا چھا گیا تھا۔ کھڑکیوں کے پٹ دھڑا دھڑ بجنے لگے تھے۔ دلاور کی آنکھوں میں ویرانوں کی دھول تھی۔ اس کے لیے یہ صدمہ ناقابلِ برداشت تھا۔

اس رات اسے بخار ہوگیا۔ باہر ریتیلی آندھی کے جھکڑ چلتے رہے۔ وہ اپنے بستر پر پڑا بخار میں پھنکتا رہا۔ لاہور میں لوہاری سے آگے اور شاہ عالمی سے پہلے ایک تنگ گلی والا بازار بائیں طرف اوپر کو چڑھتا تھا۔ اس بازار کے اختتام پر تنگ گلیوں کا ایک گورکھ دھندا سا تھا۔ انہی گلیوں میں سے ایک گلی میں اس کا سارا بچپن گزرا تھا۔ نیم تاریک گلی کا سیلن زدہ ''تھڑا'' اس کی من پسند جگہ تھی۔

جس عورت کے پاس وہ رہتا تھا، وہ اس کی ماں نہیں تھی۔ چاچی..... ماسی..... نانی..... دادی بھی نہیں تھی۔ پتا نہیں کون عورت تھی وہ جس نے اسے پالا تھا۔ جب وہ بارہ سال کا ہوا تو وہ عورت مرگئی۔ آدھے سفید آدھے مہندی لگے بالوں والی عورت کی میت پر بیٹھے وہ بہت دیر تک روتا رہا تھا۔ اس کے بعد وہ نہیں رویا۔ رونا اسے اچھا نہیں لگتا تھا مگر آج وہ رونا دوبارہ لوٹ آیا تھا۔ آج ایک جیتی جاگتی عورت نے اسے رونے پر مجبور کر دیا تھا۔ وجہ صاف تھی۔ یہ دلاور کی زندگی میں داخل ہونے والی دوسری عورت تھی۔

اگلے تین دن بھی اس کا بخار نہ اترا۔ ظفری اسے دوا لاکر دے رہا تھا اور مسلسل اس کی تیمارداری بھی کر رہا تھا۔ ظفری دلاور کے کہنے پر ہی ملتانی کو منڈ بھیرو سے بلا لایا تھا..... ملتانی کے آنے سے ظفری کی ڈیوٹی کم ہوگئی۔ ملتانی، دلاور کی خدمت میں جت گیا۔

دلاور کی حالت سدھرنے لگی۔ بخار کم ہونے لگا۔ یہاں ہر گزرتے دن کے ساتھ دلاور ٹھیک ہو رہا تھا۔ دوسری طرف ہر گزرتے دن کے ساتھ حویلی کی سجاوٹ میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ برقی قمقمے لگ رہے تھے۔ رنگ برنگی لائٹوں اور مصنوعی پھولوں سے حویلی کو لاد دیا گیا تھا۔ ولیمے کے لیے بہت بڑے دسترخوان کا انتظام کیا جا رہا تھا۔ دو ہزار کے قریب مہمانوں کی لسٹ تیار کی گئی تھی مگر سٹنگ اور کھانے کا انتظام اس سے بھی زیادہ کا رکھا جا رہا تھا.....

شادی میں چار دن باقی رہ گئے تھے۔ ظفری کی زبانی اسے معلوم ہوا تھا کہ سویرا..... پھپھو عالیہ..... اور رمشا..... بہاولپور میں رمشا کے خالو کے گھر شفٹ ہوگئے ہیں۔ اب برات چوڈیرو حویلی سے بڑی آن بان سے نکل کر رمشا کے خالو کے گھر جانی تھی۔

شادی سے ایک دن پہلے دلاور ملتانی سے بولا۔ ''چل یار..... یہاں سے کہیں دور چلے جائیں..... اب میرا دل یہاں پر نہیں لگے گا۔''

''کہاں جائیں گے ہم؟''

''کہیں بھی مگر یہاں سے دور..... جہاں بہت ساری ہوا ہو..... میں..... میں کھل کے سانس لینا چاہتا ہوں..... یار..... یہاں کی ہوا صحیح نہیں ہے..... اس ہوا میں گندھک ملی ہوئی ہے۔ میرا سارا سینہ جھلس گیا ہے۔ میرا سارا حلق چھل گیا ہے.....'' وہ عجیب لہجے میں بولا۔

دلاور کا درد بھرا لہجہ محسوس کر کے ملتانی چونک گیا۔ غور سے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اوئے لالے! تیرے چہرے پر تو عشق کا پینٹ ہوا، ہوا ہے۔ مجھے ٹھیک سے بتا بات کیا ہے؟'' ملتانی دلاور کا راز دان تھا۔ اس کا اصرار بڑھا تو دلاور نے اپنی کہانی کے خاص خاص حصے سنا ڈالے۔ ملتانی سر پکڑ کر بیٹھ گیا، بولا۔

''یار..... یہ سب بہت برا ہوا۔'' ایک لمحے کے لیے اس نے اپنے سر کو سہلایا اور پینترا بدل کر بولا۔ ''اب میں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

تجھے یہاں زیادہ دیر رکنے نہیں دوں گا..... صبح ہوتے ہی ہم واپس منڈ بھیرو چلیں گے..... پھر اس سے اگلے دن ہم دونوں پنڈی چلے جائیں گے۔ ایک کام کا ٹھیکا ملا ہے مجھے، چار پانچ دن بعد جانا تھا مگر اب پرسوں ہی چلیں گے.....'' ملتانی بڑے ٹھوس لہجے میں کہہ رہا تھا مگر دلاور جانتا تھا..... اب رہائی ممکن نہیں تھی۔ سویرا تو پرسوں دلہن بن کر اس گھر میں آ رہی تھی، اپنی تمام تر کوششوں اور ارادوں کے باوجود وہ یہاں سے کہیں نہیں جا سکتا تھا۔ عشق کی نادیدہ ڈور نے اس کے ہاتھ باندھ کر اس کے پورے وجود کو جکڑ دیا تھا۔

شاید یہ خود اذیتی تھی۔ وہ سویرا کی شادی اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا تھا۔

☆☆☆

شادی نہایت دھوم دھام سے ہوئی..... یہ چوڈیرو گاؤں کے ''بڑے سائیں'' کی شادی تھی۔ جتنی بھی خوشی منائی جاتی کم تھی۔ طوفان آتے ہیں، تباہی مچاتے ہیں اور گزر جاتے ہیں۔ شادی کا طوفان بھی ہر چیز کو نیست و نابود کر کے گزر گیا..... شادی کے بعد تین چار دن دلاور شراب کے نشے میں دھت اپنے بستر پر پڑا رہا۔ شراب کا حصول اس حویلی میں کون سا مشکل کام تھا۔

اس نے کبھی کوئی نشہ نہیں کیا تھا۔ صرف سگریٹ پیتا تھا۔ اس دن کے بعد اس نے نشہ شروع کر دیا۔ اس ''بیماری'' کو خود سے لپیٹ لیا جو اسے سویرا کی یاد سے نجات دلا سکتی تھی۔ شادی کے پانچویں دن ملتانی سومنت ساجت کے باوجود واپس لوٹ گیا، دلاور اس کے ساتھ نہیں گیا۔ وہ ابھی اور اذیت سہنا چاہتا تھا۔

یہ شادی کے دو ہفتے بعد کی بات تھی۔ صبح دس گیارہ بجے کے قریب سویرا ٹہلتی ٹہلتی دلاور کے کمرے تک آ گئی تھی۔ اس نے بڑی کامدار شال لے رکھی تھی۔ اب وہ چوڈیرو حویلی کی نئی بہو تھی..... اس کی چال میں ایک شاہانہ تمکنت آ گئی تھی۔ وہ دلاور سے سخت خفا تھی۔ وہ شادی میں شریک نہیں ہوا تھا۔ وقتاً فوقتاً سویرا کو دلاور کی بیماری کی خبریں ملتی رہتی تھیں۔ وہ اس کا احوال جاننے کے لیے ہی ٹہلتی ہوئی اس طرف آ نکلی تھی۔

کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ دلاور اندر موجود نہیں تھا۔ ظفری بھی کسی کام سے نکلا ہوا تھا۔ سویرا اندر داخل ہو گئی۔ سارا کمرا بے ترتیب اور چیزیں بکھری ہوئی تھیں۔ ایک لمحہ اس کے دل میں خیال آیا کہ دلاور والی سائڈ کی چیزیں سنبھال دے مگر دوسرے لمحے ہی اس نے اس خیال کو رد کر دیا۔

الماری کھلی ہوئی تھی، کپڑے بے ترتیب پڑے ہوئے تھے۔ اس نے ایک ہینگر کو اٹھایا تو اس کے نیچے سے شراب کی بوتل برآمد ہوئی۔ اس کو جھٹکا لگا۔ اس نے فوراً الماری بند کر دی۔ الماری کے ساتھ ہی ایک ادھ کھلا اٹیچی کیس پڑا تھا۔ اس نے وہ کھولا، اس میں بہت سی چیزیں بے ترتیبی سے پڑی ہوئی تھیں۔ ان بے ترتیب چیزوں میں سے اس نے لکڑی کا ایک خوبصورت ڈبا اٹھا لیا۔ اس نے آہستگی سے اسے کھولا تو حیران رہ گئی۔ سب سے اوپر ایک رومال پڑا تھا۔ یہ وہی رومال تھا جو سویرا نے ایک بار دلاور کو آنسو پونچھنے کے لیے دیا تھا۔ رومال کے نیچے وہ گھڑی تھی جو سویرا نے اسے تحفے کے طور پر دی تھی۔ اس سے نیچے ٹوٹی چوڑیوں کے کچھ ٹکڑے تھے۔ سویرا دیکھ کے دنگ رہ گئی۔ یہ چوڑیاں اسی کی تھیں۔ پر یہاں کیسے پہنچی تھیں۔ چوڑیوں کے نیچے ایک کاغذ تہ کیا ہوا پڑا تھا۔ سویرا نے وہ کاغذ کھولا۔ خوش خط الفاظ میں نظم لکھی تھی۔ تم کب تک مجھ کو بھولو گے..... اس نے ساری نظم پڑھ ڈالی۔ یہ آزاد نظم اس کی تخلیق کردہ تھی۔ سویرا نے پلنگ کا پایہ تھام لیا اور وہیں بیٹھ گئی۔ اس کا ذہن چکرا رہا تھا۔ آنکھوں کے آگے تارے ناچ رہے تھے۔ آج اس پر ایک عجیب انکشاف ہوا تھا۔

☆☆☆

دلاور نہ زمین پر تھا نہ آسمانوں میں۔ اس کا وجود جیسے ہواؤں میں معلق تھا۔ ظفری اکثر اسے اپنی حالت سدھارنے کا کہتا۔ مگر کسی کے کہنے سے اس کی حالت کہاں سنبھلنے والی تھی۔ ظفری یہی سمجھتا تھا کہ دلاور گھریلو طور پر بے حد پریشان ہے۔ دلاور نے اسے اپنے گھر بار کے بارے میں دردناک من گھڑت کہانی سنا رکھی تھی اور یہ جھوٹ گھڑنے کا مشورہ دلاور کو ملتانی نے دیا تھا۔

دلاور اس وقت سیبوں والے باغ کی طرف چلا جا رہا تھا۔ ''سیبوں والا باغ'' اصل میں وسیع و عریض چوڈیرو حویلی کا جنوب مشرقی حصہ تھا۔ یہاں کوئٹہ کا سب سے اچھا سیب لاکر پیک کیا جاتا تھا اور پھر مڈل ایسٹ میں ایکسپورٹ کیا جاتا تھا۔ دلاور کی حالت ابتر تھی۔ اس کے بال الجھے، شیو بڑھی ہوئی تھی۔ شکل سے مہینوں کا بیمار نظر آتا تھا۔ ظفری سیبوں والے باغ کا نگران مقرر تھا۔ وہ اس وقت وہاں موجود تھا۔ سیبوں کی پیٹیاں کنٹینر میں لوڈ کروا رہا تھا۔ سیبوں والے باغ میں آنے کا مشورہ ظفری نے ہی اسے دیا تھا۔ ظفری ہمدرد اور انسان دوست آدمی تھا۔ وہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

چاہتا تھا کہ دلاور اپنے کمرے میں پڑا رہنے کے بجائے چلے پھرے...... حویلی میں گھومے، خود کو مصروف رکھنے کی کوشش کرے جس سے اس کی موجودہ خراب طبیعت درست ہو۔

دلاور کو باغ میں آتا دیکھ کر ظفری کے چہرے پر مسکراہٹ ابھری پھر گہری ہو گئی۔ وہ کنٹینر سے چھلانگ لگا کر اتر آیا بولا۔ ”یارا! بہت اچھا کیا تم ادھر آ گئے۔“ وہ ہاتھ میں پکڑا ایک سیب چمکا کر دلاور کی طرف اچھالتے ہوئے بولا۔ ”یارا! خود کو سنبھالو...... نہاؤ...... شیو بناؤ...... اچھے کپڑے پہنو۔ بخار تو کب کا رخصت ہو گیا۔ تم اب اپنے ذہن سے پریشانی کو بھی رخصت کر دو۔“

ظفری کی بات پر اس نے پھیکی سی مسکراہٹ پر اکتفا کیا۔ وہ دل کھول کے ہنسنا چاہتا تھا مگر اس کا دل مر گیا تھا۔ کوئی چیز کوئی منظر، کوئی بات بھی تو اسے اچھی نہیں لگتی تھی...... آدھے سفید آدھے مہندی لگے بالوں والی عورت کے مرنے کے بعد بھی اس کی حالت کافی دن ایسی ہی رہی تھی۔ پھر تھوڑے دنوں بعد وہ بہتر ہو گیا تھا۔ کیا اب بھی ایسا ہو گا؟ تھوڑے دن...... کچھ ہفتے...... گزر جانے کے بعد وہ زندگی کی طرف لوٹ آئے گا؟ جواب نفی میں آیا...... گھاؤ پہلے زخم سے زیادہ گہرا اور کاری تھا۔

ظفری...... سیبوں والا کنٹینر چوڈیرو کی حدود سے باہر نکلوانے کے لیے چلا گیا اور دلاور کو تھوڑی دیر بعد واپس آنے کا کہہ گیا۔

باغ وسیع رقبے پر پھیلا ہوا تھا۔ زمین پر تھوڑا اونچا تھڑا سا تھا جس پر فاصلے سے لوہے کے پائپ لگے تھے اور ان پائپوں کے اوپر ٹین کی چادریں ڈالی ہوئی تھیں۔ تپتی چھت کے نیچے جابجا پرالی بکھری ہوئی تھی۔ دھلے دھلائے سیب صاف کر کے خوبصورت کریٹوں میں پیک کیے جا رہے تھے۔ دھلے سیب دیکھ کر دلاور کے دل میں امید سی جاگی۔ وہ ٹین کی چادروں والی چھت سے پرے ہٹتا چلا گیا۔ وہ درختوں سے گھرے اس حجرے کی عقبی جانب بڑھ گیا جہاں سے دھلے ہوئے سیب لائے جا رہے تھے۔ دلاور کو من کی مراد مل گئی۔ حجرے کی بیک سائیڈ پر پانی کا تالاب موجود تھا۔ ہیوی موٹر کی آواز گونج رہی تھی اور تقریباً پانچ انچ قطر کے پائپ سے جھاگ اڑاتا پانی تالاب میں گر رہا تھا۔ یہ حوض نما تالاب کم و بیش تین سو مربع فٹ کا تھا۔ تالاب میں سے پانی نکال کر سائڈ پر بنی ہوئی حوضیوں میں سیب دھوئے جاتے تھے مگر اب نہیں دھوئے جا رہے تھے۔ دلاور نے تالاب کے قریب بیٹھے ایک ملازم سے اجازت لی اور

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں
گھر بیٹھے
رسالے حاصل کیجیے
جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت
باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں، اپنے دروازے پر
ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)
پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 800 روپے
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 9,000 روپے
بقیہ ممالک کے لیے 8,000 روپے
آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔
یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے
بیرونِ ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر بھاری بینک فیس عائد ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔
رابطہ: ثمر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون: 021-35895313 فیکس: 021-35802551

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

کیڑوں سمیت تالاب میں اتر گیا..... وہ گہرے پانی کی مچھلی تھا۔ گہرے پانی کی مچھلی جو لاکھوں ٹن پانی کے دباؤ میں بھی زندہ رہتی ہے جس دباؤ پر چیزیں پھٹ کر ریزہ ریزہ ہوجاتی ہیں، وہ سکون سے تیرتی ہے۔ دباؤ کی زیادتی اس کی زندگی..... دباؤ کی کمی اس کی موت ہوتی ہے۔ وہ سینے سے سانس نکال کر تالاب کے پیندے میں جا بیٹھا۔ تالاب دس فٹ کے قریب گہرا تھا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ یہاں دنیا کی مصیبتوں، اس کے رنج و غم سے دور ہوگیا ہو۔ ہلکی ہلکی سرگوشیوں جیسی آوازیں تھیں جو اس کی سماعت سے ٹکراتی تھیں..... آدھے سفید آدھے مہندی لگے بالوں والی عورت کے گھر اکثر وہی آدمی آیا کرتا تھا۔ آہستہ آہستہ دلاور کو اندازہ ہوا تھا کہ وہ اس کا گھر والا ہے۔ اس کا نام سرفو تھا، مگر سب اسے سرفو دم گھٹ کہتے تھے۔ وہ راوی کے پانیوں کا کھنچوا تھا۔ کہا جاتا تھا کہ وہ بغیر سانس لیے پندرہ منٹ تک پانی کے اندر رہ سکتا ہے۔ وہ جب بھی اس گھر میں آتا دلاور کو اپنے ساتھ دریائے راوی لے جاتا۔ خود پانی میں اترتا، اسے بھی غوطہ لگانے پر مجبور کرتا۔ اس وقت دلاور کی عمر سات آٹھ سال ہوگی (دلاور کا نام..... دلاور بھی اسی نے رکھا تھا) پانی کے اندر شروع شروع میں دلاور کی حالت بری ہوجاتی۔ وہ کھانستا، غوطے کھاتا، پانی ناک میں داخل ہوکر اس کا تالو چھیل دیتا، اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوتے مگر سرفو دم گھٹ کو اس پر رحم نہ آتا۔ ان لمحات میں سرفو دم گھٹ، دلاور کو دنیا کا سب سے ظالم انسان لگتا مگر اس سختی کے پیچھے ایک تربیت چھپی ہوئی تھی..... پتا نہیں کیوں سرفو دم گھٹ جاتے جاتے اپنا فن دلاور میں منتقل کرگیا۔ سخت، جان لیوا تربیت میں دلاور کو پتا بھی نہ چلا کہ وہ کب گہرے پانی کی مچھلی بن گیا ہے۔ سرفو دم گھٹ کی تربیت قریباً تین سال تک جاری رہی۔ دلاور کو پالنے والی عورت کے مرنے کے ساتھ ہی یہ سلسلہ بھی منقطع ہوگیا۔ وہ عورت دنیا سے کیا گئی، سرفو دم گھٹ بھی جیسے دنیا سے رخصت ہوگیا۔ اس کے بعد دلاور نے اسے کبھی نہیں دیکھا مگر تب تک ایک نایاب ہنر دلاور میں منتقل ہو چکا تھا۔

وہ جب حد سے زیادہ پریشان ہوا کرتا تو راوی کے پانی میں کود جاتا۔ کنارے پر کسی جڑ کو پکڑ کر تین چار منٹ تک زیر آب رہتا۔ جب سینے میں رکی سانس اس کے پھیپھڑوں کو جھنجوڑنے لگتی، وہ سطح آب پر آجاتا۔ سانس لے کر دوبارہ زیر آب چلا جاتا۔ آج بھی وہ ہمیشہ سے زیادہ دکھی تھا۔ حویلی میں تالاب نظر آیا تو جیسے وہ جی اٹھا اور پھر..... من پسند کھیل شروع ہوگیا..... وہ روز سیبوں والی حویلی میں آتا اور بہت دیر تک اپنا پسندیدہ کھیل کھیلتا۔ دم توڑتی مچھلی پانی ملنے سے دوبارہ جی اٹھتی ہے۔ وہ بھی جیسے دوبارہ زندہ ہونے لگا تھا، دن بدن بہتری کی طرف بڑھنے لگا تھا۔ پہلے وہ ہر دم نشے میں رہتا تھا مگر اب نشے والی حالت میں کمی ہونے لگی تھی۔ اسی دوران میں ایک روز ایک عجیب واقعہ بھی ہوا۔ تالاب میں غوطہ زن رہنے کے بعد دلاور پانی کی سطح پر ابھرا تو ٹھٹک کر رہ گیا۔ چند قدم کے فاصلے پر بڑی آپا، کٹی ناک والی نگینہ بیگم اور سویرا وغیرہ کھڑی تھیں۔ وہ بالکل غیر متوقع طور پر باغ کی سیر کو آئی تھیں۔ دلاور کا بالائی جسم عریاں تھا۔ بڑی آپا کی نگاہ سیدھی دلاور کی چھاتی پر پڑی۔ وہاں افقی رخ پر وہی دس بارہ انچ لمبا زخم تھا جو سویرا کو بچاتے ہوئے دلاور کے سینے پر آیا تھا۔ دلاور صرف شلوار میں تھا، اس نے باہر نکل کر جلدی سے چادر میں اپنا جسم لپیٹا اور مؤدب کھڑا ہوگیا۔ بڑی آپا نے کہا۔ ''دلاور! کافی لمبا پھٹ لگا ہوا ہے تجھے، شکر کر تیری جان بچ گئی۔''

دلاور نے کہا۔ ''جی ہاں، پھٹ تو لگا ہے..... لیکن اب پرانا ہوگیا ہے۔''

بڑی آپا کے پیچھے کھڑی ایک ملازمہ کانوں کو ہاتھ لگا کر بولی۔ ''توبہ اللہ جی۔ بڑی خطرناک لڑائی تھی وہ۔ جب چانڈیو کے بندے نے چاقو چلایا تو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ مجھے تو لگتا ہے جی کہ اگر اس ویلے دلاور سامنے نہ آتا تو یہ چاقو..... اللہ نہ کرے سویرا باجی کو ہی لگتا تھا۔''

دلاور کو لگا جیسے اس کا کوئی قیمتی راز افشا ہوگیا ہے۔ اسے محسوس ہوا کہ جیسے سویرا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا ہے۔ عورتیں اس واقعے کی تفصیل بیان کرنے لگ پڑیں۔ دلاور موقع دیکھ کر وہاں سے ہٹ گیا۔

☆☆☆

شادی کے بعد دو تین ماہ پلک جھپکتے میں گزر گئے۔ سویرا، شاہ زمان کی ہر ضرورت کا خیال رکھتی تھی۔ وہ ایسی بیوی ثابت ہوئی تھی جو اپنی اطاعت، ناز و ادا اور موقع محل کے مطابق بات چیت سے خاوند کا دل جیت لیتی ہے۔ شاہ زمان اس کے حسن کا اسیر تو پہلے سے تھا۔ اب اس کی سیرت کا گرویدہ بھی ہوچلا تھا مگر ان سب باتوں کے ساتھ ساتھ اس کی رگوں میں جاگیردارانہ خون بھی دوڑتا تھا۔ وہ کسی وقت رات کو حویلی میں راگ رنگ کی محفل بھی جمالیتا تھا۔ سویرا ادبی زبان میں اعتراض کرنے کے بعد خاموش ہوجاتی

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

تھی۔ ایک جوان چودھری کی حیثیت سے شاہ زمان ''نظر بازی'' سے بھی باز نہیں آتا تھا۔

شام کا وقت تھا۔ شاہ زمان اور سویرا دالان میں بیٹھے چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ چائے کا سامان میز پر ترتیب سے رکھنے والی ملازمہ ماروی تھی۔ اس نے اپنا جسم باریک دوپٹے میں لپیٹ رکھا تھا۔ اس کے جسم کا انگ انگ چیخ چیخ کر دیکھنے والے کو اپنی طرف متوجہ کرتا تھا۔ شریف سے شریف انسان کی آنکھیں بھی اس کے قیامت خیز جسم سے ٹکرائے بنا نہیں رہ سکتی تھیں۔

اس کا رنگ گندمی' چہرے کے نقوش تیکھے تھے۔ لانبی آنکھوں میں لگے کاجل میں حسن کی ایک داستان رقم تھی۔ اس کا حسن کسی بھی پارسا کا بیڑا غرق کر سکتا تھا۔

وہ جھک کر چائے بنا رہی تھی اور شاہ زمان مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوا وقتاً فوقتاً اسے دیکھ رہا تھا۔ سویرا کی لاعلمی کے دوران جتنی دفعہ اس کی نظر ماروی کی طرف اٹھتی، نگاہ کی پیش پہلے سے بڑھی ہوتی ...... عورت چار آنکھیں رکھتی ہے۔ سویرا سب جانتے ہوئے بھی انجان بنی رہی۔ شاہ زمان نے اس کے انجان بنے رہنے کو اپنا کارنامہ سمجھا اور مزید دلیر ہو گیا۔ وہ باتیں تو سویرا سے کر رہا تھا مگر اس کی نگاہوں کا مرکز ماروی تھی ...... آخر سویرا زچ ہو گئی۔ اس نے تھوڑے سخت لہجے میں ماروی کو وہاں سے جانے کا اشارہ کیا تو شاہ زمان یوں انجان بن گیا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو......

تھوڑی دیر پہلے سویرا بہت اچھے موڈ میں تھی مگر شاہ زمان کی نظر بازی نے سویرا کے موڈ کا ستیاناس کر دیا۔ باقی وقت وہ خاموش رہی، صرف ہوں ہاں سے شاہ زمان کی باتوں کا جواب دیتی رہی۔

اگلی رات، ڈنر میں کھانا سرو کرنے والی بھی ماروی تھی۔ بڑے ٹیبل پر کھانا لگایا گیا تھا۔ سب لوگ کھانا کھا رہے تھے اور بظاہر شاہ زمان، شاہ فرمان سے باز کے سلسلے میں کوئی گرما گرم بحث کر رہا تھا مگر اس کی نگاہیں ماروی کا طواف کر رہی تھیں۔ کھانا سویرا کے حلق میں اٹکنے لگا۔ ابھی تو اس کی شادی کو ڈھائی تین ماہ کا عرصہ ہی ہوا تھا۔ شاہ زمان یہ کیا کر رہا تھا۔ آدمی عورتوں کی جانب دیکھتے ہیں مگر اس طرح دیکھنے اور شاہ زمان کے اب والے دیکھنے میں بڑا فرق تھا اور یہ فرق سویرا کو بری طرح محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے اپنے دل کو لاکھ بہانے دے کر بہلا لیا کہ وہ یوں ہی شکی مزاج ہو رہی ہے۔ آدمی عورتوں کی طرف دیکھتے ہی ہیں۔ اسے شاہ زمان کی نظر پہچاننے میں غلطی ہوئی ہے لیکن .....

لیکن یہ سلسلہ تو کئی ہفتوں سے سویرا کو نظر آ رہا تھا۔ اس رات سویرا نہ سو سکی۔ صبح ناشتا دونوں نے باہر لان میں کیا۔ چائے کا سپ لیتے ہوئے وہ بڑی ادا سے بولی۔ ''آج کل آپ بڑے دل پھینک لگ رہے ہیں۔'' شاہ زمان ہنس دیا۔ سلائس کا ٹکڑا منہ میں چباتے ہوئے بولا۔

''تم کس کی بات کر رہی ہو؟'' وہ لانبی انگلی شاہ زمان کے پہلو میں گھساتے ہوئے بولی۔

''آپ کی...... اور مجھے لگتا ہے آپ کو ٹھیک کرنا پڑے گا۔'' اس کی انگلی رینگتی ہوئی شاہ زمان کے سینے پر آ گئی۔

شاہ زمان نے جلدی سے اِدھر اُدھر دیکھا اور سویرا کا ہاتھ فوراً پرے ہٹا دیا۔

''کیا ہوا......؟'' سویرا قہقہہ مارتے ہوئے شوخی سے ہنسی۔

''کیا کر رہی ہو...... کوئی دیکھ لے گا......'' اس نے مصنوعی خفگی سے کہا۔

''اچھا جی...... آپ کو اپنی عزت کا بڑا خیال ہے۔'' اس نے شاہ زمان کے پہلو میں چٹکی لی پھر بولی۔ ''وہاں ڈنر

بھلکڑ

جنرل وارڈ میں ایک صاحب سے جن کا ابھی ابھی آپریشن ہوا تھا' برابر میں لیٹے ہوئے مریض نے پوچھا۔ ''آپ کو آپریشن کے بعد کوئی تکلیف تو محسوس نہیں ہو رہی؟''

وہ صاحب بولے۔ ''اجی کیا پوچھتے ہو۔ پیٹ میں بڑا درد ہو رہا ہے۔''

پڑوسی مریض بولا۔ ''یہ ڈاکٹر صاحب دراصل بھلکڑ ہیں۔ ایک آپریشن کے بعد انہیں مریض کا پیٹ دوبارہ کھولنا پڑا کیونکہ وہ اس کے پیٹ میں قینچی بھول گئے تھے، دوسرے مریض کے پیٹ میں چاقو بھول گئے تھے۔''

اتنے میں ڈاکٹر صاحب گھبرائے ہوئے وارڈ میں داخل ہوئے اور گھبرا کر بولے۔ ''بھئی کسی نے میری چھتری تو نہیں دیکھی؟'' اتنا سننا تھا کہ آپریشن والے صاحب بے ہوش ہو گئے۔

مرسلہ: وزیر محمد خان، بٹل ہزارہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

میں تو سب کے سامنے بڑی بہادری کا مظاہرہ کر رہے تھے آپ...... ایک منٹ کے لیے بھی ماروی سے آپ کی نظر نہیں ہٹ رہی تھی۔"

سویرا کی بات پر وہ دل کھول کر ہنسا...... بولا۔ "تم عورتیں بھی پتا نہیں کیا مخلوق ہو۔ ہر وقت شک کی دنیا میں جیتی ہو۔"

"تو کیا...... شک نہ کروں...... آپ برابر...... اسے گھورے جا رہے تھے۔" وہ مصنوعی خفگی سے لاڈ دکھاتے ہوئے بولی۔ وہ ادائیں دکھا رہی تھی...... شاہ زمان کو چھیڑ رہی تھی مگر اندر اس کے دل میں اک گرہ سی لگ گئی تھی۔

شاہ زمان بولا۔ "تو شک نہ کیا کر...... چوڈیرو حویلی کے مردوں کے خون میں یہ چیز شامل ہے۔ ہم لوگ عورتوں کے قدر دان ہیں اور خاص طور پر خوبصورت عورتوں کے...... تمہارے جیسی......" وہ اس کی طرف اشارہ کر کے ہلکے پھلکے انداز میں بولا۔ "اور ضروری نہیں ہے ہر خوبصورت عورت کو ہم اپنی بیوی بنالیں...... اسی لیے میں مفت مشورہ دیتا ہوں...... تو ایویں شک کے بیج نہ بویا کر......" سویرا جانتی تھی کہ شاہ زمان نے یہ باتیں مذاق میں کی ہیں۔ وہ یہ باتیں کرتے ہوئے اشارے کنائیوں سے اسے چھیڑ بھی رہا تھا...... مگر سویرا یہ بھی جانتی تھی کہ اس مذاق کی آڑ میں سچ بھی جھلک رہا تھا۔ شادی سے قبل اس نے اپنے ذہن میں جو اندیشے دبا دیے تھے، وہ صرف دو تین ماہ بعد ہی سر اٹھانے لگے تھے۔

☆☆☆

دلاور کے ہاتھ میں عجیب شغل آ گیا تھا۔ اس نے ظلفری سے اجازت لے لی تھی۔ وہ روزانہ سیبوں والے باغ کا رخ کرتا اور گھنٹوں اپنا من چاہا کھیل کھیلتا۔ تالاب کے پانی میں ڈبکی لگاتا تو دنیا کے رنج والم کچھ دیر کے لیے پانی سے باہر رہ جاتے...... ظلفری کسی کام سے تھوڑے دنوں کے لیے صادق آباد گیا ہوا تھا۔ دلاور کمرے میں اکیلا تھا۔ جب وہ تنہا ہوتا تو سرکش سوچیں اس پر حاوی ہونے لگتی تھیں۔

باہر گھنگھور گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا تھوڑی دیر میں بارش شروع ہو گی اور کئی مہینوں سے پیاسی زمین سیراب ہو جائے گی۔

جس سوچ اور جس جذبے کو سلانے کی سعی وہ پچھلے دو تین ماہ سے کر رہا تھا اور جس میں وہ کچھ کامیاب بھی ہوا تھا، جاگ گیا۔ بدلتے موسم اور مست ہواؤں نے یکا یک، اس کے اندر کا موسم بھی بدل ڈالا۔ شادی کے بعد اس نے دو تین دفعہ سویرا کو نئے ڈرائیور کے ساتھ نکلتے دیکھا تھا۔ وہ سویرا کا سامنا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ پچھلے چند ہفتے سے اس کا دل چاہنے لگا تھا کہ اب وہ یہ حرم چھوڑ جائے۔ مگر اب شاہ زمان نے اسے یہاں روک لیا تھا۔ وہ اس سے کوئی اہم کام لینا چاہتا تھا۔ وہ "اہم کام" کیا تھا، دو ماہ گزر جانے کے بعد بھی دلاور کو معلوم نہیں ہو سکا تھا۔ دلاور کے دل میں نشے کی مدہوشی کے عالم میں کئی دفعہ یہ سوال اٹھا تھا کہ سویرا کو ایک دفعہ بھی اس سے ملنے کا خیال نہیں آیا۔ وہ چاہتی تو "بیمار" دلاور کی خبر لینے ہی آ جاتی۔ مگر وہ اس حقیقت سے لاعلم تھا۔ سویرا اس کی خبر لینے ہی آئی تھی اور اس کی غیر موجودگی میں اس کے کمرے میں وہ کچھ دیکھ گئی تھی کہ دوبارہ وہاں آنے کی ہمت اس میں نہ رہی تھی۔

سہانے موسم نے آج اس کے دل کے تار چھیڑ دیے تھے۔ تھوڑی دیر بوندا باندی ہوتی رہی پھر موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ اس نے اٹھ کے کھڑکی کے پٹ کھول دیے۔ سوندی گیلی مٹی والی ہوا اس کے نتھنوں سے ٹکرائی تو وہ جھوم اٹھا۔ سویرا شدت سے اسے یاد آنے لگی۔ اس کے نرم گلابی ہونٹ اب تک اسے بھولے نہیں تھے۔ اس نے ان ہونٹوں سے ایسا جام پیا تھا کہ مرتے دم تک اس نشے سے آزاد نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے بھولنے کی خاطر اس واقعے کو بے خبری کے پاتال میں پھینک دیا تھا مگر ایسے "حادثے" کب بھولتے ہیں۔ جب جب کلیاں کھلتی ہیں، جب جب بارش برستی ہے، اس واقعے کی یاد دل کی دیواروں کو ٹھوکریں مارتی ہے۔

باہر بارش برستی رہی اور وہ رات بہت دیر تک بستر پر کروٹیں لیتا رہا۔ اس کی آنکھ نہ جانے کب لگی...... مگر تھوڑی دیر میں ہی وہ کسمسا کر اٹھ بیٹھا...... حواس کچھ بحال ہوئے تو اسے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اس کے ساتھ بستر پر کوئی اور بھی ہے۔ ایک نامانوس سی خوشبو بھی کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھا اور اس نے لائٹ آن کر دی...... خدا کی پناہ...... اس کے بستر پر ایک قیامت موجود تھی۔

وہ ایک لڑکی تھی۔ اس کا جوان قاتل جسم دلاور کے دماغ میں دھماکے کر رہا تھا۔ اس کے کپڑے بھیگے ہوئے تھے۔ بال بکھرے ہوئے تھے اور وہ مخمور نگاہوں سے دلاور کی جانب دیکھ رہی تھی۔ کاجل لگی آنکھوں میں ایک داستان رقم تھی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

دلاور نے اس فتنہ پرور لڑکی کو بے شمار دفعہ حویلی کے برآمدوں اور نشست گاہ کے آس پاس کام کرتے اور آتے جاتے دیکھا تھا۔ یہ وہی ماروی تھی جس کو حویلی کا ہر مرد للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا تھا۔ یہ لڑکی..... یہاں..... اس کے بستر پر رات کے ڈیڑھ، دو بجے کے قریب اس حالت اور ایسے موسم میں کیا کر رہی تھی؟ دلاور کو سازش کی بو محسوس ہونے لگی۔ اس نے بڑی عجلت میں کمرے کا دروازہ کھولا، دھیمے مگر نہایت سخت لہجے میں بولا۔ ''چلو..... یہاں سے باہر نکلو..... تم کیا کر رہی ہو میرے کمرے میں؟''

اس نے نگاہ اٹھا کر ایک ادائے قاتلانہ سے دلاور کی جانب دیکھا۔ آہستگی سے بستر سے اٹھی۔ دلاور کے قریب آ کر دروازہ بند کر دیا۔ دلاور نے غصے کے عالم میں دروازہ کھولنا چاہا تو وہ شعلہ بدن پوری کی پوری دلاور کے ساتھ آ لگی۔ دلاور ایک لمحے کے لیے سن ہو کر رہ گیا۔ رات، تنہائی، بارش اور ساتھ لگا ایک جوان نسوانی جسم..... دلاور جیسے سرتاپا پسینے میں ڈوب گیا۔ اس نے اس لڑکی کو کندھوں سے پکڑ کر خود سے علیحدہ کیا تو وہ حیران رہ گیا۔ وہ رو رہی تھی۔ اس کی کاجل لگی آنکھوں میں آنسوؤں کی لڑیاں تھیں۔ اس سے پہلے کہ دلاور کچھ سمجھ پاتا یا اس سے کوئی سوال کرتا، وہ بولی۔ ''دلاور! مجھے معاف کر دینا۔ مجھے ایسا رستہ اختیار کرنا پڑا..... میں خود کے ہاتھوں مجبور ہو کر یہاں تک پہنچی ہوں.....''

''تم کہنا کیا چاہتی ہو؟'' دلاور کا لہجہ درشت تھا۔

''میں تم سے پیار کرتی ہوں..... اور اس دن سے کرتی ہوں جس دن تم نے اس حویلی میں قدم رکھا ہے.....'' وہ ایک لمحے کے لیے رکی پھر بولی۔ ''ٹھہرو، تمہیں یوں سمجھ نہیں آئے گی..... میں تمہیں تفصیل سے بتاتی ہوں۔ یہاں آؤ..... بیٹھ کے بات کرتے ہیں۔''

اس لڑکی نے کچھ اس انداز سے کہا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی دلاور کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ اس کے برابر میں بیٹھی اور بولی۔ ''میرا نام ماروی ہے۔ ترنڈا کی رہنے والی ہوں۔ اس حویلی میں اپنی ماں کے ساتھ رہتی ہوں۔ میں جس لڑکے سے پیار کرتی تھی اس کا نام بابو تھا۔ اس کی شکل تم سے بہت ملتی تھی۔ تمہارے جتنا قد کاٹھ، تمہارے جیسا جسم۔ تین سال ہوئے وہ ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں ختم ہو گیا۔ میری دنیا اندھیر ہو گئی۔ میں پاگل اور دیوانی ہو گئی۔ میں ہر روز اس کی یاد میں آنسو بہاتی تھی۔ پھر ایک دن میں نے تمہیں حویلی میں دیکھا تو مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا..... میں سمجھی بابو لوٹ آیا ہے مگر دلاور جانے والے کب واپس لوٹ کے آتے ہیں۔ تم بابو نہیں ہو..... بابو جیسے تو ہو نا..... روپے میں آٹھ دس آنے تو اس سے ملتے ہو نا۔ میں تمہیں دیکھتی ہوں تو مجھے یوں لگتا ہے بابو ابھی زندہ ہے۔ میرے پاس ہے۔'' اس نے گلوگیر لہجے میں کہا اور اٹھ کر دلاور کو اپنی بانہوں میں لے لیا.....

دلاور کرسی پر بیٹھا ہوا تھا، اس کا سر کسی گداز میں دھنستا چلا گیا..... نسوانی بدن کی خوشبو نے اس کا بیڑا غرق کر کے رکھ دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ بہک جاتا..... اپنی ہی نظروں میں گر جاتا، اس نے خود کو ماروی سے علیحدہ کیا اور منت بھرے لہجے میں بولا۔ ''ماروی! مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ تم اس وقت یہاں سے جاؤ۔ کسی نے دیکھ لیا تو قیامت آ جائے گی۔ میں صبح تم سے بات کروں گا۔'' دلاور نے لاکھ جتن کر کے اسے وہاں سے رخصت کیا اور واپس آ کر سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اس کا دماغ ہزار کلومیٹر کی رفتار سے دوڑ رہا تھا۔ زمانے بھر کی خاک چھاننے والا اور گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے والا دلاور اتنا تو سمجھ رہا تھا کہ ماروی خود سے یہاں نہیں آئی تھی، اسے کسی نے بھیجا ہے۔ کس نے بھیجا، یہ سوال جواب طلب تھا۔

ماروی نے جو کہانی اسے سنائی تھی، وہ نہایت کمزور اور بوگس تھی۔ کہانی سناتے ہوئے اس کے جذبات اور اس کا لہجہ میل نہیں کھا رہا تھا۔ وہ جیسے کسی کا یاد کرایا ہوا سبق پڑھ رہی تھی۔

☆☆☆

آنے والے دنوں میں ماروی اس کے لیے عجیب دردِ سر بن گئی۔ جب موقع ملتا وہ آن ٹپکتی اور پھر اس کی جان نہ چھوڑتی۔ وہ بہت دیر اس سے باتیں کرتی رہتی۔ صاف پتا چلتا تھا، وہ اسے خود کی طرف مائل کرنا چاہتی ہے۔ وہ ہر حربہ آزما رہی تھی۔

ایک دن وہ گاڑی میں بیٹھا اس کا ڈیش بورڈ صاف کر رہا تھا۔ آج وہ پہلے دن اپنی ڈرائیوری کی ڈیوٹی پر واپس آیا تھا۔ پستول اس نے اپنے ہولسٹر میں لگا رکھا تھا..... آگے جھک کر صفائی کرتے ہوئے پستول پسلیوں میں چبھنے لگا تو اس نے پستول نکال کر ڈیش بورڈ پر رکھ دیا اور اپنا کام کرنے لگا۔ اسے پتا ہی نہ چلا کب ماروی اگلا دروازہ کھول کے اس کے برابر میں آ بیٹھی۔

''تم یہاں بھی پہنچ گئیں.....؟'' دلاور نے اسے گھورا۔

''میں تمہارا پیچھا کبھی نہیں چھوڑوں گی.....'' وہ بالوں کی

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

ایک آوارہ لٹ کو انگلی پر گھماتے ہوئے بولی۔ جواب میں دلاور کچھ نہیں بولا، اپنے کام میں منہمک رہا...... ماروی نے ڈیش بورڈ سے پستول اٹھالیا، دلاور کی جانب کرتے ہوئے بولی۔

''اور اگر تم نے مجھ سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کی تو ...... میں تمہیں گولی ماردوں گی۔'' وہ ایک آنکھ بند کیے اس کا نشانہ لیے ہوئے تھی۔

دلاور نے جھپٹ کے اس سے پستول چھینا تو وہ ایک دم سہم گئی...... دلاور نے اسے بے نقط سنا ڈالیں...... پہلے وہ خاموش ہوئی پھر چہرے کے تیور بگڑے۔ نچلا ہونٹ ڈھیلا چھوڑ کر جلی آنکھوں میں آنسو لے آئی...... اس نے تیزی سے اس سے پستول چھینا تھا اسی دوران اس کے ناخنوں سے ماروی کا ہاتھ زخمی ہوگیا تھا۔ دلاور کا دل نرم پڑ گیا۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کے زخم کو دیکھنے لگا...... اسی دوران شاہ زمان اندر سے برآمد ہوا۔ اس کا دھیان گاڑی میں اگلی سیٹ پر بیٹھی ماروی پر پڑا۔ ماروی نے چونک کر دلاور سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور گاڑی سے نکل کر سر پر دوپٹا ٹھیک کرتی ہوئی وہاں سے رفو چکر ہوگئی۔ شاہ زمان نے جاتی ہوئی ماروی کو بڑی گہری اور تفصیلی نظروں سے دیکھا اور گاڑی کی طرف آ گیا۔ دلاور نے بڑی سرعت سے شاہ زمان کے لیے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولا...... شاہ زمان بڑے کروفر سے گاڑی میں سوار ہوا اور گاڑی تیزی سے حویلی کے صدر دروازے سے باہر نکل گئی۔ چند منٹ خاموشی کے گزر گئے پھر شاہ زمان کی بھاری آواز گونجی۔

''اب تم کیسے ہو......؟''

''اللہ کا کرم ہے بڑے سائیں...... پہلے سے بہتر ہوں......''

''اسپتال سے جو رپورٹس آنی تھیں، ان کا کیا بنا......''

''بڑے سائیں...... رپورٹس آ گئی تھیں۔ اللہ کا کرم ہے، سب ٹھیک ٹھاک ہے۔'' رپورٹس کے بارے میں دلاور نے جھوٹ سے کام لیا تھا اور اس جھوٹ کا مشورہ بھی دلاور کو ملتانی نے ہی دیا تھا۔ نہ ہی کوئی ٹیسٹ ہوا تھا، نہ ہی کسی رپورٹس نے آنا تھا مگر حویلی میں یہی مشہور کیا گیا تھا کہ ملتانی، دلاور کی بیماری سے متعلق خون کے ٹیسٹ لے کر گیا ہوا ہے۔

چند لمحے پھر خاموشی سے گزر گئے پھر شاہ زمان نے بھویں اچکاتے ہوئے کہا۔ ''یہ کُڑی'' تمہاری گاڑی میں کیا کررہی تھی؟

دلاور گڑبڑا گیا۔ ''کون سی کُڑی...... بڑے سائیں......''

شاہ زمان کا لہجہ قدرے ترش ہوگیا۔ ''اوئے ...... وہی...... جو میرے آنے پر گڈی سے نکل کر بھاگی تھی۔''

''بڑے سائیں! میں تو اسے ٹھیک سے جانتا بھی نہیں ہوں۔ تھوڑے دن سے میرے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ میں جہاں جاتا ہوں وہاں پہنچ جاتی ہے۔ میں تو اب تنگ آ گیا ہوں۔'' شاہ زمان پُرسوچ انداز میں عقب نما شیشے میں دلاور کو دیکھنے لگا۔ مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے بولا۔

''وہ تمہاری گاڑی میں کیا کررہی تھی؟ تم نے اس کا ہاتھ بھی پکڑ رکھا تھا۔''

''بڑے سائیں! کیا بتاؤں...... یہ لڑکی جونک کی طرح چمٹ گئی ہے۔ فلمی باتیں کرتی ہے۔ کہتی ہے تمہاری شکل میرے بابو سے ملتی جلتی ہے۔ بابو کو اپنا منگیتر بتاتی ہے جو تین سال پہلے کسی ایکسیڈنٹ میں مارا گیا تھا۔ اب بھی میں گاڑی کا ڈیش بورڈ صاف کررہا تھا کہ میری بے خبری میں اندر گھس آئی۔ میں نے اپنا پستول ڈیش بورڈ پر رکھا ہوا تھا۔ اس نے اٹھا کر میری طرف اس کا رخ کردیا اور فضول ایکٹنگ کرنے لگی۔ میں گھبرا گیا۔ جھپٹ کر اس سے پستول چھینا تو میرے ناخن اس کے ہاتھ پر نشان چھوڑ گئے۔ خون رسنے لگا تو مجھے اس پر ترس آ گیا۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اوپر سے آپ آ گئے۔'' دلاور نے سب صاف صاف بیان کردیا۔

شاہ زمان بڑی گہری سوچ میں غرق ہوگیا۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں تیزی سے حرکت کرنے لگیں، وہ مونچھوں کو تاؤ دیتا گیا اور سوچتا چلا گیا۔ جانے کیوں دلاور کو محسوس ہورہا تھا کہ شاہ زمان کا دل ماروی پر آیا ہوا ہے۔

☆☆☆

سویرا نے اپنے ہاتھوں سے شاہ زمان کے لیے دودھ کی باداموں والی سردائی بنائی تھی۔ وہ شام سے ہی اس کا انتظار کررہی تھی مگر شاہ زمان رات گئے دلاور کے ساتھ واپس آیا۔ آرام گاہ میں پہنچا تو کافی تھکا ہوا دکھتا تھا۔ سویرا نے آگے بڑھ کر اس کی واسکٹ اتاری...... بستر پر بیٹھا تو اس کے جوتے اتار کر جرابیں اتارنے لگی۔

''لگتا ہے، آج آپ بہت تھک گئے ہیں......''

شاہ زمان جواباً کچھ نہیں بولا۔ بیڈ پر بیٹھ کر سر پیچھے ٹکا دیا۔ سویرا نے ٹھنڈی سردائی گلاس میں انڈیلی اور شاہ زمان کو پیش کردی، بولی۔ ''میں نے اپنے ہاتھوں سے بنائی ہے۔''

شاہ زمان تین گھونٹوں میں ساری سردائی اندر انڈیل گیا۔

''آپ کچھ پریشان دکھتے ہیں۔'' سویرا فکرمندی سے بولی تو شاہ زمان سیدھا ہو کر بیٹھا اور بولا۔

''میں پریشان ہوں تمہیں اس سے کیا...... تم کھیل

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

کھیلو اپنے.....''

سویرا دم بخود رہ گئی۔ پریشانی سے اس کا چہرہ کھنچ گیا۔ وہ بمشکل بولی۔ ''کیا..... کھیل کھیلا ہے..... میں نے.....؟''

''تم اچھی طرح جانتی ہو..... حویلی میں کیا چکر چل رہے ہیں۔ کیسی چالیں چلی جارہی ہیں۔ اندھا نہیں ہوں میں۔''

''میں اب بھی آپ کا مطلب نہیں سمجھی..... میں نے کونسا جرم کیا ہے جس کی خبر مجھے بھی نہیں ہے۔'' وہ روہانسی ہوگئی۔

''وقت آنے پر سب معلوم پڑ جائے گا..... ابھی مجھ سے اس بارے میں کوئی سوال مت پوچھو۔''

''مگر..... میں.....'' اس نے کچھ کہنا چاہا۔

شاہ زمان سویرا کی بات کاٹ کر بہت زور سے دہاڑا اتنی زور سے کہ سویرا کو کمرے کی دیواریں لرزتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ ''میں نے ایک بار کہا نا..... اس بارے میں مجھ سے ابھی کوئی سوال مت پوچھو.....''

سویرا سہم گئی..... خاموش ہوگئی..... سندھ یونیورسٹی میں کلاس فیلوز کے ساتھ چہلیں کرنے والی، رومانوی شاعری کرنے والی..... بات بے بات قہقہے لگانے والی سویرا خاموش ہوگئی..... عورت کو اپنا گھر بچانے کے لیے کیا کچھ نہیں کرنا پڑتا..... اس کا ناتواں دل لحہ بہ لحہ لرزتا ہے، پل پل وہ ڈر جاتی ہے، سہم جاتی ہے۔

سویرا کی وہ رات خاموشی میں آنسو بہاتے ہوئے گزر گئی..... صبح ناشتے میں بھی شاہ زمان کا رویہ سویرا سے ٹھیک نہیں رہا..... وہ آدھا ناشتا کرکے باغیچے میں چلا گیا..... ٹہلتے ہوئے حویلی کا چکر کاٹا۔ شاہ فرمان سے نشست گاہ میں ایک ڈیڑھ گھنٹا طویل گفتگو کی..... پھر گیارہ ساڑھے گیارہ کے قریب باغیچے میں واپس آ گیا۔ اس نے ایک ملازمہ کو ماروی کو بلانے کے لیے بھیجا..... تھوڑی دیر بعد ماروی سکڑی سمٹی اس کے روبرو تھی۔

''سر میں تیل کی مالش کرلیتی ہو.....'' شاہ زمان سخت لہجے میں بولا۔

''جج..... جی بڑے سائیں.....'' وہ ہکلاتے ہوئے بولی۔

''تو جاؤ پھر تیل لے آؤ۔''

ماروی دوڑی ہوئی گئی اور دو منٹ میں واپس آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں تیل کی بڑی بوتل تھی۔ اس نے احتیاط سے سر میں تیل ڈالا اور مالش کرنے لگی۔

شاہ زمان کی آنکھوں میں فتح کی چمک تھی۔ وہ تنی گردن کے ساتھ بڑے کروفر سے کرسی پر بیٹھا مالش کروا رہا تھا۔ عادت سے مجبور مونچھوں کو تاؤ دے کر بولا۔ ''کیا نام بتایا تھا تیری ماں نے اپنے گاؤں کا؟''

''بڑے سائیں..... ترنڈا.....''

''تیرا باپ کیا کام کرتا ہے؟''

''بڑے سائیں! ہم لوگ ٹھوری ہیں۔ میرا باپ بکریاں چراتا ہے۔ ہمارے گاؤں کے ساتھ ہی چنی گوٹھ ہے..... وہ وہاں منڈی میں ہوتا ہے۔''

''تو کل..... گاڑی میں کیا کر رہی تھی؟'' اچانک شاہ زمان نے سوال کیا تو ماروی یکدم سے گڑبڑا گئی۔ لرزتے لہجے میں بولی۔

''وہ..... وہ بڑے سائیں..... مم..... میں..... مم..... میں.....''

''کیا میں..... میں لگائی ہوئی ہے..... ٹھیک سے جواب دے۔'' شاہ زمان کا لہجہ سخت ہوگیا۔ وہ ماروی کے ہاتھ کی انگلیاں بری طرح مروڑ رہا تھا۔

''وہ جی..... بی بی جی..... نے مجھے بھیجا تھا.....'' کانپتی آواز میں اس نے کہا۔

''کس کام کے لیے؟'' لہجہ بدستور تلخ تھا۔

ماروی کو کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کیا جواب دے پھر ایک دم سے بولی۔ ''بازار سے کچھ سامان منگوانا تھا جی۔'' تکلیف کے سبب اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

شاہ زمان سوچ میں غرق ہوگیا۔ اس نے ماروی کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ ہاتھ کے اشارے سے بولا۔ ''اچھا..... اب تو جا۔'' شاہ زمان نے دور سے آتی بڑی آپا کو دیکھ لیا تھا۔

بڑی آپا مسکراتے ہوئے شاہ زمان کے برابر والی کرسی پر بیٹھ گئیں، بولیں۔ ''میرے چھوٹے دیر کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا آج کل.....''

''میں بالکل ٹھیک ہوں بڑی آپا.....'' وہ خوش دلی سے مسکرایا۔

''تیرا پیر کیسا ہے.....؟ زخم پورا بھر گیا ہے نا.....''

''ہاں..... ہاں بڑی آپا..... اب تو پیر پر پورا وزن پڑتا ہے۔''

''وہ باز والا معاملہ کہاں تک پہنچا؟'' بڑی آپا حویلی کے حالات سے آگاہی رکھتی تھیں اور کسی حد تک ان معاملات میں انوالو بھی رہتی تھیں۔

''بڑی آپا..... وہ باز ہماری سوچ سے بھی زیادہ قیمتی ہے۔'' شاہ زمان کی آنکھوں میں چمک سی لہرائی تھی۔

''تمہارے خیال سے کیا قیمت ہوگی؟''

''بڑی آپا! آپ کو یہ تو پتا ہی ہوگا۔ یہ باز دو عرب

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

شیخوں کے درمیان لڑائی کی وجہ بنا ہوا ہے۔''

''ہاں..... مجھے تھوڑا بہت اس بارے میں پتا چلا تھا.....''

''شیخوں کی وہ لڑائی عروج پکڑ گئی ہے۔ وہ اب ایک ضد اور انا بن گئی ہے۔ مڈل ایسٹ پاکستان نہیں ہے جہاں ڈنڈے کے زور پر..... دھونس..... دھاندلی سے کوئی چیز حاصل کرلی جائے..... وہاں پر یہ سب چیزیں نہیں ہوتیں..... دونوں شیخ یہ سب دنگا فساد نہیں کرسکتے مگر..... جو وہ کرسکتے ہیں ڈنکے کی چوٹ پر کررہے ہیں۔ سننے میں یہ خبریں بھی آرہی ہیں کہ شان نامی بازکی بولی ستر سے اسی لاکھ ریال تک لگ گئی ہے۔''

بڑی آپا کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں..... وہ تقریباً ہکلاتے ہوئے بولیں۔ ''ستر..... اسی لاکھ ریال..... یہ..... کیسے ممکن ہوسکتا ہے؟''

''ہوسکتا ہے..... یہ خبر جھوٹی ہو..... یا بڑھا چڑھا کر بتائی گئی ہو..... مگر بڑی آپا..... اس میں ایسی کوئی انہونی بات بھی نہیں ہے۔ یہ شیخ اپنے عیش و آرام اور کبھی بھی تفریح طبع کے لیے لاکھوں ریال خرچ کردیتے ہیں..... تو..... جہاں..... ضد اور انا کا مسئلہ پیدا ہوجائے..... وہ.....'' شاہ زمان نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

بڑی آپا کی آنکھوں میں بے پناہ چمک ابھر آئی..... شاہ زمان سے تھوڑا قریب ہوتے ہوئے سرگوشی کے انداز میں بولیں۔ ''وہ باز..... اب ہے..... کہاں.....؟''

شاہ زمان آہستگی سے بولا۔ ''بڑی آپا..... وہ ہمارے کنٹرول میں ہے۔ حضور چانڈیو اور شوکت سیال کے حویلی پر کیے جانے والے حملے کے بعد..... وہ باز ہم نے یہاں سے ترنڈا بھیج دیا ہے۔ تھوڑے دن پہلے جو میں ترنڈا گیا تھا..... اسی سلسلے میں گیا تھا۔ سفید حویلی کے تہ خانے میں ''شان'' اس وقت محفوظ ہاتھوں میں ہے۔ چار گارڈ اس کی حفاظت کررہے ہیں۔''

''مگر..... شوکت سیال.....؟'' بڑی آپا نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''حویلی پر ہلا بول کے انہوں نے جو غلطی کی ہے، ان کی جان اتنی جلدی نہیں چھوٹے گی۔ ابھی بھی میں بھائی جی سے اسی کیس کے بارے میں بات کرکے آیا ہوں..... حویلی پر حملے کے بعد جو پرچہ ہم نے کٹوایا تھا، اس میں ہم نے ایک قتل بھی شوکت سیال پارٹی پر ڈال دیا تھا۔ عدالت میں کیس چل رہا ہے۔ آپ کو پتا ہے شوکت سیال کی پشت پناہی کرنے والا حضور چانڈیو ہے۔ الیکشن سر پر ہیں۔ فی الحال حضور چانڈیو کوئی ایسا کام نہیں کرے گا جس سے اس کی پارٹی کی ساکھ کو نقصان پہنچے۔ سننے میں آرہا ہے کہ وہ تو حویلی پر کیے جانے والے حملے پر بھی پچھتا رہا ہے۔ اس کا خیال تھا۔ اس کے تربیت یافتہ کارندے گوریلا ایکشن کرکے بڑی صفائی سے باز اڑا لے جائیں گے..... اور کسی کو خبر بھی نہ ہوگی مگر ہمارے بندوں نے نا صرف بیرونی خطرے پر آنکھیں کھلی رکھیں بلکہ حملہ آوروں کو بھرپور جواب بھی دیا۔ حضور چانڈیو کی سازش بے نقاب ہوگئی۔ اس کو لینے کے دینے پڑ گئے..... اب وہ کیس ختم کرانا چاہ رہا ہے اور ہم لوگ کیس کو طول دے رہے ہیں۔''

بڑی آپا معنی خیز انداز میں مسکرائیں، بولیں۔ ''اس کا مطلب ہے تم لوگ وہ باز واپس کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے۔''

''نہیں بڑی آپا..... ہم نے کیا باز کا اچار ڈالنا ہے۔ باز تو ہم حضور چانڈیو پارٹی کو واپس کریں گے مگر کڑی شرائط پر.....''

''مگر مجھے تو کچھ ایسی خبر پہنچی تھی کہ وہ باز تمہارے ''بھائی جی'' نے شیرو کے ذریعے چوری کروایا تھا۔''

شاہ زمان آنکھ میچ کے بولا۔ ''بڑی آپا..... یہ چوڈیرو حویلی کی سب سے خفیہ خبر ہے..... کہتے ہیں دیواروں کے کان بھی ہوتے ہیں۔ اسی لیے خاموشی بہتر ہے.....'' وہ کرسی پر سیدھا ہوا۔ سرگوشی کے انداز میں بولا۔ ''وہ باز بھائی جی نے شیرو کے ذریعے ہی حاصل کیا ہے مگر عدالت میں..... شیرو نے پیش ہوکر اپنا بیان ریکارڈ کروایا ہے کہ وہ باز اس نے رحیم یار خان کے قریب ''ست پار'' گوٹھ سے رانا قوم کے ایک بندے ''سخی بابر'' سے خریدا ہے۔''

''اور عدالت نے یہ سب سچ مان لیا.....؟''

''اور کیا تو نہیں..... عدالت کو سچ ماننا پڑا.....'' شاہ زمان زیر لب مسکرایا..... بڑی آپا کا سوالیہ انداز دیکھ کے بولا۔ ''ہم نے سخی بابر کو عدالت میں پیش کردیا اور اس نے اقبالی بیان میں صاف کہہ دیا کہ یہ باز اس نے شیرو کو فروخت کیا تھا۔''

''یہ سب کیسے ممکن ہے.....؟'' بڑی آپا کی حیرت عروج پر تھی۔

شاہ زمان نے ایک قہقہہ لگایا، بولا۔ ''بڑی آپا..... روپیہ..... یہ دنیا کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ اس سے آپ خوشیاں خرید سکتے ہو..... خواہشیں خرید سکتے ہو..... ایمان خرید سکتے ہو..... لوگ خرید سکتے ہو..... آپ کا کیا خیال ہے؟ سیاسی پارٹیوں کے آگے آگے چلنے والے

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

.....گلا پھاڑ کر نعرے لگانے والے لوگ اپنے لیڈروں کے ساتھ ہوتے ہیں.....نہیں.....نہیں.....وہ نامراد روپیہ ہوتا ہے جو انہیں ناچنے پر مجبور کرتا ہے۔''

''سخی بابر کے بیان سے تو حضور چانڈیو پارٹی بری طرح پھنس جائے گی.....'' بڑی آپا نے کہا۔

''پھنس جائے گی کیا.....پھنس گئی ہے.....اب وہ دن دور نہیں جب شوکت سیال اور حضور چانڈیو گھٹنے ٹیکتے ہوئے چوڈیرو حویلی آئیں گے.....کیس ختم کرانے اور باز کی واپسی کے لیے ہمارے ترلے کرنے.....!''

بڑی آپا خاموش تھیں۔

☆☆☆

وہ نیم دراز تھی اور سوچوں کے پنچھی پر لگا کر اڑ رہے تھے۔ دور ریگستان کے بیابانوں سے ایک ہوک سی اٹھتی تھی اور پورے ماحول پر چھا جاتی تھی یا شاید یہ ہوک اس کے اپنے من میں کرلاتی تھی۔ جس دن سے وہ دلاور کے کمرے میں گئی تھی اور اس نے لکڑی کے بکس میں پڑی ہوئی وہ چیزیں دیکھی تھیں، اک احساسِ جرم نے اسے گھیر لیا تھا۔ اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے ایک ہی سوچ اس کے ذہن پر سوار رہتی تھی، کہیں اس کی بے وقوفی نے کسی کی زندگی عذاب تو نہیں بنا دی تھی۔

دروازے پر کھٹکا ہوا تو وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ رخساروں کے پاس کسی چیز کا احساس جاگا۔ اس نے انگلی سے چھوا تو حیران رہ گئی..... وہ آنسو تھے جو بنا دستک دیے اس کی آنکھوں سے پھسل آئے تھے۔ آنسو تو کسی جذبے، کسی دکھ کے ساتھ آنکھوں سے چھلکتے ہیں مگر یہ کیا ہوا تھا؟ اسے خود کو بھی پتا نہ چلا تھا اور اسے پتا بھی کیسے چل سکتا تھا..... یہ آنسو بالکل اس کی لاعلم محبت کی طرح غیر محسوس تھے جو اس کے وجود میں کسی ہلکی سی چنگاری کی صورت پنپ رہی تھی۔ اس نے جلدی سے اپنے آنسو صاف کر ڈالے۔ دروازے پر دستک ہوئی اور پھر ماروی اندر داخل ہوگئی۔

''بیٹھ جاؤ۔'' سویرا ٹیک لگا کر بیٹھتے ہوئے بولی.....

.....''تمہارا کام کہاں تک پہنچا؟''

''بی بی جی! مجھے لگتا ہے بڑے سائیں کو شک پڑ گیا ہے۔'' وہ ہاتھ مروڑتے ہوئے بولی۔

''کیا مطلب ہے تمہارا..... انہوں نے تجھ سے کچھ کہا؟'' سویرا کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

''میں اس دن دلاور کی گاڑی میں جا بیٹھی۔ بڑے سائیں نے مجھے دیکھ لیا..... بڑی غصے والی نظروں سے گھور رہے تھے جی مجھے۔''

''انہوں نے تجھ سے کوئی بات کی.....؟''

''بات وات تو نہیں کی جی..... پر اگلے دن مجھ سے کہنے لگے میرے سر میں تیل کی مالش کردو۔''

''تو پھر.....'' سویرا کا دل بہت زور سے دھڑکنے لگا تھا۔

''میں نے کردی مالش..... مالش کرواتے ہوئے غصے سے پوچھنے لگے..... اس دن تو گڈی میں دلاور کے ساتھ کیا کر رہی تھی..... میری تو ٹانگیں کانپنے لگیں بی بی جی..... مجھے سمجھ نہ آئی کیا جواب دوں، پھر میں نے بہانہ بنایا کہ بی بی جی نے مجھے بھیجا تھا..... بازار سے کچھ چیزیں منگوانی تھیں۔''

''آگے سے کیا بولے تمہارے بڑے سائیں۔''

''بولے دو لے کچھ نہیں..... غصے سے مونچھوں کو تاؤ دیتے رہے اور بڑی گہری سوچ میں ڈوبے رہے۔'' سویرا کا دل ڈوبنے لگا۔ اسے شاہ زمان کا اس دن والا روپ یاد آنے لگا۔ ''تم کھیلو..... کھیل اپنے..... تم اچھی طرح جانتی ہو حویلی میں کیا چکر چل رہے ہیں۔ اندھا نہیں ہوں میں.....'' تو کیا شاہ زمان باخبر ہو چکا تھا؟

اس نے ماروی کو جانے کا کہا اور کمرے کی لائٹ بند کر کے نیم دراز ہوگئی..... شاہ زمان نے کہا تھا۔ ''تم کھیلو کھیل اپنے.....'' ہاں تو وہ کھیل رہی تھی..... یہ کھیل..... کیونکہ وہ ایک کمزور عورت تھی.....

وہ سب کچھ برداشت کر سکتی تھی..... شاہ زمان کو کسی کے ساتھ بانٹ نہیں سکتی تھی..... شاہ زمان جن نظروں سے ماروی کی جانب دیکھتا تھا..... وہ نظریں یہ اندازہ لگانے کے لیے کافی تھیں کہ..... بہت جلدی نہ سہی، دیر سے ہی سہی..... شاہ زمان ماروی سے ''ہر طرح'' کے تعلقات استوار کر لے گا..... اور ''ضرورت'' پیش آنے پر اس سے بیاہ بھی رچا لے گا..... ماروی عام لڑکی ہوتے ہوئے بھی عام نہیں تھی۔ اس کا خوبصورت چہرہ اور قیامت ڈھاتے جسمانی نشیب و فراز کسی کا بھی ایمان خراب کر سکتے تھے۔ اس سے پہلے کہ شاہ زمان کا ''ایمان'' خراب ہو جاتا..... سویرا..... ماروی کو دلاور کے ساتھ نتھی کر دینا چاہتی تھی۔

سویرا نے ہی ماروی کو اعتماد میں لے کر دلاور کے پیچھے لگایا تھا۔ ایک طرف وہ ماروی کو شاہ زمان سے دور رکھنا چاہتی تھی..... دوسری طرف نا سمجھی میں جو غلطی اس سے ہوئی تھی، وہ اس کا مداوا کرنا چاہتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ دلاور..... ماروی کی طرف مائل ہو جائے اور دل میں پلنے

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

والے منفی جذبوں سے چھٹکارا حاصل کرلے۔ وہ جذبے جن کا تعلق خود سویرا سے تھا۔ کچھ چیزیں پس منظر میں ہوتی ہیں، نظر نہیں آتیں۔ کچھ قیامتیں سمندر کی گہرائی میں ہوتی ہیں جو نگاہوں سے پوشیدہ ہوتی ہیں۔ سویرا، ماروی کو شاہ زمان سے دور رکھنا چاہتی تھی۔ دلاور کے قریب لانا چاہتی تھی۔ بظاہر تو وہ ایسا ہی چاہتی تھی۔ مگر اس کے دل کے نہاں خانوں میں ایک چھوٹی سی ''ندی'' بھی بہتی تھی اور اس ندی کے پانی سے جیسے آواز آتی تھی۔

تم کب تک مجھ کو بھولو گے
اس دشت کی تنہاراتوں میں اک درد جو ٹھہرا ہوتا ہے
وہ درد بھی طعنے دیتا ہے
رہ رہ کے سسکیاں لیتا ہے
ایک ٹیس بھی اٹھ کے کہتی ہے
تم کب تک مجھ کو بھولو گے

☆☆☆

وہ ابھی تک نہیں سمجھ پایا تھا۔ ماروی کیوں اس کے پیچھے ہاتھ دھو کے پڑ گئی ہے۔ جس دن سے اس نے بڑے سائیں کے ساتھ ماروی والی بات کی تھی، اس دن سے ماروی کی پیش قدمی سست ہوگئی تھی۔ وہ موقع کی تاک میں رہتی تھی۔ جب بڑے سائیں حویلی میں نہیں ہوتے تھے، وہ چھم سے دلاور کے روبرو آن کھڑی ہوتی تھی۔

اس دن بھی وہ سیبوں والے باغ کی طرف سے چلا آرہا تھا کہ وہ اچانک اس کے سامنے آگئی۔ دلاور اس سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ اس نے لمبے بالوں کی چٹیا میں گجرے لگا رکھے تھے۔ ایک ادا سے دلاور کی طرف دیکھ کر بولی۔

''تم بڑے ظالم ہو.....''

''میں نے تو تجھے کچھ نہیں کہا۔ میں ظالم کہاں سے ہوگیا؟''

''اسی وجہ سے تو تجھے ظالم کہہ رہی ہوں۔ تو مجھے کچھ کہتا ہی نہیں ہے۔'' وہ ادا سے لہراتے ہوئے بولی۔

''کیا کہوں تجھے؟'' دلاور آج دل لگی کے موڈ میں تھا۔

''میری طرف غور سے دیکھ..... میرے حسن کی تعریف کر..... میرے بارے میں کچھ کہہ..... حویلی کا کون سا ایسا مرد ہے جو میرے حسن کی تعریف نہ کرتا ہو..... بس ایک تو ہے جو پتا نہیں کس خیالی دنیا میں رہتا ہے۔ ایسا ٹھنڈا مرد میں نے کبھی نہیں دیکھا۔''

''تو آج سچ سچ بتا میرے سے چاہتی کیا ہے؟''

''سنے گا..... تو تڑپ جائے گا.....''

''میں تڑپنا چاہتا ہوں.....''

''تو سن.....'' وہ ایک لمحے کے لیے رکی، اس نے دلاور کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ بولی۔ ''میں تجھ سے محبت کرتی ہوں..... تجھ سے شادی کرنا چاہتی ہوں.....''

دلاور نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔ آنکھوں میں ہلکی سی نمی تھی، یہ نمی جھوٹی تھی یا سچی۔ اس سے دلاور کو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ وہ تو اس جہان کا باسی بن گیا تھا..... جہاں کسی بھی چیز سے کوئی بھی فرق نہیں پڑتا تھا۔ وہ عشق کے ایسے دریاؤں کو عبور کررہا تھا جن میں آگ بھی تھی اور ان دریاؤں کا پانی برف سے زیادہ ٹھنڈا بھی تھا۔ دلاور نے جیسے سویرا کے عشق میں ڈوب کر ''فنا'' حاصل کرلی تھی۔

دلاور نے ماروی کی طرف دیکھ کر بڑے نرم لہجے میں کہا۔ ''ماروی! تم بہت اچھی..... ہو..... خوبصورت اور جوان بھی ہو..... ہوسکتا تھا بلکہ یقیناً میں تمہاری طرف مائل ہوجاتا۔ اگر میرے ساتھ ایک بدقسمتی نہ ہوئی ہوتی۔''

''کیسی بدقسمتی.....؟'' ماروی نے شکوہ کناں لہجے میں کہا۔

''میں برف کا آدمی ہوں..... میرے دل میں پہاڑوں کی سینکڑوں ٹن برف نے بسیرا کررکھا ہے۔ میرے جذبات کو ہمالیہ کی برف کی چادر اوڑھ کر سو چکے ہیں۔''

ماروی کانپ گئی، بولی۔ ''تمہاری کوئی بات بھی میرے پلے نہیں پڑ رہی.....'' وہ پاس پڑے سنگی بینچ پر بیٹھ گئی۔

دلاور بولا۔ ''تمہارے پلے پڑ بھی نہیں سکتی..... سنو..... میں تمہیں ایک بات بتاؤں..... تمہیں پتا ہے ایک جیتا جاگتا انسان..... ایک چلتی پھرتی لاش میں کیسے تبدیل ہوتا ہے۔ جب اس سے جینے کا مطلب چھین لیا جاتا ہے۔''

ماروی گھبراہٹ سے ادھر ادھر دیکھنے لگی..... اسے ڈر تھا کہ کہیں کوئی دلاور کو یوں بولتے ہوئے نہ دیکھ لے..... مگر یہ دوپہر کا وقت تھا..... جھلسا دینے والی چولستانی ہوا حویلی کے اس حصے میں دھیرے دھیرے چل رہی تھی اور جس سنگی بینچ پر ماروی بیٹھی تھی اس کے اوپر نیم کے جڑواں درخت چھاؤں کیے ہوئے تھے۔

دلاور کہہ رہا تھا۔ ''ماروی..... میں آج تمہیں بتاتا ہوں..... میں پاکستان کے ہر شہر میں رہا ہوں۔ جہاں سے دل اچاٹ ہوجائے بھاگ نکلتا ہوں..... میں یہاں سے بھی بھاگ جانا چاہتا ہوں مگر بڑے سائیں نے مجھے روک رکھا ہے..... لیکن شاید..... نہیں..... بڑے سائیں کے حکم میں بھی اتنی طاقت نہیں ہے جو مجھ جیسے کو روک لیں..... ماروی..... میں یہاں سے بہت دور بھاگ جانا چاہتا ہوں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

......مگر بڑی بڑی فولادی بیڑیاں ہیں جو میرے پاؤں میں پڑی ہوئی ہیں۔ میں بھاگتا ہوں اور منہ کے بل گر جاتا ہوں۔ پھر اٹھ کے دوبارہ کوشش کرتا ہوں پھر گر پڑتا ہوں۔ میری ٹانگیں زخمی ہو چکی ہیں، میرا سارا جسم چھلنی ہو چکا ہے...... ماروی...... تم نے کبھی ایسا پرندہ دیکھا ہے جو آگ میں جل رہا ہو...... وہ اڑنا چاہے تو نہ اڑ پائے...... اور نہ ہی موت سے اس کی خلاصی ہو......'' دلاور ہذیانی انداز میں بول رہا تھا اور آنسوؤں کی نمی اس کی آنکھوں میں ہلکورے لے رہی تھی۔

ماروی کے جسم میں واضح کپکپی طاری ہو چکی تھی...... اس کا وہاں بیٹھنا محال ہو رہا تھا۔ اس نے کوئی بہانہ بنایا اور وہاں سے بھاگ نکلی......

☆☆☆

اس دن کے بعد ماروی نے دلاور کے پاس جانا کم کر دیا۔ سویرا نے وجہ پوچھی تو ماروی نے صاف کہہ دیا۔

''بی بی جی ...... میں نے ہر طریقہ استعمال کر کے دیکھ لیا ہے۔ وہ بندہ ٹس سے مس نہیں ہوتا ...... کسی عجیب مٹی کا بنا ہوا ہے بلکہ اب تو مجھے اس سے خوف آنے لگا ہے۔ بڑی اول جلول سی باتیں کرتا ہے جی وہ......''

''کیا کہتا ہے......؟'' سویرا کے لہجے میں تجسس تھا۔

''وہ ...... جی ...... پتا نہیں کیسی کیسی باتیں کرتا ہے۔ کبھی عشق کی...... کبھی برف کی...... کبھی کہتا ہے تم نے زندہ لاش چلتی پھرتی دیکھی ہے۔ میرے پلے تو کچھ نہیں پڑتا بی بی جی......''

سویرا کی آنکھوں میں دکھ گہرا ہو گیا...... انگلی میں پڑی انگوٹھی کو مروڑتے ہوئے بولی۔ ''اور کیا کہتا تھا......؟''

''کہتا ہے میں برف کا آدمی ہوں...... اس کی باتیں سن کر تو میں کانپ گئی تھی...... بی بی جی آپ ...... آپ یہ کام اور کسی کو دے دیں۔ دلاور بڑا اور ٹائپ کا بندہ ہے۔ پتا نہیں کن چکروں میں ہے......''

حویلی کا ہر مرد اسے یوں دیکھتا تھا کہ ابھی کھا جائے گا۔ ان مردوں میں سویرا کا خاوند سرفہرست تھا اور کیوں نہ ہوتا...... وہ اس حویلی کا بڑا سائیں تھا۔ اس سے زیادہ حق ماروی پر کسی کا نہیں بنتا تھا۔ وہ اسے نوچ کر بھی کھا جاتا تو کسی کی مجال نہیں تھی۔ سویرا کا دل کوئی ہتھیلی میں لے کر مسلنے لگا۔ وہ ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتی تھی لیکن لگتا تھا کہ ایک بھی نہ کر سکے گی۔

☆☆☆

دلاور اکثر شاہ زمان یا پیر فضل کی گاڑی ڈرائیو کرتا تھا۔ ''بیماری'' سے ٹھیک ہونے کے بعد یہ ڈیوٹی اس نے خود بڑے سائیں سے سفارش کر کے لگوائی تھی۔ وہ سویرا کی گاڑی ڈرائیو کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اس کا سامنا کرنا نہیں چاہتا تھا مگر عجیب بات تھی کہ یہاں سے جانا بھی نہیں چاہتا تھا۔

وقت پر لگا کر اڑنے لگا تھا۔ ماروی اب بھی وقتاً فوقتاً اس سے ملنے آتی تھی مگر وہ بھی جان چکی تھی کہ ان تلوں میں تیل نہیں۔ مجبوراً سویرا بی بی کے کہنے پر اسے یہ ڈیوٹی بہرحال دینی تھی۔ حضور چانڈیو سے کیس زور و شور سے چل رہا تھا جس میں شاہ زمان کا پلڑا بھاری تھا۔ ''شان نامی باز'' ترنڈا میں سفید حویلی کے تہ خانے میں بالکل محفوظ تھا۔ وہ ایک بلینک چیک تھا۔ شاہ فرمان کی غیر قانونی اسمگلنگ جاری تھی۔ ایک دو بار اس نے سوچا کہ اس شان نامی باز کے سلسلے میں دونوں شیخوں سے خود سودا کیا جائے مگر ایسا کرنے سے اسے شاہ زمان اور پیر فضل نے باز رکھا تھا۔ ان کا کہنا تھا اس سے بہت سی پیچیدگیاں پیدا ہونے کا خدشہ ہے۔

شاہ زمان کا ماروی سے آنکھ مٹکا مسلسل جاری تھا۔ یہ سویرا اور شاہ زمان کے درمیان ایک سرد جنگ تھی۔ سویرا ماروی کو شاہ زمان سے دور رکھنے کے لیے جو کر سکتی تھی، وہ کر رہی تھی...... جبکہ شاہ زمان ماروی سے قربت کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔

ملتانی دو چار دفعہ دلاور سے ملنے حویلی آیا تھا پھر واپس پنڈی چلا گیا تھا۔

دلاور کا کئی دفعہ سویرا سے آمنا سامنا ہوا تھا اور وہ کسی بہانے سے کنی کترا کر گزر جاتا تھا۔ اس کے دل کا حبس جب حد سے بڑھ جاتا تھا تو وہ رات کے وقت روہی کی طرف نکل جاتا تھا۔ ظفری اسے اکثر منع کرتا کہ رات کے وقت جھاڑیوں اور کیکر کی جڑوں میں سانپ بھی ہوتے ہیں۔ پر وہ کسی کی سنتا کب تھا۔ شیشے کی بلند دیواروں کے اندر کچھ سنائی نہیں دیتا تھا۔ وہ رات کے وقت اکثر چلتا ہوا دور تک نکل جاتا۔ کیکٹس کے پودوں سے بچتا بچاتا۔ کیکر کے درختوں سے ہمکلام ہوتا وہ ایک ریتیلے ٹیلے سے پار ایک پستہ قد بیری کے نیچے جا بیٹھتا۔ یہ جگہ اس کی جائے پناہ تھی۔ اس سے آگے روہی کی بے آب و گیاہ بیکراں وسعتیں تھیں۔ جہاں اجنبی سناٹے ''بستے'' تھے۔ اجنبی سناٹے جو اس کا پہلا عشق تھے۔ ان سناٹوں اور سویرا کے عشق میں کتنی مماثلت تھی۔ سویرا کا عشق بھی پہلے عشق کی طرح خاموش، پراسرار اور جان لیوا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

آج بھی وہ پستہ قد بیری کے نیچے بیٹھا تھا۔ آنکھیں نم تھیں۔ شاہ زمان کسی کام کے سلسلے میں تھوڑے دنوں کے لیے کراچی گیا ہوا تھا..... حویلی کی عورتوں کا ڈرائیور بیوی کی زچگی کی وجہ سے چھٹی پر تھا اور شاہ زمان جاتے ہوئے دلاور کی ڈیوٹی زنان خانے کی ڈرائیونگ پر لگا گیا تھا۔ اس نے بہت ہاتھ پاؤں مارے تھے مگر کوئی بہانہ نہ چل سکا تھا۔

دلاور بہت رات تک پستہ قد بیری کے نیچے بیٹھا رہا اور سوچتا رہا..... سویرا کی ایک ایک بات اس کی سماعت میں گونجنے لگی..... اس کی ہر ہر حرکت..... ہر ہر ادا..... گلابی ہونٹ تھے جن کے گداز میں اس کا دل دھنستا چلا جا رہا تھا۔ یہ صرف نرم و نازک ہونٹ نہیں تھے، ایک دلدل تھی جس میں وہ ناک تک ڈوب چکا تھا۔ ہاتھ پیر منجمد تھے..... پورا جسم مفلوج تھا۔ صرف ناک سے سانس کی آمد و رفت جاری تھی۔ اس کا دل بوجھل تھا۔ سانس اندر کھینچنے سے پورے جسم میں درد جاگ اٹھتا تھا۔

یکا یک اس نے تیز تیز سانس کھینچنا شروع کر دیے۔ دلدل اسے نگل رہی تھی۔ وہ اچانک اتنی زور سے چیخا کہ اس کی آواز دور بیابانوں تک سفر کرتی چلی گئی۔ اجنبی سناٹوں تک پھیلتی چلی گئی..... اس نے گھبرا کر بیری کی ایک شاخ تھام لی..... یہ کانٹوں والی بیری تھی۔ کئی کانٹے اس کی ہتھیلی اور انگلیوں میں پیوست ہو گئے..... ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور رات کے اس سمے ریت کے کئی ذرّے اس کی نمناک آنکھوں میں گھس گئے..... مرد تھا..... رونا نہیں چاہتا تھا..... مگر ریت کے ذرّوں نے ایک جواز پیدا کر دیا تھا۔

تم کب تک مجھ کو بھولو گے
اس دشت کی تنہا راتوں میں اک درد جو ٹھہرا ہوتا ہے
وہ درد بھی طعنے دیتا ہے
ایک ٹیس بھی اٹھ کے کہتی ہے
تم کب تک مجھ کو بھولو گے.....

☆☆☆

پچھلی رات بہت دیر تک وہ روہی میں رہا تھا۔ اس نے دانستہ ایسا کیا تھا۔ وہ جانتا تھا کسی بھی وقت وہ امتحان شروع ہو سکتا ہے جس سے وہ اتنے عرصے سے نظریں چراتا آیا ہے..... دلاور کے عشق کی کہانی بھی کتنی عجیب و غریب تھی۔ وہ یہاں سے فرار چاہتا تھا..... مگر حویلی چھوڑ کر جانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ وہ سویرا کی نظروں سے اوجھل رہنا چاہتا تھا مگر اس کی قربت کی خوشبو میں معطر بھی رہنا چاہتا تھا۔ شاید بلند شیشے کی دیواروں کے اندر کے تقاضے اور تھے..... شیشے کی دیواروں سے باہر کی دنیا کچھ اور تھی۔

جس امتحان سے وہ ڈر رہا تھا، اگلی صبح ہی شروع ہو گیا..... وہ کیپ پہنے گاڑی میں بیٹھا ڈیش بورڈ صاف کر رہا تھا کہ اچانک پچھلا دروازہ کھلا اور خوشبو کا ایک جھونکا گاڑی میں داخل ہو گیا۔ یہ وہ خاص مہک تھی جو دلاور مرتے دم تک نہیں بھول سکتا تھا۔ یہ دلربا مہک تب پہلی مرتبہ اس کے نتھنوں سے ٹکرائی تھی جب ڈوبتی سویرا کو اس نے لاکر تالاب کے کنارے لٹایا تھا اور یہ خوشبو اس وقت تیز تر ہو گئی تھی جب..... اس نے اپنے ہونٹ اس کے لبوں پر ثبت کیے تھے۔

ہاں، وہ سویرا ہی تھی جو دوپٹا گلے میں ڈالے، بال لہراتی گاڑی میں داخل ہوئی تھی۔

وہ سر جھکا کر ہینڈ بیگ میں سے کچھ تلاش کرنے لگی۔ اس کے کھلے بالوں نے اس کے چہرے کو ڈھانپ لیا..... وہ دلاور کی موجودگی سے لاعلم بولی۔ ''اسلم! جلدی چلو..... مجھے یونیورسٹی جانا ہے۔'' اسلم اس ڈرائیور کا نام تھا جو چھٹی پر گیا ہوا تھا۔

''بی بی جی! کون سی یونیورسٹی.....؟'' دلاور دھیمی آواز میں بولا تو جیسے سویرا ایک جھٹکے سے کسی خواب سے بیدار ہو گئی..... اس کی سنواری بالوں کی لٹیں گالوں پر جھول رہی تھیں اور حیرت سے دہن تھوڑا سا کھلا رہ گیا تھا۔ یہ ادا نہیں تھی، فطری تاثر تھا..... مگر یہ تاثر قیامت ڈھا رہا تھا..... دلاور نے ایک لمحے کے لیے یہ قیامت دیکھی تھی اور پھر فوراً نظریں جھکا لی تھیں۔

''دلاور..... تم.....؟''

''جی بی بی جی.....!''

سویرا کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئی۔ اس کا دل بڑی تیزی سے دھڑکنے لگا تھا پھر وہ خود کو اعتدال پر لاتے ہوئے بولی۔ ''بہاولپور یونیورسٹی جانا ہے۔ رستہ معلوم ہے تمہیں.....؟''

''بہت عرصہ پہلے آپ کو لے کر گیا تھا۔ کچھ کچھ یاد ہے۔''

''دوسرا ڈرائیور اسلم کدھر ہے.....؟''

''میرا خیال ہے وہ چھٹی پر ہے۔ بڑے سائیں نے اس کی جگہ میری ڈیوٹی لگائی تھی۔''

''اچھا پھر چلو..... جو رستہ یاد ہے اس پر چلتے جاؤ..... بھول جاؤ گے تو میں بتا دوں گی۔'' دلاور نے ایک جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھا دی۔ سویرا اور دلاور معاشرتی تفاوت کے باوجود کبھی اچھے دوست تھے مگر وقت نے دراڑ

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

ایک جھجک پیدا کر دی تھی دونوں کے بیچ..... دس پندرہ منٹ کی ڈرائیونگ کے بعد بالآخر وہ جھجک سویرا نے ہی دور کی۔ وہ ونڈ اسکرین سے پار کھلے بے آباد میدانوں کی جانب دیکھتے ہوئے بولی۔ ''دلاور! تمہیں معلوم ہے، میں تم سے سخت خفا ہوں۔''

دلاور کا تاثر ایسا تھا جیسے اس نے سویرا کی بات سنی ہی نہیں..... وہ صرف جواباً ''اچھا جی.....'' کہہ کر خاموش ہو گیا۔

''تم یہ نہیں پوچھو گے کیوں خفا ہوں.....؟'' سویرا کہیں دور دیکھتے ہوئے بولی۔

''آپ خود ہی بتا دیجیے.....'' اس نے مختصر جواب دیا۔

''تم میری شادی میں کیوں نہیں آئے..... میں خاص طور پر تمہیں کارڈ بھی دے کر گئی تھی.....'' اس کی ذات میں موجود شیشے کی بلند دیواروں کے اندر ایک دم سے بھونچال آ گیا۔ شیشے دھڑا دھڑ بجنے لگے..... اندر کی زہریلی فضا میں اذیت بڑھ گئی..... وہ بمشکل بولا۔

''بی بی جی! میں نے آپ کو بتایا تھا۔ ان دنوں میں سخت بیمار تھا..... اس لیے نہیں آ سکا.....''

''بعد میں بھی تم نے مبارک دینے کی زحمت نہیں کی..... کیا ناراض تھے مجھ سے؟'' آخری جملہ بڑی دلربائی سے کہا گیا تھا۔ دلاور کے وجود کا سارا لہو جیسے اس کے دل میں اکٹھا ہو گیا۔ دل دھڑا دھڑ بجنے لگا۔ وہ بولا۔

''نہیں بی بی جی!..... میری آپ سے کیسی ناراضی۔''

''تم نے یہ بی بی جی..... کی گیارٹ لگائی ہوئی ہے۔ سویرا نام ہے میرا.....'' وہ مصنوعی غصے سے بولی۔

''نہیں بی بی جی..... اب نہیں.....'' وہ روہانسا ہو گیا۔

''کیا اب نہیں.....؟'' وہ حیرت سے بولی۔

''اب آپ ہمارے بڑے سائیں کی بیگم صاحبہ ہو..... اب میں آپ کو نام سے نہیں پکار سکتا۔''

''کیا اسٹوپڈ باتیں کرتے ہو.....''

''آپ جو مرضی کہیں جی..... اب اس منہ سے آپ کا نام ادا نہیں ہو گا۔'' دلاور نے بے پروائی سے کہا تو یکدم سے سویرا کے دل کو ایک دھچکا سا لگا..... یہ ایک الارم تھا..... ہلکا سا اینٹی گیٹر تھا۔ اس کے دل کے نہاں خانے میں جو ایک چھوٹی سی ندی بہتی تھی، اس کی لہروں میں تلاطم پیدا ہوا تھا۔ سویرا تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گئی۔ گم صم بیٹھی ونڈ اسکرین سے باہر تیزی سے گزرتے ہوئے مناظر کو دیکھتی رہی..... پھر جیسے کسی خیال سے جاگتے ہوئے بولی۔

''دلاور! ماروی کے ساتھ تمہارا کیا چکر ہے.....؟''

وہ پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ''بی بی جی! مجھے نہیں معلوم وہ لڑکی کیوں ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ کئی دفعہ تو یوں لگتا ہے وہ مجھے نوکری سے نکلوا کے رہے گی.....''

آخری بات دلاور نے اپنے پاس سے جان بوجھ کے لگائی تھی۔

سویرا ایک دم سے سیدھی ہو گئی، تھوڑے جوشیلے لہجے میں بولی۔ ''تم بالکل پروانہ کرو..... تمہیں یہاں نوکری سے کوئی نہیں نکال سکتا..... اس کی گارنٹی میں تمہیں دیتی ہوں..... اور دوسری بات یہ کہ تم یہاں نوکر ہو بھی نہیں۔ تمہاری حیثیت کچھ اور ہے۔'' اس نے چند لمحے توقف کر کے بات جاری رکھی۔ ''اور اگر تم واقعی ماروی میں دلچسپی رکھتے ہو تو میں اس سلسلے میں تمہاری مدد کر سکتی ہوں۔''

''آپ میری کیا مدد کریں گی.....؟''

''میں تمہاری شادی ماروی سے کروانے میں مدد کر سکتی ہوں۔ ویسے ایک دوست ہونے کے ناتے میں کہوں گی..... ماروی دل کی بہت اچھی لڑکی ہے..... تم دونوں ایک ساتھ بہت اچھے لگو گے۔'' سویرا کی آنکھوں میں چمک سی تھی۔

دلاور سر جھکا کے تھوڑا سا کھانسا جس سے گلے میں لگا بے بسی کا پھندا کھل گیا۔ وہ بولا۔ ''بی بی جی.....! آپ کے خلوص اور تعاون کا بے حد شکریہ..... مگر میں شادی نہیں کرنا چاہتا.....''

''ماروی سے نہیں کرنا چاہتے..... یا.....''

''میں شادی ہی نہیں کرنا چاہتا..... پتا ہے بی بی جی..... یہ سب دل کا کھیل ہے۔ جب دل مر جاتا ہے تو ہر چیز، ہر جذبہ ایک ہی سطح پر آ جاتا ہے..... ہونے..... نہ ہونے میں کوئی فرق نہیں رہتا..... زندگی اور موت میں کوئی فرق نہیں رہتا۔''

سویرا کا دل گھبرانے لگا۔ وہ جلدی سے بات کا رخ موڑتے ہوئے بولی۔ ''آگے کسی بازار پر گاڑی روکنا، مجھے کچھ چیزیں خریدنی ہیں۔''

آگے پیٹرول پمپ کے ساتھ ایک اسٹیک بار تھا۔ سویرا اندر گئی اور تھوڑی دیر بعد واپس لوٹ آئی۔ اس کے ہاتھ میں بڑا سا شاپنگ بیگ تھا جس میں جنک فوڈ ٹائپ بہت سی چیزیں تھیں۔

دلاور یہ نہ جان سکا کہ سویرا رو کر اپنا من ہلکا کر کے آئی ہے۔ اس کی آنکھوں کے نچلے پپوٹے..... گلابی دکھنے لگے تھے۔ باقی سفر خاموشی سے کٹا۔ دو گھنٹے کی مسافت کے بعد وہ بہاولپور یونیورسٹی پہنچ گئے۔ یونیورسٹی کے ساتھ ساتھ بہت سے کوارٹرز بنے ہوئے تھے۔ سویرا بڑا شاپر لے کر ایک کوارٹر میں گھس گئی..... اس کی وہاں سے واپسی قریباً

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

آدھے گھنٹے بعد ہوئی۔

وہ واپس آئی تو قدرے خوش تھی۔ بولی۔ ''چلو دلاور..... ہمیں اب صرف چند منٹ کے لیے مین بازار میں رکنا ہے۔ پھر حویلی واپس چلیں گے.....''

شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے جب وہ لوگ حویلی پہنچے..... گاڑی سے اترتے ہوئے سویرا بولی۔ ''دلاور! تم مجھے بی بی جی..... کہو..... یا جو مرضی کہو..... میری نظر میں پہلے بھی تم میرے دوست تھے، آج بھی میں تمہیں وہی دلاور سمجھتی ہوں۔ خود کو سنبھالو..... پہلے والے دلاور بن جاؤ..... جو ڈھیروں باتیں کرتا تھا۔ ہر کسی کا دل لگائے رکھتا تھا۔''

وہ خاموشی سے سر جھکا کر رہ گیا۔

☆☆☆

ایک دن دلاور بستر پر پڑا سونے کی تیاری کر رہا تھا کہ ظفری معنی خیز انداز میں مسکراتا ہوا اس کے پاس آ گیا۔ دانت نکالتے ہوئے بولا۔ ''ایک خوش خبری ہے..... اور ایک بری خبر ہے۔ بول پہلے کون سی بتاؤں.....'' ایک لمحے کے لیے رک کر اس نے سر پر ہاتھ مارا بولا۔ ''یار..... خبر اصل میں ایک ہی ہے مگر وہ کسی کے لیے اچھی ہے..... کسی کے لیے..... دل دُکھانے والی۔''

''پہیلیاں کیوں بجھوا رہا ہے..... بات بتا کیا ہے؟''

''بات اصل میں یہ ہے کہ حویلی کی رونق، حویلی سے رخصت ہو گئی..... یہ ہوئی بری خبر اور اچھی خبر یہ ہے کہ ماروی سے تیری جان چھوٹ گئی ہے۔''

دلاور کا منہ کھلا رہ گیا۔ ''واقعی؟''

''ہاں..... واقعی.....! سویرا بی بی نے ماروی کا نکاح بہاولپور میں ایک بندے سے کر دیا ہے۔ ان کی ایک کلاس فیلو کا کزن بہاولپور یونیورسٹی کے کوارٹرز میں رہتا ہے۔ خوش شکل اور محنتی ہے۔ ہے بھی ماروی کی برادری کا۔ سویرا بی بی نے ماروی کی ماں سے بات کی۔ اندھے کو کیا چاہیے دو آنکھیں۔ اس نے فوراً ہامی بھر لی..... دو چار دنوں میں یہ سارا چکر چلا اور ماروی ساری حویلی کو سونا کر گئی۔'' ظفری ٹھنڈی سانس کھینچ کر بولا۔

دلاور کو یاد آنے لگا۔ سویرا اسی کے ساتھ تو بہاولپور گئی تھی۔ تو کیا وہ ماروی کے رشتے کے سلسلے میں گئی تھی؟ وہ انہی سوچوں میں تھا کہ ظفری نے اسے کندھوں سے پکڑ کر جھنجوڑ ڈالا بولا۔ ''یار!..... تو بھی پتا نہیں کیسا مرد ہے..... وہ تیرے آگے پیچھے پھرتی رہ گئی اور تو نے اس کو گھاس تک نہیں ڈالی۔''

''گھاس ڈال کے کیا کرتا.....؟''

''اس سے شادی کرتا..... کم از کم حویلی کی رونق..... یہاں سے رخصت تو نہ ہوتی.....''

''تو بہت بے غیرت آدمی ہے۔ تب وہ تیری بھابی ہوتی۔'' دلاور نے ہنس کے کہا تو حیرت سے اس کا منہ کھل گیا کھسیانا سا ہو کر بولا۔

''یار! میں تھوڑا جذبات میں آ گیا تھا۔ پھر تو وہ واقعی ہماری بھابی بن جاتی..... سوری یار مجھے معاف کر دے..... یہ عورت ذات بڑی فتنے کی چیز ہے اور اگر خوبصورت ہو..... تو.....''

دلاور نے کہا۔ ''ظفری! ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی..... بڑے سائیں اور شاہ فرمان کراچی کسی کام سے گئے ہوئے ہیں۔ پیر فضل سبحون شریف عرس کی تقریبات میں مصروف ہیں۔ پیچھے سے ماروی کا نکاح۔''

''اس میں کون سی انہونی بات ہے۔ ماروی کی ماں تو بیچاری بڑے عرصے سے ماروی کی شادی کے لیے فکر مند تھی..... ماروی کی خوبصورتی نے اس کی راتوں کی نیندیں اڑا رکھی تھیں۔ بھلا ہو سویرا بی بی کا جنہوں نے خود آگے بڑھ کر یہ فرض ادا کیا ہے..... مالک ہوں تو ایسے ہوں.....''

دلاور ظفری کی بات سن کر خاموشی سے اسے دیکھتا رہا پھر بولا۔ ''بڑے سائیں اور شاہ فرمان دونوں کچھ دنوں سے کراچی میں ہیں۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا۔ دونوں بھائی ہی حویلی سے غائب ہیں۔''

''تو حویلی میں رہتے ہوئے بھی حویلی میں نہیں ہوتا۔ مجھے لگتا ہے جو تو رات بہت دیر تک روہی کے ویرانوں میں بیٹھا رہتا ہے، اس نے تیرے دماغ پر اثر کیا ہے۔ ایسی کھلی جگہوں پر بھوت پریت ہوتے ہیں..... آدمی کو نقصان پہنچاتے ہیں۔''

دلاور ہنس دیا بولا۔ ''ان سے زیادہ نقصان مجھے انسانوں نے پہنچایا ہے..... تو حویلی کے اندر والی بات بتا..... جو میں حویلی میں رہتے ہوئے بھی نہیں جانتا۔''

ظفری دلاور کی بات پر مسکرا دیا۔ انکشاف آمیز لہجے میں بولا۔ ''وہ باز والا معاملہ تو، تو جانتا ہی ہے نا.....''

دلاور نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''اسی سلسلے میں دونوں بھائی کراچی میں ہیں۔ رحیم سائیں بھی کراچی میں ہیں۔ تم نہیں جانتے ہو گے رحیم سائیں کو..... یہ منڈ بھیرو کے پاس ایک کوٹھ کے مالک ہیں۔''

دلاور، رحیم سائیں کو جانتا تھا مگر خاموش رہا۔ یہ رحیم سائیں وہی تھے جنہوں نے جیپ تالاب میں الٹنے کے بعد زخمی شاہ زمان اور سویرا کی مدد کی تھی۔ جیپ میں ڈال کر انہیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

اپنے ڈیرے پر لے آئے تھے۔ ان کی مرہم پٹی کروائی تھی، بعد میں انہیں کھانا بھی کھلایا گیا تھا۔

ظفری کی بات جاری تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''رحیم سائیں بیچ میں پڑ کر حضور چانڈیو اور بڑے سائیں کی صلح کروا رہا ہے۔ خبریں یہ آرہی ہیں۔ رحیم سائیں کافی حد تک کامیاب ہو گیا ہے۔ بڑے سائیں بھاری رقم کے عوض شان باز واپس کرنے پر راضی ہو گئے ہیں اور جو کیس عدالت میں چل رہا ہے، اسے بھی واپس لیا جا رہا ہے۔''

ظفری کچھ دیر خاموش رہا پھر انگڑائی لیتے ہوئے بولا۔ ''یارا! یہ ہمارے صاحب لوگ ویسے پیسے کے بڑے پجاری ہیں۔ دیکھو نا...... ''شان'' باز خود چوری کروایا اور بعد میں بھاری رقم کے ساتھ اب واپس کیا جا رہا ہے۔ حضور چانڈیو پارٹی سے حویلی پر حملے والی غلطی ہو گئی جس کی وجہ سے وہ پھنس گئے۔ اب دیکھو یہ کیس چھ مہینے چلتا رہا۔ کیس ختم کروانے کے لیے علیحدہ سے رقم لی ہے بڑے سائیں اور شاہ فرمان نے......''

''وہ کیسے......؟'' دلاور حیرت سے بولا۔

''خون بہا...... شاہ فرمان نے عدالت میں جو بیان دیا تھا، اس میں اپنا ایک بندہ مقتول بیان کیا گیا تھا۔ اسی لیے تو یہ کیس حضور چانڈیو کے گلے کا پھندا بنا رہا مگر اب یہ کیس ختم ہو گیا ہے یا ہونے کے قریب ہے۔ حضور چانڈیو سے اس بندے کا خون بہا لیا جا رہا ہے۔ جو بھی قتل ہوا ہی نہیں، کیسی لطیفے والی بات ہے۔ دو بندوں کا تبادلہ بھی ہوگا ایک وہ جو حویلی پر حملے میں پکڑا گیا تھا۔ اس کے بدلے شاہ فرمان وغیرہ اپنا ایک خاص بندہ چھڑوائیں گے۔''

''ہاں شاید دنیا ایسی ہی ہے۔'' دلاور نے کہا۔ بلند شیشوں سے پار سورج چمک رہا تھا، ہوائیں چل رہی تھیں۔ زندگی سانس لے رہی تھی۔

☆☆☆

آج دلاور کی جائے پناہ پر کچھ اور لوگ قابض ہو گئے تھے۔ ڈھولکی بج رہی تھی۔ دف بج رہے تھے۔ گھنگھروؤں کی چھنکار پستہ قد بیری کے آس پاس رقص کر رہی تھی۔ وہ چار طوائفیں تھیں جن کے جوان جسموں سے پسینا چھوٹ کر ان کی ایڑیاں بھگو رہا تھا۔ ان کے کمانوں کی طرح تنے، تنگ کپڑوں میں پھنسے، وحشی بدن میوزک کی دھن پر جلوے بکھیر رہے تھے۔ رات کے اس سمے جنریٹر کی آواز ڈھولکی اور دف کی آواز میں مدغم ہو رہی تھی۔ شراب پانی کی طرح بہائی جا رہی تھی۔ یہ حضور چانڈیو سے بھاری رقم وصول کرنے کا جشن تھا۔ حیدرآبادی طوائفوں نے ناچ ناچ کر روہی کی ریتیلی زمین میں دنگا مچا دیا تھا۔ ایک جوان...... میلے رنگ کا سرائیکی جس نے سر پر شیشوں والی ٹوپی پہن رکھی تھی اور جس کا میلا چہرہ بھی جنریٹر کی تیز روشنی میں لشکتا تھا، کان پر ہاتھ رکھے کوئی تان لگا رہا تھا۔

طوائفوں پر جوں جوں نوٹ نچھاور کیے جاتے تھے، ان کے پیر اور زیادہ تیزی سے حرکت کرنے لگتے تھے۔

''شان'' باز تین کروڑ کے عوض حضور چانڈیو کو واپس کیا جانا تھا۔ جرگے میں طے ہوا تھا کہ رقم پہلے ادا کر دی جائے گی، باز تین دن بعد حضور چانڈیو کے گوٹھ میں خود شاہ فرمان پہنچا کر آئے گا۔ اس پر بہت اعتراض تھا۔ حضور چانڈیو نے کہا تھا کہ باز رقم ادا کرتے وقت ہمارے حوالے کیا جائے۔ جس پر دونوں بھائی متفق نہیں ہوئے۔ بہت لمبی چوڑی بحث کے بعد رحیم سائیں کی گارنٹی کے ساتھ یہ معاملہ طے ہو گیا۔

رقم چوڈیرہ حویلی والوں کے اکاؤنٹ میں پہنچ چکی تھی۔ جن دو بندوں کا تبادلہ ہونا تھا، وہ بھی ہو چکا تھا۔ جو آدمی حضور چانڈیو سے رہا ہو کر آیا اس کا نام ''ٹریگر'' تھا۔

اب رقم بینک میں کنفرم ہونے کے بعد فوری طور پر اس جشن کا اہتمام کیا گیا تھا۔

جشن ختم ہونے کے بعد اس رات نشے میں دھت شاہ زمان حویلی میں داخل ہوا۔ مہمان خانے میں اکڑ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''جاؤ شیرو! ماروی کو بلا کر لاؤ۔'' اس کا لب و لہجہ بالکل ٹن تھا۔

''مگر سائیں...... اس وقت...... اس وقت آپ سو جائیں۔'' شیرو نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔ ''رات کا ایک بج رہا ہے۔''

''بکواس کرتے ہو...... زبان چلاتے ہو...... بڑے سائیں کے آگے...... کس حرامزادے کی مجال ہے...... جو میرے حکم کو نہ مانے...... بلاؤ...... اس ناگن کو...... جس نے...... یہاں۔'' وہ اپنے دل پر ہاتھ رکھ کے بولا۔ ''یہاں ڈنگ مارے ہیں...... آج میں حساب برابر کرنا چاہتا ہوں۔''

''بہت اچھا بڑے سائیں!'' شیرو یہ کہتا ہوا پچھلے پاؤں پلٹ گیا۔ اس کی واپسی چند منٹ بعد ہوئی۔ وہ تھوڑا گھبرایا ہوا تھا۔ لرزتے لہجے میں بولا۔ ''وہ...... وہ بڑے سائیں...... ماروی تو یہاں نہیں ہے۔''

شاہ زمان گردن ٹیڑھی کر کے مخمور لہجے میں بولا۔ ''یہاں نہیں ہے...... یہ کیا بکواس کر رہا ہے...... تو......؟''

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

''بڑے سائیں! وہ..... وہ..... اس کی ماں..... جو ہے نا..... اس نے پچھلے ہفتے نکاح کر دیا ہے اس کا..... وہ چلی گئی ہے یہاں سے.....''

یہ انکشاف نشے میں دھت شاہ زمان کے لیے دھماکے سے کم نہیں تھا۔ وہ اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا سائیڈ ٹیبل پر پڑا بیش قیمت گلدان گھما کر زمین پر دے مارا۔ شیشے کا وہ گلدان کرچی کرچی ہوگیا۔ وہ ناقابلِ یقین غراتے لہجے میں بولا۔ ''لاؤ بلا کر اس کی ماں کو میرے پاس.....''

اگلے چند منٹوں میں ماروی کی آدھی سوئی، آدھی جاگی ماں شاہ زمان کے سامنے کھڑی تھی۔ اس نے بکھرے بالوں کو چادر میں لپیٹ رکھا تھا..... وہ حواس باختہ تھی۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ اتنی رات گئے اسے کیوں بلایا گیا ہے۔ ٹوٹے گلدان کو دیکھ کر اس کی رہی سہی ہمت بھی جواب دے گئی تھی۔ شاہ زمان کی آنکھوں میں لہو اترا ہوا تھا۔ وہ آنکھوں کو سکیڑتے ہوئے، گہری خوفناک نگاہوں سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ماروی..... کہاں ہے.....؟''

''بڑے سائیں! اس کی شادی ہوگئی ہے..... اب وہ بہاولپور اپنے سسرال میں ہے۔''

ماروی کی ماں نے کانپتے لہجے میں کہا تو شاہ زمان ناقابلِ یقین تیزی سے آگے بڑھا۔ اس نے اس بوڑھی کمزور عورت کے بال اپنی مٹھی میں جکڑ لیے، ایک جھٹکا دیا جس سے اس کی چادر اتر گئی۔ وہ درد سے کراہ اٹھی، بالوں کی گرج سے لہجے میں بولا۔ ''تیری مجال کیسے ہوئی اس کی شادی کرنے کی..... بڑے سائیں کے حکم کے بغیر تو یہاں پتا بھی نہیں ہلتا..... اور تو نے..... اتنا بڑا کام مجھ سے پوچھے بغیر کر دیا.....''

شاہ زمان نے ایک جھٹکے سے اسے پرے پھینکا۔ وہ نہایت قیمتی پانچ فٹ اونچے پلر گلدان پر گری۔ گلدان گرا اور ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔ ماروی کی ماں کی کلائی زخمی ہوگئی۔ گلدان ٹوٹنے سے وہ اور طیش میں آگیا یا اسے بہانہ مل گیا۔ اس نے بوڑھی عورت کو ٹھوکر پر رکھ لیا۔ وہ چیخنے لگی۔ خدا رسول کے واسطے دینے لگی..... مگر الکوحل کے زیر اثر شاہ زمان کے کان پر جوں تک نہ رینگی..... اس کے ہاتھ اور پاؤں اس وقت رکے جب اس عورت کے منہ سے سویرا بی بی کا نام نکلا۔ وہ لرزاں روتے لہجے میں بولی۔

''بڑے سائیں..... ! میری کیا مجال میں آپ کے حکم کے بغیر لڑکی کی شادی کر دوں..... وہ تو..... سویرا بی بی نے جلدی جلدی سارا انتظام کیا..... میں نے تو ایک دو دفعہ انہیں کہا بھی تھا کہ بڑے سائیں کی اجازت کے بغیر شادی کرنا مجھے ٹھیک نہیں لگ رہا..... انہوں نے یہ جواب دیا کہ اگر بڑے سائیں نہیں ہیں..... تو کیا ہوا..... میں تو ہوں نا.....''

شاہ زمان اپنی جگہ منجمد ہوگیا۔ اس کے دیدے پھٹے ہوئے تھے اور آنکھوں کی غیر معمولی چمک میں کسی آنے والے طوفان کی پیش گوئی تھی..... شاہ زمان نے رخ دوسری طرف پھیر لیا۔ شیرو نے جلدی سے آگے بڑھ کر اس عورت کو اٹھایا، چادر اسے تھمائی اور اشارہ کیا کہ جلدی سے یہاں سے نکل جاؤ.....

دو تین دن بالکل خاموشی سے گزر گئے۔ شاہ زمان نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا..... بس وہ ہر روز دلاور کے ساتھ ''فیروزہ'' نکل جاتا تھا۔ فیروزہ لیاقت پور اور چنی گوٹھ کے پاس ایک خوبصورت بستی تھی۔ شاہ زمان فیروزہ میں ایک دو منزلہ عالی شان مکان میں جاتا اور تین چار گھنٹے بعد وہاں سے نکلتا..... دلاور اتنی دیر باہر چھاؤں میں سستاتا رہتا۔

ایک دن شاہ زمان دو منزلہ مکان سے باہر آیا تو اس کے ساتھ بڑی سی پگڑی والا ایک ساٹھ پینسٹھ سالہ شخص بھی تھا۔ اس نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ پاؤں میں پشاوری جوتی تھی اور ہاتھ پاؤں غیر معمولی بڑے تھے۔ چہرے مہرے سے پختون لگتا تھا۔ رخصت ہوتے وقت پگڑی والے نے شاہ زمان سے مصافحہ کیا اور رواج کے مطابق اس کے گالوں کا بوسہ لیا۔ شاہ زمان کافی ہشاش بشاش تھا۔ چوڈیرو پہنچنے تک وہ پچھلی سیٹ پر پرسکون انداز میں نیم دراز رہا۔ انداز سے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس نے کوئی نہایت اہم سنگِ میل عبور کر لیا ہے۔

☆☆☆

وہ چوڈیرو حویلی کی ایک حبس زدہ شام تھی۔ سیبوں والی حویلی میں بھنگ گھوٹی جا رہی تھی۔ حویلی کے کارندے ٹیپو ٹریگر کی خوشی میں اپنے انداز میں جشن منانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ شاہ زمان بھی وہاں پر موجود تھا۔ وہ بھنگ کا رسیا تو نہیں تھا..... مگر کبھی کبھار شوق پورا کر لیا کرتا تھا۔ بھنگ بڑی بڑی تین، چار ''دوریوں'' میں گھوٹی جا رہی تھی۔ دلاور ظفری کے ساتھ وہاں موجود تھا۔ اس حویلی میں آنے کے بعد اور سویرا سے ''زخم'' کھانے کے بعد اس نے ہر نشے کا ذائقہ چکھا تھا مگر فنا کی دیواریں کھڑی کرنے کے بعد اس نے یہ سب چھوڑا تو نہیں تھا..... محتاط ضرور ہوگیا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

http://paksociety.com

پاک سوسائٹی پر مُوجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

Downloaded From Paksociety.com

ایک سوکھے بدن کا لمبا تڑنگا کارندہ بڑے کڑاہے میں دودھ پھینٹ رہا تھا کہ اچانک سیبوں والی حویلی کے صدر دروازے سے دھول اڑاتی ہوئی جیپ اندر داخل ہوئی..... اس میں شاہ فرمان اور شیر وسوار تھے۔ دونوں بڑی عجلت میں جیپ سے اترے۔ چہرے بتا رہے تھے کہ کوئی خیر کی خبر نہیں ہے۔ شاہ فرمان، شاہ زمان کو نہیں دیکھ سکا۔ دھاڑتے ہوئے بولا۔ ''اوئے۔ یہ تم لوگوں نے کیا کنجر خانہ لگا رکھا ہے۔ اٹھاؤ یہاں سے سب کچھ.....'' اس نے ایک میز کو ٹھوکر ماری، ایک کرسی کو اٹھا کے پرے پھینکا۔ اسی دوران میں شاہ فرمان کے بگڑے تیور دیکھتا ہوا شاہ زمان اٹھ کھڑا ہوا۔

وہاں موجود تمام کارندوں کے چہرے دھواں دھواں ہو رہے تھے۔ اسی اثنا میں شاہ فرمان کی نظر شاہ زمان پر پڑ گئی۔ وہ تیزی سے اس کی جانب بڑھا اور اس کے کان میں سرگوشی کی..... شاہ زمان بڑے بھائی کی بات سنتا گیا اور اس کے چہرے کا رنگ بدلتا گیا..... جواب میں اس نے بھی شاہ فرمان سے آہستگی سے کوئی بات کی جس کا جواب شاہ فرمان نے ہاتھ ہلاتے ہوئے دیا..... شاہ زمان کے چہرے پر پریشانی کے سائے منڈلا رہے تھے۔ اس نے دھاڑتے ہوئے کارندوں کو حکم دیا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے تین جیپیں مسلح جوانوں سے لد گئیں اور دھول اڑاتی ہوئی وہاں سے رخصت ہو گئیں۔

دلاور منہ کھولے ظفری کی جانب دیکھنے لگا..... مگر ظفری بھی اس صورتِ حال سے اتنا ہی لاعلم تھا جتنا کہ دلاور..... رات گئے تک حویلی میں چہ میگوئیاں ہوتی رہیں..... مگر اصل صورتِ حال کا کسی کو اندازہ نہ ہو سکا۔

اس دن کے بعد حویلی کی فضا میں اک بے نام سا تناؤ پیدا ہو گیا۔ دبی دبی سرگوشیاں سر اٹھانے لگیں۔ ملازمین آپس میں مختلف قیاس آرائیاں کرنے لگے۔ اصل صورتِ حال کو چھپایا جا رہا تھا..... مگر سب جانتے تھے، اہم باتیں زیادہ دیر چھپی نہیں رہ سکتیں۔ اس بات کو بھی جلد ہی کھلنا تھا۔

ماروی کی شادی والے معاملے کے بعد شاہ زمان خاموش تھا؟ اس نے سویرا کے سامنے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا تھا اور وہ کرنا بھی نہیں چاہتا تھا..... وہ سیدھا وار کرنا چاہتا تھا..... اسی سلسلے میں دلاور کے ساتھ فیروزہ چکر لگاتا رہتا تھا۔ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ عنقریب ایک خوبرو لڑکی اس حویلی میں سویرا بی بی کی سوتن بن کر آنے والی ہے۔

ایک دن دلاور نشست گاہ میں شاہ زمان کے پاس اکیلا بیٹھا تھا۔ موقع دیکھ کر بولا۔ ''بڑے سائیں! برا نہ منائیں تو کچھ عرض کروں.....''

وہ دلاور کی طرف دیکھے بغیر بولا۔ ''ہاں..... بولو.....''

''بڑے سائیں! آپ نے مجھ سے کہا تھا..... تم سے بہت ضروری کام لینا ہے۔ مجھے یہاں رہتے ہوئے بہت عرصہ ہو گیا ہے۔ نہ آپ نے مجھ سے وہ کام لیا اور نہ ہی اس کے متعلق کچھ بتایا۔''

شاہ زمان کے چہرے پر سوچوں کا ایک جال بنا ہوا تھا۔ وہ ہاتھ کی انگلی ماتھے پر رگڑتے ہوئے بولا۔ ''بہت جلد..... میں تمہیں بتاؤں گا..... بس تم اپنی تیاری رکھو۔''

''بڑے سائیں! آپ حکم کریں۔ میں ہر دم تیار ہوں۔''

اسی دوران دھماکے سے دروازہ کھلا اور ادھیڑ عمر شاہ فرمان شیرو کے ساتھ اندر داخل ہوا..... شاہ فرمان کے تیور بگڑے ہوئے تھے۔ وہ شاہ زمان کے برابر والی نشست پر بیٹھ گیا۔ ماتھے پر تیوڑی ڈالتے ہوئے بولا۔ ''چاچا پیر فضل کی حضور چانڈیو سے بات ہوئی ہے۔ چاچے نے ان کو حوصلہ رکھنے کو کہا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ ہم چوڑیرو والے کبھی اپنی زبان سے نہیں پھرتے۔''

''تو کیا کہا حضور چانڈیو..... نے.....'' شاہ زمان کے لہجے میں بھی پریشانی تھی۔

''کہنا کیا ہے..... وہ جو حرام کا تخم..... شوکت سیال ہے نا..... وہ چانڈیو کو اکسا رہا ہے..... معاملے کو بگاڑنے کے لیے بڑھاوا دے رہا ہے..... بات کو..... کئی دفعہ تو دل میں آتا ہے اس شوکت سیال کا پتا ہی صاف کر دیں بیچ میں سے۔''

''نہیں..... نہیں..... ہم نے ایسی کوئی بے وقوفی نہیں کرنی۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں نے..... ٹریگر کو تیار کیا ہے..... وہ جائے گا کچے کے علاقے میں..... ٹریگر نے ہی کافی معلومات بھی اکٹھی کی ہیں۔ کھرا ڈھونڈ لیا ہے اس نے۔''

''اس کا وہاں اکیلے جانا ٹھیک ہوگا؟'' شاہ فرمان نے سوال اٹھایا۔

''نہیں..... دو بندے اور بھی اس کے ساتھ جائیں گے۔ وہ دونوں کچے کے چپے چپے سے واقف ہیں۔''

''ان کی روانگی کب تک ہو گی؟''

''دو چار دن لگ جائیں گے..... ایک ہفتہ بھی لگ سکتا ہے.....'' شاہ زمان نے کہا۔

''مگر..... حضور چانڈیو.....؟''

''اب اتنا انتظار تو اسے کرنا پڑے گا.....'' شاہ زمان پُرسوچ لہجے میں بولا۔

(باقی اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں)

WWW.PAKSOCIETY.COM